سنسنی خیز اور دل ہلا دینے والی داستان
بھونچال
ایم اے راحت

آخر کار میری قسمت کا فیصلہ سنا دیا گیا اور جو کچھ فیصلہ ہوا تھا وہ میری توقع کے برعکس نہیں تھا۔ یعنی سزائے موت۔ بجلی کی کرسی کیسی ہوتی ہوگی۔ دو ایک بار بدن میں کرنٹ لگا تھا۔ ایک شدید جھٹکا، ذہن ساکت ہو جاتا ہے اور پورے بدن میں گدگدی سی لیکن وہ برقی رو جو سزائے موت کے وقت الیکٹرک چیئر میں دوڑائی جاتی ہے اس معمولی سے جھٹکے سے لاکھوں گنا زیادہ طاقتور ہوتی ہے۔ اچھا ہے۔ جیسے معمولی سا جھٹکا لگنے سے ذہن ایک لمحے کے لیے سو جاتا ہے اسی طرح اتنی طاقتور برقی رو تو سوچنے سمجھنے کی قوت ہی مفلوج کر دیتی ہوگی۔ سائنس نے جہاں لوگوں کو تکلیف پہنچانے کی بہت سی ایجادات کی ہیں وہیں انسان کی آسانی کے لیے بھی بہت سے کام ہوئے ہیں۔ پہلے پھانسی کے تختے ہوتے تھے۔ رسّی میں گردن باندھ دی جاتی تھی اور پھر پیروں کے نیچے سے رکاوٹ ہٹا دی جاتی تھی۔ بڑی تکلیف ہوتی ہوگی لیکن اب مرنے میں بڑی آسانیاں ہوگئی ہیں۔ کرسی پر بٹھاؤ، بٹن آن کرو اور پلک جھپکتے میں کوئلے کے ڈھیر کے علاوہ اور کچھ باقی نہ رہ جائے۔

موت ایک بھیانک تصور ہے۔ کون مرنا چاہتا ہے؟ کسی سو سالہ بوڑھے کو موت پیش کرو وہ آخری کوشش کرے گا کہ زندگی کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑے۔ حالانکہ اس کی زندگی کی ساری خواہشات پوری ہو چکی ہوتی ہیں۔

لیکن کیا آپ یقین کریں گے کہ جس وقت مجھے سزائے موت سنائی گئی۔ میں نے سکون کی گہری سانس لی تھی۔ بعض اوقات انسان کی زندگی اس نہج پر پہنچ جاتی ہے جہاں وہ خود زندہ نہیں رہتا۔ بلکہ ایک مقصد اس کی رگوں میں خون بن کر دوڑتا رہتا ہے۔ وہی مقصد روح کہلاتا ہے اور جب وہ مقصد پورا ہو جاتا ہے تو زندگی مٹی کے سوا کچھ نہیں ہوتی۔ اب اگر آپ اس غلیظ مٹی سے کوئی دلچسپی رکھتے ہیں تو اس کا بوجھ اٹھائے اٹھائے پھریں ورنہ جب مقصد پورا ہو گیا

تو پھر زندگی کیا معنی رکھتی ہے۔

اور میں خوش نصیب انسان ہوں۔ جو میرا مقصد تھا۔ میں اسے پورا کرنے میں کامیاب ہوگیا تھا۔ چوہدری بدر شاہ کے چھ جوان بیٹے، اس کی بیوی، وہ خود، ایک بیٹی، ایک داماد، پورے دس آدمی تھے۔ اور میں نے ان دسوں کے دسوں کو انہی کے گھر میں بند کر کے جلا دیا تھا۔

ہاں میں نے جو کہا تھا وہ پورا کر دکھایا تھا۔ اپنے باپ کی لاش پر کھڑے ہو کر میں نے اس کے سینے سے ابلتا ہوا خون اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر چہرے پر ملا تھا اور پوری بستی کے سامنے کہا تھا۔ "بستی والو! سن لو، تم نے دیکھا کہ چوہدری بدر شاہ نے میرے بوڑھے باپ کو کس طرح قتل کیا ہے۔ خدا کی قسم! حکومت چوہدری بدر شاہ کو اس سلسلے میں کوئی سزا دے یا نہ دے میں اس کے خاندان کو نیست و نابود کر دوں گا۔ میں چوہدری بدر شاہ کی نسل کو آگے بڑھنے دوں گا۔ سنو بستی والو! میں جا رہا ہوں، تم میں سے کسی میں جرأت ہو تو میرے باپ کو کفن پہنا دینا، نہیں تو اس کی لاش کی تقدیر میں جو بھی ہو۔ میری زندگی کا اب صرف ایک مقصد ہے"۔

اور پھر برسات کی ایک رات تین دن تک بارش لگاتار برسنے کے بعد تھوڑی دیر کے لیے رکی تو بستی والوں نے دیکھا کہ چوہدری بدر شاہ کی حویلی شعلوں میں گھری ہوئی تھی۔ اس کی اور اس کے اہلِ خانہ کی دردناک چیخیں رات کے سناٹے میں دور دور تک گونج رہی تھیں۔ اور جب بستی کے ہمدرد لوگ حویلی کی طرف دوڑے تو سنسناتی گولیوں نے ان کا استقبال کیا اور رات کے سناٹے میں گونجنے والی آواز میری ہی تو تھی۔

"بستی والو! میں آصف خان تم سے مخاطب ہوں طارق خان کا بیٹا۔ جس کی لاش میں تمہارے حوالے کر گیا تھا۔ آج میں اپنے باپ کا انتقام لے رہا ہوں۔ میرے نزدیک آؤ، میں نہیں چاہتا کہ کسی اور کو نقصان پہنچے۔ ہاں اگر تم چوہدری بدر شاہ سے وفاداری کا اظہار چاہتے ہو تو رات گذر جانے دو، ان جسموں کو خاکستر ہو جانے دو صبح کو ان کی جلی ہوئی لاشوں کے ساتھ میں بھی تمہیں ملوں گا"۔

اور وہی ہوا جو میں نے کہا تھا۔ میں نے انتہائی پُرامن انداز میں خود کو بستی والوں کے سپرد کر دیا اور بستی والوں نے مجھے پولیس کے سپرد۔ بات وہی ہوئی نا۔ یعنی مقصد، باپ کی موت کے بعد میں نے قسم کھائی تھی اور قسم کھاتے وقت مجھے پورا پورا احساس تھا کہ جو کچھ میں کرنے

جا رہا ہوں اس کا نتیجہ کیا ہوگا۔ سو میں نے سوچ لیا کہ چوہدری بدر شاہ نے صرف میرے باپ کو قتل نہیں کیا بلکہ مجھے بھی مار دیا ہے۔ کیونکہ اب میں زندہ نہ تھا۔ صرف ایک مقصد زندہ تھا اور جب وہ پورا ہو جائے تو باقی کیا رہ جاتا ہے، صرف مٹی کا ڈھیر۔ تو پولیس نے اس مٹی کے ڈھیر کے ساتھ جو سلوک کیا وہ نہ مجھے یاد ہے اور نہ ہی یاد رکھنا چاہتا ہوں۔ پولیس افسر بھی حیران تھے کہ کس سر پھرے سے پالا پڑ گیا ہے۔ بستی والوں کی بھلا کیا مجال تھی کہ میری ہمدردی کرتے۔

حکومت نے ہی میرے لیے وکیلِ صفائی مقرر کر دیا تھا اور وہ بے چارہ بھی مجھ سے عاجز آ گیا تھا۔ کیونکہ جو کچھ وہ مجھ سے کہتا میں اس کو الٹا ہی کرتا تھا۔ سو نہایت آسانی سے میں نے اپنے لیے سزائے موت کی راہ ہموار کر لی اور مجھے موت کی سزا دی گئی۔

یہ چند روز عجیب و غریب احساسات کے روز تھے۔ نہ جانے کیا کیا خیالات میرے ذہن میں آتے۔ لوگ کہتے ہیں کہ موت کے وقت کا کوئی تعین نہیں لیکن میں کہتا ہوں کہ مجھے اپنی موت کا وقت معلوم ہے۔ آج سے چار دن بعد سوا چھ بجے مجھے سزائے موت دی جائے گی۔ کیسے مزے کی بات ہے، مجھے اپنی موت کا وقت معلوم ہے، ساری روایتیں جھوٹی ہو جاتی ہیں۔

لیکن صاحب کیا کہا جا سکتا ہے، روایتوں کا قیام بہرحال کوئی معنی ضرور رکھتا ہے اور بعض اوقات انسان جو خود کو بہت زیادہ ذہین سمجھنے لگتا ہے بری طرح چوٹ کھاتا ہے سو یہی میرے ساتھ ہوا۔ غالباً میری موت میں صرف اٹھارہ گھنٹے باقی رہ گئے تھے۔ مجھے ایک ایسی کوٹھڑی میں بند کیا گیا تھا جہاں سزائے موت کے قیدی رکھے جاتے تھے۔

تنگ و تاریک کوٹھڑی موت کے انتظار کا کوئی مونس نہیں ہوتا، ایک قبر کی مانند اور میں خود منکر تھا اور خود نکیر۔ اپنا حساب آپ لے رہا تھا۔ زندگی میں کیا کھویا ہے، کیا پایا ہے کس پر ظلم کیا ہے اور کس کے ساتھ نیکی۔ اونہہ! نیکی اور بدی کا فیصلہ ہونے میں اب کتنی دیر باقی رہ گئی ہے جس کا جو کام ہے کرے گا۔ میں کسی کے معاملات میں ٹانگ کیوں اڑاؤں۔

تو صرف اٹھارہ گھنٹے باقی رہ گئے تھے۔ مجھے یقین تھا کہ اب تنگ و تاریک کوٹھڑی میں کوئی انسانی آواز نہیں سنائی دے گی۔ گویا یہ قبر ہے جو مجھے زندگی ہی میں عطا کر دی گئی ہے لیکن رات کے نہ جانے کون سے پہر جبکہ نیند آنکھوں میں بھر آتی ہے خواہ اس کے بعد موت ہی نصیب کیوں نہ ہو جائے۔ مجھے ہلکی سی چاپ محسوس ہوئی، شاید اس کوٹھڑی کا دروازہ کھلا تھا۔ پھر روشنی کی ایک رمق اندر آئی اور اچانک کوئی دھڑام سے میرے اوپر آ گرا۔

میں بوکھلا کر اُٹھ گیا۔ اور ٹٹول ٹٹول کر اسے دیکھنے لگا۔ تو اتنا میں سمجھ ہی گیا تھا کہ کوئی انسانی جسم ہے۔ اس نے بھی مجھے محسوس کر لیا اور اس کے ہاتھ میرے بدن کو میری مانند ٹٹولنے لگے۔ پھر ایک غراہٹ نما آواز سنائی دی۔

''ہا...... کون ہو بھائی اور اس کوٹھری میں کیوں ہو؟''

''پکنک پر آیا ہوں''۔ میں نے مسخرے پن سے کہا۔ اور دوسری طرف خاموشی چھا گئی۔ شاید وہ سوچنے لگا تھا کہ پھانسی کی کوٹھری میں یہ کون بے جگر ہے جو اس مزاحیہ انداز میں گفتگو کر رہا ہے۔ پھر جب حیرت کا دور ختم ہوا تو اس نے مجھ سے پوچھا۔

''نوجوان ہو؟''

''اور تم شاید بوڑھے معلوم ہوتے ہو''۔

''یہی بات ہے''۔

''بڑے میاں یہ پھانسی کی کوٹھڑی ہے کیا یہ بات بھی تمہیں معلوم ہے؟''

''ہاں میں بھی سزائے موت پانے والا ہوں''۔ بھاری آواز نے جواب دیا۔

''میرے بارے میں کیا پوچھا تھا تم نے؟''

''آواز سے جوان معلوم ہوتے ہو''۔ بوڑھے نے کہا۔

''ہاں بڑے میاں میری جوانی کے اٹھارہ گھنٹے باقی ہیں۔ پورے اٹھارہ گھنٹے اور اس کے بعد میں بوڑھا ہو جاؤں گا۔ پھر مر جاؤں گا۔ اب بتاؤ کیا میں پیدا ہو گیا۔ کیا میں جوان ہوں۔ بوڑھا ہو چکا ہوں یا مر چکا ہوں۔ کیا تم اٹھارہ گھنٹے کی زندگی کو کوئی حیثیت دے سکتے ہو۔ ہاں کہو گے تو میں تمہیں احمق سمجھوں گا''۔

چند ساعت خاموشی طاری رہی۔ پھر بوڑھے کی آواز ابھری۔ ''کیا موت کے خوف نے تمہارا ذہن ماؤف کر دیا ہے''۔ اور میرے ذہن میں چنگاریاں سی بھر گئیں۔ میں نے بوڑھے کا گریبان پکڑ لیا۔

''کیا بکواس کرتے ہو؟ موت کیا ہے۔ خوف کیسا ہوتا ہے۔ میں لاش ہوں...... لاش...... خوف کسی زندہ انسان کے سینے میں تو پیدا ہو سکتا ہے لیکن تم لاش کا دل کہاں سے لاؤ گے۔ اپنے الفاظ واپس لو ورنہ موت سے پہلے تمہیں ختم کر دوں گا۔ پورے دس انسانوں کو قتل کیا ہے میں نے''۔

اور بوڑھے کی ہنسی بے حد ٹھنڈی تھی۔

''میرا گریبان چھوڑو نوجوان۔ دلچسپ انسان معلوم ہوتے ہو۔ زندگی نے کوئی مذاق کیا ہے تمہارے ساتھ''۔

''کہانی سننا چاہتے ہو؟ میں داستان گو نہیں ہوں''۔ میں نے اس کا گریبان چھوڑ دیا۔

''کہانی گذری ہوئی داستان کو کہتے ہیں اور جو گذر جائے وہ قابلِ ذکر نہیں ہوتا میں مستقبل کی باتیں کرنا پسند کرتا ہوں''۔

''کیوں آئے ہو یہاں؟''

''یہ لوگ مجھے موت دینے لائے ہیں''۔

''آہا...... سزائے موت کے قیدی ہو''۔ میں نے خوش ہو کر کہا۔

''ہاں''۔

''کتنے مارے تھے۔ کیوں مارے تھے؟''

''تم مجھ سے وہی بات پوچھ رہے ہو جس پر خود جھلا گئے تھے''۔

''اوہ...... بات درست ہے''۔ میں نے اعتراف کیا۔ ''لیکن بڑے میاں موت کا کوئی خوف، مرنے کا کوئی رنج تو نہیں ہے''۔ اور بوڑھے نے پھر ہلکا سا قہقہہ لگایا۔

''موت مجھے پیش کی گئی ہے، میں نے اسے قبول نہیں کیا''۔

''کیا مطلب؟''

''ارے میں زندہ انسان ہوں، موت نہیں چاہتا اور تم سن لو مروں گا بھی نہیں۔ بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک شخص مرنا نہ چاہتا ہو اور اسے موت دے دی جائے۔ ہم قدرت کی دی ہوئی موت کو نہیں ٹال سکتے لیکن انسان کی کیا مجال ہے کہ وہ کسی کو مار سکے''۔

''بجلی کی کرسی پورے بدن میں سرور کی لہریں دوڑا دیتی ہے اور انسان اس قدر لذت محسوس کرتا ہے کہ پھر کبھی آنکھ نہیں کھولتا''۔ میں نے تمسخرانہ انداز میں کہا۔

''کہنا یہ چاہتے ہو کہ ہمارے لیے سزائے موت تجویز کرنے والے ہمیں کسی طرح نہ جینے دیں گے''۔

''ہاں میرا مقصد یہی ہے''۔

''تم تو بزدل ہو''۔ بوڑھے نے حقارت سے کہا۔ ''مجھے دیکھو، انہوں نے مجھے سزائے

موت دی ہے لیکن میں نے اسے دل سے قبول نہیں کیا۔ اور میں قبول کروں گا بھی نہیں۔ اب سے کچھ دیر بعد یہاں سے چلا جاؤں گا“۔

”بہت خوب!“ میں نے طنزیہ انداز میں ہنستے ہوئے کہا۔

”چلو گے میرے ساتھ؟“

”نہیں دیکھوں گا کہ تم کس طرح باہر جاتے ہو“۔

”زندگی کی آرزو نہیں ہے؟“

”نہیں“۔

”اوہ..... پھر تمہاری بزدلی انتہا کو پہنچی ہوئی ہے۔ احمق نوجوان مجھے دیکھو میں بوڑھا ہوں، معذور ہوں لیکن میں زندہ رہنا چاہتا ہوں تُو اتنی چھوٹی سی عمر میں کیوں مرنا چاہتا ہے؟“

”میری ایک منطق ہے۔ میں مقصد کو زندگی سمجھتا ہوں اور جب مقصد پورا ہو جائے تو زندگی بے مقصد ہو جاتی ہے“۔

”تو تمہارا مقصد پورا ہو گیا؟“

”ہاں“۔

”لیکن نوجوان تم نے اتنی طویل زندگی کو صرف ایک مقصد کے قابل کیوں سمجھا۔ یہ تو خوش بختی ہے کہ انسان کو کچھ مقصد حاصل ہو جائے۔ تمہارے نظریے کے مطابق اگر تم زندگی کا سب سے بڑا مقصد حاصل کر چکے ہو اور اپنی دانست میں زندگی ختم کر چکے ہو تو پھر ان بقیہ سانسوں کو کسی اور صرف میں کیوں نہیں لگا دیتے۔ تمہیں کیا معلوم جس زندگی کو تم اس بے دردی سے ختم کرنے پر تلے ہوئے ہو ممکن ہے وہ کسی کے کام میں آ جائے۔ نہ جیو اپنے لیے، اپنے آپ کو کسی دوسرے کے حوالے کر دو، ممکن ہے، اس کی زندگی کو تمہاری زندگی کی ضرورت ہو“۔

بوڑھے کے الفاظ نے نہ جانے کیوں میرے ذہن میں ہلچل پیدا کر دی تھی۔ مجھے محسوس ہو رہا تھا جیسے واقعی میری سوچ غلط ہو، لیکن بڑے میاں بھی پاگل ہی معلوم ہو رہے تھے۔ زندگی صرف چند گھنٹوں کے لیے رہ گئی تھی۔ اور وہ نکل جانے کی باتیں کر رہے تھے۔ میں خاموشی سے ان کے بارے میں سوچتا رہا۔ وہ بھی خاموشی سے کچھ سوچ رہے تھے۔ پھر وہ بولے۔

”میرے خیال میں تم اپنے فیصلے پر نظرِ ثانی کر رہے ہو“۔

”تم نے میرا ذہن الجھا دیا ہے“۔ میں نے پریشان لہجے میں کہا۔

”ایسی کوئی بات نہیں ہے، میں تمہیں زندگی کی راہ پر لے جانا چاہتا ہوں تم نہ جانے کیوں موت کی وادیوں میں گم ہو جانا چاہتے ہو“۔

”اوہ..... تم میرے بارے میں کچھ نہیں جانتے، زندگی اور موت میرے لیے یکساں ہے غور تو کرو اس دنیا میں اربوں انسان ہیں۔ زمین کے ایک ایک حصے پر لاکھوں جاندار ہیں۔ ان میں رشتے ہیں، ناطے ہیں، محبتیں ہیں، اپنائیت ہے۔ میں نہیں کہتا کہ دنیا میں میرے جیسے نہ ہوں گے لیکن میں دعوے سے کہتا ہوں کہ انہیں میری مانند جینے کی خوشی نہ ہوگی۔ میری زندگی سے کسی کو کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ میں مر جاؤں گا تو کوئی آنسو نہیں بہائے گا۔ ایسے بے مقصد انسان کو کیوں جینا چاہیے؟“

”مرنا بھی نہیں چاہیے۔ تم اپنے لیے کیوں جیتے ہو۔ میں نے کہا ناں، تمہاری زندگی اگر کسی کے کام آ جائے تو یہ کتنی خوشی کی بات ہے“۔

”کیوں آ جائے جب کوئی مجھ سے ہمدردی نہیں رکھتا۔ ساری دنیا میرے لیے اجنبی ہے تو میں ان اجنبیوں سے محبت کیوں کروں۔ کیوں کسی کے لیے اپنی زندگی کو وقف کر دوں؟ ان سے انتقام لینے کا بہترین طریقہ یہی ہے کہ خود کو فنا کر دیا جائے“۔

تب بوڑھے کا ہاتھ میرے ہاتھ میں آ گیا۔ اس کے انداز میں بڑی محبت تھی۔ بڑی اپنائیت تھی۔

”ٹوٹے ہوئے معلوم ہوتے ہو، بڑی توڑ پھوڑ ہوئی ہے تمہاری شخصیت میں۔ نہ جانے کون سنگدل تھا جس نے تمہیں زندگی سے اتنی دور دھکیل دیا ہے۔ بہر حال میں چاہتا ہوں کہ تم زندہ رہو یوں سمجھو میں ایک خودغرض انسان ہوں اور اپنے لیے تمہاری زندگی چاہتا ہوں“۔

”لیکن میرے بزرگ! ہم دونوں سزائے موت کے مجرم ہیں۔ جیل کی کوٹھڑی میں ہیں اور تم اس طرح باتیں کر رہے ہو جیسے اپنی کوٹھی کے ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہو۔ یہاں سے نکلو گے کس طرح؟“

”بہت آسانی سے، بات یہ ہے کہ میں ابھی زندگی چاہتا ہوں۔ مین نے موت قبول نہیں کی اور جو موت قبول نہیں کرتے وہ موت سے جنگ کرنا بھی جانتے ہیں۔ ابھی تھوڑی دیر بعد میں زندگی کے لیے موت سے جنگ کروں گا۔ اگر اس جدوجہد میں مارا گیا تو سمجھ لوں گا کہ اس جنگ میں شکست ہوگئی ممکن ہے زندگی ہی کامیاب ہو جائے“۔

"اگر مجھے میری زندگی کا کوئی مصرف بتا دو تو میں تمہارا ساتھ دوں گا"۔

"مصرف ہے، اور ایسا ہے کہ تمہیں اس سے دلچسپی ہو جائے گی، لیکن یہاں سے نکلنے کے بعد بتاؤں گا"۔

"ہوں"۔ میں اس کی باتوں پر غور کرنے لگا۔ درحقیقت میں نے پہلے اس انداز میں نہیں سوچا تھا۔ ورنہ خود کو اس طرح بستی والوں کے سپرد نہ کرتا۔ اسی وقت اپنے بچاؤ کے لیے جدوجہد کرتا لیکن اب مجھے احساس ہو رہا تھا کہ زندگی واقعی ایسی بے حقیقت چیز نہیں ہے۔ زندگی کے بہت سے دَور ہوتے ہیں۔

"کیا سوچا؟"

"میں تیار ہوں"۔ میں نے جواب دیا اور بوڑھے نے مجھے ٹٹول کر سینے سے لگا لیا۔

"یقین کرو زندگی بہت خوبصورت ہوتی ہے بشرطیکہ اسے گزارنے کے گُر سیکھ لیے جائیں۔ میں اب بھی اور کبھی بھی تم سے یہ بات نہیں پوچھوں گا کہ تم یہاں تک کس طرح پہنچے لیکن اپنے بارے میں اتنا ضرور بتاؤں گا کہ میں جان بوجھ کر یہاں تک آیا ہوں"۔

"کیا مطلب"۔

"میں نے صرف چند روپوں کے لیے ایک شخص کو قتل کر دیا تھا۔ بھرے بازار میں تاکہ مجھے یہاں تک پہنچا دیا جائے۔ مجھے ان روپوں کی کوئی ضرورت نہیں تھی"۔

"اوہ"! میں نے حیرت سے کہا۔

"یہ حقیقت ہے میرے بچے میں تمہیں اس کا ثبوت دے دوں گا"۔

"لیکن آخر کیوں...... تم یہاں کیوں آنا چاہتے تھے؟"

"اس داستان کو ہم کسی اور وقت کے لیے اٹھا رکھتے ہیں۔ برسات کا موسم دُور ہے اور امن کا دَور ہے، ہم کچھ وقت سکون سے گزار سکتے ہیں"۔ بوڑھے کی گفتگو میری سمجھ نہیں آ رہی تھی لیکن بہرحال مجھے اس شخصیت سے دلچسپی محسوس ہوئی تھی اور میں اس کی باتوں میں بھی دلچسپی لے رہا تھا۔

"پھر اب کیا کیا جائے؟"

"کیا وقت ہوا ہوگا؟" بوڑھے نے پوچھا۔

"مجھے کوئی اندازہ نہیں ہے"۔

"اوہ...... کیا یہاں بہت تاریکی ہے؟"

"تمہیں کیا محسوس ہو رہا ہے؟" میں نے مضحکہ خیز انداز میں پوچھا۔

"مجھے!" بوڑھا چند ساعت کے لیے خاموش ہو گیا۔ پھر ایک گہری سانس لے کر بولا۔

"یا تو یہاں گہری تاریکی ہے، یا تم مذاق اُڑا رہے ہو"۔

"کیا مطلب؟" میں نے متحیرانہ انداز میں کہا۔

"میں اندھا ہوں"۔ بوڑھے نے جواب دیا۔ اور میرے ذہن کو ایک شدید جھٹکا لگا۔ اب تک کی گفتگو سے کہیں یہ احساس نہیں ہوا تھا کہ بوڑھا اندھا بھی ہے۔ میری خاموشی سے ہی بوڑھے نے اندازہ لگا لیا کہ میں ابھی اس بات سے لاعلم ہوں۔ چنانچہ اس نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

"مجھے یقین ہے اس وقت گہری تاریکی ہے اور تم میری صورت نہیں دیکھ پائے"۔

"ہاں یہ حقیقت ہے، لیکن محترم دوست کیا تمہاری ساری باتیں ناقابلِ فہم نہیں ہیں، تم اندھے بھی ہو، تم نے ایک قتل بھی کیا ہے اور تم یہاں سے نکل جانے کی باتیں بھی کرتے ہو"۔

"بلاشبہ تمہیں میری باتیں حیرت انگیز محسوس ہو رہی ہوں گی لیکن میرے پیارے بیٹے! کچھ عرصے کے لیے اپنے تجسس کی آنکھ کو بند کر لو اور صرف میری ہدایت پر عمل کرو۔ میرا خیال ہے بہت مختصر وقت میں تمہیں میرے بارے میں معلوم ہو جائے گا"۔ بوڑھے کے لہجے میں عاجزی تھی اور میں کسی سوچ میں گم ہو گیا تھا۔ اب تک میں نے صرف جذباتی انداز میں سوچا تھا۔ میں یہی سوچتا رہا تھا کہ مقصد کے حصول کے بعد زندگی ضروری نہیں ہوتی لیکن بوڑھے سے گفتگو کرنے کے بعد نہ جانے کہاں سے میرے ذہن میں بھی زندگی کی روشنی کی ایک کرن ابھر آئی تھی۔ اور میں زندہ رہنے کے بارے میں سوچنے لگا تھا۔ تب بوڑھے کی آواز ابھری۔

"کیا تیار ہو؟"

"ٹھیک ہے"۔ میں نے گہری سانس لی۔ "میں تیار ہوں"۔

"بہت خوب۔ مجھے خوشی ہے کہ میں نے تمہیں زندگی کی اہمیت سے آشنا کر دیا، بہت ہی مدہ۔ تو میرے بچے ہم اب سے چند منٹ کے بعد کام شروع کر دیں گے، ہاں تمہیں اس جیل لں کتنا عرصہ گزر گیا؟"

"تقریباً ڈیڑھ سال"۔ میں نے جواب دیا۔

"یقیناً تم اس کی پوری پوزیشن سے واقف ہو گے۔ کیا تمہیں اندازہ ہے کہ اس وقت تم جہاں موجود ہو، یہ جگہ جیل کی دیوار سے کتنی دور ہے؟ میں چاہتا ہوں کہ تم صرف ایک بار مجھے اس کا نقشہ سمجھا دو"۔ بوڑھے نے کہا اور میں اپنی یادداشت کے سہارے اسے صورتِ حال سمجھانے لگا۔ بوڑھا بہت غور سے سن رہا تھا۔ پھر اس نے غالباً گردن ہلائی۔

"ٹھیک ہے اس طرح معمولی چالاکی سے ہم جیل کی دیوار عبور کر سکتے ہیں بیٹے"۔

"لیکن اس آہنی کوٹھڑی سے کیسے نکلو گے؟"

"سنتری یہاں سے خاصی دور ہے اور تم بتا چکے ہو کہ کوٹھڑی کے پیچھے ایک ناکارہ گٹر موجود ہے جو کوڑا کرکٹ پھینکنے کے کام آتی ہے"۔

"ہاں!" میں نے جواب دیا۔

"تو پھر ممکن ہے ہم سنتری کو قتل کیے بغیر ہی دیوار تک پہنچ جائیں اور پھر باہر نکلنے کے لیے ہم گٹر لائن استعمال کریں گے۔ وہی گٹر لائن جو دیوار کے قریب سے شروع ہوتی ہے"۔

"لیکن چچا جان! اوّل تو اس کوٹھڑی کی موٹی سلاخیں اور پھر جس گٹر لائن سے آپ فرا کا پروگرام بنا رہے ہیں۔ اس کے اوپر بھی آہنی جنگلا زمین کی خاصی گہرائی میں نصب ہے وہاں سے فرار کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اس لیے اس طرف محافظ خاصی نگرانی بھی نہیں رکھتے"۔

"واہ......" بوڑھا خوش ہو کر بولا۔ "اور تم کہتے ہو کہ فرار کی کوئی گنجائش نہیں ہے؟ آؤ"۔ بوڑھا اُٹھ گیا اور پھر وہ ایک لمحے کے لیے رکا اور دوسرے لمحے کوٹھڑی کے آہنی جنگلے قریب پہنچ گیا۔ میں متحیرانہ انداز میں اس کے سائے کو دیکھتا رہا اور پھر میں بھی اس کے پیچھے جنگلے تک پہنچ گیا۔ تب میں نے محسوس کیا کہ کچھ ہو رہا ہے۔ تاریکی کی کسی حد تک عا آنکھوں نے اس کے چوڑے سائے کو محسوس کیا تھا اور پھر کچھ اور بھی محسوس ہوا اس کے بوڑھے کی طویل سانس ابھری۔

"آؤ" اس نے کہا اور میں نے محسوس کیا کہ وہ باہر نکل گیا۔ میں بھی متحیرانہ انداز جنگلے کو ٹٹولنے لگا اور پھر مجھے سلاخوں کے درمیان کافی چوڑا خلاء نظر آیا۔ اتنا چوڑا کہ میں آسانی اس سے نکل گیا۔ اب نہ جانے کیوں مجھے بوڑھے کی شخصیت پر کسی قدر اعتبار آ تھا۔ میں محسوس کر رہا تھا کہ شاید ہم فرار ہونے میں کامیاب ہو جائیں۔

"میرے پیچھے پیچھے چلے آؤ"۔ بوڑھے نے کہا اور وہ میری ڈھال بنا رہا۔ ایک بار پھر میرا ذہن ڈانواں ڈول ہونے لگا۔ بوڑھا جس انداز میں چل رہا تھا اس سے قطعی احساس نہیں ہوتا تھا کہ وہ اندھا ہے۔ محافظ اس کوٹھڑی سے کافی دور تھا۔ اس کے قدموں کی چاپ رات کی خاموشی میں صاف سنائی دے رہی تھی اور پھر وہ اس گٹر کے قریب رک گیا۔ جس کے بارے میں میں نے اسے بتایا تھا۔ وہ زمین پر بیٹھ گیا اور پھر اس نے مجھے سرگوشی میں پکارا۔

"سنو...... کیا یہی وہ جگہ ہے؟"

"ہاں" میں نے بے ساختہ کہا اور پھر خود ہی اپنی حماقت پر مسکرا دیا۔ بوڑھا مجھے بے وقوف بنا رہا تھا لیکن وہ خاموشی سے زمین پر ہاتھ پھیرنے لگا اور پھر اس نے گٹر کی سلاخیں پکڑ لیں۔

"تھوڑے سے پیچھے ہٹ جاؤ"۔ اس نے کہا اور میں نے اس کی ہدایت پر عمل کیا۔ میں پیچھے ہٹ گیا تھا۔ تب میں نے مٹی کا ایک تودہ زمین سے ہٹتے دیکھا۔ خوفناک بوڑھے نے گٹر کا ڈھکنا اٹھا لیا تھا۔ جو اپنے قرب و جوار کی مٹی اکھاڑ رہا تھا اور زمین میں ایک چوڑا سوراخ بن گیا، جس کے نیچے پانی بہنے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔

بوڑھے نے آواز پر کان لگا دیئے۔ پھر آہستہ سے بولا۔ "گہرائی آٹھ فٹ سے زیادہ نہیں ہے میرا خیال ہے ہم با آسانی نیچے کود سکتے ہیں اور یہ اچھی بات ہے کہ گٹر کافی کشادہ ہے۔ آؤ میری تقلید کرو"۔ اس نے کہا اور دوسرے لمحے غڑاپ سے اندر کود گیا۔ اب میں بھی اتنا بزدل نہیں تھا کہ سوچنے میں وقت گنواتا، یوں بھی مجھے زندگی سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ میں ہر وہ کام کر سکتا تھا جو دوسرے نہ کر سکیں۔

چھپاک سے میں غلیظ پانی میں جا پڑا، جس میں شدید تعفن تھا لیکن پانی ٹخنوں سے تھوڑا سا ہی اونچا تھا اور اس کا بہاؤ بہت آہستہ تھا۔

بوڑھا بھی میرے نزدیک ہی کھڑا تھا۔ پھر اس نے کہا۔ "ہمیں بہاؤ کی مخالف سمت چلنا چاہیے۔ ظاہر ہے پانی نشیب کی طرف بہتا ہے اور یہ نشیب کسی گندے نالے یا ندی میں ختم ہوتا ہوگا اس لیے اس طرف جانا خطرناک ہے"۔

"یقیناً"۔ میں نے تائید کی۔

"آؤ"۔ بوڑھے نے کہا اور ہم آگے بڑھنے لگے۔ پھر تھوڑی دور چلنے کے بعد بوڑھا بولا۔

"میرا خیال ہے تم آگے آ جاؤ"۔ کیونکہ تم آنکھیں رکھتے ہو۔ کسی بھی خطرے سے آگاہ کر سکتے ہو میرا خیال ہے یہاں بھی گہری تاریکی ہوگی؟"

"ہاں یہاں بھی گہری تاریکی ہے"۔ میں نے کہا۔ حالانکہ خود مجھے اپنی آواز عجیب سی محسوس ہو رہی تھی۔ میرے لہجے میں خود شکوک و شبہات تھے۔ میں اس کو اندھا کیونکر تسلیم کر لیتا۔ کس بناء پر کرتا۔ اس کی ساری حرکتیں آنکھوں والوں کی سی تھیں وہ اندھا کیسے ہو سکتا تھا۔

کشادہ گٹر میں جس قدر تعفن پھیلا ہوا تھا۔ اس کے پیشِ نظر بڑی مشکلات سے گزرنا پڑ رہا تھا، لیکن بہرحال ایک منزل تک تو پہنچنا ہی تھا۔ موت کے قریب جاتے جاتے جس طرح میں زندگی کے قریب لوٹ آیا تھا وہ بس انہونی ہی تھی۔

لیکن زندگی نے مجھے ایک اور موقع دیا تھا تو اب میں اس سے گریزاں نہ تھا۔ یوں ہم چلتے رہے..... چلتے رہے پھر ایک جگہ چھت میں روشنی نظر آئی تو میں نے بوڑھے کو اس سے آگاہ کر دیا۔

"اوہ میرا خیال ہے کہ ہم کافی دور نکل آئے ہیں اب اوپر نکل جانا نامناسب نہ ہوگا"۔ بوڑھے نے کہا۔

چھت کافی اونچی تھی، لیکن گٹر میں اترنے کے لیے لوہے کی سیڑھیاں تھیں چنانچہ میں نے پہلے بوڑھے کو ہی ان سیڑھیوں تک پہنچایا۔ کیونکہ ابھی صورتِ حال کا اندازہ کرنا تھا۔ وہ خود کو اندھا کہہ رہا تھا۔ اس لیے اس کا احساس تو رکھنا ہی تھا۔

چند سیکنڈ کے بعد بوڑھے نے میرا شکریہ ادا کیا اور پھر وہ انتہائی اطمینان سے سیڑھیاں چڑھتا ہوا اوپر پہنچ گیا اور مین ہول سے باہر نکل گیا۔

میں نے بھی اس کی تقلید کی۔ تھوڑی دیر کے بعد ہم دونوں اوپر تھے۔ پتلی سی ایک گلی تھی۔ بس دور دور پولز پر اسٹریٹ بلب لگے ہوئے تھے۔ کہیں کہیں لیمپ پوسٹ لگے ہوئے تھے۔ جن کی روشنی تھوڑے سے حصے کو منور کر رہی تھی۔ کافی تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ رات کیونکہ زیادہ گزر چکی تھی اس لیے جاگتے ہوئے لوگ نظر نہیں آ رہے تھے۔ شاید گلیوں کے کتے بھی سو گئے تھے۔

"کیا کیفیت ہے؟" بوڑھے نے پوچھا۔

"بالکل ٹھیک"۔ میں نے جواب دیا۔

"یوں لگتا ہے جیسے رات کا آخری پہر ہو۔ لوگ سوئے ہوں۔ خاموشی چھائی ہو"۔

"ہوں"۔ میں نے گردن ہلائی۔

"کیا تمہارے بدن پر بھی قیدیوں والا لباس ہے؟"

"ظاہر ہے"۔ میں ہنس پڑا۔

"ہاں واقعی یہ کچھ بے تکا سوال تھا، لیکن مسئلہ یہ ہے دوست کہ سب سے پہلے ہمیں اس لباس سے چھٹکارا حاصل کرنا ہے"۔

"لیکن کس طرح؟"

"چوری"۔ اس نے مسکراتے ہوئے مجھے دیکھا۔

"کیا مطلب؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں چوری۔ اس کے علاوہ تو اور کوئی ترکیب نہیں ہے"۔

"لیکن یہ ترکیب بے حد خطرناک ہوگی محترم بزرگ!"

"خطرناک، بھئی تم نے اس لفظ کی قیمت دوسری دے رکھی ہے ورنہ خطرات زندگی کے کس لمحے میں نہیں ہوتے۔ کون سا وقت ایسا ہوتا ہے جب ہم خطرات سے دور ہوں۔ ہم نہیں جانتے دوست کہ ہمارا آنے والا لمحہ کتنے خطرناک لمحات سے بھرپور ہوگا۔ مجھے بتاؤ کہ کیا سڑک پر چلتے وقت تمہیں یہ احساس نہیں ہو سکتا کہ کسی کار کا ٹائی راڈ ٹوٹے گا اور وہ تمہارے اوپر آ چڑھے گی۔ کیسے بچ سکتے ہو میرے بچے۔ خطرات تو ہر جگہ موجود ہیں۔ میرے دوست انہیں نظر انداز کرنا ہی بہتر ہوتا ہے"۔

"شاید تمہارا خیال ٹھیک ہے"۔ میں نے اس سے اتفاق کیا۔

بوڑھا دلچسپ انسان معلوم ہوتا تھا اور بہرحال اس کی باتیں حقیقت سے دور نہ تھیں۔ آہستہ آہستہ وہ مجھے پسند آتا جا رہا تھا۔

"لیکن اب مسئلہ یہ ہے کہ کیا اب ہم کسی مکان میں داخل ہوں؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں یہی بہتر ہے"۔

"تب ٹھیک ہے کسی بھی مکان کا انتخاب کر لیا جائے"۔

"لیکن اس سلسلے میں میں ناکارہ ثابت ہوؤں گا۔ سوائے اس کے کہ باہر کھڑا قدموں کی چاپ سنتا رہوں۔ میرے دوست تم کوشش کرو یہاں صرف تم کام کر سکتے ہو"۔

''ٹھیک ہے میں کوشش کرتا ہوں۔ تم اس جگہ کھڑے ہو جاؤ اور ہاں اگر کوئی خاص خطرہ محسوس کرو تو سیٹی بجا دینا''۔ میں نے کہا اور بوڑھے نے گردن ہلا دی۔

عجیب وغریب حالات تھے خطرناک تھے بھی اور نہیں بھی اب سے کچھ گھنٹے پہلے میرے ذہن میں تصور بھی نہ تھا کہ میں زندگی کے لیے کوئی جدوجہد کروں۔ لیکن اب...... اب میں مکمل طور سے زندہ رہنے کا خواہشمند تھا۔

مکان میں داخل ہونے کے بعد اور اپنی پسند کے لباس چرانے میں جو حالات پیش آئے ان میں کوئی ایسا واقعہ نہ تھا۔ جو خاص طور پر قابلِ ذکر ہو۔ بس ہوا یوں کہ کچھ کرنسی اور چند لباس جو میری دانست میں ہم دونوں کے بدن پر پورے آسکتے تھے، حاصل کر لیے گئے اور میں باہر نکل آیا۔

شاید قسمت ہی یاور تھی کہ ان حالات میں کوئی خاص واقعہ پیش نہیں آیا تھا۔ نہ کوئی ناخوشگوار بات ہوئی۔ بوڑھے کے نزدیک پہنچا تو اس نے بڑے تپاک سے میری طرف ہاتھ بڑھائے۔

''کیا کامیاب آئے ہو بچے؟'' اس نے پوچھا۔

اور ایک بار پھر میں حیران رہ گیا، اس کا یہ انداز ایسا نہیں تھا جس سے وہ اندھا معلوم ہوتا، تاہم میں نے جواب دیا۔

''ہاں! کام بن گیا''۔

''بہت خوب''۔ اس نے مسکراتے ہوئے کہا اور پھر ہم ایک دیوار کی سمت بڑھ گئے۔

سب سے پہلے میں نے اور پھر بوڑھے نے اپنا لباس تبدیل کر لیا۔ جیل کے کپڑے ہم نے وہیں ایک طرف گٹھڑی بنا کر ڈال دیئے تھے۔ یہ لباس جو میں نے پہنا تھا۔ وہ تو میرے بدن پر فٹ تھا لیکن بوڑھے کی جسامت اچھی خاصی تھی اس بنا پر لباس اسے کچھ تنگ تھا۔ تاہم کام چل سکتا تھا۔ میں نے کرنسی احتیاط سے جیب میں رکھی اور ہم وہاں سے آگے بڑھ گئے۔

''اب کیا خیال ہے''۔ بوڑھے نے پوچھا۔

''یہ تو تم ہی بتا سکو گے، میرے ذہن میں کوئی خیال نہیں ہے''۔ میں نے جواب دیا۔

اس وقت ہم ایک لیمپ پوسٹ کے نیچے سے گزر رہے تھے۔ میں نے بوڑھے کے چہرے پر نگاہیں دوڑائیں۔ پہلی بار میں نے اس کے چہرے کو بغور دیکھا تھا اور ایک بار پھر

مجھے ذہنی جھٹکا لگا۔ میرے خیال کے مطابق بوڑھا اندھا ہونے کا فریب کر رہا ہے ورنہ اس میں کوئی بات بھی اندھوں جیسی نہیں تھی لیکن اب میں نے اس کی آنکھیں دیکھیں تو مجھے احساس ہوا کہ روشنی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس کی آنکھوں میں دو گڑھے تھے۔ جن میں کچھ نہ تھا۔ یقیناً وہ اندھا تھا۔

لیکن ایک اندھا اس قدر تیز حسیات کا مالک یہ بات متحیر کن تھی۔

''تمہارا نام کیا ہے نوجوان؟'' بوڑھے نے پوچھا۔

''آصف خان''۔ اور بوڑھا گردن ہلانے لگا تب میں نے سوچا کہ میں بھی کیوں نہ بوڑھے کا نام پوچھ لوں۔

''اور تمہارا......؟''

''میرا نام؟'' بوڑھا چند لمحات کے لیے رُکا پھر بولا۔ ''پروفیسر ضرغام''۔

''اب ہم کہاں چلیں؟'' چند منٹ کے بعد میں نے پوچھا۔

''آصف!'' بوڑھے نے مجھے پکارا۔

''ہاں!'' میں نے اس کی طرف دیکھا۔

''مجھے ایک بات بتاؤ، اگر تمہیں زندگی مل جاتی تو تم کہاں صرف کرتے؟'' بوڑھے نے پوچھا۔

''یہ بات مجھ سے بار بار کیوں پوچھتے ہو؟ میں بتا چکا ہوں کہ پوری دنیا میں میرے باپ کے سوا میرا کوئی نہ تھا۔ اور وہ مر چکا ہے اس کی موت کے بعد میں نے بھی مرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اور تم نے دیکھا کہ میں موت کے کتنا نزدیک تھا۔ اب تم مجھے زندگی کے قریب لے آئے ہو۔ تو مجھ سے ایسی باتیں مت کرو۔ میرا کوئی نہیں ہے میں کہیں نہیں جانا چاہتا''۔

''اوہ میرے بچے آصف! میں تمہارے زخموں کو نہیں کریدنا چاہتا تھا۔ میں تو صرف تم سے یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ تمہارے دل میں کوئی خاص خواہش تو نہیں ہے، اگر نہیں ہے تو میں تمہیں دعوت دیتا ہوں کہ تم میرے ساتھ چلو؟''

''کہاں جاؤ گے؟''

''راج پور!'' بوڑھے نے جواب دیا۔

''کیا مطلب؟''

”ہاں میں اسی طرف کا رہنے والا ہوں“۔

”اوہ، ٹھیک ہے۔ ظاہر ہے جب میرا اس دنیا میں ٹھکانہ ہی نہیں تھا تو پھر کہیں بھی چلو“۔

”تب پھر ہمیں اسی وقت اسٹیشن چلنا چاہیے“۔

”چلو“۔ میں نے لاپرواہی سے کہا۔ اور ہم دونوں اسٹیشن کی طرف چل پڑے۔ لباس تو بدلے ہوئے تھے۔ اس لیے کسی نے خصوصی طور پر ہماری طرف توجہ نہیں دی اور ہم اسٹیشن پہنچ گئے۔ ریلوے ٹائم ٹیبل میں ہم نے راج پور کے لیے ٹرین کا ٹائم دیکھا اور اتفاق ہی کی بات تھی کہ اب سے پون گھنٹے بعد ایک ٹرین راج پور سے گزرنی تھی۔ ہم نے فوراً ٹکٹ خرید لیے اور پلیٹ فارم پر ٹہل ٹہل کر وقت گزارنے لگے۔ رات کا چونکہ آخری پہر تھا۔ اس لیے پلیٹ فارم پر مسافر اِکا دُکا ہی تھے۔ چند دکانیں کھلی ہوئی تھیں۔ ہم دونوں ایک چائے خانے میں پہنچ گئے۔

ہم نے چائے طلب کی اور دونوں چائے پینے بیٹھ گئے۔ بوڑھا پروفیسر ضرغام خاموش تھا۔ ویسے اس کے نام پر میں جب بھی غور کرتا مجھے عجیب سا لگتا نہ جانے یہ کیسا نام تھا ویسے تو یہ بوڑھا خود بھی پُراسرار تھا۔ اس کی کون کون سی بات پر غور کرتا۔ بہرحال مجھ جیسے انسان کو ان ساری باتوں کی کیا پرواہ ہوسکتی تھی۔

پون گھنٹہ گزر گیا اور ہماری مطلوبہ ٹرین آ گئی۔ کافی مسافر نیچے اترے ہم دونوں کو بڑی اچھی جگہ مل گئی تھی۔ بوڑھا ضرغام ٹرین میں بھی آنکھوں والوں کی طرح ہی چڑھا تھا۔ اس کے انداز میں ذرا بھی جھجک نہیں تھی۔ البتہ سیٹ پر بیٹھنے میں اس نے میری مدد طلب کی تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد ٹرین روانہ ہوگئی۔ ضرغام بالکل خاموش تھا اور جب یہ خاموشی طویل ہونے لگی تو میں نے ہی اسے مخاطب کیا۔

”کیا بات ہے تم ضرورت سے زیادہ خاموش ہو“۔

”کچھ سوچ رہا تھا۔ تم ہی گفتگو شروع کرو“۔ ضرغام نے جواب دیا۔

”کیا گفتگو کروں، تم بتاؤ کیا سوچ رہے تھے؟“

”اوہ...... میری بات مت کرو، میرا ذہن خیالات کا دفینہ ہے بس نہ جانے کیا کیا سوچتا رہتا ہوں“۔

”دراصل ہم لوگوں کے درمیان ایک معاہدہ ہوگیا ہے، یعنی ایک دوسرے کا ماضی نہیں

کریدیں گے ورنہ یہ حقیقت ہے کہ تمہاری پچھلی زندگی بے شمار واقعات سے پُر ہوگی اور یقیناً وہ واقعات میرے لیے بہت دلچسپ ہوتے۔ لیکن خیر...... ہم دوسری گفتگو بھی کر سکتے ہیں“۔

”یہی مناسب ہے میرے دوست، ماضی کریدنے سے کچھ نہیں ملتا میں تم سے پہلے بھی کہہ چکا ہوں“۔

”ٹھیک ہے لیکن اب تم راج پور پہنچ کر کیا کرو گے؟“

”تمہیں اپنی قدیم رہائش گاہ دکھاؤں گا۔ بڑی انوکھی جگہ ہے تم اسے دیکھ کر یقیناً حیران ہو گے“۔

”کیا خاص بات ہے اس میں؟“

”بس دیکھو گے تو اندازہ ہوگا“۔

”چلو ٹھیک ہے اس کی بات اس وقت تک گئی، تمہارے عزیز واقارب تو ہوں گے؟“

”تم خوش ہو جاؤ بیٹے کہ اتفاق سے میرا بھی اس دنیا میں کوئی نہیں“۔

”اس میں خوشی کی کیا بات ہے؟“

”ہاں یہ بھی ٹھیک ہے“۔ بوڑھے نے رواداری سے کہا۔

”اچھا یہ بتاؤ کہ کیا تم پیدائشی اندھے ہو؟“

”نہیں“ بوڑھے کی آواز میں اچانک تلخی سی آ گئی۔ ”میں پیدائشی اندھا نہیں ہوں لیکن آنکھیں کھوئے ہوئے مجھے دو سال سے زیادہ نہیں گزرے۔ میرے دشمن نے میری آنکھیں نکال لی ہیں“۔

”ارے!“ میں چونک پڑا۔ ”کون تھا وہ دشمن؟“

”تھا نہیں...... تھی۔ بلکہ ہے“۔

”اوہو...... کوئی عورت تھی“۔

”ہاں عورت نہیں ناگن، ایک خوفناک ناگن!“ بوڑھا نفرت زدہ آواز میں بولا۔

”کیا دشمنی تھی اس سے؟“

”ابھی نہیں بتاؤں گا۔ دوست اس کے لیے کچھ انتظار کرو“۔

”اچھا تمہاری مرضی لیکن ایک بات پر مجھے حیرت ہے، وہ یہ کہ تم کسی طور اندھے معلوم نہیں ہوتے۔ تمہاری تمام حرکات آنکھوں والوں سی ہیں۔ جیل کی چار دیواری میں تم نے جس

انداز میں راستہ تلاش کیا تھا۔ وہ میرے لیے بڑی حیرت انگیز بات تھی“۔

”ہاں۔ انسان جب کسی حس سے محروم ہو جاتا ہے۔ تو اس حس کی کمی دوسری چند خصوصیات کر دیتی ہیں۔ میرا ذہن میری آنکھیں ہیں۔ میرے کان میری آنکھیں ہیں۔ تم نے جیل کے راستوں کا جو نقشہ کھینچا تھا۔ میرے ذہن کی آنکھوں نے اسے پہچانا اور میری رہنمائی کی۔ اس طرح اس کے مطابق چلتا رہا۔ میرے کان ضرورت سے زیادہ حساس ہیں۔ میں ہوا کی سرسراہٹ سے بہت سی باتوں کا پتہ چلا لیتا ہوں۔ میں قدموں کی چاپ سے انسان کی پوری شخصیت پہچان لیتا ہوں اور بھی بہت سی خصوصیات ہیں مجھ میں۔ جو تم پر آہستہ آہستہ کھل جائیں گیں۔ انتظار کرو“۔

”ٹھیک ہے“۔ میں نے گہری سانس لے کر کہا اور پھر میں راستے بھر پروفیسر کی پُراسرار شخصیت کا جائزہ لیتا رہا۔ میرے ذہن کی چولیں ہل گئی تھیں۔ ہر قدم پر یہ شخص نئے انداز میں نمودار ہوتا تھا۔ بالآخر وہ پہاڑی اسٹیشن جس کا نام راج پور تھا، آ گیا۔ میں نے تو اس وقت اسٹیشن کا بورڈ بھی نہیں دیکھا تھا لیکن بوڑھا پروفیسر ضرغام اُونگھ رہا تھا۔ اور اچانک اونگھتے اونگھتے چونک پڑا۔ اس نے چہرہ اٹھا کر فضاء میں کچھ سونگھا اور پھر مجھے ٹٹولنے لگا۔

”کیا تم سو رہے ہو آصف! اگر سو رہے ہو تو جاگو ہماری منزل آ گئی ہے“۔

”میں جاگ رہا ہوں پروفیسر، لیکن تم نے کیسے اندازہ لگا لیا کہ آنے والا اسٹیشن راج پور ہے؟“ اور میری اس بات پر بوڑھے کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

”یہ نہ پوچھو یہ سب کچھ نہ پوچھو اپنی زمین کی خوشبو روئیں روئیں میں بسی ہوتی ہے بشرطیکہ تمہارے دل میں وطن کی سچی محبت ہو۔ یہ ہوائیں مجھے میری سرزمین کی آمد کا پیغام دے رہی ہیں“۔ اس نے جواب دیا اور درحقیقت آنے والا اسٹیشن راج پور ہی تھا۔

ہم دونوں ٹرین سے نیچے اتر گئے، بوڑھا اس انداز میں آگے بڑھ رہا تھا کہ جیسے سارے اس کے جانے پہچانے ہوں۔ میں اس کا ساتھ دے رہا تھا۔ اسٹیشن سے نکل کر ہم بستی میں داخل ہو گئے۔ اچھی خاصی پکی آبادی تھی۔ جھٹپٹا وقت تھا۔ سورج ڈوبنے کو تھا۔ زندگی کی گھما گھمی ماند نہیں پڑی تھی۔ لوگ اپنے کاموں میں مصروف تھے۔

بوڑھا پروفیسر چند ساعت چلتے چلتے رک جاتا اور پھر چلنے لگتا۔ ایک جگہ رک کر اس نے کہا۔

”اپنے بائیں سمت دیکھو آصف! کیا تمہیں سُرخ رنگ کا ایک مینار نظر آ رہا ہے؟“

”ہاں۔ مینار موجود ہے“۔ میں نے بائیں سمت دیکھتے ہوئے کہا۔

”اندازاً کتنے فاصلے پر ہوگا؟“

”تقریباً سو گز پر ہے“۔

”ہوں“۔ بوڑھے نے گردن ہلائی اور پھر تقریباً پچیس تیس قدم چلنے کے بعد وہ دائیں سمت مڑ گیا۔ اس طرف ایک پتلی سی گلی تھی۔ جو کافی طویل معلوم ہوتی تھی۔ گلی کے آخری سرے پر بستی کا آخری مکان تھا۔ اس کے بعد کھیتوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا تھا۔ جو حدِ نگاہ پھیلا ہوا تھا۔ ہم کھیتوں کے درمیان ایک پگڈنڈی پر ہو لیے۔ بوڑھا پروفیسر خاموشی سے آگے بڑھتا جا رہا تھا اور اس کے چہرے پر عجیب سے تاثرات تھے۔ سورج ڈوب گیا تھا۔ اب کھیتوں پر تاریکی کی دبیز چادر پھیلتی جا رہی تھی۔ چلتے چلتے میں تنگ آ گیا۔ میں نے بوڑھے سے پوچھا۔

”تم نے کہا تھا کہ یہی بستی تمہاری بستی ہے؟“

”ایں؟“ بوڑھا چونک پڑا۔ ”کیا کہا تم نے؟“

”میں کہہ رہا تھا کہ تم تو دیکھ نہیں سکتے، اپنے ذہن کی آنکھوں سے دیکھو کہ سورج چھپ چکا ہے اور تاریکی پھیلتی جا رہی ہے۔ اور ہم طویل و عریض کھیتوں کے درمیان چلے جا رہے ہیں۔ بستی کا آخری مکان بھی نگاہوں سے اوجھل ہو چکا ہے۔ آخر ہم کہاں جا رہے ہیں؟“

”اوہ...... بس تھوڑی دور اور ان کھیتوں کے اختتام پر جنگلات کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ بس وہیں ہماری قیام گاہ ہوگی“۔

”جنگلوں میں؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔

”ہاں، میں کسی قدر تنہائی پسند بھی ہوں۔ اور پھر ایک طویل عرصے تک میں اپنی قیام گاہ سے دور رہا ہوں۔ بہرحال اب ہمیں زیادہ نہیں چلنا پڑے گا“۔

کھیتوں کے اختتام تک چلتے چلتے رات ہو چکی تھی۔ جنگلات کا سلسلہ گہری تاریکی میں لپٹ گیا تھا۔ مجھے تھوڑے فاصلے کی چیز بھی نظر نہیں آ رہی تھی، لیکن ساعت کی بینائی سے مرضع ضرغام اس وقت حیرت انگیز ثابت ہو رہا تھا۔ وہ اچھی خاصی رفتار سے چل رہا تھا۔ اس نے میرا ہاتھ پکڑا ہوا تھا اور سچ مچ میں اس عمارت کو نہیں دیکھ سکا۔ جس کے دروازے پر اس نے مجھے لا کھڑا کیا تھا۔ پتہ تو اس وقت چلا جب دروازہ کھلنے کی آواز سنائی دی۔ ایسا ہی محسوس ہوا

تھا۔ جیسے کسی پرانی عمارت کا دروازہ طویل عرصے کے بعد کھلا ہو۔ چُوں چرا کی آواز بند ہو گئی۔ اور پھر پروفیسر ضرغام کی آواز سنائی دی۔

''کیا تم خوفزدہ ہو؟''

بُوڑھے کی بات مجھے پسند نہیں آئی تھی۔ اس لیے میں نے اس کا جواب نہیں دیا۔ اس نے چونک کر میرے ہاتھ کو ٹٹولا اور پھر اسے پکڑ کر بولا۔

''غیر معمولی طور پر تم خاموش ہو کیا بات ہے؟''

''کچھ نہیں تم بار بار احمقانہ گفتگو کرنے لگتے ہو۔ بھلا میں دنیا کی کس چیز سے خوفزدہ ہو سکتا ہوں''۔ میں نے ناگواری سے کہا۔

''اوہ...... مجھے افسوس ہے کہ میں نے غلط جملے استعمال کیے ہیں۔ مگر تمہاری خاموشی کیا معنی رکھتی ہے؟''

''بس میں حیران ہوں۔ میں اس عمارت کو نہیں دیکھ سکا تھا''۔ میں نے جواب دیا اور ضرغام نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔

''کافی تاریکی ہے شاید''۔

''ہاں'' میں نے گہری سانس لے کر کہا۔

''میرا ہاتھ پکڑ کر چلتے رہو۔ آؤ''۔ اس نے کہا۔ اور میں اس کے ساتھ چل پڑا اندازہ نہیں ہو رہا تھا کہ یہ کیسی عمارت ہے۔ مجھے تو اس کے در و دیوار تک نظر نہیں آ رہے تھے لیکن اندھا ضرغام با آسانی موڑ مڑ رہا تھا۔ ویسے کافی وسیع عمارت معلوم ہوتی تھی۔ کیونکہ اندر داخل ہونے کے بعد بھی کافی دیر تک چلنا پڑا۔

پھر بوڑھا رکا اور اس نے کمرے کا دروازہ کھولا۔ میں ایک گہری سانس لے کر اس کے ساتھ دوسرے کمرے میں داخل ہو گیا تھا لیکن تاریکی کے سوا کچھ نہیں تھا۔ کمرے میں سیلن کی بو بالکل نہیں محسوس ہوئی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ کشادہ اور ہوادار ہے اور کسی طرف سے اس میں ہوا آتی ہے۔

''ٹھہرو میں تمہارے لیے روشنی کر دوں۔ میں نے لفظ تمہارے لیے، ٹھیک استعمال کیا ہے ظاہر ہے میرے لیے روشنی اور تاریکی یکساں ہے؛ ہے نا؟'' اس نے کہا۔ میں نے اس وقت بھی خاموشی مناسب سمجھی تھی لیکن تھوڑی دیر کے بعد کمرے میں ایک شمعدان روشن ہو گیا۔

پہلے ایک شمع جلی تھی اور اس کے بعد متعدد۔ خاصی روشنی ہو گئی تھی۔

''ٹھیک ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''ہاں''۔ میں نے آہستہ سے جواب دیا۔ میں کمرے کی آرائش دیکھ رہا تھا۔ چاروں طرف انتہائی نفیس پُرانے طرز کا فرنیچر موجود تھا۔ فرش پر سرخ رنگ کا ایک دبیز قالین بچھا ہوا تھا۔ ایک طرف حسین مسہری بھی تھی۔ غرض ہر لحاظ سے اسے ایک قیمتی کمرہ کہا جا سکتا تھا۔ جس سے بوڑھے کے ذوق کا پتہ چلتا تھا۔

''یہ عمارت تمہاری ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں آبائی پشتوں کی''۔ اس نے جواب دیا۔

''لیکن کیا یہاں تمہارے سوا اور کوئی جواب نہیں ہے؟''

''ہے''۔ اس نے کہا۔

''کون ہے؟''

''میرے دو ملازم''۔

''اوہ...... مگر عمارت تو ویرانے میں ہے، یہاں وہ لوگ کس طرح رہتے ہوں گے؟''

''وہ بھی میری طرح سکون پسند ہیں۔ اس لیے انہیں یہاں رہنے پر کوئی اعتراض نہیں ہے''۔ ضرغام نے مسکراتے ہوئے کہا اور میں نے گردن ہلا دی۔ ''یہ سکون کی جگہ ہے، مجھے خوشی ہے کہ ہم نہایت کامیابی سے یہاں تک آ پہنچے اب یہاں ہمیں کوئی خطرہ نہیں ہے، اول تو پولیس جیل سے مفرور قیدیوں کو تلاش کرتی یہاں تک نہیں پہنچ سکتی اور اگر پہنچ بھی گئی تو اسے اس ویران عمارت میں کچھ نہیں ملے گا۔ یہاں داخل ہونے والے باہر کے لوگ یہاں کچھ نہیں تلاش کر سکتے''۔

''ہاں یہ جگہ مجھے ایسی ہی لگتی ہے''۔ میں نے جواب دیا۔

''تم بھوکے ہو گے۔ میں تمہارے لیے کھانے کا بندوبست کرتا ہوں مجھے بے حد مسرت ہے کہ تم بے جگر انسان ہو اور خوفزدہ ہونے والوں میں سے نہیں ہو، یہاں تمہیں جو کچھ نظر آئے۔ اس سے متاثر ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ کیونکہ یہاں سب ہمارا اپنا ہے''۔

''ٹھیک ہے بڑے میاں، آپ میرے لیے پریشان نہ ہوں''۔ میں نے جواب دیا اور پُراسرار بوڑھا مسکراتا ہوا باہر نکل گیا۔ اس کے جانے کے بعد میں ایک آرام کرسی میں دراز ہو

گیا۔ درحقیقت میں بہت خوفزدہ نہیں تھا اور میری اس کیفیت کا جواز یہ ہے کہ میں نے طویل عرصہ موت کے تصور میں گزارا تھا۔ خوف کی بنیادی وجہ تکلیف، آزار یا موت ہوتی ہے۔ یعنی موت اس سلسلے میں آخری اسٹیج ہوتا ہے اور میں اسی اسٹیج میں تھا۔

ایک جذباتی مقصد کے تحت میں نے موت اپنا لی تھی۔ اور مجھے زندگی سے دلچسپی ہوتی تو اوّل تو میں اپنے باپ کی موت کا انتقام لینے کے لیے اتنا بھیانک کھیل ہی نہیں کھیلتا۔ یا پھر انتقام لینے کے بعد وہاں سے فرار ہونے کی کوشش کرتا، لیکن میں نے خوشی سے خود کو موت کے حوالے کر دیا تھا۔ گویا مجھے اب زندگی کی ضرورت نہیں تھی۔ اور اب میں سُپر مین بننے کی کوشش نہیں کروں گا۔ جب مجھے سزائے موت سنائی گئی تو میں نے موت کے بارے میں سوچا ضرور تھا لیکن وہی عزم وہی استقلال برقرار رہا تھا۔ یعنی میں نے اپنی زندگی کی حدیں اپنے مقصد سے منسلک کر دی تھیں۔ اس لیے مجھے موت سے ڈر نہیں لگا تھا۔

نہ جانے کیوں اس بوڑھے کی باتوں نے مجھے اس قدر جلدی متاثر کر لیا تھا۔ اور اب میں زندگی کی طرف آ کر بھی میں پشیمان نہیں تھا، لیکن اب مجھے زندگی سے دلچسپی محسوس ہونے لگی تھی، لیکن عام انسانوں سے زیادہ بے جگر تھا۔ میں اس ماحول سے قطعی خوفزدہ نہیں تھا۔ ہاں اس کے بارے میں سوچ ضرور رہا تھا اور اس سوچ کی وجہ قدرتی تھی۔

بوڑھا بے حد پُراسرار تھا۔ وہ آنکھوں سے اندھا تھا۔ اگر اس کی آنکھیں موجود ہوتیں اور صرف بینائی کے جانے کی بات کرتا تو شاید ذہن تسلیم نہ کرتا۔ میں سوچتا کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے۔ لیکن آنکھوں کی جگہ دو غار اس کی سچائی کا ثبوت تھے۔ اور پھر اس کی بے پناہ صلاحیتیں جو شاید آنکھوں والوں کو بھی نصیب نہیں تھیں۔ حیرت انگیز بات تھی پھر اس عمارت کا ماحول لیکن وہ مجھے یہاں لایا کیوں ہے اور اب اس عمارت میں آ کر میں کیا کروں گا۔

نہ جانے ان سوچوں میں کس قدر وقت گزر گیا۔ پھر دروازے پر ہلکی سی آہٹ سن کر ہی میں چونکا تھا۔ دروازہ کھل رہا تھا۔ اور پھر بوڑھے کے بجائے ایک اور شخص اندر آ گیا۔ اس کے ہاتھوں میں کھانے کی ٹرے تھی۔ جو اس نے انتہائی تہذیب سے ایک میز پر رکھ دی اور پھر پانی کا جگ درست کرنے لگا۔

لیکن جب وہ پانی وغیرہ رکھ کر سیدھا ہوا تو میں بُری طرح چونک پڑا۔ آہ...... اس کی دونوں آنکھیں غائب تھیں اور ان کی جگہ دو گہرے غار تھے۔ سیاہ گہرے غار...... میں ششدر

رہ گیا۔ اپنی جگہ سے اُٹھ کر اُس کے قریب پہنچ گیا۔

میں نے صاف محسوس کیا تھا کہ اُس نے دور ہی سے اپنے قریب میری موجودگی کو بخوبی محسوس کر لیا تھا۔ پھر وہ نرم آواز میں بولا۔

''کھانا کھا لیجیے جناب!''

''اوہ ہاں ٹھیک ہے۔ سنو! کیا تم اندھے ہو؟'' میں نے پوچھا لیکن وہ اس طرح واپس مڑ گیا جیسے اندھا ہی نہ ہو، بہرا بھی ہو اور دروازے سے باہر نکل گیا۔ میں نے طویل سانس لے کر شانے ہلائے اور پھر کھانے کی طرف متوجہ ہو گیا۔ جہنم میں جائے سب کچھ۔ خواہ یہ اندھوں کی نگری ہو یا بہروں کی میں جیل سے باہر نکل آیا ہوں اور اب زندگی کی طرف چل پڑا ہوں۔ یہ زندگی میری اپنی ہے۔ بوڑھا ضرغام بے شک مجھے جیل سے نکالنے میں میرا معاون ہے۔ میرا مددگار ہے لیکن اب میری زندگی میری اپنی ہے، میں اس کا پابند نہیں ہوں جب تک دل چاہے گا۔ یہاں رہوں گا اور دل چاہے گا تو یہاں سے نکل جاؤں گا۔

میں نے ڈٹ کر کھانا کھایا۔ بہت عمدہ کھانا تھا اور پھر میں برتن ایک طرف سرکا کر ملحقہ باتھ روم میں گیا۔ دانت وغیرہ صاف کیے، شیو کافی دن سے نہیں بنا تھا، وہ بنایا۔

بہرحال اس وقت میں نے اس کمرے سے نکلنا مناسب نہیں سمجھا۔ جاتا بھی کہاں، چنانچہ مسہری پر لیٹ گیا اور سونے کی کوشش کرنے لگا۔ عرصہ کے بعد احساس ہو رہا تھا کہ جیل کی بجائے گھر میں ہوں۔ اب وہ گھر کسی کا بھی ہو، زمین پر ٹاٹ بچھا کر سوتے ہوئے نہ جانے کتنا وقت گزر چکا تھا۔ آرام دہ مسہری عجیب سی لگی اور نیند تو جیسے تُلی بیٹھی تھی گہری نیند سو گیا اور دوسرے دن صبح کو ہی اُٹھا۔

ناشتا بوڑھے پروفیسر نے میرے ساتھ ہی کیا تھا اور ناشتہ کے لیے ہم جس کمرے میں گئے وہ بھی باقاعدہ ڈرائنگ روم تھا۔ جس میں اخروٹ کی کی منقش میز اور ایسی ہی کرسیوں کا سیٹ تھا۔ برتن بھی نہایت قیمتی تھے۔ بوڑھا خاصا صاحبِ حیثیت تھا۔ ناشتے سے فارغ ہونے کے بعد میں نے کہا۔

''پروفیسر ضرغام، میں اعتراف کرتا ہوں کہ یہاں کے حالات دیکھ کر تمہاری شخصیت کو محسوس کر کے تجسس اس قدر بڑھ گیا ہے کہ میں تمہارے بارے میں جاننے کے لیے بے چین ہو گیا ہوں۔ کیوں نہ ایسا کیا جائے کہ ہم دونوں اپنا عہد توڑ دیں۔ تم مجھے اپنے بارے میں بتاؤ

اور میں تمہیں اپنے بارے میں''۔

میری بات سن کر بوڑھے کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

''اس کے بجائے ہم کیوں نہ کام کی باتیں کریں''۔ اس نے کہا۔

''لیکن میرا تجسس؟''

''تمہیں کوئی تکلیف تو نہیں ہے؟''

''نہیں لیکن میں تمہارے اندھے ملازم کے بارے میں جاننا چاہتا ہوں''۔

''اس...... کیا جاننا چاہتے ہو اِس کے بارے میں؟''

''کیا تمہارا دوسرا ملازم بھی اندھا ہے؟''

''ہاں''۔

''واقعی''۔ میں اچھل پڑا۔

''ہاں میں غلط نہیں کہہ رہا''۔

''لیکن معاف کرنا یہ اندھوں کی ٹیم تم نے کیوں جمع کی ہے؟''

''اسے میرا کمپلیکس سمجھ لو۔ میں خود اندھا ہوں اس لیے میں چاہتا ہوں کہ میرے ساتھی بھی اندھے ہوں''۔ بوڑھے نے مسکرا کر جواب دیا۔

''لیکن تم خصوصی حسیات کے مالک ہو۔ کیا یہ ملازم بھی تمہاری طرح ہیں''۔

''ہاں...... یہ پوری عمارت کی نگرانی کرتے ہیں، باورچی خانے میں کھانا پکاتے ہیں کمروں کی صفائی کرتے ہیں۔ کوئی کام ایسا نہیں جو نہ کرسکیں''۔

''لیکن پھر وہی سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر ایسا کیوں ہے اور تم کہہ چکے ہو کہ تم پیدائشی اندھے نہیں ہو''۔

''ہاں میں نے غلط نہیں کہا۔ خیر چھوڑو ان باتوں کو آؤ میں تمہیں یہ عمارت دکھاؤں''۔ ناشتے کی میز سے بوڑھا اُٹھ گیا۔ اس نے میرا یہ سوال بھی تشنہ چھوڑ دیا تھا۔ میں اس کے ساتھ اٹھ گیا اور پھر اس نے مجھے یہ کھنڈر نما عمارت دکھائی۔ درحقیقت تاحدِ نگاہ ویران جنگلوں کے علاوہ کچھ نہ تھا۔ اِس کھنڈر کی موجودگی بھی حیرت انگیز تھی۔ نہ جانے آبادی سے دور یہ عمارت کس لیے بنائی گئی تھی۔ بوڑھا ایک ایک جگہ کے بارے میں مجھے بتاتا رہا اور پھر واپس اپنے کمرے میں آ گیا۔

''بیٹھو''۔ اس نے ایک طویل سانس لے کر خود بھی بیٹھتے ہوئے کہا۔ اور میں کرسی پر بیٹھ گیا۔ میں گہری نگاہوں سے اس کا جائزہ لیتا رہا تھا اور بوڑھا کسی سوچ میں گم تھا۔ کافی دیر خاموشی سے گزر گئی۔

''میرا خیال ہے کہ تم خصوصی طور سے مجھے اپنے بارے میں بتانا نہیں چاہتے''۔

''نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ میں بہت جلد اپنے بارے میں سب کچھ بتا دوں گا...... بہت جلد''۔ اس نے پُرخیال انداز میں کہا۔ اور میں خاموش ہو کر کچھ سوچنے لگا۔ میں سوچ رہا تھا کہ اگر وہ اپنے بارے میں چھپانا چاہتا ہے تو مجھے بھی اتنی کرید نہیں ہے۔ میرا کیا ہے جب دل چاہے گا یہاں سے چلا جاؤں گا۔ کسی کی مجال ہے کہ مجھے روک سکے۔ اس کے بعد میں نے اس بوڑھے سے کوئی بات نہیں کی۔ وہ بھی تھوڑی دیر تک خاموش رہا پھر ایک گہری سانس لے کر اٹھتے ہوئے کہا۔

''اچھا تم آرام کرو میں چلتا ہوں اور ہاں ذہن میں کسی وسوسے کو جگہ دینے کی ضرورت نہیں ہے۔ میرے ساتھ رہ کر تمہیں کوئی تکلیف نہیں ہوگی''۔

''تم بالکل فکر مت کرو۔ میں نے دوبارہ زندگی قبول کر لی ہے، اور اب میں اس کے ساتھ پورا پورا انصاف کروں گا''۔

''یقیناً...... یقیناً''۔ اس نے مسکراتے ہوئے کہا اور دروازے سے باہر نکل گیا۔ میں اب یہاں سے کسی حد تک اکتاہٹ محسوس کرنے لگا تھا اور...... دوسرے انداز میں سوچ رہا تھا۔ کیوں نہ راہِ فرار اختیار کی جائے۔ جو فاصلہ طے کر کے میں یہاں پہنچا تھا اسی سے واپس بھی جا سکتا تھا۔ کون روکنے والا تھا، تھوڑی دیر اور سہی''۔

اور پھر میں مسہری کی طرف بڑھ گیا۔ لیٹ گیا اور اس کے علاوہ اور کام بھی کیا تھا لیکن اب کیا کرنا چاہیے؟ یہاں سے کہاں جاؤں، کس طرح زندگی بسر کروں۔ ظاہر ہے پولیس میرا تعاقب کرے گی۔ دس آدمیوں کا قاتل تھا اور سزائے موت کا مجرم، مہذب دنیا میں پتہ نہیں میرے خلاف کیا کیا کارروائیاں ہو رہی ہوں لیکن جب زندگی سے ہاتھ ہی دھو لیے تھے جب اپنے آپ کو مُردہ ہی تصور کر لیا تھا۔ تو اب زندہ رہنے کے لیے خوف بے معنی تھا۔ آنکھ مچولی میں کوئی حرج نہیں تھا زندہ بچ گیا تو ٹھیک ہے اور پولیس کی گولی دل میں اتر گئی تو بہرحال موت تو آنی ہے لیکن اب اس بوڑھے سے کچھ گھن سی محسوس ہونے لگی تھی اونہہ، اس بور ماحول

میں زندہ رہنا ہی بے مقصد ہے۔ جب زندگی کا کوئی تصور ہی نہیں تو پھر کیوں نہ چند سانسیں، زندگی سے بھرپور ماحول میں گزاری جائیں۔

میں نے دل میں فیصلہ کرلیا کہ بہت جلد یہاں سے چلا جاؤں گا۔

دوپہر آئی اور پھر شام ہوگئی۔ رات کے کھانے پر بھی بوڑھا میرے ساتھ تھا۔ کوئی خاص گفتگو نہیں ہوئی اور مجھے کھانے کے بعد آرام کی تلقین کر کے چلا گیا۔ میں بھی بے زار کمرے میں واپس آگیا۔ اب تو بالکل ہی دل اکتا گیا تھا۔ میں نے سونے کی کوشش کی اور ذہن نیم غنودہ ہوگیا۔ کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر دیا گیا تھا۔

اچانک مجھے محسوس ہوا جیسے اس کمرے میں میرے علاوہ بھی کوئی موجود ہے۔ اس کا احساس گہرے گہرے سانسوں سے ہوا تھا۔ اور وہ سانسوں کی آواز اتنی تیز تھی جیسے خراٹے لیے جا رہے ہوں۔ پہلے تو میں نے سمجھا کہ شاید میری سماعت کا دھوکہ ہو لیکن سانس اتنے تیز تھے کہ ذہن کی غنودگی دور ہوگئی اور میں آنکھیں کھول کر چاروں طرف دیکھنے لگا لیکن شمعدان کی روشنی میں کوئی نظر نہیں آیا۔

پھر یہ آواز کہاں سے آ رہی ہے۔ پورے طور سے غور کیا تو احساس ہوا کہ مسہری کے نیچے سے تیز سانسوں کی آوازیں آ رہی ہیں۔ میں اچھل کر نیچے کود آیا۔ یہ تو حیرت انگیز بات تھی۔ بھلا یہاں کون ہوسکتا تھا۔ بے ساختہ میں نیچے جھکا اور پھر اچھل کر پیچھے ہٹ گیا۔ یقیناً کوئی موجود تھا۔ دو پاؤں سامنے ہی نظر آ رہے تھے۔ چونکہ شمعدان کی روشنی مسہری کے اس رخ پر نہیں آ رہی اس لیے یہ اندازہ نہیں ہو سکا کہ یہ پاؤں بوڑھے ضرغام کے ہیں یا اس کے نوکر کے۔ بہرحال میں نے کوئی تکلف نہیں کیا اور اطمینان سے دونوں پاؤں پکڑ لیے اور زور سے باہر گھسیٹ لیا اس کے ساتھ ہی ایک نسوانی چیخ کمرے میں گونج اٹھی چیخ کے ساتھ ہی میں نے گھبرا کر پاؤں چھوڑ دیئے اور اچھل کر پیچھے ہٹ گیا۔

لیکن جس طاقت سے میں نے اسے گھسیٹا تھا۔ اس سے وہ پوری باہر نکل آئی تھی اور اب کمرے میں ایک حسین اور نوجوان دوشیزہ کو دیکھ کر میری آنکھیں متحیرانہ انداز میں پھیل گئیں، جو کچھ ہو رہا تھا ناقابلِ یقین تھا۔ کیونکہ اب تک میں نے بوڑھے ضرغام کو دیکھا تھا۔ یا اس کے دونوں اندھے ملازموں کو اب تک نہ تو کسی سے کسی لڑکی کے بارے میں سنا تھا نہ ہی ایسے آثار نظر آئے تھے لیکن یہ اچانک لڑکی کہاں سے ٹپک پڑی۔

وہ متحیرانہ انداز میں پلکیں جھپکا رہی تھی۔ جیسے سونے سے جاگنے والے وقتی طور پر خالی الذہن ہوتے ہیں۔ اس کے چہرے کی تراش عجیب تھی۔ عمر کا کوئی تعین نہیں کیا جاسکتا تھا۔ ایک نگاہ میں محسوس ہوتا تھا کہ وہ ایک سادہ سی لڑکی ہے لیکن بغور دیکھنے سے چہرے پہ بے حد متانت کی نظر آتی تھی۔ ہونٹوں کی تراش میں ایک نمایاں خصوصیت تھی۔ اس کے بدن پر سیاہ چست پتلون اور سفید مردانہ قمیض تھی۔ بالوں کا اسٹائل کافی خوبصورت تھا اور اس کا پلکیں جھپکانے کا انداز۔

پھر یوں محسوس ہوا جیسے وہ ہواس کی دنیا میں واپس آ گئی ہو۔ اس نے دونوں کہنیاں زمین پر ٹکائیں اور بدن کو تھوڑا سا اٹھایا اور پھر ایک بے تعلق سی کراہ کے ساتھ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس نے زور سے آنکھیں بند کر کے گردن جھٹکی اور میری طرف دیکھنے لگی۔

''کب آئے تم؟'' اس نے سوالیہ انداز میں پوچھا جیسے برسوں کی شناسا ہو۔

''کیا مطلب، کون ہو تم؟'' میں نے متحیرانہ انداز میں پوچھا۔

''شرمین!'' اس نے لاپرواہی سے جواب دیا۔

''بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر لیکن آپ کون ہیں اور کہاں سے نازل ہوئی ہیں؟''

''اس مسہری کے نیچے سے''۔

''سبحان اللہ! کیا ابھی ابھی پیدا ہوئی ہیں؟''

''نہیں میری عمر تو بائیس سال ہے''۔

''تو اے بائیس سالہ حسینہ! اب اپنی شانِ نزول بھی بتا دے''۔

''کیسی باتیں کر رہے ہو تم، پورے چار گھنٹے سے تمہارا انتظار کر رہی ہوں۔ گوفی اور چمبا یقیناً مجھے تلاش کر رہے ہوں گے۔ بلکہ شاید مایوس بھی ہو چکے ہوں۔ بس میں چھپ کر آئی اور سیدھی مسہری کے نیچے آ گھسی۔ پتہ نہیں کس وقت نیند آ گئی تمہارا انتظار کرتے کرتے''۔

''اوہ.....'' میں نے پریشانی سے گردن ہلائی۔ نہ جانے اس بھوت خانے میں کیا کیا تھا۔ اب اس لڑکی سے کیا کہا جائے اور جو کچھ وہ کہہ رہی ہے اسے کیا سمجھا جائے۔ پتہ نہیں کون ہے اور اس عمارت میں کہاں سے آ گئی۔ ضرغام سے اس کا کیا تعلق ہے۔ بہت سے سوالات میرے ذہن میں مچل رہے تھے۔ چند ساعت میں اس کی شکل دیکھتا رہا۔ پھر نہ جانے کیوں اسے سہارا دینے کے لیے ہاتھ آگے بڑھا دیا۔ سہارا قبول کرلیا گیا۔ اس کا نازک ہاتھ میرے ہاتھ میں آ گیا۔ تب وہ اٹھ گئی اور شکریہ کہہ کر ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔

''خدا کے لیے اب تو بتا دو کہ کون ہو تم؟''

''ارے تم یہ نہیں جانتے؟''

''جی نہیں''۔

''کہہ تو چکی ہوں شرمین ہوں اور تمہیں ایک اہم اطلاع دینے آئی ہوں''۔

''اچھا تو فرمایئے''۔ میں نے نچلا ہونٹ دانتوں میں دبا کر کہا۔

''بھاگ جاؤ فوراً...... بھاگ جاؤ میں اس کے علاوہ کچھ نہیں کہوں گی''۔

''کیوں خیریت، یہاں میری موجودگی تم کو گراں گزر رہی ہے''۔ میں نے طنزیہ انداز میں پوچھا۔''اور اگر تم شرمین ہو تو شرمین ہوتی کیا چیز ہے؟''

''بس......بس رہنے دو، میں سمجھ گئی کہ تم میری بات کو اہمیت نہیں دے رہے۔ بھگتو گے خود۔ میں نے دوستانہ طور پر تمہیں سمجھا دیا ہے اور اس کے لیے میں چار گھنٹے سے تمہارا انتظار کر رہی تھی''۔

لڑکی کے انداز میں ایک عجیب سی کیفیت جھلک رہی تھی۔ جیسے وہ صحیح الدماغ نہ ہو۔ میں غور سے اسے دیکھتا رہا اور پھر میں نے اس کے قریب پہنچ کر پوچھا۔

''ضرغام سے تمہارا کیا رشتہ ہے؟''

''موت کا رشتہ ہے۔ مارے جاؤ گے تم کتے کی موت اور پھر یاد کرو گے کہ میں نے کیا کہا تھا۔ بس اس سے زیادہ میں کچھ نہیں کہوں گی۔ ارے مجھے تو ایسا ہی لگ رہا ہے جیسے تمہارے لیے وقت ضائع کیا ہو''۔ وہ جھلائے ہوئے انداز میں بولی اور پھر کرسی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

''ارے نہیں......نہیں بیٹھو۔ تم تو مجھے بہت اچھی لڑکی معلوم ہوتی ہو''۔ میں نے آگے بڑھ کر اس کے دونوں شانوں پر ہاتھ رکھ دیئے اور اس نے ایک جھٹکے سے شانے چھڑا لیے۔

''بولو جاؤ گے یا نہیں؟'' اس نے پوچھا۔

''تم یہیں رہتی ہو؟''

''ہاں''۔

''تب تو مجھے یہاں سے نہیں جانا چاہیے'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''میں کہتی ہوں فضول باتیں مت کرو۔ اور......اور......''۔

اچانک اس کے حلق سے چیخ نکل گئی۔ دروازہ بہت زور سے کھلا تھا۔ سب سے آگے ضرغام تھا اور اس کے پیچھے دونوں ملازم اندر گھس آئے تھے۔ تینوں کے چہرے پر خوفناک تاثرات تھے۔ ضرغام منہ اٹھا کر کتے کی طرح سونگھنے لگا اور پھر غرائی ہوئی آواز میں بولا۔

''ہوں، تو تم یہاں موجود ہو''۔

''مم...... میں تو ابھی آئی تھی''۔ لڑکی نے خوفزدہ لہجے میں کہا اور اس کی آنکھوں سے خوف ٹپکنے لگا۔

''چلو چمبا اسے یہاں سے لے جاؤ'' اور دونوں ملازم آگے بڑھے اور لڑکی کو بازوؤں سے پکڑا اور اسے خاصی بے دردی سے گھسیٹتے ہوئے لے گئے۔ لڑکی نے منہ سے آواز نہیں نکالی تھی۔ ضرغام کے چہرے پر بلا کی سنجیدگی طاری تھی۔ چند ساعت وہ سوچتا رہا اور پھر اس کے ہونٹوں پر مصنوعی مسکراہٹ پھیل گئی۔

''کیا بکواس کر رہی تھی، یہ بے وقوف لڑکی؟'' اس نے آہستہ سے پوچھا۔

''جو کچھ بھی کہہ رہی تھی اس سے تمہیں کوئی سروکار نہیں ہونا چاہیے میں تمہیں کچھ نہیں بتاؤں گا، کیونکہ تم نے مجھے یہاں کے بارے میں کچھ بھی نہیں بتایا''۔ میں نے بگڑے ہوئے لہجے میں کہا۔

''آصف تم بہت بے صبرے انسان معلوم ہوتے ہو، میں نے تم سے کہا تھا کہ میں تمہیں سب کچھ بتا دوں گا لیکن نہ جانے کیوں تمہیں اس سلسلے میں اتنی جلدی ہے۔ بہرحال اس کے بارے میں سنو، وہ میری بیٹی ہے شرمین، اس کا دماغ الٹ چکا ہے مکمل طور پر...... یہ پاگل ہو چکی ہے اس کی کسی بات پر بھروسہ نہیں کیا جاسکتا۔ اب بتاؤ وہ کیا کہہ رہی تھی تم سے؟''

''بس میرا خیال ہے عقل کی بات نہیں کی تھی۔ کہہ رہی تھی یہاں سے بھاگ جاؤ ورنہ مصیبت میں گرفتار ہو جاؤ گے۔ بس اس کے علاوہ کچھ نہیں کہا تھا اس نے''۔ میں نے کہا اور یوں محسوس ہوا جیسے بوڑھے نے اطمینان کی سانس لی ہو۔ پھر وہ غمزدہ انداز میں بولا۔

''میری زندگی کا سب سے بڑا المیہ یہ بچی ہے۔ اس کی ماں اس کی پیدائش کے وقت ہی مرگئی تھی اور اس کے بعد میں نے ہی اسے پرورش کیا۔ بے حد حساس ہے ذرا ذرا سی بات کو ذہن سے چپکا لیتی ہے اور بالآخر یہی بات اس کے ذہنی انتشار کا باعث بنی ہے۔ اب وہ صحیح الدماغ نہیں ہے۔ اس کی غیر موجودگی سے ہم بہت پریشان ہو گئے تھے۔ بہرحال شکر ہے کہ

وہ تمہارے کمرے میں مل گئی اور ہمیں اس کی تلاش میں جنگلوں کا رخ نہ کرنا پڑا۔ میرا خیال ہے تمہیں نیند آ رہی ہوگی آرام کرو۔ احمق لڑکی نے تمہیں پریشان کیا''۔

بوڑھا اٹھنے لگا لیکن میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے روک دیا۔

''بیٹھو ضرغام، مجھے ابھی نیند نہیں آ رہی تم مجھے اس لڑکی کے بارے میں کچھ اور بتاؤ''۔

''صبح کو سہی آصف میں خود بھی تھکن محسوس کر رہا ہوں''۔ ضرغام نے اکتائے ہوئے انداز میں کہا۔

''تمہاری مرضی ضرغام ویسے میں محسوس کر رہا ہوں کہ تم مجھ سے بہت سی باتیں چھپا رہے ہو، اور مجھے اپنے بارے میں کچھ نہیں بتانا چاہتے۔ بہرحال تم میرے محسن ہو، تم نے مجھے جیل سے فرار ہونے میں مدد دی ہے۔ میں تمہیں کسی سلسلے میں مجبور نہیں کرسکتا۔ اگر تم اپنے بارے میں نہیں بتانا چاہتے تو نہ بتاؤ بلکہ سچ کہو اگر تمہیں میری یہاں موجودگی ناگوار گزر رہی ہے تو میں یہاں سے چلا جاؤں ہم دونوں ایک دوسرے کو دوست کی حیثیت سے یاد رکھیں گے''۔

''غلط فہمی کا شکار نہ ہو آصف، ایک رات کی مہلت اور دے دو کل صبح تمہیں سب کچھ معلوم ہو جائے گا۔ کوئی بھی بات تم سے پوشیدہ نہیں رہے گی۔ میں وعدہ کرتا ہوں تمہیں سب کچھ بتا دوں گا۔ بس اب مجھے اجازت دو''۔ وہ مزید کچھ کہے بغیر اٹھ گیا اور تیز تیز قدموں سے نکل گیا۔ میرا ذہن الجھنوں کا شکار ہو گیا تھا۔

اس کے جانے کے بعد کافی دیر تک سوچتا رہا اور پھر ٹھنڈی سانس لے کر مسہری پر آ گرا...... لعنت ہے، اس پاگل خانے پر بوڑھا ضرغام کچھ بتائے یا نہ بتائے، میں کل یہ کھنڈر چھوڑ دوں گا، بعد میں جس انداز میں بھی زندگی گزارنی پڑے...... اور یہ فیصلہ کرنے کے بعد خاصی سکون کی نیند آئی تھی۔ ساری رات شاید کروٹ بھی نہیں بدلی۔

دوسری صبح آنکھ کھلی تو ذہن پر بڑا خوش گوار تاثر تھا۔ بدن ہلکا پھلکا محسوس ہو رہا تھا۔ انگڑائی لینے کی کوشش کی تو پتہ چلا کہ دونوں ہاتھ بندھے ہوئے ہیں اور میں بری طرح اچھل پڑا۔ کیونکہ اب محسوس ہوا کہ نہ صرف ہاتھ بندھے ہوئے ہیں بلکہ بدن پر جگہ جگہ ایسی بندشیں ہیں جو بظاہر محسوس نہیں ہوتیں لیکن ہلنے جلنے کی کوشش کی جائے تو اسے ناکام بنا سکتی ہیں۔

میرا منہ حیرت سے کھل گیا۔ یہ کیا ہو گیا تھا، کس نے باندھ دیا تھا مجھے اور کیوں؟ میں نے گردن گھمانے کی کوشش کی لیکن اس میں بھی ناکام رہا۔ سر کے دونوں طرف بھی ایسی

رکاوٹیں کر دی گئی تھیں کہ گردن نہ ہلائی جا سکے۔ میں نے چھت کی طرف دیکھا اور صاف اندازہ ہو گیا کہ میں اس کمرے میں نہیں ہوں جس میں پچھلی رات سویا تھا۔ لیکن میں یہاں کیسے آ گیا اور یہ کون سی جگہ ہے، مجھے یہاں لانے والا کون ہے؟ عجیب سی بے بسی محسوس ہونے لگی تھی۔

اور پھر اسی وقت ضرغام کی کریہہ آواز کانوں میں گونجی۔

''کیا محسوس کر رہے ہو؟''

میں چونک پڑا لیکن گردن گھما کر ضرغام کو نہیں دیکھ سکا تھا اور اسی وقت ضرغام کا چہرہ میرے چہرے کے مقابل آ گیا۔ اس کے ہونٹوں پر شیطانی مسکراہٹ تھی۔ اس وقت اس کے چہرے میں تبدیلی تھی۔ جو بڑے بڑے شیشوں والی عینک سے ہوئی تھی۔ جو اس کی منحوس آنکھوں پر چڑھی ہوئی تھی۔

''کیا تمہیں اپنے بدن میں ایک خصوصی توانائی محسوس ہو رہی ہے؟''

اس نے پھر پوچھا۔

''یہ سب...... کیا ہے؟''

میں نے غصیلے انداز میں پوچھا۔

''میری بات کا جواب دو''۔

''بکواس مت کرو، مجھے بتاؤ تم نے مجھے کیوں باندھ دیا ہے؟''

میں نے غراتے ہوئے پوچھا۔

''اوہ...... تم بضد تھے نا کہ تمہیں سارے حالات سے آگاہ کر دیا جائے''۔

بوڑھے نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''لیکن تم نے مجھے باندھ کیوں دیا ہے اور...... اور مجھے میرے کمرے سے کیسے لایا گیا؟''

''بیہوش کر کے، بہرحال تمہیں یہاں آنا ہی تھا''۔

''یہ کون سی جگہ ہے؟''

''اسی عمارت کا تہہ خانہ، لیکن میں نے اس میں ترمیمیں کرائی ہیں، یہ میری لیبارٹری ہے''۔

''لیبارٹری؟''

میں نے متحیرانہ انداز میں پوچھا۔

''ہاں لیبارٹری''۔

بوڑھے نے ایک گہری سانس لی۔ ’’بہت کم لوگ ڈاکٹر ضرغام کو جانتے ہیں‘‘۔

’’ڈاکٹر ضرغام؟‘‘

میں نے تعجب سے کہا۔

’’ہاں ڈاکٹر ضرغام، آنکھوں کا ماہر۔ میں نے آنکھوں کی متعدد بیماریوں کے علاج دریافت کیے ہیں لیکن بہت سے لوگوں کو میرے طریق کار سے اختلاف تھا۔ میری لیبارٹری پر کئی بار چھاپے مارے گئے اور مجھے کبھی سکون سے کام نہیں کرنے دیا گیا‘‘۔

’’مگر تم...... تم نے میرے ساتھ یہ سلوک کیوں کیا ہے؟‘‘

’’یہ بھی معلوم ہو جائے گا۔ میرے بارے میں پوری تفصیل سنو، یہ تو تمہاری سب سے بڑی خواہش تھی۔ ہاں تو میں بتا رہا تھا کہ میں نے آنکھوں کی متعدد بیماریوں کے علاج دریافت کیے اور انہیں عام کر دیا۔ یہ جو آنکھیں بدلنے کے آپریشن عام ہو گئے ہیں، یقین کرو ان کا بنیادی تصور میں نے ہی دیا تھا لیکن ہر تعمیر کے لیے پہلے قربانیاں دینا ہوتی ہیں۔ آنکھوں کے مؤثر علاج کے لیے مجھے انسانی آنکھوں کی ضرورت ہوتی تھی۔ چھوٹی چھوٹی بیماریوں کے لیے میں نے مردہ انسانوں کی آنکھیں خریدنا شروع کر دیں۔ عام طور سے لاوارث مرنے والوں کی آنکھیں مل جایا کرتی تھیں لیکن موت کے بعد بینائی پر جو جھلی چڑھ جاتی تھی وہ میرے اس منصوبے کے لیے ناکارہ تھی۔ جس پر میں نے سوچا تھا کہ اس پر عمل کرنے کے لیے زندہ انسانوں کی آنکھوں کی ضرورت تھی۔ میں نے بے اندازہ دولت خرچ کر کے بھی انسانی آنکھیں حاصل کرنے کی کوشش کی لیکن یہ ممکن نہ ہو سکا۔ دوسری طرف میں اپنے تجربے کے لیے پاگل تھا اور اسی جنون کے عالم میں، میں نے ایک زندہ انسان کی آنکھیں نکال لیں لیکن عجب قانون ہے۔ عجیب لوگ ہیں۔ میری کوششوں سے بے شمار ایسے انسانوں کی آنکھوں کی روشنی واپس آئی جو اندھے ہو چکے تھے۔ مجھے کچھ نہیں ملا لیکن میں نے انہی کے فائدے کے لیے صرف ایک انسان کی آنکھیں ضائع کر دیں اور پھر دنیا میری دشمن ہو گئی اور میری زندگی دوبھر کر دی گئی۔ بالآخر مجھے اس دنیا کو خیر باد کہنا پڑا۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ اس کے بعد میں لوگوں کی فلاح کے لیے یہ کام کرنا بند کر دیتا...... میں کوئی قلاش انسان نہیں ہوں۔ ساری زندگی عیش و عشرت سے بسر کر سکتا ہوں لیکن تم جانو، شوق کا نشہ اتنا ہلکا نہیں ہوتا کہ آسانی سے زائل ہو جائے۔ میں اپنے تجربات کو اس حد تک وسعت دینا چاہتا تھا کہ میں کسی ایسے انسان کو بینائی دے سکوں، جو

پیدائشی طور پر اندھا ہو، اس کی آنکھوں کی شریانیں تک نہ ہوں۔ جس طرح پلاسٹک کے دوسرے اعضاء بنا لیے گئے ہیں جن میں ہاتھ پاؤں یہاں تک کہ نازک ترین اعضاء یعنی دل، گردے، پھیپھڑے وغیرہ شامل ہیں اور وہ انسانی زندگی کے تار قائم رکھنے میں مددگار ہوتے ہیں، اسی طرح مصنوعی آنکھیں بنانا چاہتا تھا تاکہ ہم ان آنکھوں کے محتاج نہ رہیں جو عطیہ کے طور پر دی جاتی ہیں لیکن یہ دنیا والے کسی اچھے کام کی اس وقت تو تعریف کر دیتے ہیں جب وہ ہو چکے۔ اگر اس کی تکمیل کے مراحل میں ان کی مرضی کے خلاف کچھ ہو تو اسے قطعی طور پر برداشت نہیں کرتے۔ ہم لوگ بہت سے مسائل میں اس لیے مایوس ہو جاتے ہیں کہ ہمیں تعاون نہیں ملتا...... لیکن میرا نظریہ مختلف ہے، میں سوچتا ہوں کہ ٹھیک ہے، دنیا سے اجازت لینے کی کیا ضرورت ہے جو کرنا ہے کر ڈالو۔ چنانچہ میں نے آبادیوں کی گھما گھمی سے دور ان کھنڈرات کا انتخاب کیا اور یہاں اپنی تجربہ گاہ قائم کی۔ مجھے زیادہ معاونوں کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ چنانچہ میں نے اپنے طور پر کام شروع کر دیا۔ میرے ساتھ میری بچی شرمین بھی تھی۔ یہی میری معاون، یہی میری اسسٹنٹ، جو بھی سمجھو، میں نے اپنا کام شروع کر دیا لیکن مسئلہ وہی تھا۔ یعنی انسانی آنکھوں کی ضرورت...... بالآخر میں نے ایسے دو انسانوں کا انتخاب کیا جو دنیا کی سرد مہری سے تنگ آئے ہوئے تھے، معاشی مسائل نے انہیں خودکشی کی منزل تک لا پھینکا تھا، وہ مر جانا چاہتے تھے۔ تب میں نے ان سے سودا کیا۔ میں نے ان سے ان کی آنکھیں خرید لیں۔ بھاری رقم کے عوض۔ اس دولت نے ان کے بچوں کو اچھا مستقبل فراہم کر دیا اور میں نے ان کی زندگی بھی نہ برباد ہونے دی۔ میں نے انہیں اپنے پاس بلا لیا اور وہ دونوں میرے معاون ہیں۔ تم سمجھ گئے ہو گے یعنی گونی اور چمبا اور اس کے بعد مسٹر آصف، اس کے بعد میں نے اپنی آنکھیں بھی تجربے کی نذر کر دیں۔ میں اپنے کام میں اس سے زیادہ مخلص نہیں ہو سکتا تھا۔

’’مجھے بتاؤ! فلاحِ انسانیت کے لیے اس سے بڑی قربانی اور کیا دی جا سکتی تھی کہ میں نے اپنی کائنات تاریک کر لی۔ اب بھی لوگ میرے خلوص پر شک کریں تو میں کیا کر سکتا ہوں۔ اس کے لیے مجھے کسی چیز کی ضرورت پیش آئے تو میں کیا کروں۔ سوائے اس کے کہ جائز ذریعوں کی تلاش میں وقت ضائع نہ کروں اور یہی ہوا تھا۔ میں نے شہر جا کر ایک انسان کو قتل کر دیا اور پھر اس کی آنکھیں نکالی تھیں لیکن اس جرم میں، میں پکڑا گیا۔ دنیا کو تو میں نے اصلیت

کی کوئی ہوا نہ لگنے دی، ہاں مجھے سزائے موت ضرور سنا دی گئی نکلنا تو تھا ہی۔ میں نے سوچا کہ کوئی ساتھی بھی مل جائے، سو میں نے تمہارا انتخاب کیا اور تمہیں یہاں لے آیا۔ اب دیکھو نا۔ میرے دو...... دو کام ہو گئے۔ ایک ساتھی بھی مل گیا اور اپنے تجربے کے لیے دو آنکھیں بھی''۔

''کیا مطلب؟'' میں پھر اچھل پڑا۔

''انسانیت کی فلاح کے لیے میرے دوست!''

''کیا بکواس ہے''۔

میرے بدن میں خوف کی لہریں دوڑ گئیں۔

''تھوڑی سی فراخ دلی سے کام لو۔ غور تو کرو۔ اگر تمہاری آنکھیں میرے تجربے کا آخری مرحلہ پورا کر سکیں تو اس سے سیکڑوں ایسے لوگوں کو روشنی مل جائے گی جنہوں نے کبھی یہ دنیا نہیں دیکھی، جنہوں نے کبھی باغوں میں کھلتے ہوئے پھولوں کے رنگ نہیں دیکھے، جنہوں نے کبھی معصوم بچوں کی مسکراہٹیں نہیں دیکھیں۔ کائنات کی سب سے انمول چیز بینائی جس سے وہ محروم ہیں۔ تمہاری آنکھیں ان کے درد کا درماں بن جائیں تو اس سے بڑی نیکی اور کیا ہو سکتی ہے۔

''نہیں نہیں، میں تمہاری بات نہیں مان سکتا''۔

''کیوں آخر کیوں؟ تم سزائے موت کے مجرم تھے۔ تم تو موت اپنا چکے تھے۔ پھر اگر میں تمہاری زندگی میں تھوڑا سا خلا پیدا کر رہا ہوں تو تم اس سے اس قدر منحرف کیوں ہو رہے ہو، خود کو اس تجربے کے لیے وقف کر دو۔ وعدہ کرتا ہوں کہ اگر کامیاب ہو گیا تو تعاون کرنے والوں میں تمہارے نام کو نظر انداز نہیں کروں گا۔ تم بھی انسانوں کے محسن کہلاؤ گے''۔

''لیکن آنکھوں کے بغیر زندگی کا تصور بے حد بھیانک ہے''۔

''تم ہمیشہ اندھے نہیں رہو گے۔ دوست، تمہاری بینائی واپس مل جائے گی۔ تم نے دیکھا کہ میں خود بھی اسی کیفیت میں ہوں۔ ہمارا تجربہ ہماری آنکھوں کے دو گڑھوں کو پُر کر دے گا''۔

بوڑھے کی آواز میری سماعت پر ہتھوڑے برسا رہی تھی لیکن اس کے ساتھ ہی میں متحیر بھی تھا۔ بھلا یہ اندھا بوڑھا یہ تجربات کیسے کر رہا ہے اس نے اپنی آنکھیں بھی داؤ پر لگا دی ہیں۔ کیسی انوکھی بات ہے۔

''تم نے اب تک ایک دلیر انسان ہونے کا ثبوت دیا ہے۔ آصف! میں چاہتا ہوں تم

اب بھی اسی انداز سے پیش آؤ اور خوشی خوشی اپنی آنکھوں کا عطیہ پیش کر دو۔ تم یہاں رہو گے میں وعدہ کرتا ہوں کہ تم تینوں کو سب سے پہلے آنکھیں واپس کروں گا''۔

میں اس کی بات پر غور کرنے لگا۔ سب کچھ بے حد عجیب تھا۔ آنکھیں کھونے کا تصور بڑا ہی اذیت ناک تھا۔ بھلا آنکھوں کے بغیر بھی زندگی کو زندگی کہا جا سکتا ہے۔ بوڑھا پاگل کیا ضروری ہے کہ اپنے تجربات میں کامیاب رہے۔ وہ دونوں بے چارے اندھے جو زندگی گزار رہے تھے وہ افسوسناک تھی۔ نہ جانے انہیں کب تک انتظار کرنا پڑے اور بوڑھا کامیاب ہو یا نہ ہو۔

''تم نے کیا سوچا؟''

بوڑھے کی آواز ابھری۔

''کیا تم مجھے سوچنے کا موقع دو گے؟''

''فیصلے لمحوں میں کیے جانے چاہئیں۔ ان کے لیے وقت درکار نہیں ہوتا''۔

''لیکن یہ فیصلہ......'' میں نے خوفزدہ آواز میں کہا۔

''آصف خان! میں نے تمہیں جس انداز میں پایا تھا، اس کے لیے میں نے سوچا تھا کہ تم جیسا دلیر انسان زندگی کی کوئی پرواہ نہیں کرے گا کیوں نہ تم خود کو مُردہ ہی تصور کرو''۔

''تب میں تمہیں رائے دیتا ہوں میرے دوست کہ پہلے مجھے ختم کر دو اور اس کے بعد میری آنکھیں نکال لو''۔

''نہیں تم اس قدر مایوس نہ ہو۔ ایک وعدہ تم سے کرتا ہوں کہ جب تک تم دنیا دیکھنا چاہو گے دیکھ سکو گے۔ وقتی طور پر سہی، مصنوعی طور پر سہی''۔

''میں نہیں سمجھا''۔

میں نے کہا۔

''سمجھنے کی کوشش بھی نہ کرو''۔

''لیکن تم مجھے تھوڑا سا وقت تو دو، تم نے مجھے باندھ کیوں دیا ہے؟''

''نہیں آصف! میں اپنی سانسوں کے بارے میں بھی کیا کہہ سکتا ہوں۔ موت کا تو کوئی تعین نہیں ہوتا۔ پھر ہم انتظار میں وقت کیوں ضائع کریں۔ جو کام کرنا ہے جلد از جلد کر لیا جائے''۔

"بکواس مت کرو۔ مجھے کھول دو"۔

"ہرگز نہیں دوست...... ہرگز نہیں۔ تم اس خوبصورت موقع کو ضائع کرنے کا مشورہ دے رہے ہو۔ میری زندگی میں یہ آپریشن بھی بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ بہتر یہ تھا کہ تم رضاکارانہ طور پر خود کو اس کے لیے پیش کر دیتے لیکن تم اتنے فراخ دل نہیں ہو جتنا میں سمجھتا تھا۔ مجھے اجازت دو کہ میں اپنا کام کروں"۔ اس کا چہرہ میرے سامنے سے ہٹ گیا۔

میں بری طرح بدحواس ہو گیا تھا۔ یہ سب کچھ توقع کے بالکل خلاف تھا۔ ظاہر ہے میں بزدل انسان نہیں تھا۔ میں نے تو موت کو گلے لگا لیا تھا لیکن اس وقت جب زندگی سے محبت ہوئی تو یہ تکلیف دہ دور شروع ہو گیا۔ آنکھوں کے بغیر تو کچھ نہیں۔ اندھا رہ کر زندہ رہنے سے کیا فائدہ اور اب جبکہ یہ بوڑھا خبیث اپنی مقصد براری کے لیے مجھے زندگی کے بدترین لمحات سے آشنا کرنے والا تھا تو میں ہر قیمت پر اس سے بچاؤ کرنا چاہتا تھا۔ میں نے اپنی گردن کے گرد کسی ہوئی بندشوں کو توڑنے کے لیے بھرپور جدوجہد کی لیکن خبیث اور طاقتور بوڑھے نے جس طرح مجھے باندھا تھا، اس سے نکلنا میرے بس کی بات نہیں تھی۔ نہ جانے میرے بدن کے کون کون سے حصوں پر زخم آئے لیکن میں اس وقت تک جدوجہد کرتا رہا جب تک سکت رہی۔ پھر میرا ذہن جواب دینے لگا۔ بوڑھا کتا نہ جانے کون سے کاموں میں مصروف تھا۔

پھر نیم غنودگی کی کیفیت میں ہی میں نے اپنے بازوؤں میں انجکشن کی چبھن محسوس کی۔ ہلکی سی، سی میرے منہ سے نکلی اور اس سے بعد کی کیفیت عجیب تھی۔ پتہ نہیں، جاگ رہا تھا یا سو رہا تھا۔ آوازیں میری سماعت سے ٹکرا رہی تھیں لیکن ذہن ان کے بارے میں سوچنے سے قاصر تھا۔ ہاں البتہ جب مکمل طور پر ہوش آیا تو رات ہو چکی تھی۔

"رات...... یہ کیسی رات تھی"۔ میں نے سوچا، پھر مجھے بوڑھا خبیث یاد آ گیا اور میں نے اپنے ہاتھوں میں اینٹھن سی محسوس کی۔ ایک بار پھر میں نے بندشوں سے آزاد ہونے کی کوشش کی لیکن بندشیں تو اب میرے گرد نہیں تھیں۔ سر بھی ہلا سکتا تھا، ہاتھ پاؤں بھی ہلا سکتا تھا۔ شاید رات کا آخری پہر ہے ورنہ اس قدر گھور تاریکی۔ میں نے پلکیں جھپکانے کی کوشش کی اور اچانک میری گھگی بندھ گئی۔

آہ...... یہ کیا ہے، میری پلکیں آنکھوں کے ان ڈیلوں کو محسوس نہیں کر رہی تھیں جن میں بینائی ہوتی ہے۔ دہشت زدہ ہو کر میں نے دونوں ہاتھوں سے آنکھیں ٹٹولیں اور آنکھوں کے

گڑھوں میں خون کی چپچپاہٹ میری انگلیوں سے ٹکرائی اور پھر میرے حلق سے جو آواز نکلی وہ بڑی دہشت ناک تھی۔

"نہیں...... نہیں...... یہ ...... یہ کیا کیا تو نے...... کتے ضرغام...... ضرغام کتے...... میں تجھے جان سے مار دوں گا۔ آہ میری آنکھیں...... میری آنکھیں......"

میرے دماغ میں شعلے بھڑک چلے تھے۔ میں طوفان کی طرح اپنی جگہ سے اٹھا۔ جو چیز میرے سامنے آئی، میں اسے نیست و نابود کرنے پر تل گیا۔ شیشے ٹوٹنے کی آوازیں، میز کرسیوں کا شور اور پھر میں سامنے کی دیوار سے ٹکرایا اور اسے ٹٹول ٹٹول کر دروازے تک پہنچ گیا۔ میرے بدن میں اس وقت بے پناہ قوت تھی۔ میں نے دروازے کو جھنجھوڑ ڈالا اور پھر میرے بدن کی بھرپور طاقت نے دروازہ توڑ دیا۔

"ضرغام...... ضرغام تو کہاں ہے، میرے سامنے آ کتے، تو نے میرے ساتھ دھوکا کیا ہے۔ میری آنکھیں مجھے واپس دے دے، میں کہتا ہوں میری آنکھیں مجھے واپس دے دے۔ ورنہ اچھا نہ ہوگا۔ میں تجھے ایسی موت مار دوں گا کہ تو سوچ بھی نہ سکے گا۔ ضر...... ضر......"

میں نے کسی چیز سے ٹھوکر کھائی اور اوندھے منہ نیچے گر گیا۔

"میرا سر زور سے کسی پتھر سے ٹکرایا تھا اور ذہن پھر تاریکیوں میں کھو گیا۔ نہ جانے کب تک...... نہ جانے کب تک...... لیکن زندگی تھی تو ہوش بھی آ گیا اور ذہن جاگا تو کسی کے گفتگو کرنے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ میں نے اس طرف کان لگا دیئے۔

آہ...... یہ اسی ذلیل بوڑھے کی آواز تھی، وہ کسی سے کہہ رہا تھا۔

"نہیں...... اسے پائپ سے خوراک دو، ہوش میں لانا ٹھیک نہیں، ابھی وہ برداشت نہیں کر سکے گا۔

"جو حکم سر، کیا اس کی آنکھوں پر دوا لگا دی جائے؟"

"اوہ...... اس کی ضرورت نہیں۔ میں نے اس کی شریانیں بند کر دی ہیں۔ آنکھوں کے گڑھے بالکل بے جان، ہیں۔ اسے تکلیف محسوس نہ ہوگی لیکن بس اسے ہوش میں نہیں آنا چاہیے"۔

"بہت بہتر جناب"۔

دوسرے شخص کی آواز سنائی دی اور پھر کوئی مجھے نزدیک آتا محسوس ہوا۔ میرے دانت

ایک دوسرے پر بھینچ گئے تھے۔ میں نے اس کے قدموں کی چاپ کو محسوس کیا اور جونہی آنے والا میرے قریب آیا۔ میری دونوں ٹانگیں پوری قوت سے اس کے منہ پر پڑیں اور وہ ایک بے ساختہ چیخ کے ساتھ شاید دوسری طرف الٹ گیا۔

میں پھرتی سے کھڑا ہو گیا تھا۔ درحقیقت آنکھوں کے خالی حلقوں میں کوئی تکلیف نہیں محسوس ہو رہی تھی۔ بوڑھے کتے نے میری آنکھیں نکال کر کوئی ایسی دوا ان حلقوں میں لگا دی تھی جس سے تکلیف کا کوئی احساس نہیں تھا۔ اس کے علاوہ بدن میں توانائی بھی محسوس ہو رہی تھی۔

تب ہی میں نے بوڑھے ضرغام کی آواز سنی۔

"اوہ...... چمبا کیا ہوا، کیا تم ٹھیک ہو"۔

"نہیں جناب! شاید وہ ہوش میں آ گیا ہے"۔

"اوہ......"

ضرغام نے مخصوص انداز میں منہ اٹھا کر فضا میں سونگھنے کی کوشش کی اور پھر اس نے مجھے آواز دی۔

"آصف خان! کیا تم نے چمبا کو نقصان پہنچایا ہے"۔

"میرے نزدیک آ کتے! دھوکے باز۔ کیا تو مجھے اس لیے جیل سے نکال لایا تھا۔ دیکھ، سن...... مجھے میری آنکھیں واپس کر دے۔ ورنہ میں تجھے کتے کی موت مار دوں گا"۔ میں نے دونوں ہاتھ خلا میں چلاتے ہوئے کہا۔ تب اچانک میرے ہاتھ کسی کے جسم سے ٹکرائے اور میں نے اسے مضبوطی سے پکڑ لیا۔

یہ بوڑھا ضرغام ہی تھا۔

"کتے...... کتے......!" میں نے اس کی گردن ٹٹولی اور اپنی گرفت میں لے لی۔ جب بوڑھے ضرغام کے چوڑے ہاتھ میری کلائیوں پر آ جمے اور اس نے نہایت اطمینان سے اپنی گردن میری گرفت سے چھڑا لی۔

"آصف خان! میں آخری بار کہہ رہا ہوں، ہوش میں آ جاؤ۔ جو ہونا تھا، وہ ہو چکا ہے۔ ایک خوبصورت مستقبل کے لیے تم تھوڑے سے عرصے کے لیے تاریکی برداشت کر لو"۔

"میں...... میں تجھے مار ڈالوں گا"۔

میں نے دانت بھینچ کر اس کا لباس کھینچا۔

"اچھا تو مار ڈالو"۔ اس نے سرد لہجے میں کہا اور میں اپنی جدوجہد کرنے لگا لیکن جیل کی موٹی سلاخوں کو موم کی طرح توڑ دینے والا، زمین میں ایک فٹ گہرے گڑے ہوئے آہنی جنگلے کو اکھاڑ پھینکنے والا، میرے بس کا روگ نہیں تھا۔ اس نے ایک ہاتھ سے میرے دونوں بازو پکڑے اور دوسرا ہاتھ میری کمر میں ڈال کر مجھے اٹھایا اور کندھے پر ڈال لیا اور پھر نہایت اطمینان سے بستر پر آ پٹخا۔

"اگر تم شرافت سے باز نہ آئے تو اب تمہارے ساتھ برا سلوک کیا جائے گا۔ تمہاری آنکھوں کے گڑھوں میں کوئی تکلیف نہ ہوگی، میں جانتا ہوں اور اب بہتر یہی ہوگا کہ میں تمہیں کسی بھری پُری بستی میں چھوڑ آؤں گا اور پھر تم ایک اندھے کی حیثیت سے بھیک مانگنے کے سوا کچھ نہ کر سکو گے"۔

بوڑھے نے جس طرح میری جدوجہد کو ناکام بنا دیا تھا، اس سے یہ احساس تو یقین پا گیا تھا کہ میں اس کا کچھ بگاڑ نہیں سکتا۔ میرا دل چاہا کہ میں بے بسی سے پھوٹ پھوٹ کر رو پڑوں۔ کچھ ایسی ہی کیفیت محسوس کر رہا تھا میں لیکن یہ شانِ مردانگی کے خلاف تھا۔ چنانچہ دل گھونٹ کر رہ گیا۔ چند ساعت خاموشی رہی پھر ضرغام کی آواز سنائی دی۔

"اگر تم نے فیصلہ اثبات میں کیا ہے تو پھر مجھے بتا دو اور اگر تم اب بھی کوئی جدوجہد کرنا چاہتے ہو تو ظاہر ہے تمہاری جدوجہد تمہیں آنکھیں نہیں دے سکے گی۔ سوائے اس کے کہ میں تمہیں عدم تعاون کرنے والوں میں شمار کروں گا"۔

پھر دروازہ بند ہونے کی آواز سنائی دی۔ شاید وہ سب باہر چلے گئے تھے...... میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

زندگی چلی جاتی تو کوئی غم نہ تھا لیکن آنکھیں...... آنکھوں کے بغیر زندگی بے کار تھی اور اب کوئی جدوجہد بھی بے مصرف ہی معلوم ہو رہی تھی۔ پھر کیا زندگی کو گونی اور چمبا کی طرح ہی گزارا جائے۔ آہ، بڑی غلطی ہو گئی اے کاش! اس سے تو موت ہی آ جاتی۔

شاید زندگی میں پہلی بار رویا تھا۔ آنسو نہ جانے کہاں سے نکلے تھے دیر تک، یہ نمکین پانی بڑا ہی وزنی ہوتا ہے۔ ذہن پر اس طرح چھا جاتا ہے جیسے منوں بوجھ...... بہہ جاتا ہے تو طبیعت کیسی سبک ہو جاتی ہے۔ رونے سے میں بھی کیسے خود کو ہلکا محسوس کرنے لگا تھا اور پھر میں سنجیدگی سے آئندہ زندگی کے بارے میں سوچنے لگا۔

زندگی کی جو امنگ سینے میں جاگی تھی۔ وہ تو اب ختم ہوگئی تھی۔ اب اس بے کار بوجھ کو لیے لیے جگہ جگہ گھٹتے رہنا کیا معنی رکھتا تھا۔ بہتر یہی ہے کہ اسی ویران کھنڈر میں، دوسروں کی مانند زندگی گزار دی جائے۔ بڑی مایوسی بڑی بددلی چھا گئی تھی میرے ذہن پر اور پھر میں اپنے اس فیصلے پر اٹل ہوگیا تھا۔

چنانچہ جب مجھے خوراک دی گئی تو میں نے خاموشی سے قبول کر لی۔ ٹٹول ٹٹول کر کھانا کھایا، پانی پیا اور پھر لیٹ گیا اور پھر جب میں نے کئی دن تک کوئی حرکت نہ کی تو جیسے بوڑھے ضرغام کو میرے اوپر اعتبار ہوگیا۔ پانچویں یا چھٹے دن اس نے نرم لہجے میں مجھے مخاطب کیا۔

”آصف! کھنڈرات کے حصوں میں چہل قدمی کیا کرو۔ آواز کے سہارے چلنے کی کوشش کیا کرو۔ میرا خیال ہے تم بہت جلد اس کے عادی ہو جاؤ گے۔ جتنا وقت تاریکی میں گزرنا ہے، ایک جگہ پڑے پڑے گزارنے سے کیا فائدہ، چلنے پھرنے سے بدن میں قوت بھی رہے گی۔

”ٹھیک ہے مسٹر ضرغام! آپ مجھے میرا کام بتا دیں میں کیا کروں گا“۔

”کیا مطلب؟“

”کیا آپ گونی اور چمبا کی مانند کوئی کام میرے سپرد کرنا چاہتے ہیں۔ مسٹر ضرغام“۔

”احمقانہ انداز میں نہ سوچو۔ تمہاری حیثیت ان سے مختلف ہے۔ میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ میں نے انہیں ان کی زندگی کی پوری پوری قیمت ادا کر دی تھی جبکہ تم میرے دوستوں میں شامل ہو۔ ٹھیک ہے تم نے میرے ساتھ اس انداز میں تعاون نہیں کیا جیسا میں چاہتا تھا۔ پھر بھی میں تم سے انسیت رکھتا ہوں۔ یہاں سکون سے رہو۔ میرے دوست! تمہیں کوئی تکلیف نہ ہوگی“۔

اور میں صرف ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا۔ اس کے خلاف میرے دل میں جو نفرت تھی اسے تو کوئی نہیں نکال سکتا تھا لیکن میں خاموشی کے علاوہ کر بھی کیا سکتا تھا۔ خود کو ذلیل و خوار کرانے سے کیا فائدہ۔

❀❀❀❀

کئی دن مزید گزر گئے۔

اب یہاں رہنا میں نے اپنی عادت بنا لی تھی۔ چہل قدمی بھی کر لیتا تھا لیکن اس ویرانے سے باہر جانا میرے بس کی بات نہ تھی۔ آنکھیں کھونے کے تقریباً ایک ماہ بعد کی بات ہے کہ

ایک شام میں عمارت کے ایک حصے میں ایک ابھرے ہوئے پتھر پر بیٹھا ہوا تھا، خاموش اور سوچ میں گم۔ میری زندگی میں جو ویرانے در آئے تھے، ان سے نجات تو اس زندگی میں ممکن نہیں تھی۔ موت چونکہ میرا مقدر بن گئی تھی اور میں تقدیر کے خلاف زندگی کی طرف دوڑ پڑا تھا، اس لیے مجھے اس دوڑ کی سزا مل رہی تھی۔ دفعتاً مجھے اپنی پشت پر کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی اور میں چونک پڑا۔ ”ہوگا کوئی“...... میں نے لاپروائی سے سوچا اور پھر مجھے اپنے قریب وہی نسوانی آواز سنائی دی جو میں پہلے بھی سن چکا تھا۔

”ارے تم یہیں موجود ہو“۔ اس نے کہا اور پھر شاید وہ میرے سامنے آگئی۔ دوسرے لمحے اس کے حلق سے بے ساختہ چیخ نکل گئی۔ ”نہیں نہیں...... آہ نہیں“۔ وہ شاید رو پڑی تھی۔ ”یہ نہیں ہوسکتا۔ آہ یہ کیا ہوگیا“۔ اس نے میرے دونوں شانوں پر ہاتھ رکھ کر میرا رخ اپنی جانب کر لیا اور پھر بے اختیار مجھے سینے سے بھینچ لیا۔ بڑی بے اختیارانہ کیفیت تھی اس کے انداز میں۔ میں نے بھی تعرض نہ کیا اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ رونے کے درمیان وہ کہتی جا رہی تھی۔

”کہا تھا نا میں نے تم سے کہ بھاگ جاؤ لیکن نہ سنی تم نے، پاگل سمجھا تھا نا دوسروں کی مانند، کیوں نہیں گئے بتاؤ...... کیوں نہیں چلے گئے“۔ وہ روتی رہی۔

درحقیقت میرے ذہن میں اب اس کی بات آ رہی تھی۔ بلاشبہ اس نے مجھ سے چلے جانے کے لیے کہا تھا لیکن ضرغام نے اسے پاگل قرار دیا تھا اور اس وقت میں نے بھی اس کے بارے میں کچھ نہیں سوچا تھا لیکن اب کیا ہوسکتا تھا۔ اس نے شاید میرا چہرہ اپنے چہرے کے مقابل کیا۔ مجھے دیکھتی رہی اور پھر غمزدہ لہجے میں بولی۔

”آہ...... کس قدر بدنما کر دیا تمہارا چہرہ۔ کیسی حسین آنکھیں تھیں لیکن اب کیا بھی کیا جاسکتا ہے۔ بتاؤ اب میں تمہارے لیے کیا کروں“۔

”شکریہ شرمین! تمہاری ہمدردی نے مجھے کافی سکون بخشا ہے“۔
میں نے دھیمی آواز میں کہا۔

”نہیں...... لیکن میرا سکون ختم ہوگیا ہے۔ پپا جو کچھ کرتے رہے، وہ سب مجھے ناپسند تھا لیکن انہوں نے یہ جو کیا ہے اس پر...... اس پر...... میں انہیں معاف نہیں کرسکتی......“ اس نے مسلسل روتے ہوئے کہا۔

''تمہیں اس بارے میں سب کچھ معلوم ہے شرمین''۔

''کس بارے میں''۔

''جو کچھ تمہارے پپا کرتے رہے ہیں''۔

''ہاں مجھے معلوم ہے''۔

''کیا تم نے کبھی ان سے اس بات پر اختلاف کیا؟''

''ہاں میں سخت احتجاج کرتی رہی ہوں''۔

''ظاہر ہے، ضرغام نے تمہاری بات قبول نہیں کی ہوگی''۔

''ہاں، پپا بہت سنگدل ہیں لیکن انہوں نے تمہارے ساتھ جو کچھ کیا ہے، اس پر میں انہیں معاف نہیں کروں گی''۔

وہ پھر رونے لگی اور میرے ذہن میں پھر ایک نئے خیال نے جنم لیا۔ میں نے سوچا کیوں نہ اس لڑکی کو آلہ کار بنایا جائے اور اس سے ضرغام کے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کی جائیں۔ میں ضرغام سے انتقام لینا چاہتا تھا۔ اس کم بخت نے میرے ساتھ جو سلوک کیا تھا وہ بے حد بھیانک تھا۔ میں بے بس ہو کر رہ گیا تھا لیکن اب اگر یہ لڑکی میرے ساتھ تعاون پر آمادہ ہو جائے تو شاید اس خبیث بوڑھے کے خلاف کچھ کر سکوں۔ میں نے محسوس کیا تھا کہ وہ مجھ سے کچھ متاثر ہے۔ ورنہ کسی کے لیے آنکھوں سے آنسو کہاں آتے ہیں۔

''شرمین! تمہیں مجھ سے ہمدردی ہے نا''۔

''ہاں۔ میں تم سے متاثر ہوں۔ ان سارے دنوں میں کوشش کرتی رہی کہ کسی طرح اگر مجھے قید سے رہائی مل جائے تو میں تم سے ملاقات کروں لیکن مشکل ہو گیا تھا۔ آج بڑی مشکل سے چمپا کو دھوکا دے کر بھاگی ہوں۔ اسے پتہ بھی نہ چل سکا۔ کھانا دینے کے بعد اس نے میرے قید خانے کا دروازہ حسبِ معمول بند کر دیا تھا، یہ معلوم کیے بغیر کہ میں چپ چاپ دروازے سے باہر نکل آئی ہوں۔ اس کے بعد میں تمہیں تلاش کرتی رہی۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ تمہارے ساتھ یہ سب کچھ ہو چکا ہے''۔

اس نے پھر ایک سسکی لی اور میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

''تو کیا تمہیں قید رکھا جاتا ہے''۔

''ہاں''۔

''کیوں؟''

''اس لیے کہ مجھے پپا کے کام سے اختلاف ہے۔ میں نے ان سے کھل کر کہہ دیا تھا کہ میں یہ سب کچھ نہیں ہونے دوں گی۔ اس پر انہوں نے مجھے پاگل قرار دے کر قید کر دیا''۔

''اوہ ضرغام بے حد سنگدل ہے''۔ میں نے کہا۔

''تم پپا کے چنگل میں کیسے پھنس گئے تھے'' اس نے پوچھا اور میں نے مختصراً اپنی کہانی سنا دی۔

''اوہ۔ تو پپا اتنے دن تک جو غائب رہے تھے اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ حکومت کی قید میں تھے، لیکن یقیناً ان کے بارے میں لوگوں کو معلومات نہیں حاصل ہو سکی ہوں گی کہ وہ کون ہیں۔ ورنہ اس حادثے کی نوعیت بدلی ہوتی''۔

''لیکن میری سمجھ میں ایک بات نہیں آئی شرمین، کہ ضرغام نے اپنی آنکھیں کیوں گنوا دیں؟''

''پپا! بے حد جذباتی انسان ہیں۔ میں اعتراف کرتی ہوں کہ وہ اپنے کام میں مخلص ہیں لیکن ان کی یہ جذباتیت شدت پسندی کی حدود میں داخل ہو گئی ہے۔ تم غور کرو کہ اگر وہ اپنے تجربے میں کامیاب ہو جاتے ہیں تو دنیا کو کیا مل جائے گا۔ کیا ساری دنیا سے اندھوں کا وجود نہیں ختم ہو جائے گا۔ وہ لوگ جو کائنات میں رہ کر حسنِ کائنات کی دید سے محروم ہیں، کیا وہ خود کو ایک نئی دنیا میں نہیں محسوس کریں گے۔ اس کے بعد ان کے دلوں میں پپا کی کیا حیثیت ہوگی۔ کیا احترام ہوگا۔ اس کا اندازہ تم خود کر سکتے ہو''۔

''ٹھیک ہے۔ مجھے اعتراف ہے لیکن بات ان کی آنکھوں کی تھی''۔

''جب انہیں کوئی نہ ملا تو انہوں نے خود اپنی آنکھیں اپنے تجربے کی نذر کر دیں''۔

''لیکن اس کے بعد ضرغام کو مشکلات کتنی پیش آئی ہوں گی''۔

''اور کسی کو معلوم نہیں صرف مجھے معلوم ہے کہ انہوں نے اپنے لیے ایک خاص انتظام کیا ہے''۔

شرمین نے کہا اور اسی وقت عقب سے ضرغام کی غراتی ہوئی آواز سنائی دی۔

''آج پھر تیرا دماغ پھر گیا ہے شرمین! تو کیوں چاہتی ہے کہ میں تجھ پر تشدد کروں''۔

"نہیں پپا! آج میں تم سے باتیں کرنا چاہتی ہوں"۔

"کیا مطلب؟"

ضرغام کا انداز کسی قدر بدل گیا تھا۔

"کیا باتیں کرنا چاہتی ہو"۔

"میری سوچ میں معمولی سا فرق آ گیا ہے پپا"۔

"اوہ۔ تو پھر اندر چلو"۔

ضرغام نرم لہجے میں بولا۔

"یہاں کیا ہرج ہے۔ میں مسٹر آصف کو بھی اپنی گفتگو میں شریک کرنا چاہتی ہوں"۔

"ہاں آصف! میرا دوست ہے۔ میں جانتا ہوں، وہ مجھ سے ناراض ہے لیکن کچھ عر- کے بعد وہ مجھ سے مکمل اتفاق کرے گا"۔

"میں بھی مسٹر آصف کو یہی سمجھا رہی تھی"۔ شرمین نے کہا اور میں ایک لمحے کے - چونک پڑا حالانکہ لڑکی نے مجھ سے یہ گفتگو نہیں کی تھی لیکن میرا خیال تھا کہ وہ ضرغام کو شیشے : اتارنے کی کوشش کر رہی ہے چنانچہ میں بھی اس سے تعاون پر آمادہ ہوگیا۔

"کیا بتا رہی تھیں؟"

"یہی کہ اب تک میں نے پپا سے اختلاف کیا تھا لیکن اگر گہری نگاہوں سے جائزہ جائے تو پپا کا مقصد عظیم ہے۔ اندھے انسان کو آنکھیں مل جانا کتنی بڑی بات ہوگی۔ میں - جو پپا سے اختلاف کیا تھا وہ صرف اس لیے تھا کہ مجھے زندہ انسانوں سے ہمدردی تھی لیک بہرصورت یہ بات اب میری سمجھ میں آ گئی ہے کہ وسیع تر مفاد کے لیے کچھ قربانیاں دینا ہو ہیں۔ اگر اس تجربے کی کامیابی کے لیے کچھ انسانوں کو تکلیف برداشت کرنا پڑتی ہے تو بہرحال تعمیری حیثیت رکھتی ہے"۔

"یقیناً...... یقیناً......"

ضرغام نے خوش ہو کر کہا۔

"پپا! میں پیشکش کرتی ہوں کہ اب تمہارے تجربے کے لیے میری آنکھیں بھی کام جائیں تو میں تیار ہوں"۔

"اوہ...... ہاں ہاں"۔

میں نے ضرغام کی آواز میں نمایاں لرزش محسوس کی۔ ظاہر ہے یہ اولاد کا معاملہ تھا۔ وہ ی اکلوتی بچی تھی۔ ظاہر ہے وہ اپنی آنکھیں دے سکتا تھا لیکن اپنے جگر گوشے کے ساتھ یہ ے کسی طرح ممکن نہیں تھا۔

"آؤ آؤ...... میرے ساتھ آؤ"۔

اس نے شرمین سے کہا اور پھر معذرت آمیز انداز میں بولا۔

"مسٹر آصف! مجھے امید ہے کہ تم محسوس نہیں کرو گے"۔

پھر میں نے جاتے ہوئے قدموں کی آواز سنی اور ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔ صورتِ ا کسی حد تک میری سمجھ میں آ رہی تھی۔ لڑکی نے یقیناً چال چلی تھی۔ ظاہر ہے وہ ضرغام سے ں نہیں تھی لیکن اس نے جو فوری طور پر پلٹا کھایا تھا اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ بوڑھے ام سے فریب کرنا چاہتی ہے۔

بہرحال تھوڑی دیر تک میں وہیں بیٹھا رہا اور پھر اپنے کمرے میں واپس آ گیا۔ مجھے اب اس تو اندازہ ہو چکا تھا کہ میں عمارت کے کسی حصے میں اپنی رہائش گاہ پر واپس آ جاؤں۔ میں ے کمرے میں آ کر مسہری پر لیٹ گیا۔

دن اور رات کا کوئی اندازہ نہیں تھا۔ اب تو سب دن تاریک تھے اور ساری راتیں سیاہ۔ انے کتنا وقت گزرا۔ کوئی اندازہ ہی نہیں ہو سکا تھا۔ چائے آئی اور چائے پینے کے بعد میں ی قدمی کے لیے نکل آیا۔ ایک محدود دنیا تھی اس کے سوا کچھ نہ تھا اور اسی محدود دائرے میں وقت گزارنے کے بعد میں پھر واپس اپنے کمرے میں آ گیا۔ اور اس وقت شاید رات ہو تھی جب مجھے دروازے پر آہٹ سنائی دی۔

"چمپا!" میں نے پکارا۔

لیکن کوئی جواب نہیں ملا۔

"کون!" لیکن آنے والا کوئی نہیں تھا۔

پھر دروازہ شاید اندر سے بند کر دیا گیا۔ میں حیران رہ گیا تھا، یہ کون ہو سکتا ہے۔ تب اپنے شانے پر ایک ہاتھ محسوس ہوا اور یہ ہاتھ شرمین کے علاوہ اور کسی کا نہیں ہو سکتا تھا۔ مجھے شرمین کی آواز سنائی دی۔

"آصف"۔

''اس وقت...... شاید رات ہو چکی ہے''۔

''ہاں''۔

''کیا ضرغام سو گیا ہے؟''

''نہیں وہ اس وقت اپنی تجربہ گاہ میں ہے''۔

''اوہو...... تو کیا تم قید سے فرار ہو کر آئی ہو؟''

''نہیں مجھے قید نہیں کیا گیا۔ صبح کی چال کارگر رہی''۔

''اوہو۔ تو میرا اندازہ درست تھا''۔

میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''کیسا اندازہ؟''

''صبح کو جب تم نے ضرغام سے گفتگو کی تھی تو میں نے یہی اندازہ لگایا تھا کہ تم ضرغام کو شیشے میں اتار رہی ہو''۔

''ہاں، آصف...... پپا اس سلسلے میں بہت ہی شدت سے سوچنے کے قائل ہیں لیکن میں تم سے یہ کہنے میں عار محسوس نہیں کرتی کہ میں تمہیں پسند کرنے لگی ہوں۔ میں چاہتی ہوں کہ پپا اب مکمل طور پر ناکام ہو جائیں تاکہ انسانی زندگیاں یوں خاک میں نہ ملیں''۔

شرمین نے کہا۔

''اوہ...... کیا تمہارے خیال میں، ضرغام اپنی کوشش میں کامیاب نہیں ہو سکتا''۔

''یہ کوشش ایک دیوانگی ہے''۔

''کیا تم یقین کرو گی شرمین کہ میں بہر حال دل سے ضرغام کے جذبے کی عظمت کا قائل ہوں''۔

''ہاں آصف! پپا برے انسان نہیں ہیں''۔

''میں جانتا ہوں''۔

''لیکن جو کچھ کر رہے ہیں، وہ انداز شدت پسندی میں بدل گیا ہے۔ کون جانے کب اپنی کوشش میں کامیاب ہوں اور اس وقت تک کتنی زندگیاں برباد ہو جائیں۔ اگر وہ کامیاب نہ ہو سکے تو یہ لوگ ہمیشہ اندھے رہیں گے۔ میں اب کسی اور کو اندھا دیکھنا نہیں چاہتی۔ آصف! اب میں کسی اور کو پپا کی دیوانگی کی بھینٹ نہیں چڑھنے دوں گی''۔

''لیکن ضرغام کرتا کیا ہے، کیا تم اس کے بارے میں کچھ جانتی ہو؟''

''ہاں''۔

''مجھے بتاؤ''۔

''وہ انسانی آنکھوں کا لعاب الگ الگ کر لیتے ہیں اور پھر ان میں سے ہر لعاب کا انہوں نے ایک خصوصی محلول تیار کیا ہے۔ یہاں ایک اور انسان ہے جس کو تم نے نہیں دیکھا ہوگا''۔

''اوہ...... وہ کون ہے''۔

''اس بدنصیب کا نام حیات علی ہے۔ پپا کا پرانا ساتھی۔ پپا نے سب سے پہلے اس کی آنکھیں نکالی تھیں اور اب وہ اس کی آنکھوں پر تجربہ کر رہے ہیں''۔

''کیا مطلب''۔

''کاش تم دیکھ سکتے''۔

''ہاں۔ اب تو میں نہیں دیکھ سکتا''۔

میں نے اُداسی سے کہا۔

''نہیں آصف۔ تم دیکھ سکو گے''۔

شرمین نے عجیب سے لہجے میں کہا اور میں اس کے لہجے پر غور کرنے لگا۔

اس کے لہجے میں محبت تھی، خلوص تھا، ہمدردی تھی، امید تھی۔

''نہ جانے کب۔ یا شاید کبھی نہیں''۔

''لیکن کس طرح''۔

''ابھی نہیں بتاؤں گی''۔

''تمہارے الفاظ نے مجھے الجھن میں ڈال دیا ہے شرمین۔ بہر حال کوئی بات نہیں، میں انتظار کروں گا۔ میں تمہیں دیکھنا چاہتا ہوں۔ خدا کرے میں تم کو پھر سے دیکھ سکوں۔ اس وقت جب میں نے تمہیں دیکھا تھا تو تمہاری کیفیت دوسری تھی۔ میرے ذہن میں تمہارے لیے وہ جگہ نہیں تھی جو اب تم نے قائم کر لی ہے''۔

''آصف!''

شرمین نے میرے قریب آ کر کہا۔

میرے پورے بدن میں سنسنی سی دوڑ گئی۔ شرمین جلدی سے میرے پاس سے ہٹ گئی تھی۔ پھر وہ دروازہ کھول کر جلدی سے باہر نکل گئی اور میں خیالات میں گم ہو گیا۔

شرمین کے انداز میں ایک عجیب سی کیفیت تھی۔ جسے میں سمجھ نہیں سکا تھا۔ ہر صورت یہ لڑکی مجھ سے محبت کرنے لگی تھی۔

اور پھر وہ رات میں نے عجیب وغریب خیالات میں گزاری۔ نہ جانے کیا کیا سوچتا رہا۔

دوسرا دن بھی حسبِ معمول تھا۔ شرمین دن بھر میرے پاس نہیں آئی اور میں حسبِ معمول کھنڈرات میں ٹھوکریں کھاتا رہا لیکن شام جس کے بارے میں، میں صرف اندازہ کرسکتا تھا، جب آئی تو شرمین بھی میرے پاس پہنچ گئی۔

''آصف!''

اس کی آواز میں لرزش تھی۔

''اوہ شرمین! تم آگئیں''۔

''ہاں! کیا تم میرا انتظار کر رہے تھے''۔

''دن بھر انتظار کرتا رہا ہوں شرمین''۔

میں نے اُداس آواز میں کہا اور وہ میرے سینے سے آ لگی۔ بڑی شدت پسند لڑکی تھی۔ جذبات کے اظہار میں کبھی بخل سے کام نہیں لیتی تھی۔ اس وقت بھی وہ جس شدت سے مجھ سے لپٹی تھی۔ اس میں بڑی اپنائیت، بڑی چاہت تھی۔

''آصف! میں تمہیں جس شدت سے چاہنے لگی ہوں، اس کا اظہار نہیں کرسکتی''۔

''میں بھی شرمین''۔ میں نے جواب دیا۔

''دیکھو میں تمہارے لیے کیا لائی ہوں''۔

''کیا ہے؟'' میں نے پوچھا اور شرمین نے کوئی چیز میرے ہاتھ میں تھما دی۔

آہ...... اب تو ٹٹول کر ہی چیزوں کا جائزہ لیا جا سکتا تھا۔ میں نے اسے ٹٹول کر دیکھا بڑے بڑے شیشوں والی کوئی عینک تھی۔

''چشمہ''۔

میں نے پوچھا۔

''ہاں اسے لگاؤ''۔

''کیوں''۔

''بس میں کہہ رہی ہوں اسے لگاؤ''۔

شرمین نے کہا اور میں نے صرف اس کی خاطر عینک اپنی مکروہ آنکھوں کے گڑھوں پر چڑھا لی۔ بھلا فائدہ بھی کیا تھا، سوائے ایک نقص چھپانے کے وہ اور کیا کام دے سکتی تھی۔

''آصف''۔

شرمین نے شدتِ جذبات میں کہا۔

''کچھ محسوس ہوا''۔

''کیا شرمین''۔

''اوہ...... تم میرے بارے میں تصور کرو۔ سوچو میرے بارے میں...... پلیز آصف جو میں کہہ رہی ہوں وہ کرو''۔

اور میں نے شرمین کے کہنے پر عمل کیا۔

نہ جانے کیوں مجھے ایک ہلکی سی روشنی کا احساس ہوا اور پھر یہ روشنی بڑھتی چلی گئی۔ یوں لگتا تھا جیسے اس روشنی کا تعلق میرے دماغ سے ہو۔ میں شرمین کے بارے میں سوچ رہا تھا اور پھر میرا دل دھک سے ہوگیا۔ شرمین میری نگاہوں کے سامنے تھی۔

''یہ کیسے ممکن ہوا، یہ کیسے ہوسکتا ہے۔ شرمین؟''

میں نے اس کی طرف ہاتھ بڑھائے اور اس نے اپنے دونوں ہاتھ میرے ہاتھوں میں دے دیئے وہ مسکرا رہی تھی۔

''شرمین مجھے یقین نہیں آ رہا۔ خدا کے واسطے مجھے بتاؤ کہ یہ سب کچھ کیا ہے۔ کیوں ہے؟''

''آصف! یہ ایک مخصوص عینک ہے۔ میرے پپا کی ایجاد۔ وہ اسے تصور کی عینک کہتے ہیں۔ جب انہوں نے اپنی آنکھیں نکالنے کا فیصلہ کیا تو اس بات کا بھی بندوبست کیا کہ ان کے کام میں رکاوٹ نہ ہو چنانچہ انہوں نے ایک ایسی عینک ایجاد کی جو آنکھوں کا نعم البدل ہو۔ وہ اسے آنکھوں پر لگا کر ہی اپنے تمام کام کرتے ہیں۔ بات صرف میری ذات تک محدود نہیں۔ تم اسے لگا کر کہیں کا تصور کرلو تمہاری نگاہوں کے سامنے ہوگا''۔

''واقعی''۔

میں نے متحیرانہ انداز میں پوچھا۔

''ہاں''۔ شرمین نے جواب دیا۔

میں نے ضرغام کی لیبارٹری کے بارے میں سوچا اور وہ ہال میری نگاہوں کے سامنے گھوم گیا۔ جس کی میں نے صرف چھت دیکھی تھی اور جہاں میری آنکھیں نکالی گئی تھیں۔ چاروں طرف مشینیں نصب تھیں۔ ان میں عجیب عجیب سیال کھول رہے تھے۔ چمبا اور گوگی لیبارٹری میں کام میں مصروف تھے۔ البتہ ضرغام ایک کرسی پر خاموش بیٹھا کچھ سوچ رہا تھا۔ پھر اس نے چمبا کو آواز دی اور چمبا کسی آنکھوں والے ہی کی مانند اس کے نزدیک پہنچ گیا۔

حیرت کی بات تھی کہ مجھے ان سب کی آوازیں بھی صاف سنائی دے رہی تھیں۔

عجیب پُراسرار عینک تھی۔

ضرغام نے چمبا سے کوئی چیز طلب کی اور چمبا نے ایک چھوٹے سے بلوریں پیالے میں ایک مٹیالا سیال اس کے سامنے لا رکھا۔ تب ضرغام نے ایک ڈراپر سے سیال کھینچا اور اس کے چند قطرے اپنی دونوں آنکھوں میں ٹپکا لیے اس کے بعد وہ دونوں آنکھیں بند کر کے بیٹھ گیا۔ میں دیوانوں کی طرح یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا...... یہ صرف تصور کا کمال تھا۔ حیرت انگیز بات تھی اور میں اس دلچسپ عینک میں کھو گیا۔

شرمین چند لمحے کے لیے میرے ذہن سے نکل گئی تھی۔

آہ۔ کیسی حیرت انگیز چیز تھی کیسی عجیب و غریب۔ میں نے پھر شرمین کو دیکھا۔ اس کے سرخ لباس کے بٹن میری نگاہوں کے سامنے آ گئے اور پھر سرخ لباس کے نیچے چمکدار سفید جلد۔ چھوٹے چھوٹے سینے کے ابھار، سرخ سرخ گوشت، پسلیوں کے درمیان دھڑکتا ہوا دل صاف نظر آ رہا تھا۔ نگاہیں کچھ اور پیچھے گئیں اور اس کی پشت کے پیچھے کی دیوار صاف نظر آئی۔ میرا دماغ چکرانے لگا میں نے گھبرا کر عینک اتار دی۔

''آہ یہ تو عجیب ہے''۔

''رکھ لو اسے۔ پوری احتیاط کے ساتھ۔ یہ میری طرف سے تحفہ ہے''۔

لیکن اس کے بعد میرا یہاں رکنا حماقت تھا۔ موقع ملتے ہی میں وہاں سے بھاگ نکلا۔ میں جانتا تھا کہ یہ جگہ بے حد بھیانک ہے۔ میں بالکل غیر محفوظ ہوں، شرمین دل میں ضرور تھی لیکن پہلے زندگی عزیز ہوتی ہے بعد میں سب کچھ۔ شرمین کو بھی میرے فرار کا علم نہیں تھا۔ میں

نے رات کا وقت منتخب کیا تھا اور رات نہ جانے کتنے وقت تک میں دوڑتا رہا تھا۔ تھک کر چُور ہو گیا تو رکا اور اس عینک کی مدد سے دیکھنے لگا۔ مجھے کسی جائے پناہ کی تلاش تھی۔

سب کچھ ناقابلِ فہم تھا، قطعی ناقابلِ یقین...... لیکن میرا فیصلہ بالکل ٹھیک تھا۔ میں نے فوری طور پر یہ بھیانک جگہ چھوڑ دی تھی۔ یہاں پروفیسر ضرغام نے اپنی تجربہ گاہ بنائی ہوئی تھی۔ کیا عجیب سی بات ہے ویسے اس میں کوئی شک نہیں کہ اس دور کی سائنس نہ جانے کیا کیا کچھ کر رہی ہے۔ کسی ایک سمت نگاہ دوڑا لو۔ سائنسی ایجادات پر غور کر لو۔ دماغ کھوپڑی سے نکل کر کئی فٹ کی بلندی پر معلق ہو جاتا ہے۔ سارے ہی کام جادوگری کے۔ زمانہ قدیم کے جادوگر اگر ان تفصیلات کو دیکھ لیتے تو موجودہ دور کے سائنسدانوں کے سامنے مرغا بن جاتے جو ایک سے ایک انوکھی ایجادات کر رہے تھے۔ گو اک عام انسان ہونے کی حیثیت سے میں نے کبھی ان ساری باتوں پر غور نہیں کیا تھا لیکن اب میں عام انسان نہیں تھا۔ میری زندگی کی کہانی راج پور میں شروع ہوئی تھی اور راج پور ہی میں ختم ہونے جا رہی تھی۔ وہ تو بس تقدیر کے کھیل جن کے بارے میں سیانے نہ جانے کہاں کہاں کی باتیں کرتے تھے۔ میں نے تو کبھی ان باتوں پر بھی غور نہیں کیا تھا۔

انوکھی اور پُراسرار کہانیاں لیکن اب ایک انوکھی اور پُراسرار کہانی میری زندگی سے وابستہ ہو گئی تھی۔ راج پور میں چوہدری بدر شاہ نے میرے والد کو قتل کر دیا تھا۔ ہم باپ بیٹے بڑی سادگی کی زندگی گزار رہے تھے۔ میرے والد طارق خان ایک سیدھے سادے دیہاتی آدمی تھے۔ سچ بولا، حلال کھایا۔ مجھ سے بھی یہی توقع رکھتے تھے حالانکہ میں بچپن ہی سے سرکش مزاج کا مالک تھا اور میں نے اپنے باپ سے بہت کم تعاون کیا تھا۔ چوہدری بدر شاہ نے میرے والد کی کسی بات سے ناراض ہو کر اسے قتل کر دیا تھا۔

میری تمام تر سرکشی اپنی جگہ لیکن جب میرے کان تک یہ بات پہنچی تو اس وقت میں ایک روایتی بیٹا بن گیا۔ میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ ہر وہ بیٹا جو اپنے باپ کو باپ سمجھتا ہے، میری ہی طرح روایتی اور جذباتی ہوتا ہے۔ چوہدری بدر شاہ نے میرا باپ مجھ سے چھین لیا تھا۔ میں نے بستی والوں کے سامنے قسم کھائی کہ چوہدری بدر شاہ سے اپنے باپ کا انتقام لوں گا۔ باپ کی تدفین کے بعد میں نے سب سے پہلے راج پور چھوڑ دیا کیونکہ میں جانتا تھا کہ چوہدری بدر شاہ کس قسم کا آدمی ہے۔ اس نے میری تلاش میں اپنی پوری فورس لگا دی ہوگی۔

بہرحال میں اس کے آدمیوں کی رینج سے بچتا رہا۔ راجن پور سے زیادہ فاصلے پر نہیں گیا تھا پھر اس کے بعد مجھے موقع مل گیا اور میں نے بدر شاہ کے پورے خاندان کو جلا دیا اور بستی والوں کے سامنے اپنی سرخروئی کا اعلان کیا۔ البتہ دوسری جذباتی حماقت کو میں حماقت ہی کہوں گا۔ میرے پاس فرار کے ذرائع تھے لیکن کھوپڑی میں بس یہی آیا کہ باپ کے انتقام کو پورا کرنے کے بعد زندگی بے کار سی چیز ہو کر رہ گئی ہے۔

چنانچہ میں نے خود کو پولیس کے حوالے کر دیا۔ چوہدری بدر شاہ کا خاندان بہت بڑا تھا۔ راج پور میں بھی کافی لوگ تھے اور راج پور سے باہر بھی اس کے کافی بھائی بند تھے۔ ظاہر ہے، انہیں میرا دشمن بن ہی جانا تھا۔ مقدمہ بہت مختصر چلا تھا۔ ایک تو میں خود اعتراف کر چکا تھا۔ دوسرے مدِ مقابل بڑے طاقتور لوگ تھے۔ میں تو اپنے لیے وکیل بھی نہیں کر سکا تھا اور سرکاری وکیل کو کیا پڑی تھی جو مجھے بچانے کی سخت جدوجہد کرتا۔ چنانچہ میرے لیے سزائے موت مقرر ہو گئی۔

میں نے تو اپنے آپ کو مردہ سمجھ لیا تھا لیکن تقدیر مجھے مردہ نہیں ہونے دینا چاہتی تھی۔ وہ شیطان بوڑھا مل گیا اور اس نے مجھے آنکھوں سے محروم کر دیا۔ چشمِ تصور میں آئینے میں اپنا چہرہ دیکھ سکتا تھا۔ جو آنکھوں سے بے نیاز ہو کر کتنا بھیانک لگتا ہو گا جبکہ عام حالات میں، میں ایک اچھے نقوش کا مالک نوجوان تھا۔ بہرحال جو واقعات پیش آئے تھے آپ ان سے بخوبی واقف ہوں گے۔

شرمین نے مجھ پر احسانات کیے تھے۔ پہلی لڑکی تھی جسے میں نے اپنی طرف ملتفت پایا تھا۔ اس سے پہلے ان راستوں سے نہیں گزرا تھا لیکن اپنے فیصلے سے مطمئن تھا۔ شرمین کو چھوڑ دینا ہی میرے حق میں تھا۔ اس وقت میں جس جگہ موجود تھا، یہ ایک پرانی عمارت تھی۔ شاید انگریزوں کے زمانے میں ڈاک بنگلے کی حیثیت رکھتی ہو گی۔

انگریزوں کے جانے کے بعد اسے کوئی اہمیت نہیں دی گئی تھی اور اگر کسی چیز کو اہمیت نہ دی جائے تو وہ زوال پذیر ہو ہی جاتی ہے۔ یہ بوسیدہ ڈاک بنگلہ بھی زوال پذیر ہو گیا، البتہ اس وقت میرے بہت کام آیا تھا۔ چوہدری بدر شاہ کا قتل اور اس کے بعد کی ہنگامہ آرائیاں۔ بہت زیادہ سوچنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ سوائے اس کے کہ زندگی کے اختتام پر غور کرتا رہا تھا لیکن اب یہ احساس ہوا تھا کہ زندگی بچ گئی ہے اور آگے کے بارے میں نہیں کہا جا سکتا کہ اس میں کتنی

طوالت ہو، عقل بھی شاید اس عینک نے بڑھا دی تھی کیونکہ اب بہت دور تک سوچنے لگا تھا۔ یہ جانتا تھا کہ اس وقت آدھی دنیا میری دشمن ہے، میری دنیا تو بہت مختصر تھی ناں۔ آدھی دنیا سے میری مراد ہے ایک طرف چوہدری بدر کے خاندان والے جن میں بڑے بڑے خونخوار لوگ تھے۔ ان میں سے بہت سے خونخواروں نے دانت پیستے ہوئے مجھ سے کہا تھا۔ ”کاش! حکومت مجھے ان کے حوالے کر دے۔ وہ چوہدری بدر شاہ کا انتقام خود مجھ سے لے لیں گے۔ انہوں نے یہ بھی کہا تھا۔ ”آصف خان بڑا خوش نصیب ہے تُو، اس دنیا میں تیرا اور کوئی نہیں ہے ورنہ جس طرح تُو نے ہمارے بھائی کو اور اس کے اہلِ خانہ کو زندہ جلا دیا ہے، ہم اس سے بھی بُرا سلوک کرتے تیرے اہلِ خاندان کے ساتھ۔ آہ...... کاش تیرا بھی کوئی ہوتا“۔

ایک طرف تو وہ سارے لوگ جو میرے خون کے پیاسے تھے، میرے پیچھے تھے۔ دوسری طرف پولیس...... میں جانتا تھا کہ میرے فرار کے بعد پولیس والوں کی جو شامت آئے گی، وہ کم نہیں ہو گی۔ سزائے موت کا مجرم بھاگا تھا۔ تیسری پارٹی ایک انتہائی پُراسرار اور خوفناک آدمی، پروفیسر ضرغام کی تھی۔ میں پروفیسر ضرغام کی عینک لے بھاگا تھا۔ میرے آنے کے بعد شرمین پر نہ جانے کیا گزری ہو گی؟ سوچنے کے لیے بہت کم وقت رہ گیا تھا۔ اور میں سوچ رہا تھا، مسلسل سوچ رہا تھا کہ اب مجھے کیا کرنا چاہیے۔ گزرے ہوئے پُراسرار واقعات ذہن میں در آئے تو ایک اندازہ ہوا۔ وہ یہ کہ عینک میرے لیے آنکھوں کا کام دے رہی ہے، نہ صرف آنکھوں کا بلکہ ایک ایسی شاندار طاقت بن گئی ہے میرے لیے کہ جس کا کوئی جواب نہیں۔

میں اس سے باقی سب تو دیکھ ہی سکتا ہوں لیکن اس کے ساتھ ہی اس تصور کی آنکھ سے اور بھی بہت کچھ دیکھ سکتا ہوں جس کا تجربہ میں کر چکا تھا لیکن شرمین نے مجھے کچھ اور بھی بتایا تھا۔ پروفیسر ضرغام بے شک جیل میں تھا لیکن اس قدر لاچار نہیں تھا۔ اس نے ایک ایسا محلول تیار کر لیا تھا جو آنکھوں کی جگہ پوری کر سکتا تھا اور وہ اسی کے ذریعے کام لیا بھی کرتا تھا۔ اگر اس محلول کی کچھ مقدار مجھے مل جائے تو میں اسے اپنے قبضے میں کر لوں کبھی عینک استعال کر لوں اور کبھی...... واہ کیا ہی شاندار بات تھی اور اس کے لیے بھی نہ جانے کس طرح میری عقل نے ساتھ دیا۔

میں اس وقت یہی سوچ رہا تھا کہ میں اس محلول کو کیسے حاصل کر سکتا ہوں اور پھر اچانک ہی مجھے عینک کا خیال آیا تھا جو تصوراتی طور پر ہر منظر دماغ میں پیش کر دیا کرتی تھی، چاہے وہ

آنکھوں کے سامنے ہو یا نہ ہو۔ بڑی انوکھی چیز تھی۔ میں نے عینک لگائی اور پھر پروفیسر ضرغام کی اس پُراسرار حویلی کا تصور کیا۔ چند لمحوں کے بعد مجھے یوں لگا جیسے میں اس لیبارٹری میں داخل ہو گیا ہوں۔ میں ایک دم خوشی سے اچھل پڑا تھا۔ یہ تجربہ میری زندگی کا شاندار ترین تجربہ تھا۔ میں تصور کی آنکھ سے کوٹھی کے مختلف مناظر دیکھنے لگا۔

سب سے پہلے میں ایک کمرے میں داخل ہوا اور اندر کا منظر دیکھ کر بری طرح اچھل پڑا۔ وہ شرمین تھی جس کے دونوں پاؤں بندھے ہوئے تھے۔ دونوں ہاتھ بھی پیچھے کر کے باندھ دیئے تھے۔ اس کے چہرے پر کئی جگہ مار پیٹ کے نشان تھے۔ بائیں ہاتھ کا نچلا حصہ نیلا ہو رہا تھا۔ ہونٹ پھٹا ہوا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے اس کی اچھی طرح مرمت کی گئی ہے۔ مجھے بے حد افسوس ہوا۔ یہ سب کچھ میری ہی وجہ سے ہوا تھا۔ بیچاری شرمین اپنی محبت کا شکار ہو گئی۔ دل تو چاہا کہ دوڑ کر اس کے پاس پہنچ جاؤں اور اسے دلاسے دوں لیکن پہلی بات تو یہ کہ میں وہاں پہنچ نہیں سکتا تھا۔ تصور کی آنکھ سے میں یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا لیکن ان سے آگے میرے لیے کچھ کرنا ممکن نہیں تھا۔ ایک ٹھنڈی سانس لے کر میں وہاں سے باہر نکل آیا اور پھر دوسری جگہوں کی تلاشی لینے لگا۔ میرا تصور مجھے ہر منظر دکھا رہا تھا۔ بالکل اس طرح جیسے میں قدم قدم چل کر ہر چیز دیکھ رہا ہوں۔

آخرکار میں لیبارٹری پہنچ گیا۔ پروفیسر ضرغام ایک کرسی پر خاموش بیٹھا ہوا تھا۔ اس وقت وہاں اور کوئی نہیں تھا۔ ابھی میں نے اس کا جائزہ ہی لیا تھا کہ دو افراد وہاں پہنچ گئے۔ میں انہیں بھی اچھی طرح جانتا تھا۔ یہ وہی دو ملازم تھے جو اس کے دست راست کے طور پر کام کرتے تھے۔ ان میں سے ایک نے کہا:

”نہیں پروفیسر...... ہم نے میلوں دور کا علاقہ چھان مارا ہے، وہ شرارے کی طرح غائب ہو گیا ہے“۔

”برباد کر دیا اس لڑکی نے مجھے تباہ کر دیا۔ دل چاہتا ہے اس کی گردن دبا کر مار دوں۔ وہ میرا قیمتی سرمایہ لے گیا۔ آہ...... وہ میرا قیمتی سرمایہ لے گیا۔ یہ دنیا، ناقدری دنیا جس سے میں اب نفرت کرنے لگا ہوں۔ پہلے تو میں نے یہی سوچا تھا کہ میں ایک ایسا فارمولا لے کر منظر عام پر آؤں گا جو ساری دنیا میں ہلچل مچا دے گا۔ وہ لوگ جن کی آنکھوں کے حلقوں میں دیدے ہی نہیں ہیں، بینا انسانوں کی طرح، آنکھوں والوں کی طرح دنیا دیکھ سکیں گے لیکن کیا

سلوک کیا ان لوگوں نے میرے ساتھ۔ مجھے پکڑ کر جیل میں ڈال دیا۔ خیر میں نے اپنا ارادہ بدل دیا تھا۔ میں نے سوچا تھا کہ اب میں کسی کے ساتھ نیکی اور انصاف کا کام نہیں کروں گا۔ یہ بہت بُری دنیا بہت ہی بری دنیا میں جہاں ہر کام انسان اپنے لالچ اور اپنی غرض کے لیے کرتا ہے، میں اعلان کروں گا کہ میں اندھوں کو دنیا دکھا سکتا ہوں جن کی آنکھوں میں صرف گہرائیاں ہوتی ہیں، دیدے نہیں ہوتے اور میں اس کا معاوضہ کروڑوں روپے وصول کرتا۔

اور اب بھی میں ایسا ہی کروں گا لیکن مجھے صرف اس بات کا دکھ ہے کہ میری ایک بہت قیمتی شے میرے ہاتھوں سے نکل گئی اور ایک ایسا شخص بھی جو میرے اس تجربے کی داستان کو آگے کر سکتا ہے، اسے ہر قیمت پر میرے ہاتھ لگنا چاہیے۔ اب میں یہ کام ترک کر کے پہلے اسے پکڑنے کی کوشش کروں گا۔ گونی تم شہر چلے جاؤ میں تمہیں پورا پتہ دیتا ہوں جہاں تمہیں ایک شخص جون ہیگ ملے گا۔ یہ ایک دیسی عیسائی ہے۔ وہ درجنوں قتل کر چکا ہے، باقاعدہ جرائم پیشہ آدمی ہے۔ جون ہیگ سے بات کرو اور اس سے کہو کہ میں اس سے ملنا چاہتا ہوں“۔

”کیا آپ کا شناسا ہے وہ شخص؟“

”نہیں لیکن تم اس کے سامنے پانچ لاکھ روپے رکھو اور اس سے کہو کہ ایک کام کے سلسلے میں اسے مزید بڑی رقم ملے گی۔ وہ مجھ سے ملاقات کر کے کام کی نوعیت کو سمجھ لے۔ مجھے اس کے بارے میں جیل کے ایک قیدی سے پتہ چلا تھا۔ بہرحال میں جون ہیگ کو اس شخص کے پیچھے لگاؤں گا جس کا نام آصف خان ہے۔ جون ہیگ اسے زندہ یا مُردہ ضرور گرفتار کرے گا۔ مجھے میری عینک چاہیے“۔

میں چلا جاتا ہوں پروفیسر، مجھے اکیلے جانا ہوگا؟“

”ہاں“۔ پروفیسر ضرغام نے جواب دیا اور اس کے بعد وہ گردن لٹکا کر بیٹھ گیا۔ میں اس سے اتنے فاصلے پر بیٹھا یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا اور یہ اسی عینک کا کمال تھا۔ آہ...... کاش مجھے اتنی قوت اور حاصل ہوتی کہ میں اسی طرح ان کے پاس پہنچ سکتا لیکن یہ ممکن نہیں تھا۔ اس کے بعد میں نے تصور کیا کہ وہ محلول کہاں ہے اور میرے نادیدہ قدم ایک الماری کی طرف اٹھ گئے۔ الماری کیا، وہ ایک تجوری تھی جس میں درجن بھر تالے لگے ہوئے تھے۔ یہ تالے تو میں نہیں کھول سکا لیکن تجوری کے اندر رکھی ہوئی چیز میں نے دیکھ لی۔ ایک خوبصورت شیشی میں

وہ محلول بند تھا جو آنکھوں کے حلقوں میں روشنی پیدا کر دیتا تھا اور انسان اس سے دیکھ سکتا تھا۔ یہ ایک عجیب وغریب چیز تھی لیکن اس کے حصول کا ذریعہ کیا ہوگا؟ اس تجوری کی چابیاں کہاں ہیں؟ میں نے دیکھا کہ وہ چابیاں بھی ایک سیف میں بند ہیں اور اس سیف کی چابی ایک ایسے پوشیدہ خانے میں رکھی ہوئی ہے جو کسی کے علم میں نہیں ہے۔ بڑی اچھی حفاظت کا انتظام کیا تھا پروفیسر ضرغام نے اس محلول کا، لیکن شاید اسے بھی اس بات کا خدشہ ہو کہ عینک کی موجودگی میں اب کوئی بھی چیز میری نگاہوں سے پوشیدہ نہیں ہے۔

میں اس محلول کو حاصل کرنے کے لیے جس قدر محنت ہو سکتی تھی، کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ میں نے لیبارٹری سے واپسی کا قصد کیا اور اس کے بعد اس عمارت میں ایسے گوشے تلاش کرنے لگا جہاں سے میں آسانی سے اندر داخل ہو سکوں اور اس کے بعد مختلف علاقوں سے گزرتے ہوئے میں نے ایک نقشہ ترتیب دے لیا اور اس کے بعد عینک اتار کر نیچے رکھ دی۔ میرے دماغ پر ایک ہلکا سا بوجھ طاری ہو گیا تھا اور یہ بھی ایک تجربہ ہی تھا۔ یعنی عینک کے ساتھ دماغ کا استعمال بھی ہوتا تھا اور اس طرح قوت بھی خرچ ہوتی تھی اور دماغ بوجھل ہو جاتا تھا لیکن یہ پُراسرار عینک کمال کی چیز تھی۔ واقعی ایک عجوبہ میرے ہاتھ لگا تھا۔

اسی وقت میرے ذہن میں ایک اور خیال آیا، میں زندگی کھونے پر تل گیا تھا ورنہ چوہدری بدرشاہ کی ہلاکت کے بعد روپوش بھی ہو سکتا تھا۔ اپنا حلیہ، نام سب کچھ تبدیل کر لیتا اور اپنی بستی سے دور جا کر ایک نئی زندگی کا آغاز کر سکتا تھا لیکن باپ کی موت کے بعد مجھے یوں لگا جیسے میری دنیا ہی ختم ہو گئی ہو۔ میں نے سوچا تھا کہ اب باپ کے بغیر زندہ رہنے کا کیا فائدہ لیکن جب جیل کے دن جیل کی راتیں گزریں تو اور بھی بہت سے خیالات ذہن میں آئے۔ ماں باپ تو سدا کسی کے نہیں رہتے۔ دنیا سے جانا تو ہوتا ہی ہے۔ اپنی زندگی اپنی ہوتی ہے۔ دنیا میں ہزاروں دلچسپیاں ہیں لیکن پھر یہ سوچ کر ٹھنڈی سانس بھر کر خاموش ہو جاتا تھا کہ چلو باپ دنیا سے گیا، میں بھی چلا گیا تو کون سا دنیا خالی ہو جائے گی اور اس کے بعد میں نے اپنے آپ کو زندگی کے اختتام کے لیے تیار کر لیا تھا لیکن قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔

زندگی ابھی میرے ساتھ سفر کرنا چاہتی تھی اور میں عجیب وغریب حالات سے گزر کر یہاں تک پہنچ چکا تھا۔ جو حادثہ میرے ساتھ ہوا تھا وہ بڑا دلدوز تھا لیکن اب جو یہ سب کچھ ہوا تھا اس نے میرے اندر زندگی کی نئی اُمنگ پیدا کر دی۔ اس عینک سے کام لے کر تو میں نہ

جانے کیا سے کیا بن سکتا تھا۔ انسانوں کا ہر راز میری نگاہوں کے سامنے ہوگا۔ بڑی بڑی گہرائیاں تلاش کر سکوں گا میں۔ اپنے لیے دولت بھی حاصل کر سکوں گا۔ جو چاہوں کروں دنیا کے سامنے یہ کہہ کر پیش ہو جاؤں گا کہ بھائی! میں تو ایک اندھا آدمی ہوں کوئی یہ ثابت نہیں کر سکے گا کہ مجھے کچھ نظر آتا ہے۔ میری آنکھوں کے گڑھوں میں تو کالے حلقوں کے علاوہ کچھ نہیں ہوگا۔

واہ...... دنیا کو دھوکہ دینے کا کیا شاندار طریقہ ہے واہ...... واہ...... واہ۔ اور بھی سوچوں گا، اپنی زندگی کے بارے میں۔ پہلے ذرا اس محلول کے حصول کے لیے کوشش کر لوں اور اس سلسلے میں منصوبہ بندی کرنے لگا۔

❁❁❁❁

بڑی ہمت کا کام تھا دوبارہ اس لیبارٹری میں داخل ہونا جبکہ مجھے اس بات کا علم بھی ہو چکا تھا کہ پروفیسر ضرغام نے میرے لیے کچھ انتظامات کرنے کی بات کی ہے۔ پتہ نہیں یہ جون ہگ کیا چیز تھی لیکن بہرحال باپ کی موت کے بعد دنیا سے دل اچاٹ ہو گیا تھا اسی لیے میں نے اپنی زندگی ختم کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا اور خود کو پولیس کے حوالے کر دیا تھا لیکن اب ایک دم جینے کو دل چاہنے لگا تھا۔ میں اپنے منصوبے کی تکمیل کے لیے آخر کار چل پڑا۔ جہاں سے فرار ہوا تھا، اس جگہ تک کا راستہ اتنا طویل نہیں محسوس ہوا تھا۔ اب جب دوبارہ وہاں جانے کے بارے میں سوچا تو پتہ چلا کہ میں نے کس عالم میں اتنا فاصلہ طے کیا تھا۔ آخر کار میں اس عمارت میں پہنچ گیا جس میں لیبارٹری تھی۔ چشمِ تصور میں میں نے جس طرح شرمین کو دیکھا تھا۔ اس سے دل کو تھوڑا سا دکھ ضرور ہوا تھا لیکن پھر اپنے آپ کو سنبھال لیا تھا۔ کس چکر میں پڑ رہے ہو آصف خان، یہ کھیل تمہارا نہیں ہے۔ تم نے دشمنوں کی ایک فوج پالی ہوئی ہے۔ ذرا بھی کہیں لغزش ہوئی تو موت کے شکنجے میں کسے جاؤ گے۔ اب یہ خیال زیادہ شدت اختیار کر گیا تھا کہ موت نہیں زندگی۔ جب تک بھی مل جائے۔ بہرحال اس عمارت میں داخلے کے راستے میں نے تصور کی آنکھ سے دیکھ لیے تھے۔ وہ لوگ یہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ میں اس طرف دوبارہ اس موت کدے میں آؤں گا لیکن وہ میرا مقصد بھی تو نہیں جانتے تھے چنانچہ مجھے کسی مشکل کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔

مختلف مراحل طے کرتا ہوا آخر کار میں داخل ہو گیا۔ سیف کی چابی میرے علم میں تھی۔ میں نے اسے حاصل کیا اور جب میرے ہاتھوں نے اس محلول کی شیشی کو چھوا تو مجھے یوں لگا

جیسے میرے بدن میں برقی رو دوڑ رہی ہو۔ پتہ نہیں یہ صرف احساس تھا یا پھر اس پُراسرار محلول میں ایسی کوئی اور قوت بھی تھی لیکن بات وہی تھی اس وقت انسان نہیں جانور بن کر ہی جیا جاسکتا ہے۔ احساس...... ہر قسم کا احساس انسان کی موت ہوتا ہے کیونکہ وہ مفلوج کر دیتا ہے۔ مجھے ان احساسات میں پھنسنے کی بجائے اپنا کام کرنا تھا۔ اس محلول کو احتیاط سے لے کر میں کامیابی کے ساتھ باہر نکل آیا۔

ایک لمحے کے لیے دل نے بے ایمانی کی تھی اور کہا تھا کہ شرمین کو دلاسہ ہی دے دوں اس کا شکریہ ہی ادا کر دوں کہ اس کی مدد سے میں زندگی کی طرف لوٹ گیا ہوں لیکن بات وہی آتی ہے کسی بھی قسم کا احساس پیروں کی زنجیر بھی بن سکتا ہے اور یہ زنجیر موت کی زنجیر بھی ثابت ہوسکتی ہے۔ چنانچہ ان چکروں میں پڑنے کے بجائے ہر وہ طریقہ اختیار کرنا چاہیے جس سے آگے کے راستے ہموار ہوں۔ ایک خیال میرے دل میں آیا، میری جیبیں خالی ہیں۔ دنیا میں جینے کے لیے دولت کی ضرورت ہوتی ہے۔ میں نے جیب سے عینک نکال کر آنکھوں پر لگائی اور سوچا کہ یہاں عمارت میں مجھے رقم کہاں سے مل سکتی ہے۔ میری رہنمائی ہوگئی۔

میں نے بہت زیادہ رقم وہاں سے حاصل نہیں کی تھی۔ بس اتنی جو عارضی طور پر مجھے سہارا دے سکے اور اس کے بعد میں اسی راستے سے باہر نکل آیا تھا اور رات کی تاریکیوں میں گم ہوگیا تھا۔ کوئی تین گھنٹے تک میں نے پھر سفر کیا اور تھکن سے چُور ہوگیا۔

اب میں اس ڈاک بنگلے کی طرف نہیں گیا تھا۔ بڑے محتاط طریقے سے باقی سارے کام کرنے تھے۔ چنانچہ ایک محفوظ جگہ تلاش کر کے صبح تک آرام کیا۔ دن کی روشنی میں مجھے ایک بستی نظر آئی۔ میں نے عینک کے ذریعے اس بستی کو دیکھا تھا اور یہاں کے حالات معلوم کیے تھے۔

پھر اس کے بعد میں نے عینک احتیاط سے اپنے لباس کے اندرونی حصے میں چھپا لی اور اس کے بعد محلول کے دو دو قطرے آنکھوں میں ٹپکائے۔ ایک ایسی فرحت محسوس ہوئی جسے الفاظ میں بیان نہیں کر سکتا اور اس کے بعد جیسے دنیا پہلے سے کہیں زیادہ روشن ہوگئی۔ آہ...... واقعی پروفیسر ضرغام نے دنیا کی فلاح کے لیے کام تو زبردست کیا تھا، ویران آنکھوں کو اس طرح روشنی بخش دینا درحقیقت انتہائی نیک کام تھا لیکن یہ بات میں بھی جانتا تھا کہ نیکیوں کا صلہ کیا ملتا ہے

بہرحال اس نے دنیا کے لیے جو کچھ بھی کیا ہو میرے ساتھ اس نے جو سلوک کیا تھا، وہ ناقابلِ معافی تھا۔ میرے چہرے کو بدنما بنا دیا گیا تھا اور وہ بھی اس کمبخت نے دھوکہ دہی کے ساتھ کیا تھا۔ اپنے ضمیر کو مطمئن کرنے کے بعد میں وہاں سے چل پڑا۔ بستی میں داخل ہوا۔ ایک درمیانہ درجے کے تنور سے دو روٹیاں اور سالن کی ایک پلیٹ حاصل کی البتہ مشکل پیش آئی تھی اس نوٹ کے سلسلے میں جو میں نے نان بائی کو دیا تھا۔ وہ ہنس کر بولا۔

"صاحب مذاق کر رہے ہیں؟"

"کیوں، کوئی غلط بات کہہ دی ہے میں نے"

"ارے صاحب اتنی کمائی تو ہماری ہفتے بھر میں بھی نہیں ہوتی۔ اس نوٹ کو کھلوانا تو پوری بستی میں ممکن نہیں ہوگا"۔

"یہ تو گڑبڑ ہوگئی پھر کیا کیا جائے"۔

"آپ کہیں باہر کے ہو صاحب"۔

"ہاں، ہوں تو باہر کا"۔

"ٹھیک ہے اگر آپ کے پاس چھوٹے پیسے نہیں ہیں تو رہنے دیجیے۔ آج آپ اللہ کے مہمان سہی۔ دو روٹیاں اور ایک سالن ہماری طرف سے خاطر مدارت کے طور پر قبول فرمایئے۔ چائے بنا کر دیتے ہیں آپ کو"۔ نیک دل نان بائی نے کہا۔ میں اس کی بات سے بہت متاثر ہوا تھا۔ وہ جو کہتے ہیں ناں کہ مال مفت دل بے رحم۔ وہاں سے میں نے شہر جانے کے بارے میں خاصی معلوم حاصل کیں تو پتہ چلا کہ مجھے بس سے سفر کرنا ہوگا۔ بس کی جگہ بھی بتا دی گئی تھی۔

میں نے نان بائی سے کہا "لو...... یہ نوٹ رکھ لو۔ تم نے میری خاطر تواضع کی۔ میری مہمان داری کی۔ میں نے تمہارا وہ تحفہ شکریہ کے ساتھ قبول کر لیا۔ یہ میرا تحفہ ہے جو تم قبول کر لو اور ایک بات سنو، یہ جعلی نوٹ نہیں۔ یہ مت سمجھنا کہ میں تم سے دھوکہ کر رہا ہوں تم تو اک طرح سے مجھ پر احسان کر ہی چکے ہو۔ بس یوں سمجھ لو کہ یہ میری طرف سے تحفہ ہے"۔

"صاحب! یہ بہت ہے، ہم بڑے معمولی سے لوگ ہیں، اتنی بڑی رقم"۔

"سنو! نوٹ تو اب تمہاری ملکیت ہے۔ احتیاط کے ساتھ رکھنا اور جہاں سے بھی ممکن ہو اسے کھلوا لینا لیکن ایک ضرورت اور پوری کر دو میری"۔

"حکم دیجیے صاحب! حکم دیجیے"۔ نان بائی کے چہرے سے خوشی پھوٹی پڑ رہی تھی۔

''تمہارے پاس کھلے پیسے ہوں گے۔ مجھے سو دو سو روپے دے دو۔ بس سے سفر کرنا ہے میرے پاس سارے یہ بڑے ہی نوٹ ہیں''۔

''دل و جان سے صاحب...... دل و جان سے''۔ اس نے کوئی ایک سو ستر روپے اپنے گلے سے نکال کر میرے حوالے کر دیئے۔ یہی ایک سو ستر روپے اس کے گلے میں تھے۔ میں نے اس کا دلی شکریہ ادا کیا۔ اس سے ہاتھ ملایا اور اس کے بعد وہاں سے چل پڑا۔ عینک میں نے آنکھوں پر لگائی ہوئی تھی۔ اس لیے کوئی میری آنکھیں نہیں دیکھ پا رہا تھا۔ نان بائی نے نوٹ اپنے شلوکے کی جیب میں رکھ لیا۔ اس کا سانس پھول رہا تھا۔ اتنا بڑا نوٹ اسے ملا تھا۔

بہرحال وہ حالات پر شاکر تھا۔ کوئی دھوکہ دہی بھی ہو سکتی تھی اس کے ساتھ لیکن ایسے نیک لوگوں کے ساتھ بھلا کوئی دھوکہ دہی کر سکتا ہے۔ آخرکار میں بس کے اڈے پر پہنچ گیا۔ بس روانہ ہونے میں دس ہی منٹ باقی رہ گئے تھے۔ میں نے ٹکٹ خریدا اور بس میں بیٹھ گیا۔ اس کے بعد باقی سفر میں نے چشمے کے پیچھے بند آنکھوں سے سوتے ہوئے گزارا تھا۔ ایک دو بار آنکھ کھلی تھی۔ بس پُرسکون انداز میں سفر کر رہی تھی اور کوئی خاص بات نہیں ہوئی تھی۔ یہاں تک کہ بس شہری آبادی میں پہنچ گئی۔

میں جاگ گیا تھا۔ مسافر نیچے اترنے لگے۔ میں بھی نیچے اتر گیا۔ اب مجھے ذہانت اور سمجھداری سے کام لینا تھا۔ چنانچہ میں شہر کے ایک بھرے بازار میں پہنچ گیا۔ یہ کافی بڑا شہر تھا۔ بازار کھل چکے تھے۔ میں ایک اسٹور میں داخل ہوا اور اس سے اپنے ناپ کے بہت سے لباس خرید لیے اور اس کے بعد عینک بھی جو ذرا کم ڈارک شیشوں کی تھی، لیکن ایسی کہ باہر سے آنکھیں نظر نہ آئیں اس عینک کو میں بہت احتیاط سے رکھنا چاہتا تھا۔ اس کے علاوہ اس محلول کے لیے میں نے کئی چھوٹی چھوٹی شیشیاں بھی خریدیں۔ اسے ایک شیشی میں محدود نہیں رہنا چاہیے۔ اس کی حفاظت میرے لیے گویا زندگی کی حفاظت کے مترادف تھی۔ عینک بھی اتنی ہی قیمتی چیز تھی۔

یہ تمام خریداری کر کے میں نے ایک سوٹ کیس بھی خریدا۔ ایک شوروم کے ڈریسنگ روم میں جا کر لباس بھی تبدیل کیا اور اپنا پرانا لباس ایک کاغذ میں پیک کرا لیا۔ نئے جوتے بھی خریدے گویا ایک نیا انسان بننے کے لیے جو بھی ضروریات ہو سکتی تھیں وہ میں نے پوری کیں۔ مجھے اس بات کا خدشہ مسلسل تھا کہ میرے لاتعداد دشمن مجھے اتنی آسانی سے نہیں چھوڑ دیں

گے۔ ان سے تحفظ کے لیے مجھے بندوبست کرنا ہوگا۔

بہرحال اس کے بعد ایک درمیانے درجے کے ہوٹل پہنچ گیا۔ میں نے ایک کمرہ حاصل کیا۔ انہیں بتایا کہ میں ایک طویل عرصہ یہاں گزاروں گا۔ خاصی رقم ایڈوانس دی اور اس کے بعد اپنے کمرے میں منتقل ہو گیا۔ نہ جانے کیوں کمرے کے دروازے کے پاس پہنچ کر مجھے احساس ہوا کہ اب میں کسی قدر محفوظ ہوں لیکن جو کچھ ہوا تھا، ابھی تک ایک خواب کی مانند محسوس ہوتا تھا اور دل بار بار کانپ جاتا تھا کہ کہیں اس خواب سے آنکھ نہ کھل جائے۔ پہلی داستان تو خواب نہیں رہی تھی کیونکہ زندگی کا سب سے بڑا ساتھی مجھ سے چھوٹ گیا تھا۔ پھر جیل کے دن جیل کی راتیں اور اس کے بعد ضرغام کا مل جانا لیکن ضرغام کے ہاں سے نکلنے کے بعد جو کارروائی میں کر رہا تھا اور اب جس پوزیشن پر تھا، وہ سب کبھی کبھی اعصابی دباؤ کا شکار کر دیتی تھی۔

بہت دیر تک غسل کیا۔ غسل کرنے کے بعد لباس پہنا۔ دوپہر ہو چکی تھی۔ بھوک لگ رہی تھی۔ چنانچہ میں نے ویٹر کو طلب کر کے کھانا منگوایا اور پھر کھانا کھانے کے بعد آرام کرنے کی غرض سے لیٹ گیا۔ میں بستر کو ٹٹول ٹٹول کر دیکھ رہا تھا کہ سب کچھ سچ ہی ہے ناں۔ سب کچھ سچ ہی تھا۔ لیکن یہ کیسی عجیب و غریب بات تھی۔ میں نے دل میں سوچا اس سحرزدہ کیفیت سے نکل آنا چاہیے۔ جب تقدیر نے نئی زندگی سے نوازا ہے تو پھر اس زندگی کی بقا کے لیے اور اپنے مستقبل کے لیے گہرے انداز میں سوچنا چاہیے۔ نیند تو راستے میں ہی پوری ہو چکی تھی۔ اب بستر پر لیٹا اپنے ذہنی دائروں کو وسعتوں میں پھیلا رہا تھا۔

میں نے سوچا کہ جو قوت مجھے حاصل ہو چکی ہے، اس سے میں بڑے بڑے کام کر سکتا ہوں اور بڑے کام کرنے والوں کو بڑائی ملتی ہے۔ اگر کہیں کسی کی مدد کرنے کا موقع ملا تو اس سے گریز نہیں کروں گا لیکن اپنے مقصد کے حصول کے لیے جو کچھ ہو سکا، اس سے بھی گریز نہیں کروں گا، مجھے ایک بڑا آدمی بننا چاہیے۔ پھر میں اپنی جگہ سے اٹھ گیا۔ اس ہوٹل کو میں نے خاصے عرصے کے لیے حاصل کیا تھا اور سوچ سمجھ کر حاصل کیا تھا۔ چنانچہ اب مجھے ہوٹل میں ایسی جگہوں کی تلاش تھی جہاں میں اپنی قیمتی چیزیں پوشیدہ کر سکوں۔ مثلاً یہ عینک اور یہ محلول اور یہ رقم وغیرہ سب کچھ احتیاط سے خرچ کرنا ہوگا۔

میں نے آخرکار ایسی جگہ تلاش کر لی۔ ساری چیزیں میں نے الگ الگ چھپائی تھیں اور اس انداز میں چھپائی تھیں کہ کسی دوسرے شخص کی نگاہوں میں نہ آ سکیں۔ مجھے علم تھا کہ ہوٹل

کے ملازم کمروں کی صفائی بھی کرتے ہیں۔ ان کے پاس ڈوپلیکیٹ چابی ہوتی ہے۔ خیر محلول اور عینک تو ایسی چیز نہیں تھی جسے وہ لوگ توجہ کے قابل سمجھیں حالانکہ یہی میرے لیے اس وقت کائنات کی سب سے قیمتی چیزیں تھیں۔

پھر بھی میں نے ان کے تحفظ کے لیے ایک معقول بندوبست کیا۔ میں نے محلول کو بڑی احتیاط سے مختلف شیشیوں میں منتقل کیا اور یہ شیشیاں کئی ایسی جگہوں میں چھپا دیں جہاں سے عام نگاہوں میں نہ آسکیں۔ اگر ایک آدھ کسی کے ہاتھ لگ بھی جائے تو باقی موجود رہیں۔ مجھے یہ اندازہ نہیں تھا کہ اس محلول کو آنکھوں میں ٹپکانے کے بعد کتنے وقت تک بینائی بحال ہو جاتی ہے۔

یہ بھی ایک تجربہ کرنا تھا۔ ابھی ضروری نہیں تھا کہ ہوٹل سے باہر نکلوں۔ میں مختلف معاملات پر سوچ رہا تھا۔ چوہدری بدر شاہ اپنے اہلِ خاندان کے ساتھ دفن ہو چکا تھا لیکن مقدمے کے دوران جن لوگوں نے پیروی کی تھی وہ بہت بڑے بڑے لوگ تھے۔ میری ان سے کوئی دشمنی نہیں تھی۔ میں نے اپنے دشمن کو ختم کر دیا تھا۔ ہاں اگر وہ لوگ کہیں میرے پیچھے لگے تو میں دیکھ لوں گا۔

پہلا دن گزر گیا۔ دوسرا دن اور تیسرا دن بھی پُرسکون گزر گیا۔ میری شیو کافی بڑھ چکی تھی۔ میں نے سوچا کہ چہرے پر اگر ہلکی سی داڑھی اُگ آئے تو کوئی حرج نہیں۔ آئینے میں آپنے آپ کو دیکھا تو خاصا بہتر محسوس ہوا۔ پھر دل چاہا کہ شرمین اور پروفیسر ضرغام کے بارے میں ذرا سی معلومات حاصل کروں۔ عینک آنکھوں پر لگائی اور تصور کے گھوڑے دوڑا دیئے۔ میں نے دیکھا کہ شرمین سر جھکائے ناشتے کی میز پر بیٹھی ہوئی ہے۔ کھانے کی اشیاء اس کے سامنے رکھی ہوئی ہیں اور پروفیسر ضرغام اس کے سامنے بیٹھا ہوا اس سے باتیں کر رہا ہے۔

''نوجوانی کی عمر بڑی غلطیوں کی عمر ہوتی ہے بیٹا۔ تم نے میری ساری عمر کی محنت پر پانی پھیر دیا۔ کیا ملا تمہیں؟ وہ شخص چلا گیا ناں تمہیں چھوڑ کر جیسا کہ تم نے مجھے بتایا کہ کیا کچھ نہیں کیا تم نے اس کے لیے''۔

''غلطی ہو گئی پاپا...... غلطی ہو گئی''۔

''جانتے ہو بیٹا، وہ ہمارے پاس سے کیا کیا لے گیا۔ وہ عینک جو میری ساری زندگی کا حاصل تھی، وہ محلول جو بے شمار انسانی آنکھوں کا عرق تھا اور اب مجھے وہ عرق تیار کرنے میں

کتنا وقت لگ جائے گا۔ یہ عینک بیٹا جو تم نے بڑی آسانی سے اس شخص کو دے دی۔ وہ میری زندگی بھر کی کمائی تھی۔ اب اسے دوبارہ تیار کرنے میں، میں دوبارہ کامیاب ہو سکوں گا بھی یا نہیں۔ بس کیا کہا جائے، اپنوں ہی کے ہاتھوں موت حاصل ہوئی ہے۔ بھلا اس کی کیا مجال تھی کہ وہ نکل جاتا''۔

''پاپا...... ایک بات کہوں''۔

''بولو......''

''پاپا...... میں اپنی کم عمری کی وجہ سے دھوکہ کھا گئی۔ مجھے دنیا کا زیادہ تجربہ نہیں۔ میں ہمدردی کا شکار ہو گئی پاپا...... اور سچی بات یہ ہے پاپا کہ میرے دل میں اس کے لیے محبت جاگ اٹھی تھی۔ بس اپنی حماقت کا شکار ہو گئی میں پاپا، لیکن کیا مجھے آپ کچھ عرصے کے لیے آزادی دیں گے''۔

''آزادی''۔

''ہاں پاپا، جو کچھ میں نے کیا ہے اس کا کفارہ ادا کروں گی''۔

''میں سمجھا نہیں بیٹا!''

''میں اسے تلاش کروں گی میں یہ ظاہر کروں گی کہ میں نے اس کی محبت میں آپ کو چھوڑ دیا ہے اور اسے تلاش کرتی پھر رہی ہوں۔ پاپا...... اس کے بعد میں زندہ یا مُردہ اسے آپ کے سامنے پیش کروں گی۔ مجھے اب اپنی حماقت کا بھرپور احساس ہو چکا ہے اور وہ بھی اس وجہ سے پاپا...... کہ اس شخص نے اپنا مطلب نکالنے کے بعد مجھ پر تھوک دیا۔ پاپا میرا پندار یہ توہین برداشت نہیں کر رہا ہے۔ پاپا میں اس سے انتقام لوں گی اپنا۔ میں اس کے پاس موجود ان تمام چیزوں کو واپس حاصل کروں گی۔ پاپا بتایئے کہ کیا آپ مجھے اس کا موقع دیں گے؟''

''سوچنا پڑے گا مجھے...... میں کوئی دوسری غلطی نہیں کرنا چاہتا اور سنو! اس بارے میں اب اس کے بعد ہم کوئی گفتگو نہیں کریں گے کیونکہ وہ اس عینک کے ذریعے ہمیں محسوس کر سکتا ہے، ہماری تمام باتوں سے آگاہ ہو سکتا ہے۔ احتیاط رکھو اس بات کی''۔

''ایک مرتبہ پاپا...... صرف ایک مرتبہ مجھے موقع دیجیے میں آپ کو مایوس نہیں کروں گی''۔

''رُکنا ہوگا...... شرمین رکنا ہوگا۔ مجھے سوچنا ہوگا''۔ اس نے کہا اور میرے حلق سے بے اختیار ایک قہقہہ نکل گیا۔ میں نے دونوں ہاتھ جوڑ کر ماتھے سے لگاتے ہوئے کہا۔

"شکریہ...... میری تقدیر تیرا شکریہ، کھلی ہے تو اس طرح کہ ہر دروازہ میرے سامنے کھول دیا۔ میرے دل میں ایک جو خلش تھی اور میں جو سوچ رہا تھا کہ شرمین کے ساتھ برا ہوا تو اب میرا دل بھی صاف ہو گیا۔ وہ میرے دشمن کی بیٹی ہے جس سے مجھے نقصان ہوا۔ اچھا ہوا میں اس کے ارادے سے واقف ہو گیا۔ تم اگر مجھے کہیں ملیں شرمین تو میں تمہارا اتنا پُرجوش استقبال کروں گا کہ تم بھی کیا یاد کرو گی"۔

دل و دماغ پر سے ایک بوجھ ہٹ گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ ضمیر کو مارنا دنیا کا مشکل ترین کام ہے۔ پتہ نہیں وہ کون لوگ ہیں جو اس میں بڑی آسانی کے ساتھ کامیاب ہو جاتے ہیں۔ شرمین کے لیے ابھی تک دل دکھتا رہا تھا لیکن اب سب ٹھیک تھا۔

چنانچہ میں نے فیصلہ کیا کہ اب اس کے بعد باہر نکل کر ذرا دنیا کا جائزہ لینا چاہیے۔ اَب میں اپنے باقی دشمنوں کو بھی زیر کر لوں گا۔ اپنے آپ کو آزمانا تو ضروری ہے۔ پھر اسی رات نہ جانے کیوں بابا یاد آ گئے۔ بہت اچھا تھا میرا باپ، بہت نیک اور اعلیٰ ظرف لیکن چوہدری بدر شاہ نے اسے ختم کر دیا۔ دل میں ایک عجیب سی ہوک اٹھنے لگی اور میں نے فیصلہ کر لیا کہ کل راج پور جاؤں گا۔ اپنے باپ کی قبر پر جہاں میں ان کی تدفین کے بعد آج تک نہیں گیا تھا۔

رات آخر کار گزر گئی اور پھر صبح کو میں جلدی اٹھ گیا۔ مجھے اپنا اہم فریضہ سرانجام دینا تھا۔ ایک بار پھر میں نے اپنی چھپائی ہوئی چیزوں پر غور کیا۔ میرے پیچھے اگر کوئی کمرے میں داخل ہوتا ہے تو کیا وہ ان چیزوں کے بارے میں جان سکے گا۔ عینک کو میں اپنی زندگی سے زیادہ عزیز رکھنا چاہتا تھا کیونکہ وہ ہی میری پُراسرار قوتوں کا سرچشمہ تھا۔ اسے ساتھ لیے لیے پھرنا بھی میرے لیے ممکن نہیں تھا۔ حالانکہ وہ بڑی کارآمد چیز تھی۔ اسے لگانے کے بعد تصور کی آنکھ سے پوری کائنات کا سفر کیا جاسکتا تھا لیکن محلول کی ایک چھوٹی شیشی جسے میں نے مختلف شیشیوں میں منتقل کر دیا تھا اپنے پاس بھی محفوظ رکھنا بہت ضروری تھا۔ ابھی میں تجرباتی دور میں تھا اور یہ نہیں جانتا تھا کہ یہ محلول کتنی دیر تک گمشدہ بینائی کو بحال رکھ سکتا ہے۔ یا اس کے اور کیا کیا فائدے ہیں۔ تمام تر تیاریوں کے بعد میں باہر نکل آیا۔ راج پور جانے کے لیے ویسے تو بہت سے ذریعہ سفر تھے لیکن میں چاہتا تھا کہ آزادی کے ساتھ اپنے کام کر سکوں۔

چنانچہ میں نے اپنی دوسری عینک آنکھوں پر لگائی۔ جو میرے عیب کو چھپانے کے لیے تھی اور اس کے بعد رینٹ اے کار سے ایک کار حاصل کی اس میں مجھے کوئی دقت نہیں ہوئی تھی۔ یہ

کار، بار آج کل بڑے اعلیٰ پیمانے پر چل رہا ہے اور اس سلسلے میں خاصی رعایتیں دی گئی ہیں۔ چنانچہ کار کے حصول کے بعد میں راج پور چل پڑا۔

بہت عرصے کے بعد ادھر کا رخ کر رہا تھا۔ جب سے اپنے آپ کو پولیس کے حوالے کیا تھا دوبارہ کبھی راج پور جانے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ مجھے اپنے باپ کی قبر بھی نہیں معلوم تھی لیکن راج پور میری اپنی جائے پیدائش تھی ہر شخص مجھے جانتا تھا اور میں کسی سے بھی اپنے باپ کی قبر کے بارے میں پوچھ سکتا تھا۔

بہرحال سفر طے کرتا رہا۔ راستے میں بہت سے خیال دل میں آ رہے تھے۔ نہ جانے کون کون سی سوچیں دامن گیر تھیں۔ آخر کار راج پور پہنچ گیا۔ اس بستی سے میری بچپن سے لے کر جوانی تک کی یادیں وابستہ تھیں اور میں یہاں کے ایک ایک چپے سے واقف تھا۔ زیادہ لوگوں کے سامنے جانا خطرناک تھا، میں الیاس تایا کے پاس پہنچ گیا۔ جن کی راج پور کے نواحی علاقے میں ایک دکان تھی۔ الیاس تایا کا بیٹا حفیظ میرا بہت اچھا دوست تھا۔ بچپن میں نے حفیظ کے ساتھ گزارا تھا۔ بہرحال میری کار اس علاقے میں پہنچ گئی جہاں الیاس تایا کی دکان تھی۔ وہ دکان پر موجود تھے۔ کار سے اتر کر میں پیدل ان کے پاس پہنچا اور میں نے انہیں سلام کیا تو مجھے دیکھ کر وہ بولے۔

"جی بابو صاحب!...... کیا چاہیے سرکار!"

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں، الیاس تایا۔ نہ میں بابو صاحب ہوں نہ سرکار ہوں، آپ مجھے نہیں پہچانے۔ میں طارق خان کا بیٹا آصف خان ہوں"۔

الیاس تایا کو جیسے بچھو نے کاٹ لیا۔ بری طرح اچھل پڑے اور اِدھر اُدھر دیکھنے لگے ان کے چہرے پر خوف کے نقوش بیدار ہو گئے تھے۔

"آصف...... آصف...... آصف خان"۔

"ہاں الیاس تایا!......"

"م...... مگر...... مگر"۔

"ہاں، آپ یہی کہنا چاہتے ہیں ناں کہ مجھے تو پھانسی ہو گئی تھی لیکن میں کوئی روح نہیں ہوں، ایک جیتا جاگتا انسان ہوں۔ طارق خان کا بیٹا آصف خان اور آپ جانتے ہیں کہ میں نے اپنے باپ کی موت کے بدلے کی قسم کھائی تھی۔ میں نے بدلہ لے لیا اور اس کے بعد اپنے

آپ کو پولیس کے حوالے کر دیا‘‘۔ ابھی میں الیاس تایا کو یہ ہی بتا رہا تھا کہ پیچھے سے حفیظ آ گیا۔ اس نے شاید میری باتیں سن لی تھیں اس کے منہ سے سرسراتی ہوئی آواز نکلی۔

’’آصف، میرے دوست، میرے بھائی!‘‘ ہم دونوں ایک دوسرے کے گلے لگ گئے۔ الیاس تایا اب بھی پھٹی پھٹی آنکھوں سے مجھے دیکھ رہے تھے۔

حفیظ نے کہا۔ ’’آپ کو نہیں معلوم ابا جی لیکن یہ خبر کئی دن پہلے دلاور خان تک پہنچ گئی ہے کہ آصف خان جیل سے بھاگ نکلا ہے‘‘۔

’’مم...... مم...... مجھے نہیں بتایا تم نے‘‘۔

’’مجھے بھی آج ہی معلوم ہوا ہے۔ بستی میں تو خاصی چہ میگوئیاں ہو رہی ہیں کیونکہ دلاور خان کو جب سے یہ بات معلوم ہوئی، اس نے اپنے آدمیوں کو تیار کرنا شروع کر دیا ہے‘‘۔

’’ب...... بیٹا تم اتنے خطرے میں ہونے کے باوجود اس طرح بھاگے بھاگے پھر رہے ہو‘‘۔ الیاس تایا نے ہمدردی سے کہا۔

راج پور کا ہر شخص مجھ سے ہمدردی رکھتا تھا۔ میں نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

’’الیاس تایا۔ اتنی بے خبری میں نہیں پھر رہا ہوں میں۔ ظاہر ہے میرے پیچھے پولیس بھی ہے اور دوسرے دشمن بھی ہیں جن میں اب مجھے پتہ چلا کہ دلاور خان بھی ہے‘‘۔

’’دلاور خان نے تو راج پور والوں پر بڑے ظلم کیے ہیں۔ بستی میں ان تمام لوگوں کو پکڑ کر میدان میں جمع کیا اور جوتے لگوائے جن کا تعلق کسی بھی طرح طارق خان اور اس کے بیٹے آصف خان سے تھا۔ حفیظ کو بھی کافی مارا پیٹا ہے اس نے۔ مجھے بوڑھا سمجھ کر چھوڑ دیا۔ تمہارے گھر کو اس نے کھدوا دیا اور اس پر چار دیواری کر کے اسے کوڑا گھر بنوا دیا گیا ہے۔ راج پور والوں کو حکم دیا گیا ہے کہ بستی بھر کا کوڑا اسی جگہ ڈالا جائے۔ ایک آدمی مقرر کر دیا ہے جو اس کوڑے پر مٹی کا تیل ڈال کر آگ لگا دیتا ہے۔ دلاور خان نے بستی والوں سے کہا کہ بدقسمتی سے طارق خان کا کوئی خاندان نہیں ہے ورنہ وہ اسی کوڑا گھر پر انہیں جلا کر خاکستر کر دیتا۔ بڑی نفرتوں کا اظہار کیا ہے اس نے‘‘۔

’’ٹھیک ہے، قدرت ہر انسان کے لیے کوئی نہ کوئی مشغلہ فراہم کر دیتی ہے‘‘۔ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ پھر بولا۔

’’حفیظ، بابا کی قبر کہاں ہے تمہیں معلوم ہے؟‘‘

’’ہاں کیوں نہیں۔ جمعرات کی جمعرات ابا خاموشی سے جاتے ہیں، پھول چڑھاتے ہیں اور فاتحہ پڑھتے ہیں۔ میں بھی کبھی کبھی ان کے ساتھ چلا جاتا ہوں‘‘۔ میں نے ایک غمزدہ مسکراہٹ کے ساتھ الیاس تایا کو دیکھا اور کہا۔

’’بہرحال اب مجھے پرواہ نہیں ہے۔ میرے باپ کا قاتل تو قبر بھی نہیں پا سکا۔ مجھے میرے باپ کی قبر دکھا سکو گے‘‘۔

’’کیوں نہیں، چلو‘‘۔ حفیظ نے کہا۔

الیاس تایا کے چہرے پر ذرا سے تردد کے آثار پیدا ہوئے۔ پھر انہوں نے کہا۔

’’بیٹا! اگر حفیظ کے بجائے میں چلوں تمہارے ساتھ تو زیادہ اچھا نہیں ہوگا؟‘‘

’’واپس ادھر ہی آنا۔ میں کسی سے نہیں ڈرتا‘‘۔ حفیظ نے کہا۔

میں نے اس کا شانہ تھپتھپایا اور الیاس تایا کے ساتھ چل پڑا۔ خاصا فاصلہ طے کرنے کے بعد ہم قبرستان پہنچ گئے۔ الیاس تایا نے مجھے دور سے قبر دکھائی۔ میں نے کہا۔

’’میں فاتحہ پڑھ لوں آپ کو واپس چھوڑ دوں گا‘‘۔

’’نہیں بیٹا، اب میری ضرورت تو نہیں ہے نا تمہیں؟‘‘ الیاس تایا نے کہا۔

’’نہیں، بالکل نہیں۔ آپ نے یہاں تک جو تکلیف کی ہے میں تو اس کے لیے آپ سے شرمندہ ہوں‘‘۔

’’نہیں بیٹا! حالات ایسے ہیں ورنہ...... اور میری بات سنو برا تو نہیں مانو گے؟‘‘

’’نہیں بتایئے‘‘۔

’’بیٹا راج پور مت آنا۔ اگر دلاور خان کو پتہ چل گیا تو بہت سوں کی شامت آ جائے گی‘‘۔ میں سمجھ گیا کہ الیاس تایا مجھے حفیظ سے دور رہنے کا مشورہ دے رہے ہیں۔ میں نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

’’ٹھیک ہے الیاس تایا ابھی نہیں آؤں گا...... آؤں گا لیکن اس وقت جب آپ کو اور راج پور والوں کو میری ذات سے کوئی خطرہ نہیں ہوگا۔ آپ جایئے، میں آپ کو دیکھ رہا ہوں‘‘۔

الیاس تایا نے مجھے دعائیں دیں اور واپسی کے لیے مڑ گئے۔ جب وہ نگاہوں سے اوجھل ہو گئے تو میں اس قبر کی جانب چل پڑا جس میں بابا سو رہے تھے۔ قبر کے پاس پہنچ کر میں بیٹھ گیا۔ میرے دل میں بابا کا خیال تھا۔ میں انہیں دیکھ رہا تھا۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ قبر

کے ساتھ میرے سامنے آ بیٹھے ہوں۔ میں نے گلوگیر لہجے میں کہا۔

''بابا.... کچھ بھی نہیں تھا آپ کے سوا میری زندگی میں اور یہی وجہ تھی کہ میں نے آپ کے بعد جینے کا ارادہ چھوڑ دیا۔ مگر بابا تقدیر نے مجھے زندگی کی طرف گھسیٹ لیا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ آپ کے بغیر یہ زندگی بے کیف ہوگی۔ میرا تو سب کچھ آپ ہی تھے۔ میں آپ کے لیے بہت افسردہ ہوں بابا۔ آپ کی روح کو بھی سکون ملا ہوگا کہ میں نے بدرشاہ کے ساتھ اس کے خاندان کو بھی ختم کر دیا اور جو لوگ باقی ہیں اور اپنے دل میں بدر شاہ کے لیے ہمدردی رکھتے ہیں۔ آپ دیکھ لینا وہ بھی میرے ہاتھوں ہی فنا ہوں گے۔ بابا میں انہیں بھی نہیں چھوڑوں گا۔ مجھے حوصلہ دیجیے، مجھے اپنی آواز سنایئے''۔

میں اس طرح گم ہوگیا کہ آس پاس کی خبر نہ رہی۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے بابا میرے سامنے ہی کھڑے ہوں۔

وقت گزرتا رہا، شام ہوگئی اور پھر قبرستان میں اندھیرا پھیلنے لگا۔ میں نے بہت وقت یہاں قبر کے پاس گزار دیا تھا۔ میرا دل ہی وہاں سے اٹھنے کو نہیں چاہ رہا تھا۔ دفعتاً مجھے کچھ روشنیاں نظر آئیں جو اسی طرف آ رہی تھیں۔

نہ جانے کیوں میں چونک پڑا۔ یہ روشنیاں کسی گاڑی کی تھیں۔ حفیظ نے مجھے دلاور خان کے بارے میں اطلاع دے دی تھی۔ دلاور خان راج پور میں نہیں رہتا تھا بلکہ راج پور کے نزدیک ایک نواحی بستی میں اس کی زمینیں تھیں۔ یہ بدر شاہ کا چچا زاد بھائی تھا اور بڑا خطرناک زمیندار تصور کیا جاتا تھا۔ اس نے بڑی دلیری دکھائی تھی اور جیسا کہ الیاس تایا نے بتایا تھا، اس نے میرے گھر کو کوڑے دان بنا دیا تھا۔ خیر یہ تو الگ بات تھی۔ آنے والے وقت میں ممکن ہے میں خود اس کی حویلی کو قبرستان بنا دوں لیکن اس وقت وہ برق رفتاری سے اس طرح بڑھ رہا تھا۔ میں نے ایک بڑی جیپ دیکھی تھی جس میں سو فیصد دلاور خان ہی تھا۔ میں فوراً قبر کے پاس سے ہٹا اور بابا سے کہا۔

''چلتا ہوں بابا۔ میری زندگی اب ذرا مختلف ہوگئی ہے۔ ان لوگوں کے ساتھ آنکھ مچولی میری زندگی کا ایک محبوب مشغلہ بن چکا ہے''۔ بہرحال میں پھرتی سے اپنی گاڑی کے قریب پہنچا اور اسے اسٹارٹ کر کے تیزی سے چل پڑا۔ تھوڑی دیر کے بعد میں اس تنگ اور ٹوٹی پھوٹی سڑک پر پہنچ گیا جو قبرستان کے بائیں سمت سے گزرتی تھی۔ یہ سڑک ذرا اونچائی پر تھی لیکن

بہرحال میری کار طاقتور تھی۔ وہ اس سڑک پر چڑھی اور میں نے تیزی سے آگے بڑھا دیا۔ مجھے اپنے پیچھے شور سنائی دیا تھا اور بہت سی آوازیں ابھری تھیں۔ انہوں نے مجھے فرار ہوتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ بہرحال یہ راستے پیدل تو میں نے سیکڑوں بار طے کیے تھے۔ کار میں پہلی بار سفر کر رہا تھا۔

سڑک بہت تنگ اور خراب حالت میں تھی۔ کار کئی بار نشیب میں اترتے اور الٹتے الٹتے بچی۔ بہ حالتِ مجبوری مجھے روشنیاں جلانی پڑیں اور کار اس ناہموار سڑک پر اچھلتی کودتی آگے بڑھنے لگی۔ خاصا سفر طے کرنے کے بعد میں نے مڑ کر دیکھا تو بہت دور کہیں دو روشن نقطے نظر آئے وہ لوگ میرا مسلسل تعاقب کر رہے تھے۔ دلاور خان کو میرے بارے میں راج پور ہی سے علم ہوا ہوگا۔ علم جیسے بھی ہوا ہو میں نہیں جانتا تھا۔ ہوسکتا ہے حفیظ یا الیاس تایا خطرے میں پڑ گئے ہوں۔

بہرحال وہ لوگ میرا پیچھا نہیں چھوڑ رہے تھے۔ میرے اور اس گاڑی کے درمیان فاصلہ کافی تھا۔ تاہم میں نے رفتار کچھ اور بڑھا دی۔ جیپ کار کی نسبت زیادہ بہتر طور پر سفر کر رہی تھی۔ اور تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد وہ روشنیاں واضح ہونے لگی تھیں۔ میں نے سوچا کہ سڑک جیسی بھی ہے ایک ہی ہے۔ اگر میری کار کی ہیڈلائٹ روشن رہیں تو ان لوگوں کی رہنمائی ہوگی اس وقت ان لوگوں کو ڈوز دینے کی ضرورت تھی چنانچہ میں نے روشنیاں بند کر دیں اور کار کچے میں اتار لی۔ ہیڈ لائٹ کے بغیر کار چلانا خودکشی ہی تھی۔ کہیں درخت تھے اور کہیں بڑے بڑے گڑھے اور کہیں سخت مٹی کے اونچے نیچے تودے۔ آسمان پر محض تاروں کی مدھم روشنی تھی۔ اتنی دیر کے سفر میں میری آنکھیں اندھیرے میں دیکھنے کی عادی ہوگئی تھیں اور میں پوری پھرتی اور دماغی قوتوں کے ساتھ کار دوڑا رہا تھا۔ چونکہ ان علاقوں سے واقف تھا، اس لیے جلد ہی مجھے احساس ہوگیا کہ میں سڑک سے بہت دور کس طرف نکل آیا ہوں۔

اب دلاور خان کی جیپ بھی مجھے نظر نہیں آ رہی تھی۔ میں ذرا سا پریشان ہوگیا تھا چنانچہ میں نے کار کی رفتار کسی قدر سُست کر دی۔ کار ابھی تک میرا ساتھ دے رہی تھی۔ میرا مقصد بھی میرا ساتھی تھا۔ تقریباً ایک گھنٹے کے ایسے ہی پیچ در پیچ سفر کے بعد مجھے اندازہ ہوگیا کہ اب وہ جیپ میرے تعاقب میں نہیں ہے، وہ لوگ مجھے کھو بیٹھے ہیں تو ایک جگہ میں نے جھاڑیوں کے جھنڈ دیکھے اور کار کا رُخ اس جانب کر دیا۔ اب یہ پتہ نہیں کہ یہ کون سا علاقہ تھا۔ اس طرح تو

اس کی شناخت ممکن نہیں تھی اور پھر ویسے بھی مجھے بستی کے آس پاس کے علاقوں کے بارے میں ہی معلومات حاصل تھیں۔ اس سے زیادہ کا سفر میں نے نہیں کیا تھا۔

آخر کار میں نے ایک جھاڑیوں کے جھنڈ کے عقب میں کار روکی اور سر باہر نکال کر گہری گہری سانسیں لینے لگا۔ میں نے قرب و جوار میں نگاہیں دوڑائیں تو پتہ چلا کہ یہ جھاڑی تنہا نہیں ہے بلکہ آس پاس کے علاقے میں درختوں کی بہت بڑی تعداد موجود ہے۔ حیرت کی بات تھی کہ اس جنگل کے بارے میں مجھے کچھ نہیں معلوم تھا۔ جہاں سے جنگل شروع ہوتا تھا وہاں درخت تاحدِ نظر ایک سیدھ میں چلے گئے تھے۔ جنگل کے ساتھ تقریباً آٹھ میٹر چوڑی زمین کی پٹی بالکل ہموار اور ریتلی نظر آ رہی تھی۔ اچھا خاصا صاف ستھرا راستہ تھا جو سوکھے پتوں سے اٹا ہوا تھا۔ میں اس راستے کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا لیکن میرے دل نے چاہا کہ میں اس راستے پر سفر کروں۔ ایسے بھی یہاں رکنے کی کوئی تک نہیں تھی۔ میں نے ایک بار پھر کار سنبھالی اور اس راستے پر چل پڑا۔ واقعی ایک عجیب سی سڑک تھی جس کے بارے میں مجھے نہیں معلوم تھا کہ کہاں جاتی ہے۔ کافی دیر تک اس قدرتی یا غیر قدرتی سڑک پر میرا سفر جاری رہا۔

پھر اچانک میری کار میں ایک زوردار کڑاکا ہوا اور ایک تیز گڑگڑاہٹ کے ساتھ وہ رک گئی اور انجن بند ہو گیا میں نے حیرت اور پریشانی کے ساتھ قرب و جوار میں دیکھا۔ انجن سے مجھے دھوئیں کی خفیف سی لکیر نکلتی ہوئی دکھائی دی۔ کچھ دیر تک میں خاموش بیٹھا رہا پھر میں نے ڈرتے ڈرتے دوبارہ کار اسٹارٹ کرنے کی کوشش کی لیکن سیلف تک نہیں گھوما تھا۔ کافی دیر تک میں سیلف لگاتا رہا لیکن یہ ایک احمقانہ کوشش تھی۔ ویسے مجھے کار وغیرہ کا کوئی تجربہ نہیں تھا۔ میں نے ایک گہری سانس لی۔ مجھ پر تھکن نے غلبہ پا لیا تھا اور میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اب مجھے کیا کرنا چاہیے۔

ابھی بات سمجھ میں بھی نہیں آ رہی تھی۔ میں تقریباً نیم دراز ہو گیا۔ اب تو پیدل چلنے کو بھی دل نہیں چاہ رہا تھا۔ بدن کی تھکن مجبور کر رہی تھی کہ میں آرام کروں، بہت دیر تک اسی طرح نیم غشی جیسی کیفیت میں سیٹ پر لیٹا رہا۔ پھر آنکھیں کھول کر اِدھر اُدھر دیکھا اور اچانک ہی میں چونک پڑا۔ ایک دم مجھے احساس ہوا کہ وہ خفیف سی آواز بہت دیر سے آ رہی ہے جس پر میں نے غور ہی نہیں کیا۔

اب چونکنے کے بعد میں نے اپنے کان اس آواز پر لگائے۔ تو مجھے احساس ہوا کہ "

گھوڑوں کے ٹاپوں کی آواز ہے۔ جو جنگل کے اندر سے آ رہی تھی۔ صحیح طور پر تو یہ اندازہ نہیں ہوا کہ گھوڑوں پر کون لوگ تھے۔ دلاور خان مجھے پانے میں ناکام ہو کر کسی عمل پر اتر آیا ہے تو دوسری بات ہے۔ ورنہ اصولی طور پر یہ دلاور خان کے آدمی نہیں ہونے چاہئیں تھے پھر بھی ہوشیاری بڑی چیز تھی۔ گاڑی دیکھی جا سکتی تھی۔ ٹاپوں کی آواز جس طرف سے آ رہی تھی میں دبے قدموں اس سے آگے چل پڑا اور درختوں کے درمیان گھس گیا۔ درخت زیادہ گنجان نہیں تھے لیکن جتنا بھی دور کھڑے ہو کر دیکھا جاتا جنگل اتنا ہی گھنا نظر آتا ہے۔ میں ایک درخت کے عقب میں دبک کر بیٹھ گیا۔ ٹاپوں کی آواز اب مجھے بالکل صاف سنائی دے رہی تھی۔ میں درخت کے پیچھے سے جھانک کر اُدھر دیکھ سکتا تھا۔

چنانچہ میں نے یہی عمل کیا اور پھر میں نے ان دونوں گھوڑے سواروں کو دیکھ لیا۔ جو میری کار کو دیکھ کر اس کے قریب پہنچ گئے تھے۔ وہ مسلح تھے اور ان کے کندھوں پر رائفلیں لٹکی ہوئی تھیں۔ کار کے قریب پہنچتے ہی انہوں نے اپنی رائفلیں سنبھال لیں اور گھوڑوں سے نیچے اتر آئے پھر ان میں سے ایک کی کڑک دار آواز ابھری۔

"کون ہے سامنے آؤ ورنہ ہم گولی چلا دیں گے"۔ دو تین منٹ انتظار کرنے کے بعد جب انہیں کوئی آواز سنائی نہ دی تو ان میں سے ایک نے رائفل سیدھی کی اور یکے بعد دیگرے کئی گولیاں چلائیں۔ انہوں نے کار کے دونوں ٹائر ناکارہ کر دیئے تھے۔ گولیوں کی بازگشت جنگل میں گونجنے لگی اور پھر سکوت چھا گیا۔ پھر وہ بڑے محتاط انداز میں کار کی طرف بڑھ گئے۔ میں ان کی تمام حرکتوں کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ جب انہیں یقین ہو گیا کہ کار میں کوئی موجود نہیں ہے تو وہ سیدھے ہو گئے ان میں سے ایک نے ٹارچ نکالی اور کار کی جانب بڑھنے لگا۔ مجھے غور سے انہیں دیکھنے کا موقع مل گیا۔ کچھ اور ہی لگ رہا تھا میرا خیال تھا کہ وہ ڈاکو تھے اس سے پہلے بھی راج پور اور اس کے نواحی علاقوں میں ڈاکوؤں کی اچھی خاصی ہنگامہ آرائی ہوتی رہتی تھی اور قرب و جوار کی بستیوں میں ڈاکے پڑتے رہتے تھے۔ اب ان کی آوازیں بھی سنائی دینے لگی تھیں۔ ان میں سے ایک نے کہا۔

"یہ چکر کیا ہے کوئی نہ کوئی تو اس گاڑی کو یہاں تک لایا ہوگا، وہ کہاں گیا؟" دوسرے نے کار کے بونٹ پر ہاتھ رکھا اور بولا۔

"انجن گرم ہے اس کا مطلب ہے کہ کار کو یہاں آئے ہوئے زیادہ دیر نہیں گزری"۔ وہ

دونوں اندھیرے میں آنکھیں پھاڑتے رہے۔ رائفلیں اب بھی ان کے ہاتھ میں تھیں۔ پھر ان میں سے ایک نے کہا۔

"چھوڑو یار دفع کرو۔ جب کوئی سامنے آئے گا تو دیکھا جائے گا"۔ میرے دل میں اس وقت ایک عجیب سا خیال ابھرا کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی چاہیے۔ بے شک یہ پنگا لینے والی بات تھی۔ اب میں وہ پہلے جیسا آصف خان نہیں تھا۔ طاقتور آدمی تھا۔ جیل کاٹ چکا تھا۔ چنانچہ کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی تھا اور آخرکار میں نے اپنے بدن میں تحریک پیدا کی اور درختوں کی آڑ لیتا ہوا کسی چوکنے چیتے کی طرح ان کے پیچھے پہنچ گیا۔ اچانک ہی کچھ سوکھے پتے میرے پیروں تلے آئے اور آواز خاصی بلند ہوگئی۔ میں ان کے کافی قریب پہنچ چکا تھا اور مجھے احساس ہوا تھا کہ یہ گڑبڑ ہوگئی ہے۔ عین اسی وقت ایک گھوڑا نہ جانے کیوں بری طرح چونکا۔ پتوں کے چرچرانے کی آواز ابھری ہی تھی کہ گھوڑے کے ہنہنانے کی آواز اس پر غالب آگئی اور بات بن گئی وہ جو کوئی بھی تھے انہوں نے یہی سمجھا تھا کہ پتے گھوڑوں کے پیروں تلے آکے چرچرائے ہیں۔ اس طرح ان کی توجہ میری طرف نہیں ہوسکی تھی۔

لیکن وہ انسان تھے۔ انہوں نے انسانی عقل سے ہی سوچا تھا البتہ جانور ان سے زیادہ چالاک تھا۔ وہ گھوڑا جو ہنہنایا تھا، اپنا منہ فضا میں بلند کرکے عجیب سے انداز میں دانت نکال رہا تھا اور نتھنے پھڑپھڑا رہا تھا۔ اسے یقیناً میرا نشان مل گیا تھا اور وہ اپنے مالک کو بتانے کی کوشش کر رہا تھا لیکن انہوں نے اس پر توجہ نہیں دی تھی۔ حالانکہ وہ جنگلوں میں زندگی گزارنے والے لوگ تھے۔ انہیں ان باتوں کا زیادہ علم ہونا چاہیے تھا لیکن انہوں نے غور ہی نہیں کیا تھا۔

بہرحال میں ان کی غفلت پر ان کا ممنون تھا۔ اب میں ان کے بہت قریب پہنچ چکا تھا۔ حالانکہ میں ان سے الجھنا نہیں چاہتا تھا لیکن نہ جانے کیوں میں انہیں قریب سے دیکھ رہا تھا اور کچھ سوچ بھی رہا تھا۔ مجھے یہ اندازہ تو ہو چکا تھا کہ کار بالکل ناکارہ ہو چکی ہے۔ رات کی تاریکیاں تو مجھے محفوظ رکھے ہوئے ہیں لیکن دن کی روشنیوں میں وہ لوگ بھی ضرور کوئی کارروائی کریں گے جنہوں نے بروقت مجھ پر قبرستان میں حملہ کیا تھا۔

بہرحال میں انتظار کرتا رہا۔ میرے ذہن پر بڑا عجیب سا تاثر پیدا ہوتا جا رہا تھا پھر میں نے ان میں سے ایک کی آواز سنی۔

"اوئے...... چھوڑ یار پتہ نہیں کیا چکر تھا۔ ہم کیوں مشکل میں پڑ گئے ہیں۔ جو کام ہمیں دیا

گیا ہے ہمیں اس کی فکر کرنی چاہیے"۔

"ٹھیک ہے چلو...." دوسرے نے کہا لیکن جیسے ہی وہ واپس مڑے، میں نے عقب سے ان پر چھلانگ لگا دی اور انہیں اپنے ساتھ لے کر نیچے آ رہا۔ ان کے سر بری طرح ایک دوسرے سے ٹکرائے اور وہ انتہائی بدحواس ہو گئے۔ ان میں سے ایک کے حلق سے کچھ ایسی آواز نکلی جیسے وہ کسی بلا کی گرفت میں آ گیا ہو۔ اس سے پہلے کہ ان میں سے ایک کا سر زمین سے اٹھتا، میں نے اس کی کھوپڑی پر ہتھوڑے کی طرح گھونسا رسید کیا اور وہ وہیں ساکت ہو گیا لیکن دوسرا میرے نیچے سے نکلنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ وہ ابھی سیدھی طرح کھڑا بھی نہیں ہو سکا تھا کہ میں نے اس کی ٹانگ پکڑ کر کھینچ لی اور وہ دوبارہ اوندھے منہ نیچے گر پڑا وہ کوئی زیادہ جاندار آدمی نہیں تھا۔ چنانچہ میں نے اسے قابو میں کرکے اس کے بال اپنی مٹھی میں جکڑ لیے اور اس کا سر کئی بار زمین سے ٹکرا دیا۔

پھر وہ بھی اپنی جگہ ساکت ہو گیا۔ یہ چھوٹی سی مہم آسانی سے سر ہو گئی تھی۔ میں نے تیزی سے ان دونوں کی تلاشی لی۔ ان دونوں کی جیبوں میں سو سو کے کئی نوٹ موجود تھے۔ ایک ریوالور بھی ہاتھ لگا اور میں نے ساتھ ہی ایک جدید ساخت کی بالکل نئی آٹومیٹک رائفل بھی اٹھا لی۔ تھوڑا سا میگزین بھی اپنے قبضے میں کر لیا اور اس کے ساتھ ہی ٹارچ بھی، پھر میں گھوڑوں کی جانب متوجہ ہو گیا اور پھر میں نے ان میں سے ایک گھوڑا منتخب کر لیا۔ اسے قابو میں کرنا میرے لیے زیادہ مشکل ثابت نہیں ہوا۔ چند سیکنڈ کی جدوجہد کے بعد گھوڑا رام ہو گیا۔ دوسرے گھوڑے نے ایک لمبی چھلانگ لگائی اور وہاں سے بھاگ گیا۔

بہرحال میں گھوڑے کی پشت پر سوار ہو گیا اور اس کے بعد میں نے گھوڑے کا رخ ایک طرف کر دیا۔ میں اسی سمت میں سفر کرنے لگا جدھر اپنی کار میں جا رہا تھا۔ جب جو ہو گا دیکھا جائے گا، بعد میں ساری باتیں سوچی جائیں گی اس وقت تو صورتِ حال بدل گئی تھی۔ میرے بائیں ہاتھ پر بھی خاصا گھنا جنگل تھا اور یقیناً آس پاس ہی ڈاکوؤں کا کوئی ٹھکانہ بھی ہو گا۔ میں اس وقت خاصی بہتر حالت میں تھا اور گھوڑے کو خاصی تیزی سے بھگا رہا تھا۔ دور دور تک میرے تعاقب میں کوئی نہیں تھا۔ پھر پورے ایک گھنٹے تک میرا سفر جاری رہا اور پھر میں نے گھوڑے کی رفتار سست کر دی۔

جنگل ختم ہونے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ پھر نہ جانے کتنا فاصلہ طے کیا تھا کہ بہت دور

کہیں سے مجھے نہایت مدھم سی آواز سنائی دی اور میں نے اپنی تمام تر سماعتی طاقت اس آواز پر مرکوز کر دی۔ آہستہ آہستہ آواز واضح ہوتی جا رہی تھی۔ وہ کسی گاڑی کے انجن کی آواز تھی اور پھر مجھے لگا جیسے یہ آواز ایک گاڑی کی نہیں بلکہ دو گاڑیوں کی ہو۔ اب اس بات میں کوئی شبہ نہیں رہا تھا کہ آس پاس ہی کم از کم دو گاڑیاں ضرور موجود ہیں۔ مگر کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ پھر میں نے ان گاڑیوں کے ہیولے دیکھ لیے وہ تیز رفتاری سے میرے عقب میں آ رہی تھیں۔ ایک بار پھر میں نے گھوڑے کو ایڑھ لگائی اور وہ دوڑنے لگا۔ پتہ نہیں کب سے وہ بے چارہ مشقت کر رہا تھا کیونکہ مجھے اس کے انداز سے تھکن کا احساس ہو رہا تھا۔ پھر میں نے گاڑیوں کی روشنیاں دیکھیں۔ یہ پتہ نہیں کیسی گاڑیاں تھیں۔ روشنیاں جلا کر غالباً راستہ دیکھا گیا تھا اور اس کے بعد روشنیاں بجھا دی گئی تھیں۔ صاف اندازہ ہو رہا تھا کہ ان لوگوں کو گھوڑوں کی گمشدگی اور اپنے ساتھیوں کے بارے میں علم ہو چکا تھا۔ یہی کہا جا سکتا تھا۔ کیونکہ اس وقت دلاور خان کے آدمیوں کا تصور نہیں کیا جا سکتا تھا۔

بہرحال میں نے ایک بار پھر گاڑیوں کی ہیڈ لائٹس جلتی دیکھیں۔ اسی وقت میرے گھوڑے نے کسی چیز سے ٹھوکر کھائی۔ یہ ایک کٹے ہوئے درخت کا تنا تھا اور گھوڑا اس سے جا ٹکرایا تھا۔ گھوڑا بہت بری طرح گرا اور اس کے ساتھ ہی میں بھی، لیکن جس جگہ میں گرا تھا وہ نرم جھاڑیاں تھیں جنہوں نے میری بھرپور مدد کی اور مجھے کوئی خاص چوٹ نہیں آئی۔ میں تیزی سے اٹھ کھڑا ہوا اور اس امید کے ساتھ گھوڑے کے قریب پہنچا کہ وہ بھی اٹھ کھڑا ہوگا لیکن دوسرے لمحے گھوڑے کو دیکھ کر مجھے جھرجھری سی آ گئی۔ اس کی اگلی بائیں ٹانگ اس طرح ٹوٹی تھی کہ ہڈی کھال پھاڑ کر باہر نکل آئی تھی۔ اس کے باوجود وہ اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کے حلق سے کرب زدہ آوازیں نکل رہی تھیں۔ ایک لمحے کے لیے میں نے یہ سوچا کہ اسے گولی مار دوں لیکن یہ بھی میرے لیے خطرناک بات ہوتی کیونکہ گولی کی آواز میرے دشمنوں کو میری سمت کا پتہ بتا دیتی۔ جیپیں قریب آتی جا رہی تھیں۔ ایک بار پھر پیدل دوڑنے کے علاوہ کوئی چارہ کار نہیں تھا۔ میں جنگل میں گھس گیا۔

لیکن میں نے اندر کی طرف زیادہ دور تک جانے کی کوشش نہیں کی اور دوڑتا رہا۔ رات کی تاریکی میں ڈوبا ہوا جنگل کبھی اپنی خبر نہیں دیتا۔ بہرحال میں پوری کوشش کر رہا تھا۔ ادھر گاڑیوں کی آوازیں بھی میری مدد کر رہی تھیں۔ وہ قریب آتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں جس کا

مطلب تھا کہ میں ریتلے علاقے سے زیادہ دور نہیں جا رہا۔ پھر اچانک مجھے لگا جیسے گاڑیاں رک گئی ہوں۔ میں سمجھ گیا کہ وہ اس مقام تک پہنچ گئے ہیں جہاں ٹانگ ٹوٹا گھوڑا پڑا ہوا ہے۔ جیپوں کی خفیف سی گھرگھراہٹ صاف سنائی دے رہی تھی، لیکن جیپیں حرکت میں نہیں آئی تھیں۔ پھر اچانک ہی فضا گولیوں کی تڑتڑاہٹ سے گونج اٹھی۔ میں ایک لمحے کے لیے تو حیران ہو گیا مجھے اس بات پر حیرت تھی کہ میں تو وہاں نہیں تھا پھر وہ لوگ کس پر فائرنگ کر رہے تھے۔ صرف گھوڑے کو مارنے کے لیے اتنی گولیاں نہیں چلائی جاتیں بہرحال میں نے خود بھی اپنی رائفل اتار کر اپنے ہاتھ میں لے لی اور اس فائرنگ پر غور کرنے لگا۔

اچانک ہی مجھے احساس ہوا کہ گولیاں ایک دوسرے پر چلائی جا رہی ہیں۔ ڈاکوؤں کا غالباً کسی نامعلوم پارٹی کے ساتھ مقابلہ ہو گیا تھا۔ اب پورے وثوق سے تو میں یہ بات نہیں کہہ سکتا تھا۔ صرف اندازے تھے۔ معلوم نہیں اندھیرے میں کہاں کیا ہو رہا تھا۔ رفتہ رفتہ ہوائی لہروں کے دوش پر بہت دور سے آتی ہوئی مدھم سی آواز سنی وہ آواز میگافون سے ابھر رہی تھی۔ بہت مدھم سی آواز تھی اور الفاظ میرے لیے ناقابلِ فہم تھے۔

لیکن میگافون پر جو کہا جا رہا تھا اس کے کچھ کچھ الفاظ کانوں میں پڑ جاتے تھے اور اس وقت مجھ پر ایک عجیب سا سرور طاری ہو گیا۔ مجھے اندازہ ہو گیا کہ کوئی پولیس پارٹی ڈاکوؤں کا تعاقب کر رہی ہے اور وہ لوگ آپس ہی میں بھڑ گئے ہیں۔ ایک بار پھر میں نے اپنی جگہ چھوڑی اور تیز رفتاری سے ان سے دور ہونے کی کوشش کرنے لگا۔ مجھ پر شدید تھکن طاری ہوتی جا رہی تھی۔ جنگل جیسے ایک سمندر تھا جو ختم ہونے میں ہی نہیں آ رہا تھا۔

پھر رفتہ رفتہ ماحول روشن ہونے لگا اور تھوڑی دیر کے بعد جنگل کا یہ سلسلہ ختم ہو گیا۔ اب میرے سر پر کھلا آسمان تھا۔ مدھم سی روشنی میں میں نے کوئی آدھ کلومیٹر کے فاصلے پر ایک بس کو جاتے ہوئے دیکھا اور مجھے اندازہ ہو گیا کہ یہ کوئی پختہ سڑک ہے۔ ایک لمحے تک میں سوچتا رہا کہ اب مجھے کیا کرنا چاہیے۔ رائفل یا ریوالور جو میں نے ان ڈاکوؤں سے چھینا تھا، میرے لیے صرف اس وقت تک کارآمد چیز تھی جب تک میں جنگلوں میں بھٹک رہا تھا۔ اب مجھے ان دونوں چیزوں کی ضرورت نہیں تھی۔ انسانوں کی بستی میں یہ میرے لیے کسی بھی وقت خطرناک ثابت ہو سکتی تھیں۔

میں ایک لمحے تک سوچتا رہا اور اس کے بعد میں نے میگزین اور یہ ہتھیار پھینک دیئے

اور اس کے بعد میں اس سڑک کی طرف بڑھنے لگا لیکن ابھی زیادہ دور نہیں گیا تھا کہ ایک جگہ آگ جلتی ہوئی نظر آئی۔ سڑک کے کچھ فاصلے پر ایک کٹیا نما جگہ تھی۔ یہاں ایک جھنڈا بھی لگا ہوا تھا۔ چھوٹی چھوٹی دو دیواریں بھی کچی مٹی سے اٹھائی گئی تھیں۔ میرے قدم اس جانب اٹھ گئے۔ میں نے اپنا حلیہ کسی حد تک درست کر لیا تھا۔ میری آنکھوں پر عینک لگی ہوئی تھی اور یہ عینک میرے ان گڑھوں کو چھپائے ہوئے تھی۔

بہرحال میں تھکن سے چُور چُور تھا۔ چنانچہ تھوڑی دیر کے بعد میں اس جھونپڑی تک پہنچ گیا۔ صاف اندازہ ہو رہا تھا کہ یہاں کوئی ہے اور میں نے آواز لگائی۔

''کوئی ہے...... یہاں کوئی ہے؟'' اور جواب میں قدموں کی آہٹ سنائی دی اور ایک بوڑھا آدمی جو درویش نما تھا، باہر آ گیا۔

''کون ہو بھائی...... کیا بات ہے؟''

''بابا جی...... مسافر ہوں۔ غلطی سے بس سے اتر گیا تھا۔ بس چلی گئی اور میں ساری رات پیدل سفر کرتا رہا۔ بڑی بری طرح تھک گیا ہوں۔ ایک کٹورہ پانی مل سکے گا''۔

''آ جاؤ...... آ جاؤ سب کچھ مل سکے گا۔ اللہ کا دیا سب کچھ موجود ہے''۔ بوڑھے نے نرم لہجے میں کہا اور میں اس کے ساتھ اندر داخل ہو گیا۔ وہ مجھے دیکھتا ہوا بولا۔

''بیٹھو کافی تھک گئے ہو''۔

''ہاں، بابا جی بہت تھک گیا ہوں''۔

''بیٹھو...... آرام سے بیٹھ جاؤ بلکہ ایسا کرو پہلے منہ ہاتھ دھو لو سارا چہرہ گرد آلود ہو رہا ہے''۔

''آپ کا بڑا بڑا شکریہ بابا جی''۔ میں نے کہا۔

بوڑھا مجھے جھونپڑی کے عقبی حصے میں لے گیا۔ جہاں ٹین کے ایک ڈرم میں پانی بھرا ہوا تھا جس میں ٹونٹی بھی لگی ہوئی تھی۔ اس کے ساتھ ہی دو مٹکے بھی رکھے ہوئے تھے جو پینے کے پانی کے تھے۔ تھوڑے فاصلے پر مجھے ایک کنواں نظر آیا جس پر رسی اور ڈول وغیرہ رکھا ہوا تھا۔ آبادیوں سے دور اس ویرانے میں بوڑھے بابا نے زندگی گزارنے کا انتہائی معقول بندوبست کر رکھا تھا۔ میں نے بڑے اطمینان سے چہرہ، گردن اور ہاتھ پاؤں دھوئے۔ ایک انوکھا سرور ملا تھا۔ پانی بھی قدرت کی بنائی ہوئی کیا چیز ہے۔ سارے وجود میں زندگی دوڑا دیتی ہے۔ رات بھر کی مشقت کی تھکن غالب تھی۔ پانی نے کافی تھکن اتار دی۔ اچانک ہی مجھے روٹیاں پکنے کی

خوشبو محسوس ہوئی اور میں نے گرد ہلائی۔ یقیناً روٹیاں پکائی جا رہی تھیں۔ میں منہ ہاتھ دھونے کے بعد واپس آیا۔ تو بوڑھا ایک چارپائی بچھا چکا تھا۔ جو شاید وہ اس جھونپڑی سے نکال کر باہر لایا تھا۔

''بیٹھ جاؤ بھائی...... میں خود بھی اپنے ناشتے کے لیے روٹیاں پکا رہا تھا بس شروع ہی کرنے والا تھا کہ اللہ نے ایک مہمان بھیج دیا''۔

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ بوڑھے نے روٹیاں پکا کر ان پر گھی لگایا۔ پھر بولا۔

''غریبوں کا یہی ناشتہ اور یہی کھانا ہوتا ہے اور یہی سب سے بہتر ہے۔ میں چائے بناتا ہوں۔ بیٹھو چارپائی پر بیٹھ جاؤ''۔ بوڑھے نے چائے کا پانی چڑھا دیا پھر ساگ کو روٹی کے ساتھ لے کر وہ میرے پاس آ گیا۔ پانی وغیرہ بھی لے آیا تھا۔ اس وقت یہ مجھے دنیا کی قیمتی ترین نعمت محسوس ہوئی۔ میں نے خدا کا شکر ادا کر کے اسے کھایا اور پھر بوڑھے کا شکریہ ادا کیا۔

''نہیں بابا، مہمان تو اللہ کے بھیجے ہوئے ہوتے ہیں۔ میں کیا اور میری اوقات کیا''۔

''آپ اسی جنگل میں رہتے ہو بابا جی''۔

''ہاں جنگل سمجھ لو...... آبادی سمجھ لو...... شہر سمجھ لو۔ بس دنیا راس نہیں آئی تو یہاں بسیرا کر لیا۔ بڑے برے ہیں یہ دنیا والے۔ انسان کو اگر موقع مل جائے تو ان سے جتنا دور ہٹ سکتا ہے، ہٹ جائے۔ اچھا نہیں ہوتا ان کے ساتھ رہنا''۔

''کوئی حادثہ ہوا ہوگا آپ کے ساتھ''۔

''پوچھنا نہیں بیٹا۔ بتانے کو جی نہیں چاہتا۔ بس جسے گزرنا تھا گزر گئی۔ اب یہاں رہتا ہوں۔ سکون ہے، اب تم دیکھنا تھوڑی دیر میں کتنے سارے پرندے جمع ہو جاتے ہیں۔ میں نے ان کے لیے دانے دنکے کا بندوبست کر رکھا ہے''۔

''آپ کی گزر بسر کیسے ہوتی ہے بابا جی!''

''ہو جاتی ہے، بس ہوش کے زمانے میں کچھ جمع کر لیا تھا۔ اس پر منافع مل جاتا ہے مہینے کے مہینے، بس میں بیٹھ کر شہر کا ایک چکر لگا لیتا ہوں۔ ضرورت کی چیزیں لے آتا ہوں...... بیماری دہتی ہے تو خود بخود ٹھیک ہو جاتا ہوں۔ اللہ کا فضل ہے''۔

''ہوں، بابا جی اپنا ایک لباس دے سکیں گے مجھے قیمت ادا کروں گا اس کی''۔

''نہیں بیٹا! یہاں کوئی دکان نہیں ہے، پھر میرے پاس لباس ہی کیا ہیں، بس دو چار

کفنیاں ہیں ان میں سے کوئی چاہیے تو لے لو"۔

"دے دیجیے بابا جی، آپ کی مہربانی ہوگی"۔ میں نے کہا اور بوڑھا ایک بوسیدہ سی کفنی نکال لایا۔ حلیہ بدلنے کے لیے یہ بہترین چیز تھی۔ میں اس کو پہن کر اپنے آپ کو عجیب سا محسوس کرنے لگا۔ پھر میں نے سوچا کہ اب مجھے کیا کرنا چاہیے۔ تھوڑی سی مشکلات آ کھڑی ہوئی تھیں۔ وہ کار وہاں رہ گئی تھی اس کے بارے میں رینٹ اے کار والی کمپنی کو اطلاع بھی دینی تھی۔ وہ ہی لوگ اسے وہاں سے اٹھا سکتے ہیں۔ بہرحال یہ سارے معاملات اپنی جگہ تھے۔ بوڑھے کی اجازت سے میں کھانے پینے کے بعد آرام سے لیٹ گیا۔ کفنی مجھے اپنے بدن پر بہت عجیب لگی تھی۔ اپنا لباس اتار کر میں نے ایک بنڈل سا بنایا تھا اور اسے وہیں ایک جگہ چھپا دیا تھا۔ مین حلیہ بدل کر یہاں سے نکل جانا چاہتا تھا۔ شہر جانے کے بعد نئے سرے سے کچھ سوچوں گا اور آگے کے راستے منتخب کروں گا۔

پھر دوپہر تک سوتا رہا تھا اور اس کے بعد اس وقت جاگا تھا جب باہر کچھ آہٹیں سنائی دی تھیں۔ دماغ جاگ گیا۔ آہٹیں کچھ غیر معمولی سی معلوم ہو رہی تھیں۔ میں جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گیا اور میں نے ان آہٹوں پر کان لگا دیے آوازیں جو آ رہی تھیں۔

"وہ کون ہے، اس نے اپنے بارے میں آپ کو کیا بتایا بابا جی!"

"ہم نے زیادہ نہیں پوچھا۔ بیچارہ مسافر ہے۔ غلطی سے اتر گیا تھا کسی بس سے، راستہ بھٹک کر ادھا آ گیا"۔

"ہمارا ایک دشمن فرار ہوا ہے۔ ساری رات ہم اس کی تلاش میں بھٹکتے پھرے ہیں۔ ایک رات میں اس نے اتنے سارے ہنگامے کر ڈالے ہیں کہ آپ سوچ بھی نہیں سکتے بابا جی! وہ بہت خطرناک آدمی ہے اس کے پاس رائفل وغیرہ بھی ہے۔ دو ڈاکوؤں کو اس نے شدید زخمی کر دیا ہے"۔

"جو مہمان میرے پاس آیا ہے وہ ایسا تو نہیں لگتا بھائی پھر بھی آپ اس سے مل لو دیکھ لو۔ سو رہا ہے اندر"۔

"بابا جی! اگر وہ ہمارا مطلوبہ آدمی نکلا تو تمہیں انعام ملے گا۔ تم نے دلاور خان کا نام تو سنا ہوگا۔ وہ دلاور خان کے بھائی بدرشاہ کا قاتل ہے"۔

"اللہ بہتر جانتا ہے۔ اگر وہ یہ سب کچھ ہے تو آپ اسے پکڑ لو جو اللہ کی مرضی"۔ بوڑھے

نے کہا۔ میرا دماغ برق رفتاری سے کام کر رہا تھا۔ ان باتوں کو سننے کے بعد مجھے یہ اندازہ تو ہوگیا تھا کہ آنے والے دلاور خان کے آدمی ہیں۔ کم بخت مسلسل میرے سراغ میں تھے اور میرے بارے میں سب کچھ معلوم کرتے ہوئے آ رہے ہیں۔

یہ بات قابلِ داد تھی کہ انہوں نے صحیح معنوں میں میرا تعاقب کیا تھا اور میرا پیچھا نہیں چھوڑا تھا۔ بہرحال بہت کم وقت تھا۔ سوچ سمجھ کر فیصلہ کرنا تھا۔ میں نے پھرتی سے اپنا چہرہ کھول دیا۔ اب میں جو کچھ کرنے والا تھا وہ میری موجودہ کیفیت کا پہلا عمل تھا۔ اندر داخل ہونے والے چار آدمی تھے۔ میں اس طرح پلنگ پر سکڑ کر لیٹ گیا کہ میرے انداز سے یہ پتہ بھی نہ چلے میں اس طرح پلنگ پر سکڑ کر لیٹ گیا تھا کہ میرے انداز سے یہ پتہ بھی نہ چلے کہ میں جاگ رہا ہوں۔ وہ چاروں میرے قریب آ گئے اور مجھے غور سے دیکھنے لگے۔

"یہ وہی ہے"۔ ایک نے دوسرے سے سرگوشی کی۔

"پتہ نہیں۔ یہ تو بڑا عجیب سا لگ رہا ہے۔ دیکھو اسے، فقیروں جیسے کپڑے پہنے ہوئے ہیں جس کا ہم پیچھا کر رہے تھے وہ ایسے کپڑے تو نہیں پہنے ہوئے تھا۔

"اٹھاؤ اسے"۔ ایک اور نے کڑوے لہجے میں کہا اور ان میں سے ایک نے میری چارپائی پر ٹھوکر ماری۔ میں جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گیا اور میں نے دونوں ہاتھ خلاء میں پھیلا دیے۔

"کون ہو بھائی، کیا بات ہے"۔ میں نے بڑے مظلوم لہجے میں کہا اور آنکھیں کھول دیں۔ جو شخص میرے قریب تھا وہ ایک دم گردن جھٹک کر پیچھے ہٹ گیا تھا۔

"یہ...... یہ...... یہ......تو کوئی اندھا ہے۔ ذرا دیکھو"......

"اندھا؟"

"ہاں"۔ وہ سب مجھے دیکھنے لگے۔ میری آنکھوں میں دیدے نہیں تھے لیکن میں انہیں بخوبی دیکھ رہا تھا۔ محلول کا اثر ابھی زائل نہیں ہوا تھا اور میں بڑے آرام سے ہر چیز دیکھ سکتا تھا۔ ان چاروں کے چہروں پر حیرت کے نقوش پھیل گئے۔

"نہیں بابا...... یہ کہاں سے آیا یہ تو ویسے ہی کوئی مجہول سا آدمی ہے۔ بے چارہ آنکھوں سے اندھا۔ دماغ خراب ہوا ہے تمہارا کس کے پیچھے لگ کر یہاں تک پہنچ گئے ہو"۔ وہ سب ایک دوسرے کو برا بھلا کہنے لگے۔ انہوں نے زیادہ تفتیش کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی تھی۔ میں بدستور مظلوم چہرہ بنائے انہیں دیکھتا رہا۔ میں نے آہستہ سے کہا۔

''کیا بات ہے بابا مجھے بھی تو کچھ بتاؤ''۔ لیکن کسی نے کچھ نہیں بتایا اور وہ لوگ با
گئے۔ باہر بوڑھا بابا موجود تھا۔
''پکڑا نہیں بھائی تم نے اسے''۔
''ارے بابا...... نہیں...... یہ ہمارا آدمی نہیں ہے اور کوئی بھی آیا تھا یہاں پر''۔
''نہیں کبھی کبھی اللہ کا کوئی بندہ چلا آتا ہے......'' مگر اچانک ان میں سے ایک نے
''بابا سائیں۔ آپ ہمیں یہاں کی تلاشی لینے کی اجازت دیں گے''۔
''ارے بھائی۔ اس جھونپڑی میں رکھا ہی کیا ہے۔ جیسے دل چاہے تلاشی لے لو''۔
وہ لوگ چاروں طرف مارے مارے پھرتے رہے۔ میں ٹٹولتا ہوا باہر آ گیا تھا اور
بار بوڑھے بابا نے بھی مجھے دیکھا تھا۔
''تم اندھے ہو...... ارے تم اندھے ہو''۔ میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ مظلوم سی شکل
کر بیٹھ گیا۔ بوڑھا بڑے تاسف کا اظہار کر رہا تھا۔ اس نے کہا۔
''رات کو تو مجھے پتہ ہی نہیں چلا کہ تم اندھے ہو''۔ میں نے کوئی جواب نہیں دیا وہ
واپس آ گئے۔
''بہت بہت شکریہ بابا، پانی پلا دو''۔ ان میں سے ایک نے کہا۔
''پانی کے برتن پیچھے رکھے ہوئے ہیں۔ میں لاتا ہوں''۔
''جی نہیں ہم خود پی لیتے ہیں۔ پھر ان چاروں نے پانی پیا اور اس کے بعد وہ وہاں
باہر چلے گئے۔ میں بڑے عجیب و غریب انداز سے سوچ رہا تھا۔ اس وقت آنکھوں میں دیا
کا نہ ہونا میری زندگی کی ضمانت بن گیا تھا۔ اس طرح تو اچھے اچھوں کو دھوکہ دیا جا سکتا۔
واقعی میری شخصیت بڑی باکمال ہو گئی تھی۔ ابھی تو میں اپنے دشمنوں میں ہی گھرا ہوا تھا
حالات بتا رہے تھے کہ آگے چل کر آنکھوں کی اس غیر موجودگی سے بڑے فائدے حاصل
سکتے ہیں۔ وہ لوگ چلے گئے اور میں چلنے کی تیاریاں کرنے لگا۔ باپ کی قبر پر آنا تھا۔ ف
خوانی کر لی۔ دل کو سکون ہو گیا تھا۔ اب مجھے واپس اپنی دنیا میں پہنچ جانا چاہیے۔ جہاں
دلاور خان اور بدر شاہ کے دوسرے ساتھیوں کا تعلق تھا اگر وہ میرے راستے میں آئے تو
لوں گا انہیں۔ اصل دشمنی میری بدر شاہ سے تھی اور میں نے اس سے انتقام لے لیا تھا۔ باقی
سارے لوگ تھے وہ ایک الگ کہانی تھی۔ رفتہ رفتہ ان ساری کہانیوں کو نمٹا لوں گا۔ میں

بابا کے ساتھ مزید کچھ وقت گزارا اور پھر اس سے اجازت مانگی۔
''کہاں جاؤ گے بھائی......''
''شہر جانا ہے یہاں کوئی سواری مل جائے گی''۔
''بس ہے...... بس سے جا سکتے ہو''۔
''میں چلا جاؤں گا''۔
''نہیں نہیں مجھے معاف کرنا...... تم نے مجھے بتایا ہی نہیں کہ تم اندھے ہو۔ ورنہ تمہارے
ں اپنے ہاتھ سے کرتا۔ پھر بھی تم سارے کام کر لیتے ہو''۔
''ہاں بابا جی...... قدرت من کی آنکھیں کھول دیتی ہے اگر تن کی آنکھیں بند ہو جائیں تو''۔
''بالکل ٹھیک کہتے ہو...... اللہ اپنے بندوں کو کبھی بے بس نہیں رہنے دیتا۔ وہ خود ان کا
تا اور محافظ بن جاتا ہے''۔ بوڑھے نے دل سوزی سے کہا۔ میرے لاکھ منع کرنے کے
وہ میرے ساتھ اس سڑک تک پہنچا اور پھر گزرنے والی ایک بس کو اس نے ہاتھ کے
ے سے روکا۔
''بھائی شہر میں اتار دینا''۔
''بابا جی...... ٹکٹ لے گا یہ'' کنڈیکٹر ذرا غلط فطرت کا مالک تھا۔
''جو کچھ دے گا لے لینا بھائی۔ انسانوں کو انسانوں پر رحم کرنا چاہیے''۔ کنڈیکٹر نے مجھے
ارے کر اوپر چڑھایا تھا اور بس آگے بڑھ گئی تھی۔ تھوڑی دور جا کر میں نے وہ اپنی کالی
انکھوں پر لگا لی۔ میں محسوس کر چکا تھا کہ بہت سے لوگ میری آنکھوں میں دیکھنے سے
ا رہے ہیں۔ بہرحال اس کے بعد خاموشی سے بس کا یہ سفر شروع ہو گیا۔
بس نے مجھے شہر اتارا تو میں نے ایک سنسان سی جگہ پہنچ کر اپنی وہ چھوٹی سی گٹھڑی کھولی
لا اٹھائے ہوئے تھا اور جس میں میرے غیر استری شدہ کپڑے موجود تھے۔ کفنی اتار کر
نے ایک طرف پھینکی اپنے کپڑے پہنے اور اس کے بعد اپنے ہوٹل کی جانب چل پڑا۔
ار ہوٹل پہنچ گیا۔ اس سے پہلے کی زندگی بس زندگی کے طور پر گزری تھی۔ بابا تھے اور میں
ہم دونوں باپ بیٹے ایک دوسرے کو بہت زیادہ چاہتے تھے۔ بے شک ہماری سادہ سی
ا میں بہت سے مسائل تھے لیکن ایسے نہیں جو ہمیں پریشان کریں لیکن پھر اس زندگی میں
بھونچال آ گیا۔ اس بھونچال نے سب کچھ تہہ و بالا کر دیا۔ بابا مجھ سے جدا ہو گئے اور

میرے سامنے زندگی کا کوئی مقصد نہ رہا۔ دنیا سے بے خبر نہیں تھا۔ یہ جانتا تھا کہ دنیا آنی چیز ہے۔ جو آتا ہے وہ جاتا بھی ہے لیکن عام سا ہی انسان تھا۔ بابا کی جدائی کو برداشت نہ کر سکا تھا۔ طبیعت میں درندگی تھی جس کا پہلے کبھی ادراک نہیں ہوا تھا ورنہ انسانوں کو زندگی دینا بہرحال ایک کام ہوتا ہے۔ جیل پہنچ گیا اور پھر وہاں سے ایک نئی ہنگامہ خیز کہانی کا آغاز جس نے یہاں تک پہنچا دیا تھا۔

اس کہانی میں بس ایک کردار ایسا تھا جو دل کے لیے خلش بن گیا تھا۔ شرمین جس نے اپنے باپ سے بغاوت کر کے مجھے ایک عجیب و غریب شخصیت بنا دیا تھا اور وہ آنکھیں دے دی تھیں جو نہ ہونے کے باوجود تھیں۔

❁❁❁❁

بہرحال یہاں زندگی کے بہت سے تجربات ہوئے تھے اور یہ اندازہ ہوا تھا کہ میں اس اپنی انوکھی شخصیت سے بہت سا کام لے سکتا ہوں۔ اب ذرا آرام کرنا چاہیے اور اس کے بعد مستقبل کے بارے میں سوچنا تھا۔ جب یہ سب کچھ ہو ہی گیا ہے تو پھر کیوں نہ زندگی میں کچھ کیا جائے۔ ایسا عمل جو آگے کی زندگی میں مدد دے سکے، کایا ہی پلٹ گئی تھی میری۔ دو دن تک ہوٹل سے باہر نہیں نکلا۔ یہ ہوٹل میرے لیے ایک انتہائی محفوظ پناہ گاہ تھی۔ تیسرے دن پھر طبیعت میں جولانی پیدا ہوئی۔ دنیا سے اس طرح کٹ کر نہیں رہنا چاہیے۔ میں ایک خوبصورت سا لباس پہن کر اپنی عام عینک لگا کر باہر نکل آیا۔ دوسری عینک کو تو میں نے انتہائی احتیاط کے ساتھ محفوظ کر لیا تھا۔ وہ خاص ہی خاص موقعوں پر نکالی جانے والی چیز تھی کیونکہ میں اس کی اہمیت سے واقف تھا اور کسی قیمت پر اسے کھونا نہیں چاہتا تھا۔

شہر کی ہنگامہ آرائیاں شباب پر تھیں۔ دوپہر کو ایک ریستوران میں داخل ہوا اور کھانا طلب کر لیا۔ پھر کھانے سے فارغ بھی نہیں ہوا تھا کہ اچانک ہی میں نے پولیس کو ریستوران میں داخل ہوتے ہوئے دیکھا۔ جو لوگ پولیس کو لے کر آئے تھے ان کے چہرے دیکھ کر میں کھٹک گیا۔ یہ رینٹ اے کار کے مالکان تھے جن سے میں نے کار حاصل کی تھی۔ ایک لمحے کے لیے بدن میں سنسناہٹ دوڑ گئی لیکن دوسرے ہی لمحے میں نے اپنے آپ کو بے تعلق کر لیا اور خاموشی سے کھانے میں مشغول ہو گیا البتہ یہاں میں نے تھوڑی سی اداکاری کی تھی جو میری عقل و دانش کا نتیجہ تھا۔ میں کھانے کے برتن اس طرح ٹٹولنے لگتا تھا جیسے مجھے کچھ نظر نہ آ رہا ہو

اور میں صرف اندازے کی بناء پر کھانا کھا رہا ہوں۔ ایک آدھ بار میں نے غلط جگہوں پر بھی ہاتھ مارے، پانی کا گلاس اٹھایا تو وہ الٹ گیا۔

پولیس والے میرے بالکل قریب آ کر کھڑے ہو گئے تھے لیکن میں ان سے بے خبری کا مظاہرہ کرتے ہوئے کھانے میں مصروف رہا۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ سب ایک دوسرے کی شکل دیکھ رہے ہیں۔ رینٹ اے کار والے شخص نے کہا۔

''مسٹر احسان کہاں غائب ہیں آپ''۔ میں نے اِدھر اُدھر نگاہیں دوڑائیں اور پھر کھانے کی طرف ہاتھ بڑھا دیا۔

''یہ ایکٹنگ کر رہا ہے انسپکٹر صاحب گرفتار کر لیجیے اسے''۔ رینٹ اے کار والے شخص کی آواز ابھری۔

''کیا نام ہے تمہارا؟'' انسپکٹر نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا اور میں نے اندھا ہونے کی بہترین اداکاری کی۔

''کک......کون......کون ہے بھائی؟''

''بالکل ایکٹنگ کر رہا ہے۔ انسپکٹر صاحب۔ یہ اندھا بننا چاہ رہا ہے''۔

''کک۔ کیا ہوا۔ میں سمجھا نہیں ہوں بھائی''۔ میں نے پھر نرم لہجے میں کہا۔

''اٹھو تمہیں ہمارے ساتھ چلنا ہے''۔ انسپکٹر بولا۔

''کہاں بھائی صاحب۔ مجھے کچھ بتا تو دیجیے''۔ میں نے کہا

''پولیس اسٹیشن اور کہاں''۔

''اوہ......مگر کوئی غلطی ہوگئی ہے مجھ سے؟ آپ مجھے پولیس اسٹیشن کیوں لے جا رہے ہیں بھائی صاحب؟''

''یہ تمہیں پولیس اسٹیشن چل کر ہی معلوم ہو جائے گا میرے بچے''۔ اس نے کسی قدر جارحانہ لہجے میں کہا۔

پولیس انسپکٹر بھی غالباً مکمل شخصیت کا مالک تھا۔ چاہتا تو آسانی سے میری عینک اتار کر میرا چہرہ دیکھ سکتا تھا۔ میں نے بھی اسے خاص طور سے اس طرف متوجہ نہیں کیا۔ کھانے کا بل ادا کرنے کے لیے میں نے جیب میں ہاتھ ڈالا۔ ویٹر وغیرہ میرے پاس آ کھڑے ہوئے تھے۔ میں نے لرزتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"ویٹر صاحب۔ ویٹر صاحب ادھر آیئے ذرا مجھے بتایئے پیسے کتنے ہوئے"۔

"اوئے پیسے ہم ادا کر دیں گے تیرے، تُو اپنی جگہ سے تو اٹھ"۔

رینٹ اے کار کے مالک نے غالباً انسپکٹر صاحب کو پوری طرح سمجھا دیا تھا کہ انہیں کیا کرنا ہے۔

بہر حال وہ لوگ مجھے باہر لائے۔ جیپ میں بٹھایا۔ میرے دل سے خوف نکل گیا تھا حالانکہ میں جانتا تھا کہ اس چھوٹے سے معاملے کے علاوہ ایک ایسا بڑا معاملہ ہے جو میرے لیے انتہائی سنگین ہے یعنی جیل سے مفرور مجرم، اس حیثیت سے میری شناخت ہوگئی تو شاید وہ لوگ آسانی سے میری حیثیت کو تسلیم نہ کریں حالانکہ میری بچت کا بہترین ذریعہ یہ تھا کہ میری تو آنکھیں ہی نہیں تھیں۔ بڑے سے بڑا آئی سرجن میری بات کی تصدیق کر سکتا تھا۔ جو کام پروفیسر ضرغام نے کیا تھا وہ ابھی تک دنیا کے علم سے بہت دور تھا۔ غرض یہ کہ میں پولیس اسٹیشن پہنچ گیا۔ رینٹ اے کار کا مالک فیروز خان بھی ساتھ ہی تھا۔ تھانے میں مجھے ڈی ایس پی صاحب کے سامنے پیش کیا گیا۔ دیکھنے ہی سے اچھی شخصیت کا مالک معلوم ہوتا تھا۔ انسپکٹر نے اسے سلیوٹ کیا اور بولا۔

"خواجہ صاحب ملزم کو لے آئے ہیں ہم"۔

"ہوں......" ڈی ایس پی نے مجھے غور سے دیکھا اور بولا۔

"کیوں، فیروز خان صاحب یہی بندہ ہے؟"

"سو فیصد یہی جناب۔ میرے آدمی شہر بھر میں اسے تلاش کر رہے تھے۔ اب ہم نے کاروباری تو ہیں نہیں۔ اگر ایسے بندے ہمیں چوٹ دے جائیں تو پھر ہمیں تو یہ کاروبار بند کر دینا چاہیے"۔

"ٹھیک کہتے ہیں آپ۔ کیوں بھئی او شہنشاہ معظم یہ اپنی خوبصورت عینک اتار دیجیے۔ میں آپ کو بتاؤں فیروز خان صاحب یہ جتنے مجرم قسم کے بندے ہوتے ہیں ناں یہ سب سے پہلے اپنی آنکھوں کو چھپاتے ہیں"۔

"خواجہ صاحب اس بندے نے تو اندھا ہونے کی ایکٹنگ شروع کر دی۔ ہمیں دیکھتے ہی اِدھر اُدھر ہاتھ پاؤں مارنے لگا، اُلٹی سیدھی حرکتیں کرنے لگا"۔

"واہ بھئی واہ۔ ظاہر ہے یہ بھی تربیت یافتہ ہی ہوگا۔ اوئے عینک اتار"۔ ڈی ایس پی

نے کہا اور میں نے ہاتھ میں رعشہ پیدا کیا جیسے لرز رہا ہوں اور عینک اتار دی۔

"ہوں......" خواجہ صاحب نے کہا اور ایک دم چونک کر اپنی جگہ سے کھڑے ہو گئے۔ انہوں نے گھور کر میری آنکھوں کو دیکھا پھر انسپکٹر کی طرف اور اس کے بعد فیروز خان کی طرف سارے کے سارے میری آنکھوں کے گڑھے دیکھ کر ہکا بکا رہ گئے تھے۔ خواجہ صاحب نے منہ آگے بڑھا کر مجھے غور سے دیکھا۔ حالانکہ میں ایک ایک شخص کے چہرے پر چھائی ہوئی حیرت کو دیکھ رہا تھا لیکن اب بھی اداکاری ہی میری پوری زندگی کا ریکارڈ مرتب کرنے والی تھی۔ خواجہ صاحب نے کہا۔

"خورشید علی کیا تم بھی اندھے ہو......"

"خواجہ صاحب...... یہ...... یہ...... یہ......"

"تھو ہے تمہاری شکل پر۔ تم انسپکٹر کیا حوالدار بننے کے قابل بھی نہیں ہو اور کیوں اس بے چارے کو پکڑ لائے ہو تم......"

"وہ خواجہ صاحب۔ وہ...... وہ......"

"یار فیروز خان۔ یہ ہے تمہارا تجربہ۔ میرا تو دل دکھ کر رہ گیا۔ جوان آدمی ہے کتنی اچھی شکل وصورت کا مالک ہے۔ اوہ یار ایک شخص اللہ کی طرف سے بینائی سے محروم ہے اور تم اسے مجرم سمجھ کر پکڑ لائے ہو"۔

"آپ یقین کیجیے خواجہ صاحب اتنا ملتا ہے یہ اس آدمی سے کہ میں بیان نہیں کر سکتا۔ آپ اگر ایک نگاہ اسے دیکھ لیتے جی......"

"یار خدا سے ڈرو۔ تمہیں بھی اپنی قبر میں جانا ہے۔ بھائی صاحب معافی چاہتے ہیں ہم لوگ۔ آپ کی شکل وصورت کا ایک آدمی ان سے کار لے گیا تھا وہ واپس نہیں لایا۔ احسان نام تھا اس کا۔ آپ کا نام کیا ہے"۔

"قیصر بیگ"۔ میں نے ایک لمحہ ضائع کیے بغیر جواب دیا۔

"قیصر صاحب۔ بہت معافی چاہتے ہیں ہم آپ سے۔ بڑی غلطی ہوگئی۔ بس آج کل لوگ اتنے ہی ذہین ہیں۔ ان انسپکٹر صاحب کو کم از کم آپ کی عینک اتروا کر دیکھ لینا چاہیے تھا۔ واہ بھئی واہ۔ چلو بوتل لاؤ بیگ صاحب کے لیے"۔

"نہیں جناب آپ کا بے حد شکریہ۔ میں تو ایک مظلوم سا پریشان حال آدمی ہوں۔ بس

زندگی گزار رہا ہوں"۔

"کیا کرتے ہو؟"

"میں کیا کروں گا جناب۔ بس تھوڑی سی زمین ہے۔ یہاں ایک شادی میں آیا تھا۔ ایسے ہی گھومنے باہر نکل آیا۔ کبھی کبھی بڑا دل اکتا جاتا ہے۔ میرے ساتھ میرا ایک دوست تھا۔ مجھے بھوک لگ رہی تھی میں ہوٹل میں کھانا کھانے بیٹھ گیا وہ کسی کام سے چلا گیا۔ طے یہ ہوا تھا کہ وہ دو گھنٹے کے بعد مجھے ہوٹل سے واپس لے لے گا کہ یہ لوگ آ گئے، مجھے پکڑ لائے"۔

"اوئے انسپکٹر۔ جاؤ انہیں اسی ہوٹل چھوڑ کر آؤ جلدی کرو۔ کہیں ان کا دوست آ کر چلا نہ جائے"۔

"یس سر۔ آئیے جناب"۔ فیروز خان واپسی کے لیے پلٹا تو ڈی ایس پی صاحب نے کہا۔

"تم ادھر بیٹھو یار۔ بات کرنی ہے تم سے"۔ رینٹ اے کار کا مالک واپس بیٹھ گیا۔ انسپکٹر مجھے لے کر آیا۔

"یار تمہیں وہیں مجھے بتا دینا چاہیے تھا"۔

"انسپکٹر صاحب آپ نے مجھے بولنے کا موقع تو دیا ہی نہیں"۔

"یار میں بھی معافی چاہتا ہوں۔ وہ بندہ بھی دھوکے میں آ گیا تھا۔ ورنہ وہ بھی غلط آدمی نہیں ہے"۔ میں نے دل ہی دل میں سوچا کہ واقعی بے چارہ وہ بھی غلط آدمی نہیں ہے۔ میں کار اسے واپس کر دیتا لیکن معاملہ ہی دوسرا ہو گیا ہے۔ خیر کوئی بات نہیں ہے۔

تھوڑی دیر کے بعد مجھے ہوٹل پر پہنچا دیا گیا۔

"تمہارا دوست کس حلیے کا ہے۔ کہیں وہ آ کر چلا نہ گیا ہو"۔

"نہیں ایسی بات نہیں ہے۔ وہ جائے گا نہیں"۔

"تو پھر میں چلتا ہوں"۔

"بہت بہت شکریہ"۔ انسپکٹر مجھے ہوٹل میں چھوڑ گیا لیکن جب میں نے دیکھا کہ اس کی گاڑی واپس چلی گئی ہے تو میں ہوٹل سے باہر نکل آیا۔ میرے ہونٹوں پر مدھم سی مسکراہٹ تھی۔ عینک میں نے آنکھوں پر لگا لی تھی۔ البتہ میں یہ سوچ رہا تھا کہ رینٹ اے کار کے مالک بے چارے کو نقصان کیوں پہنچایا جائے۔ کار بیشک حادثے کا شکار ہو گئی تھی لیکن پہلی بات تو یہ کہ ان کاروں کا انشورنس ہوتا ہے۔ انشورنس کمپنی اسے مرمت کرا کے دے گی۔ دوسری بات یہ کہ کار

وہاں پڑے رہنے سے مجھے کیا فائدہ ہوگا۔ کار اگر اسے ہی واپس مل جائے تو یہ زیادہ اچھا رہے گا"۔

چنانچہ تھوڑی دیر تک میں پیدل چلتا رہا۔ بیشک باہر نکلنے پر فوری طور پر ایک حادثہ ہوا تھا لیکن اس حادثے نے میرے اندر پختگی پیدا کی تھی۔ آگے کے لیے میں اپنی زندگی کا لائحہ عمل مرتب کر سکتا تھا۔ کچھ دیر میں سوچتا رہا اس کے بعد میں نے ایک ٹیکسی روکی اور اس میں بیٹھ کر اُدھر چل پڑا جہاں رینٹ اے کار کا آفس تھا۔

میں تھوڑی دیر کے بعد وہاں پہنچ گیا۔ اصل میں مجھے وہاں کا ٹیلی فون نمبر نہیں معلوم تھا۔ میں نے سوچا جو بورڈ لگا ہوا تھا اس پر ٹیلیفون نمبر بھی لکھا ہوا تھا۔ وہاں سے نمبر لے لوں گا اور میں نے ایسا ہی کیا لیکن مجھے یہ بات معلوم تھی کہ فیروز خان کو ڈی ایس پی صاحب نے بٹھا رکھا ہے۔ اس علاقے میں اترنے کے بعد میں نے کوئی ٹیلیفون بوتھ تلاش کیا اور یہ آسانی سے مجھے مل گیا۔ میں نے اس نمبر پر رنگ کیا جو دکان کے بورڈ پر لکھا ہوا تھا۔ فوراً ہی کسی نے فون اٹھا لیا۔

"مجھے فیروز خان صاحب سے بات کرنی ہے"۔

"خان جی اس وقت دکان پر موجود نہیں ہیں"۔

"آپ کون صاحب بول رہے ہیں"۔

"منیجر ریاض الدین"۔

"ریاض صاحب۔ میں آپ کو ایک اطلاع دینا چاہتا ہوں"۔

"ہاں ہاں فرمائیے کیا بات ہے"۔

"احسان نامی ایک شخص نے آپ سے رینٹ پر کار لی تھی"۔

"ہاں ہاں لی تھی اور ہمارے لیے بہت بڑا عذاب پیدا کر دیا تھا۔ مگر آپ کیا کہنا چاہتے ہیں اس سلسلے میں"۔

"احسان کی کار کا ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا۔ میرا مطلب ہے رینٹ اے کار کا"۔

"اچھا۔ کہاں ہو گیا تھا مگر آپ کون صاحب بول رہے ہیں"۔

"یار کام کی بات سنو۔ میں کون صاحب بول رہا ہوں فالتو باتیں مت کرو کچھ کہہ دوں گا تو برا مان جاؤ گے۔ جو کہہ رہا ہوں وہ سنو"۔

"کمال ہے آپ ہمیں اتنی اہم اطلاع دے رہے ہیں آپ کو معلوم ہے کہ وہ کار لیزنگ کی نہیں تھی بلکہ ہماری اپنی خریدی ہوئی تھی۔ انشورنس بھی نہیں تھا اس کا"۔

"یہ سارے آپ کے معاملات ہیں۔ میں کیا دلچسپی رکھ سکتا ہوں اس سے"۔

"میرے بھائی جو دلچسپی رکھتے ہو وہ تو بتا دو"۔ منیجر نے کہا۔

"پتہ نوٹ کیجیے۔ کار کو تھوڑا سا نقصان پہنچا ہے۔ آپ کو وہ اس علاقے میں مل جائے گی وہاں سے اٹھوا لیجیے"۔

"لکھوائیے لکھوائیے پتہ"۔ میں نے مکمل یادداشت سے وہ پتہ منیجر کو نوٹ کرا دیا۔

"آپ کا بہت بہت شکریہ میرے بھائی۔ بہت بڑی مشکل حل کی ہے آپ نے مگر یہ تو بتا دیجیے کہ آپ، ہیں کون"۔

میں نے ٹیلی فون بند کر دیا۔ ریسیور پر سے اپنی انگلیوں کے نشانات مٹائے اور اس کے بعد وہاں سے باہر نکل آیا۔ پھر تھوڑی دیر کے بعد ایک ٹیکسی نے مجھے میرے ہوٹل پہنچا دیا۔

ہوٹل آنے کے بعد سب سے پہلے مجھے اپنی زندگی کے قیمتی سرمائے کو دیکھنا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ وہ محفوظ رہے بلکہ اس سلسلے میں آج میں نے اپنے اس ہوٹل میں بیٹھ کر ایک اور فیصلہ کیا۔ ظاہر ہے ابھی مجھے ہوٹلوں میں ہی قیام کرنا تھا۔ ابھی تک آگے کی زندگی کے لیے کوئی لائحہ عمل مرتب نہیں کیا تھا لیکن سب سے پہلا کام مجھے یہ کرنا چاہیے کہ کسی اور ہوٹل میں ایک کمرہ حاصل کر لوں۔ اس کمرے کو مسلسل اپنے نام پر قائم رہنے دوں اور یہاں وہ چیزیں محفوظ رہنے دوں کیونکہ میرے سرمایہ حیات کو اِدھر اُدھر منتقل بھی نہیں ہونا چاہیے۔

یہ فیصلہ کرنے کے بعد میں نے تیاریاں کیں۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ کوئی میرا تعاقب کر کے میرے اس ہوٹل تک پہنچے اور اس کمرے کا پتہ لگا لے۔ اس کمرے کو محفوظ رہنا چاہیے۔ ہاں کبھی کسی مناسب وقت جب میں اپنی زندگی کے لیے کوئی اور راستہ منتخب کر لوں گا یہ متاعِ حیات کہیں اور منتقل کر دوں گا۔ سامان تیار کرنے کے بعد میں باہر نکل آیا۔ کاؤنٹر منیجر کے پاس پہنچا اور اس سے کہا۔

"منیجر صاحب میں کچھ عرصے کے لیے آؤٹ آف سٹی جا رہا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ یہ کمرہ میرے نام پر ریزرو رہے"۔

"سر آپ جب تک یہاں رہنا چاہیں رہیں۔ آپ کو پتا ہے کہ کسی چیز کو ریزرو رکھنے کے لیے"۔

"آپ مجھ سے ایک مہینے کا کرایہ ایڈوانس لے لیجیے۔ بعد میں جو بھی ہوگا دیکھا جائے گا"۔

"بس اتنی ہی سی تو بات ہے"۔ منیجر نے رجسٹر نکالتے ہوئے کہا۔ میں نے اسے کمرے کا

ایک مہینے کا رینٹ ادا کر دیا اور منیجر نے خوش دلی سے گردن جھکاتے ہوئے کہا۔

"ہمارے لائق اور کوئی خدمت"۔

"نہیں، بس شکریہ۔ میں چند روز کے لیے باہر جا رہا ہوں واپس آ جاؤں گا"۔

"آپ کا کمرہ ہے جناب۔ آپ بالکل بے فکر رہیے گا"۔

میں باہر نکل آیا پھر ایک ٹیکسی روک کر میں نے ٹیکسی ڈرائیور سے کسی اچھے سے ہوٹل چلنے کے لیے کہا اور آخر کار مجھے ایک فوراسٹار ہوٹل پسند آیا۔ فوراسٹار ہوٹل کی پانچویں منزل پر مجھے ایک خوبصورت کمرہ مل گیا۔ دولت انسان کے لیے کیا مقام رکھتی ہے۔ بس کہا نہیں جا سکتا۔ ابھی تک تو میرے پاس وہ رقم چل رہی تھی جو میں نے پروفیسر ضرغام سے وصول کی تھی لیکن اپنے شاندار ایئر کنڈیشن کمرے میں تمام دنیا سے فارغ ہونے کے بعد ایک صوفے پر بیٹھ کر میں نے سوچا کہ جو نئی قوت مجھے حاصل ہوئی ہے اس سے اور فائدے اٹھائے جانے چاہئیں لیکن سب سے پہلے مجھے اتنی معقول رقم کا بندوبست کرنا چاہیے جس سے میری نئی شاندار زندگی کا آغاز ہو سکے اور اس کے بعد میں نے اس رقم کے حصول پر غور کرنا شروع کر دیا۔

❀❀❀❀

ایک بات بڑی عجیب بات ہے، انسان جب تک خواہشات کی آس میں رہتا ہے، پانے کی آرزو اسے بے چین رکھتی ہے۔ پھر جب اسے مل جائے تو وہ کسی حد تک بے نیازی کا شکار ہو جاتا ہے۔ جیسے اب میری کیفیت تھی۔ جن حالات کا شکار ہو گیا تھا اس کے بعد اپنی طرف توجہ کا تصور ہی لٹ گیا تھا، بس موت کا خوف تھا جو دل کو بے ترتیبی سے دھڑکاتا رہتا تھا۔ پھر موت کے بطن سے زندگی نے جنم لیا اور آنکھیں چلی گئیں...... دنیا تاریک ہو گئی...... اس کے بعد تاریکیوں سے اجالا پیدا ہوا اور میری شخصیت پُراسرار ہو گئی۔

اور اب...... ایک آسودگی تھی، جیسے سب کچھ مٹھی میں آ گیا ہو اور یہ بند مٹھی کھولنے کی کوئی خاص ضرورت نہیں تھی یا ضرورت بھی تھی تو کوئی جلد بازی نہیں تھی۔ دولت کے بارے میں سوچا تھا میں نے اور پھر اپنے بارے میں...... ایک دم احساس ہوا تھا کہ بھلا اب دولت کا حصول کون سا مشکل کام ہے۔ اس قدر زبردست قوت حاصل ہے۔ عینک لگاؤ اور تصور کو کائنات کے سفر پر روانہ کر دو...... جہاں چاہو جھانک لو... جہاں چاہو پہنچ جاؤ۔ تھوڑا سا خیر۔ غرض بھی ہوا تھا۔ شرمین، جس نے میرے لیے اپنے باپ سے بغاوت کر لی تھی اور اس کا نتیجہ

اثاثہ مجھے دے دیا تھا مگر میں اس کا حقدار بھی تھا اس مردود نے مجھ سے میری آنکھیں چھین کر میری دنیا تاریک کر دی تھی۔ اس کے بعد اس کی غلامی کے علاوہ میری زندگی میں اور کیا رہ جاتا۔

بہرحال اس شاندار ہوٹل کے اس کمرے میں زندگی کے بہت سے رموز سے آگہی ہو رہی تھی اور میں بہت کچھ سوچ رہا تھا۔ سب سے پہلے میں نے اپنے تصور کا تجزیہ کیا۔

1- عینک لگا کر میں ہر شے کے بارے میں سوچ سکتا ہوں۔

2- میری سوچ کی رینج کیا ہے۔

3- سوچ کے عمل میں میری جسمانی مداخلت کی کیا حیثیت ہے۔ کیا اپنی سوچ کے دوران میں کوئی جسمانی عمل بھی کر سکتا ہوں اور پھر مجھے عجیب وغریب انکشافات کا سامنا کرنا پڑا۔ پرانے وجود کو تصور کی حد میں تحلیل کر سکتا تھا۔ خود کو تصور کے وجود میں بدل کر کوئی بھی بدن اپنا سکتا تھا یہ نیا تجربہ تھا۔ اس کے لیے تجربہ کرنا ضروری تھا۔ مجھے اس کا تجربہ کرنا چاہیے۔ یہ ایک دلچسپ تجربہ ہوتا چنانچہ میں نے عینک لگا لی اور پھر میں تصور کی سڑک پر نکل آیا۔ زندگی میرے سامنے رواں دواں تھی۔ سب کچھ وہی تھا جو آنکھوں کے سامنے ہوتا ہے۔ کہیں کوئی تبدیلی نہیں تھی۔ مجھے اپنا وزنی خیالی بدن محسوس ہو رہا تھا جسے میں کوئی بھی شکل دے سکتا تھا۔ یہ سو فیصد میری دریافت تھی۔ میں سوچ کی سڑکوں پر سفر کرتا رہا۔ وہ حادثہ میرے سامنے ہی ہوا تھا۔

ایک کار تھی، جو ایک نوجوان کو ٹکر مارتی ہوئی چلی گئی تھی۔ نوجوان اچھل کر نیچے گرا تھا۔ اس کے منہ سے "ہائے" کی آواز نکلی تھی اور بس اس کے بعد ساری کہانی ختم ہو گئی تھی۔ میں دوڑتا ہوا اس کے پاس پہنچا اور لوگ بھی آس پاس سے آ گئے تھے اور چیخ رہے تھے۔

"کار کا نمبر نوٹ کیا؟"

"نہیں"۔

"نکل گیا کم بخت"۔

"اسے تو دیکھو"۔

"بظاہر تو کوئی چوٹ نظر نہیں آ رہی"۔

"غالباً صدمے سے بے ہوش ہو گیا ہے"۔

"اسپتال لے چلو"۔

"وہ سامنے ہی تو اسپتال ہے"۔

اسپتال کا بورڈ میں نے سامنے ہی دیکھا تھا۔ نیم سرکاری اسپتال تھا، بہرحال انسانی ہمدردی سے سرشار لوگ اس نوجوان کو اسپتال کی جانب لے چلے۔ میں بھی ان کے ساتھ تھا۔ نوجوان اچھی خاصی شکل وصورت کا مالک تھا۔ اور بے ہوش نظر آ رہا تھا لیکن اس کے بعد کچھ اور ہی واقعہ ہوا۔ کچھ ڈاکٹروں نے اسے دیکھا اور تشویش کا شکار ہو گئے۔ پھر ان میں سے ایک نے سرسراتی ہوئی آواز میں کہا...... "یہ مر چکا ہے"۔

میرے دل کو شدید جھٹکا لگا تھا جو کچھ میرے سامنے ہی ہوا تھا اور نہ جانے کیوں اس نوجوان سے کوئی رشتہ نہ ہونے کے باوجود میرے دل میں اس کے لیے ایک عجیب سی ہمدردی پیدا ہو گئی تھی۔ ڈاکٹر آپس میں گفتگو کر رہے تھے۔ نوجوان کے لباس کی تلاشی لی گئی تو ایک تعارفی خط ملا جس میں کسی نے اس کی نوکری کے لیے اپنے کسی دوست کو رقعہ دیا تھا، اس نے خوش قسمتی سے اپنا فون نمبر بھی لکھ دیا۔ ڈاکٹروں نے اسی نمبر پر کوشش کی کیونکہ اس کے علاوہ نوجوان کے پاس سے کوئی اور نشانی نہیں ملی تھی۔ یہ نمبر کسی حاجی ابراہیم بیگ کا تھا۔ جس ڈاکٹر نے حاجی ابراہیم بیگ سے رابطہ قائم کیا تھا، اس نے کہا۔

"حاجی ابراہیم بیگ صاحب سے بات کرنی ہے"۔

"ہاں...... میں بول رہا ہوں"۔

"ابراہیم صاحب میں اسپتال سے ڈاکٹر احسان بول رہا ہوں۔ آپ نے اس مہینے کی 2 تاریخ کو کسی نوجوان لڑکے کو اپنے دوست فرقان حیدر کے لیے ایک سفارشی خط دیا تھا، جو زمت کے لیے تھا"۔

"ہاں...... مجھے یاد آیا، جمیل تھا اس نوجوان کا نام۔ میں براہ راست تو اسے نہیں جانتا تھا ن خود میرے ایک دوست نے مجھ سے اس کے لیے کہا تھا اور میں نے وہ سفارشی خط دے تھا لیکن افسوس جن لوگوں کے نام وہ خط دیا تھا میں نے، انہوں نے اپنا کاروبار بند کر دیا یہ آپ سب کچھ کیوں پوچھ رہے ہیں؟"

"اس نوجوان کے گھر کا پتہ معلوم ہے آپ کو؟ میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ میں اسپتال سے ر بول رہا ہوں"۔

میں بتاتا ہوں"۔

دوسری طرف سے کہا گیا اور پھر تھوڑی دیر کے بعد ڈاکٹر احسان نے پتہ نوٹ کرلیا پتہ میں نے بھی اپنے ذہن میں رکھا تھا۔

ڈاکٹر احسان نے کہا۔ "اب ٹیلی فون نمبر کے بارے میں کچھ کہا نہیں جا سکتا ویر نوجوان جس شکل کا نظر آ رہا ہے اس کے بعد یہ سوچنا کہ اس کے گھر میں ٹیلی فون ہوا عقل سے دور نظر آتا ہے۔ کسی وارڈ بوائے کو بھیجا جائے۔ جس وارڈ بوائے کو اس کام کے تیار کیا گیا تھا میں اس کے ساتھ ساتھ چل پڑا۔

وہ بس میں بیٹھ کر جا رہا تھا۔ جس محلے میں وہ پہنچا وہ ایک سادہ سی آبادی تھی اور چھ چھوٹے مکانات چاروں طرف بکھرے ہوئے تھے۔ مکان نمبر 96 پر جمیل لکھا ہوا تھا اور نوجوان کا نام تھا۔ وارڈ بوائے نے دروازے پر دستک دی تو دروازہ سادہ سے نقوش کی ایک لڑکی نے کھولا۔ وارڈ بوائے کو دیکھ کر وہ ایک قدم پیچھے ہٹ گئی تو وارڈ بوائے نے کہا۔

"جمیل صاحب اسی گھر میں رہتے ہیں؟"

"ہاں......"

"آپ کو اسپتال چلنا ہوگا۔ انہیں چوٹ لگی ہے میں اسپتال سے آ رہا ہوں، وہیں ہوں"۔

"لڑکی بے اختیار ہو گئی"۔ اس نے رندھی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"زیادہ چوٹ لگی ہے بھائی"۔

"بی بی یہ تو اسپتال چل کر ہی معلوم ہوگا"۔

"کون ہے نجمہ؟" اندر سے ایک عمر رسیدہ خاتون کی آواز سنائی دی۔

"امی اسپتال سے کوئی آیا ہے، کہہ رہا ہے بھائی کو چوٹ لگ گئی ہے"۔

دوسرے لمحے عمر رسیدہ خاتون بھی دروازے پر آ گئی تھیں پھر وارڈ بوائے سے کئی سوالات کیے گئے۔ پڑوس کے ایک بزرگ کو بلایا گیا اور نجمہ ان بزرگ کے ساتھ اسپتال چل دی۔ میں سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ ذرا اس گھر کے بارے میں معلومات حاصل کرنا ضروری ہے۔ یہ بات تو میں جانتا تھا کہ نجمہ باآسانی اسپتال پہنچ جائے گی لیکن یہاں عمر رسیدہ خاتون تھیں۔ پڑوس سے جس خاتون کو بلایا گیا تھا ان کے گھرانے کی تین عورتیں جمیل کی گئیں اور پھر وہی باتیں شروع ہو گئیں جن کی توقع کی جا سکتی تھی لیکن اس سے مجھے جمیل کے بارے میں معلومات حاصل ہو رہی تھیں۔ غربت زدہ گھرانہ تھا۔ جمیل ڈھائی سال سے بے روزگار تھا، نوکری نہیں مل رہی تھی اور ماں اور بہن کی کفالت کے لیے اب اس کے پاس کچھ بھی نہیں تھا۔ غربت و افلاس زندگی کے ساتھی بنے ہوئے تھے۔ غم کی ایک کہانی تھی جو ان لوگوں سے وابستہ تھی۔ ماں دونوں ہاتھوں سے سینہ پکڑے ہوئے صرف ایک ہی دعا کر رہی تھی۔

"الٰہی میرے بچے کو زندگی دے دے۔ اسے تندرست کر دے"۔ بہت عرصے کے بعد ایک ماں کو بلکتے ہوئے دیکھا تھا۔ میں تو خود بھی ماں باپ سے بچھڑا ہوا تھا۔ ایک ماں کی آہ وزاری میری آنکھوں میں آنسوؤں کی نمی لے آئی اور میری آنکھوں سے نامحسوس آنسو ٹپک پڑے۔

مجھے احساس ہوا کہ روح کا بھی ایک جسم ہوتا ہے۔ ایک علیحدہ جسم جو احساس سے عاری نہیں ہوتا ہے، اس میں غم ہوتا ہے۔ زندگی ہوتی ہے، ہر طرح کا احساس ہوتا ہے، میں جانتا تھا کہ ابھی تھوڑی دیر کے بعد اس بوڑھی عورت پر غم کے پہاڑ ٹوٹنے والے ہیں اور یہ ہو گیا۔

تھوڑی دیر کے بعد وہی بزرگ جو نجمہ کے ساتھ گئے تھے، واپس آئے اور بہرحال انہوں نے یہ اطلاع دے دی کہ حادثہ میں جمیل زندہ نہیں رہ سکا۔ ماں پر سکتہ طاری ہو گیا تھا۔ عورتیں بین کرنے لگیں، بہرحال یہ سب کچھ ایسا تھا کہ میں اسے چھوڑ کر واپس نہیں آ سکا۔ میرا دل بھی بری طرح دُکھ رہا تھا۔ انسان کسی بھی عالم میں ہو بہرحال انسانی دکھوں سے متاثر ہوتا ہے۔ محلے کے افراد اسپتال چلے گئے۔ نجمہ کو وہاں سے واپس لایا گیا۔ لاش ابھی تک نہیں ملی تھی اور ضروری کارروائیاں ہو رہی تھیں۔ اس وقت دن کے تقریباً پونے تین بجے تھے جب لاش اسپتال سے لائی گئی۔ پڑوسی شدید غم کا شکار تھے۔

میں نے اس وقت ایک ماں کو دیکھا جو حسرت، جو کیفیت مجھے اس کے چہرے پر نظر آئی اس نے مجھے دیوانہ کر دیا۔ ماضی کی نہ جانے کون کون سی یادیں ایک دم ذہن میں زندہ ہو گئیں اور پھر دماغ میں تاریکیاں پھیل گئیں۔ نجمہ کی چیخیں آسمان کو چھو رہی تھیں اور میں سکتے کے عالم میں اس لاش کو دیکھ رہا تھا۔ دفعتاً میرے ذہن میں ایک عجیب سی کلبلاہٹ کا احساس اُبھرا۔ یہ احساس ایک خیال کی شکل اختیار کر گیا۔ ایک کام میں کر سکتا ہوں۔ یہ ایک کام میں بخوبی کر سکتا ہوں۔ واقعی اس وقت میں ایک کام آسانی سے کر سکتا ہوں اور مجھے یہ کام کرنا چاہیے۔

جب مجھے قدرت نے ایک انوکھی اور پُراسرار قوت سے نوازا ہے تو مجھے اپنے فرض کی

ادائیگی بھی کرنی چاہئے۔ یہ تو ایک دلچسپ مشغلہ ہے۔ یہ تو ایک ایسا عمل ہے جسے کرکے بہت سوں کو سکون بخش سکتا ہوں اور خود سکون حاصل کرسکتا ہوں۔ بس ایک لمحے کے اندر میں نے فیصلہ کرلیا کہ مجھے یہی عمل کرنا چاہئے۔ لوگ جمیل کی لاش کے گرد جمع تھے۔ طرف ایک کرسی پر عمر رسیدہ خاتون بیٹھی ہوئی تھیں۔ نجمہ درد بھرے انداز میں کہہ رہی تھی۔

''بھائی وعدہ خلافی کر ڈالی نا، کہتے تھے نجمہ میں جھوٹ نہیں بولتا۔ آخر بولا نا جھو دیکھو ہمیں بے آسرا چھوڑ کر چلے گئے، یہ اچھا تو نہیں کیا''۔

بس اس سے زیادہ میں نہیں سن سکا۔ میں نے اپنا عمل شروع کردیا اور آہستہ آہستہ وجود جمیل کے جسم کے اندر داخل ہونے لگا۔ کچھ ہی لمحوں کے اندر میرے ہوائی وجود کو ایک مل گیا تھا۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میں ایک بند کمرے میں آگیا ہوں۔ یہ کمرہ چاروں طر سے بند تھا اور اب اس کے بعد مجھے وہ کرنا تھا جس سے کسی کو کوئی غلط احساس نہ ہو۔ چنانچہ میں نے کروٹ بدلی اور بے شمار خواتین جو رو پیٹ رہی تھیں، اچانک ہی وہاں سے پڑیں، ایک عجیب سی بھگدڑ مچ گئی تھی۔ طرح طرح کی باتیں کی جارہی تھیں۔

دیکھو وہ ہل رہا ہے۔ ارے قسم لے لو اس نے منہ سے آواز نکالی ہے۔

''تو مری کیوں جارہی ہو، ذرا بتاؤ مولوی صاحب کو''۔

جتنے منہ اتنی باتیں۔ لیکن سچی محبتوں کا انداز ذرا مختلف ہوتا ہے۔ نجمہ آگے بڑھی اور سے لپٹ گئی۔

''بھائی تم زندہ ہو، بھیا اللہ نے ہم پر کرم کردیا، بھیا سن لی...... ہماری''۔

ماں کی دلدوز چیخ بھی سنائی دی اور وہ مجھ پر جھپٹ پڑی تھیں۔ میں اُٹھ کر بیٹھ گیا میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''کیا سمجھ لیا تھا آپ لوگوں نے اور یہ سب لوگ یہاں کیوں جمع ہیں۔ باپ رے باپ مجھے اپنی بیہوشی تو یاد ہے لیکن اس کے بعد کیا ہوا، یہ کچھ پتہ نہیں تھا مجھے''۔ بس اتنا کافی خوشیوں کا طوفان آگیا، حالانکہ میرا دل رو رہا تھا۔ یہ لوگ حقیقت کھو بیٹھے تھے اور اب ایک جھو انہیں بہلا رہا تھا، لیکن بہرحال یہ ایک جھوٹ ہی سہی، عارضی طور پر ان لوگوں کے غم کا مداوا بن تھا۔ مجھے جو یہ انعام حاصل ہوا تھا میں اس کا خراج ادا کررہا تھا۔ طرح طرح کے سوالات مجھ کئے جانے لگے۔ میں نے یہ اعتراف کیا کہ مجھے ایک کار سے ٹکر لگی تھی۔ یہ بھی کہا کہ اس ٹکر

بعد میں ذہنی طور پر معطل ہوگیا تھا اور میں نے غشی کے عالم میں وقت گزارہ تھا۔

اس دوران میرے ساتھ کیا ہوتا رہا۔ مجھے اس بارے میں کچھ نہیں معلوم، بہرحال جو ہوا تھا اس پر مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوا تھا۔ جو ہو رہا تھا وہ ان لوگوں کے لئے زندگی کا باعث تھا اور اس پر وہ بے حد خوش تھے۔ میں بہت دیر تک ان سے باتیں کرتا رہا۔ میں نے بتایا کہ میں ٹھیک ہوں۔ بہرحال ایک غریب کا معاملہ تھا اور غربت زدہ لوگ ہی ہمارے آس پاس تھے۔ نہ کوئی خاص مشورہ دے سکا، نہ کسی نے اس بات پر حیرت کا اظہار کیا۔ بس خوشیاں ہی خوشیاں تھیں۔

ماں کو اچانک زندگی مل گئی تھی اور میں ان کی کیفیت کو سمجھتا تھا۔ وہ بے شک ایک اجنبی ماں کی طرح تھی، لیکن آپ شاید اس پر یقین نہیں کریں گے کہ ہر ماں کا لمس ایک ہی جیسا ہوتا ہے اور ہر ماں اپنا ایک مقام رکھتی ہے۔ غرضیکہ اس طرح سے وقت گزرتا رہا۔ پڑوسی بہت دیر تک خوشیوں کے ساتھ رہے اور اس کے بعد چلے گئے۔ ماں اور بہن مجھے لپٹائے ہوئے بیٹھی تھیں اور اپنے جذبات کا اظہار کررہی تھیں۔

بہت اچھا ہوا تھا اور ہم بہرحال خوشیوں کا جھولا جھول رہے تھے۔ رات کا کھانا کھایا گیا۔ پھر ماں آرام کرنے لیٹ گئی۔ نجمہ دیر تک مجھ سے باتیں کرتی رہی تھی۔ میرے بارے میں بہت سی باتیں اس نے کہی تھیں۔ بار بار مجھے چومنے لگتی تھی اور میرے دل میں اس کے لئے محبت کا جذبہ پیدا ہوگیا تھا۔ پھر میں نے نجمہ کو بھی سونے کے لئے کہا اور وہ آرام کرنے کے لئے اپنے کمرے میں چلی گئی کہ دل نہیں چاہتا کہ مجھے چھوڑ کر جائے۔ نہ جانے کیوں یہ محسوس ہوتا ہے کہ اگر وہ اُٹھ کر چلی گئی تو یہ خواب ٹوٹ جائے گا جو بھیانک بات اس نے سنی ہے وہ عمل پذیر ہوجائے گی، لیکن میں نے اسے تسلی دی اور کہا کہ وہ بے فکر رہے، میں ٹھیک ہوں اور یقینی طور پر اس حادثے کے بعد ہماری دنیا میں ایک نئی زندگی کا آغاز ہوگا۔

بہرحال اس کے بعد میں جمیل کے کمرے میں آگیا۔ دروازہ اندر سے بند کرلیا۔ سونے کے لئے لیٹ گیا اور یوں جب مجھے احساس ہوگیا کہ باقی تمام لوگ سو چکے ہوں گے تو میں کمرہ بند کرکے جمیل کے کمرے کی تلاشی لینے لگا۔ بعض لوگوں کی عادتیں بعض معاملات میں عجیب محسوس کی جاتی ہیں، لیکن کبھی کبھی وہ اس قدر کارآمد ثابت ہوتی ہیں کہ انسان یقین نہ کرپائے اور یہی ہوا تھا۔ جمیل کے بارے میں ساری تفصیلات معلوم کرنا تو شاید مہینوں میں ممکن نہ ہوتا، لیکن جمیل کی ڈائری مل گئی تھی۔ سرخ رنگ کی ایک بوسیدہ کتاب میں اس نے اپنی

زندگی کی کہانی لکھ ڈالی تھی۔ ویسے تو اس کہانی میں بڑی طوالت تھی، لیکن کچھ کام کی باتیں مجھے معلوم ہوئی تھیں۔

میں نے ان کام کی باتوں کو معلوم کرنا شروع کردیا۔ نمبر ایک جمیل کی زندگی میں کوئی لڑکی نہیں تھی۔ بنیادی وجہ اس کی مصروفیت اور مالی نا آسودگی تھی۔ بہن کا رشتہ ایک جگہ کردیا تھا۔ شہریار بقول اس کے بہت اچھا انسان تھا اور اس کی دلی آرزو تھی کہ اس کی بہن کی زندگی کا ساتھی بن جائے۔ ایک اور مشکل ڈائری میں درج تھی وہ یہ تھی کہ شہریار بہت اچھی حیثیت کا مالک تھا۔ اس کی بہن نجمہ اور وہ کالج میں ساتھ پڑھ چکے تھے۔ بظاہر تو سب کچھ ٹھیک تھا، لیکن شہریار کا باپ ایک لالچی آدمی تھا اور اس کے اور شہریار کے باپ کے درمیان کافی چپقلش چل رہی تھی۔

شہریار نے اس سے کہا تھا کہ نجمہ کے لیے بہت کچھ ہے۔ ایک اچھا خاصا بینک بیلنس اور نجمہ کو بہت کچھ ملے گا۔ اس کے لئے اس نے جمیل سے کہا تھا کہ جمیل میرے بھائی جہاں جہاں سے مجھے بن پڑے گا میں یہ انتظام کرنے میں تمہاری مدد کروں گا۔ تم اپنے آپ کو اس سلسلے میں تنہا نہ سمجھنا۔ نجمہ کو میں وہ سب کچھ مہیا کروں گا جو کچھ میرے والد صاحب چاہتے ہیں، لیکن جمیل اس احساس سے شدید دلبرداشتہ تھا کہ اس کا بہنوئی اس پر یہ احسان کرے گا۔ وہ خود اپنی بہن کے لئے کچھ نہیں کرسکے گا۔ اس کے علاوہ جمیل کے کچھ اہم دوست تھے جن میں ناصر فرازی کا نام ایک پُراسرار حیثیت کا حامل تھا۔

ناصر فرازی کے بارے میں جمیل نے عجیب وغریب انداز میں لکھا تھا۔ پوری ڈائری پڑھنے کے بعد کم از کم مجھے یہ اندازہ بخوبی ہوگیا تھا کہ جمیل جن مسائل میں گھرا ہوا ہے ان میں اس کی بھرپور مدد کرسکتا ہوں۔ اب اس کے بعد یہ دیکھنا تھا کہ صورت حال آگے کیا ہوتی ہے۔ بہرحال نہ جانے کیوں میرے اندر خوشی کا احساس بھی تھا۔ جمیل کو اگر بچاسکتا تو شاید یہ میری زندگی کی سب سے بڑی خوشی ہوتی، لیکن وہ بے چارہ اس دُنیا میں نہیں تھا اور میں اس کا کردار انجام دے رہا تھا۔ میری آرزو تھی کہ میں اس کے والدین کو سکھ دے سکوں۔

دوسرے دن سے زندگی پھر معمول پر آگئی۔ میرے پاس بہت کچھ تھا اور فی الحال اس بہت کچھ ہی سے میں کام لے سکتا تھا۔ بھلا مجھے کسی شے کی کیا ضرورت تھی۔ میں آرام سے سب کچھ کرسکتا تھا۔ چنانچہ صبح کے ناشتے کے بعد میں نے ماں سے کہا،

"ویسے تو جو کچھ ہُئی بھائی کہ میں وہ تو اللہ کا حکم تھا، لیکن کبھی کوئی حادثہ زندگی کے بہت سکھ دے دیتا ہے۔ میں آپ کے لئے ایک خوش خبری لے کر آرہا تھا کہ راستے میں یہ واقعہ پیش آگیا۔ وہ خوش خبری آپ کی امانت ہے۔ امی میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں، وہ خوش خبری کیا ہے۔ امی، میری ملاقات کچھ ایسے لوگوں سے ہوئی جن کا دنیا کے مختلف ملکوں میں کاروبار ہوتا ہے۔ امی اصل میں وہ لوگ مجھے اپنے ساتھ شامل کرنا چاہتے ہیں اور اس کے لئے انہوں نے مجھے بڑی پیشکش کی ہے"۔

"کیا؟"

"ان کا کہنا ہے کہ میں دو تین مہینے یہاں رُک سکتا ہوں، وہ مجھے اتنا ایڈوانس دے سکتے ہیں کہ میں آسانی سے آپ لوگوں کے مسائل حل کرسکوں لیکن اس کے بعد مجھے کئی سالوں کے لئے ملک سے باہر جانا ہوگا۔ امی اتنا سنہری موقع زندگی میں بہت کم ملتا ہے۔ میں پوری طرح یہ اندازہ لگاچکا ہوں کہ وہ لوگ انتہائی نیک فطرت ہیں۔ صاف ستھرا کاروبار کرتے ہیں۔ کسی قسم کا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ آپ سمجھ لیجئے کہ اگر میں نے ان کی پیشکش قبول کرلی تو امی ہم سب کی زندگی بن جائے گی"۔ بزرگ عورت کے چہرے پر عجیب سے تاثرات پھیل گئے۔ کچھ لمحے سوچتی رہی، پھر انہوں نے کہا۔

"بیٹے ماں باپ کی آرزو آخری وقت تک یہی ہوتی ہے کہ بچوں کو اچھی زندگی مل جائے۔ بیشک ان کے دلوں میں کچھ اور بھی احساسات ہوتے ہیں، لیکن پھر بھی یہ ہوتا ہے کہ بچے بحالت مجبوری دور ہوجاتے ہیں۔ کتنے عرصے کے لئے تم ملک سے باہر جاؤ گے"۔

"عرصہ طویل بھی ہوسکتا ہے"۔

"اور یہاں میرا مطلب ہے نجمہ کا کیا ہوگا؟"

"امی اتنی رقم ایڈوانس مل رہی ہے کہ نجمہ کی شادی دھوم دھام سے کرسکتے ہیں کوئی دقت نہیں ہوگی۔ ہم شہریار سے مل کر چند روز کے اندر اندر یہ تمام معاملات طے کرسکتے ہیں"۔ امی کے چہرے پر عجیب سے تاثرات پھیل گئے تھے۔ انہوں نے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔

"کیا تم یقین کرو گے جمیل کے پرسوں رات شہریار کی والدہ آئی تھیں اور ایک عجیب سی بات کہہ گئی ہیں"۔

میں نے چونک کر عمر رسیدہ خاتون کی طرف دیکھا۔

"آپ نے مجھے کیوں نہیں بتایا؟"

"پریشانیوں کے علاوہ کیا حاصل ہوتا"۔

"پھر بھی آپ کو بتانا تو چاہئے تھا کہ کیا کہہ گئی ہیں وہ"۔

"کہ شہر کی خوشیوں کے لئے انہوں نے ایک طویل عمر گزاری ہے اور ایک ماں کے لئے بیٹے کی خوشیاں دیکھنا کتنا بڑا کام ہوتا ہے۔ میں اسے نہیں جانتی۔ انہوں نے ہاتھ جوڑ کر مجھ سے کہا کہ میں جو کچھ بھی کر سکتی ہوں کر دوں۔ کم از کم ان کی آرزو تو پوری ہو جائے"۔

"ٹھیک ہے تو پھر یہ کرتے ہیں کہ آج ہی رات شہر یار کے گھر چلتے ہیں اور ان سے باتیں کریں گے"۔

"میں نے شہریار کو اس حادثے کے بارے میں نہیں بتایا۔ پتہ نہیں وہ لوگ کیا سوچتے"۔

"چھوڑیئے اس بات کو بس ہم لوگ چل رہے ہیں"۔

"مگر بیٹے، پہلے ان لوگوں سے معاملہ طے کر لو۔ پتہ چل جائے کہ وہ ہماری اس طرح مدد کرنے پر آمادہ بھی ہیں یا نہیں۔ کہیں ایسا نہ ہو"۔

"اس کے لئے بے فکر رہیں امی۔ سب ٹھیک ہو جائے گا"۔

بہرحال اس رات کو میں اور امی شہریار کے گھر پہنچ گئے۔ پتہ میرے علم میں آ چکا تھا اور بہرحال جمیل کے وجود میں جو کچھ تھا وہ بھی ذہن میں تھا۔

زندگی کی ایک انوکھی کہانی شروع ہو گئی تھی اور میں اس کہانی کا ایک کردار بن گیا تھا۔ ایک ایسا کردار جو دلکش بھی تھا اور دلچسپ بھی۔ شہریار کے اہلِ خاندان سے ملاقات ہوئی تو اندازہ ہوا کہ واقعی روایتی قسم کے لوگ ہیں، البتہ شہریار خود ایک بہت ہی نفیس شخصیت کا مالک تھا۔ نرم نقوش کا مالک ایک دلچسپ نوجوان، جس نے بہت محبت بھرے انداز میں مجھے خوش آمدید کہا لیکن وہ مغرور خاتون اور شہریار کے والد، دونوں بڑی سرد مہری سے ہم سے ملے تھے۔ شہریار کے والد نے کہا۔

"آپ کے گھر تو فون بھی نہیں ہے، جس سے آپ کی آمد کی اطلاع مل جاتی"۔

ان الفاظ پر شہریار نے شرمندہ نگاہوں سے مجھے دیکھا، پھر سرگوشی کے انداز میں کہا تھا۔

"جمیل بھائی میرے اور آپ کے درمیان یہ بات طے ہو چکی ہے کہ جتنی زیادتی یہ لوگ آپ کے ساتھ کر رہے ہیں، میں ان سے ایک ایک کا حساب لے کر آپ کو دوں گا۔ آنے والا وقت

آپ کو احساس دلائے گا۔ جمیل بھائی کہ میں نے جو کچھ کہا تھا، غلط نہیں کہا تھا۔ بعض والدین اپنی اولاد سے ان کی پرورش کی اتنی بڑی قیمت وصول کرتے ہیں کہ انسان سوچ بھی نہیں سکتا۔ یہ قیمت ادا تو کر دی جاتی ہے جمیل بھائی لیکن اس کے بعد ان کا کوئی قرض باقی نہیں رہتا۔ بہرحال آپ میرے ہمیشہ ساتھی رہے ہیں۔ اس وقت تک اور میرا ساتھ دیجئے۔ جب تک میری زندگی کی تکمیل نہ ہو جائے۔ اس کے بعد پھر آپ کو اس قرض کی واپسی کر دوں گا"۔ شہریار کی باتوں کا مفہوم میں سمجھ رہا تھا۔ میں نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

"نہیں شہریار بے فکر رہو، سب ٹھیک ہے۔ مجھ سے کل دن میں ملاقات کر لو۔ کچھ کام ہیں تم سے ذرا ان کے بارے میں اہم مشورے کرتے ہیں"۔

بہرحال جمیل کی والدہ ان کے رویئے سے خاصی دلبرداشتہ تھیں اور انہوں نے روتے ہوئے کہا تھا کہ پتہ نہیں شادی ہونے کے بعد ان کی بچی سے ان لوگوں کا کیسا سلوک رہے گا۔ میں نے انہیں اطمینان دلاتے ہوئے کہا کہ امی کیا آپ کو اللہ کی ذات پر بھروسہ نہیں؟ اب سب ٹھیک ہو جائے گا۔ وہ لوگ جو کچھ بھی چاہتے ہیں وہ انہیں مل جائے گا۔ اصل رونا تو اسی بات کا تھا کہ ہم انہیں وہ سب کچھ کیسے دے سکیں گے۔ میں نے آپ سے کہا نا جو بات میں نے کہی ہے آپ سے۔ شاید آپ کو اس پر یقین نہیں ہے۔ بہرحال قصہ مختصر ہے یہ سارے معاملات طے ہوتے رہے۔ میں اپنا فرض پورا کرنا چاہتا تھا۔

چنانچہ تمام مسائل میں مجھے خاصی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ وہ لوگ تعاون نہیں کر رہے تھے۔ غالباً ان کے ذہن میں یہ خیال تھا کہ ہم انہیں کچھ نہیں دے سکیں گے، لیکن اپنے بیٹے سے بھی مجبور تھے وہ۔

چنانچہ شادی ہوئی اور جب میں نے ان کی خواہشوں سے کہیں بڑھ کر مال و دولت انہیں دیا تو ان کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ وہ بے پناہ خوش ہو گئے اور انسان کی اصلیت سامنے آ گئی۔ وہ ہمارے قدموں میں بچھ گئے۔

میں نے نفرت سے اس غلیظ شے کے بارے میں سوچا جس کا نام دولت ہے۔ دولت انسان کو کس قدر گرا دیتی ہے۔ یہ مناظر سینکڑوں بار دیکھنے میں آئے ہیں۔ اس وقت بھی یہی منظر دیکھ رہا تھا۔ بہرحال نجمہ اپنے گھر چلی گئی اور اس کے جانے کے بعد ایک اور مشکل سامنے آ گئی۔ ظاہر ہے میں جمیل کی حیثیت سے زندگی تو یہاں نہیں گزار سکتا تھا۔ بس جتنا بھی وقت

گزر جائے، لیکن اب جمیل کی والدہ نجمہ کے جانے کے بعد تنہا رہ گئی تھیں۔ اب ان کی آرزو تھی وہ یہ کہ میری شادی کر کے اپنی تنہائی دور کر لیں۔

حالانکہ میں ان سے کہہ چکا تھا کہ تھوڑے عرصے کے بعد میں اپنی ملازمت پر چلا جا گا۔ یہ کہنے کی وجہ صاف ظاہر تھی، میں ان سے جدا ہوتا لیکن نجمہ کے شوہر نے یہ مسئلہ حل کر دیا۔ ایک دن مجھ سے آ کر ملا۔ نجمہ بھی ساتھ تھی، میرے ساتھ نجمہ کی والدہ بھی تھیں، کہنے

''میں نے آپ سے وعدہ کیا تھا نا جمیل بھائی کہ بعد میں آپ کا قرض پورا کر دوں آپ نے سوچا ہوگا کہ یہ شخص اپنا مطلب پورا کرنے کے بعد سب کچھ بھول گیا''۔

''نہیں ایسی کوئی بات نہیں، مگر کہنا کیا چاہتے ہو تم؟''

''بات اصل میں یہ ہے کہ میرے والدین بگڑے ہوئے والدین ہیں، اس میں کوئی ش نہیں جمیل بھائی آپ نے نہ جانے کہاں کہاں سے کوششیں کر کے ان کی خواہشوں کے مطا ہی سب کچھ دیا ہے۔ اس کے بعد انہیں کم از کم نجمہ کے ساتھ سلوک اچھا کرنا چاہئے تھا، وہ اپنی مستیوں میں ڈوبے ہوئے لوگ ہیں، نہیں سمجھ پا رہے ہیں کہ انسان کی عزت کیا ہے۔ آخر کار میں نے فیصلہ کیا ہے کہ کرائے کا مکان لے کر اس میں چلا جاؤں۔ یہاں امی کے ساتھ بھی رہ سکتا ہوں، لیکن خود میری غیرت گوارہ نہیں کرتی۔ یہ آپ کا گھر ہے''۔

''نہیں ایسی بات نہیں ہے۔ اگر تم نے فیصلہ کیا ہے تو میری ایک بہت بڑی مشکل ہو جائے گی۔ مجھے اپنی ملازمت کے سلسلے میں ملک سے باہر جانا ہے اور میرا یہ معاہدہ طویل معاہدہ ہے۔ پتہ نہیں میری واپسی کب ہو۔ اگر امی کے ساتھ تم اور نجمہ رہو گے تو میر لئے اس سے زیادہ خوشی کی بات اور کوئی نہیں ہو سکتی''۔

وہ سوچ میں ڈوب گیا۔ اس نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے''۔

''لیکن ایک بات بتاؤ؟''......

''کیا؟''

''تمہارے والدین تو تمہارے یہاں رہنے پر اعتراض نہیں کریں گے؟''

''اب میری زندگی کا آغاز ہو چکا ہے۔ بھلا کسی کو کیا حق پہنچتا ہے کہ مجھے زنجیر ڈال قید رکھے۔ میں اپنی بیوی کے ساتھ جہاں چاہوں رہوں گا اور پھر ایک بات بتاؤں۔ آپ

جیسا میں نے کہا کہ وہ لوگ اپنی دولت میں مست ہیں۔ انہیں اس بات پر اعتراض نہیں ہوگا''۔

پھر یوں ہوا کہ نجمہ اپنے شوہر کے ساتھ یہاں آ گئی اور میں مطمئن ہو گیا۔ میں نے سوچا یہ تھا کہ چند ہفتے یہاں گزارنے کے بعد آخر کار واپس چلا جاؤں گا۔ یہ لوگ اس انداز میں مطمئن ہو جائیں گے کہ میں ملک سے باہر گیا ہوا ہوں۔ بہر حال بزرگ خاتون کی زندگی تک ہی یہ ساری مشکل ہے اور انسان کو ایک دن واپس جانا ہوتا ہے۔ چنانچہ کھیل ختم ہو جائے گا۔

سب لوگ ہنسی خوشی رہ رہے تھے کہ ایک تبدیلی رُونما ہوئی جسے میں ایک دلچسپ تبدیلی کہہ سکتا ہوں۔ مجھے ایک خط ملا۔ ظاہر ہے یہ خط جمیل کے نام تھا اور جمیل ہی کی حیثیت سے مجھے بھیجا گیا تھا۔ خط کا مضمون یوں تھا۔

ڈیئر جمیل!

کہو کیسے مزاج ہیں۔ زندگی کی گاڑی کتنا سفر طے کر چکی ہے۔ کہاں تک پہنچے ہو، جیسا کہ میں نے تمہیں بتایا تھا کہ میں پچھلے دنوں برازیل گیا ہوا تھا۔ بس ایک تکا لگ گیا تھا۔ یہ تو تم جانتے ہو کہ میں ایک مفلس آدمی ہوں، کوئی کرم فرما مل جاتا ہے تو زندگی کے کچھ دن گزر جاتے ہیں، ورنہ مست۔ یقین کرو۔ اس میں بڑا لطف آتا ہے۔ اچھا خیر، چھوڑو میرے ایک بہت ہی اچھے دوست ہیں جو یہاں اس شہر میں اچھی خاصی جائیداد کے مالک ہیں۔ زمیندار خاندانوں سے تعلق ہے۔ اسماعیل عباسی صاحب کے نام سے جانے جاتے ہیں، لیکن بڑے ہی اعلیٰ ذوق کے مالک ہیں۔ انہیں نوادرات سے بہت دلچسپی ہے۔ یہ نوادرات مختلف شکل میں ہیں۔ قیمتی زیورات، قدیم عمارتیں، یہاں فیض پور میں ایک بہت ہی پرانا مکان ہے، جس کی شکل و صورت ابھی تک ختم نہیں ہوئی، لیکن اس کی تاریخ کا پس منظر تاریک ہے۔ نہیں معلوم یہ عمارت کس نے بنوائی تھی، اندازہ یہ ہے کہ تقریباً سات آٹھ سو سال پرانی ہے۔ اگرچہ اس کا بڑا حصہ کھنڈروں اور ویرانوں میں بدل چکا ہے، لیکن اس کے باوجود یہ اب بھی رہائش کے قابل ہے۔ اسماعیل کو چونکہ اس طرح کی چیزوں کا شوق ہے، چنانچہ پچھلے دنوں اس نے حکومت سے یہ خرید لی ہے۔

متعلقہ محکمے کو ایسے پاگلوں کی ضرورت رہتی ہے حالانکہ یہ خوفناک عمارت مفت

میں بھی نہیں لی جاسکتی تھی، کیونکہ دیکھنے ہی سے آسیب زدہ معلوم ہوتی ہے لیکن کیا کیا جائے۔ اسماعیل صاحب کو اور اب انہوں نے ہمیں میرا مطلب ہے مجھے اس عمارت میں قیام کی دعوت دی ہے۔ تمہیں یاد ہے نا بسمل کہ تم نے کئی بار اس طرح کے معاملات میں میرا ساتھ دیا ہے اور میں جانتا ہوں کہ معاشی مسائل گھر میں ہونے کے باوجود تمہیں ایسی چیزوں سے دلچسپی ہے، چنانچہ فوراً آجاؤ۔ میں تمہارا انتظار کروں گا، مجھے بتاؤ کون سے دن پہنچ رہے ہو اور ہاں فیض پور میں میرا پتہ تبدیل ہوگیا ہے۔ نیا پتہ لکھ رہا ہوں، جس قدر جلد آسکو، آجاؤ۔ میں نے اسماعیل صاحب سے بھی تمہارا تذکرہ کردیا ہے۔ امی کو سلام کہہ دینا۔ نجمہ کیسی ہے، اسے بھی دعا دینا۔

تمہارا دوست ناصر فرازی

خط پڑھ کر میں حیران رہ گیا۔ حالانکہ کیا عجیب اور انوکھی بات تھی، جمیل ایک بالکل ہی مختلف سا کردار جس کے بارے میں کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ ایسے معاملات سے دلچسپی رکھتا ہے، لیکن خط کے بارے میں مَیں نے کسی کو کچھ نہیں بتایا۔ نجمہ نے پوچھا۔

''کس کا خط تھا جمیل بھائی''۔

''ابھی اس بارے میں نہ پوچھو''......

''کیوں؟''

''بس ایسی ہی بات ہے''......

''مجھ سے بھی چھپانے والی''۔

''یہی سمجھو''......

''سمجھ گئی''۔ نجمہ مسکرا کر بولی۔

''کیا؟''......

''کوئی خاتون ہیں...... خاتون سو فیصد''۔

''اوہ...... تمہارا مطلب ہے کہ......''

''جی ہاں...... اور میں نے غلط نہیں کہا''۔

''کمال ہے، تم تو بہت ذہین ہوگئی ہو''۔

''آپ کی بہن ہوں نا''۔

''تو پیاری بہن اپنی کھوپڑی ٹھیک کرلو''۔

''کیا مطلب؟''

''ایسی کسی خاتون کا ابھی اس دنیا میں کوئی وجود نہیں''۔

نجمہ خاموش ہوگئی۔ میری سوچ میں بہت سی باتیں آرہی تھیں۔ جمیل کی شخصیت بالکل مختلف تھی، لیکن بہرحال یہ حقیقت میرے سامنے آگئی تھی اور حیرانی کی بات یہ تھی کہ یہ سب میرے ذوق کے عین مطابق تھا۔ بھلا میرے لئے اس سے زیادہ خوشی کی کیا بات ہوسکتی تھی کہ میں وہی کچھ کرتا جو میری خواہش تھی۔ میں نے ماں سے کہا۔

''میرے مالکان نے مجھے طلب کیا ہے''۔

''میں سمجھی نہیں''۔ امی بولیں۔

''میں نے آپ سے کہا تھا ناں''۔

''ہاں...... جمیل'' امی کے لہجے میں لرزش تھی۔

''ملازمت تو ملازمت ہی ہوتی ہے، امی آج نہیں تو کل ان لوگوں کی طلبی پر مجھے جانا ہی ہوتا''۔

''امی کی آنکھوں میں آنسوؤں کی نمی آگئی تھی۔ میں نے اسے محسوس کیا تھا لیکن بات وہی تھی، میں زیادہ عرصے یہاں رہ کر کیا کرتا۔ ایک نہ ایک دن جانا ہی تھا۔ میں تیاریوں میں مصروف ہوگیا۔ نجمہ میرا ساتھ دے رہی تھی۔ اس دوران میں نے فیض پور کے بارے میں معلومات حاصل کرلی تھیں۔ ٹرین سے سفر کرنا تھا اور یہ سفر تقریباً سات گھنٹے کا تھا۔ آخرکار روانگی کا وقت آگیا۔ نجمہ کی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے۔ میں نے اسے کہا۔

''نجمہ خدا کے فضل سے تمہاری زندگی کو شوہر کا سہارا مل گیا ہے اور یہ بھی بہت اچھی بات ہے کہ تمہارا شوہر ایک اچھے مزاج کا آدمی ہے۔ بس اس کا خیال رکھنا''۔

اس کے بعد میں گھر سے نکل آیا۔ ٹرین برق رفتاری سے اپنا سفر طے کرنے لگی۔ قرب و جوار میں بہت سے مسافر تھے۔ اپنی اپنی دھن میں مست۔ میں بھی خیالات میں ڈوبا ہوا تھا اور میرا ذہن ناصر فرازی میں کھویا ہوا تھا وہ جمیل کا دوست تھا اور اس کے دوست اسماعیل عباسی نے ایک پرانا کھنڈر خریدا تھا۔ اس کی نوعیت کیا ہے، اس میں بڑی دلچسپی لے رہا تھا۔ ٹرین کا

سفر بہت بور گزرا کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

لیکن بہرحال وقت تو گزرنا ہی ہوتا ہے۔ جس وقت ٹرین فیض پور پہنچی سورج چھپ
تھا۔ ریلوے پلیٹ فارم پر زیادہ رش نہیں تھا۔ لوگ اِدھر اُدھر آ رہے تھے۔ مجھے گمان بھی ن
تھا کہ ناصر فرازی اس طرح میرے پاس آجائے گا۔ میں تو اسے پہچانتا بھی نہیں تھا۔ اچان
ہی ایک شوخ و شریر چہرے والے لمبے چوڑے آدمی نے گرج دار آواز میں دھاڑتے ہو
دونوں ہاتھ پھیلائے اور مجھے اپنے سینے سے لگا لیا۔ ''اوئے میرے یار تُو بڑا موٹا ہوگیا
بھئی''۔ میں اس اچانک حملے سے ایک لمحے کے لئے تو پریشان ہوگیا لیکن پھر سمجھ گیا کہ
ناصر فرازی ہے۔ میں چونکہ اس وقت جمیل کا کردار ادا کر رہا تھا اور اس شخص کی جمیل سے د
تھی۔ اس کے بارے میں میرے علم میں آچکا تھا اس لئے مجھے بھی اسی بے تکلفی کا مظاہر
تھا، چنانچہ میں نے اس کے بعد اسی پُرتپاک سے اس سے ملاقات کی اور جذباتی انداز میں بو

''یار تُو بھی کسی سے کم نہیں رہا۔ اتنا ہی موٹا تو مجھے نظر آ رہا ہے۔

''اس کی وجہ ہے نا''۔ ناصر نے میرے ساتھ آگے بڑھتے ہوئے کہا۔

''بھلا کیا وجہ ہے؟''

''بس بتا دیتے ہیں۔ پہلے تجھے اپنے گھر لے جاؤں اور اس کے بعد اسماعیل کے
بس یہ سمجھ لے کہ اسماعیل کو میں نے تیرے بارے میں ساری تفصیلات بتا دی ہیں۔ و
تیری آمد کا بے چینی سے منتظر ہے''۔

''ساری باتیں اپنی جگہ لیکن تم مجھے اس عمارت کے بارے میں تو بتاؤ''۔

''اب اتنی جلدی بھی نہیں ہونی چاہئے۔ بتا دوں گا، سب کچھ''۔ ناصر فرازی نے کہا۔

اس دوران ہم ریلوے اسٹیشن سے باہر نکل آئے تھے۔ ناصر فرازی ایک پرانی نور
کی طرف بڑھتا ہوا بولا۔

''لندن میں مجھے میرے ایک دوست نے تحفہ میں دی تھی اور جب میں واپس آیا تو
نے یہ کار اسے واپس دینا چاہی مگر انگریزوں میں ایک بڑی خوبی ہوتی ہے''۔

''وہ کیا؟''

''کھلاتے بھی ہیں اور گھر تک چھوڑنے بھی آتے ہیں''۔

''خیر انگریزوں کی تعریف تم کم از کم میرے سامنے مت کرنا، گھر تک چھوڑنے آ

اور پھر واپس نہیں جاتے''۔ میں نے کہا اور ناصر فرازی ہنسنے لگا۔ پھر بولا۔

''یار ہمیشہ ون وے ٹریفک نہیں چلانا چاہئے''۔

''خیر چھوڑو جو کچھ میں کہہ رہا ہوں اسے برداشت کرنا مشکل ہو جائے گا''۔

''میرے بھائی ہم نے بھی تو غلطیاں کی تھیں۔ کسی کو اپنے گھر میں اتنی جگہ دینا کون سی عقل مندی تھی۔ کسی کے چہرے پر لکھا ہوتا ہے کہ کون اچھا ہے، کون برا''۔

''تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ یہ کار جب میں نے اپنے انگریز دوست کو واپس کی تو اس نے مجھے حیرانی سے دیکھتے ہوئے کہا''۔

''اس کی وجہ''۔

''میں نے کہا یار! ہم ٹھہرے پھکّو لوگ اسے اپنے گھر کیسے لے جائیں گے''۔ بس اس کے بعد تم سمجھ لو کہ یہاں تک پہنچایا اس نے اور اب بھی اگر اس کے فاضل پرزے درکار ہوئے تو ہمارا یار زندہ باد''۔

پھر ہم ناصر فرازی کے گھر پہنچ گئے۔ میرے لئے تو یہ بھی ایک اجنبی جگہ تھی، لیکن اس جگہ کا جائزہ لینے کے بعد ناصر فرازی کی شخصیت کے بارے میں اندازہ ہو جاتا تھا کہ وہ واقعی ذرا مختلف قسم کا آدمی ہے۔ یہاں پہنچنے کے بعد اس نے میری خاطر مدارت کا بندوبست شروع کر دیا۔ کھانے سے فراغت حاصل کر کے میں اس سے اس کے بارے میں باتیں کرنے لگا، لیکن نہایت ذہانت کے ساتھ۔ میں اس کی اصل شخصیت کو کھود کر نکال رہا تھا اور اس گفتگو کے دوران مجھے جو باتیں معلوم ہوئیں وہ یہ تھیں کہ گھومنا پھرنا اس کا خاص مشغلہ تھا اور اس نے دنیا کے بیشتر دشوار گزار حصوں اور ان جانے علاقوں میں سفر کیا تھا۔

اس کی زندگی کی داستان اس قدر پُراسرار اور لرزہ خیز تھی کہ اس جیسے شخص سے دوستی کرنا میرے اپنے مقصد سے بڑی مطابقت رکھتا تھا، البتہ یہ بات ذرا باعثِ پریشانی تھی، میرے لئے کہ میں صرف جمیل بن کر اس سے ملوں۔ اس طرح سے میری شخصیت تو بالکل ہی پس منظر میں چلی جاتی تھی۔

بہرحال یہ بعد کی بات تھی کہ کبھی کسی مناسب وقت میں اسے اپنے بارے میں بتاؤں۔ کھانا وغیرہ کھانے کے بعد اصل موضوع پر گفتگو ہوئی اور میں نے موضوع بدلا۔ اصل میں اسماعیل عباسی کے بارے میں مختصر طور پر میں نے تمہیں اپنے خط میں لکھا تھا، وہ ایک شوقین

آدمی ہے۔ سیر وسیاحت کے دوران ہی اس سے میری ایک بار ملاقات ہوئی تھی۔ ہم دو
کے درمیان دوستی کا سبب یہی مشترکہ شوق ہے۔

''اس عمارت کا کیا قصہ ہے؟''

''اصل میں اسماعیل کے ساتھ اس کا بھائی نذیر عباسی بھی رہتا ہے۔ دونوں بھائی ا
ہی مزاج کے لوگ ہیں اور اس نے مجھے اس عمارت کے بارے میں تفصیل بتائی تھی۔

اصل میں یہ عمارت ایک بار میں نے خود بھی دیکھی تھی اور خفیہ طور پر اس میں داخل
تھا۔ یہ بات تو تم جانتے ہو کہ میں نڈر آدمی ہوں اور میں نے زندگی میں بہت سے نشیب و
دیکھے ہیں۔ بظاہر یہ عمارت کسی خاص اہمیت کی حامل نہیں۔ بس یوں سمجھ لو، گزارے والی
تھی لیکن اس کی پُراسراریت سے میں انکار نہیں کرسکتا۔ انتہائی پُراسرار عمارت ہے وہ۔ صد
پرانے طرزِ تعمیر کا نمونہ، لاتعداد کمرے، گیلریاں، برآمدے اور غلام گردشیں وہاں موجود ہیں
اسماعیل عباسی نے اس بارے میں جو تفصیل بتائی ہے، وہ بالکل ہی مختلف نوعیت کی ہے''۔

''کیوں اس میں کیا خاص بات ہے؟''

اس نے کہا۔ ''اصل عمارت کے نیچے ایک اور عمارت بنی ہوئی ہے۔ یعنی تہہ خانہ اور
تہہ خانے میں غالباً عمارت کے مالکان نے اس عمارت کو مکمل کرتے ہوئے اوپر کا سامان
سجا دیا تھا۔ اسماعیل نے یہ سارا سامان واپس عمارت کے کمرے میں رکھا ہے۔ اس کا کہنا
کہ اس میں لاتعداد پرانے زمانے کے ہتھیار، فرنیچر اور ایسی بے شمار اشیاء ہیں۔ اس نے
بہترین آئیڈیا دیا ہے اور اس میں واقعی کوئی شک نہیں ہے کہ اگر ہم اس آئیڈیے پر کام کر
تو کمال چیز ہوگی''۔

''آئیڈیا کیا ہے؟''

''اسماعیل عباسی کہتا ہے کہ دنیا کے مختلف ممالک میں پرائیویٹ تہہ خانے ہوا کر
تھے، خاص طور پر محکمہ سیاحت کے تعاون سے ان میں کام ہوتا ہے۔ اگر ہم اسے ایک
گھر کی شکل دے دیں اور اس کی پبلسٹی کریں تو نہ صرف ہمارے شوق یا ذوق کی تکمیل
بلکہ ہمیں اس سے اچھا پیسہ بھی حاصل ہوگا''۔

''واقعی! تم نے میرا تجسس بہت زیادہ بڑھا دیا ہے''۔ میں نے ناصر فرازی سے کہا۔
ویسے بھی اب میں اس شخص کو اچھی طرح سمجھتا جا رہا تھا اور مجھے اس بات کی خوشی تھی

اب تک اس نے میرے بارے میں ایک لفظ بھی نہیں کہا تھا، یعنی یہ کہ وہ میری طرف سے اب بالکل مطمئن تھا اور اس نے مجھے مکمل طور پر جمیل سمجھ لیا تھا۔ خیر باقی لوگوں کی تو بات ہی مختلف ہوتی ہے۔ ماں اور بہن نے جب اپنے بھائی اور بیٹے کی تمیز نہیں کی تھی تو بھلا پھر ایک ایسا شخص جس سے صرف میری دوستی ہو، مجھ میں کیا نئی بات تلاش کرتا میں نے کہا۔

''تو پھر اب کیا ارادہ ہے؟''

''اسماعیل کو میں نے تمہارے بارے میں بتا دیا تھا۔ وہ ہمارا انتظار کر رہا ہوگا اور تھوڑی ہی دیر کے بعد ہمیں روانہ ہونا ہے''۔

میں نے اپنے دل میں ایک عجیب سی خوشی محسوس کی تھی۔ غالباً اب یہ میری فطرت بن چکی تھی، پُراسرار اور انوکھی چیزیں میرے لئے بڑی دلچسپی کا باعث تھیں۔ ناصر فرازی تمام معمولات سے فارغ ہوا اور اس کے بعد مجھے ساتھ لئے ہوئے باہر نکل آیا۔ اس کی پرانی فورڈ کار بہترین کنڈیشن میں تھی۔ ایک سلف میں اسٹارٹ ہوتی تھی۔ ہم چل پڑے۔ راستے میں، میں نے اس سے کہا۔

''اس عمارت کا فاصلہ کتنا ہے؟''

''یار، عجیب وغریب جگہ ہے۔ ویسے تو شہر سے باہر نکلتے ہی اگر ہموار راستہ مل جائے تو زیادہ سے زیادہ 20 منٹ کا سفر ہوتا ہے، لیکن غالباً اس بات کا خیال ہی نہیں رکھا گیا یا پھر اس بات کے امکانات بھی ہیں کہ جب وہ عمارت تعمیر ہوئی ہوگی تو اس کے آس پاس آبادیاں ہوں گی، لیکن بہرحال اب ہمیں وہاں تک پہنچنے کے لئے تقریباً 60 کلومیٹر کا فاصلہ طے کرنا پڑے گا اور اس کے بعد تھوڑا سا کچا سفر''۔

میں نے خاموشی اختیار کرلی۔

ایک اچھی شاہراہ سے گزر کر آخرکار ایک کچی پگڈنڈی اختیار کرنا پڑی۔ میں اس علاقے کی جغرافیائی نوعیت سے واقفیت حاصل کر رہا تھا۔ پھر میں نے دور سے اندھیرے میں لپٹی ہوئی اس کھنڈر نما عمارت کو دیکھا۔ واقعی اس کا جائے وقوع خطرناک کہا جا سکتا تھا۔

عمارت کو دور ہی سے دیکھ کر یہ اندازہ ہو جاتا تھا کہ بے حد عظیم الشان اور ہیبت ناک جگہ ہے۔ قریب پہنچ کر صورتِ حال مزید واضح ہو رہی تھی۔ بلند و بالا دیواریں، نمی، دھوپ اور ہوا کے باعث کالا رنگ اختیار کر چکی تھیں۔ جگہ جگہ اینٹوں سے ڈیزائن بنے ہوئے تھے۔ بدنما

اور خستہ اینٹیں کسی شارک مچھلی کی آنکھوں کی طرح جھانک رہی تھیں۔

قرب و جوار میں ریت کے ٹیلے بکھرے ہوئے تھے جن پر ناگ پھنی کے پودے جا بجا نظر آرہے تھے۔ اندازہ یہ ہورہا تھا کہ اس علاقے میں سانپ بھی ضرور ہوں گے۔ غور سے زمین پر دیکھا جاتا تو ریت پر سانپوں کی لکیریں نمایاں نظر آتیں۔ پھر ہم نے عمارت کے دروازے پر روشنی دیکھی۔ اس روشنی میں کچھ انسانی سائے نظر آرہے تھے، دور سے دیکھنے والے یقینی طور پر اس ماحول کو دیکھ کر خوفزدہ ہوجاتے۔ میں نے بھی اس سلسلے میں فوراً ناصر فرازی سے سوال کرڈالا تو وہ مسکرا کر بولا۔

''مزہ آیا نا''۔

''کیسا مزہ؟''

''مدھم روشنی میں ان لرزتے ہوئے انسانی سایوں کو دیکھ کر ان ویرانوں کی طرف نکل آنے والا کوئی بھی شخص دُم دبا کر بھاگ سکتا ہے یا پھر دم دے سکتا ہے۔ ویسے دُم اور دم کا فرق تمہیں سمجھ میں آیا؟''

''مگر یہ کیا قصہ ہے؟''

''قصہ نہیں، یہ اسماعیل عباسی اور اس کا ملازم شمشیر ہے۔ بھئی ظاہر ہے بلند و بالا عمارت سے دور ہی سے کسی نہ کسی کو آتے ہوئے دیکھا جاسکتا ہے۔ انہوں نے ہماری گاڑی دیکھ لی ہوگی اور ہمارے استقبال کے لئے آ کھڑے ہوں گئے۔ بہرحال تھوڑی دیر کے بعد ہم لوگ اس عمارت کے دروازے پر پہنچ گئے اور میں نے پہلی بار اسماعیل عباسی کو دیکھا۔ کسی قدر پستہ قامت لیکن سرخ چہرے والا یہ شخص کافی خوش مزاج معلوم ہوتا تھا، جیسے ہی ہم نیچے اترے، دونوں ہاتھ پھیلا کر ہماری طرف بڑھا۔ پہلے وہ مجھ سے بغل گیر ہوا اور بولا۔

''میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ تم جمیل ہو...... کیوں ناصر فرازی میرا کہنا غلط تو نہیں''۔

''بالکل نہیں!''

''البتہ اپنے بارے میں، میں آپ کو بتاؤں، میرا نام اسماعیل عباسی ہے''۔ عباسی نے ایک زوردار قہقہہ لگایا اور پھر اپنے غلام شمشیر کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

''گاڑی تم اندر لے آؤ گے۔ جمیل صاحب، یہ میرا چھوٹا بھائی نذیر ہے اور یہ ہمارے ساتھ شمشیر جس کا عہدہ بہت بڑا ہے۔ بس آپ یوں سمجھ لیجئے کہ ہم اسی کے بل پر زندگی گزار

رہے ہیں۔ یہ بہترین کھانا پکاتا ہے، بہترین ڈرائیونگ کرتا ہے، بہترین ہاؤس کیپر ہے۔ ایک نڈر اور ضروریات کے وقت ایک شاندار لڑاکا جسے شاید پستول سے لے کر ٹینک تک سارے ہتھیار استعمال کرنے کا تجربہ ہے''۔

''ویری گڈ...... زبردست بات ہے یہ تو! ایسا ساتھی اگر کسی کو مل جائے تو یہ تو بہت خوش قسمتی کی بات ہے''۔

''حالانکہ میں نے پہلے سوچا تھا کہ اس عمارت میں ملازموں کی ایک فوج جمع کرلوں، لیکن چار آدمی بڑی مشکل سے گھیر گھار کر لایا تھا۔ پر چاروں بھاگ گئے''۔

اندر داخل ہوتے ہی اسماعیل عباسی نے قہقہہ لگایا۔ وہ بہت زیادہ ہنسنے کا عادی تھا۔

''بھاگ گئے؟''

''ہاں''۔

''لیکن کیوں؟''

''اس لئے کہ عمارت کے دوسرے مکینوں نے انہیں پریشان کرنا شروع کردیا تھا''۔

''دوسرے مکین؟''

''ہاں بھئی ایک ایسی جگہ جہاں طویل عرصے تک کوئی نہ رہا ہو، اگر کچھ لوگ بسیرا کرلیتے ہیں تو اس میں تعجب کی کون سی بات ہے اور پھر یہ بات تو تم لوگ جانتے ہی ہو کہ زر، زن اور زمین کے جھگڑے ہمیشہ ہی سے چلتے رہے ہیں۔ اب ہم نے یہاں جن لوگوں کو ڈسٹرب کیا ہے، وہ ظاہر ہے ہماری آمد کو پسند تو نہیں کرتے اور ان کے اور ہمارے درمیان ایک دلچسپ جنگ کا چلنا بہت ضروری ہے''۔

بہرحال اس بات کو ناصر فرازی نے بڑی دلچسپی سے سنا تھا۔ پھر اس نے کہا۔

''آپ کا مطلب ہے مسٹر اسماعیل عباسی کہ واقعی اس عمارت میں ایسا کوئی سلسلہ ہے۔ میرا مطلب ہے کہ یہ ایک آسیب زدہ عمارت ہے''۔

اسماعیل عباسی نے زوردار قہقہہ لگایا پھر بولا۔

''نہ گھوڑا دور ہے نہ میدان، میں پورے دعوے سے تو یہ نہیں کہہ سکتا کہ اس گھر میں بری روحیں رہتی ہیں لیکن بہرحال اس میں کوئی شک نہیں کہ تھوڑی پراسرار مدافعت ہو رہی ہے۔ اب یہ مدافعت انسانی ہے یا غیر انسانی اس کے بارے میں میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔

مدافعت تو بہر حال ہوتی ہے"۔

"یعنی آپ کا مطلب ہے مسٹر اسماعیل عباسی"۔

"میں بتاتا ہوں"۔ اچانک ہی نذیر نے درمیان میں دخل دیا اور ہم سب اس کی طرف متوجہ ہوگئے۔ میں نے تو ابھی خاموشی ہی اختیار کر رکھی تھی، لیکن نذیر عباسی بولا۔

"میں نے یہاں بہت سے ایسے واقعات دیکھے ہیں، اس مختصر وقت میں، جن سے مجھے اندازہ ہوگیا ہے کہ وہ جو کوئی بھی ہیں، ہماری یہاں موجودگی کو ناپسند کرتے ہیں"۔

"خیر چلو چھوڑو، یہ سب بعد کی باتیں ہیں۔ معزز مہمانوں کو پہلے ہی مرحلے پر اس قدر خوفزدہ کردینا ایک غیر مناسب عمل ہے"۔

"ناصر فرازی آپ کے بارے میں بہت سی باتیں بتا چکا ہے۔ مسٹر جمیل، واقعی پُراسرار واقعات میں دلچسپی کا اپنا الگ ہی مزہ ہے۔ چلیں ٹھیک ہے، آیئے آپ کے لئے کوئی مناسب جگہ منتخب کردوں۔ ویسے تو رات کو ہم سب جمع ہوکر اس مسئلے پر گفتگو کریں گے"۔ جو کمرہ ہمارے لئے منتخب کیا گیا تھا، وہ صاف ستھرا ٹھنڈا اور زمانہ قدیم کے فرنیچر سے آراستہ تھا، اس کے بارے میں ناصر فرازی نے بتایا۔

"جیسا کہ میں تمہیں بتا چکا ہوں، یہ فرنیچر بھی پہلے موجود نہیں تھا، بلکہ اسے ایک پُراسرار تہہ خانے میں سے نکالا گیا اور اس کے بعد کمروں میں اسے جگہ دی گئی ہے اور مسٹر اسماعیل عباسی نے خود وہ تہہ خانہ دریافت کیا تھا اور"۔

"اس سلسلے میں کوئی تفصیلی بات تو نہیں ہوئی میری، لیکن بہر حال عمارت کا جائزہ لینے کے بعد یہ اندازہ ہوتا ہے کہ واقعی یہاں کوئی گڑ بڑ ہے۔ کیا آپ کو اس سلسلے میں کوئی خاص تجربہ ہے؟" فرازی چونک کر مجھے دیکھنے لگا، پھر ہنس کر بولا۔

"یار مجھے تو یوں لگتا ہے کہ جیسے کوئی پُراسرار روح تیرے اندر بھی داخل ہوگئی ہے، تیرے بات کرنے میں یہ تبدیلی مجھے واقعی کئی بار حیرت انگیز لگی ہے۔ وقت ہوگیا ہے، خاصا وقت گزر گیا پھر بھی اتنا نہیں ہوا کہ اتنی بڑی حویلی میں تبدیلی آجائے مجھے تو لگتا ہے کہ عمارت کے بھوت تجھ پر اثر انداز ہوئے ہوں"۔

میں ہنسنے لگا۔ ویسے اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ یہ عمارت اپنے حلیے ہی سے آسیب زدہ معلوم ہوتی تھی۔ آسیب زدہ عمارتوں میں ایک عجیب سی نحوست چھائی ہوئی ہوتی ہے۔ ان کے

در و دیوار روتے ہوئے لگتے ہیں۔ ایک ایک منظر سے عجیب و غریب احساسات جھانکتے ہیں۔

میں تو خیر پکے دل کا انسان تھا، کیونکہ جن واقعات سے میرا واسطہ پڑ چکا تھا، وہ بہت ہی خوفناک تھے، لیکن اگر کوئی ایسا شخص جس نے کبھی زندگی میں کوئی پُراسرار واقعات اور حالات کا منہ نہ دیکھا ہو، اس کمرے میں ہی آجاتا تو یقیناً دہشت زدہ ہوجاتا۔ پُراسرار اور قدیم فرنیچر جو جگہ جگہ سے ٹوٹا پھوٹا تھا، لیکن جسے استعمال کے قابل بنالیا گیا تھا۔ میزیں، کرسیاں، آتش دان اور ایسے ہی دوسرے ڈیکوریشن پیس جن میں کچھ کو زبردستی ڈیکوریشن پیس بنادیا گیا تھا۔

مثلاً کارنس پر رکھا ہوا ایک انسانی ہاتھ جو دور سے دیکھتے ہی کسی انسان کا کٹا ہوا ہاتھ محسوس ہوتا تھا، لیکن اصل میں اس کی انگلیوں کے درمیان ایک شمع رکھی ہوئی تھی۔ ہاتھ کے دوسرے سرے سے خون ٹپکتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ مجھے یہ بھی اندازہ ہو رہا تھا کہ اسماعیل عباسی بذات خود بھی اسی قسم کا انسان ہے، بعض لوگوں کو ایسی صورتیں پسند ہوتی ہیں جن سے خوف محسوس ہو۔

اچانک ہی ناصر فرازی باہر نکل گیا۔ میں ایک سمجھ دار شخصیت کا مالک تھا، کچھ لمحے تک میرے دل میں خوف کا کوئی گزر نہ ہوا۔ البتہ پھر ایک ایسا واقعہ ہوا جس نے مجھے حیران کردیا۔ میری نگاہ کمرے کی دوسری چیزوں کا جائزہ لیتے ہوئے اس کٹے ہوئے انسانی ہاتھ پر جا پڑی جس کی انگلیوں کے درمیان شمع رکھی ہوئی تھی۔ نہ جانے کیوں مجھے یہ احساس ہوا کہ اس ہاتھ کی انگلیاں ہل رہی ہیں۔ میں نے حیران نگاہوں سے کارنس پر رکھے ہوئے اس انسانی پنجے کو دیکھا۔ یہ حیرانی کی انتہا تھی کہ میں نے انگلیوں کو دوبارہ ہلتے ہوئے دیکھا۔

پھر اچانک ہی ہاتھ کے درمیان رکھی ہوئی شمع روشن ہوگئی اور میں اچھل کر کھڑا ہوگیا۔ یہ کیا قصہ ہے، ایک لمحے کے لئے میں سوچتا رہا۔ شمع کا اچانک جل جانا میری سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ رفتہ رفتہ میرے قدم آگے بڑھے اور ہاتھ کے قریب پہنچ گیا۔ تب میں نے دوسرا منظر دیکھا۔ ہاتھ کی کٹی ہوئی کلائی سے خون کے قطرے ٹپک رہے تھے اور اچھا خاصا خون جمع ہو چکا تھا۔ میری آنکھیں حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ ہلتی انگلیاں ساکت ہوگئی تھیں۔ قریب سے دیکھنے پر اندازہ ہوا کہ یہ کوئی ڈیکوریشن پیس نہیں بلکہ واقعی ایک انسانی ہاتھ ہے جو کلائی کے پاس سے کاٹ دیا گیا ہے، لیکن اس سے ٹپکتے ہوئے خون کے قطرے میرے خدا...... میں نے انگلی سے اس خون کو چھو کر دیکھا تو گاڑھا خون میری انگلی کے پور سے لگ گیا۔

ایک لمحے کے لئے میں سوچتا رہا، پھر میں نے وہ جگہ چھوڑ دی۔ اسی وقت ناصر فرازی میرے پیچھے سے آگیا۔ جیسے ہی اس نے دروازہ کھولا، میں اچھل پڑا، جو منظر میں دیکھ رہا تھا اس کو دیکھ کر خوف کا احساس تو قدرتی بات تھی، ناصر فرازی مجھے کھڑا دیکھ کر میرے پاس آگیا۔

''کیا بات ہے؟''

''اسے دیکھو''۔ میں نے ہاتھ کے پنجے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''میں نے کہا نا تم سے اسماعیل عباسی ایک کھسکا ہوا آدمی ہے۔ اسے اس طرح کی فضول چیزوں سے بہت دلچسپی ہے اور وہ انہیں نوادرات میں سے سمجھتا ہے۔ یہ کٹا ہوا انسانی ہاتھ یقینی طور پر کسی ایسی چیز سے بنا ہے جو انسان کی کھال سے مشابہت رکھتی ہے''۔

''میں تمہیں ایک بات کہوں، غور سے دیکھو یہ کوئی مشابہت نہیں بلکہ یہ واقعی کٹا ہوا انسانی ہاتھ ہے اور یہ شمع میں نے نہیں جلائی خود بخود روشن ہوگئی ہے''۔

''روشن ہوگئی ہے''۔ ناصر فرازی نے حیران کن لہجے میں کہا۔

''ہاں تم دیکھو نا''۔ میں نے رخ بدلا اور پھر دوسرے لمحے میرا منہ حیرت سے کھل گیا۔ شمع بجھی ہوئی تھی۔ جب موم بتی جلتی ہے اور اس کے بعد اسے بجھادیا جاتا ہے تو لازمی طور پر اس کا ہلکا سا سفید دھواں خارج ہوتا ہے اور ایک ناگوار سی بو بھی محسوس ہوتی ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ نہ تو اس وقت اس کا موم پگھلا ہوا تھا، نہ اس کی بتی میں کوئی ایسی بات تھی کہ وہ جلی ہوئی ہو، جبکہ میں پورے ہوش وحواس کے ساتھ یہ بات کہتا ہوں کہ میں نے جو کچھ دیکھا وہ حقیقت تھا اور حیرت کا دوسرا حملہ مجھ پر اس وقت ہوا جب میں نے اس ہاتھ کو دیکھا۔

آہ! یہ تو واقعی پتھر کا ہاتھ تھا جس کی انگلیاں ایک مخصوص انداز میں اُٹھی ہوئی ہیں۔ اچانک ہی مجھے خیال آیا، میری انگلی میں بھی خون لگا ہوا ہے۔ ثبوت کے طور پر میں یہ خون تو پیش کرسکتا ہوں، میں نے جلدی سے اپنی انگلی کو دیکھا لیکن خدا کی پناہ میری انگلی کا یہ حصہ بالکل صاف ستھرا تھا۔

''تمہیں کیا ہوگیا ہے جمیل، لگتا ہے کہ اس مکان کے آسیب تم تک پہنچ گئے ہیں''۔
میں نے پھیکے انداز میں ہنس کر کہا۔

''نہیں، بس ایسے ہی میں ان تمام چیزوں کو دیکھ رہا تھا۔ رات کو کھانے کی میز پر شمشیر ہمیں لے کر پہنچ گیا۔ اسماعیل، نذیر وہاں موجود تھے۔ شمشیر کو بہت اہمیت حاصل تھی۔ بے

شک کھانا اسی نے تیار کیا تھا لیکن وہ اس وقت کھانے کی میز پر ایک معزز مہمان کی حیثیت سے موجود تھا۔

کھانے کی میز پر اسماعیل عباسی نے تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔

''میں واقعی بڑی بے چینی سے تمہارا منتظر تھا، ناصر فرازی صاحب اور خصوصاً جمیل صاحب کا، کیونکہ مجھے تم نے بتایا تھا کہ تم دونوں ایسے پُراسرار واقعات میں بے پناہ دلچسپی رکھتے ہو۔ میری زندگی کا بہت سا حصہ تو تمہارے سامنے ہے۔ یہ سمجھ لو کہ اس عمارت کی خریداری بھی میں اپنی زندگی کا ایک اہم کارنامہ سمجھتا ہوں۔ بہر حال میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ یہاں کچھ پُراسرار اور لرزہ خیز آوازیں سنی جاتی رہی ہیں۔ میری زندگی میں ایسے بہت سے واقعات پیش آتے ہیں کہ کچھ لوگوں نے کسی جگہ کوئی اڈا بنا رکھا ہے اور اس طرح کے پُراسرار حالات پیدا کردیئے ہیں کہ کوئی دوسرا وہاں نہ ٹک سکے۔ اس بات پر میں نے خاص طور پر نظر رکھی ہے''۔

''کچھ سوالات درمیان میں کرسکتا ہوں، مسٹر عباسی؟''

''تو پھر تمہیں بلایا کس لئے ہے؟'' اسماعیل عباسی نے مسکراتے ہوئے کہا، پھر بولا۔

''اصل میں یہی تو میں چاہتا ہوں کہ اس عمارت کے بارے میں کسی ذمہ دار اور دلیر آدمی سے تفصیلی گفتگو کروں''۔

''اگر اس کے لئے آپ نے میرا انتخاب کیا ہے تو آپ کا شکر گزار ہوں۔ میں یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ جب آپ نے حکومت سے اس عمارت کی خرید وفروخت کی بات کی تو کیا اس سلسلے میں کسی رکاوٹ کا سامنا تو نہیں کرنا پڑا؟'' اسماعیل عباسی کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی، پھر اس نے کہا۔

''میں نے جب متعلقہ لوگوں سے اس سلسلے میں بات چیت کی تو کچھ چہرے حیرت کی تصویر بن گئے۔ کچھ پر ایسے آثار نظر آئے جیسے اپنی زندگی میں کسی ہوش مند پاگل کو دیکھ رہے ہوں اور اس میں واقعی کوئی شک بھی نہیں کہ ایسی کسی عمارت کے خریدنے کی بات دیوانگی کے سوا اور کچھ بھی نہیں۔ بہرحال کچھ لوگوں کے اپنے مفادات بھی اس خرید سے وابستہ تھے۔ انہوں نے میری بڑی پذیرائی کی اور عمارت کو خریدنے میں میری کافی مدد کی۔ اس کے لئے انہیں مالی منافع بھی حاصل ہوا اور یہ خرید مکمل ہوگئی۔ اس کے علاوہ تم دیکھ چکے ہوگے کہ یہاں تک آتے ہوئے قرب و جوار میں کوئی آبادی نہیں۔ اس لئے اور بھی کوئی دقت نہیں ہوئی۔ ہاں

یہاں سے گزرنے والے، میں نے خاص طور پر غور کیا ہے کہ کبھی اس عمارت کے قریب سے ہوکر نہیں گزرتے۔ گویا لوگوں کے ذہنوں میں یہ بات موجود ہے کہ یہ عمارت آسیب زدہ ہے اور اس کے نزدیک سے گزرنا خطرناک"۔

"ٹھیک اس طرح کم از کم یہ بات مکمل ہوگئی کہ اس عمارت کی خرید میں لوگوں کی دلچسپی کیوں تھی۔ اس کے علاوہ مسٹر اسماعیل عباسی، کیا آپ نے اس عمارت کی تاریخ معلوم کرنے کی کوشش کی؟"

"جہاں تک اس کی تاریخ کے معلوم کرنے کا تعلق ہے، اس کے لئے تو اب ہم کام شروع کریں گے۔ اس کے بارے میں جہاں تک میری تحقیقات کا تعلق ہے، میں پورے اعتماد کے ساتھ کہتا ہوں کہ یہ سات، آٹھ سو سال پرانی ہے۔ اس کی طرز تعمیر، اس کا فرنیچر اور بہت سی ایسی چیزیں جو یہاں سے مجھے دستیاب ہوئی ہیں، وہ اس بات کی نشاندہی کرتی ہیں۔ حالانکہ عمارت کا تم جائزہ لے چکے ہو۔ اس کا زیادہ تر حصہ ٹوٹ پھوٹ چکا ہے اور یہ برسوں سے ویران پڑی ہوئی ہے، لیکن اب تم اس کی یہ موجودہ شکل بھی دیکھ رہے ہو۔ یہ الگ بات ہے کہ میں نے اسے صاف ستھرا کیا ہے، لیکن کسی قسم کی تعمیر نہیں کرائی۔ اور یہ بات میں اپنے تجربے سے پورے اعتماد کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ ابھی صدیوں یہ اسی عالم میں رہ سکتی ہے اور اس کا کوئی خطرہ نہیں کہ یہ عمارت گر جائے"۔

"گڈ، یہ ایک دلچسپ بات ہے"۔ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

چند لمحات کے لئے خاموشی طاری ہوگئی۔ ایسا لگتا تھا کہ ہر شخص ان الفاظ کے تاثر میں ڈوبا ہوا ہو۔ پھر میں نے سوال کیا۔

"عباسی صاحب، آپ تو یہاں کافی دن سے مقیم ہیں۔ آپ یہ بتائیے کہ آپ نے کبھی یہاں کوئی ایسی بات محسوس کی؟"

"ہاں...... میرے یہاں آنے کے تقریباً آٹھ دن بعد کا ذکر ہے، رات کے گیارہ یا بارہ بج رہے ہوں گے۔ ہر طرف دہشت ناک سناٹے کو چیرنے والی وہ آواز، یوں لگتا تھا جیسے کوئی ناؤتھ آرگن بجا رہا ہے۔ آہستہ آہستہ وہ آواز بلند ہونے لگی۔ پھر اچانک ہی ایک ہلکا سا دھماکہ ہوا اور اس آواز میں انسانی چیخیں شامل ہوگئیں...... کربناک، اذیت ناک جیسے کسی کو کوئی سخت اذیت دی جا رہی ہو۔ اصولی طور پر یہ ہونا چاہئے تھا کہ میں اٹھ کر ان آوازوں کی طرف دوڑتا

لیکن میں نے برداشت کیا۔ بہت دیر تک یہ آوازیں بلند ہوتی رہیں۔ اس وقت چاروں ملازم بھی میرے پاس نہیں تھے۔ جب یہ آوازیں بند ہوگئیں تو وہ دہشت سے لرزتے ہوئے میرے پاس آئے اور بولے کہ عمارت میں انسانی چیخوں کی آوازیں بلند ہو رہی ہیں۔ یوں لگ رہا تھا، جیسے کوئی کسی کو قتل کر رہا ہو۔ ان میں سے ایک ملازم نے کچھ اور بھی عجیب و غریب باتیں بتائیں"۔

"وہ کیا؟" میں نے سوال کیا۔

"اس نے کہا کہ یہاں سے فاصلے پر موجود آبادی فیض پور کے کچھ باشندوں نے بڑی عجیب و غریب باتیں انہیں بتائی ہیں"۔

"وہ کیا؟"

اس بار ناصر فرازی نے سوال کیا تو اسماعیل عباسی بولا۔

"یہ باتیں چونکہ مجھے عمارت کے خریدنے سے پہلے معلوم نہیں ہوئی تھیں، بلکہ بعد میں جب میں نے ان ملازموں کو جمع کیا تو بہت سی باتیں معلوم ہوئیں کہ تھوڑے عرصے پہلے کی بات ہے، ایک صاحب جن کا نام رحیم شاہ تھا، ادھر سے گزر رہے تھے، گاڑی کی بیٹری ڈاؤن ہوگئی۔ لاکھ دھکے لگائے گئے مگر گاڑی دوبارہ اسٹارٹ نہ ہوئی، چنانچہ وہ رات اس عمارت میں رک گئے، لیکن دوسری صبح ان کا ذہنی توازن درست نہیں تھا۔ رسیاں کندھے سے باندھ کر گاڑی گھسیٹنے کی کوشش کر رہے تھے۔ یہاں تک کہ ان کی موت واقع ہوگئی۔ ایک اور صاحب ایک دن یہاں آکر قیام پذیر ہوئے تھے کہ صبح کو ان کی بھی لاش یہاں سے ملی۔ ایسے کئی واقعات پیش آئے۔ میں نے ملازم کو ڈانٹا اور کہا کہ ایسی فضول باتیں کر کے دوسروں کو خوفزدہ کرنے کی کوشش نہ کرے۔

ملازم خاموش ہوگیا تھا لیکن میں یہ بات محسوس کر چکا تھا کہ باقی ملازموں کے چہرے خوف سے زرد پڑے ہوئے ہیں۔ بہرحال دن کی روشنی میں ایسی کوئی بات نہیں ہوئی۔ میں نے کافی دور دور کا جائزہ لیا تھا، لیکن کہیں ایسے نقوش نہیں پائے گئے جن سے یہ اندازہ ہوتا کہ رات کو کوئی گڑبڑ ہوئی ہے۔ البتہ دوسری رات جب ہم، میرا مطلب ہے، ملازم اور میں، اس وقت تک نذیر میرے پاس نہیں آیا تھا، بہت دیر تک آوازوں کا یا کسی اور بات کا انتظار کر کے اپنے بستروں میں پہنچ گئے تھے کہ اچانک دور دراز کے کمرے سے سسکیوں کی آوازیں بلند

ہوئیں اور پھر کوئی زور زور سے رونے لگا۔

پھر ایسے سیٹیاں بجیں جیسے کسی کو ہوشیار کیا جا رہا ہو۔ میں نے دن کی روشنی میں بندوبست کرلیا تھا اور یہ سوچ لیا تھا کہ اگر آج یہ آوازیں بلند ہوئیں تو میں ان کا جائزہ لینے کی کوشش کروں گا۔ ملازموں میں سے صرف ایک ملازم نے میرا ساتھ دیا، باقی تین کمرے میں گھسے رہے۔ میں نے ٹارچ اور رائفل لی اور آوازوں کا اندازہ لگاتا ہوا اس کمرے کی جانب بڑھا جو آوازوں کا مرکز تھا۔ ملازم سہا سمٹا سا میرے ساتھ چل رہا تھا۔ یہاں تک کہ میں اس کمرے کے قریب پہنچ گیا۔ کمرے کا دروازہ باہر سے بند تھا۔ اس میں تالا لگا ہوا تھا اور آوازیں اسی کمرے سے آرہی تھیں۔

میں نے اپنے ذہن کو سنبھالا...... اس میں کوئی شک نہیں کہ ان آوازوں کو سننے کے بعد خاص طور پر رات کی اس بھیانک تاریکی میں اپنے دل و دماغ پر قابو رکھنا ایک مشکل کام تھا، لیکن بہرحال زندگی میں بہت سے مرحلے پیش آچکے تھے، جن میں خاصی خوفناک حالت کا وقت گزارنا پڑا تھا، چنانچہ میں نے خود کو سنبھالا اور اطمینان سے تالا کھول کر کمرے میں داخل ہوگیا۔ طاقتور ٹارچ کی روشنی میں نے چاروں طرف پھینکی۔

اندر قدم رکھتے ہی اچانک آوازیں بھیانک شکل اختیار کر گئیں۔ مجھے یوں لگا جیسے تیز ہوائیں میرے بدن کو ٹٹول رہی ہوں۔ کتنی بار جسم میں سرسراہٹوں کا احساس ہوا تھا۔ آوازیں اتنی تیز ہوگئی تھیں کہ کانوں کے پردے پھٹنے لگے۔ میرا سر گھومنے لگا اور رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ اس دوران میرا وہ دلیر ملازم باہر نکل گیا تھا اور میں تنہا رہ گیا تھا۔ بہرحال اس کے بعد میں واپس اپنے کمرے میں آگیا۔ اب تو ملازموں کو کسی طرح بھی یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ خوفزدہ نہ ہوں۔

وہ ملازم جو میرے ساتھ کمرے میں گیا تھا، آپ یقین کریں کہ دوبارہ مجھے اس عمارت میں نظر نہیں آیا۔ باقی تینوں ملازم بھی اس کے بارے میں کچھ نہیں بتا سکے کہ وہ کہاں گیا۔ اس دن سے آج تک اس کا کہیں پتہ نہیں چل سکا ہے، لیکن رات کی تاریکی میں وہ آوازیں اب بھی اس کمرے سے آتی ہیں اور میں آج تک ان کا سراغ نہیں لگا سکا۔ اس کے بعد نذیر کو یہاں بلالیا۔ باقی ملازم بھی بھاگ گئے۔ شمشیر میرا پرانا ساتھی ہے۔ یہ کچھ مصروف تھا جس کی وجہ سے اس وقت میرے ساتھ نہیں آیا تھا، لیکن بعد میں یہ واپس آگیا اور اب میں، نذیر اور

شمشیر ایک ساتھ یہاں مقیم ہیں، لیکن نہایت بے چینی کے ساتھ میں تمہارا انتظار کر رہا تھا، کیونکہ پچھلے کچھ معاملات میں تم میرے ساتھ تھے اور تم نے بڑی دلچسپی کا ثبوت دیا تھا''۔

یہ الفاظ اس نے ناصر فرازی سے مخاطب ہوتے ہوئے کہے تھے۔ ناصر فرازی کے چہرے پر گہری سوچ کے آثار تھے، اس نے کہا:

''گویا اب بھی ان آوازوں کو سنا جا سکتا ہے؟''

''اندازہ تو یہی ہے کہ یہ روزانہ آدھی رات کے بعد سورج نکلنے تک سنائی دیتی ہیں، تھوڑا تھوڑا وقفہ ہوجاتا ہے۔ ان کے درمیان اور اس کے بعد پھر وہ شروع ہوجاتی ہیں''۔

''اندازہ کیا ہوتا ہے؟'' میں نے دلچسپی سے سوال کیا۔

''بس کبھی سیٹیاں بجتی ہیں۔ کبھی باجے کی آواز سنائی دیتی ہے، پھر کبھی چیخیں سنائی دیتی ہیں، ویسے ان چیخوں سے میں نے اندازہ لگایا ہے کہ یہ ایسے شخص کے حلق سے نکلتی ہیں جسے شدید اذیت دی جا رہی ہو''۔

''مسٹر عباسی آپ نے تہہ خانے سے یہ سامان نکالا ہے؟''

''ہاں''۔

''تہہ خانے میں کیا پوزیشن تھی، آپ نے اس کا جائزہ لیا؟''

''میں سمجھا نہیں''۔

''میرا مطلب ہے کہ اس کمرے کے نیچے بھی تہہ خانہ ہوگا''۔

عباسی کچھ دیر سوچتا رہا پھر بولا۔ ''ممکن ہے''۔

''آپ نے دیکھا نہیں''۔

''نہیں، خاص طور پر نہیں دیکھا''۔

''دن کی روشنی میں کبھی آپ نے کمرے میں جا کر دیکھا؟''

''ہاں...... ایسا میں نے ضرور کیا لیکن کوئی قابلِ ذکر بات نظر نہیں آئی، یہاں تک کہ کوئی نشان تک نہ ملا''۔

''اگر آپ یہ سوچ رہے ہیں، مسٹر جمیل کہ وہاں کوئی ایسے مائیکروفون یا ایسی کوئی چیز رکھ دی گئی ہو، یا دیواروں میں نصب کر دی گئی ہو جس سے یہ آوازیں سنائی جاتی ہوں اور اس کا پس منظر یہ ہو کہ کوئی شخص ہمیں اس عمارت سے دور کرنا چاہتا ہو تو میں یہ بھی کوشش کر چکا ہوں،

لیکن کوئی سراغ نہیں ملا"۔ اسماعیل عباسی یہ باتیں کرتے ہوئے خاموش ہوگیا۔

"عمارت کے مشرقی حصے سے ہوا کی لہروں پر تیرتی ہوئی ایک مدھم سی آواز میں نے بھی سنی تھی"۔ نذیر عباسی نے آہستہ سے کہا۔

"حیرت ناک، دیکھو کیا تم ماؤتھ آرگن کی سُر سن رہے ہو۔ میں نے خود یہ آوازیں سنی تھیں۔ عباسی کے کہنے کی ضرورت نہیں تھی، مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے باقاعدہ ایک نغمہ بجایا جا رہا ہو، جس کمرے میں ہم لوگ بیٹھے ہوئے تھے اس کے دروازے اور کھڑکیاں بند تھیں۔ دیر تک یہ آوازیں بڑھتی رہیں۔ اچانک میں اپنی جگہ سے اٹھا اور وہ تمام کھڑکیاں کھول دیں۔ آوازیں تیز ہوگئیں۔ ایک آواز لمبی چیختی ہوئی انجن کی سیٹی کی مانند سنائی دے رہی تھی۔ ہم لوگ کمرے کے اندر تھے لیکن باہر پھیلی تاریکی اور بھیانک ماحول میں یہ آوازیں درحقیقت اعصاب شکن ہوگئیں۔

اور کوئی بھی اجنبی شخص ان سے متاثر ہوسکتا تھا۔ اگر خود اسماعیل صاحب اور اس کا ملازم شمشیر اور بھائی نذیر ان آوازوں کے عادی نہ ہوتے تو ان کی حالت بھی خراب ہوجاتی، لیکن میں ناصر فرازی کے چہرے پر ایک پیلاہٹ سی دیکھ رہا تھا اور مجھے لگ رہا تھا جیسے اس کا بدن ہولے ہولے کانپ رہا ہو۔ خود میں بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔

اور مجھے بار بار اپنے لباس کے نیچے ایک سرسراہٹ سی محسوس ہو رہی تھی، جیسے کوئی نادیدہ ہاتھ میرے بدن کو ٹٹول رہے ہوں۔ یہ آواز میں بغور سن رہا تھا۔ پتہ نہیں کسی انسان کی تھیں یا نہیں۔ کبھی کبھی تو یہ محسوس ہوتا جیسے یہ کوئی مشینی آواز ہو۔ یہ کبھی تیز ہوجاتیں اور کبھی مدھم لیکن اس میں درد، کرب اور تکلیف کی شدت کا جو احساس تھا، اس کی مثال نہیں ملتی تھی۔

کچھ لمحے میں مختلف کھڑکیوں کے پاس کھڑا کان لگا کر ان آوازوں کی سمت کا اندازہ لگاتا رہا۔ غالباً میں ہی ان کے درمیان ایک ایسا شخص تھا جو آوازوں کے سراغ کے سلسلے میں متحرک تھا، ورنہ باقی سب لوگ تو سرد اور خاموش بیٹھے ہوئے تھے۔ پھر میں نے ساری کھڑکیاں بند کردیں اور نشست پر آکر بیٹھ گیا۔ یہاں موجود لوگوں کے چہروں سے میں یہ اندازہ لگا رہا تھا کہ یہ سب خوفزدہ ہیں۔ تعجب کی بات تھی، خاص طور پر اسماعیل اور نذیر وغیرہ کے سلسلے میں کہ اگر وہ ان آوازوں سے خوف محسوس کرتے تھے تو پھر یہاں قیام کیوں کیا ہوا تھا انہوں نے؟ میں نے یہی سوال عباسی سے کر ڈالا۔

"معافی چاہتا ہوں اسماعیل صاحب بڑا ذاتی سا سوال ہے، لیکن چونکہ ہم سب یہاں موجود ہیں اور ہمیں اس سلسلے میں گفتگو بھی کرنی چاہئے۔ آپ ایک بات بتایئے آپ ان آوازوں سے خوفزدہ ہیں؟"

اسماعیل عباسی نے عجیب سی نگاہوں سے مجھے دیکھا پھر بولا۔

"میں سمجھ رہا ہوں کہ اس وقت صرف آپ ہیں جو اس قدر متاثر نظر نہیں آتے۔ یقیناً اس کی کوئی وجہ ہوگی۔ ہوسکتا ہے کہ ناصر فرازی نے آپ کا انتخاب کسی خاص مقصد کے تحت کیا ہو اور مجھے اس بارے میں تفصیلات نہ بتائی ہوں۔ آپ واقعی دلیر انسان ہیں، جہاں تک آپ کے سوال کا تعلق ہے تو میں بس یہی کہہ سکتا ہوں کہ میں نے یہ عمارت خریدی ہے اور جیسا کہ میں نے آپ کو بتایا، میں یہاں پر ایک میوزیم بنانا چاہتا ہوں جس کے بارے میں لوگ سوچیں اور کہیں کہ دیکھو اسماعیل عباسی نے ایک ایسا کام کیا جو عام لوگوں سے منفرد ہے۔ چنانچہ میں یہ سوچ رہا ہوں کہ اگر کوئی راستہ روکنا چاہتا ہے تو روشنی میں آجائے اور مجھے پتہ چل جائے کہ وہ کون ہوسکتا ہے"۔

"کیا آپ کو اس سلسلے میں کسی پر شبہ ہے، میرا مطلب ہے کوئی ایسی شخصیت جو آپ کا راستہ روکنا چاہتی ہو؟"

"میرے سوال پر اسماعیل عباسی کسی سوچ میں ڈوب گیا اور میں چونک پڑا۔ سوچ میں ڈوبنے کا مقصد یہ ہے کہ کوئی ایسی شخصیت ضرور ہے جس کے بارے میں اس کے ذہن میں اس دوران یہ شبہ ہو رہا ہے۔ میری دلچسپیاں اس سلسلے میں بڑھ گئی تھیں۔ میں خاموشی سے اسماعیل کی صورت دیکھتا رہا۔ میں نے محسوس کرلیا تھا کہ ناصر فرازی بھی تجسس بھری نگاہوں سے عباسی کا چہرہ دیکھ رہا ہے۔ کچھ لمحے خاموش رہنے کے بعد عباسی نے کہا۔

"حالانکہ اس وقت جو صورتِ حال ہے اس میں مجھے یہ الفاظ کہنا یوں عجیب سا لگتا ہے کہ میرا بھائی نذیر بھی یہاں موجود ہے، لیکن معاملہ چونکہ ذرا بالکل ہی مختلف ہے اور اس وقت کی صورتِ حال صرف مذاق نہیں"۔ تمام لوگ ان جملوں پر متوجہ ہوگئے تھے۔

اسماعیل عباسی نے کہا، "اصل میں زندگی کے رات دن اس طرح گزرے کہ ہمیں بہت سے معاملات میں مناسب فیصلہ کرنے کا موقع نہ مل سکا۔ میں نے اور میرے بھائی نے جس طرح زندگی گزاری ہے وہ عام راستوں سے ہٹ کر ہے۔ خاص طور پر نذیر جس نے یہیں رہ

کر بڑی ترقی کی ہے اور اس خیال میں رہ گیا تھا کہ مستقبل کا آغاز تو کسی بھی وقت ہوسکتا ہے۔ یعنی بیوی اور بچے وغیرہ۔ اصل میں مستقبل بنانے کے لئے صحیح وقت پر عمل کرنا ضروری ہے۔ کیونکہ گزرنے والا وقت ضائع ہوتا ہے۔ مستقبل سے مستقبل تعمیر نہیں کیا جاسکتا، بلکہ حال سے مستقبل تعمیر کیا جاتا ہے۔

شاید تمہید طویل ہوگئی۔ کہنا یہ چاہتا تھا، نہ میں نے شادی کی نہ میرے بھائی نے۔ لیکن اس کا مقصد یہ نہیں کہ میں نے زندگی کی لطافتوں سے منہ موڑ رکھا ہے۔

یہاں آنے کے بعد فیض پور میں ایک معزز اور پُراسرار شخصیت سے ملاقات ہوئی۔ اصل میں ذکیہ بیگم مجھے سویڈن میں ملی تھیں۔ کاروباری ذہن کی مالک ہیں اور حیران کن بات یہ ہے کہ میری طرح ہی ان کی زندگی بھی اپنی تعمیر میں گزر گئی۔ ان کی کہانی مختصر یہ ہے کہ ان کے والدین دو چھوٹی بہنوں کا بوجھ ان کے شانوں پر چھوڑ کر دنیا سے چلے گئے اور انہیں اپنی بہنوں کو ایک مناسب زندگی دینے کے لئے مردوں کی طرح کام کرنا پڑا اور یہ حقیقت تو آپ بھی اچھی طرح جانتے ہیں کہ جب عورت اپنے جذبوں میں سفر کرتی ہے تو پھر وہ بہت آگے ہوتی ہے۔

خاتون ذکیہ بیگم بھی ایسی ہی آگے کی شخصیت ہے۔ میری اس سے سویڈن میں ملاقات ہوئی تو ہم دونوں کے درمیان گہری دوستی ہوگئی۔ میں اس سے دوستی کو محبت کا نام تو نہیں دے سکتا، چونکہ ہم دونوں کی پختہ عمر تھی۔ البتہ آپ لوگ یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ پختہ عمر کی دوستی تھی، جو زیادہ پائیدار تھی۔ اگر آپ لوگ خاتون ذکیہ کو دیکھیں تو وہ آپ کو بے انتہا پسند آئیں گی۔ حسین صورت کے ساتھ ساتھ حسین سیرت اور ذہانت کی مالک بھی ہیں۔ ان کا خاندان انتہائی اعلیٰ ہے۔ زمانہ قدیم میں ان کی اپنی ایک کہانی ہے۔ وہ یہ کہ خاندان کے کسی بزرگ نے برائیوں کو اپنا کر جائیداد وغیرہ کھودی تھی اور اس کے بعد یہ خاندان پس منظر میں چلا گیا''۔

یہاں تک کہ خاتون ذکیہ نے ایک بار پھر سے اس کے نام کو روشن کیا۔ آپ لوگوں کو حیرت ہوگی کہ یہ عمارت جس میں اس وقت ہم موجود ہیں، ذکیہ بیگم کی آباد کی ہوئی عمارت ہے۔ انہوں نے مجھے اس بارے میں تفصیلات بتائی تھیں اور یہ بھی بتایا تھا کہ اس وقت اس کی نوعیت کیا تھی۔ آپ سمجھ لیجئے کہ اس خاندان کے بڑے افراد نے اس عمارت کو دور دراز تعمیر کر کے اپنے لئے ایک عیش گاہ بنائی تھی۔ یہاں کے بارے میں کہانیاں مشہور ہیں۔

بہرحال وہ سویڈن سے واپس چلی آئیں۔ میں نے ان سے وعدہ کیا کہ وطن واپس آنے کے بعد سب سے پہلے انہی سے ملاقات کروں گا اور میں نے ایسا ہی کیا۔ ان کا تعلق اب بھی فیض پور سے ہے۔ ایک اچھا کاروبار کرتی ہیں اور ہم دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں، لیکن یہ بات بھی آپ لوگ ذہن نشین کر لیجئے کہ ہماری اس پسند کو بھی بہت سی نگاہیں حسد کے انداز میں دیکھتی ہیں، چونکہ اور بھی چند افراد ہیں جو ذکیہ بیگم پر ڈورے ڈالنے کی کوشش کر رہے ہیں اور ان کا مقصد ایک ایسی عورت کی قربت حاصل کرنا تھا جو مالی طور پر انتہائی مطمئن ہے۔ یہاں تک کہ میں نے اور ذکیہ نے اپنی شادی کا اعلان بھی کر دیا ہے، بہت ساری باتیں ایسی ہوتی ہیں جو وقت سے پہلے بتانا مناسب نہیں ہوتیں۔ میں نے شاید کچھ الفاظ کو چھپانے کی کوشش کی ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ میں یہ مکان ذکیہ بیگم کو تحفہ میں دینا چاہتا ہوں، کیونکہ ان کے مطابق یہ ان کا خاندانی مکان ہے۔ اب میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ کس کو میرے اس خیال سے اختلاف ہے اور کون یہ نہیں چاہتا کہ میں یہ مکان اس طرح اپنی تحویل میں رکھوں یا اسے ذکیہ بیگم کو دینے کی کوشش کروں۔ حالانکہ یہ ایک بے مقصد سی بات ہے، لیکن ہر صورت میرے ذہن میں بارہا آیا ہے کہ ہوسکتا ہے میرے رقیبوں نے مجھے خوفزدہ کرنے کی کوشش کی ہو۔ اس بات کے تو سو فیصد امکانات ہیں...... میں آپ کو کچھ اور بھی باتیں بتانا چاہتا ہوں۔ ہوسکتا ہے کہ آپ لوگ اس سلسلے میں میری بہتر مدد کر سکیں''۔

''ضرور''۔

''ایک روز شام کے وقت جبکہ میں فیض پور میں ذکیہ بیگم کے گھر کھانے پر مدعو تھا، کچھ اور لوگ بھی وہاں آئے ہوئے تھے اور میں اس مکان کی خریداری کی بات کر رہا تھا تو دوران گفتگو کسی صاحب نے کہا کہ آخر میں اس مکان کا کیا کروں گا؟ ازراہ مذاق میں نے کہا۔

''آپ لوگوں کو اس بات کا علم تو ہے کہ میں اور ذکیہ بیگم منفرد مزاج کے مالک ہیں۔ ہم اپنا ایک الگ مقام رکھتے ہیں۔ میں نے بھی فیصلہ کیا ہے کہ شادی کی پہلی رات ہم اس مکان میں گزاریں گے۔ باقی لوگوں پر جو کچھ بھی ردعمل ہوا، وہ تو ایک الگ بات ہے ذکیہ بیگم نے کہا، عباسی کیا تمہیں یہ بات معلوم نہیں کہ یہ عمارت آسیب زدہ ہے۔ یہ تو بہت اچھی بات ہے ، ذکیہ بیگم کہ ہماری زندگی کی پہلی رات ایک آسیبی ماحول میں گزرے گی۔ ہر ماحول کا اپنا ایک مزاج ہوتا ہے اور اس سے لطف اندوز ہونا خوش ذوقی کی علامت ہے۔

وہاں بیٹھے ہوئے چند افراد ہنس پڑے تو میں نے کسی قدر درشت لہجے میں سوال کیا۔

''آپ لوگ بڑی فراخ دلی سے ہنس رہے ہیں۔ کیا اس ہنسی کی وجہ بتانا پسند کریں گے؟''

''جب آسیب ہیبت ناک آوازیں نکال رہے ہوں اور ماحول پر دہشت سوار ہو تو ہم خیال ہے کہ آپ جیسا بے جگر انسان ہی رومانس کی باتیں کرسکتا ہے''۔

''کاش! میں آپ کو اپنی اس بے جگری کا نظارہ کرنے کے لئے مدعو کرسکتا''۔ میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

''دیکھئے میرا ہمدردانہ مشورہ ہے کہ آپ یہ منحوس عمارت نہ خریدیں۔ شاید آپ کو اس ماضی نہیں معلوم بہت سے لوگ......''

''معلوم ہے، معلوم ہے۔ آپ یہی کہنا چاہتے ہیں کہ یہ جو عمارت میں نے خریدی ہے جس نے بھی اس سے تعلق قائم کیا وہ یا تو پاگل ہوگیا، یا موت کے گھاٹ اتر گیا۔ فیض پور کی آبادی میں یہ عمارت بدروحوں کا مسکن مشہور ہے''۔

''جی ایسی ہی بات ہے۔ وہی تو میں عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اعلیٰ درجے کے ہوٹلوں اور پُرفضا مقامات پر تو لوگ ہنی مون منایا ہی کرتے ہیں، آسیبوں کی ڈراؤنی اور دہشت ناک فضا میں ہنی مون منانا ایک دلچسپ عمل ہوگا اور آپ لوگ اس کی فکر نہ کریں۔ ساری زندگی میں نے بدروحوں کا مقابلہ کرتے ہوئے گزاری ہے۔ آپ لوگ ہمارا بھی جائزہ لے لیجئے''۔

''ٹھیک ہے آپ بیشک ایسا ہی کریں، لیکن ایک بات آپ ذہن نشین کرلیں کہ اس عمارت میں آپ کا قیام طویل نہیں ہوسکتا اور اگر آپ نے اس میں قیام رکھنے کی ضد کی تو آپ یہ سمجھ لیجئے کہ بدترین نقصان سے دوچار ہوں گے۔ آپ کوئی شرط باندھنا چاہیں تو باندھ لیجئے''۔

یہ شخص جس نے مجھ سے بات کی تھی، اس کا نام تصور شاہ تھا۔ یہ بھی ہڈیوں کی صنعت کا بہت بڑا کاروباری ہے اور خاصا دولت مند...... بہرحال میں نے تصور شاہ سے یہ شرط کرلی۔ بات صرف مذاق میں ہوئی تھی، لیکن جب تمام لوگ چلے گئے تو ذکیہ بیگم نے کہا۔

''یہ تم نے کیا کر ڈالا ہے؟ تم بھی بڑے جذباتی آدمی ہو۔ جب دوسروں سے کسی ضد کی بات پر گفتگو کررہے ہوتے ہو میری طرف نگاہ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے۔ میں تمہیں ٹوکنا چاہتی تھی، روکنا چاہتی تھی لیکن اب کیا کروں تم نے شرط لگا کر حماقت کی ہے''۔

''آخر کیوں ذکیہ؟''

''اس لئے کہ یہ عمارت واقعی آسیب زدہ ہے۔ میں تمہیں بتا چکی ہوں کہ یہ میری خاندانی عمارت ہے اور اب اللہ کے فضل سے میں اس قابل تھی کہ خود بھی اسے خرید سکوں، لیکن میں نے ایسا نہیں کیا۔ البتہ اپنی خاندانی عمارت ہونے کی وجہ سے میں نے اس کے بارے میں لاتعداد بار معلومات حاصل کی ہیں۔ تم نہیں جانتے کہ اس کا ایک کمرہ تو بہت ہی خطرناک ہے۔ صرف ایک کمرہ خاص طور سے''۔

''اس میں کیا بات ہے؟''

''سنا ہے اس کمرے میں آوازیں آتی ہیں...... انتہائی خوفناک آوازیں''۔

''کیا تم نے یہ آوازیں اپنے کانوں سے سنی ہیں ذکیہ؟''

''یہ آوازیں باہر سے نہیں سنی جاسکتیں۔ میں نے کبھی یہ آوازیں نہیں سنیں، اس لئے کہ میں اس عمارت میں کبھی اندر داخل نہیں ہوئی۔ اگر کوئی عمارت سے باہر ہو تو یہ آوازیں نہیں سن سکتا۔ ہاں اگر کوئی اندر داخل ہوجائے تو وہ آوازیں سن سکتا ہے''۔

''اس کا مطلب ہے کہ تصور شاہ صرف مجھے دھوکہ نہیں دے رہا تھا۔ یعنی اب جب میں یہاں آنے کے بعد ان آوازوں کو سنتا ہوں اور یہ سوچتا ہوں کہ ہوسکتا ہے مجھ سے شرط لگانے والے نے ان آوازوں کا انتظام کیا ہو، تاکہ میں دہشت زدہ ہوکر یہ عمارت چھوڑ دوں اور وہ شرط جیت جائے، لیکن جو معلومات مجھے بعد میں حاصل ہوئیں ان سے یہ پتا چلا کہ آوازیں بہت عرصے سے سنی جاتی ہیں اور یہ نئے سرے سے وجود میں نہیں آئیں۔ بہرحال یہ کہانی ہے، اب بتاؤ میں کیا کروں؟''

''آپ یقینی طور پر ذکیہ بیگم سے شادی کرکے ہنی مون کے لئے یہاں آنا چاہتے ہیں؟'' میں نے سوال کیا۔

''سو فیصد...... اور بہرحال یہ میری عزت، میرے وقار کا معاملہ ہے۔ ظاہر ہے اس سلسلے میں نہ تو پولیس سے مدد لے سکتا ہوں، نہ ہی کچھ ایسے لوگوں سے لیکن ناصر تم سے میں یہ کہہ کر مدد کی خواہش کا اظہار کرتا ہوں، کیونکہ بہرحال تم ایک ذہین آدمی ہو اور میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ مسز جمیل بھی اپنے اندر کچھ ایسی پُراسرار خصوصیات رکھتے ہیں جو میں نے عام لوگوں میں نہیں دیکھیں۔ میرا اندازہ ہے کہ میری یہ ٹیم ان پُراسرار واقعات کا سراغ ضرور لگائے گی۔ دیکھو وہ آوازیں شروع ہوگئی ہیں اور اب یہ جاری رہیں گی۔ شاید ساری رات یا شاید......''

"تو پھر کیا خیال ہے کیوں نہ ہم......"

لیکن یہ جملہ ادھورا رہ گیا۔ ناصر فرازی نے کہا۔

"آج رات نہیں......آج کی رات اور کل کا دن اور گزار لیا جائے۔ اس کے بعد ہم طور پر ان واقعات کا سراغ لگانے کی کوشش کریں گے"۔

جواب میں اسماعیل عباسی نے گردن ہلائی اور بولا۔

"بالکل ٹھیک ہے......میں خود بھی یہی چاہتا ہوں......واقعات تم دونوں کے علم میں آگئے ہیں۔ میں کسی قیمت پر یہ نہیں چاہوں گا کہ تم صرف میری خواہش پر اپنے آپ مصیبت میں مبتلا کرو بلکہ پورے اطمینان کے ساتھ تمہیں ان حالات کا تجزیہ کرنا ہے اور کے بعد عمل کرنا ہے۔ جلد بازی میں کسی کو کوئی نقصان پہنچ جائے، یہ بات مجھے بالکل پسند نہ ہوگی۔ چنانچہ یہ بات دن میں طے ہوگئی کہ ہم سب لوگ آرام کریں گے۔ اسماعیل عباسی پوچھا۔

"جیسا کہ اس عمارت کے بارے میں آپ کو اندازہ ہو چکا ہے کہ اس میں ب کمرے ہیں اور بہت سے کمروں میں فرنیچر بھی سجا ہوا ہے۔ آپ لوگ آرام سے جس کمر اپنے لئے منتخب کرنا چاہیں اپنے لئے منتخب کرلیں۔ دونوں کو الگ الگ کمرہ چاہئے تو الگ ا کمرہ لے لیں"۔

"آپ لوگ کہاں سوتے ہیں؟" ناصر فرازی نے پوچھا۔

"بھئی......جھوٹ بولنے کی کوشش نہیں کریں گے۔ ہم نے ہمت کرکے یہ سب کچ لیا ہے لیکن اب اتنے دلیر نہیں ہیں ہم کہ ان پُراسرار واقعات کی حقیقت کو جانے بغیر بہادری دکھانے کی کوشش کریں۔ ہاں ہم نے ایسے تمام انتظامات ضرور کرلئے ہیں کہ اگر انسانی ذریعے سے ہمیں نقصان پہنچانے کی کوشش کرے تو اس سے نمٹ لیں، بلکہ آپ چونکہ اب ہمارے مہمان ہیں۔ ہم یہ بالکل نہیں چاہیں گے کہ آپ کسی طرح کے حالات تقاضوں سے محروم رہیں، چنانچہ یہ چند چیزیں آپ بھی رکھ لیں"۔

یہ کہہ کر اسماعیل عباسی نے اپنے بھائی کو اشارہ کیا۔ نذیر عباسی نے دو ریوالور، دو اور فالتو کارتوس کا پیکٹ ناصر فرازی کے حوالے کردیا۔ واقعی یہ بڑی ضروری چیزیں تھیں ہمارے پاس موجود نہیں تھیں۔ اسماعیل عباسی کے مؤقف سے یہ بھی پتہ چلتا تھا کہ یہ

افراد ملازم اور آقا کا فرق مٹا کر ایک ہی میز پر کھاتے تھے اور ایک ہی کمرے میں سوتے تھے۔ بعد میں انہوں نے اپنی خواب گاہ دکھائی اور اس کے بعد وہ کمرہ جس میں ہمیں قیام کرنا تھا۔ یہ کمرہ اسی کمرے کے قریب تھا اور اس میں شاندار پرانے طرز کا فرنیچر لگا ہوا تھا۔ وہ فرنیچر جو اسی طلسمی داستان کا حصہ تھا۔ اب ہمارے پاس اس موضوع پر گفتگو کرنے کے لئے خاصا مواد تھا۔ جب اسماعیل عباسی وغیرہ سونے کے لئے اپنے کمرے میں چلے گئے اور ہم نے ان کا دروازہ بند ہونے کی آواز سنی تو ہم لوگوں نے اپنا دروازہ بھی بند کرلیا، حالانکہ ناصر فرازی کے فرشتے بھی نہیں جانتے تھے کہ میں کون ہوں، کیا ہوں اور یہ کہ میں جمیل نہیں ہوں، لیکن اس کے باوجود اس نے اپنے آپ سے زیادہ مجھ پر بھروسہ کیا تھا، حالانکہ اس بڑے وسیع کمرے میں دو بیڈ موجود تھے، لیکن ناصر فرازی نے مجھ سے کہا۔

"دیکھو جمیل، بے شک دلیری دیکھنے کے کسی موقع کو ہاتھ سے نہیں جانے دینا چاہئے، لیکن سب سے دلیر آدمی وہ ہے جو اپنی حفاظت کرسکے، چنانچہ کیوں نہ ہم ایک ہی بستر پر......"

ناصر فرازی نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا تو میں نے ہنس کر کہا۔

"ہاں......کیوں نہیں......ایک ہی بستر پر سو جاتے ہیں، باتیں بھی کریں گے کیا تمہیں نیند آرہی ہے؟"

"یار، اصل میں کچھ باتیں قابلِ غور ہیں۔ میں یہ تو نہیں کہتا کہ اسماعیل عباسی نے ان پر غور نہیں کیا ہوگا۔ ذہین آدمی ہے گھاٹ گھاٹ کا پانی پیئے ہوئے ہے۔ معمولی معمولی باتوں پر غور نہ کرے تو مجھے حیرت ہوگی۔ میں ان آوازوں پر غور کر رہا ہوں تو کہنا میں یہ چاہتا ہوں کہ ان بھیانک آوازوں کی موجودگی میں جو دروازے اور کھڑکیاں بند ہوجانے کے باوجود مدھم مدھم آرہی ہیں۔ آسانی سے نیند آنے کا بھلا کیا سوال ہے، لیکن میں جو غور کر رہا ہوں، وہ ایک اور بات ہے، کیا تم اس کے بارے میں سوچ سکتے ہو؟"

"کیا؟" میں نے سوال کیا۔

"میں یہ اندازہ لگانے کی کوشش کر رہا ہوں کہ ان آوازوں کا ایک ہی انداز ہے، یعنی ماؤتھ آرگن کے سُر یا چیخیں، کیا چیخنے والوں کی آوازیں ایک ہی سُر میں آتی رہتی ہیں تو ہم ایسے کی زیرِ زمین ٹیپ ریکارڈ پر یا کسی اور آواز نشر کرنے والی مشین کے بارے میں سوچ سکتے ہیں اور اگر ان کا انداز ہر لمحے بدلا ہوا ہوتا ہے تو اس کا مطلب ہے کہ وہ کوئی مشین نہیں بلکہ یہ

آوازیں حقیقی ہیں"۔

"نہیں، فیصلہ کن لہجے میں یہ بات نہیں کہوں گا...... ہر بات میں گنجائش رکھنی چاہئے۔

"ایک اور سوال جو اس سے بھی زیادہ اہمیت کا حامل ہے، ناصر فرازی، وہ میں تم سے کرنا چاہتا ہوں"۔

"ہاں...... ہاں بولو"۔

"نہ تو تم نے پہلے کبھی مجھے اسماعیل عباسی نامی شخص کے بارے میں کچھ بتایا اور نہ ہی مجھ پر اب تک یہ بات واضح ہوسکی ہے کہ تم اسماعیل عباسی کے لئے یہ سب کچھ کیوں چاہتے ہو؟"

میرے سوال پر ناصر فرازی کچھ دیر خاموش ہوگیا۔ پھر کسی قدر شرمندہ لہجے میں بولا۔

"مجھے یقین تھا کہ تم یہ سوال ضرور کرو گے"۔

"نہیں ایسی کوئی بات نہیں...... اگر تم مجھے اس بارے میں نہ بتانا چاہو تو میں تمہیں مجبور نہیں کروں گا"۔

"یار...... حقیقت بتاؤں تمہیں...... کبھی کبھی شیخی خوری ایسی طبیعت درست کرتی ہے کہ لطف آجاتا ہے۔ اصل میں میری ملاقات اسماعیل عباسی سے ملک سے باہر ہوئی تھی۔ میں تفصیل میں نہیں جاؤں گا کیونکہ بہرحال یہ ایک راز ہے، لیکن یوں سمجھ لو اسماعیل عباسی وہاں بھی ایک آسیبی چکر میں ہی مجھ سے ملا تھا اور میں اپنے ایک ایسے غیر ملکی دوست کو بے وقوف بنا رہا تھا جس کا خیال تھا کہ وہ آسیبوں کے جال میں پھنسا ہوا ہے۔ کہانی بڑی دلچسپ اور لمبی ہے، اگر تم سننا چاہو تو سن سکتے ہو، مجھے اعتراض نہیں"۔

"اگر تمہیں نیند نہیں آرہی اور گفتگو کرنا چاہتے ہو تو بے شک وہ کہانی بھی مجھے سنادو"۔

"بڑی دلچسپ ہے...... ایک چائے بنانے والی فرم میں میرا دوست جیکی ایک انجینئر تھا۔ میں بھی وہاں کسی کام سے پہنچا تھا اور ایک ہوٹل میں قیام پذیر تھا...... اسماعیل عباسی بھی جیکی کا دوست تھا۔ جیکی نے اپنی ایک مشکل بتائی اور وہ مشکل ایک مکان تھی جو اس کمپنی نے اسے رہائش کے لئے دیا تھا۔ ایک خالی مکان جو اتنا خوبصورت تھا کہ بتا نہیں سکتا۔

وہاں کا ماحول، خوبصورت درخت، پُر فضا مناظر لیکن یہ مکان آسیب زدہ تھا اور جیکی نے نشے کے عالم میں یہ بات سننے کے باوجود کہ مکان آسیب زدہ ہے، اسے لینے کی ہامی بھرلی چنانچہ کمپنی نے اسے ڈیکوریٹ کرکے جیکی کے حوالے کردیا اور جب ہوش و حواس کے عالم میں

جیکی کی پہلی رات وہاں گزری تو اس کے حواس بگڑ گئے۔ مکان کے آسیب رات بھر مکان کی اوپری منزل میں ہنگامے کرتے رہے تھے۔ اسے ڈراتے رہے تھے۔

اور جیکی کی ساری رات تباہ ہوگئی تھی اور اس کے بعد اس کی نیندیں حرام ہوگئیں۔ گھر کی بیشتر اشیاء غائب ہوجاتی تھیں۔ کچن میں افراتفری پھیل جاتی تھی اور ہر طرح کے نقصانات ہوتے رہتے تھے۔ قیمتی چیزیں غائب ہوجاتیں۔ جیکی سخت پریشان تھا اور اسی پریشانی کے عالم میں اسماعیل عباسی سے اس کی ملاقات ہوئی تھی اور میری اسماعیل عباسی سے۔ میں نے یونہی مذاق ہی مذاق میں دعویٰ کردیا کہ میری زندگی پُراسرار واقعات سے بھری پڑی ہے اور میں جن بھوت اور آسیب آسانی سے بھگا دیتا ہوں۔ بس جیکی کا معاملہ میرے سر آپڑا اور پہلی رات میں نے جیکی کی اس رہائش گاہ میں گزاری۔

رات کو گیارہ بجے کے قریب چھت پر قدموں کی چاپ سنائی دی۔ میں، جیکی اور اسماعیل عباسی جاگ رہے تھے۔ پھر آوازیں تیز سے تیز تر ہوتی چلی گئیں۔ ان دونوں کے حواس خراب تھے۔ توڑ پھوڑ، بھاگ دوڑ، لڑائی جھگڑا...... میں بھی ان آوازوں سے خوفزدہ تھا اور بہت ہی غور کررہا تھا ان پر۔ پھر یہ تجویز میں نے ہی پیش کی تھی کہ اُوپر چل کر دیکھا جائے، لیکن دونوں میں سے کسی کی ہمت نہیں تھی۔

تنہا میں بھی ہمت نہیں کرسکتا تھا، لیکن میں نے ان لوگوں سے یہ کہہ دیا کہ میں بہرحال ان بھوتوں کو بھگادوں گا۔ یہ میری ذمہ داری ہے۔ جیکی پورے خلوص کے ساتھ مجھے گھر میں چھوڑ کر چلا گیا۔ اسماعیل عباسی بھی چلا گیا تھا اور اس کے بعد میں وہاں تنہا رہ گیا۔ حالت تو میری بھی خراب تھی، لیکن نہ جانے کیوں میرے ذہن میں ایک عجیب سا احساس پرورش پا رہا تھا۔ وہ یہ کہ جس طرح بھی بن پڑا، میں بہرحال اس راز کو معلوم کرلوں گا کہ یہ بھوت کیسے ہیں اور کیا چاہتے ہیں۔ دن کی روشنی میں اپنے آپ کو پوری طرح مسلح کرکے میں نے چھت کی طرف جانے والے زینوں کا رخ کیا اور تھوڑی دیر کے بعد چھت پر پہنچ گیا۔

چھت پر جابجا مختلف چیزیں پڑی ہوئی تھیں۔ روٹیوں کے ٹکڑے، کپڑے اور ایسی ہی دوسری چیزیں، حالانکہ مکان بہت خوبصورت تھا، لیکن اوپر کا منظر انتہائی بھیانک تھا۔ مجھے یقین ہوگیا کہ یہاں پُراسرار آسیب اپنا گھر بنائے ہوئے ہیں۔ سامنے والی سمت ایک کمرہ تھا جو لکڑی کا بنا ہوا تھا اور اس کے کچھ روشن دان نظر آرہے تھے۔ اس کا دروازہ باہر سے بند تھا۔ نہ جانے

کیوں میرے دل کو یقین ہوگیا کہ جو کچھ بھی ہے اس کمرے میں ہی ہے۔

دوسری رات پھر ویسی ہی ہنگامہ خیز تھی۔ جیکی اور اسماعیل عباسی تو آج بھی ہر کر سکے تھے، لیکن میں نہ جانے کیوں جان کی بازی لگانے پر تل گیا۔ اوپر پہنچا تو اس آ زدہ کمرے میں روشن دانوں سے روشنی جھلک رہی تھی اور آسیب اندر خوب دھماچوکڑی م تھا۔ میں اس سے زیادہ ہمت نہ کر سکا اور واپس آ گیا۔ جیکی اور اسماعیل عباسی تو مایوس ہ لیکن میں دوسرے دن کچھ نہ کچھ کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ جب وہ لوگ چلے گئے تو میں جان کی بازی لگا کر اس آسیب زدہ کمرے کو دیکھنے کا فیصلہ کر لیا۔ سیڑھیاں چڑھ کر اوپر پ اس وقت وہاں مکمل خاموشی تھی۔

میں اُوپر کے کمرے کے پاس پہنچا، دروازے کو آزمایا۔ وہ لاک نہیں تھا۔ بس اس کا ذرا زنگ خوردہ تھا۔ میں نے ہمت کر کے لاک پر ہاتھ رکھا اور پوری قوت سے دروازہ کھ دیا۔ اندر سے کچھ عجیب سی آوازیں ابھریں، جنہوں نے کچھ لمحے کے لئے تو میرے دل دھڑکن تک بند کر دی تھی، لیکن دوسرے لمحے میں نے ان آوازوں کو پہچان لیا اور حیرت آنکھیں پھاڑ کر اس عجیب و غریب مخلوق کو دیکھنے لگا۔ یہ بندر کے چھوٹے چھوٹے بچے تھے مجھے دیکھ کر چیخ رہے تھے۔ کمرے میں مختلف اشیاء کے انبار لگے ہوئے تھے۔ پھٹے ہو کپڑے، کھانے پینے کی چیزیں، پرس، جوتے۔ میں یہاں کھڑا ہو کر صورت حال کا تجزیہ کر لگا اور یہ تجزیہ بڑا ہی دلچسپ تھا۔ یہ کمرہ لکڑی کا بنا ہوا تھا۔ عقبی حصے میں ایک روشن دان کھلا تھا اور دوسری طرف ایک پتلی گلی تھی۔ اس گلی میں بجلی کا ایک پول لگا ہوا تھا جس پر لگی لائٹ روشن دان سے اس کمرے تک پہنچتی تھی اور رات کو جب یہ لائٹ جلتی تو کمرہ خو روشن ہو جاتا۔ سری لنکا کا ماحول، بندروں کی آزادی۔ یہ بندر اس کمرے میں بسیرا کرتے اور دن کی روشنی میں کھانے پینے کی تلاش میں نکل جاتے تھے۔ یہاں انہوں نے اپنا خاندان آباد کر رکھا تھا۔

رات کو یہاں آنے کے بعد وہی زر، زن اور زمین کا معاملہ شروع ہو جاتا تھا۔ بھا دوڑ، اچھل کود، لڑائی جھگڑا...... بس ان ساری چیزوں نے مل کر اس گھر کو آسیب زدہ بنا دیا میری تو لاٹری نکل آئی۔ سارا دن میں نے ان روشن دانوں کو بند کرنے میں صرف کیا کے تین بچوں کو وہاں سے ہٹا کر سامنے گلی کے دوسری جانب والی چھت پر ڈال دیا۔ وہ چ

کرتے ہوئے بھاگ گئے۔ کمرے اور چھت کی صفائی کی اور ان ساری چیزوں کو صاف ستھرا کرنے کے بعد میں نے فضول چیزیں کوڑے کے ڈرم میں ڈالیں اور پھر تھوڑا سا ڈرامہ کیا۔ یعنی اپنے بدن کو زخمی کر لیا، لیکن یہ زخم نہیں، بس ایسے ہی نشان تھے۔ چہرے پر بھی کچھ نشان بنائے اور شام کو جب جیکی اور اسماعیل واپس آئے تو میرا حلیہ دیکھ کر چونک پڑے۔

"ارے یہ کیا؟" اسماعیل عباسی نے پوچھا۔

"جنگ!"

"کیا مطلب؟"

"جنگ کا مطلب میرا خیال ہے، جنگ ہی ہوتا ہے"۔ میں نے پھیکے انداز میں مسکراتے ہوئے کہا اور وہ تشویش سے مجھے دیکھنے لگے۔

"خدا کے لئے مجھے بتاؤ تو کیا ہوا ہے؟"

"ایک خوش خبری ہے، آپ لوگوں کے لئے"۔

"بھلا کیا؟"

"میں نے یہ گھر بھوتوں سے پاک کر دیا ہے"۔

"اور تم زخمی ہو گئے ہو؟"

"زیادہ نہیں"۔

اس وقت تو ان لوگوں کو میری بات کا یقین نہیں آیا، لیکن اس رات پھر دوسری اور تیسری رات بھی کوئی گڑبڑ نہیں ہوئی۔ وہ میرے مرید بن گئے اور یہی معاملہ یہاں تک پہنچا ہے"۔

"مطلب؟"

"یار سیدھی سی بات ہے اگر ہم اسماعیل عباسی کی یہ مشکل حل کرنے میں کامیاب ہو گئے تو بہت بڑی رقم ہاتھ آجائے گی"۔

"تو یہ معاملہ ہے"۔

"ہاں"۔

"یہ بندروں کی آوازیں نہیں ہیں"۔

"ہاں میں جانتا ہوں...... یار اسی لئے میری ہوا کھسک رہی ہے۔ اگر واقعی یہاں کی صورتِ حال مختلف ہوئی تو عزت تو عزت جان بچانا بھی مشکل ہو جائے گی"۔

میرے دل میں اچانک ہی یہ سوال ابھرا کہ میں ناصر فرازی سے یہ سوال تو پوچھوں۔ میرے بھائی تو خیر اس طرح ان لوگوں کی نگاہوں میں ہیرو بن گیا، مگر جمیل بے چارے نے ایسا کیا کام کیا تھا جس کی وجہ سے تُو اسے یہاں لا کر پھنسانے کا باعث بنا، لیکن بہرحال یہ باتیں پوچھنے کے لئے نہیں ہوتیں اور پھر میرے لئے بھلا کیا مشکل تھا کہ میں ایک لمحے کے اندر اندر اس سارے جھگڑے سے نکل جاؤں۔ نہ تو اسماعیل عباسی، نہ ہی ناصر فرازی مجھے روک سکتے تھے، لیکن اگر میں اپنے بدن کو چھوڑ دیتا تو لینے کے دینے پڑ جاتے اور وہ لوگ سمجھتے کہ جمیل کی موت یہاں اس جگہ واقع ہوئی ہے۔ بہرحال تھوڑی دیر تک خاموشی رہی۔ میں نے کہا۔

''لیکن ناصر، سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ تم اس سلسلے میں کیا کہتے ہو؟''

''دیکھو، ساری صورتِ حال تمہارے علم میں آ چکی ہے۔ جمیل یوں سمجھ لو کہ نہ میں عالم ہوں نہ تم، ہاں ایک بات ہے کہ اگر ہم اس مسئلے کو حل کرنے میں کامیاب ہو گئے تو اچھا خاصا ہاتھ آ جائے گا اور ضرورت تو بہرحال ضرورت ہی ہوتی ہے۔ ویسے تم کیا کہتے ہو، ایک نام آیا ہے۔ ہمارے سامنے تصور شاہ، تمہارے خیال میں کیا یہ شخص اس پُراسرار عالم میں ہونے والے واقعات کا ذمہ دار ہو سکتا ہے، ذکیہ بیگم کے لئے''۔

''سوچنے کو تو بہت سی باتیں سوچی جا سکتی ہیں۔ ذکیہ بیگم بذات خود بھی اس کی ذمہ دار ہو سکتی ہے۔ ہم لوگ اس موضوع پر باتیں کرتے رہے کہ اچانک باہر انتہائی بھیانک آوازیں شروع ہو گئیں اور ایسی بھیانک چیخیں محسوس ہوئیں کہ بہت سے انسانوں کو گردن کاٹ کر ڈال دیا گیا ہو اور وہ درد کی شدت سے تڑپ رہے ہوں۔ ایسی خوفناک حالت میں اچانک ہمارے دروازے پر دستک ہوئی اور ناصر فرازی کا رنگ فق ہو گیا اس نے سہمی ہوئی نگاہوں سے میری طرف دیکھا، بولنے کی کوشش کی، لیکن اس کے منہ سے آواز تک نہیں نکلی۔ میں اپنی جگہ سے اٹھا اور دروازے کے قریب پہنچ کر دروازہ کھولا تو سامنے اسماعیل عباسی کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ریوالور تھا اور دوسرے ہاتھ میں ٹارچ...... چہرہ غصے سے سرخ ہو رہا تھا۔ اس نے دانت بھینچتے ہوئے کہا۔

''کیا تم میں سے کوئی میرا ساتھ دینے پر آمادہ نہیں ہو گا، دیکھ رہے ہو، سن رہے ہو آوازیں...... انتہا ہو گئی ہے۔ اگر یہ کسی کی مجرمانہ سازش ہے تو آج میں اس سازش کو منظرِ

عام پر لا کر رہوں گا، میری قوتِ برداشت انتہا کو پہنچ گئی ہے''۔

ناصر فرازی اب بھی ساکت بیٹھا تھا۔ میں نے ایک نظر اس پر ڈالی۔ مجھے یہ اندازہ ہو گیا کہ ناصر فرازی اس وقت قطعی اس قابل نہیں کہ وہاں تک جائے۔ اس کی ساری دلیری ہوا ہو چکی ہے، لیکن میں چونکہ اس کے ساتھ آیا تھا اور چاہتا تھا کہ ناصر فرازی کی بے عزتی نہ ہونے پائے، چنانچہ میں نے کہا۔

''کیا چاہتے ہیں مسٹر اسماعیل عباسی؟''

''وہ دونوں بزدل خوف سے کانپ رہے ہیں اور میرا ساتھ دینے کے لئے تیار نہیں۔ اگر تم میں سے کوئی میرا ساتھ دے تو آؤ ہم اس کمرے کی جانب چلتے ہیں۔ ذرا دیکھو تو سہی کہ یہ خوفناک آسیب آخر کیا بلا ہے اور کیا بگاڑ لیتا ہے میرا''۔

''چلو......'' میں نے کہا اور دروازے سے باہر نکل آیا۔

اسماعیل عباسی کچھ اس طرح غصے میں نظر آ رہا تھا کہ لگتا تھا آج وہ ساری حدود پار کر لے گا۔ میں اس کے ساتھ آگے بڑھتا رہا اور ہم دبے پاؤں اس کمرے کی جانب روانہ ہو گئے، جس کے بارے میں ہمارا اندازہ تھا کہ آوازیں اسی کمرے سے آتی ہیں۔ ایک لمبی راہ داری اور سنسان غلام گردش کو عبور کر کے آخر کار ہم اس آسیب زدہ کمرے کی جانب پہنچ گئے۔

آوازیں یہاں انتہائی دہشت ناک طریقے سے آ رہی تھیں۔ کچھ لمحے کے لئے یہ آوازیں اسی طرح آتی رہیں اور ہم دھڑکتے دلوں سے سنتے رہے۔ پھر یہ آوازیں مدہم ہونے لگیں اور یوں لگا جیسے کوئی سسک سسک کر رو رہا ہو۔ اسماعیل عباسی نے ریوالور میری طرف بڑھایا اور بولا۔

''تمہارا ریوالور تمہارے پاس موجود ہے؟''

''ہاں...... بالکل''۔

''میں ذرا یہ تالا کھولتا ہوں''۔ اس نے آگے بڑھ کر تالا کھولا اور جیسے ہی تالے میں چابی گھومی سسکیوں کی آواز بند ہو گئی۔ ہم آگے بڑھ گئے اور کمرے میں داخل ہو گئے۔ اب ہر طرف ایک خوفناک سناٹا پھیل گیا تھا۔ کمرے میں مکمل خاموشی اور اندھیرا تھا۔

❀❀❀

ایک دلچسپ مشغلہ آپ کو بتاؤں، اگر دن رات کے کسی حصے میں وقت مل جائے تو اپنے

آپ کو پڑھنا شروع کردیں۔ ایسے ایسے دلچسپ انکشافات ہوں گے اپنے بارے میں کہ آپ حیران رہ جائیں گے۔ یوں لگے گا جیسے آپ خود اپنے لئے اجنبی ہوں۔ میں اکثر ایسا کہتا ہوں، ویسے تو زندگی کا سفر نہ جانے کہاں سے شروع ہوا تھا، لیکن میں اپنا آغاز اس وقت سے سمجھتا ہوں جب میں مجرم بن گیا تھا۔ بس اس کے بعد کی کہانی آپ کو معلوم ہے۔

اور پھر زندگی کا یہ انداز...... انسانوں کی 98 فیصد تعداد زندگی کی یکسانیت کا شکار ہے۔ وہ بے حد خوش نصیب ہوتے ہیں، جنہیں زندگی میں تنوع مل جائے اور مجھے تو وہ سب کچھ مل گیا تھا جسے بس ایک خواب سمجھا جاسکتا ہے۔ ناآسودہ خواہشوں کی تکمیل کا خواب، بلاشبہ جو سے آنکھیں لے کر وہ سب کچھ دے دیا گیا تھا جو خوابوں ہی میں حاصل کیا جاسکتا ہے۔ حقیقی زندگی میں وہ صرف ایک افسانہ ہوسکتا ہے اور میں وہی افسانوی شخصیت بن گیا تھا۔

تو ذکر ہے ان ہولناک لمحات کا جن سے ہم اس وقت گزر رہے تھے۔ ٹارچوں کی روشنیاں چاروں طرف لہراتی رہیں۔ ماحول انتہائی بدنما اور لرزہ خیز تھا۔ ایک عجیب سی نحوست چاروں طرف برس رہی تھی۔ مکڑی کے بڑے بڑے جالے، چھت کے قریب سرسراہٹیں جیسے کوئی چھت سے چپکا ہوا آگے بڑھ رہا ہو۔ ہم اس گہرے سناٹے میں ٹارچوں کی روشنی ادھر اُدھر ڈالتے رہے کہ اچانک ایک بھیانک چیخ بلند ہوئی...... ایسی بھیانک کہ انسان اگر ان چیخوں کو برداشت کرے تو اسے انسان ہی نہ کہا جائے...... یوں لگ رہا تھا جیسے دیواروں سے اچانک ہی لاتعداد چہرے نمودار ہوگئے ہوں، ان کی بھیانک زبانیں، سانپوں کی طرح لہرا رہی ہوں اور وہ حلق پھاڑ پھاڑ کر چیخ رہے ہوں۔ اسماعیل عباسی کے ہاتھ سے ٹارچ گر گئی اور وہ بری طرح دروازے کی سمت بھاگا۔

میں ایک لمحے تک اندر رکا لیکن یہ چیخیں کانوں کے پردے پھاڑے دے رہی تھیں۔ بدن میں خون جیسے جم رہا تھا۔ اسماعیل عباسی جو شاید غصے کے عالم میں یہاں آیا تھا، ہمت ہار کر باہر نکل بھاگا تھا اور مجھے اس کی بزدلی پر غصہ آرہا تھا۔ کمبخت نے دل چھوڑ دیا تھا۔

میں نے ایک لمحے کے لئے سوچا اور اس کے بعد نفرت بھری نگاہوں سے کھلے دروازے کے باہر دیکھا۔ پتہ نہیں اسماعیل عباسی کہاں جا مرا تھا۔ بہرحال میں کمرے کے درمیان کھڑا ان آوازوں کو سنتا رہا۔ میں دیکھنا چاہتا تھا کہ یہ آوازیں صرف آوازیں ہیں یا ان کے ساتھ کچھ اور بھی ہے۔ چھت کے قریب ہونے والی سرسراہٹیں بھی ان آوازوں میں دب گئی تھیں۔ میں

دیر تک کھڑا حالات کا جائزہ لیتا رہا۔ میں نے آنکھیں بند کرلی تھیں اور یہ سوچ رہا تھا کہ جب تک میرے بدن کو کوئی چھوئے گا نہیں، میں آنکھیں نہیں کھولوں گا اور ان آوازوں کو برداشت کرتا رہوں گا۔ میں یہ اندازہ اب بھی لگانا چاہتا تھا کہ اس مکان کے آسیب صرف چیخ و پکار کرتے ہیں یا کسی کو نقصان بھی پہنچاسکتے ہیں۔

یہ ایک دلچسپ تجزیہ تھا۔ خاص طور سے اس لئے کہ میں اپنے جسم سے بالکل ہی بے فکر تھا۔ بہت دیر تک یہ آوازیں شور مچاتی رہیں اور میں خاموش کھڑا رہا۔ پھر جب یہ احساس ہوا کہ اب ان کی شدت میں کمی آگئی ہے تو میں آہستہ آہستہ سامنے والی دیوار کی طرف بڑھا۔ دیوار پر ہاتھ رکھ کر یہ اندازہ لگانے کی کوشش کی کہ کہیں ان کے اندر مائیکروفون تو فٹ نہیں، لیکن چند ہی لمحوں میں، میں نے محسوس کرلیا کہ یہ آوازیں دیواروں کے اندر سے نہیں آرہیں۔ البتہ ایک اور خوفناک بات ہوئی، وہ یہ کہ میرے پیروں کے نیچے فرش ٹیڑھا ہونے لگا۔ مجھے یوں لگا جیسے کمرے کا فرش ایک طرف سے بلند ہوتا جارہا ہے اور کمرہ ٹیڑھا ہونے لگا ہو۔ چیخیں انتہائی خوفناک ہوگئی تھیں۔

دوسری خوفناک بات یہ ہوئی کہ میرے ہاتھ میں روشن ٹارچ کی روشنی مدھم ہونے لگی، جیسے اس کے سیل ختم ہوگئے ہوں۔ یہ چیزیں ناقابل یقین تھیں، میں گرنے لگا اور اپنے آپ کو سنبھالنے کے لئے میں نے اپنے جسم کو بیلنس کرنے کی کوشش کی۔ ٹارچ بجھ گئی تھی اور میں نیچے کی جانب کھسکتا چلا جارہا تھا۔ اب اس کے سوا کوئی چارہ نہ رہا کہ میں دروازے سے باہر نکل جاؤں۔ جیسے ہی میں دروازے سے باہر نکلا، اچانک ایک خوفناک قہقہہ بلند ہوا اور پھر ایک کے بعد ایک اس طرح کے بھیانک قہقہے بلند ہوتے رہے۔ یوں لگ رہا تھا جیسے کوئی میری اس شکست پر ہنس رہا ہو۔ پھر ایک دم گہری خاموشی ہوگئی۔ بہت فاصلے پر مجھے کچھ انسانی سائے نظر آرہے تھے۔ آہستہ آہستہ میں ان کے قریب پہنچا تو اچانک ہی میری ٹارچ پھر روشن ہوگئی۔ یوں لگا جیسے اس میں نئی روشنی پڑگئی ہو۔ جس جگہ وہ لوگ کھڑے ہوئے تھے، وہاں بھی انہوں نے روشنی کررکھی تھی اور اس روشنی میں ان کے چہرے ہلدی کی طرح زرد ہورہے تھے۔ یہ اسماعیل، ناصر فرازی، نذیر عباسی اور شمشیر تھے۔ وہ چاروں ساکت و جامد کھڑے غالباً میری زندگی کی دعائیں مانگ رہے تھے۔ پھر میں ان کے قریب پہنچا تو اسماعیل عباسی نے کہا۔

''آؤ براہ کرم میرے کمرے میں آؤ''۔

ہم اس کے کمرے کی جانب بڑھ گئے۔ جہاں اسماعیل عباسی نے اپنا قیام کر رکھا
اس بڑے اور وسیع کمرے کی دیواریں، چھت سیاہ، پتھر کی بنی ہوئی تھیں۔ یہاں انہوں
ایک بڑا لیمپ روشن کر رکھا تھا۔ اسماعیل عباسی نے غصیلے انداز میں کہا۔

''اب اس کے سوا کوئی اور چارہ کار نہیں ہے کہ میں اس کمرے کو کھدوا کر پھنکوا
اس کی دیواریں، اس کا فرش سب کچھ تباہ کر دوں۔ میں، میں ہار نہیں مان سکتا۔ ہار ما
مطلب ہے کہ میں ذکیہ بیگم سے شادی نہ کروں۔ وہ اس کے سوا کچھ اور نہیں چاہتے''۔

''جذباتی ہونے کی کوشش مت کریں، مسٹر عباسی، بات کچھ اور بھی ہو سکتی ہے''۔
نے کہا۔

''تم اس کمرے میں گئے تھے۔ کوئی اندازہ لگایا تم نے؟''

''صرف اتنا کہ یہ کام کسی انسان کا معلوم نہیں ہوتا اور شاید کمرہ کھدوانے کے بعد بھی
آوازیں بند نہیں ہوں گی''۔

میرے ان الفاظ نے ایک لمحے کے لئے وہاں خاموشی طاری کر دی۔ پھر اسماعیل عبا
نے کہا۔

''گویا کوئی حل نہیں ہے کہ میں اس عمارت کو دوبارہ آباد کر لوں۔ بس ایک بات میں
تم لوگوں کو بتا دوں۔ میرے دوستو! خدا نے مجھے بہت کچھ دیا ہے، اتنا کہ میں 10 خاندان
کر لوں، تب بھی اس میں کوئی فرق نہ پڑے۔ میں اپنی دولت کا ایک بڑا حصہ تم لوگوں کو د
کے لئے تیار ہوں، لیکن میں یہ بے عزتی برداشت نہیں کروں گا۔ میں اس عمارت کو نہ
چھوڑوں گا۔ اب تم مجھے یہ بتاؤ کہ مجھے کیا کرنا چاہئے۔ میں سخت پریشان ہوں''۔

''سب سے پہلے ہمیں چائے تیار کروانی چاہئے، کیوں شمشیر؟''

''اس وقت میں کچن میں بالکل نہیں جاؤں گا۔ ہاں چائے کے سامان کا بندوبست
نے الگ کر رکھا ہے...... یہیں بیٹھ کر چائے بنائی جائے گی۔ اگر آپ لوگوں کو اعتراض نہ ہو''

''بھلا چائے کا معاملہ اور کوئی اعتراض کرے؟''

اچانک ہی باہر تیز ہوائیں چلنے لگیں...... یوں لگا تھا، جیسے مکان کے آسیب پوری ط
اس مکان میں کھیلتے پھر رہے ہوں۔

تیز ہواؤں کی سیٹیاں، جگہ جگہ اُبھر رہی تھیں اور ادھر شمشیر نے چائے کا بندوبست

کر دیا تھا۔ گیس اسٹوو جلا لیا گیا۔ پانی وغیرہ تمام چیزوں کا بندوبست یہیں تھا۔ برتن بھی موجود تھے۔ چائے کی پتی، دودھ، شکر پھر اچانک ہی باہر بادلوں کی گرج ابھری اور تیز بجلی چمکنے لگی۔ بہت دیر تک یہ سلسلہ جاری رہا اور محسوس ہوا کہ جیسے بارش صبح تک بند نہیں ہوگی۔ چائے نے اس وقت جو مزہ دیا تھا اس کا کوئی جواب نہیں تھا۔ اچانک ہی مجھے کچھ یاد آیا کہ میں نے اسماعیل عباسی سے کہا

''عباسی صاحب، ایک بات تو بتائیے۔ آپ نے اس مکان کی تاریخ تو معلوم کی ہوگی...... آپ مجھے بتائیں کہ آخری بار یہ مکان کس کے قبضے میں تھا؟''

''میں بالکل نہیں جانتا اور شاید مشکل ہی ہو جائے، کیونکہ تھوڑی سی تفصیلات مجھے ذکیہ خاتون سے معلوم ہوئی تھیں۔ یہ ان کے خاندان کا گھر تھا، لیکن آبادیاں یہاں سے دور ہٹ گئی تھیں۔ اس وقت سے یونہی پڑا ہے اور اس پر کسی نے کوئی دعویٰ نہیں کیا، چنانچہ یہ حکومت کی تحویل میں چلا گیا تھا۔

''میں جاننا چاہتا تھا کہ یہاں جو قیمتی فرنیچر آپ نے نیچے سے نکلوا کر اوپر منگوایا ہے۔ یہ کس نے خریدا تھا اور کس نے انہیں تہہ خانوں میں پہنچایا تھا؟''

''افسوس اس بارے میں کچھ نہیں بتا سکتا''۔

''میں اصل بات جو کہنا چاہتا تھا، وہ یہ کہ کیا ان سارے معاملات کا تعلق ان تہہ خانوں سے تو نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے تہہ خانوں کے اندر کوئی ایسا بندوبست کیا گیا ہو''۔

اسماعیل عباسی پُرخیال نگاہوں سے مجھے دیکھنے لگا...... پھر اس نے کہا۔

''میں نہیں جانتا، ممکن ہے ایسا ہو''۔

''ٹھیک ہے میں یہ چاہتا ہوں کہ ہم ان تہہ خانوں کا جائزہ لیں''۔

''ابھی چلنا چاہو تو ابھی چلو......'' اسماعیل نے کہا اور میں ہنس پڑا۔

''کیوں؟''

تہہ خانوں میں جائیں گے۔ اگر وہاں کہیں ہنگامہ ہوا تو آپ سب لوگ تو بھاگ آئیں گے مجھے وہاں چھوڑ کر''۔

اسماعیل عباسی میرے ان الفاظ سے شرمندہ ہو گیا تھا، کچھ دیر وہ خاموش رہا، پھر اس نے کہا۔

"ہاں واقعی یہ ایک افسوس ناک عمل ہے جس پر میں خود کو معاف نہیں کرسکوں گا۔ تمہیں اپنے ساتھ اپنی مدد کے لئے لے گیا تھا، لیکن میں خود بھاگ آیا، یہ ایک اچھی بات نہیں تھی جو میں نے کی"۔

"ارے نہیں، میں نے مذاق کیا ہے۔ آج نہیں تو کل دن کی روشنی میں ہم تہہ خانہ دیکھیں گے۔ پھر ان کے بعد ہم نے ان سے اجازت لی"۔

باہر بارش مسلسل ہورہی تھی۔ ہم دونوں اپنے کمرے میں آگئے۔ ناصر فرازی نے کہا۔

"حقیقت تو یہ ہے جمیل کہ میں تو ہمت ہارتا جارہا ہوں۔ یہاں کے معاملات تو واقعی بے حد سنسنی خیز اور پُراسرار ہیں۔ میں خوف محسوس کررہا ہوں"۔

"فی الحال اپنے محسوسات کو پس پردہ ڈال کر آرام کی نیند سوجاؤ ورنہ میں تو کم ازکم بیمار پڑجاؤں گا"۔

پتہ نہیں ناصر فرازی سوگیا تھا یا نہیں، لیکن مجھے نیند نہیں آرہی تھی، بلکہ ایک ہلکی سی غنودگی کا عالم مجھ پر طاری تھا۔ بہرحال اچانک ہی میں نے محسوس کیا کہ ایک شی...... شی کی آواز بلند ہورہی ہے۔ یہ آواز ایسی تھی جیسے کوئی کسی کو مخاطب کررہا ہو۔ میں نے چونک کر آنکھیں پھاڑ دیں۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ وہ دروازہ کھلا ہوا تھا جو ہمارے کمرے کا واحد دروازہ تھا اور جسے میں نے اپنے ہاتھوں سے بند کیا تھا۔

میں ایک دم اُٹھ کر بیٹھ گیا اور میں نے کھلے دروازے پر نگاہ جما کر آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنا شروع کردیا۔ دروازہ کس نے کھولا۔ میں نے حیرت بھرے انداز میں سوچا اور پھر ان حقیقتوں پر غور کرنے لگا، جنہیں پُراسرار نہ سمجھا جاسکے۔ باہر تیز ہوائیں چل رہی تھیں اور بارش بھی ہورہی تھی۔ دروازے کا بولٹ ڈھیلا ہے۔ ہوسکتا ہے ہوائیں آہستہ آہستہ دروازے پر دباؤ ڈالتی رہی ہوں اور آخرکار کنڈی کھل گئی ہو لیکن یہ شی...... شی کی اور ان آوازوں کے بارے میں جو اندازہ ہوا، وہ ہوا کی سرسراہٹیں ہوسکتی ہیں، لیکن پھر بے اختیار میری نگاہیں دروازے کی جانب اٹھیں تو مجھے محسوس ہوکہ جیسے کوئی انسانی جسم دروازے کے سامنے سے گزرا ہو۔

ایک بار پھر زمین پر پاؤں مار کر مجھے مخاطب کیا گیا جیسے پہلے کیا گیا تھا اور اب کوئی شک نہیں رہا تھا کہ دروازہ بھی کسی نے کھولا ہے اور دروازے کے باہر بھی کوئی موجود ہے۔ میں نے اپنے قریب سوئے ہوئے ناصر فرازی کو دیکھا اور یہ تصور دل سے ختم ہوا کہ وہ ناصر فرازی

ہوسکتا ہے۔ پھر کون...... اسماعیل عباسی، نذیر عباسی یا شمشیر؟ لیکن دیکھے بغیر چارہ کار نہیں تھا۔ اب میں نے دروازے سے باہر قدم رکھا تو مجھ سے کوئی پندرہ گز کے فاصلے پر ایک انسانی جسم متحرک نظر آیا۔

شانوں سے لے کر پیروں تک سیاہ لباس میں ملبوس وہ اس طرح وہاں کھڑا تھا جیسے وہاں کسی کا منتظر ہو۔ اس کے قدوقامت اور اس کے لباس سے کم ازکم یہ اندازہ مجھے ہوگیا تھا کہ یہ ان تینوں میں سے کوئی نہیں۔ یعنی اسماعیل عباسی، نذیر عباسی یا شمشیر، پھر یہ کون ہے؟ تجسس نے مجھے خوف سے بیگانہ کردیا۔ ایک قدم آگے بڑھا تو میں نے دیکھا کہ وہ سایہ بھی آگے چل پڑا ہے۔ ایک پُراسرار انوکھا اور دلچسپ کھیل جس کا اختتام پتہ نہیں تھا کہ کیا ہوتا ہے۔ میں نے قدم آگے بڑھادیئے، نڈر اور بے خوف ہوکر۔ تجسس اب ہر احساس پر حاوی ہوگیا تھا اور میں ہر قیمت پر یہ جان لینا چاہتا تھا کہ یہ سب کیا ہے۔

پُراسرار سایہ اس طرح آگے بڑھ رہا تھا جیسے میری رہنمائی کررہا ہو اور میں بھی شاید اس کے سحر میں گرفتار تھا۔ تھوڑے بہت خوف کا احساس تو ہوتا لیکن میں ہر احساس سے بے نیاز اب اس سائے کا تعاقب کررہا تھا اور مجھے یوں محسوس ہورہا تھا جیسے میں بالکل اجنبی راستوں پر جارہا ہوں، حالانکہ اس عمارت کو میں نے کافی حد تک دیکھا تھا، لیکن اس وقت جن راستوں پر چل رہا تھا، وہ بالکل ہی اجنبی اور نئے معلوم ہورہے تھے۔

وسیع وعریض راہداری جس کی دیواریں اور چھتوں کا رنگ سیاہ پڑچکا تھا۔ لکڑی کے بنے ہوئے دروازے اور اونچی اونچی کھڑکیاں قرب و جوار میں چند کرسیاں، لیمپ اور کراکری کا کچھ سامان بھی نظر آرہا تھا۔ دیواروں پر روغنی تصویریں جن کے رنگ ونقوش مدھم پڑچکے تھے۔ تصویروں کے گرد لمبی لمبی سیاہ موم بتیاں روشن تھیں اور ان کی جھلملاتی کانپتی روشنی میں یہ تصویریں اور بھیانک نظر آرہی تھیں۔

ان کے فریم بے حد خوبصورت اور مضبوط تھے۔ تقریباً پچاس سے ساٹھ فٹ لمبی اس راہداری کو عبور کرتے ہوئے میں نے یہ تمام عجیب وغریب چیزیں دیکھیں۔ میرے حواس بھی بحال تھے اور ہر طرح کا خوف میرے دل سے نکل چکا تھا۔ حالانکہ یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا، سوچ رہا تھا لیکن اس کے باوجود ایک سحرزدگی کی کیفیت مجھ پر بے شک سوار تھی۔ یہاں تک کہ میں اس سیاہ سائے کو بھی بھول گیا تھا جس کی وجہ سے میں نے یہ تعاقب کیا تھا۔ یہاں جو

چیزیں موجود تھیں، انہیں دیکھ کر ہی میں سب کچھ بھول گیا تھا۔
اچانک ہی میرے کانوں میں ایک عجیب سی آواز ابھری اور اس آواز نے مجھے ایک بار پھر ہوش وحواس کی دنیا میں لا پھینکا۔ میں چونک کر چاروں طرف دیکھنے لگا۔ آواز سائے آرہی تھی۔ یہ کوئی عجیب سے ساز کی آواز تھی۔ کانپتی، لمبی اور سُریلی آواز لیکن اس میں ردھم تھا۔ بجانے والا یقینی طور پر ماہر فنکار تھا، کیونکہ چند ہی لمحوں کے بعد مجھ پر خود فراموشی کی سی کیفیت چھانے لگی۔ جس طرح ناگ بین بجانے والے کے سامنے مست ہو جاتا ہے، میرا بھی یہی حال تھا۔ رات کے اس ہولناک سناٹے میں کسی نامعلوم ہستی کے یوں ساز بجانے سے مجھ پر دہشت کے بجائے فرحت کا حملہ ہوا تھا۔ دل میں ایک عجیب سی خوشی پیدا ہوگئی تھی۔ میں آگے بڑھا اور اس دروازے تک پہنچ گیا جو سامنے نظر آرہا تھا۔ جیسے ہی میں دروازے کے قریب پہنچا، دروازہ خود بخود کھل گیا اور اس سے روشنی نظر آئی، لیکن یہ روشنی موم بتیوں کی نہیں تھی۔ دروازہ کھلتے ہی یوں معلوم ہوا جیسے ساز کی آواز پیچھے ہٹ گئی ہو۔
میں نے سامنے دیکھا اور ایک ایک قدم آگے بڑھ گیا۔ لیکن اچانک ہی مجھے یوں لگا جیسے وہاں کوئی موجود ہو۔ روشنی کمرے کے تمام گوشوں کو منور کئے ہوئے تھی، لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے یہ کمرہ صدیوں سے بند پڑا ہے۔ ساز کی آوازیں بند ہوگئی تھیں۔ ایسا ہولناک سناٹا جو اعصاب کو چیرتا ہوا روح کو زخمی کئے دیتا تھا۔ آوازوں کے رک جانے سے یوں محسوس ہوتا تھا، جیسے کوئی خوفناک واقعہ عمل میں آنے والا ہو۔ میری چھٹی حس بتا رہی تھی کہ اس خاموشی میں کوئی راز چھپا ہوا تھا۔ اچانک ہی میرے دل میں شدت سے یہ خواہش پیدا ہوئی کہ یہ اعصاب شکن خاموشی دور ہو جائے اور وہی چیخنے چلانے کی آوازیں دوبارہ سنائی دیں۔ یہ خاموشی ان آوازوں سے زیادہ بھیانک اور پُرخطر لگ رہی تھی۔ شاید اس کی وجہ یہ کہ آوازوں کے بغیر اس کمرے کی ہیبت کا احساس شعور کو نہیں ہوتا تھا، جو دل و دماغ میں بیٹھ ہوئی تھی۔ پھر بے اختیار میرے اندر جوش وخروش کی ایک ناقابل برداشت لہر نمودار ہوگئی۔ میں نے پستول جیب میں رکھا۔ حالانکہ کمرے میں روشنی تھی، لیکن اس کے ساتھ ہی میں نے ٹارچ روشن کرلی اور پھر کمرے کی دیوار کے ساتھ ساتھ کمرے کا چکر لگانے لگا۔ میں نے پاگلوں کی طرح دیوار پر گھونسے مارے اور پیروں سے فرش بجایا، لیکن دیواروں اور سنگین فرش کے اندر سے کوئی آواز نہیں نکلی۔

جنوبی دیوار میں بہت بڑے آتش دان کے قریب کھڑکیاں نظر آرہی تھیں۔ میں نے ان کھڑکیوں کے بند دروازوں کا معائنہ کیا، لیکن کوئی ایسی بات نہیں معلوم ہوئی جو میں دیکھنا چاہتا تھا کہ یہاں کیا ہے۔ آتش دان میں جلی ہوئی لکڑیاں اور ان کا جلا ہوا برادہ بکھرا ہوا تھا۔ آتش دان برج سے کہیں زیادہ بڑا تھا۔ میں نے اس میں گردن ڈال کر اوپر چمنی کی طرف دیکھا۔ چمنی اونچی اور تاریک تھی، لیکن درمیان میں ایک موٹا سا رسہ لٹک رہا تھا۔ آتش دان کی دیوار کے ساتھ ساتھ لوہے کے کئی کڑے گڑے ہوئے تھے۔ ان کڑوں میں دو دو فٹ لمبی زنجیریں بندھی ہوئی تھیں۔
میں حیران ہوگیا۔ ان زنجیروں اور کڑوں کا مقصد میری سمجھ میں نہیں آیا تھا، اسی عالم میں، میں نے فیصلہ کیا کہ دن کی روشنی میں اس چمنی کا بھرپور جائزہ لوں گا۔ نہ جانے کیوں چھٹی حس بتا رہی تھی کہ ان آوازوں کا راز اس چمنی کے سینے میں چھپا ہوا ہے۔ میری متجسس نگاہیں قرب و جوار کا جائزہ لیتی رہیں۔ پھر اچانک آتش دان کے اندر مجھے ایک اور چیز نظر آئی جس پر نظر ڈالتے ہی رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ یہ آتش دان میں راکھ کریدنے اور راکھ ہٹانے والی لوہے کی موٹی اور لمبی سلاخ تھی۔ اس کے ایک سرے پر بالکل تازہ خون جما ہوا تھا۔ میں اس پر جھک گیا اور جائزہ لینے لگا۔ بہت دیر تک میں ہاتھ لگائے بغیر اسے جھک کر قریب سے دیکھتا رہا۔ خون نہ صرف ہتھی پر جما ہوا تھا بلکہ سلاخ کے نچلے حصے اور درمیانی حصہ پر بھی موجود تھا۔ میں سوچ میں ڈوب گیا۔
کیا یہ سلاخ اس سے پہلے بھی یہاں پڑی ہوئی تھی، لیکن اس پر تازہ خون کے دھبے کہاں سے آئے؟ یہ خون انسان کا ہے یا پھر؟ اسی قسم کے کئی سوال میرے ذہن میں بجلی کی تیزی سے آئے۔ اگر یہ سلاخ پہلے یہاں موجود نہیں تھی تو اسے کون یہاں لایا؟ اور وہ کمرے میں کس وقت اور اس راستے سے داخل ہوا۔ کیا اس چمنی کے راستے یہاں کوئی آتا ہے؟ یہ خون ممکن ہے ہم لوگوں کو جو یہاں اس عمارت میں اس وقت موجود تھے، خوفزدہ کرنے کے لئے لایا گیا ہو۔ اس احساس نے میرے دل میں کچھ اور کرید پیدا کردی۔ میں نے بڑبڑانے کے انداز میں کہا۔
”تم لوگ جو کوئی بھی ہو دوستو! یہ سمجھ لو کہ تمہارے آخری لمحات قریب آگئے ہیں اور اب کم از کم مجھ سے نہیں بچ سکو گے۔ سمجھ رہے ہو۔ میں تم سے بالکل خوفزدہ نہیں ہوں۔ تم

کوئی بھی ہو، سامنے آکر مجھ سے بات کرو۔ دیکھتا ہوں تم کس طرح یہاں کامیاب ہوئے اب جب میں اس عمارت میں آگیا ہوں تو تمہاری ہر سازش ختم کر کے ہی یہاں سے باہر

میں نے جھک کر خون آلودہ سلاخ اٹھائی لیکن سلاخ کو اٹھاتے ہی جیسے خوفناک آگیا۔ کمرہ بھیانک آوازوں سے گونج اٹھا اور مجھے یوں محسوس ہوا جیسے بے شمار خوفناک آوازوں کے ساتھ میرے اردگرد رقصاں ہوگئی ہیں۔ وہ چاروں طرف سے مجھ کر رہی تھیں۔

میں نے بے اختیار سلاخ فرش پر دے ماری۔ خوفناک آواز آئی۔ جس جگہ سلاخ پر گری تھی وہاں سے تازہ خون کا فوارہ ابل پڑا۔ ایسا لگا جیسے میں نے سلاخ زمین پر نہ ہو بلکہ کسی کے سینے میں گھونپ دی ہو۔ خون کے اس فوارے کے بے شمار چھینٹے میرے پڑے تو میری اعصابی قوت ساتھ چھوڑ گئی اور دوسرے ہی لمحے میں نے کمرے سے چھلانگ لگادی۔ دروازے کے قریب پہنچا تو ناصر فرازی کے چیخنے کی آواز سنائی دی۔

''کیا ہوا؟ کیا ہوگیا؟''

میں اس سے ٹکراتے ٹکراتے بچا...... ناصر فرازی نے مجھے سنبھالا اور بولا۔

''یہ رات میں تم اٹھ کر کہاں چلے گئے تھے؟''

''مجھے پانی پلاؤ؟''

''میں لاتا ہوں...... لیکن تم؟''

''پلیز مجھے پانی پلاؤ''۔ میں نے کہا اور ناصر فرازی پانی لینے چلا گیا، اسے صورت کوئی اندازہ نہیں تھا۔ پانی پلانے کے بعد جب وہ میرے قریب آیا تو میں نے اس سے کہا

''مجھے افسوس ہے کہ میری وجہ سے تمہاری نیند خراب ہوئی''۔

''کیسی باتیں کرتے ہو؟ میں تو یہ سوچ رہا تھا کہ تم خود میری وجہ سے ان الجھنوں کا ہوئے۔ کہیں تمہیں کوئی نقصان نہ پہنچ جائے۔

''صرف مجھے؟ بہرحال میرا مسئلہ بہت مختلف ہے''۔

''اب تم مجھے یہ بتاؤ کہ ہوا کیا ہے؟''

''بس تم یہ سمجھ لو کہ میری زندگی میں دیوانگی آگئی تھی''۔

''مطلب؟''

''میں اس کمرے کی تلاش میں گیا تھا''۔

''کیا؟''۔

''اور کیا''۔

''مجھے کیوں نہ جگایا؟''

''کیا فائدہ؟''

''کیوں فائدہ نقصان کیا معنی رکھتا ہے؛ اگر تمہارے دل میں یہ خیال آیا تھا تو تم مجھے جگالیتے کیا یہ اچھا نہیں ہوتا؟''

''خیر وہ الگ بات ہے کہ کیا اچھا ہوتا اور کیا برا ہوتا لیکن بہرحال میں اس کمرے میں داخل ہوگیا تھا''۔

''داخل ہوگئے تھے؟''

''ہاں''۔

''تو پھر؟''

''واقعی وہاں کی صورتِ حال بڑی عجیب وغریب ہے''۔

''تم نے واقعی اس وقت کمال کر ڈالا''۔

''کیوں؟''

''بھئی تم تنہا اس کمرے میں گئے اور وہ بھی رات کے اس پہر، اگر تمہیں کوئی نقصان پہنچ جاتا تو؟ اچھا خیر چھوڑو...... یہ بتاؤ کہ وہاں تم نے کمرے میں کیا دیکھا؟''

''ایسی پُراسرار انوکھی چیزیں جن کے بارے میں شاید میں خود بھی ابھی اندازہ نہیں لگا سکتا''۔

''مثلاً؟ مجھے کچھ بتاؤ تو سہی پلیز'' ...... اور جواب میں مَیں نے ناصر فرازی کو ساری تفصیلات سنادیں اور پھر میں نے کہا۔

''لیکن میں سمجھتا ہوں کہ یہ سب کچھ فراڈ ہے۔ یقیناً یہ کچھ ایسے لوگوں کا کام ہے جو یہ نہیں چاہتے کہ اسماعیل عباسی ذکیہ بیگم سے شادی کرے، لیکن دوست، ہونا وہی چاہئے جس کے لئے ہم یہاں آئے ہیں...... اسماعیل عباسی کو ذکیہ بیگم سے شادی کرنا ہوگی اور ہم یہ سب کچھ کریں گے۔ ان لوگوں کو اس بارے میں بتانا چاہئے''۔

"کیوں؟"

"اس میں کوئی حرج ہے؟"

"چلو ٹھیک ہے جیسے تم مناسب سمجھو...... ویسے وہ لوگ جاگے نہیں ہیں"۔

"یہ اچھی بات ہے"۔

دوسری صبح ناشتے کی میز پر میں نے اسماعیل عباسی کو ساری کہانی سنائی تو وہ دنگ رہ گیا۔ شمشیر تو تھر تھر کانپنے لگا۔

نذیر عباسی نے کہا تم بے انتہائی بہادر آدمی ہو، دوست۔

"میں نے بھائی صاحب سے یہی کہا تھا کہ یہ شخص بڑا بہادر معلوم ہوتا ہے اور ہوسکتا ہے کہ یہ ہمارے کام آجائے، لیکن اس کے باوجود تمہیں اس طرح خطرے کا سامنا نہیں کرنا چاہئے تھا"۔

"میں نے جو کچھ کیا ہے یا نہیں کیا، لیکن آؤ کیا تم لوگ اس کمرے میں جانے کی ہمت کرو گے؟"

"کیوں نہیں"۔

"تو پھر آؤ تمہیں وہ سلاخ اور زمین سے ابلنے والا خون دکھاؤں"۔

وہ میرے ساتھ چل پڑے تھے۔ میں نے بہادری کے ساتھ آگے بڑھ کر کمرے کا دروازہ کھولا تو پہلے کی طرح صاف اور خالی تھا۔ میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر چاروں طرف دیکھنے لگا، وہاں نہ خون تھا، نہ سلاخ بلکہ ایسے لگتا تھا جیسے یہاں کوئی آیا ہی نہ ہو۔ سلاخ آتش دان کے اندر پڑی ہوئی تھی لیکن اس پر خون کے دھبے تھے، نہ وہ ٹوٹی ہوئی تھی۔ بڑی عجیب شرمندگی ہوئی اور میں سخت پریشان ہوگیا۔ اسماعیل عباسی، نذیر عباسی سب لوگ کچھ لمحات تو کھڑے رہے، پھر اسماعیل عباسی نے کہا۔

"آؤ واپس چلتے ہیں"۔

میں باہر نکلا تو میرے ذہن پر ایک تردد سوار تھا۔ میں باہر آنے کے بعد شرمندگی سے ان لوگوں کو دیکھنے لگا، تو اسماعیل عباسی نے کہا۔

"ہم جن حالات میں گھرے ہوئے ہیں، ان میں اس واقعہ کا اس طرح ہوجانا حیرانی کا باعث نہیں۔ تم اس پر زیادہ توجہ نہ دو، اپنا دل خراب نہ کرو"۔

پھر ساڑھے دس بجے کے بعد ایک شخص اس عمارت کے دروازے پر کھڑا نظر آیا۔ سہما سہما اندر پہنچا تھا۔ اس وقت ہم عمارت کے برآمدے میں موجود تھے، آنے والے نے اسماعیل عباسی کو سلام کیا تو اسماعیل عباسی بولا۔

"ہاں زمان خان، کیا بات ہے؟"

"صاحب جی، بی بی صاحب نے آپ کو بلایا ہے۔ دوپہر کا کھانا آپ ان کے ساتھ ہی کھائیے"۔

"اوہو! اچھا ٹھیک ہے...... تم جاؤ میں آجاؤں گا"۔

"نذیر صاحب کو بھی بلایا ہے"۔

"ہاں کیوں نہیں، نذیر صاحب بھی آئیں گے"۔ اسماعیل نے کہا اور ملازم چلا گیا۔ تب اسماعیل نے کہا۔

"ذکیہ اکثر ہم لوگوں کی دعوت کرتی رہتی ہے۔ وہ اس بات پر ہم سے سخت ناراض ہے کہ ہم خطرہ مول لے کر اس مکان میں کیوں رہ رہے ہیں۔ اس کے تاثرات بڑے عجیب ہیں۔ اپنا خاندانی مکان ہونے کی وجہ سے اس سے محبت بھی کرتی ہے، لیکن یہاں ہونے والے معاملات اور واقعات سے کبھی کبھی خوفزدہ بھی ہوجاتی ہے"۔

بہرحال وہ دونوں تیار ہوکر نکل گئے اور شمشیر سے کہہ گئے کہ وہ ہمارے کھانے پینے کا بندوبست کرے...... شمشیر باورچی خانے میں چلا گیا تو میں نے ناصر فرازی کی طرف دیکھا اور کہا۔

"کیا خیال ہے فرازی، ہم اپنا کام شروع کریں"۔ فرازی کے اندر ایک ہچکچاہٹ سی تھی، اس نے کہا۔

"کس طرح؟"

"مجھے کچھ اس طرح محسوس ہورہا ہے ناصر، جیسے تم ان حالات اور واقعات سے بددل ہوتے جارہے ہو"۔

ناصر نے فوراً ہی جواب نہ دیا۔ کچھ دیر خاموش رہا، پھر ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔

"کچھ امید ہے؟"

"کیوں نہیں"۔

"تو ٹھیک ہے...... میں بس یہ سوچ رہا ہوں کہ کہیں صورتِ حال کوئی مشکل شکل اختیار کر جائے"۔

"اب جو کچھ بھی ہوگا، دیکھا جائے گا، لیکن ابھی تک میں مکمل طور پر اس بات پر اتفاق نہیں کرتا کہ یہ سب کچھ آسیبی کارنامے ہیں"۔

"تو پھر؟"

"آؤ...... ذرا جائزہ لیتے ہیں"۔ اور اس کے بعد ہم اپنے کام میں مصروف ہو گئے۔

عمارت کے اردگرد کوئی آبادی، کوئی بستی نہیں تھی۔ دور دور تک کوئی انسان اِدھر اُدھر نظر نہیں آتا تھا۔ نزدیک ترین بستی جس میں ذکیہ بیگم رہتی تھیں۔ فیض پور سے تقریباً 60 کلومیٹر کے فاصلے پر تھی، اس عمارت کی صحیح تاریخ کا اندازہ نہیں ہو رہا تھا۔ جیسا کہ یہ بات معلوم ہوئی تھی کہ یہ عمارت ذکیہ کے بزرگوں کی تھی، لیکن پھر بھی اس کے بارے میں اور بھی تھوڑی بہت معلومات ملنی چاہئے تھیں۔ کوئی ایسی عمر رسیدہ شخصیت جو یہاں بہت پہلے سے رہتی ہو۔ اس سے معلومات حاصل ہوں تو کچھ کام بن جائے۔

شمشیر نے دوپہر کا کھانا تیار کر دیا۔ میں نے اور ناصر فرازی نے اپنے ہی کمرے میں کھانا کھایا اور اس کے بعد میں نے ناصر فرازی سے کہا۔

"کیا خیال ہے دوست، ہمت کرنی چاہئے"۔

"کک...... کیسی ہمت؟" ناصر فرازی نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

"یار کمال ہے...... اس سے پہلے تو میں نے تمہیں اتنا بزدل نہیں دیکھا"۔

"بس یوں سمجھ لو کہ ان حالات سے نہ جانے کیوں میری طبیعت کچھ الجھی الجھی سی ہے"۔

"آؤ ذرا اس کمرے کی چھت پر دیکھتے ہیں...... میں نے تمہیں چمنی کے بارے میں بتایا تھا ناں"۔

"ہاں"...... "تو پھر آؤ......" اور اس کے بعد ہم نے کمرے کی چھت پر جانے کا راستہ تلاش کیا۔ راستہ نہیں ملا، البتہ ایک سیڑھی دستیاب ہو گئی جس کو لگا کر ہم کمرے کی چھت پر پہنچ گئے اور اس کے بعد خوب اچھی طرح دور دور تک اس پوری عمارت کی چھتوں پر دیکھا، لیکن وہاں کوئی ایسی بات نظر نہیں آئی۔ اوپر پہنچنے کے بعد میں نے چمنی کے اندر جھانکا۔ کچھ پتہ نہیں

چلا تھا کہ یہ آواز کدھر سے آتی ہے۔

اگر یہ آواز کسی مشین کی ہے تو وہ مشین آخر کہاں چھپائی جا سکتی ہے۔ سلاخ سے خون کا نکل آنا ایسی کوئی مشکل بات نہیں تھی۔ کوئی بھی شعبدہ باز ایسی چیزیں تیار کر سکتا ہے۔ زمین کے نیچے کوئی ایسی چیز دبائی گئی ہو جس سے خون ابل پڑے لیکن بہرحال یہ تمام احساسات کچے تھے اور ان کے بارے میں زیادہ اعتماد کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا، میں نے ناصر فرازی سے کہا۔

"کیا کہتے ہو اس بارے میں؟"

"میں تو بس دیکھ رہا ہوں...... مجھے تو یوں لگ رہا ہے جیسے کوئی بہت ہی اچھا ماہر جاسوس روحوں کی نگرانی کر رہا ہو اور پُراسرار آدمیوں کے خلاف کام کر رہا ہو۔ ویسے یار، ایک بات کہو...... کاروبار کتنا اچھا ہے...... تم نے سڑکوں پر بڑے بڑے بورڈ لگے دیکھے ہوں گے۔ لوگ باقاعدہ کاروبار کرتے ہیں، حالانکہ ہمیں کاروبار کی ضرورت نہیں لیکن پھر بھی ایک دلچسپ مشغلہ تو ہو سکتا ہے۔ یہ روحانی جاسوسی کے بارے میں کیا خیال ہے تمہارا؟" میں ہنس پڑا۔

ناصر فرازی اگر مجھے جمیل سمجھتا ہے تو سمجھتا رہے، اس روپ میں کیا برا ہے بلکہ مجھے تو صرف ان حالات کے بارے میں اندازہ لگانا ہے۔

اسماعیل عباسی نے مجھے خاموش دیکھ کر کہا۔

"کیوں کیا بات ہے، کیا ہوا؟"

"نہیں، واقعی میں تمہاری تجویز پر غور کر رہا ہوں۔ کیا تم یقین کرو گے جمیل کہ میں نے کتنی بار اس انداز میں سوچا"۔

"کس انداز میں؟"

"یہی کہ اگر ہم یعنی میں ایسا کوئی کاروبار شروع کروں، اصل میں بس ایک خرابی ہے۔ بے شمار دھوکے بازوں نے یہ کاروبار شروع کر دیا ہے اور لوگوں کی مجبوریوں سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں۔ ہم بالکل ایسا نہیں کریں گے، بلکہ کوشش کریں گے کہ مختلف لوگوں کے کام آئیں۔ ان کے سنگین حالات معلوم کر کے ان کی مدد کریں۔ کیسا رہے گا یہ سب کچھ"۔

"میرے خیال میں خاصا اچھا"۔

"ملاؤ گے ہاتھ"۔

"بشرطیکہ بچ کر یہاں سے واپس جاسکیں"۔

"ارے واہ اس کا کیا سوال ہے...... اچھا یہ بتاؤ، خیر چھوڑو"۔ اچانک ہی وہ خاموش ہوگیا۔ میں اسے دیکھتا رہا پھر میں نے کہا۔ "کچھ پوچھ رہے تھے؟"

"نہیں، یہ سب بعد کی باتیں ہیں۔ واقعی بعد میں ہم اس موضوع پر بات کریں گے"۔

"ٹھیک ہے، میں ایک بات اور سوچ رہا ہوں"۔

"کیا؟" اس نے سوال کیا۔

"یہاں ہمیں کوئی ٹیپ ریکارڈر مل سکے گا؟"

"ٹیپ ریکارڈر"۔

"ہاں...... میں اس کمرے میں ہونے والی آوازیں ریکارڈ کرنا چاہتا ہوں"۔

"میرا خیال ہے، اسماعیل آسانی سے ٹیپ ریکارڈر فراہم کردے گا"۔

"ٹھیک ہے، ایسا ہی کرتے ہیں"۔ اور اس کے بعد ہم نے اپنا یہ سلسلہ ترک کر دیا اور آرام کرتے رہے۔ شام کو 4 بجے کے قریب اسماعیل اور اس کا بھائی واپس آگئے۔ اسماعیل بہت خوش نظر آرہا تھا۔

"دوستو! میں ایک بہت بڑا کارنامہ سرانجام دے کر آیا ہوں"۔

"وہ کیا؟"

"میں نے ذکیہ کو مطمئن کر دیا ہے اور کہا ہے کہ میں بہت جلد اس آسیب زدہ مکان کی مرمت شروع کرادوں گا۔ میں نے آسیب زدہ مکان کی روحوں پر قابو پالیا ہے۔ میں نے اسے بتایا کہ یہ روحیں وغیرہ کچھ نہیں بلکہ کچھ ایسے وہم پیدا ہوگئے ہیں جن کی بناء پر اس مکان کو آسیب زدہ سمجھ لیا گیا ہے۔ میں سارا کام ٹھیک کروں گا"۔

"ویری گڈ"۔

"ویسے آپ کو طلب کیوں کیا گیا تھا؟"

"اصل میں ذکیہ بیچاری بری طرح تنہائی کا شکار ہے۔ وہ چاہتی ہے کہ ہم دونوں جلد شادی کرلیں، تاکہ اس کے بعد حالات پُرسکون ہوجائیں۔ میں نے بھی اس بات کا وعدہ کرلیا ہے...... کہ ذکیہ خاتون سے شادی کے بعد آپ اسی مکان میں رہیں گے؟"

"ہاں کیوں نہیں"۔

"لیکن آپ نے یہ وعدہ زیادہ جلد بازی میں نہیں کرلیا؟"

"دیکھ لیں گے، شادی تو ہوجائے۔ اگر ہم اس مکان میں گزر بسر نہ کرکے تو کہیں اور بندوبست کرلیں گے۔ ویسے نہ جانے کیوں مجھے اس بات کا یقین ہوگیا ہے کہ آپ ضرور ان آوازوں پر قابو پالیں گے۔ میں سمجھتا ہوں کہ بس یہی وہ آوازیں ہیں جو ہمیں خوفزدہ کرتی ہیں۔ ورنہ باقی تو اور کوئی بات نہیں ہے، ہم کوشش کر رہے ہیں کہ آوازوں کا سراغ لگالیں...... ویسے آپ سے کچھ چیزوں کی ضرورت ہوگی، مثلاً ٹیپ ریکارڈر"۔

"ٹیپ ریکارڈر؟"

"ہاں"۔

"اتفاق کی بات ہے کہ ٹیپ ریکارڈر تمام لوازمات کے ساتھ میرے سامان میں موجود ہے، اصل میں مَیں موسیقی کا شوقین ہوں اور کچھ خاص قسم کی چیزیں اپنے ساتھ رکھتا ہوں، لیکن کیا کروں، یہاں تو صورت حال ہی کچھ ایسی پیش آگئی ہے کہ میں یہ سب کچھ نہیں کرسکا۔ میں ٹیپ ریکارڈر آپ کو فراہم کردوں گا"۔

"آپ مجھے دے دیجئے......" اور اس نے اپنے سامان میں سے وہ قیمتی ٹیپ ریکارڈر نکال کر مجھے دے دیا۔ یہ بہت چھوٹا تھا اور اس کے کیسٹ بھی بہت چھوٹے تھے۔ یہ دراصل نئی چیز تھی، اتنی طاقتور کہ بجلی کے بغیر بھی بیٹری سے چلا کر دور دور کی ریکارڈنگ کی جاسکتی تھی۔ اب اس کے بعد ہمیں رات کا انتظار تھا اور ہم یہ سوچ رہے تھے کہ کب یہ آوازیں پیدا ہوتی ہیں۔

رات کے تقریباً 11 بجے کا وقت تھا، کمرے سے رونے کی ہلکی ہلکی آوازیں اٹھیں۔ پھر آہستہ آہستہ آوازیں بلند ہوتی چلی گئیں...... ہم نے فوراً ٹیپ ریکارڈر آن کرلیا۔ ٹارچیں روشن کیں اور کمرے کی طرف دبے پاؤں چل دیئے۔ وہاں پہنچتے ہی رونے کی آوازیں لرزہ خیز چیخوں میں تبدیل ہوگئیں جو اس گہرے سناٹے میں دور دور تک سنی جاسکتی تھیں، البتہ یہ بات میرے علم میں آگئی تھی کہ یہ آوازیں کتنی ہی تیز کیوں نہ ہوں، انہیں عمارت کے اندر رہنے والے ہی سن سکتے ہیں اور اس کے باہر یہ آوازیں کوئی بھی نہیں سن سکتا تھا، چاہے وہ عمارت کی دیوار کے بالکل پاس ہی کیوں نہ ہو"۔

ٹیپ ریکارڈر آن کر دیا گیا...... اس کے ایک ڈائل سے سبز روشنی تھرتھرا رہی تھی، اس کا مطلب ہے کہ آواز ریکارڈ ہورہی ہے۔ کافی دیر تک یہ آوازیں ابھرتی رہیں اور ہم انہیں ریکارڈ

کرتے رہے۔ پھر آوازیں اچانک بند ہوگئیں اور اعصاب شکن سناٹا فضا میں پھیل گیا۔ لمحے تک ہم سوچتے رہے، پھر میں نے سب کو واپسی کا اشارہ کیا اور اس کے بعد ہم اس کمرے میں پہنچ گئے جو اسماعیل عباسی کا کمرہ تھا۔ ٹیپ ریکارڈر بیٹری سے چل رہا تھا اور فٹ حالت میں تھا، چنانچہ ٹیپ کو ریوائنڈ کیا گیا اور اس کے بعد ہم نے اس کو آن کیا انتہائی صورت حال سامنے آگئی۔ ٹیپ ریکارڈر میں کوئی آواز نہیں اُبھری تھی...... سب لو کے چہرے دھواں ہوگئے۔

نذیر عباسی نے کہا...... ''ممکن ہے ٹیپ ریکارڈر خراب ہو؟''

''نہیں یہ ممکن نہیں ہے''۔ میں نے جواب دیا۔

''کیوں؟''

''وہ سبز روشنی جو اس بات کی علامت ہوتی ہے کہ آواز ریکارڈ ہورہی ہے، چل تھی''۔

''تو پھر کوئی آواز ریکارڈ کیوں نہیں ہوئی؟''

''سمجھ میں نہیں آتا۔ ایک منٹ تجربہ کرکے دیکھ لیا جائے''۔ اسماعیل عباسی بولا۔

''وہ کیسے؟''

''ٹیپ ریکارڈر آن کرو...... ہم لوگ جو باتیں کررہے ہیں وہ ریکارڈ ہونی چاہئیں''۔ بات پر عمل کیا گیا اور ہم لوگ یونہی الٹی سیدھی باتیں کرنے لگے...... کیسٹ کو ریوائنڈ کر دیکھا گیا تو ہماری آوازیں بالکل واضح ریکارڈ ہوئی تھیں اور صورتِ حال بالکل سمجھ میں آرہی تھی، لیکن اس کیفیت کا سب سے زیادہ اثر اسماعیل عباسی پر ہوا، اس کا چہرہ سرخ اور اس نے کہا۔

''میں نے سنا ہے کہ بدروحوں کے نہ تو سائے ہوتے ہیں اور نہ ہی ان کی آواز ر کی جاسکتی ہے''۔

''میرے خدا...... اس کا مطلب ہے کہ...... اُف...... یہ تو واقعی آخری بات ہے بھی اگر ہم یہ سوچیں کہ یہاں ایسا کوئی عمل نہیں ہے تو واقعی حماقت ہے''۔ اس کے بدن تھرتھراہٹ پیدا ہوگئی۔ آواز بھنچنے لگی۔ میں نے ناصر فرازی کو چونک کر دیکھا تو وہ تھرتھر رہا تھا۔

''کیا ہوا مسٹر اسماعیل عباسی؟''

''اب...... اب...... میری ہمت جواب دے رہی ہے''۔

''نہیں مسٹر عباسی، ایسا کیسے ہوسکتا ہے''۔

''آپ خود کو سنبھالئے''۔

''میں...... میں نہیں سنبھال سکتا''۔ اس کے دانت بجنے لگے اور جسم کا سارا خون چہرے پر جمع ہونے لگا۔ آہستہ آہستہ اس پر غشی کی کیفیت طاری ہونے لگی۔ نذیر عباسی نے کہا۔

''یہ تو خطرناک علامت ہے۔ ہم انہیں یہاں سے لئے چلتے ہیں''۔

''نہیں بالکل نہیں۔ میں یہاں سے کہیں نہیں جاؤں گا''۔

''مجھے تنہا چھوڑ دو...... پلیز پلیز میں تنہا رہنا چاہتا ہوں''۔

بہرحال اس پر غشی طاری ہوتی چلی گئی اور تھوڑی دیر کے بعد اس کا سارا وجود بخار میں پھنکنے لگا، لیکن جب بھی ہم اسے یہاں سے لے جانے کی بات کرتے، وہ فوراً ہوش میں آجاتا اور شدت سے اس کی مخالفت کرتا۔ صبح کی روشنی نمودار ہوئی اور اسماعیل عباسی جاگ گیا۔ وہ لوہے کے ٹکڑے کی طرح تپ رہا تھا اور ہم اس کے متعلق تشویش کا شکار تھے۔ نذیر عباسی نے کہا۔

''میرا خیال ہے، ہم بھائی جان کی بات نہیں مانتے، انہیں اسپتال لے جانا ضروری ہے''۔

''میں نے تم سے ایک بار کہہ دیا کہ میں اسپتال نہیں جاؤں گا، البتہ جو کچھ میں کہہ رہا ہوں، اسے غور سے سنو،'' اسماعیل عباسی بولا۔ ''ہاں بتاؤ''۔

''تم اسے بلالاؤ، ذکیہ بیگم کو یہاں بلالاؤ...... میں جو کچھ کہہ رہا ہوں، اس پر عمل کرنا اگر تم نے اس کے برعکس کیا تو اچھا نہیں ہوگا''۔

''ٹھیک ہے، میں چلا جاتا ہوں۔ کہیں عجیب سی کیفیت نہ ہوجائے اس کی''۔

''میں چلا جاتا ہوں، ویسے بھی ذکیہ کو اطلاع دینا ضروری ہے کیونکہ وہ میری ہونے والی بھابی ہے''۔

''ہوسکتا ہے اسماعیل عباسی ذکیہ کی بات پر یہاں سے جانے کے لئے تیار ہوجائے...... تم لوگ ذرا اس کا خیال رکھنا''۔

''ٹھیک ہے میں خیال رکھوں گا''۔ شمشیر کو ہم نے اسماعیل عباسی کے پاس چھوڑ دیا اور میں ناصر فرازی کو لے کر اس کمرے سے باہر نکل آیا۔

"اب کیا کہتے ہو؟" میں نے سوال کیا۔

"ایک بات کا تم یقین کرو یا نہ کرو، میں تو بڑی سنسنی کا شکار ہوگیا ہوں"۔

"ڈر رہے ہو؟"

"دیکھو بلاوجہ بہادر بننے کی کوشش نہیں کروں گا۔ خوف تو انسانی فطرت کا ایک حصہ ہے کیا تمہیں حالات بہت زیادہ سنگین نظر نہیں آرہے؟"

"میں بھی یہی کہنے کے لئے تمہیں کمرے سے باہر لایا ہوں"۔

"کیا مطلب؟" ناصر فرازی نے سوال کیا۔

"اسماعیل عباسی کی کیفیت بالکل بہتر نہیں ہے۔ مجھے تو کچھ عجیب سا احساس ہو رہا ہے...... کیسا احساس؟"

"خوفزدہ تو نہیں ہو جاؤ گے"۔

"نہیں بالکل نہیں......"

"مجھے تو لگ رہا ہے جیسے اسماعیل عباسی اپنی اصل آواز میں نہیں بول رہا ہے"۔

"اصل آواز میں...... تو تمہارا مطلب ہے کہ"۔

"میں نے کہا نا کہ ڈرو گے نہیں اور تمہارا ہکلانا اس بات کی علامت ہے کہ تم ڈر رہے ہو"۔

"نہیں ڈر تو نہیں رہا ہوں، لیکن اب کیا ہوگا؟"

"دیکھو کیا ہونے والا ہے؟"

اس کے بعد ہم نے خود ہی ناشتے وغیرہ کی چیزیں تلاش کیں اور اپنا اپنا پیٹ بھرلیا۔ چائے اور کچھ سلائس ہم نے شمشیر کو بھی دیئے، اس نے ہمارا شکریہ ادا کیا۔ اسماعیل عباسی گہری نیند سو رہا تھا اور اس کا تھرتھراتا ہوا جسم اب ساکت ہوگیا تھا، میں بھی رات بھر جاگا ہوا تھا میں نے ناصر فرازی سے کہا"۔ کیا سونا چاہتے ہو؟"

"یقین کرو شدید نیند محسوس کر رہا ہوں...... میرا بدن کچھ ایسا لگ رہا ہے، جیسے بخار آ ہے نا، بخار کی سی کیفیت ہو رہی ہے"۔

"شمشیر تم یہاں موجود ہو"۔

"جی صاحب...... آپ بے فکر ہو کر سو جائیں، میں یہاں موجود ہوں"۔ شمشیر نے ہمت سے جواب دیا۔

ہم دونوں واپس آگئے۔ اپنے کمرے میں پہنچنے کے بعد ہم بستر پر لیٹ گئے۔ ناصر فرازی نے کچھ دیر کے بعد کہا......

"جمیل، سو رہے ہو تم؟"

"ہاں شاید سو جاؤں"۔

"کیا خیال ہے، ہم ان حالات سے نمٹ سکتے ہیں؟"

"جناب، تھوڑا سا وقت گزرا ہے...... آپ نے ایک ایسا ادارہ قائم کرنے کی بات کی ہے جہاں آپ لوگوں کی روحانی مشکلات دور کریں۔ سمجھ رہے ہیں نا، آپ اور روحانی مشکلات دور کرنے کے لئے بڑی مار کھانی پڑتی ہے۔ بڑے خطرناک حالات سے گزرنا پڑتا ہے۔ ہمیں تو وظیفے وغیرہ بھی نہیں آتے، جس سے لوگ جنات پر قابو پالیتے ہیں"۔

"ہاں آتے تو نہیں، لیکن تھوڑی بہت کوشش کی جاسکتی ہے"۔

"یہ آسیب زدہ مکان ہے...... میرا خیال ہے تھوڑا سا انتظار کرلیا جائے۔ ہر راز کا ایک پہلو ہوتا ہے اور کھل کر سامنے آتا ہے"۔

"پتہ نہیں کیا حال ہے اس کا؟...... چلیں دیکھ لیتے ہیں"۔

ہم دونوں باہر نکلے تو ہم نے محسوس کیا کہ آسیب زدہ مکان میں تھوڑی سی رونق ہے۔ شمشیر چائے کی ٹرے لئے ہوئے جا رہا تھا اور اسماعیل عباسی کے کمرے سے نذیر عباسی باہر آرہا تھا...... ہمیں دیکھ کر وہ مسکراتا ہوا ہمارے قریب پہنچ گیا۔

"کہو، آسیبوں کے ساتھ کیسی گزر رہی ہے؟"

"ٹھیک ہوں، تم بتاؤ ذکیہ بیگم کی کیا صورتِ حال رہی"۔

"بے موت ماری گئی بیچاری"۔ نذیر عباسی نے ہنس کر کہا اور ہم دونوں چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگے۔

"مطلب؟"

"بڑے دل گردے کا کام ہے۔ عشق تو کرلیا لیکن عشق کو نبھانا اصل مسئلہ ہے۔ ذکیہ بیگم جس کیفیت میں یہاں آئی ہے، اس سے دو ہی باتیں ظاہر ہوتی ہیں، یا تو عشق کامل ہوگیا یا بھاڑ میں جائے لیلیٰ والی بات ہوگی اور ذکیہ بیگم یہاں سے بھاگ جائیں گی"۔ میں اور ناصر فرازی ہنس پڑے۔

نذیر کا کہنا کچھ اس طرح تھا کہ خود بخود ہنسی آجائے، تاہم میں نے تفصیل پوچھی تو

نے کہا۔

"ذکیہ بیگم کسی قیمت پر اس آسیب زدہ مکان میں آنے کے لئے تیار نہیں تھیں
جب انہیں بتایا گیا کہ اسماعیل کی حالت بہت خراب ہے تو وہ سوچ میں ڈوب گئیں
فیصلہ کررہی تھیں کہ زندگی زیادہ قیمتی چیز ہے یا عشق؟ لیکن دنیاداری بھی کوئی چیز ہوتی ہے
ہیں"۔

"اوہو، کہاں ہیں؟"

"اندر ہیں۔ ویسے فیض پور کے ایک قابل حکیم کو بھی لایا ہوں۔ حکیم صاحب کے بار
میں بڑی بڑی باتیں سنی ہیں۔ بڑا لطیفہ ہوا، اصل میں حکیم صاحب ذکیہ خاتون کے معتر
ہیں۔ نیاز مند ہیں بلکہ لگتا ہے کہ ان کی وجہ سے ان کی روزی روٹی چل رہی ہے۔ بڑی
سے یہاں آنے پر آمادہ ہوئے ہیں"۔

"کہاں ہیں؟"

"اندر"!

"اور ذکیہ خاتون؟"

"وہ بھی اندر ہیں اور اسماعیل صاحب کی تیمارداری کی جارہی ہے۔ ابھی میں نے
اندر بھجوائی ہے"۔

"ہاں میں نے شمشیر کو اندر جاتے ہوئے دیکھا ہے"۔

پھر نذیر، فرازی اور میں بہت دیر تک باتیں کرتے رہے اور پھر تھوڑی دیر کے بعد
اندر چل پڑے۔ میں نے پہلی بار ذکیہ خاتون کو دیکھا۔ پختہ عمر کی مالک لیکن بہت ہی
عورت تھیں اور جب پہلی بار ان سے تعارف ہوا تو انہوں نے گردن خم کرکے ہمیں سلام
اسماعیل عباسی اس کے آنے کی وجہ سے شاید خاصی بہتر کیفیت کا حامل ہوگیا تھا۔

"ذکیہ بیگم کے آجانے کے بعد ویسے بھی آپ کو ٹھیک ہوجانا چاہئے"۔ ہم نے مسکر
ہوئے کہا اور اسماعیل بھی مسکرانے لگا، پھر بولا۔

"میں اس بات سے انکار نہیں کروں گا، ایسا ہے۔ ویسے ذکیہ خاتون، آپ یہاں
کریں گی یا جانا چاہتی ہیں؟"

"نہیں، میں تو اسماعیل سے کہہ رہی تھی کہ یہاں سے چلیں۔ لعنت بھیجیں اس منحوس
عمارت پر، ہم یہاں نہیں رہیں گے"۔

"ایسا نہ کہو...... اب جبکہ تم نے مجھے بتادیا ہے کہ یہ تمہاری خاندانی عمارت ہے تو پھر
میرے لئے بھی ضروری ہوگیا ہے کہ میں اس سے محبت کروں، ہم ایسے یہاں سے نہیں جائیں
گے"۔

"مگر میں تمہیں اس عالم میں چھوڑ کر جانا بھی نہیں چاہتی"۔

"البتہ اگر آپ لوگوں کو زحمت نہ ہو تو مجھے آپ ضرور واپس بھجوادیجئے" اس بار حکیم
صاحب نے کہا۔

"حکیم صاحب، آپ کا بے حد شکریہ۔ واقعی آپ کو جانا چاہئے"۔

"کیوں! ذکیہ رہیں گی میرے ساتھ؟"

"ہاں میں اس طرح نہیں جاؤں گی"۔ ذکیہ بیگم نے کہا۔

"تو ٹھیک ہے...... نذیر حکیم صاحب کو چھوڑ آئیں گے"۔

میری نگاہیں ان بزرگ حکیم کو دیکھ رہی تھیں۔ لمبی سفید داڑھی، عمر 75 سے 80 کے
درمیان ہوگی۔ یہ بات میرے اور فرازی کے درمیان طے پائی تھی کہ ہمیں اگر آس پاس کی
بستی کا کوئی بزرگ مل گیا تو ہم اس سے اس عمارت کے بارے میں معلومات حاصل کریں
گے۔ اس وقت حکیم صاحب کو دیکھ کر یہ خیال ذہن میں جاگا تھا۔ غالباً ناصر فرازی نے بھی
بالکل اسی انداز میں سوچا تھا، کیونکہ ہم دونوں نے ایک دوسرے کی سمت دیکھا۔ اچانک ہی
ناصر فرازی بول اٹھا۔

"ذکیہ بیگم، آپ یہاں کیسے تشریف لائی ہیں؟"

"میرے پاس اپنی لینڈ کروزر ہے"۔

"اگر حکیم صاحب کو چھوڑنے جانا پڑا تو اس کا طریقہ کار کیا ہوگا؟"

لینڈ کروزر میں چلے جائیں گے"۔

"تو پھر ٹھیک ہے۔ ہم ایسا کرتے ہیں کہ حکیم صاحب کو فیض پور چھوڑ دیں گے۔ ہماری
بھی آؤٹنگ ہوجائے گی"۔

"کوئی حرج نہیں ہے"۔ اسماعیل عباسی نے کہا۔

حکیم صاحب جلدی سے اپنی دوائیوں کا تھیلا لے کر کھڑے ہو گئے تھے۔ ان کے ا
میں جلدی بازی تھی۔ باہر نکل کر وہ لینڈ کروزر میں بیٹھ گئے۔ ناصر فرازی بھی ساتھ بیٹھ گیا۔ ناصر فرازی نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔ لینڈ کروزر اسٹارٹ ہو کر عمارت سے باہر آ
حکیم صاحب نے کہا۔

"خدا کا شکر ہے، انسان کسی بھی عمر میں مرنا نہیں چاہتا۔ مجھے تو یوں لگ رہا تھا جیسے م
مقتل کی طرف لے جایا جا رہا تھا۔ مقتل سے نکل آنا کتنا بڑا کام ہے۔ بڑی منحوس عمارت تھی
اللہ کی پناہ"۔ حکیم صاحب نے خود ہی میرے مطلب کی بات شروع کر دی۔ میں نے ان سے کہا۔

"قبلہ حکیم صاحب، کیا واقعی یہ منحوس عمارت ہے؟"

"میاں ایسی ویسی، وہ تو بس کیا بتاؤں تمہیں کہ کیسے پھنس گیا"۔

"لیکن آپ اس عمارت کے بارے میں ایسی بات کیسے کہہ سکتے ہیں؟"

جواب میں حکیم صاحب نے مجھے چونک کر دیکھا اور پھر بولے۔ "کہیں باہر سے آئے ہو؟"

"جی یہی سمجھ لیجئے"۔

"اور سیدھے اس عمارت میں آئے ہو؟"

"یہ بھی بالکل ٹھیک ہے"۔

"آپ تو اس عمارت کے بارے میں کافی جانتے ہوں گے، قبلہ حکیم صاحب؟"

"تم نہیں جانتے؟"

"ہاں کیوں نہیں، لیکن اتنا نہیں جانتے ہوں گے جتنا آپ جانتے ہیں"۔

"میری عمر کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟"

"بس کچھ نہیں کہہ سکتے، ویسے ماشاء اللہ صحت مند ہیں"۔

"ویسے، میری عمر 80 سال کے لگ بھگ ہو چکی ہے"۔

"بڑی بات ہے، بہت بڑی بات ہے، اب بھی آپ"۔

"ہاں بس نظر نہ لگاؤ۔ ویسے اس عمارت کے بارے میں جب سے میں نے ہوش سنبھا
ہے ایک بات ضرور سنتا آ رہا ہوں"۔

"کیا یہاں ہر سال کسی نہ کسی انسان کا خون ہوتا رہا ہے؟"

"تم نے اس عمارت میں کبھی کسی خاص کمرے سے اٹھتی ہوئی آوازیں نہیں سنیں؟ یہ محسوس نہیں کیا تم نے جیسے کوئی آگ میں جل رہا ہو اور جلنے والے کے حلق سے چیخیں نکل رہی ہوں۔ اگر تم نے یہاں ایک رات بھی گزاری ہے تو سمجھ لو کہ تم نے سازوں کی آوازیں بھی سنی ہوں گی۔ طویل عرصے سے اس عمارت میں رہنے والی روح کسی سے انتقام لینے کے لئے بے قرار ہے"۔

ہماری پوری توجہ حکیم صاحب کی طرف ہو گئی تھی۔ ایک انوکھا انکشاف، ایک حیران کن داستان شاید ہمارا انتظار کر رہی تھی اور ہمارے چہرے سرد ہوتے جا رہے تھے۔ ہم بس حکیم صاحب کے ہونٹوں سے نکلنے والی آواز کے منتظر تھے۔ حکیم صاحب جو یقینی طور پر اس عمارت کے بارے میں کسی انتہائی سنسنی خیز کہانی کا انکشاف کرنے والے تھے۔ اسٹیرنگ پر ناصر فرازی کا ہاتھ بہکا تو میں نے اسے سنبھالتے ہوئے کہا۔

"ناصر فرازی! اپنی تمام تر توجہ ڈرائیونگ پر رکھو"۔ حکیم صاحب خیالات میں ڈوب گئے تھے۔ غالباً وہ اس عمارت سے متعلق مشہور کہانی کے واقعات اپنے ذہن میں تازہ کر رہے تھے۔ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد انہوں نے کہا۔

"یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے کہ اس عمارت میں ہر سال کسی نہ کسی کی زندگی کم ہو جاتی ہے۔ تم نے اس کے مشرقی حصے سے اٹھتی ہوئی آوازیں شاید سنی ہوں۔ غور کرو گے تو تمہیں اندازہ ہو جائے گا، جیسے کوئی آگ میں جل رہا ہو۔ اس کے حلق سے چیخیں نکل رہی ہوں۔ میں نے تم سے سازوں کی آوازوں کا بھی تذکرہ کیا تھا اور اب بھی میں تم سے یہی بات کہہ رہا ہوں کہ نہ جانے کتنے عرصے سے اس کی روح انتقام لینے کے لئے بے قرار ہے۔ یہی کہا تھا میں نے تم سے؟

"جی حکیم صاحب، لیکن وہ روح کس کی ہے؟"

"اس کا نام امیر خرم بتایا جاتا ہے۔ یہ عمارت ایک بہت بڑے رئیس نے خریدی تھی اور س کا پورا خاندان یہاں آباد تھا۔ شاید یہ بات بھی تمہارے علم میں ہو یا نہ ہو کہ وہ رئیس ذکیہ بیگم کے بزرگوں میں سے ایک تھا، اس عمارت میں مقیم ایک نوجوان ملازم نے عمارت میں رہنے والی رئیس زادی سے محبت کی تھی، لیکن وہ ملازم تھا اور اس کی محبوبہ رئیس زادی...... دونوں

ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے اور وہی پرانی کہانی، رئیس کو اس بات کا علم ہوگیا۔
ملازم کے لئے آقا زادی کی محبت کا جو نتیجہ ہوسکتا تھا وہی ہوا۔ رئیس نے اس نوجوان ملاز
عمارت کے اس مشرقی حصے میں قید کردیا اور اس پر مظالم کی انتہا کر ڈالی۔ لوہے کی سلاخیں
کرکے اس کا جسم داغا گیا۔ اس کی آنکھیں نکالی گئیں۔ ایک دن اسے آتش دان کے
لٹکا کر آگ میں جلادیا گیا۔ اس دردناک کہانی کا پہلو یہ ہے کہ رئیس زادی نے اپنے باپ
سامنے جھوٹ بولتے ہوئے نوجوان لڑکے پر الزام لگایا کہ وہ زبردستی اسے ملاقات پر مجبور
ہے۔ یہ بات رئیس زادی نے محبت کرنے والے اس نوجوان کے سامنے کہی تھی اور جب
آگ میں جلایا جارہا تھا تو اس نے چیخ چیخ کر کہا تھا۔

"وہ اس خاندان سے انتقام لے گا اور اس وقت تک اس کی روح کو چین نہیں آ
جب تک اس خاندان کا ایک فرد بھی اس زمین پر باقی رہے گا"۔

حکیم صاحب کی سنائی ہوئی داستان نے دل لرزا دیا تھا اور ہم لوگ اس داستان
میں کھوئے ہوئے تھے۔ وہ ہولناک چیخیں اور آتش دان میں نظر آنے والا خون سارا
اس کہانی سے مطابقت رکھتی ہوئی معلوم ہوتی تھیں۔ پھر جب فیض پور پہنچے تو خاصا وقت
چکا تھا۔ حکیم صاحب نے بہت اصرار کرکے ہمیں کچھ کھانے پینے کے لئے کہا اور بہرحال
اترنا پڑا۔

کافی دیر تک ہم ان سے معلومات حاصل کرتے رہے اور یہ معلومات انتہائی مفید
لیکن پھر ایک عجیب واقعہ ہوا۔ واپس آنے کے لئے ہم گاڑی میں بیٹھے تو انجن اسٹارٹ
ہوا۔ آخری کوشش تک کرلی۔ فیض پور کے ایک موٹر مکینک کو بلایا گیا۔ موٹر مکینک بھی کا
تک سر مارتا رہا لیکن بہت ہی تعجب کی بات تھی کہ ہر کوشش ناکام رہی اور گاڑی اسٹارٹ
ہوئی۔ یہاں تک کہ شام اور رات ہوگئی۔ ہماری پریشانیاں عروج پر پہنچی ہوئی تھیں۔ موٹر
بھی چلا گیا تھا اور ہم پریشان سے سوچتے رہے کہ اب کیا کریں۔

حکیم صاحب نے کہا، جیسا کہ موٹر مکینک کہہ کر گیا ہے کہ وہ اپنے استاد کو لے
گا۔ انتظار کرلو۔ صبح کو کچھ بھی ہوگا دیکھ لیں گے...... رات کو یہیں آرام کرلو۔

"وہ ٹھیک ہے حکیم صاحب، لیکن بہرحال مجبوری ہے جا بھی تو نہیں سکتے"۔

"فکر کی کوئی بات نہیں...... تمہارا دوست جس نے مکان خر ... صرف خو

ہے اور کوئی بات نہیں ہے...... ویسے عجیب بات ہے کہ آخر اس نے یہ مکان خریدا کیوں
ہے...... کیا چاہتا ہے وہ؟"

"بے وقوف آدمی ہے...... بس یہ سمجھ لیجئے کہ ذکیہ بیگم سے شادی کرنا چاہتا ہے اور چند
لوگوں نے اسے بھگا دیا ہے"۔

"کیا ذکیہ بیگم؟" اچانک ہی حکیم صاحب شور مچانے کے انداز میں بولے۔

"ہاں"۔

"اوہ تو کیا وہ خدا کی پناہ...... خدا کی پناہ...... دیکھو، اب مجبوری ہے...... کوئی انتظام کرو،
اور فوراً بھاگو...... سال بھی پورا ہو رہا ہے۔ کہیں تمہارے دوست اور اس لڑکی کی زندگی خطرے
میں نہ پڑ جائے۔ میری مراد ذکیہ خاتون سے ہے۔ وہ کبھی اس عمارت کی طرف نہیں جاتیں۔
شاید یہی وجہ ہے کہ وہ نوجوان، میرا مطلب ہے وہ شخص بیمار ہوگیا ہے۔ اس کا محبوب ہے، اس
کی وجہ سے وہ وہاں گئی ہے، لیکن میں یہ بتائے دیتا ہوں کہ اس کی زندگی سخت خطرے میں
ہے۔ روح کے انتقام لینے کا وقت آگیا ہے۔ جلدی کوشش کرو۔

❀❀❀❀

ہم دونوں واقعی بدحواس ہوگئے تھے۔ بڑی مشکل سے ہم باہر نکلے اور پریشانی کے انداز
میں اِدھر اُدھر دیکھنے لگے۔ حکیم صاحب کی سمجھ میں خود نہیں آرہا تھا کہ کیا کریں؟ لیکن بہرحال
کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی تھا۔ حکیم صاحب وہاں سے یہ کہہ کر چلے گئے کہ وہ دیکھتے ہیں، ہوسکتا ہے
دو گھوڑوں کا انتظام ہوجائے۔

میں گاڑی کے اسٹیرنگ پر بیٹھا۔ اس بدبخت گاڑی نے پتہ نہیں کیوں دھوکہ دیا تھا لیکن
اس وقت میری حیرت کی انتہا نہ رہی، جب یوں ہی بے یقینی کے انداز میں، میں نے سلف
گھمایا اور گاڑی ایک دم اسٹارٹ ہوگئی۔ ناصر فرازی بھی چونک پڑا۔ اس کے بعد ہم نے حکیم
صاحب کی واپسی کا انتظار نہیں کیا اور گاڑی کو برق رفتاری سے عمارت کی طرف دوڑایا۔

رات سرد اور تاریک تھی، ابھی بمشکل آدھا راستہ ہی طے کیا تھا کہ آسمان پر بادل گرجنے
لگے اور تیز کڑک کے ساتھ بجلی چمکنے لگی۔ میں نے اسٹیرنگ سنبھالا ہوا تھا۔ بالکل اجنبی جگہ تھی،
راستوں سے واقفیت نہیں تھی اور ویسے بھی صرف ایک یادداشت کی بنا پر گاڑی دوڑا رہا تھا۔ ہر
لمحے یہی خطرہ تھا کہ گاڑی کہیں کسی گڑھے میں نہ گر جائے۔ تھوڑی دیر کے بعد موسلا دھار بارش

بھی شروع ہوگئی۔ ایک طوفانِ عظیم تھا جو اچانک ہی نمودار ہوا تھا اور اس کا شور لحہ بہ لحہ جارہا تھا۔ بجلی کڑکتی تو یوں محسوس ہوتا کہ جیسے ہم پر گری لیکن بہرحال گاڑی ساتھ دے رہی تھی۔ بارش تھوڑی سی ہلکی ہوئی اور دوسرے ہی لمحے ناصر فرازی کی آواز ابھری۔

''شاید ہم راستہ بھول گئے ہیں''۔

''کیا مطلب؟''

''میرا خیال ہے کہ اتنی دیر میں ہمیں آسیب زدہ مکان تک پہنچ جانا چاہئے تھا۔ ویسے رات کی تاریکی میں راستے کا صحیح تعین کرنا مشکل تھا''۔

''یہ تو بڑی گڑبڑ ہوگئی، اب کیا کریں؟''

''کچھ نہیں راستہ تلاش کرنا پڑے گا''۔

آسمان پر بادل بدستور رکے ہوئے تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ بارش ہلکی ہوگئی تھی، لیکن پھر بھی اس بات کا خوف تھا کہ بارش دوبارہ شروع ہوسکتی ہے۔ ہم اندازے کی بنا پر گاڑی کو اِدھر اُدھر دوڑاتے رہے۔ پھوار اب بالکل بند ہوگئی تھی اور سفید بادلوں میں چھپا چاند حیرت سے گردوپیش کا منظر تک رہا تھا۔ اچانک ہی ہمیں دور سے عمارت کی سیاہ دیواریں نظر آئیں اور دل کی دھڑکنیں تیز ہوگئیں۔ ناصر فرازی نے بھی میرے ساتھ ساتھ اس عمارت کو دیکھا اور اس کی آواز ابھری۔ ''خدا کا شکر ہے۔ یار عمارت نظر آگئی''۔

نہ جانے کیوں ہمارا دل بری طرح دھڑک رہا تھا اور ہم دھڑکتے دل کے ساتھ عمارت کی طرف جارہے تھے۔ نہ جانے کیوں دل میں ایک عجیب احساس پھیلا ہوا تھا۔

ہم خاصی تیز رفتاری سے گاڑی عمارت کے اندر لے گئے اور پھر اسے کھڑی کرکے دیوانوں کی طرح اندرونی عمارت کی طرف بھاگے...... عمارت معمول سے کچھ زیادہ بھیانک اور سوگوار منظر پیش کررہی تھی۔ یک لخت ایک لرزہ خیز دھماکہ سنائی دیا اور پھر انسانی چیخیں بلند ہوئیں جن میں بہت سی ملی جلی آوازیں بھی تھیں۔ ہمارے بدن سن ہوگئے اور وہیں ساکت ہوگئے۔ لگ رہا تھا جیسے پاؤں زمین نے پکڑ لئے ہوں۔ عمارت کے مشرقی حصے سے چیخوں اور قہقہوں کی آوازیں مسلسل بلند ہورہی تھیں۔ پھر دفعتاً اس طرف سے آگ کے شعلے ابل پڑے اور آگ اس طرح آناً فاناً پھیلی کہ یقین نہ آئے۔ ہم لوگ بری طرح وہاں سے بھاگے اور باہر نکل آئے۔

قرب و جوار میں کوئی آبادی نہیں تھی، اس لئے کسی کو آگ کا پتہ نہیں چلا۔ پھر اندر ہی کوئی کارروائی ہوئی اور آگ بجھ گئی ہے۔ ہمارے سارے وجود ساکت ہورہے تھے اور سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ ہم کیا کریں؟ جب آگ بالکل سرد ہوگئی اور شعلے بالکل ختم ہوگئے تو اچانک ہی بارش دوبارہ شروع ہوگئی۔ ہم بری طرح بدحواس تھے۔ بارش سے بچنے کے لئے ہم اندر کی طرف بھاگے۔ اندر گوشت جلنے کی بدبو پھیلی ہوئی تھی اور ایک انتہائی ہولناک ماحول نظر آرہا تھا۔ ناصر فرازی نے کہا۔

''پتہ نہیں، ان لوگوں کا کیا حشر ہوا تم گوشت جلنے کی بو سونگھ رہے ہو؟''

''ہاں''۔

''آؤ دیکھیں......'' کچھ ہی لمحوں بعد ہم اندر داخل ہوگئے اور مختلف راستوں سے گزرتے ہوئے اس کمرے میں پہنچ گئے۔ کمرے کا دروازہ جل کر خاکستر ہوگیا تھا۔ اس وقت ہم ہمت کا مظاہرہ کررہے تھے، جس کی مثال آسانی سے نہیں مل سکتی۔ اندر داخل ہوکر ہم نے جو کچھ دیکھا وہ ناقابلِ یقین تھا۔ آتش دان کے اوپر ایک جلی ہوئی انسانی لاش لٹک رہی تھی، اس کی گردن میں موٹے رسے کا پھندا پڑا ہوا تھا اور آتش دان کے دائیں جانب ذکیہ خاتون زنجیروں میں بندھی پڑی تھیں۔ اس کی کھوپڑی کے کئی حصے ہوچکے تھے اور سارا جسم خون میں لت پت تھا

ناصر فرازی پر سکتہ طاری ہوگیا تھا۔ یہ دہشت ناک منظر دیکھ کر انسانی دل و دماغ پر قابو پانا ایک مشکل کام تھا، لیکن بہرحال میں چونکہ مرشد کے اشاروں پر ایسے بہت سے مرحلوں سے گزر چکا تھا، ناصر فرازی کی نسبت میرے اعصاب بہت زیادہ مضبوط تھے، چنانچہ میں نے اس کا ہاتھ پکڑا اور عمارت سے باہر نکلا۔ میں نے گاڑی کے پاس جاکر کہا۔

''فرازی جو سنگین حادثہ ہوچکا ہے، تم کیا سمجھتے ہو وہ معمولی نوعیت کا ہے۔ اگر کسی کو علم ہوگیا کہ ہم یہاں موجود تھے اور ان واقعات کے بارے میں اچھی طرح جانتے ہیں تو ایسی گردن پھنسے گی کہ نکالنا مشکل ہوجائے گا۔ حکیم صاحب بھی گواہی دیں گے کہ ہم ان لوگوں کے ساتھ تھے، ہم نہیں جانتے کہ اسماعیل عباسی اور نذیر عباسی کا کیا حشر ہوا۔ آتش دان پر لٹکی ہوئی لاش کس کی تھی، لیکن ہمیں اس سے زیادہ جاننا بھی نہیں چاہئے جتنی جلدی ممکن ہو خاموشی سے یہاں سے نکل جائیں''۔

بات ناصر فرازی کی سمجھ میں آگئی تھی۔ اس کے بعد آبادی سے باہر نکلنے میں ذکیہ بیگم کی

گاڑی نے ہمیں مدد دی لیکن یہ آبادی فیض پور نہیں تھی، بلکہ رات کے اس حصے میں جب
یہاں پہنچے تو ہمیں یہ علم نہیں ہوسکا کہ یہ کون سی آبادی ہے؟ لیکن شکر کی بات یہ تھی کہ ر
ریلوے لائن نظر آرہی تھی۔ چھوٹا سا ریلوے اسٹیشن تلاش کرنا بھی مشکل کام ثابت نہیں ہو
پھر یہاں جو ٹرین آکر رکی، اس کے بارے میں بھی ہمیں کچھ معلوم نہیں تھا، کہاں جائے گی
کہاں جارہی ہے۔ بس اس میں بیٹھ کر چل پڑے تھے۔

اور یہاں بھی اتفاق ہی تھا کہ صحیح سمت کا تعین ہوگیا تھا کہ ٹرین کا آخری اسٹاپ وہی
تھا جہاں میرا قیام تھا۔ ناصر فرازی اس دوران ایک اچھا دوست، ایک اچھا ساتھی ثابت ہ
تھا۔ ویسے بھی مکمل تنہائی دل کو ناگوار گزرتی تھی۔ رقم کے حصول کا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ مرشد
اس سلسلے میں مجھے بہت کچھ سکھایا تھا۔ میں نے سوچا کہ ناصر فرازی کو اپنے ساتھ ہی رکھوں
اگر وہ مجھے جمیل سمجھتا ہے تو جمیل ہی سہی۔ میرا کوئی نقصان تو نہیں ہوتا۔ یہاں اترنے کے ب
میں ناصر فرازی کو لے کر اپنی رہائش گاہ پر پہنچا، اس نے میری اس شاندار رہائش گاہ کو دیکھ
حیرت سے کہا۔

''اس کا مطلب ہے، تم نے ایک بہترین مقام حاصل کرلیا ہے۔ میں تو یہ ہی سمجھ رہا
کہ ویسے کے ویسے ہی ہو گے تمہارا ہی گھر ہے ناں''۔

''اپنا ہی کہو''۔

''بڑی خوشی ہوئی یار، کم از کم تم نے تھوڑی بہت ترقی کی، ہم تو بس وہی کے وہی رہے''۔

ناصر فرازی یہاں آکر بہت خوش تھا۔ میں بھی ایک اچھے دوست کے ساتھ مطمئن تھا
ہم لوگ ان پُراسرار اور ہولناک واقعات کے بارے میں اکثر گفتگو کرتے رہتے تھے۔ ناصر
فرازی نے کہا۔

''ویسے ایک بات حقیقت ہے جمیل، ہر چیز کا ایک نشہ ہوتا ہے۔ ہم لوگ جسے شعبے
منسلک ہوگئے ہیں، عام لوگ اس کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتے۔ کون اپنی جان مصیب
میں پھنساتا ہے۔ اصل میں جو لوگ عالم ہوتے ہیں اور ان کا تعلق اہل علم سے ہوتا ہے، ان کی
بات تو بالکل مختلف ہوتی ہے۔ بڑے بڑے علوم کا سہارا لے کر وہ ہر طرح کے کام کرلیا کرتے
ہیں لیکن ہم کس کھیت کی مولی ہیں، البتہ اس کے باوجود دل میں جو جذبے پیدا ہوتے رہتے
ہیں، ان سے تمہیں انکار ہوا ہے، کبھی اور نہ مجھے۔ یہی وجہ تھی کہ ہم بے چارے اسماعیل عبا

کے چکر میں پڑ گئے...... ویسے میں نے تم سے ایک بات کہی تھی''۔

''ہاں، مجھے یاد ہے۔ تم نے کہا تھا کہ کوئی ایسا ادارہ قائم کیا جائے جس میں پراسرار
واقعات میں پھنسے لوگوں کی مدد کی جائے۔ اصل میں ایسے سینکڑوں ادارے موجود ہیں۔
اخبارات میں اشتہارات چھپتے رہتے ہیں۔ تقدیر بدلنے کے شرطیہ دعوے کئے جاتے ہیں، جادو
کا توڑ اور جادو کا کرنا سب ہی کام ہوتے ہیں، لیکن ہمارا کام مختلف ہوگا۔ کوئی ایسا ذریعہ نہیں
ہے ناصر جس سے ہم یہ ظاہر کرسکیں کہ ہم مختلف لوگ ہیں، مختلف نہ سہی، کوشش تو کی جاسکتی ہے''۔

''تم ہر کوشش کرلو، یوں سمجھ لو میں ہر مرحلے پر تمہارا ساتھی ہوں''۔

''تو پھر ٹھیک ہے، ایک بات کہہ دوں دوست، برا مت ماننا''۔

''اس سے پہلے میں ایک بات تم سے بھی کہہ دوں، ہم اپنے کاموں کا کوئی معاوضہ
طلب نہیں کریں گے۔ ہاں اگر کہیں سے خود بخود مل جائے تو ظاہر ہے حاتم طائی بھی نہیں ہیں،
ہم اور یہاں تک اس ادارے کو قائم کرنے کے لئے اخراجات کا معاملہ ہے، وہ مکمل طور پر تمہاری
ذمہ داری ہے''۔

''تمہاری تمام ضروریات اور اخراجات ہر طرح سے میں اٹھاؤں گا''۔

اور ناصر فرازی مسکرادیا تھا۔ وہ آدمی بڑے کام کا تھا اور جو فیصلہ اس نے کیا تھا اس سے
مجھے بھی اتفاق تھا، چنانچہ میں خاموشی سے انتظار کرتا رہا۔ پھر ایک سجے سجائے دفتر میں ناصر
فرازی نے لے جاکر مجھے کھڑا کیا، تو میں حیران رہ گیا۔ کیا خوبصورت دفتر اور کیا ہی شاندار
ڈیکوریشن تھی اس کی، البتہ باہر ابھی کوئی بورڈ نہیں تھا لیکن یہ بورڈ بھی لگ گیا۔ اس پر ایک
جملہ لکھا تھا۔

''ہر مشکل کا علاج ممکن ہے، ہم ان پریشانیوں کا علاج کرتے ہیں جن کا علاج ڈاکٹر
نہیں کرسکتے''۔

اور لوگوں نے ہمارے پاس آنا جانا شروع کردیا۔ ان میں سے زیادہ تر افراد ایسے ہوتے
تھے جو یہ معلوم کرنا چاہتے تھے کہ کون سی پریشانیاں ایسی ہیں جن کا ہم علاج کریں گے۔
بڑے بڑے دلچسپ واقعات پیش آتے تھے اور ہم ان تجربات میں بڑے خوش تھے۔

ایک صاحب آئے...... بڑے تیکھے نقوش کے مالک تھے، کہنے لگے، ایک پریشانی ہے۔
کیا آپ کے پاس اس کا کوئی حل مل سکے گا؟

"ہاں، کیوں نہیں فرمائیے"۔

کہنے لگے۔ "ڈیڑھ سال سے بے روزگار ہوں...... نوکری نہیں ملتی۔ گھر میں فاقوں نوبت آ گئی ہے بتائیے کیا کروں؟"

"نوکری کر لیجئے"۔ میں نے جواب دیا۔

اور وہ مجھے گھورنے لگے پھر بولے۔ "آپ کے پاس اسی لئے آیا ہوں۔ بتائیے نوکری کیسے تلاش کروں؟"

"ہاں یہ بات سوچنے کی ہے۔ کیسی نوکری تلاش کرنی ہے، آپ کے لئے؟"

"بس کلرکی"۔

"تو ٹھیک ہے، آپ کو نوکری مل گئی"۔

"کیا نام ہے آپ کا؟"

"حمید اللہ"۔

"ٹھیک ہے حمید اللہ صاحب! یہ ایک مہینے کی تنخواہ ایڈوانس لے جائیے اور کل سے دفتر آ جائیے۔ یہ دفتر سنبھالنا ہے آپ کو"۔

چنانچہ تیسری شخصیت بھی ہمارے ساتھ شامل ہو گئی۔ لوگ اپنی مشکلات کا حل مانگنے آتے تھے۔ ہم نے اس دوران سڑکوں پر بیٹھنے والے ان نجومیوں اور کالے جادو کے ماہروں کا گہرا سروے کیا تھا جن کے بڑے بڑے اشتہارات اخبارات میں شائع ہوتے تھے۔ پیٹ بھرنے کے بہت سے دھندے نکال رکھے تھے، ان لوگوں نے۔ ابتداء ہی میں کسی پریشان حال سے کچھ نہ کچھ رقم اینٹھ لیا کرتے تھے۔ چھوٹے چھوٹے شعبدے دکھا کر لوگوں کے ذہنوں کو اپنی طرف راغب کرتے تھے اور پھر ان کی مشکل کا حل تلاش کرتے تھے۔

پھر ایک دن ایک اچھی شکل وصورت کا شخص ہمارے پاس آیا، اچھا خوش شکل نوجوان تھا لیکن چہرے کی لکیروں میں فکرمندی کے آثار تھے۔ کہنے لگا۔

"میرا نام اختر حسن ہے، ویسے تو بہت سے مسئلوں میں الجھ چکا ہوں۔ آپ کا بورڈ ذرا مختلف نظر آیا تو میں نے سوچا کہ آپ سے بھی رجوع کر لوں"۔

"کہئے مسٹر اختر...... آپ بیٹھئے براہ کرم، کیا بات ہے کیا پریشانی ہے آپ کو؟" ناصر فرازی نے سوال کیا۔

"پہلے یہ بتائیے کہ اگر میں کسی جادو کے زیر اثر ہوں تو کیا اس سلسلے میں آپ میری مدد کر سکتے ہیں؟"

"کوشش کی جا سکتی ہے، اگر آپ پسند کریں گے تو؟"

"لیکن نہ تو آپ میں سے کوئی جادوگر یا نجومی نظر آتا ہے نہ ہی آپ نے مجھے یہ بتایا ہے کہ میری مشکل کا حل تلاش کرنے والی اصل شخصیت کون سی ہے؟"

"آپ غالباً کسی کھوپڑی اور دو انسانی ہڈیوں کا تصور لے کر یہاں داخل ہوئے ہوں گے یا کم از کم آپ کے ذہن میں جادو ٹونے سے متعلق کسی ایسی شخصیت کا ایسا ہی تصور ابھرتا ہوگا۔ بس یہی گڑبڑ ہے، اختر صاحب، ہم میں سے کوئی ایسا نہیں جو آپ کی اس حس کی تسکین کر سکے"۔

"بہرحال آپ جو کوئی بھی ہیں، آپ سے تذکرہ کرنا تو بڑا ضروری ہے، بس یہ سمجھ لیجئے کہ ایک ہنستی بولتی زندگی میں بڑی مشکل پیش آ گئی ہے۔ میں کنسٹرکشن کا کام کرتا ہوں۔ عمارتیں وغیرہ بناتا ہوں، ہمارے ایک جاننے والے ہیں۔ بڑی پرانی شناسائی ہے۔ بس یوں سمجھ لیجئے، اللہ نے پیٹ بھی بھر دیا ہے اور تجوری بھی۔ ایک باغ خریدا تھا انہوں نے اسی علاقے میں جہاں سے تھوڑے فاصلے پر وہ رہتے ہیں۔ بڑا پرانا باغ پڑا ہوا تھا۔ میرے ان کرم فرماؤں کو وہاں فارم ہاؤس بنانے کی سوجھی۔ ایک عمارت، ٹیوب ویل اور ایک طویل رقبے میں احاطہ بنانے کا ارادہ کیا۔ انہوں نے اور اس کا ٹھیکہ مجھے دے دیا۔ میں نے ان سے ایڈوانس رقم لے لی اور اس کے بعد اس علاقے میں کام شروع کر دیا، لیکن یہ بات مجھے بعد میں معلوم ہوئی کہ وہ باغ آسیب زدہ ہے۔ میں نے اس بات کو ذہن میں رکھا، ایڈوانس لے چکا تھا۔ خرچ بھی کر چکا تھا۔ درمیانے درجے کا آدمی ہوں۔ اس لئے ایڈوانس واپس بھی نہیں کر سکتا تھا اور پھر سچی بات یہ کہ ایسے معاملات سے بھی کبھی واسطہ نہیں پڑا تھا، باغ کا کٹوانا ضروری تھا اور ویسے بھی بہت پرانا باغ تھا، دیکھنے ہی سے اندازہ ہوتا تھا جیسے منحوس ہے۔ سارے درخت سوکھے پڑے تھے۔ کوئی دیکھ بھال کرنے والا نہیں تھا۔ مالی بھی نہیں، قرب و جوار کی آبادی کے لوگ بتاتے تھے کہ باغ آسیب زدہ ہے۔ درختوں پر پھل نہیں آتے اور اس کا مالک بھی اس سے جان چھڑانا چاہتا تھا۔ زمانہ قدیم میں تقسیم سے پہلے یہ کسی ہندو کی ملکیت تھا۔ بہرطور میں نے ان تمام باتوں کو مزدوروں سے چھپایا اور درختوں کی کٹائی کا کام شروع کروا دیا۔ دن رات درخت کاٹے جا رہے تھے اور بہت بڑا رقبہ صاف ہو چکا تھا، لیکن اس کے

بعد مصیبتوں کا آغاز ہوگیا۔ ایک بہت پرانا درخت تھا وہاں، بستی کے آس پاس کے لوگ
کہنا تھا کہ اصل میں یہی درخت آسیب زدہ ہے، پھر کچھ ایسے آثار نمودار ہوئے جن سے
شبہ ہونے لگا کہ لوگوں کا کہنا غلط نہیں ہے۔ میں نے درخت کی کٹائی شروع کردی۔ اس
دوپہر کا وقت تھا، مزدور جڑیں کھود رہے تھے کہ درخت کی جڑ میں انہیں ایک عجیب وغریب
صندوق ملا۔ پتھر کا صندوق تھا جو عموماً نہیں ہوتے۔ مزدوروں نے اس پر کدالیں مارنا شروع
کردیں اور اس صندوق کا ڈھکن کھل گیا۔ مجھے اطلاع ملی تو میں فوراً ہی اس طرف پہنچ گیا۔

بے شمار بار ایسی ہی کھدائیاں کراتے ہوئے میرے دل میں یہ خیال آیا تھا کہ کہیں
کوئی خزانہ وغیرہ مل جائے تو زندگی بن جائے۔ اس وقت بھی جب مجھے معلوم ہوا کہ درخت
جڑ سے ایک صندوق ملا ہے تو میں دوڑتا ہوا وہاں پہنچ گیا اور مزدوروں کو ہٹا کر میں نے
چوکور گڑھے میں جھانکا کسی خاص درخت کے پتے بچھے ہوئے تھے، جن میں خاص بات یہ
کہ وہ تروتازہ تھے، حالانکہ وہ درخت پرانا اور سوکھا ہوا تھا مگر وہ پتے بالکل ہرے تھے اور ان
پتوں میں پتھر کی ایک مورتی لپٹی ہوئی تھی۔ میں نے اس پتھر کے مجسمے کو غور سے دیکھا۔

ہندوؤں کے دیوی دیوتاؤں کے بہت سے بت دیکھے تھے، لیکن یہ مجسمہ ان میں سے
نہیں تھا۔ ایک عجیب سی شکل تھی اس کی، میں نے وہ مورتی صندوق سے نکال لی اور مزدوروں
سے خوب گہرا گڑھا کھدوالیا، اس لالچ میں کہ شاید یہ کسی خزانے کی نشانی ہو مگر وہاں کچھ نہیں
مجھے بڑی مایوسی ہوئی۔ بہرحال مزدوروں نے وہ درخت بھی گرادیا تھا، میں نے وہ مورتی اس
پتھر کے صندوق سے نکال کر اپنے پاس محفوظ کرلی تھی۔ سوچا تھا کہ شاید تقدیر کے ستارے
میں آگئے ہیں اور کوئی خزانہ میرا منتظر ہے لیکن کچھ بھی نہیں ملا تھا۔

شام کو گھر چل پڑا۔ درخت کا واقعہ دوسرے کاموں کی وجہ سے بھول گیا، البتہ گاڑی
اترا تو پتھر کا مجسمہ نظر آگیا، اسے اٹھا لایا اور اپنی خواب گاہ کے کارنس پر رکھ دیا۔ میں دو بچوں
باپ ہوں، بیوی کا نام ثناء ہے۔ بہت اچھی ہے میری بیوی۔ جس قدر تعریف کروں اس کی
ہے۔ ہم لوگوں نے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھایا۔ بچوں سے باتیں کیں، بیٹی بڑی ہے اور بیٹا چھوٹا
ہے۔ یہ دونوں دوسرے کمرے میں ہوتے ہیں۔ رات کو ہم دونوں میاں بیوی معمول کے
مطابق اپنے کمرے میں سوگئے۔ یہ وہی کمرہ تھا جس میں مورتی یا مجسمہ رکھا ہوا تھا۔

اس وقت رات کے تقریباً ڈھائی بجے تھے جس وقت دھماکہ سا ہوا۔ اس کے ساتھ ہی

کی خوفناک چیخ سنائی دی۔ میں اچھل پڑا، کمرے میں مدھم روشنی جل رہی تھی اور ثناء فرش پر پڑی
ہوئی تھی۔ میں نے مسہری سے چھلانگ لگائی اور اس کے قریب پہنچ گیا۔ وہ پسینے میں ڈوبی ہوئی
تھی۔ اس کی آنکھیں دہشت سے پھٹی تھیں، لیکن وہ ہوش میں تھی اور بار بار انگلی سے کارنس کی
طرف اشارہ کررہی تھی۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ بڑی مشکل سے میں نے اسے اٹھا کر مسہری
پر لٹایا۔ پانی پلایا، دلاسے دیئے تو اس کی کیفیت بحال ہوگئی اور پھر اس کے بعد اس نے جو
تفصیل بتائی، اس سے میرے ہوش وحواس گم ہوگئے۔ اس نے بتایا کہ وہ واش روم گئی تھی۔ باہر
نکلی تو اس نے کارنس پر کوئی چیز گردش کرتی دیکھی، وہ سمجھی کوئی چوہا اوپر چڑھ گیا ہے، مگر جب
اس نے غور سے دیکھا تو وہ مجسمہ ہل رہا تھا جسے میں اس صندوق سے نکال کر لایا تھا۔

دیکھتے ہی دیکھتے وہ مجسمہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ پھر اس کے پتلے پتلے پاؤں نیچے لٹکے اور اتنے
لمبے ہوگئے کہ زمین سے لگ گئے۔ اس نے گھور کر ثناء کو دیکھا اور پھر اتر کر کھڑا ہوگیا۔ اس
کے بعد اس نے دروازہ کھولا اور باہر نکل گیا۔ ثناء دہشت سے چیخ کر بھاگی اور اپنے لباس
میں الجھ کر گر پڑی۔ میں ثناء کے اس بیان کو خوف سمجھتا، خواب سمجھتا لیکن اس بات کا میں کیا
کرتا کہ جب میں نے کارنس کی جانب نگاہیں دوڑائیں تو مجسمہ غائب پایا اور دروازہ کھلا ہوا۔

بات اصل میں یہ ہے کہ انسان اپنے آپ کو کچھ بھی سمجھ لے خوف و دہشت تو فطرت کا
ایک حصہ ہے، جناب! میں یہ اعتراف کرتے ہوئے شرم محسوس نہیں کرتا کہ خود میرا بھی دم نکل
گیا تھا۔ ایسے واقعات سے کبھی براہِ راست واسطہ نہیں پڑا، لیکن دوسروں سے قصے بہت سنے
تھے۔ میری خود ہمت نہیں ہوسکی کہ کھلے دروازے سے باہر جا کر دیکھنا۔

ثناء نے جو کچھ بتایا تھا وہ مجھے اپنی آنکھوں کے سامنے محسوس ہورہا تھا اور ثبوت کے طور
پر کارنس سے مورتی غائب تھی۔ بہرحال گھر کا مرد تھا۔ بیوی خوف کا شکار تھی، اسے سہارا دینا
ضروری تھا، وہ بری طرح ڈری ہوئی تھی اور مجھ سے اس مجسمے کے بارے میں طرح طرح کے
سوالات کررہی تھی۔ ہم رات بھر نہیں ہوسکے اور مجسمہ اپنی جگہ واپس نہیں آیا تھا۔ میری سمجھ میں
نہیں آرہا تھا کہ ثناء کو کس طرح تسلی دوں۔ صبح کو جب میں تیار ہونے لگا تو اس نے کہا۔

”تم چلے جاؤ گے اختر! اور میں خوف سے مرتی رہوں گی“۔

میں نے پریشانی سے کہا۔

”بڑے ضروری کام ہیں۔ ثناء تم ہمت رکھو...... وہ جو کچھ بھی تھا اب تو یہاں نہیں ہے۔

خوف بے کار ہے، اب وہ واپس نہیں آئے گا''۔

''بچے اسکول چلے جائیں گے اور میں تنہا رہوں گی''۔

ثناء دہشت بھرے لہجے میں بولی اور میں اسے بڑی مشکل سے سمجھاتا رہا لیکن حقیقت ہے کہ میں خود بھی سخت پریشان تھا۔ بہرحال میں اسے سمجھا بجھا کر سائٹ پر چل پڑا۔ سائٹ پہنچا تو وہاں دوسری مصیبت انتظار کر رہی تھی۔ مزدوروں نے کام شروع نہیں کیا تھا، بلکہ وہ سے کچھ فاصلے پر بیٹھے میرا انتظار کر رہے تھے، حالانکہ وہ عام حالات میں کام شروع کر تھے۔ جیسے ہی میں وہاں پہنچا تو سب میرے گرد جمع ہو گئے۔

''ہم یہاں کام نہیں کریں گے، ٹھیکیدار...... یہ بھوت باغ ہے۔ ہمارا ایک آدمی زخمی ہو ہے''۔

''کیسے؟'' میں نے حیرت سے پوچھا اور مزدور مجھے تفصیل بتانے لگے۔ یہاں کام کر والے مزدوروں نے اپنے لئے ایک گوشے میں آرام کی جگہ بنا رکھی تھی۔ پہلے کسی نے ا مزدور کو اٹھا کر زمین پر پٹخ دیا اور اس مزدور کو کافی چوٹ لگی، لیکن اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ ایسا کس نے کیا؟ ابھی دوسرے مزدور اس پر حیرت کر رہے تھے کہ ایک اور مزدور کھڑا ہو گیا اس نے اپنا لباس اتار پھینکا اور بھیانک آواز میں چیخ چیخ کر گانا شروع کر دیا۔ وہ ناچ بھی تھا۔ مجھے ایک مزدور نے کہا۔

''ٹھیکیدار جی! میں اپنے بچوں کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ جھوٹ نہیں بول رہا۔ مزدور زبان کوئی آٹھ انچ باہر نکلی ہوئی تھی اور اس کی آنکھیں تیز روشنی دے رہی تھیں کہ اس روشنی آس پاس دیکھا جا سکتا تھا۔ وہ ناچتا رہا اور ہم سب لوگ وہاں سے بھاگ پڑے، جبکہ وہ کھڑا رہا۔ صبح کو وہ زخمی حالت میں واپس آ گیا۔ اس کی حالت خراب تھی۔ اس نے کہا یہاں کام بند کر دو ورنہ سب مارے جاؤ گے۔ ٹھیکیدار جی، ہم یہاں کام نہیں کریں گے حساب کر دو''۔

میں نے مزدوروں کو بہت سمجھایا۔ ان سے کہا کہ بے شک وہ کچھ دن کے لئے کام کر دیں اور بعد میں یہ کام شروع کر دیں، مگر وہ رکے نہیں اور اس طرح کام بند ہو گیا انتہائی قیمتی سامان وہاں پڑا ہوا تھا۔ بہت بڑی رقم خرچ کی تھی، میں نے اور میں پریشان ہو گیا۔ پھر میں نے سوچا کہ شہر سے اور مزدور لے آؤں گا۔ کام تو کرانا ہی ہے

ے بن پڑا، وہ میں نے کیا اور پھر اپنی بیوی کے خیال سے واپس چل پڑا۔

بہرحال میں تو دونوں طرف سے پریشان ہو گیا تھا۔ اپنے دل کی دھڑکنوں پر قابو پا کر گھر میں داخل ہوا۔ یہ اچانک جو مصیبت مجھ پر نازل ہوئی تھی، میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں اس سے کیسے نمٹوں لیکن اللہ کا شکر تھا کہ ثناء پُرسکون تھی۔ بچوں کے بارے میں، میں نے پوچھا تو اس نے بتایا کہ اسکول سے آنے کے بعد کھانا کھا کر سو گئے ہیں۔

''تو تم بالکل ٹھیک ہو نا ثناء؟''

''ہاں......'' وہ آہستہ سے بولی۔

''کھانا پکایا ہے؟''

''ہاں''۔ اس نے کہا اور میں چونک کر اسے دیکھنے لگا۔

ثناء کے بولنے کا یہ انداز نہیں تھا۔ وہ اس وقت کچھ عجیب سے انداز میں بول رہی تھی۔ میں آپ کو بتاؤں، جناب ہمارے درمیان بہت محبت ہے۔ ہم ایک دوسرے سے اتنی واقفیت رکھتے ہیں، جتنی میاں بیوی کو رکھنی چاہئے۔ اس نے خلاف معمول میری اتنی جلدی واپسی کے بارے میں بھی نہیں پوچھا تھا۔ اس کی کیفیت میں ایک ٹھہرا ٹھہرا پن تھا، جسے میں بہت عجیب عجیب نگاہوں سے دیکھنے لگا۔ وہ کھانا لینے چلی گئی تھی۔ پھر وہ ٹرے لے کر اندر داخل ہو گئی۔ ٹرے سینٹر ٹیبل پر رکھی، واپس مڑی اور دروازہ بند کر دیا۔ یہ بھی سمجھ میں آنے والا عمل نہیں تھا۔ میں نے گردن جھٹکی۔ بھوک لگ رہی تھی۔ سالن کے رقاب سے ڈھکن اٹھایا تو حلق سے بے اختیار چیخ نکل گئی۔ بھری رقاب میں شوربہ بھرا ہوا تھا اور اس میں لمبے لمبے عجیب ساخت کے کیڑے تیر رہے تھے۔ میں نے بے اختیار رقاب اٹھا کر دور پھینک دی اور پھر دہشت زدہ انداز میں ثناء کو دیکھا لیکن اس کی صورت دیکھ کر میرا سانس بند ہو گیا۔ صاحب کیا بتاؤں، وہ سیدھی کھڑی ہوئی تھی اور اس کے دانت بھی ایک ایک انچ لمبے ہو گئے تھے۔ آنکھوں کا رنگ گہرا سرخ تھا اور ان میں پتلیاں نہیں تھیں۔ سر کے بال اس طرح ایک دوسرے سے لہرا رہے تھے، جیسے سانپ کلبلا رہے ہوں۔

اس کی یہ ہیبت ناک صورت دیکھ کر میرا رواں رواں کانپ اٹھا تھا۔ اعصاب بے جان ہو گئے تھے۔ اُٹھ کر بھاگنے کی کوشش کی، لیکن ہاتھ پاؤں نے ساتھ نہیں دیا۔ بولنا چاہا لیکن آواز نہیں نکلی۔ بس میری دہشت بھری نگاہیں اسے دیکھ رہی تھیں اور وہ اپنی سرخ آنکھوں سے

مجھے دیکھ رہی تھی۔ پھر اس کے چہرے کا زاویہ بدلا اور اس نے زمین پر کلبلاتے ہوئے کیڑوں کو دیکھا۔ آگے بڑھ کر ان کے قریب گئی، الٹی ہوئی رقاب سیدھی کر کے اس نے یہ کیڑے اٹھا کر اس میں رکھنا شروع کر دیئے۔

میں سکتے کے عالم میں اسے دیکھ رہا تھا اور وہ جیسے مجھ سے بے نیاز اپنے کام میں مصروف تھی۔ سوچنے سمجھنے کی قوتیں اس وقت کمزور ہو گئی تھیں، لیکن پھر بھی سوچا کہ کیا اس نے تمام کیڑے چن کر رقاب میں رکھے اور پھر اس طرح ہاتھ ہلانے لگی جیسے نیم بے ہوشی کی سی کیفیت میں ہو۔ مجھے یوں لگا جیسے وہ اونگھ رہی ہو۔ بار بار اس کے سر کو جھٹکے لگ رہے تھے اور کچھ دیر بعد وہ فرش پر سیدھی لیٹ گئی۔ میں نے ایک لمحے میں محسوس کر لیا کہ وہ بے ہوش ہو گئی ہے۔ اس کے چہرے پر تبدیلیاں رونما ہونے لگی تھیں اور کچھ لمحوں کے بعد وہ اصلی صورت میں واپس آ گئی۔

صاحب! میرے اعصاب بھی آہستہ آہستہ سنبھلنے لگے اور میں اپنی جگہ سے ہلنے کی کوشش میں کامیاب ہو گیا۔

اسے چھوڑ کر بھاگ جانے کو دل چاہ رہا تھا، لیکن ایسا نہ کر سکا۔ آخر کار وہ میری بیوی تھی۔ میرے بچوں کی ماں تھی، میں صرف اپنی زندگی کو نہیں بچانا چاہتا تھا، وہ جس عذاب میں گرفتار ہوئی تھی اسے بھی دیکھنا تھا، چنانچہ اپنے آپ کو ہمت دلا کر میں اس کے پاس پہنچا۔ اس کی صورت بالکل ٹھیک ہو گئی تھی۔ سانس چل رہی تھی اور اس کے اطراف میں پڑے ہوئے کیڑے اب بھی کلبلا رہے تھے۔ انہیں دیکھ کر شدید گھن آ رہی تھی، لیکن میں نے انہیں نظر انداز کر دیا اور ثناء کی گردن اور پاؤں میں ہاتھ ڈال کر اسے اٹھانے کی کوشش کی۔

میں کیا بتاؤں جناب، آپ کو کہ مجھے پسینہ آ گیا، حالانکہ وہ ایک نرم و نازک جسم کی پھول جیسے وزن والی عورت تھی، لیکن اس وقت ایسا لگ رہا تھا جیسے اس کا بدن ٹھوس پتھر سے تراشا گیا ہو۔ میں اسے جنبش بھی نہیں دے پا رہا تھا اور میری دہشت انتہا کو پہنچ چکی تھی اچانک ہی ثناء کی آنکھیں کھلیں اور اس کے چہرے کے نقوش ایک دم بدل گئے، ہونٹ اوپر چڑھ گئے اور لمبے لمبے دانت باہر جھانکنے لگے۔ اس نے ایک بھیانک قہقہہ لگایا اور دونوں ہاتھ اٹھا کر مجھے دبوچنے کی کوشش کی، لیکن اس وقت میں نے ذرا ہمت سے کام لیا اور بندر کی طرح چھلانگ لگا کر دور چلا گیا اور اس کے بعد اس کمرے میں رکنا ممکن نہیں تھا کہ میں

کوئی بھی ہوتا تو وہاں نہ ٹک سکتا تھا۔ دوڑ کر بچوں کے کمرے کی طرف آیا اور دروازہ کھول کر اندر گھس گیا۔

اس کے بعد میں نے دروازہ بند کر لیا تھا۔ میرے دل کی جو کیفیت تھی، میں اسے الفاظ میں بیان نہیں کر سکتا۔ آپ ایک انسان ہونے کی حیثیت سے خود سوچیں، بیٹھے بٹھائے جو مصیبت مجھ پر آن پڑی تھی، میری جگہ کوئی بھی ہوتا اس کا دماغی توازن درست نہیں رہ سکتا تھا۔

میں اپنے بچوں کے پاس بیٹھ کر سوچنے لگا کہ اب کیا کروں؟ اس مصیبت سے کیسے چھٹکارا پاؤں؟ یہ ساری باتیں، یہ ساری کہانیاں جن بھوت اور اس قسم کے عمل...... اس بارے میں سن تو رکھا تھا، لیکن زندگی کے کسی حصے میں خود مجھ پر ایسی بپتا پڑے گی، یہ میں نے کبھی نہیں سوچا تھا، حالانکہ اس آسیب زدہ باغ کی کہانیاں میں نے سنی تھیں، لیکن انہیں تسلیم نہیں کیا تھا اور اب یہ سب کچھ میری نگاہوں کے سامنے آ گیا تھا۔ میری حالت بے پناہ خراب تھی۔ میں نے سوچا، ٹھیک ہے جہنم میں جائے جو رقم پھنس گئی ہے، وہ بھی غارت ہو جائے، مجھے اس چیز کا افسوس نہیں ہو گا لیکن میرا گھر، میری بیوی، میرے بچے کیسے اس مصیبت سے چھٹکارا حاصل کریں گے، بہر حال کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی تھا۔

بڑی مشکل سے میں نے ہمت کی۔ سوتے ہوئے بچوں کو جگایا۔ انہیں ساتھ لیا اور کمرے سے باہر نکلا لیکن جونہی میں نے کمرے سے باہر قدم رکھا، مجھے ثناء نظر آ گئی۔ میں ایک دم چونک پڑا تھا۔ میں نے اسے غور سے دیکھا۔ وہ اداس سی کھڑی تھی، لیکن اس کی کیفیت بالکل نارمل تھی۔ میں نے خوف بھری نگاہوں سے اسے دیکھا اور اس نے بھی میری طرف نگاہیں اٹھائیں، پھر اس نے بوجھل لہجے میں بچوں کے نام لے کر انہیں پکارا اور دونوں بچے اس کے پاس پہنچ گئے۔ اس نے تعجب سے میری طرف دیکھا، پھر بولی۔

''ارے آپ کب آ گئے؟''

''مم...... مم......'' میں نے بوکھلائے ہوئے لہجے میں کہا۔ اس کے پوچھنے کے انداز میں بالکل سادگی تھی۔ میں نے صورتِ حال پر غور کیا۔

اس دوران ثناء بچوں کے ساتھ میرے قریب آ گئی اور بولی۔

''خیریت تو ہے۔ رنگ پیلا پڑ رہا ہے آپ کا کیا ہو گیا تھا۔ آپ جلدی کیسے آ گئے؟''

''وہ بس تمہاری وجہ سے...... ثناء تم کہاں تھیں اور کیا کر رہی تھیں؟''

وہ کھوئے کھوئے لہجے میں بولی اور میں اسے دیکھنے لگا۔

”ہاں...... تم...... بس دوپہر کا کھانا کھایا تھا...... بچوں کو سلایا اور خود بھی اپنے کمر آ کر سوگئی تھی۔ گہری نیند آگئی۔ پھر کچھ آوازیں سنیں تو آنکھ کھل گئی۔ باہر آ کر دیکھا تو تھے“۔ اس نے جواب دیا۔

جو کچھ مجھ پر بیت چکی تھی وہ ایک الگ کہانی تھی، لیکن اگر ثناء کو اس بارے میں بتا شاید وہ خوف سے مر ہی جاتی۔ اس کا اندازہ مجھے ہوگیا تھا کہ جو کچھ اس پر بیتی تھی وہ اس علم میں بالکل نہیں ہے۔

چنانچہ میں نے خاموشی ہی مناسب سمجھی اور کہا۔

”بس تمہاری وجہ سے ذرا جلدی آگیا ہوں۔ میں نے سوچا کہ کہیں تم پریشان نہ ہو رہی ہو“ وہ خاموش ہوگئی۔ اس کے بعد وقت گزرتا رہا اور رات ہوگئی۔ بچوں کو آج ہم نے کمرے میں سلالیا تھا۔ ثناء نے اس کی وجہ پوچھی تو میں نے کہا۔

”بس یونہی...... ثناء پچھلی رات جو واقعہ پیش آیا ہے، اس سے میں بہت متاثر ہوں۔ ویسے جو کام میں کررہا تھا وہ بھی کچھ دن کے لئے رک گیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اب چند روز تک جاؤں گا ہی نہیں“۔

”آپ......“ ثناء نے تعجب بھرے لہجے میں کہا“۔ کوئی بات ہے جو آپ مجھ سے رہے ہیں“۔

”نہیں کوئی خاص بات نہیں...... رات کے واقعہ کے بارے میں سوچ سوچ کر پریشان ہو رہا ہوں۔ آخر وہ سب کیا تھا، تمہاری سمجھ میں کچھ آتا ہے؟“

میرے ان الفاظ پر ثناء خاموش ہوگئی تھی۔ دیر تک خاموش رہی، پھر اس نے کہا۔

”نہیں کوئی خاص بات نہیں ہے۔ بس دماغ کچھ گم صم سا رہا ہے۔ ایسا لگ رہا ہے بھر جیسے پورے وجود پر کوئی وجود طاری رہا ہے۔ میں خود کو سمجھ نہیں پارہی کہ کیا ہوا ہے؟“

میں ثناء کی بات سن کر خاموش ہوگیا تھا۔ لیکن دل میں ہزاروں خوف اور برے جنم لے رہے تھے۔ یہ اندازہ ہوگیا کہ مصیبت سر پر آئی ہوئی ہے اور کچھ نہیں کہا جاسکتا سے چھٹکارا کیسے حاصل ہوگا۔ ہوسکتا ہے، یہ سب کچھ خود بخود ٹھیک ہوجائے۔ بہرحال لیٹے لیٹے کروٹیں بدل رہا تھا۔ ثناء کے بارے میں بھی اندازہ لگانے کی کوشش کررہا

جاگ رہی ہے یا سو رہی ہے۔ تھوڑی دیر بعد احساس ہوا کہ ثناء سوگئی ہے۔ بچے پہلے ہی گہری نیند سو رہے تھے۔

میں انتہائی کوشش کے باوجود نہیں سوسکا تھا۔ پریشان کن خیالات ذہن میں آرہے تھے۔ ٹھیکے کا مسئلہ بھی درمیان میں تھا۔ جو وعدہ کیا تھا اس فارم ہاؤس کو مکمل کرنے کا، اس میں رکاوٹ پیدا ہوگئی تھی۔ شہر سے مزدوروں کو تلاش کرنا، یہاں تک لانا اور اس کے بعد یہ بھی ہوسکتا تھا کہ وہ بھی یہاں سے فرار ہوجائیں۔ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کروں۔ کیا ٹھیکہ کینسل کردوں، لیکن یہ بہت بڑا نقصان ہوجاتا اور بھی بہت سے ایسے معاملات تھے جو اس ٹھیکے کو کینسل کرنے کی وجہ سے پیدا ہوسکتے تھے۔ بس انہی سوچوں میں رات کی نیند غائب ہوگئی۔

اس وقت رات کے دو یا ڈھائی بجے ہوں گے، ثناء گہری نیند سو رہی تھی، لیکن اچانک ہی اٹھ کر بیٹھ گئی اور میں چونک پڑا، اس کا اس طرح اٹھنا ایسا تھا جیسے اسے کسی نے گہری نیند سے جگا کر بٹھادیا ہو۔ میں اسے کچھ کہنے ہی والا تھا کہ اس نے دونوں ہاتھ سیدھے کردیئے اور اپنی جگہ کھڑے ہوتے ہوئے مجھے دیکھا۔ جس چیز نے میری زبان بند کردی وہ اس کا چہرہ تھا جو انگارے کی طرح روشن ہوکر دہکنے لگا تھا۔ آنکھیں بند تھیں اور سر کے بال آہستہ آہستہ پھیلتے جارہے تھے۔ پھر وہ چھتری کی مانند کھڑے ہوئے اور اب یوں لگ رہا تھا جیسے باریک باریک بال سانپوں کی طرح لہرا رہے ہوں۔

وہ آہستہ آہستہ ہاتھ سیدھے کئے ہوئے دروازے کی طرف بڑھنے لگی اور پھر میرے خوف میں اس وقت مزید اضافہ ہوگیا جب میں نے دیکھا کہ وہ ہاتھ ہلائے بغیر دروازہ کھولنے میں کامیاب ہوگئی یا پھر جو دروازہ تھا، وہ اندر سے بند تھا خود بخود کھل گیا ہے۔ ثناء رات کی تاریکی میں کھلے دروازے سے باہر نکل گئی۔ میرے بدن پر تھرتھری طاری ہوگئی تھی۔ پورا جسم پسینے سے تر ہوگیا تھا۔ اعصاب پر قابو پانا مشکل ہو رہا تھا۔ دماغ خوف سے اُڑا جارہا تھا۔ جی چاہ رہا تھا کہ گہری نیند سوجاؤں تاکہ اس خوف سے نجات مل جائے، لیکن وہ بیوی تھی، میرے بچوں کی ماں، میرا مستقبل...... بڑی ہمت کرکے میں نے اٹھا اور آہستہ آہستہ دبے پاؤں دروازے کے پاس پہنچ گیا۔ جھانک کر باہر دیکھا تو ثناء آگے جارہی تھی۔ میرے مکان کا احاطہ بہت وسیع ہے اور اس کا آخری گوشہ کافی فاصلے پر ہے۔ آخری گوشے پر بھی میں نے ایک کمرہ بنا رکھا ہے، جس میں کاٹھ کباڑ بھرا رہتا ہے۔ یہ کاٹھ کباڑ عموماً کنسٹرکشن کے سامان سے تعلق

رکھتا ہے۔ ثناء کا رخ اس کمرے کی جانب تھا۔ کمرے کے بالکل قریب ہی ایک درخت کا سایہ پورے کمرے میں رہتا ہے۔ میں نے اسے درخت کی جڑ میں کچھ ٹٹولتے ہوئے د میری ہمت نہیں پڑ رہی تھی کہ میں آگے بڑھ کر اس کے بالکل قریب پہنچ جاؤں۔ احاطے کی دیوار کا سہارا لیتے ہوئے میں بالکل بلی جیسے قدموں سے چل کر اس کے اتنے پہنچ گیا کہ وہاں سے اس کی حرکات کا جائزہ لے سکوں۔ وہ اس طرح زمین کھود رہی تھی طرح بلی اپنے پنجوں سے زمین کھودتی ہے۔ گھٹنوں کے بل بیٹھی ہوئی تھی اور کچھ دیر میں نے اس کے ہاتھ میں کوئی چیز دیکھی۔ آسمان پر چاند نکلا ہوا تھا۔ ویسے بھی عمارت سامنے کے حصے میں ایک طاقتور بلب روشن رہتا تھا۔ یہ روشنی کرنا میری ہمیشہ کی عادت تھی۔ چنانچہ اس کی وجہ سے آج میں ثناء کی تمام حرکتیں دیکھ سکتا تھا اور پھر جو منظر میں دیکھا، وہ میرے دل کی حرکت بند کرنے لگا۔ میں نے اس مجسمے کو صاف پہچان لیا۔ یہ خود مصیبت بنا کر اپنے ساتھ لایا تھا۔ ہاں وہی مجسمہ تھا جو کارنس سے غائب ہوا تھا۔ ثناء اسے ایک درخت کی جڑ میں ایک اونچی جگہ رکھ دیا اور پھر تقریباً 4 فٹ پیچھے ہٹی اور گھٹنوں بل بیٹھ کر ہاتھ اس طرح سیدھے کئے جیسے کوئی کسی کی عبادت کرتا ہے اور اس کے بعد اس ایک عجیب وغریب عمل شروع کر دیا۔

اس نے ہاتھ زمین پر ٹکالئے اور خود بھی اس کے ساتھ جھکتی چلی گئی، پھر سیدھی ہوئی پیچھے کی سمت جسم کو موڑنے لگی۔ اس کے بعد اسی انداز میں اس کی رفتار تیز ہونے لگی۔ وہ سیدھے کر کے نیچے سر جھکا کر زمین سے لگاتی اور اس طرح پیچھے ہو کر اپنا سر عقب میں لگا دیتی۔ میں اسے اس عالم میں دیکھتا رہا۔ دل خون کے آنسو رو رہا تھا، لیکن آگے بڑھنے ہمت نہیں پڑ رہی تھی۔ ثناء کے اس انداز میں جنبش کرنے کی رفتار تیز ہوگئی اور پھر اتنی تیز کہ اس پر نگاہیں جمانا مشکل ہوگیا۔ میرا کلیجہ خون ہوا جا رہا تھا۔ دل ٹکڑے ٹکڑے ہو رہا تھا۔

وہ ایک نرم و نازک عورت تھی۔ اس انداز میں جنبش کرنے سے اس کی جو کیفیت ہو تھی، مجھے اس کا احساس تھا۔ وہ بہت ہی نازک طبع تھی، لیکن اس وقت جو کیفیت تھی وہ نا یقین تھی۔ میں دونوں ہاتھ دل پر رکھے اسے دیکھتا رہا اور میری آنکھوں سے آنسو نکل آئے بڑے پریشان کن حالات تھے۔ تقریباً پندرہ منٹ تک وہ یہی عمل دہراتی رہی اور اس کے آہستہ آہستہ اس کی رفتار سست ہوگئی۔ پھر میں نے اسے اس مجسمے کو اٹھا کر واپس اس کی

رکھتے ہوئے دیکھا۔ وہ اس کام سے فارغ ہو کر پلٹی تو میں اس سے پہلے ہی دوڑتا ہوا اپنے کمرے کی جانب چل پڑا۔ دل کی جو کیفیت ہو رہی تھی، اس کا حال بس خدا کو معلوم تھا۔ کسی سے کیا کہہ سکتا تھا۔ بستر پر آ کر لیٹ گیا، مگر بدن جیسے ہوا میں اُڑ رہا تھا، دماغ قابو میں نہیں تھا۔ آہ...... یہ کیا ہوگیا۔ ثناء کیسے عذاب کا شکار ہوگئی ہے۔ وہ جس کیفیت میں تھی اس سے مجھے اندازہ ہوگیا تھا کہ ایسے عالم میں وہ اپنے ہوش وحواس سے عاری ہوتی ہے۔ بہرحال دوسرے دن میں نے سنجیدگی سے غور کرنا شروع کر دیا۔ اس طرح وہ ہلاک ہو جائے گی اور میرے بچے ماں سے محروم ہو جائیں گے۔ کیا کروں، کسی سے کوئی مشورہ کروں...... واقعات چونکہ ایسے انوکھے تھے کسی کو بتاتے ہوئے بھی شرم آتی تھی۔ لوگ طرح طرح کی باتیں کرتے تھے۔ بہت کمینہ فطرت تھے، بعض لوگ یہ الزام لگانے سے بھی نہ چوکتے کہ ثناء مجھے ناپسند کرتی ہے اور اس نے یہ کھیل مجھ سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لئے شروع کیا ہے۔

کہنے والوں کی زبان کو کون روک سکتا ہے۔ بہت سے علاقوں میں، میں نے ایسے بورڈ لگے ہوئے دیکھے تھے جن میں سڑک چھاپ جادوگر جادو ٹونے کے خلاف کام کرنے کے دعوے کرتے ہیں۔ میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا۔ بہرحال مختلف لوگوں سے مجھے مختلف معلومات حاصل ہو رہی تھیں۔ ایک سنیاسی بابا سے میری ملاقات ہوئی۔ جن کا تجربہ 70 سال کا تھا اور عمر 40 سال۔ بہرحال یہ تو پتہ نہیں چل سکا کہ 40 سال کی عمر میں 70 سال کا تجربہ کیسے ہوگیا۔ اس کے لئے انہوں نے ایک تجربہ کیا اور اس تجربے نے مجھے کافی متاثر کیا۔

پھر میں نے ساری صورتِ حال سنیاسی بابا کو بتائی۔ انہوں نے حساب کتاب لگا کر بل میرے ہاتھ میں تھما دیا۔ بل کی مجھے پرواہ نہیں تھی۔ میں نے ان سے کہا کہ اگر وہ میری بیوی کو ٹھیک کر دیں اور اسے مصیبت سے نکال دیں تو میں انہیں منہ مانگی رقم دوں گا، چنانچہ سنیاسی بابا میرے ساتھ میرے گھر آ گئے۔ میں نے انہیں وہ درخت دکھایا جس کی جڑ میں وہ خوفناک مجسمہ تھا۔ سنیاسی بابا اس طرح اظہار کرنے لگے جیسے سب کچھ سمجھ گئے ہوں اور پھر انہوں نے اپنے پیسے حلال کرنے شروع کر دیئے۔ لکڑی کی ایک چھڑی سے انہوں نے درخت کے گرد ایک دائرہ قائم کیا اور مجھ سے کچھ چیزیں طلب کرنے کے بعد کہا کہ میں وہاں سے چلا جاؤں اور کمرے میں بند ہو جاؤں اور اپنی بیوی پر نظر رکھوں۔

بچوں کو اسکول بھیج دیا گیا تھا۔

میں نے ثناء کو اس بارے میں کوئی خاص بات نہیں بتائی تھی۔ بس یہ کہہ دیا تھا کہ
شناسا ہے جو کچھ عمل کرنے کے لئے آیا ہے۔ بہرحال ایک گھنٹہ، دو گھنٹے پھر ڈھائی گھنٹے
گذرگئے۔ اس کے بعد جب مجھ سے برداشت نہ ہو پایا تو میں باہر نکل آیا، لیکن جیسے ہی میں نے
قدم رکھا درخت کی طرف دیکھا تو ہوش وحواس رخصت ہوگئے۔ سنیاسی بابا بے ہوش پڑے
تھے اور ان کا پورا لباس دھجی دھجی ہو رہا تھا اور جسم کے مختلف حصوں میں خون کی لکیریں نظر آ رہی
تھیں۔ کئی جگہ نیل پڑے ہوئے تھے۔ ایک آنکھ رخسار تک کالی پڑ چکی تھی۔ میرا منہ کھلا کا کھلا
رہ گیا۔ جلدی سے پانی لے کر آیا اور سنیاسی بابا پر انڈیلنے لگا۔

میرے پیچھے پیچھے ثناء بھی آ گئی تھی۔ اس نے حیرانی سے انہیں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''ارے یہ کیا ہوگیا۔ یہ تو یوں لگ رہا ہے جیسے کسی سے لڑائی ہوئی ہے ان کی''۔

''ہاں ایسا ہی لگتا ہے''۔ میں نے گہری سانس لے کر کہا۔

''یہ آپ کے وہی دوست ہیں ناں جو آپ کے ساتھ آئے تھے؟'' ثناء نے پوچھا۔

''ہاں''۔

''مگر یہ یہاں کیا کر رہے تھے؟''۔

''خدا جانے کیا کر رہے تھے''۔

''خدا جانے کیا کہہ رہے ہیں آپ، کیا آپ کو معلوم نہیں کہ یہ یہاں درخت کے پاس
کیا کر رہے تھے؟'' ثناء بولی اور میں گہری نگاہوں سے اس کا جائزہ لینے لگا، لیکن اس کے
چہرے پر بالکل سادگی اور معصومیت تھی۔ وہ کہنے لگی۔

''آپ مجھے ایسے کیوں دیکھ رہے ہیں؟''

''سوچ رہا ہوں ثناء کہ واقعی یہ کیا ہوگیا؟ ہوش میں نہیں آ رہا۔ یہ تو......'' ثناء اور پانی لے
آئی اور بمشکل تمام ہم نے سنیاسی بابا کو تھپڑ مار کر ہوش دلایا۔ وہ اٹھے اور دہشت زدہ نگاہوں
سے اِدھر اُدھر دیکھتے رہے۔ مجھ پر نظر پڑی، پھر ثناء کو دیکھا اور اس کے بعد اس بری طرح بھاگے
کہ اپنا جوتا بھی چھوڑ گئے۔ بڑے گیٹ سے ٹکرائے تھے، گرے تھے اور پھر اٹھ کر اسی طرح
بھاگ پڑے تھے۔ ثناء پیٹ پکڑ کر ہنسنے لگی تھی۔ اس نے کہا۔

''یہ کوئی تماشا کرنے آئے تھے یہاں؟''

''پتہ نہیں''۔ میں نے گہری سانس لے کر کہا۔ مجھے یہ اندازہ ہوگیا تھا کہ سنیاسی بابا کے

ساتھ کیا سلوک ہوا ہے۔ اس نے ان کے ہوش وحواس درست کر دیئے ہیں۔ بہرحال سنیاسی
بابا بھاگ گئے۔ میں آج تک اس مشکل میں ہوں۔ اس مصیبت کو مجھ پر نازل ہوئے کافی دن
گزر گئے ہیں۔ بہت سے لوگوں سے رجوع کر چکا ہوں۔ کوئی بات سمجھ میں نہیں آتی کہ کیا
کروں، جس مصیبت میں گرفتار ہوا ہوں اسے میں جانتا ہوں، میرا دل جانتا ہے۔ باغ پر چند
لوگوں کو سامان کی نگرانی پر رکھا ہوا ہے، جو کافی قیمتی ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ کیا
کروں۔ ثناء کی وہی حالت ہے۔ راتوں کو اٹھتی ہے۔ درخت کی جڑ میں جا کر بیٹھ جاتی ہے۔
اب تو بچے بھی اس سے خوفزدہ رہنے لگے ہیں۔ مجھے خطرہ ہے کہ اگر یہ کیفیت زیادہ عرصے تک
رہی تو کہیں بچوں کو کچھ نہ ہو جائے۔ یہ قصہ ہے دوست، میں نے تم سے ایک بات بھی نہیں
چھپائی۔ صورتِ حال کی نوعیت کا آپ کو بھی اندازہ ہو چکا ہے۔ براہِ کرم سوچ سمجھ کر جواب
دیجئے کہ آپ میرے سلسلے میں کچھ کر سکیں گے یا نہیں''۔

میں نے فوراً ہی کوئی جواب نہیں دیا۔ البتہ ناصر فرازی کے چہرے پر بھی خوف کی لکیر
تھی۔ ہم لوگ بہت زیادہ بہادر نہیں بن سکتے تھے۔ میں نے البتہ اختر سے اس کے گھر کا پتہ
پوچھا اور اس نے اپنا کارڈ نکال کر میرے حوالے کر دیا، پھر بولا۔

''کیا آپ لوگ مجھے ابھی یہ بتانا پسند کریں گے کہ آپ اس سلسلے میں کیا کر سکتے ہیں؟''

''اختر صاحب! ابھی ہم کچھ نہیں بتائیں گے، لیکن بہت جلد آپ کو اس سلسلے میں تفصیل
بتا دی جائے گی۔ چاہے وہ معذرت کی شکل میں کیوں نہ ہو''۔

''ٹھیک ہے اب مجھے یہ بتائیے کہ مجھے آپ کو کیا پیش کرنا ہوگا۔ میرا مطلب ہے''۔

''اس وقت......آپ ہمارے ساتھ ایک کپ چائے پئیں......بس یہی ہمارا معاوضہ ہے''۔

''نہیں، میرا مطلب ہے''۔

''عرض کیا نہ ہم معاوضے کے لئے کام نہیں کرتے۔ کاش ہم آپ کی مشکل کو دور کر سکیں''۔

اختر بہت متاثر ہوا تھا۔ البتہ اس کے جانے کے بعد ناصر فرازی نے ہنستے ہوئے کہا۔

''وہ سوچ رہا ہوگا کہ ہم بہت اچھے کاروباری ہیں۔ اس طرح اسے دلاسہ دے کر چائے
پلا کر بعد میں اس سے کوئی بڑی رقم طلب کریں گے''۔

''اب یہ بتاؤ ناصر کیا ارادہ ہے۔ کیا کرنا ہے؟'' میں نے سوال کیا۔

''محترم جناب قبلہ جمیل صاحب! بات اصل میں یہ ہے کہ ہم میں سے کوئی بھی عالم تو

ہے نہیں لیکن ظاہر ہے کہ ہم نے یہ ادارہ کھولا ہے اور جو بورڈ ہم نے لگایا ہے، اس کی لاج رکھنی ہے۔ بے چارے اسماعیل عباسی کو تو ہم نہیں بچا سکے کیونکہ وہ ایک روح کے ہاتھوں ہوا ہے، لیکن کوششیں تو جاری رکھیں گے۔ ہونا وہی ہے جو اختر اور ثناء کی تقدیر میں لیکن بہرحال تھوڑا سا تجربہ، تھوڑا سا مشاہدہ بڑی کارآمد چیز ہوتی ہے۔ یہ تو کر کے جائے"۔

"گویا تم اس بات سے اتفاق کرتے ہو کہ وہاں جا کر صورت حال کا جائزہ لیا جائے اختر"۔

"میرا تو یہی خیال ہے کہ پہلے کی مانند جس طرح ہم وہاں اس عمارت میں پہنچے بہرحال ان سارے واقعات کا اختتام دیکھ کر آئے تھے، اسی طرح میں سمجھتا ہوں کہ اب ہمیں اپنا یہ کام کرنا چاہئے۔ اگر کسی طور کامیاب ہو گئے تو واہ واہ، نہیں ہوئے تو اللہ کی

"ٹھیک ہے، پھر یوں کرتے ہیں کہ جتنی جلدی ممکن ہو سکے، اختر حسین کے گھر صورتِ حال کا جائزہ لیں گے"۔ اور اس بات پر ہم دونوں نے بیک وقت اتفاق کر حالانکہ بے چارہ ناصر فرازی بھی یہ بات نہیں جانتا تھا کہ میری اصلیت کیا ہے۔ جسے سمجھ رہا تھا، وہ جمیل نہیں ہے بلکہ کوئی اور ہی شخصیت ہے۔ اس دن تو خیر ہم نے اختر کے گھر جانا مناسب نہیں سمجھا۔ تھوڑے بہت انتظامات بھی کرنے تھے کوئی طریقہ کار تھا۔ میرے ذہن میں بہت سے وسوسے آئے تھے۔ بہرحال اللہ کا نام لے کر ہی فیصلہ کیا کہ جو ہوگا دیکھا جائے گا۔ ہمیں ہر قیمت پر اختر حسین کے معاملے میں الجھنا پڑے گا۔

رات کو ناصر فرازی سے اس موضوع پر گفتگو ہوئی اور یہ طے پایا کہ اختر سے رابطہ کر کے ہم اس سے کہیں گے کہ ہمیں کچھ وقت کے لئے اپنے گھر قیام کی اجازت دے میں یہ نہ بتائے کہ ہم کس لئے آئے ہیں اور ثناء کو یہی کہے کہ ہم اس کے دوست ہیں جو قیام کے لئے پہنچے ہیں۔ اس کے لئے اختر حسین سے ملنا بہت ضروری تھا۔

حمید اللہ کو ہم نے یہ ڈیوٹی سونپی کہ وہ اختر حسین کے گھر جائے اور ہمارا یہ پیغام اور کہے کہ ہم اس سے ملنا چاہتے ہیں، چنانچہ حمید اللہ وہاں روانہ ہو گیا۔ اختر اس کے ساتھ ساتھ ہمارے پاس آگیا چہرے پر وہی فکر منجمد نظر آرہی تھی۔ آنے کے بعد بولا۔

"میں تو یہ سمجھتا تھا کہ شاید آپ لوگوں نے میرے مسئلے میں رسک نہ لینے کا فیصلہ کیا؟"

"نہیں ہم نے آپ کے مسئلے میں حصہ لینے کا فیصلہ کیا ہے۔ آپ نہ لینے کی بات کر

"بہت بہت شکریہ، لیکن میں ایک عرض کرنا چاہتا ہوں"۔

"یہی کہ ہم اپنے ہر فعل کے خود ذمہ دار ہوں گے؟"۔

"کاش میرے گھر میں آپ کو کوئی نقصان نہ پہنچے"۔

"اچھا اب ان باتوں کو چھوڑیئے، مسٹر اختر...... ایک بات بتائیں، ہم آپ کو حسن کہیں یا

"یہ آپ کی مرضی ہے"۔

"میرا خیال ہے اختر زیادہ اچھا لگتا ہے۔ آج تقریباً 4 بجے ہم ایک سوٹ کیس کے ساتھ آپ کے گھر پہنچ رہے ہیں۔ آپ کے مہمان ہیں اور کسی دوسرے شہر سے آئے ہیں۔ آپ کے گھر قیام کریں گے"۔

"بہت بہت شکریہ...... نام معلوم کر سکتا ہوں آپ کے؟"

"جمیل اور ناصر"۔

"بہت بہتر آپ لوگ تشریف لے آیئے...... اس سے زیادہ خوشی کی بات میرے لئے اور کیا ہو سکتی ہے؟"۔

"کوئی اور خاص بات تو نہیں"۔

حمید اللہ کو ہم نے تمام صورتِ حال بتائی اور کہا، ہو سکتا ہے کہ ہم کچھ دن تک دفتر نہ پہنچ سکیں۔ ایک کیس ہے جس پر کام کرنا ہے۔

حمید اللہ کو بھلا کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ اسے ضروری ہدایت دے کر ہم لوگ باہر نکل آئے۔ بازار سے کچھ خریداری کی، بچوں کے لئے کھلونوں اور مٹھائی وغیرہ کے علاوہ ایک آدھ ساڑھی بھی لے لی تاکہ یہ تاثر پختہ ہو جائے کہ ہم واقعی کسی دوسرے شہر سے آئے ہیں اور پھر مقررہ وقت پر اختر حسین کے گھر پہنچ گئے۔

اچھا خاصا خوبصورت مکان تھا۔ ٹھیکیدار کا ہی معلوم ہوتا تھا۔ جگہ جگہ کنسٹرکشن کا سامان بکھرا پڑا تھا۔ وہ درخت بھی نظر آگیا جس کی جڑ میں وہ مصیبت دفن تھی۔ اختر حسین نے باہر نکل کر ہمارا استقبال کیا اور بولا۔

"میں نے ثناء کو بتا دیا تھا کہ میرے جگری دوست آرہے ہیں۔ آیئے...... آپ لوگوں کا

انتظار کررہی ہے وہ، بلکہ باورچی خانے میں مصروف ہے، کھانا پکا رہی ہے''۔

ہم اس کے ساتھ اندر داخل ہوگئے، احاطے کا جائزہ لیا۔ ایک منحوس سا تاثر تھا۔ دل چاہا کہ اختر سے سوال کرلیا جائے کہ پہلے بھی یہاں ایسا ہی ماحول تھا یا کسی بدروح کا سایہ ہونے کے بعد یہ صورتِ حال ہے، لیکن یہ سوال اسے خوفزدہ کردیتا، اس لئے ہم نے اس کا خیال ترک کر دیا۔ ثناء سے ملاقات ہوئی۔ وہ نرم و نازک سی خاتون تھیں۔ عمر 28 سال سے زیادہ نہیں ہوگی۔ چہرے پر کچھ شوخ لکیریں بھی تھیں، لیکن اب چہرے پر ایک اور احساس بھی چھایا ہوا تھا۔ انہوں نے کہا، ہمیں نہیں معلوم تھا کہ اختر کے آپ جیسے دوست بھی ہیں۔ اختر نے اپنی بے شمار باتیں ہم سے چھپا رکھی ہیں۔ آپ لوگوں کے آنے سے بڑی خوشی ہوئی ہے، ہمیں لیکن.....''

''لیکن کیا؟'' ناصر نے سوال کیا تو ثناء نے اختر کی طرف دیکھا اور حسن بولا۔

''اب اتنی جلدی بھی نہ کرو ثناء، میرے دوست سمجھیں گے جیسے تم انہیں ڈرا کر یہاں سے بھگانا چاہتی ہو''۔

''ارے نہیں، خدا کی قسم میں تو یہ چاہتی ہوں کہ یہ دو، تین مہینے ہمارے ساتھ رہیں۔ اتنی خدمت کروں گی ان لوگوں کی..... ایسی ایسی چیزیں پکا کر کھلاؤں گی کہ یہ بھی یاد رکھیں گے..... بھائی، آپ وعدہ کریں کہ آپ ہمارے ساتھ ایک اچھا اور طویل وقت گزاریں گے''۔

''بھابی، کھانے پینے کے تو ہم بھی بہت شوقین ہیں، لیکن بزرگوں کا کہنا ہے کہ اگر عزت کرانی ہے تو دو دن مہمان رہو، چار دن مہمان رہو، اس کے بعد شرافت سے چلے جاؤ، اس سے پہلے کہ میزبان باہر پھنکوادیں''۔ ان باتوں پر دونوں میاں بیوی خوب ہنسے اور پھر ثناء نے کہا۔

''چلئے بھائی، ٹھیک ہے اگر آپ ہماری نگاہوں میں فرق پائیں تو چلے جائیں مگر شرط یہ ہے کہ جب تک ہم آپ کی خدمت کرتے رہیں، آپ جائیں گے نہیں''۔

''چلیں، ٹھیک ہے یہ فیصلہ بعد میں ہوجائے گا۔ اب یہ بتاؤ مہمانوں کو ٹھہرائیں گے کہاں؟''

عمارت اندر سے کافی اچھی تھی، کیونکہ اختر خود کنسٹرکشن کا کام کرتا تھا، اس لئے اس نے گھر بھی بہت اچھا بنوایا تھا۔ ایک کافی کشادہ کمرہ ہمیں دیا گیا جس کی بڑی کھڑکی پورے احاطے کے سامنے کھلتی تھی۔ کمرے میں ہر ضروری آسائش کا بندوبست تھا۔ باتھ روم بھی کمرے کے ساتھ ہی بنوایا گیا تھا۔ بیڈ بھی موجود تھا، میز کرسی بھی اور ضرورت کی باقی تمام چیزیں بھی، چنانچہ ہم نے سب سے پہلے اس کمرے میں قیام کیا۔

ثناء کے بارے میں ہم نے اندازہ لگالیا تھا کہ کافی خوش مزاج اور اچھی طبیعت کی خاتون ہیں لیکن اس کے بارے میں اختر نے جو کچھ بتایا تھا، وہ بہت افسوس ناک تھا۔ دونوں بچے بھی بہت پیارے تھے۔ لڑکے کا نام گڈو اور لڑکی کا نام فضہ تھا۔ شام کی چائے اور رات کا کھانا بہت اچھا بنایا گیا تھا، اس دوران ہم لوگ باہر بھی آئے تھے اور اختر ہمیں پورا گھر دکھاتا پھر رہا تھا۔ ہم اس درخت کے نیچے بھی گئے تھے۔ یہاں صاف ایسے آثار نظر آتے تھے جن سے پتہ چلتا تھا کہ درخت کی جڑ میں کوئی چیز دفن ہے۔

بڑا سنسنی خیز ماحول تھا۔ ہم نے طے کرلیا کہ ہم انتظار کرلیں گے۔ رات کو خاصا وقت ہوگیا تو ہم اپنے کمرے میں چلے گئے۔ وہ کھڑکی جو باہر کی سمت کھلتی تھی، سلاخوں کے بغیر تھی اور اس کے دروازے کھول کر کوئی بھی اندر سے باہر اور باہر سے اندر آجاسکتا تھا۔ ناصر فرازی نے کسی قدر متاثر لہجے میں کہا۔

''کیا پروگرام ہے، جاگو گے رات کو؟''

''تم کیا چاہتے ہو، آرام کی نیند سونے آئے ہو؟'' میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

''یار سچی بات یہ ہے کہ میں اس معیار کا انسان نہیں ہوں، جس معیار کا بننے کی کوشش کررہا ہوں۔ میں اس خوفناک مکان کے ماحول سے بری طرح متاثر ہوگیا تھا اور اب بھی سچ بات یہ ہے کہ میری جان نکل رہی ہے۔ نہ جانے کیا ہوگا، ویسے ارادہ کیا ہے؟''

''آج کی رات ذرا جائزہ لیں گے، دیکھیں گے کہ ثناء باہر نکلتی ہے یا نہیں۔ ویسے بھی یہ کمرہ بہت عمدہ ہے۔ یعنی جس طرح سے ہم یہاں سے سارا منظر دیکھ سکتے ہیں، شاید اس عمارت میں کوئی اور کمرہ ایسا نہ ہو''۔

''ہاں بالکل''! پھر ہم کھڑکی سے تھوڑے فاصلے پر کرسیاں ڈال کر بیٹھ گئے اور باہر کا جائزہ لیتے رہے۔ تاحدِ نگاہ خاموشی اور سناٹا تھا۔ ناصر فرازی کا یہ کہنا درست تھا کہ عمارت میں ایک عجیب سی نحوست چھائی ہوئی تھی۔ سامنے والا دروازہ بھی بند تھا۔ یہ دروازہ عمارت میں داخل ہونے کا دروازہ تھا اور ہم اس کو بخوبی دیکھ سکتے تھے۔ تھوڑی دیر تک تو باتیں کرتے رہے، اس کے بعد ناصر فرازی کی آنکھوں میں نیند نظر آنے لگی۔ میں نے اسے کہا۔

''تم سونا چاہتے ہو تو سوجاؤ..... کوئی ضرورت پیش آئی تو میں تمہیں جگالوں گا''۔

''برا تو نہیں مانو گے یار؟''

"نہیں مانوں گا...... سوجاؤ" میں نے ہنستے ہوئے کہا اور ناصر فرازی بیڈ پر جا کر لیٹ گیا۔ چند ہی لمحوں بعد اس کے گہرے گہرے سانس لینے کی آواز سنائی دینے لگی تھی۔ یہی شکر تھا کہ خراٹے نہیں لیتا تھا، باہر سے کتوں کے بھونکنے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ میں نہ جانے کیسے کیسے خیالات میں ڈوبا رہا۔ بہت سی باتیں یاد آ رہی تھیں۔ ماضی کے واقعات بھی ایسے واقعات سے کسی طرح کم نہیں تھے۔ رات آہستہ آہستہ بڑھتی رہی اور پھر اچانک میں چونک پڑا۔

میں نے دیکھا، سامنے کا بند دروازہ کھلا۔ اس کے بعد میری تمام دلچسپیاں شدت کے ساتھ اس منظر میں منتقل ہو گئیں جو میں دیکھ رہا تھا۔ دروازے سے ثناء باہر نکلی۔ وہ شب خوابی کا لباس پہنے ہوئے تھی۔ دونوں ہاتھ سامنے کیے ہوئے چل رہی تھی۔ بال کسی چھتری کی مانند کھڑے تھے۔ چہرہ آگ کی طرح دہک رہا تھا۔ زبان باہر نکلی ہوئی تھی، چلنے کا انداز بے حد بھیانک تھا۔ میں اسے ہی دیکھ رہا تھا کہ دروازے سے کوئی اور بھی باہر نکلا اور میں نے اسے پہچان لیا۔ وہ مصیبت کا مارا اختر ہی تھا جو اپنی آگ میں جل رہا تھا۔ اس پر جو قیامت ٹوٹی تھی، اس نے اس کے دن رات حرام کر دیئے تھے۔ ظاہر ہے جس کا گھر اجڑ رہا ہو وہ سکون کی نیند تو نہیں سو سکتا۔ ان حالات میں کہ میں اس کی مشکل دور کرنے یہاں آیا تھا، سکون کی نیند سوتے رہنا یا پھر اسے نظرانداز کرنا ایک غیرانسانی عمل تھا۔

میں نے ناصر فرازی کی طرف دیکھا تو وہ مست نیند سو رہا تھا۔ میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ وہ بھی مزے کی چیز تھا۔ بزدل، ڈرپوک اور حالات سے خوفزدہ ہونے والا لیکن اپنے آپ کو تیس مار خان سمجھتا تھا۔

اسے جگانا بالکل غیر مناسب سمجھ کر میں خاموشی سے کمرے سے باہر نکل آیا۔ ایسے میں اختر کو سہارا دینا بے حد ضروری تھا اور پھر جو کچھ اس نے کہا تھا، اس کی تصدیق ہو رہی تھی۔ میں چند لمحوں بعد اس کے قریب پہنچ گیا۔ اسے فوراً ہی احساس ہو گیا کہ اس کے عقب میں کوئی ہے۔ دوسرے ہی لمحے وہ میرے قریب آ کر مجھ سے لپٹ گیا۔ وہ بری طرح کانپ رہا تھا، کچھ بولنا چاہتا تھا، لیکن آواز حلق میں پھنس گئی تھی، میں نے اسے سہارا دیتے ہوئے سرگوشی کی۔

"حسن حوصلہ رکھو...... حوصلہ رکھو"۔

"وہ...... وہ"۔ اس نے انگلی سے ثناء کی جانب اشارہ کیا۔

"ہاں، میں نے اسے دیکھ لیا ہے"۔

"تم یہیں رہو۔ میں اسے قریب سے دیکھتا ہوں"۔ میں نے اسے ایک درخت کی آڑ میں کھڑا کیا اور وہاں سے آگے بڑھ گیا۔ اس وقت دل میں کوئی احساس، کوئی خیال نہیں تھا، لیکن نہیں کیوں ایک ہمت تھی۔ آپ یہ بات مجھ سے بہتر جانتے ہیں کہ میں کوئی عامل نہیں تھا۔ بس تجسس نے مجھے اس مقام پر لا کھڑا کیا تھا اور میں اس معاملے میں ملوث ہو گیا تھا۔ میں ثناء کے قریب پہنچ گیا۔ وہ اس درخت کی آڑ میں بیٹھ گئی تھی اور بلیوں کی طرح زمین کھود رہی تھی۔

اس نے زمین کھود کر مجسمہ نکال لیا۔ اسے درخت کی جڑ میں ایک بلند جگہ پر رکھا اور اس کے سامنے دوزانو بیٹھ گئی۔ میرے سامنے خوف اور حیرت کے دروازے کھلتے گئے۔ میں نے مجسمے کا حجم بڑھتے ہوئے دیکھا، یہاں تک کہ وہ بھیانک چہرہ میرے سامنے ایک انسانی جسم کے برابر ہو گیا، لیکن وہ ثناء کو دیکھنے کی بجائے اپنی خونی نگاہوں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ اس نے بھاری لہجے میں کہا۔

"کون ہے یہ، کسے ساتھ لائی ہے؟" اس کے اس الفاظ پر ثناء نے گردن گھما کر مجھے دیکھا اور پھر غرا کر بولی۔

"کون ہے تُو، کہاں سے آ مرا ہے، کمبخت؟"

"تیرے بارے میں جاننا چاہتا ہوں کہ تُو کون ہے؟"

"بتائیں اسے اپنے بارے میں جوگیشور گیانی"۔ ثناء کی آواز میں مردانہ پن تھا۔

"مار سسرے کو ختم کر دے"۔ اس شخص نے کہا اور اچانک ہی ثناء کھڑی ہو گئی۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں کیا کروں...... اچانک ہی مجھے اپنے شانوں پر کوئی چیز محسوس ہوئی، یوں لگا جیسے کوئی کپڑا سا میرے کندھے پر آ کر گرا ہو اور پھر وہ پھسلتا ہوا میرے بدن پر نیچے آ گیا۔ یہ ایک ایسا عمل تھا جس کا میں تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ یہ سرخ لبادہ تھا جس نے سر سے پاؤں تک مجھے ڈھانپ لیا تھا اور اب میں سرخ لبادے میں ملبوس اس کے سامنے کھڑا تھا۔

ادھر ثناء نے اپنے ہاتھ سیدھے کر لئے تھے، اس کی انگلیاں لمبی ہونے لگیں...... لمبی اور لچکدار جن کے سرے سانپوں کے منہ بن گئے تھے اور ان سانپوں کی زبانیں لہرا رہی تھیں۔ یہ لہراتے ہوئے لمبے سانپ میری طرف بڑھ رہے تھے۔ یہاں تک کہ وہ میرے قریب پہنچ گئے، لیکن اچانک ہی میرے دونوں ہاتھ اوپر اٹھے اور میں نے ان سانپوں کو پکڑا تو وہ میرے

ہاتھوں میں تلملا رہے تھے اور مجھے ان سے کوئی خوف محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ اس تمام کار
میں پہلی بار سرخ لبادے کی افادیت مجھ پر واضح ہوئی تھی۔ یہ سب کچھ بے مقصد نہیں
مجھے سونپا گیا تھا، یہ سرخ لبادہ اچانک ہی مجھ تک پہنچایا گیا تھا۔ سانپوں کو مٹھیوں میں پکڑ
دفعتاً میں نے زوردار جھٹکے دیئے اور اس کے ساتھ ہی ثناء کے دونوں بازو اس کے شانوں
پاس سے اکھڑ گئے۔ اس سے خون کے فوارے بلند ہو رہے تھے اور یہ دونوں بازو سانپوں
شکل میں میرے ہاتھ میں موجود تھے۔ میں نے انہیں گھما کر دور پھینک دیا۔

ثناء نے حیرت سے اس بھیانک صورت والے شخص کو دیکھا اور پھر اپنے بازو کو دیکھ
لیکن اس کے ساتھ ہی وہ بھیانک انداز میں ہنس پڑی تھی۔

"جوگیشور گیانی دیکھ رہے ہو تم سے مقابلہ کر رہا ہے پاپی ہتھیارا کہیں کا۔ مہان گیانی
اگر یہ بات ہے تو ٹھیک ہے مقابلہ ہے تو مقابلہ ہی سہی"۔

میں نے اب بھی کچھ نہیں کہا تھا، بس خاموش کھڑا ہوا تھا کہ اچانک ہی اس بھیانک شکل
کے آدمی نے جس کا نام جوگیشور تھا دو چٹکیوں میں کوئی چیز اٹھائی اور اس کی طرف پھینکی اور ثناء
کے بازوؤں سے بہتی ہوئی خون کی دھار بند ہوگئی۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہاں سے دوسرے
بازو نمودار ہوگئے۔ ثناء نے اچانک ہی رقص کے انداز میں گھومنا شروع کر دیا۔ اب وہ تیزی
سے اپنے ان بازوؤں کو جنبش دے رہی تھی۔ اس کے دونوں بازو شائیں شائیں کی آواز کے
ساتھ فضاء میں گردش کر رہے تھے۔

اور پھر ایک ہی لمحے کے اندر اندر اس کے بازوؤں میں کوئی چیز نمودار ہوگئی۔ یہ لاتعداد
پرندے تھے جو غوطے لگا کر میرے سر پر پہنچ گئے۔ ان کی چونچیں لمبی اور آنکھیں سرخ تھیں
میں نے بغیر سوچے سمجھے ہاتھ بلند کئے اور اچانک وہ پرندے پھچاک کی آواز کے ساتھ فضا
میں پھٹنے لگے، ان کے خون کے چھینٹوں سے زمین کا یہ حصہ سرخ ہوگیا تھا۔ پرندے گھبرا کر
اونچے اٹھنے لگے اور جوگیشور کی خوفناک آواز سنائی دی۔

"ایسے نہیں مانے گا یہ ہمبورا!" اور دیکھتے ہی دیکھتے زمین پر ایک سیاہ ریچھ جیسا انسان
نمودار ہوگیا۔ اس کا چہرہ فٹ بال کی طرح گول اور بہت خوفناک تھا۔ شکل بن مانس سے ملتی
جلتی تھی، پہلے وہ چاروں ہاتھ پاؤں سے چلتا ہوا جوگیشور کے پاس پہنچا اور اس کے پیروں
کے تلوے چاٹنے لگا۔ پھر سیدھا کھڑا ہوگیا۔

"دیکھ لے ہمبورا اس حرام خور کو کون ہے یہ، کون ہے؟" اور اچانک ہی اس خوفناک شکل کے نمودار ہونے والے شخص نے کہا۔

"سرخ لبادے میں لپٹا ہوا ہے گیانی۔ پتہ نہیں، پر ایک بات ہم کہیں اس سے جھگڑا نہ کرو نہ کرو، اس سے جھگڑا مارے جاؤ گے، سرخ لبادہ کا داس ہے یہ گیانی جی۔ دیا رے دیا!" اور وہ کسی ریچھ ہی کی طرح چاروں ہاتھ پاؤں سے بھاگ کر چلا گیا۔

درخت کی جڑ میں بیٹھا ہوا شخص اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ "ارے یہ سرخ لبادہ کیا ہے رے"۔

میری ہمت کا کیا پوچھنا اب میں شیر ہوگیا تھا۔ میں نے ہاتھ پھیلائے اور اپنی جگہ سے آگے بڑھا تو وہ بھیانک صورت والا آدمی اچھل کر کھڑا ہوگیا اور دونوں ہاتھ جوڑ کر بولا۔

"نہ گیانی نہ ہم پاگل نہیں۔ جوگیشور ہے ہمارا نام جوگیشور گیانی۔ بس اس نے ہمیں نکال لیا تھا اور قیدی بنالیا تھا۔ اس کے مرد کے بارے میں بات کر رہے ہیں ہم۔ یہ ہمیں اچھی لگی ہے اور ہم نے سوچا کہ چلو اچھی چھوکریا ہے تھوڑا سا من لگالیں اس سے پتہ نہیں تم کہاں سے آگئے؟ ٹھیک ہے مہاراج طاقتور سے لڑنا ہمارے بس کی بات نہیں ہوگیا جو جھگڑا ہونا تھا۔ اب بات ختم ہوگئی۔ جا رہے ہیں..... چھوڑ دیا اسے، اب تمہیں شکایت نہیں ہوگی"۔

اس کے بعد اچانک ہی وہ چھوٹا سا ہوتا چلا گیا۔ اس کا حجم کم ہوتے ہوتے ایک مکھی کے برابر رہ گیا۔ میری نگاہیں اس پر جمی ہوئی تھیں۔ دوسرے لمحے وہ مکھی اڑی اور ہوا میں تحلیل ہوگئی۔

میری خوشیوں کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔ بتا نہیں سکتا آپ کو کہ میرے اندر کیسی کیسی قوتیں بیدار ہوگئی تھیں۔ ادھر ثناء وہیں سر جھکا کر بیٹھ گئی تھی۔ لگتا تھا جیسے وہ اونگھ رہی ہے۔

حالات کچھ بہتر نظر آتے تھے۔ میں نے بڑے احترام کے ساتھ اپنے وجود پر سے سرخ لبادہ اتارا اور پھر بڑے آرام سے لپیٹ کر اپنے بازوؤں پر لٹکالیا۔ یہ تو ایک ایسی چیز تھی جس سے میں نہ جانے کیا کیا کام لے سکتا تھا، اس تحفے کو تو میں کسی طور نہیں بھول سکتا تھا۔

بہرحال میں واپس پلٹا اور میں نے اختر کی جانب رخ کر کے دیکھا، مگر یہاں اختر بڑی دلچسپ کیفیت میں پڑے ہوئے تھے۔ ان کا سر نیچے تھا اور پاؤں اوپر، غالباً یہ مناظر انہوں نے دیکھے ہوں گے اور اس کے نتیجے میں مرغا بن گئے۔ ابھی میں انہیں سیدھا ہی کر رہا تھا کہ اپنے عقب میں قدموں کی آواز سنی، دیکھا تو ثناء صاحبہ چلی آ رہی تھیں۔ کافی پریشان تھیں، چونک کر بولیں۔

"ارے انہیں کیا ہوگیا؟"۔

"کچھ نہیں، بس ٹہلتے ٹہلتے سونے کے لئے لیٹ گئے ہیں"۔

"ٹہلتے ٹہلتے؟"

"ہاں رات کو چہل قدمی کرنے نکلے تھے ہم دونوں، یہ یہاں آئے اور گہری نیند سو گئے......
لیکن آپ یہاں کیا کررہی ہیں، بھابی جان؟" ثناء کے چہرے پر خوف کے آثار نمودار ہو گئے۔ اس نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے چاروں طرف دیکھا اور بولی۔

"ارے مم...... میں...... میں یہاں کیسے آگئی۔ اللہ رحم کرے، کیا مجھے سوتے میں چلنے کی عادت ہوگئی ہے؟"

"ایسا ہی لگتا ہے۔ آپ یہاں رک کر انہیں دیکھیں...... میں ذرا ناصر فرازی کو بلاتا ہوں، ہم دونوں انہیں ساتھ لے چلیں گے"۔

ناصر فرازی کو اٹھانا بے حد مشکل ثابت ہوا تھا۔ جاگتے ہی دہشت زدہ لہجے میں بولا۔

"آگئی"۔

"ابھی نہیں آئی...... باہر کھڑی آپ کو بلا رہی ہے"۔

"ایں، کون؟"

"جس کا آپ انتظار کررہے تھے"۔

"مم...... میں"۔

"ابے اٹھ یار فضول باتیں کررہا ہے۔ آؤ ذرا باہر چلیں"۔

"وقت کیا ہورہا ہے"۔

"بہت برا وقت ہے، شرافت سے چلو، ورنہ کیا فائدہ گردن پکڑ کر باہر لے جاؤں گا"۔

"مم...... مم...... مگر کہاں؟"

"جہنم میں...... کیا خیال ہے، کیسی جگہ ہے؟"

میں نے سوال کیا اور ناصر فرازی اپنے سر کو دونوں ہاتھوں میں پکڑ کر زور زور سے ہلانے لگا پھر بولا۔

"کیا بات ہے یار، میرا خیال ہے کہ میں کچھ فضول باتیں کرگیا ہوں اور مسلسل کئے جارہے ہو"۔

"نہیں، میں سمجھا نہیں"۔

"آؤ گے یا ابھی یہیں سمجھا دوں؟"۔

بمشکل تمام میں اسے یہاں لایا۔ ادھر بیچاری ثناء پریشان وہیں بیٹھی ہوئی تھی۔ غالباً اختر حسن صاحب بھی ہوش میں آنے کے لئے تیار نہیں تھے۔ یہاں پہنچ کر ناصر فرازی نے حیرت سے کہا۔

"یہ یہاں کیا کررہے ہیں؟"

"چاند قلا بازیاں کھا رہا تھا، ہم سب باہر چہل قدمی کررہے تھے۔ سوچا کہ تمہیں بھی یہاں لے آئیں"۔

"مم...... مم...... یہ اختر؟"

"وہ جو کہتے ہیں ناں میر کی زبان میں...... ابھی ٹک روتے روتے سو گیا ہے...... چلو اندر لے چلیں"۔

"بھائی، آپ انہیں سنبھال کر لائیں۔ میں بچوں کو دیکھتی ہوں"۔

ثناء اب بالکل ٹھیک ہوگئی تھی۔ وہ اندر چلی گئی تو ناصر نے کہا۔

"یار تمہیں اللہ کا واسطہ، بتادو یہ سب کیا ڈرامہ ہورہا ہے؟"

"ڈرامہ تو ہوچکا بیٹے...... اب یہ ڈراپ سین ہے۔ یعنی ہم لوگ بڑے بزرگ بن گئے ہیں اور بڑے کامیاب ہوگئے ہیں، اپنے معاملے ہیں"۔

"افسوس اس کمبخت کھوپڑی کو کسی مکینک کے حوالے کیسے کروں جو اسے ٹھیک کردے...... کوئی بات ہی سمجھ میں نہیں آتی"۔

"سمجھا دیں گے، سمجھا دیں گے، پہلے اس شریف آدمی کو اندر لے چلو"۔ میں نے کہا اور اس کے بعد بڑی مشکل سے ہم بے ہوش اختر حسن کو لے کر اندر آئے تھے۔ ثناء بے چاری بہت پریشان تھی۔ اسے اب تک صورتِ حال کا کوئی اندازہ نہیں تھا اور وہ اس بات پر اب بھی حیران تھی کہ وہ آخر باہر کیسے پہنچ گئی، لیکن دوسری صبح جب اختر حسن کو ہوش آیا تو اس نے سب سے پہلے ہمارے کمرے کی جانب دوڑ لگا دی اور اندر آکر دروازہ بند کرلیا۔ پھر ہانپتا ہوا بولا۔

"کیا ہوا، رات کو جو کچھ میں نے دیکھا وہ...... وہ"۔

"دوست مبارک باد کے علاوہ اور کیا کہا جاسکتا ہے...... تمہیں مبارک ہو، ثناء اب بالکل

ٹھیک ہے۔ آرام سے اپنا کاروبار شروع کر دو۔ اللہ نے تم پر فضل کیا ہے۔ وہ ایک بڑی جو تم پر نازل ہوگئی تھی اور اب وہاں کچھ بھی نہیں ہوگا۔ کان پکڑ کر بھاگ گئی ہے وہ''۔

''خدا کی قسم، میں نے آپ کو دیکھا تھا۔ شاہ جی، آپ اچانک ہی عجیب روپ ا... کر گئے تھے اور اس کے بعد ہی یہ سب کچھ ٹھیک ہوگیا تھا۔ میں بھی اسی وقت ٹھیک ہوا'' اختر نے مسخرے پن سے کہا اور میں ہنسنے لگا۔

❀❀❀❀

اس کے بعد ہم لوگ وہاں سے واپس آ گئے تھے۔ زندگی میں جو کچھ کیا تھا وہ ماضی کہانی بن گئی تھی اور سچی بات ہے کہ کچھ جذباتی لمحے ہی ہوتے ہیں جو انسان کی قسمت کا فیصلہ کر دیتے ہیں۔ اگر ان لمحوں پر قابو پالیا جائے تو تاریخیں بدل جاتی ہیں۔ میں بھی اپنی زندگی ختم کر چکا تھا، لیکن شاید قدرت نے مجھے معاف کر دیا تھا اور نئی زندگی دے دی تھی اور پھر اس کے بعد راہیں بدل گئی تھیں اور میرے شانوں پر ذمے داریاں ڈالی جانے لگی تھیں۔ شاید فیصلہ کیا گیا تھا میرے لئے آسمان سے اور میں نے اس فیصلے کو قبول کر لیا تھا۔ شیطان میرے دل میں بھی وسوسے ڈالتا تھا۔ ان مصنوعی آنکھوں کا سہارا لے کر میں کچھ سے کچھ بن سکتا تھا ہر طرح کا جرم کر سکتا تھا۔ کروڑوں روپے کما سکتا تھا، لیکن میں دوبارہ جذباتی نہیں ہونا چاہتا تھا۔ یہ چند دوست مل گئے تھے اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ مجھے وہ کراماتی لبادہ عطا... گیا تھا جو بہت سی مشکلات کا حل تھا۔ آنکھوں والی کہانی تو ایک سائنسی تجربے سے منسلک تھی لیکن بعد میں میرا منصب بدل گیا تھا۔ شاید قدرت نے مجھے نئی زندگی اسی لئے عطاء کی تھی مشغلہ بھی برا نہیں تھا، بے حد پُراسرار اور سنسنی خیز واقعات سے واسطہ پڑا تھا اور حیرانی کی بات یہ تھی کہ کامیابی بھی حاصل ہوتی تھی۔ کچھ تھا کچھ بن گیا تھا لیکن اسے دیکھ کر میرے پورے بدن نے پسینہ چھوڑ دیا تھا۔ میں نے اسے جیل میں دیکھا تھا، اس وقت جب میں جیل میں تھا۔ بڑا رعب تھا اس کا، سارے قیدی اس سے خوفزدہ رہتے تھے۔ پھر میں تو جس طرح جیل سے نکل آیا آپ کو معلوم ہے، لیکن وہ بھی سزائے موت کا قیدی تھا۔ وہ کیسے بچا؟ میں جائزہ ابھی لے رہا تھا کہ اس نے مجھے پہچانا ہے یا نہیں۔ اندازہ یہ ہوا کہ اس نے مجھے نہیں پہچانا تھا۔ وہ پاٹ دار آواز میں بولا۔

''میں نے تمہارا بورڈ دیکھا ہے، تم سے ایک مشورہ کرنا چاہتا ہوں''۔

''فرمائیے''۔ میں نے کہا۔

''میں سزائے موت کا قیدی ہوں، کیا مجھے سزائے موت قبول کر لینی چاہئے''۔

عجیب سوال تھا۔ ابھی میں کوئی جواب نہیں دینے پایا تھا کہ اس نے کہا۔

''اصل میں پہلی سزائے موت مجھے تین افراد کے قتل کے جرم میں دی گئی تھی اور فیصلہ سننے کے بعد میں نے کمرہ عدالت میں مزید تین افراد قتل کر دیئے اور وہاں سے فرار ہوگیا۔ پھر میں نے ایک سال تک کوئی واردات نہیں کی لیکن ایک سال بعد مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میں شریف آدمی بنتا جا رہا ہوں۔ اس سے زیادہ خوف کی بات اور کیا ہو سکتی تھی۔ میں شریف بننا نہیں چاہتا تھا۔ یہ نام میرے لئے گالی تھا۔ بہت شریف تھا میں کسی زمانے میں، آٹھ سال تک کوئلے کی کان میں کام کرتا رہا تھا۔ ڈبل ڈیوٹی کر کے زیادہ پیسے کماتا تھا، تاکہ اپنی بیمار ماں کا علاج کراؤں۔ ٹی بی کی مریضہ تھی اور وہ جینا چاہتی تھی، لیکن میری دن رات کی محنت بھی اسے زندگی نہ دے سکی۔ میں اس مہنگے علاج کا متحمل نہ ہو سکا۔ چار چار دن کے فاقے کرتا۔ پانچویں دن ایک آدھ ڈبل روٹی پانی کے ذریعہ معدے میں اتار لیتا تاکہ زندہ ہوں اور میری کمائی میری ماں کو زندگی دے دے۔

لیکن دواؤں کی قیمت آسمان سے باتیں کر رہی تھی۔ ڈاکٹر منہ لگانے کو تیار نہیں تھے۔ ہربرنجا تائی ٹی بی کے سب سے بڑے ماہر تھے۔ ایک صبح میں ہاتھ جوڑ کر ان کے گھر کے عظیم الشان پھاٹک پر کھڑا ہوگیا۔ اندر جانے کی اجازت نہ تھی، اس لئے ان کی کار کے باہر نکلنے کا انتظار کرنے لگا اور جب وہ فرعون بے سامان باہر نکلا تو میں اس کی کار کے سامنے سجدہ ریز ہوگیا۔ میں نے رو رو کر اس سے ماں کی زندگی کی بھیک مانگی اور اس نے کہا۔

''اسپتال کی باتیں میں صرف اسپتال میں کرتا ہوں''۔ اور اسپتال میں وہ صرف ان لوگوں سے ملتا تھا جو اس کی فیس ادا کر کے اندر داخل ہوتے تھے، چنانچہ ماں مر گئی۔

جب ایک وارڈ بوائے نے مجھے اس لاوارث لاش کو لے جانے کی ہدایت کی تو میں نے مردہ خانے میں جا کر ماں کو دیکھا۔ اس کی آنکھیں مجھ سے زمانے کی شکایت کر رہی تھیں۔ میں نے ماں سے کہا۔

''میں اس زمانے کو بدل دوں گا ماں''۔

وہاں سے میں سیدھا ڈاکٹر کے دفتر پہنچا اور اسے اطلاع دی۔

"ڈاکٹر میری ماں مرگئی"۔

ڈاکٹر نے چونک کر مجھے دیکھا اور بولا۔ "کون ہو تم بغیر اجازت اندر کیسے آگئے... کہاں مرگیا؟"

"کہیں دور نہیں، ڈاکٹر اس کی لاش دروازے پر پڑی ہے"۔ میں نے جواب... ڈاکٹر کے قریب بیٹھے ہوئے دوسرے ڈاکٹر نے گھبرا کر اٹھنے کی کوشش کی، لیکن میر... پنجے نے اسے اس کی جگہ بٹھادیا۔

"مجھے اندر آنے سے روک رہا تھا، مگر تم سے ملنا ضروری تھا اس لئے میں نے ا... کے فرض سے سبکدوش کردیا"۔ میں نے بات پوری کی۔

"کک..... کیا بکواس کررہے ہو۔ کیا واقعی تم نے اسے ہلاک کردیا؟" ڈاکٹر نے... لہجے میں کہا۔

"ہاں ڈاکٹر..... یقین کرو"۔

"کیسے..... کیسے؟"

"بالکل ایسے"۔ میں نے تیسری بار اپنی جگہ سے اٹھنے والے ڈاکٹر کے ساتھی... گردن دبوچ لی دوسرا ہاتھ بھی استعمال نہیں کیا تھا میں نے، کیونکہ لوگوں کے خیال کے... میں 6 ہارس پاور کا تھا۔ ممکن ہے کچھ کم ہوں، کیونکہ میں نے کبھی گھوڑوں سے طاقت آزما... کی۔ اگر میں یہ بات ڈاکٹر سے کہتا تو وہ ضرور تسلیم کرلیتا، کیونکہ دیکھتے ہی دیکھتے میرے... گرفت نے اس کے ساتھی کی زبان باہر نکال دی اور اس کی آنکھیں آدھا انچ باہر لٹک...

"سنا ڈاکٹر..... ماں مرگئی..... تم نے اس کا علاج نہیں کیا اور اب ساری دنیا کو... چاہئے..... پوچھو کیسے؟" میں نے کہا اور ڈاکٹر کی زبان سے بے اختیار نکل گیا۔

"کیسے؟" حالانکہ میں جانتا تھا کہ وہ کچھ اور بولنا چاہتا تھا، لیکن اس وقت میرے... میں تھا، اس لئے اس نے وہی کہا جو میں نے پوچھا..... تب میں نے آگے بڑھ کر... گردن دبوچ لی۔

"ایسے"۔

لوگ میرے بدن پر، جو کچھ ان کے ہاتھوں میں تھا، مار رہے تھے۔ کرسیاں، گ... لکڑیاں، آرائشی سامان لیکن ڈاکٹر کو اب کون بچاسکتا تھا۔ میں نے اسے اس کی غلطی کا

کرنے کے لئے ماں کے پاس بھیج دیا۔ پولیس نے مجھے گرفتار کرلیا۔ مجسٹریٹ نے سزائے موت سنادی، لیکن اتنی جلدی مرنے سے کیا فائدہ چنانچہ وہ لوگ فیصلہ سن کر مجھے جیل لے جانے لگے تو میں نے ان میں سے تین کو قتل کردیا اور اس کے بعد وہاں سے فرار ہوگیا، لیکن اس کے بعد میں اردن نہیں رکا، کیونکہ جانتا تھا کہ وہاں کی پولیس میرا پیچھا نہیں چھوڑے گی، میری دوسری منزل افغانستان تھی، لیکن مجھے یہ جگہ پسند نہیں آئی اور میں افغانستان سے ہندوستان آگیا اور وہاں ایک سال گزار دیا۔ پھر جب خیال آیا کہ میں نے اس دوران ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھنے کے سوا کچھ نہیں کیا تو میں نے کچھ کرنے کا فیصلہ کیا۔

اس بار پھر ایک فرعون میرے ہاتھ سے مارا گیا، اس کا نام راج مہرا تھا، ایک جاگیردار جو اپنی جاگیر میں رہنے والوں کو کھیت کھلیان سمجھتا تھا۔ میں نے اس کو کھیت کی طرح کاٹ کر رکھ دیا اور ساتھ ہی اس کے ایک بیٹے کو بھی جو اس کا دست راست تھا، لیکن اس کمبخت کا ایک "دست" نہیں تھا، الٹے سیدھے بے شمار ہاتھ تھے۔ گولی نہ چلتی اور میری ٹانگ میں نہ لگتی تو میں صاف نکل گیا تھا، لیکن ایک ٹانگ سے بھاگنے کا مجھے کوئی تجربہ نہیں تھا۔ اس لئے پکڑا گیا اور رام پرشاد مجسٹریٹ صاحب نے یہاں بھی وہی موت کا فیصلہ سنادیا۔ یہ میری دوسری سزائے موت تھی، لیکن اصل موت ان پانچ سنتریوں کی آئی جو میری کال کوٹھڑی کے نگراں تھے۔ قیدیوں کے ایک گروہ نے جس کا سرغنہ بلونت سنگھ تھا، فرار کے منصوبے میں مجھے بھی شریک کرلیا، کیونکہ میں آہنی سلاخوں والی کھڑکیوں کو چوکھٹ سمیت دیوار سے نکال لینے میں کوئی دقت نہیں محسوس کرتا تھا اور فرار کا سب سے قیمتی مددگار میں ہی تھا۔ 5 سنتریوں کو میں نے اس طرح ہلاک کردیا جیسے لکڑیاں کاٹی جاتی ہیں۔

ٹھاکر بلونت سنگھ نے خوش ہوکر مجھے ہندوستان سے نکال کر یورپ پہنچادیا۔ تیسری سزائے موت مجھے ایک یورپی ملک میں ملی تھی، لیکن پھر اسے سزائے قید میں تبدیل کردیا گیا اور تین سال میں نے ایک یوروپین جیل میں گزارے۔ یہ کوئی جیل تھی؟ نہ مار، نہ پیٹ، نہ دھول دھپا..... ایک سے ایک شریف قاتل، ایک سے ایک معصوم ڈاکو، یوں لگتا تھا یہاں جرم بھی شرافت سے ہوتا ہے۔ دل نہ لگا تو بھاگ نکلا اور امریکہ پہنچ گیا۔ انہوں نے چالاکی سے مجھے گرفتار کرلیا اور اس کے بعد نہ جانے کہاں کہاں خاک چھاننی پڑی، شاید یہ لوگ ایک قیدی کو دنیا دکھا رہے تھے۔

اصلی کہانی اس سفر سے شروع ہوتی ہے، لیکن یہ میری موت کی کہانی ہے۔ اس کیس ر
میں مرگیا تھا...... اور کیا جب کسی انسان کا عہد مرجائے، جب اس کی زندگی کا مقصد مرجائے
پھر وہ اپنے آپ کو زندہ کہنے کا حق نہیں رکھتا۔ اس لڑکی نے مجھے قتل کردیا، جس کا نام ا
تھا۔ آپ یقین کریں گے کہ 13 سال کی یہ معصوم سی لڑکی ایک وحشی انسان کی قاتل تھی۔

میں سمندری جہاز سے لمبے سفر کرتا تھا۔ وہ ایک یورپی کمپنی کا جہاز تھا۔ مجھے بھی جیل
پہنچادیا گیا۔ وہاں عجیب ہنگامہ برپا تھا۔ سینکڑوں مسافر جو جہاز پر سوار ہونے والے تھے، میر
طرح قیدی نہ تھے۔ اپنے دوستوں، عزیزوں اور رشتے داروں سے رخصتی سلام کررہے تھے
قلیوں کی بھاگ دوڑ، موٹروں کے بجتے ہوئے ہارن، سامان کی ریل پیل اور ایک دوسرے
پکارنے کی مسلسل آوازیں، بڑا دلچسپ منظر تھا۔ انہی میں مسٹر چارلس کا خاندان بھی شامل تھا
اپنی بیوی اور بچی کے ساتھ کہیں جارہے تھے۔

جہاز بے حد خوب صورت تھا، لیکن قیدیوں کو اس کے سب سے بدصورت حصے میں جگہ
دی گئی تھی۔ میرے ساتھ اور بھی قیدی تھے، جو سفر کررہے تھے، لیکن جہاز جوں جوں آگے
بڑھتا گیا، موسم خراب ہوتا گیا اور اس وقت جہاز کے سفر کو 24 گھنٹے بھی نہ گزرے تھے کہ
طوفان نے آلیا۔ آسمان پر سیاہ گھٹائیں چھاگئیں اور موسلادھار بارش شروع ہوگئی۔ مسافروں
میں ہلچل مچ گئی تھی۔ ہر شخص بارش سے پناہ حاصل کرنے کے لئے بھاگتا پھر رہا تھا۔ رفتہ رفتہ
سمندر میں اونچی اونچی لہریں اٹھنے لگیں اور جہاز ان کے نرغے میں ہچکولے کھانے لگا۔ زلزلے
کی سی کیفیت پیدا ہوگئی تھی۔ بارش کے تھپیڑے پوری قوت سے بند کھڑکیوں اور آہنی دروازوں
سے ٹکرارہے تھے۔ طوفان بڑھتا گیا، ہر چیز ایک دوسرے سے ٹکرارہی تھی۔ دفعتاً ایک شور کی
آواز ابھری اور پھر آوازیں بلند ہوتی گئیں، ان میں آگ آگ کی آوازیں بلند تھیں۔

تمام قیدی گھبرا کر کھڑے ہوگئے۔ ان کے چہرے بدحواس ہوگئے تھے۔ زیادہ دیر نہیں
گزری تھی کہ قیدیوں کا ایک محافظ اندر گھس آیا اور چابیوں کا گچھا قیدیوں کی طرف پھینکتے
ہوئے بولا۔

''جہاز میں آگ لگ گئی ہے۔ تم لوگ اپنی جان بچانے کے لئے آزاد ہو جس طرح
بھی......''

وہ بات پوری کئے بغیر باہر بھاگ گیا اور قیدیوں میں افراتفری پھیل گئی۔ باہر نکلنے والا

آخری قیدی میں تھا، لیکن باہر نکلتے ہی یوں لگا جیسے جہنم میں آگیا ہوں۔ سمندر کے سینے پر جہاز
مشعل کی طرح روشن تھا۔ مسافروں میں افراتفری تھی۔ بڑے انوکھے مناظر دیکھنے میں
آرہے تھے۔ عورتیں بچوں کو سینے سے لگائے رو رہی تھیں۔ میں ان تمام مناظر کو دیکھتا ہوا آگے
بڑھ گیا۔ تب ہی میری نگاہ ایک بچی پر پڑی۔ بارہ تیرہ سال عمر تھی، خوبصورت موٹی موٹی
آنکھوں سے آنسو رواں تھے اور میں مرگیا، ہاں میں اسی وقت مرگیا۔ ان آنسوؤں نے میری
زندگی بدل دی۔ نہ جانے کیوں، نہ جانے کیوں، مجھے ان آنسوؤں پر پیار آگیا۔ میرے قدم
بے اختیار اس کی طرف بڑھ گئے۔ میں نے بچی کے شانے پر ہاتھ رکھا تو وہ مجھ سے لپٹ گئی،
''انکل، میری ممی...... میرے ڈیڈی''۔ اس نے ہچکیاں بھرتے ہوئے کہا۔

''مرگئے وہ''۔ اس نے دو لاشوں کی طرف اشارہ کرکے کہا جو ایک بڑے ستون کے
نیچے دبی پڑی تھیں، میں انہیں زندگی نہیں دے سکتا تھا لیکن الزبتھ کی زندگی بچانا اب میری ذمہ
داری تھی اور میں اس کے لئے سرگرداں ہوگیا۔ میں نے اپنی قوتِ بازو سے ایک چھوٹی کشتی
حاصل کی اور ستر دن سمندر کے سینے پر گزارے، تب ہمیں زمین نظر آئی۔ ایک انوکھی سرزمین
جس پر قدم رکھتے ہی احساس ہوگیا کہ ہم آسٹریلیا میں ہیں، اس کے علاوہ چارہ کار نہیں تھا کہ
ہم یہاں سے آگے بڑھیں لیکن الزبتھ یہاں آکر خوش تھی۔ اس کی آنکھوں میں میری محبت نے
زندگی کی نئی جوت جگادی تھی۔ وہ بڑے پیار سے مجھے انکل کہتی تھی اور میں اپنی پچھلی زندگی کے
بارے میں سوچ کر ضرور رہ جاتا تھا کہ میں وہ نہ رہا تھا، جو تھا۔ راستے بے حد دشوار گزار تھے،
ہمیں ایک خوفناک پُل طے کرنا تھا جسے عبور کرنا انسانوں کے بس کی بات نہ تھی، لیکن میری
ہمت نہ ٹوٹی۔ میں الزبتھ کی مہذب دنیا میں واپسی چاہتا تھا، ایک نئے انسان کی حیثیت سے
اور اسی لئے میں آگے بڑھ رہا تھا کہ نکلنے کا کوئی راستہ ملے۔ ہم آگے بڑھتے رہے، خوفناک
مناظر ہمارے اطراف بکھرے پڑے تھے۔ سرزمین آسٹریلیا بے حد حسین تھی، لیکن اس حسن
میں وحشت تھی۔ درندے، زہریلے جانور اور نہ جانے کیا کیا۔

ایک دلدلی خطے کو عبور کرکے ہم ایک حسین وادی میں آگئے جس کے سرے پر ایک ندی
بہتی نظر آرہی تھی۔

''انکل پانی!'' الزبتھ بے اختیار چیخ اٹھی۔

''میں نے دیکھ لیا ہے، الزبتھ آؤ''۔

میں نے کہا اور ہم ندی کے قریب پہنچ گئے۔ ندی شفاف تھی، پانی میں اس کی تہہ نظر آ رہی تھی جس میں رنگین پتھر چمک رہے تھے۔ الزبتھ ندی کے کنارے بیٹھ گئی، اس نے پانی پیا، میں نے بھی پیاس بجھائی۔

''بہت خوبصورت جگہ ہے انکل''۔

''ہاں''۔

''کیا میں نہالوں؟'' اس نے پوچھا۔

''ضرور نہاؤ، میں اس طرف بیٹھا ہوں''۔ میں نے کنارے کے ایک درخت کی طرف اشارہ کر کے کہا اور الزبتھ پانی کی طرف بڑھ گئی۔ میرے دل میں الزبتھ کے لئے بے پناہ پیار تھا، اس معصوم بچی نے میری زندگی کا رخ ہی بدل دیا تھا اور اب میں اس کے مستقبل کے لئے فکرمند تھا۔ میری خواہش تھی کہ اسے مہذب دنیا میں لے جا کر ایک نئی زندگی دوں۔

الزبتھ کسی سنہری مچھلی کی طرح ندی کے شفاف پانی میں مچلتی پھر رہی تھی۔ وہ بے حد خوش تھی۔ خوشی کا اظہار اس کے چہرے سے ہوتا تھا، اس کے حسین بال کھل گئے تھے اور پانی پر لہرا رہے تھے۔ اس دوران ایک دفعہ بھی ذہن کنارے کی طرف نہیں گیا تھا۔ کوئی احساس نہیں ہوا تھا اور نہ ہی اس کی ضرورت پیش آئی تھی، لیکن یونہی بے مقصد میں نے پانی میں نگاہیں ڈالیں تو اچانک مجھے احساس ہوا کہ کچھ سائے لہروں پر رقصاں ہیں۔ میں بے اختیار چونک پڑا تھا۔ تب میں نے کنارے کی طرف دیکھا اور میری آنکھیں حیرت سے کھلی رہ گئیں۔ بے شمار افراد تھے جن کے جسم قوت و توانائی سے بھرپور سیاہ اور چمکدار تھے، ان کی تعداد بے پناہ تھی، ان کے ہاتھوں میں لمبے لمبے نیزے دبے ہوئے تھے۔ سیاہ چہروں پر سفید آنکھیں بڑی خوفناک لگ رہی تھیں، جسم پر برائے نام لباس تھے۔ وہ ندی کے کنارے دور دور تک پھیلے ہوئے تھے۔ میں نے بے اختیار پلٹ کر ندی کے دوسرے کنارے کی جانب دیکھا اور پھر مجھے ہنسی آ گئی۔ کنارہ بھی انہی سیاہ فاموں سے بھرا ہوا تھا۔ گویا انہوں نے ہمیں دونوں طرف سے گھیر لیا تھا۔

الزبتھ کی نگاہ ابھی ان پر نہیں پڑی تھی۔ وہ اب ندی کی شفاف تہہ میں سے خوبصورت پتھر تلاش کر رہی تھی۔ کئی پتھر اس کی مٹھی میں دبے ہوئے تھے۔ پانی اتنا پُرسکون اور آہستہ آہستہ بہنے والا تھا کہ بدن کی قوت صرف نہیں کرنی پڑتی تھی، جس کی بناء پر الزبتھ کا دل شاید پانی سے نکلنے کو نہیں چاہ رہا تھا۔ میں نے الزبتھ کو آواز دی اور وہ مسکراتی ہوئی نگاہوں سے میری

جانب دیکھنے لگی۔

''کیا بات ہے انکل؟''

''کنارے کی جانب دیکھو''۔ میں نے بھاری لہجے میں کہا اور الزبتھ نے کنارے کی طرف دیکھا۔ دوسرے ہی لمحے اس کے ہونٹوں کی ہنسی کافور ہوگئی اور چہرے پر کسی قدر دہشت کے آثار نظر آنے لگے۔

''آہ انکل...... یہ کالے کالے لوگ کون ہیں، کیا یہ بھوت ہیں؟'' اس نے خوفزدہ انداز میں سوال کیا اور جلدی سے میرے نزدیک پہنچ گئی۔

''نہیں انسان ہی ہیں لیکن آسٹریلیا کے اس علاقے کے باشندے ہیں اور ان کا رنگ سیاہ ہوتا ہے''۔

''ہاں یہ تو میں جانتی ہوں...... یہ بالکل ایسے ہی ہیں جیسے ہم اپنے وطن میں دیکھتے تھے''۔

''لیکن یہ انوکھے ہیں، الزبتھ''۔

''ہاں انکل...... بڑے خوفناک لگ رہے ہیں لیکن یہ یہاں پر کیوں کھڑے ہیں، انکل؟''

''الزبتھ، ہوشیاری سے کام لینا ہوگا۔ یہاں رکو، پہلے میں تمہارا لباس لے کر آتا ہوں''۔

''ارے ہاں انکل، میرے کپڑے...... میرے کپڑے''...... الزبتھ نے دہشت زدہ لہجے میں کہا اور میں اس کے شانے تھپک کر آگے بڑھ گیا۔ جوں جوں میں کنارے کے نزدیک پہنچ رہا تھا، وہ لوگ ایک قدم پیچھے ہٹتے جا رہے تھے۔ لباس کنارے کے نزدیک ہی رکھا ہوا تھا۔ وہ لباس میں نے اٹھایا اور پلٹ پڑا۔ ان لوگوں نے کوئی تعرض نہیں کیا تھا۔ تب میں الزبتھ کے نزدیک پہنچ گیا۔

''لیکن لیکن انکل میں یہاں پانی میں کپڑے کیسے پہنوں''۔

''جس طرح بھی ممکن ہو سکے الزبتھ، یہ لوگ کسی نیک ارادے سے نہیں آ رہے''۔ میں نے کہا۔

''کک...... کیا مطلب انکل؟'' الزبتھ ہکلائی۔

''تم لباس پہنو، الزبتھ اس کے بعد جو ہوگا، دیکھا جائے گا''۔ میں نے کہا اور الزبتھ نے بمشکل تمام پانی کے اندر ہی لباس کو ٹھیک ٹھاک کیا۔ تب میں اس کا بازو پکڑ کر دوبارہ کنارے کی طرف بڑھنے لگا۔

وہ لوگ ساکت و جامد کھڑے تھے۔ ان کی نگاہیں ہم دونوں پر جمی ہوئی تھیں، لیکن بڑا عجیب تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ کوئی وحشیانہ کارروائی نہیں کرنا چاہتے تھے، لیکن کچھ نہ تھا، ورنہ ان کے یہاں آنے کا مقصد کیا ہوسکتا تھا۔ میں کنارے پر پہنچ گیا اور الزبتھ پشت پر کرلیا۔ ان میں سے ایک آدمی جو کسی قدر چھوٹے قد کا تھا، لیکن چوڑے بدن کا تھے، آگے بڑھ آیا۔ وہ اپنا نیزہ ہلا رہا تھا۔ میرے نزدیک پہنچ کر اس نے نیزہ اپنے ہاتھوں میں پکڑا، سینے پر رکھا۔ ہلکی سی گردن جھکائی اور پھر سیدھا ہوگیا۔ گویا ان لوگوں کا جارحانہ نہیں تھا، بلکہ وہ کچھ کہنا چاہتے تھے۔ میں نے اس سے پوچھا کہ وہ کون ہیں؟

چند لمحات وہ میری جانب دیکھتا رہا، اس کے چہرے پر احترام کا تاثر تھا۔ پھر آہستہ بڑبڑایا۔

''ناقابل عبور راستوں سے آنے والے! سردار گروجن نے اپنے علم و عقل سے تجھے ناقابلِ عبور پُل طے کرتے ہوئے دیکھ لیا تھا جس پر سے گزرنے کا تصور صرف دیوتا کرسکتے تھے اور عام لوگ اس کے نزدیک جانے کی ہمت بھی نہیں کرتے۔ سردار نے کہا اور اس جوان کو لے کر آؤ، لیکن اس کی عزت و احترام میں فرق نہ ہو، ہم تجھے لینے آئے ہیں''

''میں تمہارے ساتھ چلنے کو تیار ہوں''۔ میں نے جواب دیا۔

اس نے چیخ کر اپنے ساتھیوں کو میرے بارے میں اطلاع دی اور وہ سب میرے جمع ہونے لگے جو ندی کے دوسرے کنارے پر تھے وہ پانی سے گزر کر اس کنارے پر لگے، جہاں ہم لوگ موجود تھے۔ ہم ان کے ساتھ آگے بڑھ گئے۔ آگے بڑھنے والا بلاشبہ دلکش ترین راستہ تھا۔ ایک پگ ڈنڈی تھی جو نہ جانے کس جانب جاتی تھی۔ ہم آگے بڑھتے گئے۔

سیاہ فاموں کی ٹولیاں ہمارے اردگرد بکھری ہوئی تھیں۔ وہ ہر طرف سے سفر کررہے اور آخر کار ہم اس بڑے پہاڑی ٹیلے تک پہنچ گئے جس کے عقب میں مجھے معلوم نہیں تھا کہ تھا، لیکن جب میں نے اس سے گزر کر دیکھا تو مجھے وحشیوں کی ایک عظیم الشان بستی نظر آئی تاحدِ نگاہ پھیلی ہوئی تھی۔

چھوٹے چھوٹے گھاس کے بنے ہوئے جھونپڑے جن کی دیواروں میں پتھر بھی ہوئے تھے اور دور دور تک بکھرے ہوئے تھے اور ان کے درمیان حسین سبزہ زار پھیلے ہو

تھے، کھیتی باڑی وغیرہ کا شاید کوئی تصور نہیں تھا، نہ جانے وقت گزارنے کے لئے یہ لوگ کیا کرتے تھے۔ ایک بڑے سے جھونپڑے میں ہم دونوں کو پہنچا دیا گیا اور اسی شخص نے جس نے پہلی بار مجھ سے گفتگو کی تھی، جھک کر مجھ سے درخواست کی کہ میں یہاں آرام کروں۔

الزبتھ ان لوگوں کے ساتھ آتے ہوئے خوفزدہ تھی اور جھونپڑے میں پہنچ کر بھی اس کے چہرے پر دہشت کے آثار تھے۔ تب میں نے مسکرا کر اس کی جانب دیکھا۔

''کیا بات ہے الزبتھ، کیا تم خوف محسوس کررہی ہو؟''

''انکل یہ لوگ تو بڑے وحشی معلوم ہورہے ہیں۔ ہمارے ہاں جو لوگ ہیں ان کے رنگ ان جیسے ضرور ہیں، لیکن حلیہ ان جیسا نہیں، یہ لوگ کون ہیں اور ہمیں یہاں کیوں لاتے ہیں؟''

''ان کا مقصد کچھ بھی ہو الزبتھ، تمہیں ان سے خوف نہیں کھانا چاہئے۔ یہ لوگ میری موجودگی میں تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے'' میں نے اسے دلاسہ دیا۔

''نہیں، انکل میں خوفزدہ نہیں۔ میں تو کافی بہادر ہوں...... یہ لوگ انوکھے ہیں، اس وجہ سے مجھے تشویش ہے''۔ الزبتھ نے جواب دیا اور میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ سیاہ نسل کے ان لوگوں کے بارے میں ابھی تک یہ اندازہ نہیں لگایا جاسکتا تھا کہ انہوں نے ہمیں گرفتار کیوں کیا ہے۔ ویسے ان کا رویہ کسی طور تکلیف دہ نہیں تھا، لیکن میں نے فیصلہ کرلیا تھا کہ اگر کوئی گڑبڑ ہوئی تو پھر الزبتھ کو بچانے کے لئے جو کچھ کرسکتا ہوں، ضرور کروں گا۔ الزبتھ کسی گہری سوچ میں ڈوب گئی تھی۔ کافی دیر خاموشی سے گزر گئی تو میں نے اسے مخاطب کیا۔

''کیا سوچنے لگیں، الزبتھ؟''

''کوئی خاص بات نہیں انکل، بس میں سوچ رہی ہوں کہ اب ہم کیا کریں گے؟''

''تم کیا چاہتی ہو؟''

''میری سمجھ میں تو کوئی بات نہیں آرہی۔ میں آپ کے ساتھ خوش ہوں۔ آپ اتنے اچھے ہیں کہ میں سوچتی ہوں کہ آپ اتنے اچھے کیوں ہیں، بس مجھے یہ سب اچھا نہیں لگ رہا، اس کے بجائے ہم کسی شہر میں ہوتے تو بہت مزہ آتا''۔

''ہم یہاں سے شہر جانے کی کوشش کریں گے، الزبتھ، تمہیں فکرمند نہیں ہونا چاہئے''۔ میں نے کہا، اسی وقت چند حبشی ہماری رہائش گاہ میں آگئے لیکن ان کے ہاتھوں میں ہمارے لئے کھانے پینے کی چیزیں تھیں۔ ان چیزوں کو دیکھ کر میں ان لوگوں کے بارے میں اندازہ

قائم کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ چند وحشی میرے پاس آگئے۔ ان میں سے ایک نے
پیغام مجھے دیا۔

"سردار گروجن تم سے ملاقات کا خواہش مند ہے اور اس نے تمہیں طلب کیا ہے۔"

"لڑکی بھی میرے ساتھ جائے گی؟" میں نے پوچھا۔

"اس نے اس بارے میں کوئی ہدایت نہیں دی...... یہ تمہاری مرضی پر ہے"۔ اس نے جواب دیا۔

میں نے الزبتھ کو ساتھ لیا اور جھونپڑوں کے درمیان سے گزرتے ہوئے ہم سردار جھونپڑے کے پاس پہنچ گئے جس کے سامنے ایک وسیع وعریض احاطہ تھا۔ یہاں ایک ایک قوی ہیکل سیاہ فام موجود تھا جو بڑھاپے کی حدود میں داخل ہو چکا تھا، لیکن اس کی آنکھوں سے تجربہ جھانکتا تھا۔

اس نے سر سے پاؤں تک مجھے دیکھا اور گردن ہلائی۔

"تم اس ناقابلِ عبور راستے سے آئے ہو جو موت کا راستہ ہے اور جسے عبور کرنے کی کوشش موت ثابت ہوتی ہے"۔

"تمہارا نام گروجن ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں...... تمہیں دوسروں نے بتادیا ہوگا"۔

"اپنی بستی میں آجانے والے اجنبیوں کے ساتھ تم کیا سلوک کرتے ہو؟"۔

"ہم انہیں قبول نہیں کرتے۔ اول تو اس سے پہلے اس راستے سے کوئی نہیں آیا دوسرے راستوں سے لوگ کبھی کبھی آجاتے ہیں اور وہ لوگ ہوتے ہیں جو پہاڑوں کی دھات اور چمک دار پتھروں کے پجاری ہوتے ہیں ان کے حصول کے لئے وہ زندگی کی نہیں کرتے، لیکن وہ لوگ گندے خیالات کے مالک ہوتے ہیں۔ بہت پہلے ہمیں ان کی پر اعتراض نہیں تھا۔ ہم ان سے تعاون کرتے تھے، لیکن پھر ان کی چند باتوں نے ہمیں پہنچائی۔ وہ ہم میں شامل ہوجاتے، ہماری لڑکیوں کو بہکاتے اور پھر انہیں چھوڑ کر چلے جا مقصد صرف سنہری دھات اور چمکدار پتھروں کا حصول ہوتا۔ ہمارے بہت سے لوگ ان کی سے موت کا شکار ہوئے۔ تب شلوکا نے ان کے داخلے کی ممانعت کر دی، اس نے کہا کہ دھات کے لئے آنے والوں کو ہلاک کر دیا جائے، تب سے ہم اسی اصول پر کاربند ہیں

یہ سوال ہم تم سے کریں گے"۔

"مثلاً" میں نے پوچھا۔

"کیا تم بھی سنہری دھات کی تلاش میں آئے ہو؟"

"نہیں"۔

"کیا تم سچ بول رہے ہو؟"

"ہاں"۔

"اگر یہ بات ہے تو صبح کی عبادت کے وقت تمہیں شلوکا کے بت کے سامنے اقرار کرنا ہوگا، لیکن سنو شلوکا کے بت کے سامنے جھوٹ سچ نمایاں ہوجاتا ہے۔ اگر تم نے جھوٹ بولا تو جل کر سیاہ ہوجاؤ گے، لیکن اگر تمہاری بات سچ نکلی تو ہم تمہیں احترام دیں گے، ہاں اس کے سوا کوئی بات ہو تو تم ہمیں بتا دو تاکہ ہم مطمئن ہوجائیں"۔

"اگر میں سچا نکلا تو کیا تم میری مدد کرو گے؟"

"کیا مدد چاہتے ہو؟"۔

"دوسرے راستے سے مجھے مہذب دنیا تک پہنچا دینا۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ نہ تو سنہری دھات کا کوئی ٹکڑا اپنے ساتھ لے جاؤں گا اور نہ ہی تمہاری کسی عورت کو کوئی نقصان پہنچاؤں گا"۔

میں نے کہا اور سردار نے مہربان انداز میں گردن ہلا دی۔

"میں وعدہ کرتا ہوں کہ اگر تم سچے نکلے تو میں تمہاری پوری مدد کروں گا"۔

"شکریہ سردار"۔ میں نے ممنونیت سے کہا۔

"اس وقت تک تمہیں کسی تکلیف کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا، جس جگہ تمہیں ٹھہرایا گیا ہے وہاں تمہیں تکلیف تو نہیں؟"

"قطعی نہیں"۔

"ٹھیک ہے تم آرام کرو...... کسی بھی ضرورت کو بیان کر سکتے ہو"۔ سردار نے کہا۔

"میں تم سے مزید معلومات کرنا چاہتا ہوں۔ سردار"۔

"پوچھو؟"

"خود تمہارا طرزِ زندگی کیا ہے۔ تمہارے قبیلے کا کوئی نام ہے؟ یہاں ان اطراف میں دوسرے قبائل بھی آباد ہوں گے"۔

''ہم سب شلوکا کہلاتے ہیں اور یہی ہمارے قبیلے کا نام ہے۔ دیوی شلوکا ہماری م
محافظ ہے۔ اس کا جادو سب سے عظیم ہے۔ ہاں وہ لوگ جو اپنے جادو آزماتے ہیں، شلو
مجرم ہوتے ہیں۔ ایسے مجرموں کو دیوی چھوٹ دیتی ہے اور انہیں ہزار راتیں دی جاتی ہیں
ہزار راتوں میں وہ اپنے جادو کی گندگی کے لئے آزاد ہوتے ہیں، لیکن ان کے خاتمے کے
انہیں پتھر بنادیا جاتا ہے اور وہ ہمیشہ پتھر کے بنے رہتے ہیں۔ دیکھ سکتے ہیں۔ سوچ سکتے
بھوک پیاس لگتی ہے انہیں، لیکن وہ مرسکتے ہیں نہ جنبش کرسکتے ہیں، اس لئے بہت کم لوگ
ہوتے ہیں جو اپنا جادو دیوی کے جادو پر حاوی کرتے ہیں۔ کبھی کبھی کوئی ایسا سرپھرا نکل
ہے اور پھر بستیوں کے لئے مصیبت بن جاتا ہے، جیسے جمولا''۔

سردار کے چہرے پر فکرمندی کے آثار نظر آنے لگے۔ میں بغور اسے دیکھ رہا تھا۔

''جمولا کون ہے؟'' میں نے دلچسپی سے پوچھا۔

''یہ قبیلہ صدیوں سے آباد ہے۔ ہم برے لوگ نہیں، ہمیشہ امن پسند رہے ہیں
دوسرے قبائل کے برعکس جنگ و جدل ہمارا وطیرہ نہیں رہا۔ دیوی شلوکا ہماری مدد کرتی ہے
ہماری طرف بری نگاہ ڈالنے والے خوفزدہ ہوجاتے ہیں، لیکن قسقہ کی چھوٹ ہم میں
بدنصیب کے لئے تباہ کن ثابت ہوتی رہی ہے''۔

''قسقہ کی چھوٹ؟'' میں نے استفہامیہ انداز میں پوچھا۔

''ہاں...... میں اس بارے میں تمہیں بتاچکا ہوں، یعنی وہ سرپھرا انسان جو ہزار راتوں
جادو مانگ لے اور پھر ساری زندگی پتھر بن کر گزار دے، لیکن ان ہزار راتوں میں وہ آزاد
ہے۔ ایسا کوئی بھی شخص جس دور میں بھی ہو دوسروں کے لئے پریشانی کا باعث بنا رہا''۔

''وہ جس نے ہزار راتیں مانگ لی ہیں''۔

''ہاں''۔

''خوب...... جمولا کہاں رہتا ہے اور تم لوگوں کے ساتھ اس کا کیسا رویہ ہے؟''

''وہ شیطان ہے اور ہم اس کے سامنے بے بس اور مجبور ہیں۔ قبیلے کی ہر عورت اس
بیوی ہے، وہ جسے چاہے اپنے پاس بلالے۔ ہم سب اس کے غلام بن کر زندہ رہتے ہیں
جس سے نفرت کرے، اس کا جینا حرام کردے، چنانچہ اس کی خوشنودی کے لئے ہمیں
ہوتا ہے جو ہم میں سے کسی کا دل نہیں چاہتا۔ ہرسات دن کے بعد وہ کسی ایک انسان کا

اور اس کے لئے یہ قربانی بھی ہم ہی میں سے کسی کو دینا ہوتی ہے''۔

سردار کی آواز میں غم کے آثار تھے۔

''تم اسے ہلاک نہیں کرسکتے؟''

''نہیں، اس کے جادو کے سامنے ہماری ایک نہیں چلتی''۔

''یعنی اگر تم اسے ہلاک کرنا چاہو تو کوشش کرسکتے ہو۔ دیوی کی طرف سے اس کی
مخالفت نہیں''۔

''نہیں، وہ شیطان ہوتا ہے۔ شیطان کو ہلاک کرنے کی مخالفت کس طرح ہوسکتی ہے،
لیکن اس پر قابو کون پائے؟'' سردار نے اداسی سے کہا۔

''کیا ماضی میں کبھی کسی نے ایسے شخص کو ہلاک کیا ہے؟''

''وہ جن پر ظلم کرتا ہے، ایسی کوشش کرتے ہیں لیکن ناکام رہتے ہیں''۔ سردار نے جواب دیا۔

''وہ کہاں رہتا ہے، کیا تمہارے درمیان؟''

''نہیں وہ سیاہ پہاڑیوں کے ایک غار میں رہتا ہے۔ جب اس کا دل چاہتا ہے، آتا ہے
اور ہم سب اس کے سامنے بے بس ہوتے ہیں''۔ سردار نے بتایا۔

''تم نے صبح کی عبادت کے بارے میں کہا تھا؟''

''ہاں...... ہم نکلتے سورج کی عبادت کرتے ہیں۔ کل تم بھی صبح کو اس عبادت میں
شریک ہوگے''۔

''صبح کس وقت؟''

''سورج نکلنے سے قبل''۔

''کیا جمولا بھی اس عبادت میں شریک ہوتا ہے''۔ میں نے پوچھا۔

''شیطان کو عبادت سے کیا کام، وہ تو ہر رسم سے بے نیاز ہوتا ہے''۔

''شکریہ سردار...... میں تمہارے اس تعاون کے لئے بے حد شکرگزار ہوں۔ میں کل صبح
کی عبادت میں شریک ہوں گا اور اس وقت تمہیں میری سچائی کا یقین ہوگا''۔

پھر میں سردار کے پاس سے اٹھ گیا۔ الزبتھ اس دوران خاموش رہی تھی۔ اس کی آنکھوں
میں الجھن کے آثار تھے۔ ظاہر ہے وہ اس گفتگو کو سمجھ بھی نہیں رہی ہوگی، پھر جب ہم باہر نکل
آئے تو اس نے میرا بازو پکڑ کر ہلاتے ہوئے کہا۔

"یہ آپ دونوں کو کیا ہو گیا تھا انکل؟"

"کب الزبتھ"۔

"آپ لوگ نہ جانے کیا بول رہے تھے۔ میری سمجھ میں تو کچھ بھی نہیں آیا"۔

"ان لوگوں کی زبان تھی۔ میں ان سے ان کی زبان میں بات کر رہا تھا"۔

"مجھے تو بڑی عجیب سی بات لگ رہی تھی، کیا کہہ رہا تھا؟"۔

"کہہ رہا تھا کہ ہمیں تہذیب کی وادیوں تک پہنچانے میں ہماری مدد کرے گا۔ وہ دوست بن گیا ہے، لیکن اس نے یہ پیشکش کی ہے کہ ابھی چند روز ان کے ساتھ قیام کریں یہاں کی سیر کریں"۔

"ویسے یہ جگہ تو بہت خوب صورت ہے انکل؟"

"ہاں اور ان لوگوں کا رہن سہن بھی انوکھا ہے، جب یہ لوگ جشن مناتے ہیں تو وحـ رقص کرتے ہیں"۔

"اوہ...... تو کیا یہ لوگ جشن منائیں گے؟"

"شاید ابھی نہیں...... ہاں اگر تمہیں...... کچھ دن یہاں گزارنے میں اعتراض نہ ہو ہم ان کا جشن دیکھ کر ہی جائیں گے"۔

"ٹھیک ہے، مجھے ان کا رہن سہن بہت پسند ہے"۔ الزبتھ نے خوش ہو کر کہا اور خا ہو گئی۔ میں سردار گروجن کی باتوں پر غور کرنے لگا۔ جمولا میرے لئے ایک دلچسپ شخصیت

میں نے دوسرے دن کی عبادت میں شریک ہونے کا فیصلہ کر لیا۔ پہلے تو میں نے کہ ان کی عبادت میں تنہا جاؤں گا، لیکن الزبتھ کو اس جھونپڑے میں تنہا چھوڑنا مناسب نہ اور پھر ممکن ہے کہ وہ بھی اس انوکھی بات سے لطف اندوز ہو۔

لیکن سورج نکلنے سے قبل میں نے الزبتھ کو جگانے کی کوشش کی تو وہ نہیں جاگی۔ نیند سو رہی تھی۔ تب میں خود ہی باہر نکل آیا۔ عبادت گاہ کے بارے میں، میں نے تفصیل پوچھی تھی، لیکن مجھے اس کے بارے میں جاننے میں کوئی دقت نہ ہوئی تھی۔ ایک سیاہ فا نے شانے سے پکڑ کر روک لیا۔ وہ چونک کر رک گیا۔

"کیا تم صبح کی عبادت میں شریک نہیں ہوتے"۔ میں نے پوچھا۔

"میں جا رہا ہوں لیکن تم......؟"

"میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گا"۔

"تم......؟" وہ حیرت انگیز دلچسپی سے بولا۔

"ہاں...... تمہیں حیرت کیوں ہے؟"

"اس لئے کہ تم ہم میں سے نہیں ہو...... تمہارا عبادت کرنا ہمارے لئے حیرت انگیز ہوگا"۔

"بہر حال مجھے اپنی عبادت گاہ لے چلو"۔

"آؤ...... میرے ساتھ آ جاؤ"۔ اس نے کہا اور میں اس کے ساتھ چل پڑا۔ اس کا رخ جھونپڑوں کے عقبی میدان کی جانب تھا۔ میں اس میدان کے دوسری سمت سے یہاں آیا تھا۔ اس لئے یہ عقبی حصہ ابھی تک میری نگاہ سے پوشیدہ تھا۔

نیم تاریکی میں یہ ماحول بے حد دلکش اور پُراسرار لگ رہا تھا۔ عقب میں ایک وسیع و عریض میدان تھا، جس کے اختتام پر سیاہ پہاڑیوں کا سلسلہ تاحدِ نگاہ تھا۔ یہ پہاڑیاں اس طرف کے ماحول کی ضد تھیں۔ حسین مرغزاروں میں ان کی بدنمائی عجیب سی لگ رہی تھی۔ میں نے دلچسپی سے یہ منظر دیکھا۔ ان کے درمیان آگ جل رہی تھی۔ میرا رہبر ایک جگہ کھڑا ہو گیا اور میں نے ٹھٹک کر اسے دیکھا۔

"یہی عبادت کا میدان ہے۔ درمیان میں سلگتی ہوئی آگ سورج کے عکس کا پرتو ہے۔ یہ سورج کی آگ کی نشاندہی کرتی ہے اور ہم اس کی عبادت کریں گے"۔ میرے رہبر نے کہا۔

"لیکن میرے دوست، ابھی تو یہاں زیادہ لوگ نہیں آئے۔ کیا بستی کے سب لوگ عبادت نہیں کرتے؟" میں نے سوال کیا۔

"مجال ہے کسی کی...... ہر شخص صبح کو سورج کی آمد کا انتظار اس میدان میں کرتا ہے۔ چند ساعت دیکھتے جاؤ...... ابھی وقت نہیں آیا"۔ اس نے کہا اور میں نے خاموشی سے گردن ہلا دی۔ یہ ساری چیزیں میرے لئے بڑی دلکش تھیں۔

میں اس سوچ میں گم تھا کہ آگ میں سفید دھوئیں کے بادل نمودار ہوتے دیکھے۔ ایک عجیب انوکھی سی خوشبو چاروں طرف پھیل گئی تھی۔ غالباً آگ کے الاؤ میں خوشبودار چیز ڈال دی گئی تھی اور اس کے ساتھ ہی اچانک چاروں طرف سے چیخوں کی آوازیں ابھرنے لگیں اور تیزی کے ساتھ میدان لوگوں سے بھرنے لگا۔ پہلی صف، دوسری صف اور تیزی سے صفیں بھرنے لگیں۔ صفوں کے درمیان میں بے ہنگم انداز میں وحشی رقص کرتے پھر رہے تھے۔ یوں

لگ رہا تھا جیسے زمین سیاہ فام ننگ دھڑنگ آدمی اگل رہی ہو۔ تب مجھے ایک آواز سنائی دی۔ یہ آواز گروجن کی تھی۔ گروجن چیخ رہا تھا۔

"باہر سے آنے والے اجنبی! تم جہاں بھی ہو میرے پاس آجاؤ۔ میں اس تیز الاؤ کے پاس موجود ہوں"۔ میں لوگوں کے ہجوم کو چیرتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔ میرا ساتھی ایک لمحے کے لئے حیران رہ گیا تھا۔

"چند ساعت کے بعد میں گروجن کے نزدیک پہنچ گیا۔ گروجن الاؤ کے پاس ہی موجود تھا۔ اسے تلاش کرنے میں مجھے کوئی دقت نہ ہوئی۔ شعاعوں کی روشنی اس کا چہرہ روشن کررہی تھی۔ گروجن کے نزدیک ہی چار آدمی بھی موجود تھے جو کافی عمر رسیدہ تھے اور جن کے بال جٹاؤں کی شکل میں نیچے تک پھیلے ہوئے تھے۔ بدن ان کے بھی ننگ دھڑنگ تھے اور ان کے بدن پر عجیب وغریب قسم کے نقش ونگار بنے ہوئے تھے۔ ایسے نقش ونگار جو میں اس سے پہلے بھی لوگوں کو آرائش بدن کے لئے بناتے ہوئے دیکھ چکا تھا۔

سردار گروجن نے مجھے اپنے بالکل قریب بلالیا اور تب میں نے پہلی بار اس عجیب وغریب مجسمے کو دیکھا جو خاصا طویل وعریض تھا۔ سیاہ رنگ کے پتھر سے تراشی ہوئی دیوی عجیب وغریب قسم کے خدوخال کی مالک تھی۔ انتہائی بھونڈے سے خدوخال تھے اور باقی بدن کو انسانی روپ دینے کی ناکام کوشش کی گئی تھی۔ یہ دیوی شلوکا تھی جس کے سامنے مجھے مقدس قسم کھانا تھی۔ میں گروجن کے پاس کھڑا ہوگیا۔

عبادت شروع ہوگئی۔ آہستہ آہستہ سورج بلند ہورہا تھا اور اس کے ساتھ ساتھ ان لوگوں کے جوش وخروش میں اضافہ ہوتا جارہا تھا۔ اتنا شور مچارہے تھے، اتنا چیخ رہے تھے یہ لوگ کہ کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔

مرد، عورتیں، بوڑھے، بچے سب ہی موجود تھے اور سب کے سب دیوانہ وار چیخ رہے تھے۔ یہ ایک انوکھی عبادت تھی اور میں سوچ رہا تھا کہ یقینی طور پر جھونپڑے میں الزبتھ جاگ اٹھی ہوگی۔ اس تصور کے ساتھ میں تھوڑا سا پریشان بھی ہوگیا تھا۔ بہرصورت لوگوں کے ہجوم سے نکلنا آسان نہیں تھا۔ یوں بھی میں نے گروجن کو مطمئن کرنے کا وعدہ کیا ہوا تھا، میں خاموشی سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔

جونہی سورج کی پہلی کرن نمودار ہوئی، وہ سب اچانک خاموش ہوگئے۔

اتنی تیز چیخوں کے بعد یہ خاموشی بڑی عجیب اور انوکھی لگ رہی تھی۔ میں دم سادھے ان لوگوں کی حرکات وسکنات دیکھ رہا تھا۔ چند سیکنڈ وہ لوگ خاموش رہے اور سورج بلند ہوتا رہا۔ پھر جب سورج نے سر ابھارا تو وہ لوگ مطمئن ہوگئے، گویا اب عبادت ختم ہوگئی تھی۔ تب گروجن مسکراتے ہوئے بولا۔

"میرے دوست نہ جانے کیوں مجھے تمہاری بات پر یقین ہے، حالانکہ ہمارے مذہب میں یہ بات نہیں کہ ہم کسی ایسے شخص پر بھروسہ کریں جو ہمارا ہم مذہب نہ ہو اور مسافر یا اجنبی ہو یا پھر اس نے دیوی شلوکا کے سامنے اپنی سچائی کا ثبوت نہ پیش کردیا ہو...... تاہم میں چاہتا ہوں کہ تم اپنی سچائی کا ثبوت دو"۔

"کیا چاہتے ہو؟" میں نے پوچھا۔

"سامنے آؤ"۔ گروجن بولا اور میں دیوی شلوکا کے بت کے سامنے پہنچ گیا۔ تب گروجن نے ایک بوڑھے کو اشارہ کیا اور وہ بوڑھا ہمارے نزدیک پہنچ گیا۔ گروجن بوڑھے سے مخاطب ہوکر بولا۔

"عظیم فرزونا۔ ناقابل عبور راستوں سے آنے والا شخص کہتا ہے کہ وہ ایک بھٹکا ہوا انسان ہے اور سمندر کے راستے یہاں تک پہنچ گیا ہے۔ یہاں آنا اس کا مقصد نہیں تھا اور نہ ہی چمکدار پتھروں اور سنہری دھات کی تلاش میں یہاں آیا ہے۔ یہ اس جگہ سے نکل جانے کا خواہش مند ہے اور اس سلسلے میں اپنی سچائی کا ثبوت پیش کرنے کے لئے دیوی شلوکا کے سامنے آیا ہے۔ میں نے کہا ہے کہ اگر یہ دیوی شلوکا کے سامنے کھڑے ہوکر قسم کھالے اور یہ ثابت کردے کہ وہ چمکدار پتھروں کی تلاش میں آنے والا شخص نہیں تو میں اس کی مدد کروں گا۔ قبیلے کے قانون کے مطابق اگر یہ شخص بھی چمکدار پتھر اور سنہری دھات کی تلاش میں یہاں آیا ہے تو پھر ہم اس کی کوئی اہانت نہیں کرسکیں گے اور پھر اسے شلوکا کے قدموں پر قربان کردیا جائے گا اور اگر یہ ہمارا دشمن نہیں تو ہم اس سے کوئی تعرض نہیں کریں گے اور اسے ان علاقوں تک پہنچادیں گے، جہاں سے یہ اپنی دنیا میں واپس چلا جائے...... چنانچہ عظیم فرزونا، تم اس سے مقدس قسم لو"۔

بوڑھے نے سر جھکایا اور لکڑی کے اس بڑے برتن کی طرف متوجہ ہوگیا جس میں کسی لکڑی کا برادہ تھا اور اس برادے کی خوشبو فضاء میں پھیلی ہوئی تھی۔

"میرے نزدیک آؤ"۔ بوڑھے کی لرزتی آواز ابھری اور میں اس کے نزدیک پہنچ گیا۔

"دیوی شلوکا کے سامنے جھوٹی قسم کھانے والے راکھ کے ڈھیر میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ چلو، اس خوشبو سے مٹھی بھر کر الاؤ میں ڈال دو"۔

میں نے اس کی ہدایت پر عمل کیا۔ آگ سے سفید دھوئیں کے ساتھ خوشبوئیں ابھریں فضاء میں پھیل گئیں۔ سردار کھسک کر میرے قریب آ گیا۔ تب بوڑھے نے کہا۔

"ہاں بولو، تمہارے یہاں آنے کا مقصد کیا ہے؟"۔

"جیسا کہ میں پہلے سردار گروجن کو بتا چکا ہوں کہ میں ایک تباہ شدہ جہاز سے تک آ پہنچا ہوں اور اس طرف آنے کا مقصد اس کے سوا کچھ نہیں کہ میں تہذیب یافتہ نکل جاؤں اور اس میں جھوٹ ہو تو تمہارے عقیدے کے مطابق مجھے ضرور نقصان پہنچے"۔

سردار کی آنکھیں دیوی کی طرف نگراں ہو گئیں، لیکن کوئی قابلِ ذکر واقعہ پیش نہ سردار نے آگے بڑھ کر مجھے گلے لگا لیا۔

"ہاں! میں نے تجھے سچا تسلیم کیا۔ اور اب مجھے تجھ پر کوئی شک نہیں ...... میں پورا کروں گا"۔ میں نے سردار کی پیٹھ تھپتھپائی اور سردار مجھے لئے ہوئے چل پڑا۔ ہمارے بعد بستی کے دوسرے لوگ بھی واپس چل پڑے تھے اور میدان خالی ہوتا جا رہا تھا۔

"مجھے یقین ہے، تم نے اس بات کا برا نہیں مانا ہو گا اجنبی"۔

"نہیں اس میں برا ماننے کی کوئی بات نہیں تھی۔ تمہیں مطمئن کرنا بھی ضروری تھا مطمئن تھا کہ میں نے جھوٹ نہیں بولا"۔

"تب مجھے دو دن کی مہلت دے ...... میں تیرے لئے سفر کا بندوبست کردوں راستے میں تکلیف نہ ہو۔ مہذب دنیا میں جانے کے لئے راستہ طویل ہے اور اس کے دشوار گزار مراحل آتے ہیں کہ انسان پریشان ہو جاتا ہے"۔

"مجھے اپنی پرواہ نہیں ہے سردار لیکن وہ بچی میری ذمہ داری ہے ...... اگر میری ہوتی تو میں ایک طویل وقت یہاں گزار کر تیرے لئے بھی کچھ کرنے کی کوشش

"تیرا شکریہ، بہر حال مطمئن رہ ...... میں دو دن کے اندر تیری واپسی کا بندوبست گا۔ تیری سچائی نے مجھے بہت متاثر کیا ہے۔ اب مجھے اجازت دے"۔ سردار میرے کے نزدیک آ کر بولا۔ اور میں نے گردن ہلا دی۔

سردار چلا گیا اور میں جھونپڑے میں داخل ہو گیا۔ میرا خیال تھا کہ الزبتھ ضرور جاگ گئی ہوگی آوازوں سے خوفزدہ بھی ہوئی ہوگی۔ میرا خیال درست نکلا وہ اس جگہ نہیں تھی، جہاں میں اسے چھوڑ کر گیا تھا۔ میں نے چاروں طرف دیکھا، لیکن الزبتھ جھونپڑی میں نہیں تھی۔

بے چاری لڑکی خوف کے عالم میں روتی ہوئی مجھے تلاش کرنے نکل گئی ہوگی۔ میں تیزی سے باہر نکل گیا اور پھر میں جھونپڑے کے اطراف میں ان ساری جگہوں تک جہاں الزبتھ کے جانے کا امکان ہو سکتا تھا، تلاش کرتا پھرا لیکن وہ موجود نہیں تھی۔ کیا وہ کافی دور نکل گئی؟ ممکن ہے اس میدان کی طرف لیکن میدان اب سنسان پڑا تھا، سوائے آگ کے جواب بھی تیزی سے جل رہی تھی۔ تب میں نے اسے زور سے پکارا، لیکن کوئی جواب نہ ملا۔ میں کسی قدر پریشان ہو گیا تھا۔

وہاں سے واپس آ کر میں نے ایک سیاہ فام کو پکڑا اور اس سے کہا۔

"میرے ساتھ ایک لڑکی تھی۔ کیا تم نے اسے دیکھا؟" سیاہ فام نے حیرانی سے مجھے دیکھتے ہوئے گردن ہلا دی۔

"وہ کھو گئی ...... کیا وہ اس جگہ نہیں جہاں تمہارا قیام ہے؟" اس نے پوچھا۔

"نہیں، وہ وہاں موجود نہیں"۔

"کس وقت چھوڑا تھا تم نے اسے وہاں؟"

"اس وقت جب ہم سب عبادت کے لئے گئے تھے۔" میں نے جواب دیا اور سیاہ فام تعجب سے گردن ہلانے لگا۔

"اس وقت تو بستی میں کسی فرد کا وجود بھی نہیں ہوتا۔ پوری بستی خالی ہو جاتی ہے۔ تمہیں اسے یہاں چھوڑ کر نہیں جانا چاہئے تھا"۔

میں نے سیاہ فام کی نصیحتیں سننے کے بجائے الزبتھ کو تلاش کرنا مناسب سمجھا اور کافی دیر تک اس کی تلاش میں بستی کے کونے کونے میں مارا مارا پھرتا رہا۔ میں نے بے شمار لوگوں سے اس کے بارے میں معلومات کیں اور الزبتھ کو نہ پا کر میں سردار کی قیام گاہ کی طرف چل پڑا۔

قیام گاہ کے باہر سیاہ فام پہرے دار موجود تھے۔ انہوں نے سردار کو میری آمد کی اطلاع دی اور سردار اپنے جھونپڑے سے باہر نکل آیا۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔ تب اس نے سادگی سے پوچھا۔

"کیا میں کسی خاص کام سے اس کے پاس آیا ہوں؟"

"ہاں گروجن! میری جھونپڑی سے وہ بچی غائب ہے جو میرے ساتھ تھی"۔

"کیا مطلب؟" گروجن یہ کہہ کر کئی قدم آگے بڑھ آیا۔

"وہ میرے جھونپڑے میں موجود نہیں ہے"۔

"کہاں گئی؟ اور کب؟"

"اس وقت جب میں عبادت کے لئے گیا تھا تو وہ جھونپڑے ہی میں سو رہی تھی جب میں وہاں واپس آیا تو وہ اپنی جگہ موجود نہیں تھی۔ اس کے بعد میں نے بستی کے اطرا میں میدان میں ہر جگہ کونے کونے میں اسے تلاش کیا ہے، لیکن وہ نہیں ملی"۔

"کیا......؟" گروجن نے کہا۔

"ہاں...... گروجن وہ موجود نہیں...... براہ کرم سردار اس کی تلاش میں میری مدد کرو"۔

"یقیناً...... یقیناً...... یہ تمہارے کہنے کی بات نہیں ہے" گروجن نے جواب دیا اور پھ تیزی سے آگے بڑھ گیا۔

گروجن نے چند افراد کو جمع کیا اور انہیں مختلف ہدایات دیں۔ اس نے ... سے کہا بستی کا ہر فرد بچی کی تلاش کرے، بلکہ ہر جھونپڑے میں ہر جگہ اس بستی کے اطراف میں دور تک نکل جائے اور بچی کو تلاش کرے۔ بچی ہر حال میں چند گھنٹوں کے اندر اندر مل جا چاہئے۔

لوگوں نے سردار گروجن کی ہدایات سنیں اور چاروں طرف پھیل گئے۔ میرے انداز کچھ پریشانی پیدا ہو گئی تھی۔ میرے ذہن میں یہ بھی تھا کہ الزبتھ کے ساتھ کوئی حادثہ پیش آ ہے یا وہ خوفزدہ ہو کر کہیں چھپ گئی ہے۔ بہرصورت یہ لوگ اسے تلاش کرنے کے لئے گئے تھے۔

سردار گروجن نے مجھے اپنے ساتھ رہنے کے لئے کہا اور پھر اس نے مجھے اپنے جھونپڑے میں بیٹھنے کی دعوت دی اور ہم دونوں اندر چلے آئے۔ اندر آ کر ہم دونوں اپنی اپنی نشستوں بیٹھ گئے۔

"پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے، میرے دوست، ظاہر ہے وہ بچی زیادہ دور نہیں جائے گی۔ اب اتنی ناسمجھ بھی نہیں کہ جنگلوں میں زیادہ دور تک نکل جائے۔ میرے تیز دوڑنے والے اسے تلاش کر لیں گے۔ تم اس سلسلے میں بے فکر ہو جاؤ"۔

"سردار اسے ہر قیمت پر ملنا چاہئے۔ تم یقین کرو اس کی وجہ سے میری زندگی کا رخ بدلا ہوا ہے ورنہ میں نہ جانے کہاں ہوتا؟"

"یقیناً...... یقیناً وہ میری مہمان ہے اور تم بھی میری پناہ میں ہو اس کے لئے تم بے فکر ہو جاؤ۔ اسے تلاش کر کے تمہارے حوالے کرنا ہماری ذمہ داری ہے"۔ سردار گروجن نے بڑے اعتماد سے کہا اور میں کافی دیر تک اس کے ساتھ بیٹھا رہا۔ سردار تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد کوئی نہ کوئی گفتگو کرنے لگتا تھا۔ دفعتاً کسی خیال کے تحت وہ چونک کر متوحش لہجے میں بولا۔

"کیا اس کا پورا لباس بدن پر تھا۔ کوئی ایسی چیز تو جھونپڑے میں نہیں رہ گئی جس سے اندازہ ہو کہ اسے اس کی مرضی کے خلاف کسی نے جھونپڑے سے اٹھایا ہے"۔

"کیا مطلب؟" میں نے چونک کر پوچھا۔

"میرے ساتھ چلو، میرے ساتھ آؤ"۔

سردار اُٹھ گیا...... نہ جانے اس کے ذہن میں کیا خیال تھا۔ بہرصورت وہ میرے ساتھ میرے جھونپڑے کی جانب چل پڑا، تب اس نے جھونپڑے کے اندر داخل ہو کر دیکھا اور ایک لمحے کے لئے ساکت رہ گیا۔

"آہ...... آہ...... یہ کیا ہوا؟" اس نے عجیب سے انداز میں کہا اور میں پریشانی سے اسے دیکھنے لگا۔

"کیا ہوا سردار...... کیا کوئی خاص بات تمہارے ذہن میں آئی ہے؟"۔

"بو ایک مکروہ اور شیطانی بو...... میں اس کو اس جھونپڑے ہی میں محسوس کر رہا ہوں اور یہ اس منحوس انسان کے بدن کی بو ہے جو ہماری پیشانی کا داغ ہے"۔

"سردار، براہ کرم مجھے صاف الفاظ میں بتاؤ...... تم کہنا کیا چاہتے ہو؟"

"جمولا...... وہ جہاں جاتا ہے، اس کے بدن کی بو وہاں رہ جاتی ہے اور دیر تک یہ بو فضاء میں پھیلی رہتی ہے۔ بڑا ہی ناپاک انسان ہے وہ"۔

"تو تمہارا مطلب ہے وہ اس جھونپڑے میں آیا تھا"۔ میں نے خونخوار لہجے میں پوچھا۔

"میرے دوست، اگر میرا تجربہ غلط نہیں ہے...... لیکن ٹھہرو میں ایک شخص کو بلاتا ہوں، وہ اس بات کی صحیح نشاندہی کر سکے گا"۔ سردار گروجن نے کہا اور باہر نکل آیا۔

پھر اس نے کسی کو بلانے کے لئے کہا اور چند ساعت کے بعد وہی بوڑھا جھونپڑے میں

موجود تھا۔ بوڑھے نے جونہی جھونپڑے میں قدم رکھا اور ٹھٹک گیا۔

''گروجن، جمولا کی بو محسوس ہو رہی ہے''۔ اس نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا اور[...] نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پکڑ لیا۔

میں خاموشی سے ان دونوں کی شکل دیکھ رہا تھا۔ پھر میں نے آگے بڑھ کر کہا۔

''تم دونوں کا کیا خیال ہے، براہ کرم مجھے بھی تو بتاؤ''۔

''اب...... یہ قطعی اتفاق ہے کہ میں نے تمہیں شیطان صفت جمولا کے بارے میں [...] تھا، میرا خیال ہے کہ لڑکی کو جمولا لے گیا ہے''۔

''لیکن کیوں؟'' میں نے گرجدار آواز میں پوچھا۔

''کیا کہا جا سکتا ہے اس شیطان کے بارے میں، لیکن اس منحوس نے بہت بری حر[کت] کی ہے۔ بتاؤ اب کیا کیا جائے؟''

سردار نے بوڑھے سے سوال کیا۔

''ہم سب اس کے سامنے بے بس ہیں۔ کوئی کیا کر سکتا ہے؟'' بوڑھے نے لاچاری سے[...]

''وہ کہاں ملے گا؟''

''جمولا کے بارے میں پوچھ رہے ہو؟''

''ہاں''۔

''اس منحوس کا ٹھکانہ انہی سیاہ پہاڑیوں میں ہے جنہیں تم نے عبادت گاہ کے آخ[ری] سرے پر دیکھا ہوگا، لیکن اس کو تلاش کرنا ناممکن ہے''۔

''سردار، اس ناممکن کو ممکن بنانا ہوگا۔ ویسے بھی یہ اصول مہمان نوازی کے خلاف ہے''

''یقین کرو میرے دوست، میں شرمندہ ہوں۔ ہم نے یہاں جمولا کی بو محسوس کی۔ اس لئے ہمارا خیال اس طرف گیا ہے۔ لیکن جمولا...... اگر اس موذی سے ہمیں بھی نجا[ت] دلا سکتے ہو تو ہم تمہیں نجات دہندہ کہیں گے''۔

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ میں الزبتھ کو ایسے مصائب سے بچا کر لایا تھا جن [...] موت یقینی تھی۔ یہاں آ کر میں اسے کھونا نہیں چاہتا تھا اور اگر الزبتھ نہ ملی تو پھر نہیں کہہ سکتا ان لوگوں کے ساتھ میرا کیا رویہ ہو۔

گروجن سچا انسان تھا۔ اس کی نیت میں کوئی کھوٹ نہیں تھا۔ بہرحال میں الزبتھ کے [...]

[...]ئی پریشان تھا۔ پھر میں نے سردار سے کہا۔

''مجھے ہتھیار چاہئیں سردار''۔

''ہاں ضرور، آؤ میرے ساتھ''۔

سردار مجھے اپنے جھونپڑے میں لے گیا اور پھر اس نے مجھے ہتھیاروں کے ذخیرے کے سامنے کھڑا کر دیا اور بولا۔

''اس میں سے جو پسند آئے لے لو''۔

میں نے اپنی پسند کا ہتھیار لے لیا اور باہر نکل آیا۔

دوپہر کے بعد میں نے سیاہ پہاڑیوں کا رخ کیا۔ ایسا عجیب وغریب پہاڑی سلسلہ میں نے اس سے قبل نہیں دیکھا تھا۔ پوری پوری چٹانیں اس قدر چکنی اور سپاٹ تھیں کہ قدم جمانا مشکل تھا۔ میں اس غار کی تلاش میں بھٹکتا پھرا، لیکن سورج ڈھل گیا اور مجھے کوئی غار نظر نہیں آیا۔

میرے دل میں انتہائی غصہ تھا۔ اگر جمولا مجھے مل جاتا تو میں اس کا خون پی جاتا۔ میں نے سوچا اور اچانک ہی سردار کے کچھ الفاظ میرے ذہن میں گونج اٹھے۔ میں خاموشی سے واپس چل پڑا تھا۔ سردار بے چارہ اپنے طور پر کوشش میں مصروف تھا۔ اس نے میری صورت دیکھی اور ایک ٹھنڈی سانس لے کر گردن جھکالی، پھر بولا۔

''تم اس غار کو تلاش کرنے میں ناکام رہے ہو گے''۔

''ہاں لیکن میں ناکامی نہیں چاہتا سردار''۔

''میرے دوست میں تمہارے لئے کیا کروں؟''

''تم نے کہا تھا سردار کہ وہ قبیلے کے کسی شخص کا خون پیتا ہے''۔

''ہاں''۔ سردار چونک پڑا۔

''اس کا کیا طریقہ ہوتا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''بس ڈوبتے چاند کی رات کو ایک نوجوان کو خوشبوؤں میں بسا کر سیاہ پہاڑیوں مین ایک مخصوص مقام پر بھیج دیا جاتا ہے اور اس کے بعد اس کی خون نچوڑی ہوئی لاش وہاں سے اٹھالی جاتی ہے''۔

''کتنے دن باقی ہیں اس رات میں''۔

''صرف چند روز، لیکن کیوں؟''

''اس بار تم مجھے بھیجو گے سردار؟'' میں نے کہا اور سردار کسی سوچ میں گم ہو گیا۔ اس کے چہرے پر حزن و ملال کے آثار نظر آ رہے تھے۔ جب میں واپس اپنے جھونپڑے میں پہنچا تو ایک دم اچھل پڑا۔

''الزبتھ جھونپڑے میں موجود تھی''۔ اس کی پشت میری جانب تھی۔

''الزبتھ؟'' میں بے اختیار اس کی جانب لپکا اور میری آواز پر اس نے چونک کر گردن گھمائی لیکن...... لیکن یہ الزبتھ تھی؟ میں اپنی جگہ ساکت رہ گیا۔ الزبتھ کی آنکھیں معمول سے گنا بڑی ہو گئی تھیں۔ اس کے جبڑے لٹکے ہوئے تھے اور سرخ سرخ دانت ایسے نظر آ رہے تھے جیسے اس نے کسی کا خون پیا ہو۔ خون کے قطرے اس کے ہونٹوں کے نیچے ٹھوڑی پر بھی جمے ہوئے تھے۔

میں ششدر رہ گیا۔ الزبتھ کی یہ بھیانک شکل میرے لئے اجنبی تھی۔ الزبتھ مجھے دیکھ کر مسکراتی رہی، لیکن ان نگاہوں میں بچپن اور معصومیت نہیں تھی جو الزبتھ کی عمر کے ساتھ تھی۔ اس کی نگاہوں میں ایسی کیفیت تھی جیسے کوئی بھوکی بلی ہو۔ تب وہ چند قدم آگے بڑھی اور میرے نزدیک پہنچ گئی۔ میں نے اس کے بال اپنی مٹھی میں پکڑ لئے اور وہ ایک دم اچھل پڑی۔

''الزبتھ، یہ تمہیں کیا ہو گیا؟''

''انکل!'' وہ آہستہ سے بولی۔ انداز سسکی لینے کا سا تھا۔

''آپ مجھے چھوڑ کر کہاں چلے گئے تھے انکل، لوگ کتنی زور زور سے چیخ رہے تھے مجھے ڈر لگ رہا تھا انکل۔ آپ مجھے چھوڑ کر کہاں چلے گئے تھے؟''

''تمہاری طبیعت کیسی ہے الزبتھ؟'' میں نے ہمدردی سے پوچھا۔

''ٹھیک ہوں انکل! اب تو آپ آ گئے ہیں''۔

''ہاں...... الزبتھ لیکن تمہیں ڈر لگ رہا تھا''۔

''ہاں...... بہت زور سے شور کی آوازیں آ رہی تھیں''۔

''پھر کیا ہوا الزبتھ؟'' میں نے اسے غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''کچھ نہیں انکل پھر آپ آ گئے''۔ وہ معصومیت سے بولی۔ میں تھوڑی دیر تک کچھ سوچتا رہا اور پھر میں سردار کے جھونپڑے کی طرف چل پڑا۔ الزبتھ میرے ساتھ تھی۔ گروجن الزبتھ کو دیکھ کر اچھل پڑا۔

''ارے یہ کہاں ملی؟'' وہ خوش ہو کر بولا لیکن دوسرے ہی لمحے اس کے ہونٹ سکڑ گئے اس کے انداز میں ایک پُر اسرار کیفیت نظر آنے لگی۔ پھر اس نے مایوسی سے گردن ہلائی۔

''اوہ...... یہ جمولا کا شکار ہو گئی''۔

''کیا مطلب؟''

''یقیناً اسے لے جانے والا جمولا تھا۔ اور اب یہ اس کی ملکیت ہے وہ جب اور جہاں چاہے اسے حاصل کر سکتا ہے''۔

''مگر کیسے؟'' میں نے پریشان لہجے میں پوچھا۔

''آہ...... یہ اس کی رفاقت کے بغیر کہیں نہیں جائے گی۔ اب یہ اس کے سحر میں گرفتار ہے''۔ سردار نے کہا۔

''یہ کیسے ممکن ہے؟''

''مجھے حکم دو میرے دوست، میں وہی کروں گا جو تم کہو گے''۔

''میں اسے لے کر یہاں سے فوراً نکل جانا چاہتا ہوں''۔

''میری اس اطلاع کے باوجود''۔

''ہاں''۔

''تب تم یہاں رکو...... میں بندوبست کئے دیتا ہوں۔ کاش! تم اس طرح اس منحوس کے اس بھیانک جال سے نکل سکو''۔ سردار نے کہا اور پھر وہ باہر نکل گیا۔ میں نے پریشان نگاہوں سے الزبتھ کو دیکھا۔ وہ اب پھر اتنی معصوم نظر آ رہی تھی۔

''الزبتھ!'' میں نے اسے مخاطب کیا۔

''ہاں...... انکل!''۔

''کیا سوچ رہی ہو؟''

''آپ کچھ پریشان نظر آ رہے ہیں؟''

''اوہ...... نہیں الزبتھ بیٹے۔ میں اگر پریشان تھا تو صرف تمہارے لئے۔ تم ٹھیک ہو تو اب مجھے کوئی پریشانی نہیں''۔

''انکل میں کچھ بیمار ہو گئی تھی کیا۔ مجھے کچھ یاد نہیں آتا کہ صبح کو اس وقت جب لوگ چیخ رہے تھے اور میں سوتے سے جاگ پڑی تھی۔ آپ موجود نہیں تھے۔ اس کے بعد یہ شام کیسے

ہوگئی، انکل، مجھے نہیں معلوم انکل کس طرح ہوگئی۔ مجھے دن بھر کے واقعات یاد کیوں نہ رہے۔ کیا میں سوگئی تھی؟'' اس نے پوچھا اور میں عجیب نگاہوں سے اسے دیکھتا رہا۔

''ہاں...... الزبتھ بیٹے، تم سوگئی تھیں، لیکن اب یہ بتاؤ کہ کیا تم سفر کے لئے تیار ہو؟''

''سفر؟'' الزبتھ نے تعجب سے پوچھا۔

''ہاں......سفر''۔

''لیکن کیوں انکل، کیا ہم یہاں سے جارہے ہیں...... لیکن اتنی جلدی کیوں انکل؟''

''بس الزبتھ، سردار گروجن گھوڑوں کا بندوبست کرنے گیا ہے۔ ہم لوگ آج ہی ابھی اسی وقت یہ بستی چھوڑ دیں گے اور کہیں اور چلے جائیں گے''۔ میں نے کہا اور الزبتھ میری جانب دیکھنے لگی۔

''رات میں انکل؟'' اس نے تعجب سے پوچھا۔

''ہاں بیٹے، رات میں''۔

''لیکن ہم کہاں جائیں گے؟''

''ان لوگوں کے گائیڈ ہمیں کسی مخصوص مقام تک لے جائیں گے، وہاں سے ہم اپنی منزل کی طرف نکل جائیں گے''۔

''آہ انکل، یہ تو میری دلی خواہش ہے...... انکل، کتنی دیر میں یہ لوگ ہمارے ساتھ چلیں گے؟''

''میرا خیال ہے تھوڑی دیر کے بعد''۔ میں نے کہا اور الزبتھ مسرور نظر آنے لگی۔ اس کے چہرے پر وہی معصومیت تھی جو میں اس سے پہلے بھی دیکھتا رہا تھا، لیکن میرے ذہن میں سردار کے کہے ہوئے الفاظ کا خوف ابھی باقی تھا کہ کہیں سردار کی بات سچ ہی نہ ثابت ہو۔

بے چارہ سردار گروجن میرے ساتھ بھرپور تعاون کررہا تھا۔ وہ مجھ سے کم پریشان نظر نہیں آتا تھا۔ چھ گھڑ سوار ہماری رہنمائی کے لئے تیار تھے۔ ان کے علاوہ تین گھوڑے اور تھے جن میں سے دو ہماری سواری کے لئے اور ایک گھوڑے پر ضرورت کا سامان تھا۔ سردار مجھے بستی کی سرحد تک چھوڑنے آیا، وہ اب بھی پریشان تھا۔

''میری بستی میں تمہارے ساتھ بہتر سلوک نہیں ہوسکا نوجوان، جس کے لئے میں طویل عرصے تک شرمندہ رہوں گا۔ میری دعا ہے کہ شلوکا دیوی کی مدد سے تم اس شیطان کے

نکل جاؤ، لیکن اگر تمہیں کوئی دقت محسوس ہوتو میرے دوست، گروجن کو اپنا دوست سمجھ کر اس کے پاس آجانا''۔

''میں تمہاری اس دوستی کو یاد رکھوں گا، گروجن''۔ میں نے جواب دیا اور پھر رخصت ہوکر ہم چل پڑے۔ آسٹریلیا کے خطرناک علاقے میں رات کا سفر بے حد بھیانک تھا۔ وحشی اور خونخوار درندے چاروں طرف بھٹکتے پھرتے تھے اور تاریک راتوں میں تو ان کا خطرہ اور بھی بڑھ جاتا تھا۔

جن لوگوں کو گروجن نے ہمارے ساتھ کیا تھا اور بے حد نڈر اور تجربہ کار لوگ تھے۔ ساری رات وہ ہمارے ساتھ بے تھکان سفر کرتے رہے اور یہ بھی اتفاق تھا کہ راستے میں کوئی قابل ذکر واقعہ نہیں ہوا تھا۔

صبح کو ہم نے خود کو ایک سرسبز و شاداب جنگل میں پایا۔ جنگل زیادہ گھنا نہیں تھا اور درختوں کے نیچے سبزہ پھیلا ہوا تھا۔ ایک انتہائی گھنے سایہ دار درخت کے نیچے میں نے گھوڑا روک دیا۔ الزبتھ کے چہرے پر تھکان نمایاں تھی۔

''تھک گئیں......الزبتھ؟''

''بے حد انکل......'' الزبتھ نے جواب دیا۔

''تو اب آرام کرو...... یہ عمدہ جگہ ہے''۔ میں نے کہا اور پھر میں اپنے گائیڈ سیاہ فاموں سے بات کرنے لگا۔ میں نے پروگرام بنایا تھا کہ دوپہر تک آرام کریں گے۔ دوپہر کے بعد سفر کریں گے، تاکہ رات کو کسی مناسب جگہ قیام کرسکیں۔ سیاہ فاموں نے سعادت مندی سے گردن ہلادی۔ ان بے چاروں نے ہمارے لئے آرام کا بندوبست کیا اور پھر خوراک کا سامان اتارنے لگے۔

سردار نے انہیں خاص طور سے ہمارے آرام کا خیال رکھنے کی ہدایت کی تھی۔ اسی لئے ہمارے سارے کام انہوں نے کئے اور کھانے پینے کے بعد ہم آرام کرنے لیٹ گئے۔ الزبتھ اب متوازن تھی، اس کے انداز میں پہلے جیسی معصومیت پیدا ہوگئی تھی لیکن میں اس کی طرف سے غیر مطمئن تھا۔ دوپہر ڈھل گئی اور اب پھر ہم نے دوبارہ سفر کی تیاریاں شروع کردیں۔ تھوڑی دیر کے بعد ہم اس جنگل کو عبور کررہے تھے۔ چونکہ آرام کرچکے تھے اور تھکن دور ہوچکی تھی، اس لئے ہم اس وقت تک سفر کرتے رہے جب تک تاریکی کافی گہری نہ ہوگی۔ ہم

نے دوبارہ آرام کے لئے مناسب جگہ کا انتخاب کیا۔ اونچے اونچے ٹیلے چاروں طرف کر ہوئے تھے۔ کہیں کہیں درخت بھی تھے۔ ایک خوبصورت جگہ منتخب کرکے ہم وہاں رک ابھی تک سفر پُرسکون رہا تھا۔ کوئی ایسی بات نہیں ہوئی تھی جو تشویش ناک ہوتی۔

رات کے کھانے کے بعد دیر تک الزبتھ مجھ سے گفتگو کرتی رہی۔ خود اس کی سمجھ میں آرہا تھا کہ یہ پُرصعوبت سفر کس طرح ختم ہوگا۔ اپنے اوپر گزرے ہوئے حالات کا اسے علم نہیں تھا۔ پھر وہ حسبِ معمول سونے کے لئے لیٹ گئی۔ میں بھی اس سے تھوڑے فاصلے پر لیٹ گیا تھا۔ ہم سے کچھ دور سیاہ فام محافظ آرام کررہے تھے۔ وہ بے چارے دو دن سے جاگ رہے تھے۔ گروجن نے ہماری بے لوث خدمت کی تھی۔ میں اس سے بہت متاثر تھا لیکن اس بے چارے کے لئے میں کچھ نہیں کرسکا تھا۔

آخری رات کا چاند تھا۔ پہلے تو تاریکی رہی، پھر آہستہ آہستہ روشنی ہوگئی۔ میری آنکھیں نیم غنودہ ہوئی ہی تھیں کہ میں نے کسی کو اپنے قریب محسوس کیا اور چونک پڑا۔ الزبتھ میرے سرہانے موجود تھی۔

"نیند نہیں آرہی؟" میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا اور وہ بھی مسکرادی، لیکن اس کے کسی قدر تبدیلی نظر آرہی تھی۔ یہ تبدیلی میرا احساس تھا۔ کوئی خاص واقعہ نہیں ہوا تھا، لیکن ساعت کے بعد میرے اس احساس کی تصدیق ہوگئی۔ وہ کھسک کر میرے نزدیک آگئی۔ " عورت بنا چاہتی ہوں میں جوان ہوگئی ہوں"۔ اس کی آواز ابھری اور میں اچھل پڑا۔

"الزبتھ"۔ میں نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔ "ہوش میں آؤ"۔

"مجھے مایوس نہ کرو...... ورنہ......"

میرا بھرپور ہاتھ اس کے منہ پر پڑا اور وہ کئی فٹ دور جاگری تھی۔

"ٹھیک ہے تم مجھے قبول نہ کرو، میں جارہی ہوں"۔ بات حد سے گزر گئی تھی، میں اس کے حال پر نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ چنانچہ میں نے لپک کر اسے پکڑا اور پھر میرا ہاتھ اس کی گردن کی پشت پر پڑا وہ لہرا کر زمین پر آرہی۔ وہ بے ہوش ہوگئی تھی۔

میں نے اسے اٹھا کر اس کی جگہ پر لٹادیا۔ دیر تک اس کے نزدیک بیٹھا اس کے بارے میں سوچتا رہا۔ پھر میں نے سوچا کہ دن رات سفر کرنا ہوگا تاکہ اس طلسمی ماحول سے جتنی جلد ہوسکے، دور نکل جاؤں۔ کچھ بھی ہوجائے میں الزبتھ کو بے سہارا نہیں چھوڑوں گا۔

اطمینان سے اپنی جگہ موجود تھے۔ ان بے چاروں کو صورتِ حال کا کوئی علم نہیں تھا۔ دیر تک طرح بیٹھا رہا، پھر اس کے نزدیک ہی دوبارہ لیٹ گیا۔

چاند نمایاں سفر کرتا رہا تھا اور ہوا اتنی خوشگوار چل رہی تھی کہ آنکھوں میں نشہ سا اتر رہا تھا اور پھر یہ میرے حواس پر چھا گیا اور میں دوبارہ سوگیا۔ اس بار سیاہ فاموں نے مجھے جگایا تھا۔ دور پہاڑوں کی اوٹ سے اجالا ابھر رہا تھا۔ سیاہ فام مجھے جھنجھوڑ رہے تھے، میں چونک کر اٹھ بیٹھا۔

"آپ کی ساتھی لڑکی گھوڑے پر بیٹھ کر اس طرف گئی ہے۔ ہم نے دو آدمی اس طرف دوڑا دیئے ہیں"۔ ایک سیاہ فام نے بتایا۔

میں نے گہری سانس لی۔ میں الجھ گیا تھا۔

بہرحال ہم نے اپنے اپنے گھوڑے سنبھال لئے اور پھر ہم بھی اس طرف دوڑ پڑے۔ سورج ابھر آیا تھا، لیکن ان لوگوں کا کوئی پتہ نہ چل سکا۔ یہ وہی رخ تھا جس سے ہم آئے تھے۔ ہم دوبارہ بستی کی طرف جارہے تھے۔ میرے دل میں بھنور اٹھ رہے تھے۔ دل چاہ رہا تھا کہ الزبتھ کو جہنم میں جھونک کر آگے بڑھ جاؤں، لیکن پھر خیال آتا کہ وہ بے قصور ہے۔ یہ سب جولا کا ہی شیطانی چکر ہے۔ میں شیطان کو کامیاب نہیں ہونے دوں گا۔ میرے دانت بھنچ گئے اور ہم بغیر رکے سفر کرتے رہے۔ شام کو سورج چھپے ہم بستی پہنچ گئے، جہاں ہماری ملاقات گروجن اور ان دونوں سیاہ فاموں سے ہوئی تھی۔

سیاہ فاموں کی حالت خراب تھی۔ ان کے بدن جھلسے ہوئے تھے اور جگہ جگہ سے گوشت نکل آیا تھا۔ شاید وہ ابھی گروجن کے پاس پہنچے تھے۔ گروجن کے چہرے پر مردنی چھائی ہوئی تھی۔ اس نے میری طرف دیکھا اور مایوسی سے بولا۔

"میں نے پہلے ہی کہا تھا"۔

"ان لوگوں کو کیا ہوا؟" میں نے افسردہ نگاہوں سے ان دونوں سیاہ فاموں کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"انہی سے سنو"۔ گروجن نے کہا۔

"کیا ہوا تم لوگوں کو؟" میں نے پوچھا۔

"ہم لڑکی کا تعاقب کرتے ہوئے سیاہ پہاڑوں تک گئے تھے۔ وہ گھوڑے سمیت پہاڑوں میں غائب ہوگئی۔ ہم پہاڑوں میں بھٹک رہے تھے کہ اچانک پہاڑوں سے شعلے نکلے

اور ہم شعلوں میں گھر گئے ہمارے گھوڑے جل کر ہلاک ہوگئے اور ہم بمشکل باہر نکلنے میں کامیاب ہوسکے''۔

''اوہ...... یہ حرکت اس شیطان کے علاوہ کسی کی نہیں'' گروجن نے کہا۔

''لڑکی کا کوئی پتہ نہیں چل سکا؟'' میں نے شعلہ بار نگاہوں سے انہیں گھورتے ہوئے

''نہیں، اس کا نام ونشان تک نہیں مل سکا''۔

''ہوں...... گروجن، ان کے علاج کا بندوبست کرو۔ مجھے افسوس ہے کہ تمہیں میری وجہ سے سخت پریشانی اٹھانی پڑی۔ میں دیکھوں گا کہ وہ کتنا بڑا جادوگر ہے''۔ رات کو گروجن دیر تک میرے پاس بیٹھا رہا۔ وہ بہت مایوس تھا اور مجھ سے بھی مایوسی کی گفتگو کررہا تھا۔

''یقین کرو میرے دوست، تمہاری خواہش پر مجھے کوئی اعتراض نہیں لیکن ایک مہمان کی حیثیت سے میں تمہیں اس خطرے سے بچانا چاہتا ہوں''۔

''میں تمہارے خلوص کو دل سے قبول کرتا ہوں، لیکن اب میرے لئے یہ ضروری ہے
کے علاوہ اور میں کیا کرسکتا ہوں''۔

دوسرے دن میری درخواست پر گروجن مجھے وہاں لے گیا جہاں ہزار راتوں کے پتھر کی زندگی گزار رہے تھے۔ بڑا پُراسرار علاقہ تھا۔ گروجن مجھے ان لوگوں کے بارے میں بتا رہا تھا جو بظاہر سیاہ پتھر کے مجسمے نظر آرہے تھے۔ یہ سن کر حیرت ہوتی تھی کہ وہ کبھی انسان تھے۔ اس نے ان شیطانوں کی روایات بتا کر مجھے خوفزدہ کرنے کی کوشش کی، لیکن خوف کا میرے نزدیک گزر نہ تھا۔ ''یہ تمام وہ لوگ تھے جنہوں نے اپنی قوتوں سے بستی کی بنیاد کررکھی تھی۔ انہوں نے وہ سب کیا جو وہ کرسکتے تھے اور جس کی جتنی زندگی تھی اس نے ہی انسانوں کا خون پی لیا۔ گو بے شمار افراد لقمہ اجل بنے اور ان کی زندگیاں اس طرح ہوگئیں۔ سو میرے دوست، میرے معزز مہمان یہ مناسب نہیں کہ تم خود کو اس نوجوان کی حیثیت سے پیش کرو جسے جمولا کی خدمت میں اس لئے بھیجا جاتا ہے کہ وہ اس سے اپنی کی پیاس بجھائے۔ ہم لوگ تو اس کے عادی ہیں اور ہماری تقدیریں یہی ہیں۔ گناہ ہماری زمین سے اُگا ہے اور ہمارے ہی خون سے سیراب ہونا چاہئے۔ تم چند روز کے لئے یہاں آئے ہو، تمہاری زندگی خطرے میں کیوں ڈالی جائے''۔

''نہیں گروجن، یہ تو ممکن نہیں کہ میں اس لڑکی کو یہاں چھوڑ کر اپنی زندگی بچانے

آگے بڑھ جاؤں، چنانچہ میں نے جو فیصلہ کیا ہے مجھے اس پر اٹل رہنے دو اور میری مدد کرو''۔

گروجن نے گردن جھکالی پھر وہ مردہ سی آواز میں بولا۔

''ٹھیک ہے، اگر تم اس حد تک بضد ہو تو میں خاموش ہوا جاتا ہوں''۔

❀❀❀❀

چاند آخری راتوں کا سفر طے کررہا تھا۔ پھر ایک رات وہ ڈوب گیا۔ گویا وہ ڈوبتے چاند کی آخری رات تھی اور اس رات کو آخری پہر اس نوجوان کو سیاہ پہاڑوں میں بھیجا جانے والا تھا جو اس بار جمولا کا نشانہ بننے کے لئے تیار تھا۔

ان چند دنوں میں الزبتھ کا کوئی پتہ نہیں چل سکا تھا اور میرا دل اس کے لئے خون کے آنسو رورہا تھا۔ مجھے الزبتھ کی وہ کیفیت یاد آئی جس کا اظہار اس رات ہوا تھا۔ معصوم الزبتھ کے چہرے پر ایک جوان عورت کے جذبات تھے اور میرا دل کسی طور پر یہ بات تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں تھا۔

سردار خاصا مایوس تھا۔ بہرصورت وہ میری راہ میں آنا بھی نہیں چاہتا تھا، چنانچہ تاریک رات کے آخری پہر اس نے مجھے الوداع کہا اور میں سیاہ پہاڑوں کی طرف چل پڑا۔

سردار نے مجھے بتادیا تھا کہ مجھے وہاں جاکر کیا کرنا ہے۔ میرا ذہن عجیب سے خیالات میں ڈوبا ہوا تھا۔ ان خیالات میں خوف کا عنصر تو نہیں تھا، البتہ ایک الجھن ضرور تھی۔ میں سوچ رہا تھا کہ ان شیطانی قوتوں کا کوئی علاج میرے پاس نہیں۔ تب میں نے رک کے ان سچے جذبوں کو آواز دی۔ میں نے سوچا کہ میں نے سچائی کی راہ میں قدم رکھا ہے۔

مجھے آسمانوں سے امداد درکار ہے اور میں نے ایک روشنی کوندتے دیکھی۔ ایک مرمریں پیکر میرے سامنے نمودار ہوا اور اس کی نقرئی آواز اُبھری۔

''آسمان کے رہنے والے سچائی کے ساتھی ہوتے ہیں۔ میں دیوی شلوکا ہوں اور یہ سرخ پتھر تیری ملکیت ہے جو بالآخر جمولا کی موت بن جائے گا''۔ اس نے ایک چمکدار پتھر میرے حوالے کرتے ہوئے کہا۔ نقرئی آواز پھر سنائی دی۔

''اس کے جادو کی ہزار راتیں پوری ہوچکی ہیں اور وہ غافل ہے۔ وہ ان دنوں کا حساب بھول گیا ہے۔ جا آسمان والا تیری حفاظت کرے گا اور اسے موت دے گا''۔ اس کا مرمریں پیکر فضاؤں میں تحلیل ہوگیا۔ میں اس سرخ پتھر کو ہاتھ میں لئے حیران کھڑا تھا، نہ جانے کیوں

مجھے اپنے وجود میں ایک بے خوفی کا احساس ہوا۔ یوں لگا تھا جیسے اب میرے لئے کامیابی
کامیابی ہو۔

تاریکی میں، میں ان پہاڑوں کی جانب تیزی سے سفر کر رہا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد اس ہیبت ناک اندھیرے میں داخل ہو گیا۔ وہ چشمہ جس کے بارے میں گروجن نے مجھے تھا، سامنے ہی موجود تھا اور وہاں ایک تنہا درخت کے نیچے ایک مشعل موجود تھی جس کا پہلے ہی ہو گیا تھا۔ میں درخت کے نیچے کھڑا ہوا اور میری نگاہیں چاروں طرف بھٹکنے لگیں۔ اچانک مجھے عقب سے آواز سنائی دی۔

''آہ...... میں پیاسا ہوں...... میں کس قدر پیاسا ہوں، کون میری پیاس بجھائے گا تم؟'' وہ اچانک میرے سامنے آ گیا۔ مشعل کی روشنی میں...... میں نے اس کی شکل دیکھی ہیبت ناک شکل تھی۔ سیاہ فام تو تھا ہی، نچلا ہونٹ ٹھوڑی تک لٹکا ہوا تھا اور اس کے لمبے دانت نظر آنے لگے۔ ناک طوطے کی چونچ کی طرح مڑی ہوئی تھی۔ بدن اچھا خاصا توانا تھا۔

''کیا تُو میری پیاس بجھائے گا؟'' اس نے پوچھا پھر خود ہی بڑبڑایا۔

''تُو کون ہے...... تُو اس بستی سے تو نہیں ہے۔ اوہ سمجھ گیا، سمجھ گیا میں، اس لڑکی کا ہاں وہی تو ہے۔ میں نے عبادت کی صبح تجھے دیکھا تھا، لیکن یہ گروجن بڑا عیار ہے۔ اس تجھ سے پیچھا چھڑانے کے لئے یہ سوچا خوب، کوئی ہرج نہیں مگر تُو کیا پئے گا''۔

''تیرا خون؟'' میں نے جواب دیا۔

''اوہو...... اوہو...... کیا واقعی...... پی لے پی لے...... یہ خنجر لے لے اور جہاں تیرا چاہے بھونک دے''۔ اس نے ایک لمبا خنجر نکال کر میرے ہاتھ میں دے دیا، میں نے بغور دیکھا۔ ایک لمحے کے لئے میں چکرا کر رہ گیا تھا۔

''بجھا لے اپنی پیاس بجھا لے۔ یا پھر میری پیاس بجھا دینا''۔ میں نے خنجر اس کے سے لے لیا۔ جمولا سینہ کھول کر میرے سامنے آ گیا۔ میں جانتا تھا کہ اس پیش کش میں خاص بات ضرور ہے، تاہم میں یہ دیکھنا چاہتا تھا۔ میں نے خنجر پوری قوت سے اس کے میں بھونک دیا۔ یوں لگا جیسے میں نے خنجر کسی کاہی میں اتار دیا ہو۔ پھر میں نے اسے اسے کئی بار جمولا کے بدن میں جگہ جگہ بھونکا لیکن کہیں سے خون کا ایک قطرہ بھی نہ نکلا مکروہ انداز میں ہنس پڑا۔

''اب میں کیا کروں، میرے بدن میں تو خون ہی نہیں ہے۔ اب تو اجازت ہے؟''

''اجازت ہے''۔ میں نے کہا اور خنجر جمولا کو واپس دے دیا۔ اس نے خنجر میرے ہاتھ سے لیا اور اچانک وحشیانہ انداز میں اچھلنا کودنا شروع کر دیا اور پھر انتہائی صفائی سے وہ خنجر میری گردن میں اتارنے کی کوشش کرنے لگا۔ لیکن خنجر کی دھار مڑ گئی، جس قوت سے وہ میری گردن میں پیوست کیا گیا تھا، اس کے تحت وہ پہلا اور آخری وار ہونا چاہئے تھا، لیکن اس نے مڑے ہوئے خنجر کو دوبارہ دیکھا اور پھر اسے چٹکیوں سے پکڑ کر سیدھا کیا۔

اس بار اس نے خنجر میرے سینے میں بھونکا تھا، لیکن اس بار خنجر دوبارہ سیدھا ہونے کے قابل ہی نہیں رہا۔

''کیا تیرا بدن پتھر کا ہے؟'' اس نے وحشیانہ انداز میں کہا۔

''نہیں جمولا، بلکہ تیری قوت ختم ہو گئی ہے۔ شاید تُو ان دنوں کا حساب نہیں رکھ سکا۔ ہزار راتیں پوری ہو چکی ہیں جمولا اور یہ رات میری ہے''۔ میں نے کہا اور جمولا ساکت ہو گیا۔ شاید وہ ان دنوں کا حساب لگا رہا تھا، دوسرے ہی لمحے اس نے ایک سمت چھلانگ لگا دی اور ایک غار میں داخل ہو گیا، لیکن اب میں اس کا پیچھا کیا چھوڑتا، میں بھی غار میں داخل ہو گیا۔

بدبو کا ایک شدید بھبکا میری ناک سے ٹکرایا۔ میں نے جمولا کو تلاش کیا، لیکن اس کشادہ غار میں وہ مجھے نظر نہیں آیا۔ البتہ سامنے ہی ایک سرنگ سی اور موجود تھی۔ کشادہ غار میں دیواروں میں مشعلیں لگی ہوئی تھیں اور ان کی روشنی نہایت بھیانک منظر پیش کر رہی تھی۔

پورے غار میں جانوروں کے مردہ ڈھانچے پڑے ہوئے تھے۔ کہیں کہیں انسانی ڈھانچے بھی موجود تھے جن میں گوشت چپکا ہوا تھا۔ اس کے علاوہ بھی ایسی ہی مکروہ چیزیں تھیں۔ میں اس سرنگ کی طرف بڑھ گیا اور سرنگ کے دوسرے دہانے پر مجھے ایک اور روشن غار نظر آیا۔ اس غار کی روشنی بہت تیز تھی۔ میں بے تھکان اندر داخل ہو گیا۔ یہ غار زیادہ کشادہ نہیں تھا۔ سامنے ہی سفید رنگ کا تخت بچھا ہوا تھا۔ جس میں اعلیٰ درجے کے جواہرات نصب تھے اور انہی جواہرات کی روشنی سے غار منور تھا۔ مکروہ جمولا اس تخت پر بیٹھا ہوا تھا، اس نے پاؤں بھی اوپر اٹھائے ہوئے تھے اور اس کے عقب میں ایک کرسی پر الزبتھ بھی بیٹھی ہوئی تھی۔ لیکن اس خوفناک اور وحشت زدہ شکل میں جس میں، میں نے اس دن اسے دیکھا تھا، جس دن وہ اغواء ہوئی تھی۔ اس کے ہونٹوں پر ایک خوفناک مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔ جمولا نے

چہرے پر خوف کے آثار تھے۔

''تم کون ہو؟ کون ہو تم؟'' اس نے سہمی ہوئی آواز میں کہا۔

''تم خوفزدہ ہو، جمولا؟''

''نہیں ہرگز نہیں...... تم میرا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتے...... بگاڑ کر دیکھ لو۔ میں تم دور ہوں کہ تم مجھ تک پہنچ ہی نہیں سکتے۔ میں تم سے ہزاروں میل دور ہوں سمجھے...... میل''۔ اس نے کہا۔

''تم شاید پاگل بھی ہوگئے ہو، مجھے ہلاک کرو۔ آؤ میرا خون پیو تم...... تم ناں''۔ میں نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔

''دھوکہ ہوگیا ہے، دیکھ لوں گا، گروجن کو دیکھ لوں گا، بستی والوں کو بھی۔ پوری بستی نہ پی جاؤں تو نام نہیں۔ اس نے تمہیں کیوں بھیجا؟ اب اس کے لئے مصیبتیں ہ ہیں''۔ جمولا نے کہا۔

میں بدستور آگے بڑھ رہا تھا اور ایک لمحے میں مجھے انوکھا احساس ہوا۔ میرے کے درمیان جتنا فاصلہ تھا، وہ تو چند قدموں میں طے ہوجانا چاہئے تھا۔ میں مسلسل آ رہا تھا، لیکن فاصلہ جوں کا توں تھا۔ ایک لمحے کے لئے میں ٹھٹک گیا اور اسی وقت بد نے قہقہہ لگایا۔

''آؤ...... آؤ...... رک کیوں گئے۔ مجھ تک پہنچنے کی کوشش کرو۔ تم یہ فاصلہ سا نہیں طے کرسکو گے، بڑھتے رہو''۔ لیکن میں وہیں رہ گیا۔ یہ صورتِ حال تعجب خیز تھی یہ احساس ہوگیا تھا کہ یہاں میں ناکام رہا ہوں۔ چنانچہ اس کا خوف آہستہ آہستہ دو تھا، لیکن اس نے پاؤں زمین پر نہیں رکھے تھے اور اسی طرح بیٹھا ہوا تھا، پھر اس نے

''یہ تخت میری آخری پناہ گاہ ہے۔ جب تک میرے پاؤں اوپر رہیں گے، تو پہنچ سکے گا۔ کیا سمجھا؟'' اس کی آنکھوں میں کامیابی جھلکنے لگی اور میرے چہرے پر تنو

میں گہری نگاہوں سے اس کا جائزہ لے رہا تھا، پھر میں نے کہا۔

''ممکن ہے ایسا ہو لیکن تمہاری دیوی نے یہ سرخ پتھر مجھے دیا اور کہا کہ اس موت پوشیدہ ہے۔ اگر یہ سرخ پتھر اتنی ہی بے کار چیز ہے تو میں اس کا کیا کروں'' یہ کہہ کر میں نے پتھر اس کے تخت پر اچھال دیا۔ میں نے دیکھا کہ بجلی سی کوند

شعلے ابھرنے لگے۔ اس کے ساتھ ہی جمولا کی دردناک چیخیں ابھرنے لگیں۔ وہ شعلوں میں گھر گیا اور اس کا وجود خاکستر ہونے لگا۔

میں گہری نگاہوں سے اس کا جائزہ لے رہا تھا۔ الزبتھ اس طرح کھڑی ہوئی تھی جیسے خواب سے جاگی ہو۔ واقعی وہ ان تمام معاملات سے بے خبر تھی۔ اس نے معصوم لہجے میں کہا۔

''کیا بات ہے انکل؟''

''آؤ......'' میں بھاری لہجے میں بولا۔

اب میں آزاد تھا اور نہ جانے کیوں مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے شلوکا میری رہنمائی کر رہی ہو، حالانکہ میرا ذہن ان باتوں کو قبول نہیں کرتا تھا، لیکن بہت کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ بہرحال اس کے بعد میں ایک مہذب آبادی میں داخل ہوگیا اور پھر نہ جانے کہاں کہاں سفر کرتا ہوا کہاں نکل آیا۔

اب میری زندگی میں صرف الزبتھ تھی۔ یہ لڑکی اس سرکش کو تو بہت پہلے ہلاک کر چکی تھی جو دنیا کا دشمن تھا، لیکن جہاز میں اس کے آنسوؤں نے مجھے قتل کردیا تھا اور اب میرے سینے کے بچے جذبات زندہ تھے اور میرا ذہن ایک ہی بات سوچ رہا تھا کہ اسے ایک حسین زندگی دینے کے لئے میں کیا کروں۔

ہمارے پاس کہیں کوئی جگہ نہیں تھی۔ الزبتھ کے بے ترتیب لباس اور خشک ہونٹ دیکھ کر میرا کلیجہ کٹتا تھا۔ پھر ایک دن جب وہ فاقہ کشی سے نڈھال ہوگئی تو میں نے خود سے خود کو ادھار مانگ لیا۔ صرف چند لمحات کے لئے میں نے اپنی قدیم زندگی اپنالی، لیکن اس بار اپنے لئے نہیں الزبتھ کے لئے اور اس خوفناک ڈکیتی کی کہانیاں کافی دن تک اخبارات کی زینت بنی رہیں، جس میں صرف ایک ڈاکو نے 5 افراد کو ہلاک کرکے بینک لوٹا تھا، البتہ اس جگہ رکنا اب موت کو دعوت دینا تھا۔ میں الزبتھ کو لے کر ایک بار پھر اسی سرزمین پر آگیا جہاں سے میرا خمیر اٹھا تھا۔

الزبتھ مجھ سے مکمل طور پر مطمئن تھی۔ میں نے ایک قطعہ زمین خریدا۔ ایک خوبصورت مکان بنایا اور ایک نیک نام انسان کی حیثیت سے زندگی گزارنے لگا۔ میں نے اپنی فطرت اور عادت میں نمایاں تبدیلی پیدا کرلی تھی، لیکن تقدیر کے کھیل نرالے ہوتے ہیں۔ الزبتھ جوانی کی زندگی میں قدم رکھ چکی تھی۔ میں نے الزبتھ کے لئے اپنی ساری زندگی وقف کردی تھی اور اس

کے ساتھ ایک چھوٹا سا کاروبار بھی کرلیا تھا۔ میرا معاون سعدی سجاد ایک نوجوان آدمی تھا
اکثر میرے گھر آتا جاتا رہتا تھا۔ الزبتھ سے بھی اس کی ملاقاتیں ہوئی تھیں لیکن میں نے
اس بارے میں کچھ نہیں سوچا، ہاں اس وقت ایک ہی لمحہ میرے لئے قیامت بن گیا، جب میں
نے الزبتھ کو سعدی کے ساتھ ایک خوبصورت ہوٹل میں دیکھا۔ مجھے اندازہ ہوگیا کہ دونوں ایک
دوسرے کی قربت میں بہت آگے نکل گئے ہیں۔ پتا نہیں کیوں میرے اندر کا حیوان جاگ
اٹھا۔ نفرت اور حقارت کے اس ابھرتے ہوئے جذبے نے مجھے مجبور کردیا کہ میں خود کو
دوں۔ میں نے اپنا تاج محل مسمار ہوتے ہوئے دیکھا تھا۔ الزبتھ نے مجھے اعتماد میں لئے بغیر
ایک ایسا عمل کر ڈالا تھا۔ بہرحال میں نے سعدی کے بارے میں معلومات حاصل کیں۔ وہ
ایک برا انسان تھا اور اس سے پہلے بھی کئی لڑکیوں کو جھانسے میں لاکر انہیں برباد کرچکا تھا۔
میں نے الزبتھ سے بات کی۔

"کہاں جارہی ہو؟" میں نے پوچھا تو وہ سہم گئی۔

"تم سمجھ دار ہوچکی ہو، تمہیں اپنے لئے صحیح راستوں کا انتخاب کرنا ہوگا"۔

"انکل"...... الزبتھ کی پھنسی پھنسی آواز ابھری۔

"ہاں...... میں دیکھ رہا ہوں تم غلط راستوں پر بھٹک رہی ہو۔ وہ شخص قابلِ اعتبار نہیں
اور میں تمہاری اس سے قربت پسند نہیں کرتا"۔

"انکل"۔ الزبتھ کے لہجے میں احتجاج تھا۔

"ہاں! تمہیں میری پرانی زندگی کے بارے میں کچھ نہیں معلوم۔ میں نے تمہارے لئے
ایک نیا جنم لیا ہے"۔

"انکل، میں اپنی مرضی کی مالک ہوں۔ آپ کے احسانات بے شک مجھ پر ہیں، لیکن
اس کا مطلب یہ نہیں کہ میں آپ کی غلام بن کر رہ جاؤں۔ میں بالغ ہوں اور اب مجھے اپنی
زندگی گزارنے کے لئے آزادی چاہئے۔ سعدی کے بارے میں آپ نے جو کچھ کہا، وہ پہلے
ہی مجھے اس کے بارے میں بتا چکا ہے"۔

"تم کیا کہنا چاہتی ہو؟"

"صرف یہ کہ مجھے آزادی دیجئے، میں آپ کو دھوکے میں نہیں رکھنا چاہتی"۔

"اور جو کچھ میں نے تمہارے ساتھ کیا ہے، اس کی کوئی حیثیت ہے تمہارے ذہن میں

انکل! میری زندگی کے ان قیمتی لمحات کی حفاظت کا معاوضہ کیا ہوگا؟"

"معاوضہ دینا چاہتی ہو تم؟"

"ہاں انکل! میں جارہی ہوں"۔ اور یہ کہہ کر وہ وہاں سے چلی گئی۔

اس کے بعد میں نے سعدی کو طلب کیا، لیکن الزبتھ بھی ساتھ ہی آگئی تھی۔ میں نے
بہت کچھ غور کیا تھا۔ اس دوران میں نے سعدی سے کہا۔

"میں نے تمہیں ایک خاص مقصد سے بلایا ہے، سعدی"۔

"جی سر!"

"تمہاری سابقہ زندگی میرے سامنے ہے اور تم ایک برے انسان ہو، اس کے باوجود تم
الزبتھ کو فریب دے رہے ہو۔ تمہارے پاس واپسی کا کوئی راستہ ہے؟"

"میں واپسی کا عادی نہیں ہوں"۔ اس نے بے خوفی سے کہا۔

"افسوس تم میرے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔ اگر جانتے ہوتے تو شاید اس لہجے میں
مجھ سے بات نہ کرتے"۔

"یہی تو میری خوش بختی ہے کہ میں آپ کے بارے میں سب کچھ جان گیا ہوں۔ ڈاکٹر
مجر کے قاتل کی فائل آج تک بند نہیں ہوئی اور اس میں آج بھی آپ کی تصویر موجود ہے۔
بے شک وہ تصویر پرانی ہے، لیکن پولیس کی نگاہ بہت تیز ہوتی ہے"۔

میرے بدن کو شدید جھٹکا لگا تھا، لیکن میں نے خود کو سنبھال لیا اور مسکرا کر کہا۔

"اس کے علاوہ بھی بہت سے قتل کئے ہیں میں نے"۔

"ہاں...... الزبتھ مجھے بتا چکی ہے۔ آپ دنیا کے کئی ملکوں کی پولیس کو درکار ہیں، لیکن
انکل، اب آپ کو یہ دنیا ہم نوجوانوں کے لئے چھوڑ دینی چاہئے"۔

"گویا تم دونوں کے بارے میں میرا فیصلہ ٹھیک تھا؟" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"کیا فیصلہ کیا آپ نے ہمارے لئے؟"

"یہ......" میں نے پستول نکال کر ان کا نشانہ لیا اور ایک ایک گولی ان کے سینے میں
اتاردی۔ میرے نزدیک دو قتل کرنا کیا معنی رکھتا تھا، لیکن ابھی وہ تڑپ ہی رہے تھے کہ پولیس
کے بے شمار افراد اندر گھس آئے اور میں ان میں سے صرف چند کو ہلاک کرسکا۔ بعد میں مجھے
پتا چلا کہ سعدی میرے بارے میں پولیس کو اطلاع دے کر یہاں تک پہنچا تھا۔ آخرکار پولیس

یہاں پہنچ گئی اور پولیس کے تین چار افراد کو قتل کر دینا میرے لئے مشکل نہیں تھا۔ یہ قتل کے بعد میں تین دن تک چھپا رہا۔ مجھے اپنے مستقبل کا حل چاہئے تھا۔ کتنی بار مجھے موت ہو سکتی ہے مگر موت مجھ تک پہنچ ہی نہیں پاتی۔ میں نے دل میں یہ فیصلہ کیا کہ کسی شخص سے معلومات کروں کہ میرا مستقبل کیا ہونا چاہیے۔ اور مجھے تم بہتر نظر آئے۔ سنا ہے لوگوں کی مشکلوں کا حل پیش کر دیتے ہو؟''

میری کھوپڑی چیخ کر رہ گئی تھی۔ ناصر فرازی اس وقت موجود نہیں تھا۔ میں بھلا اسے مشورہ دیتا۔ عجیب بات تھی، ویسے تھا اپنی ہی نسل کا آدمی مگر مزاج ذرا مختلف، میں نے تو مقصد ایک جذبے کے تحت قتل کئے تھے اور اس کے بعد میری زندگی کے بہت سے رخ بدل گئے ہوئے تھے، لیکن یہ شخص میرے نزدیک دیوانہ تھا۔ وہ گہری نگاہوں سے میرا جائزہ لے رہا تھا اس سے پہلے کہ میں کچھ بولتا، اچانک ہی پیچھے آہٹ سی ہوئی اور ایک پولیس آفیسر چند کے ساتھ اندر گھس آیا۔ اس نے پلٹ کر پیچھے دیکھا اور ایک دم چوکنا ہو گیا۔ پولیس آفیسر بھی ہوش اُڑ گئے تھے، لیکن اس نے فوراً ریوالور نکال لیا۔ اس وقت شاید اس شخص کے پاس ریوالور وغیرہ نہیں تھا ورنہ اس دفتر میں ہی قتل و غارت گری کا بازار گرم ہو جاتا۔

پولیس آفیسر نے پوری طرح گھیرا ڈال لیا اور اسے گرفتار کر لیا گیا۔ بڑی عجیب اور دلچسپ بات ہے، اس کی تقدیر کا فیصلہ خود بخود ہو گیا تھا اور میں اسے کوئی صحیح مشورہ بھی نہ دے پایا تھا۔ بعد میں مجھے کچھ دلچسپ تفصیلات معلوم ہوئیں۔ ناصر فرازی نے ہی مجھے کچھ بتایا تھا۔

''یار، یہ ہو کیا رہا ہے آخر کیا ہم واقعی سچ مچ کے درویش بنتے جا رہے ہیں؟ تم یقین لگ رہا ہے، کچھ ہی عرصے میں ہماری شہرت آسمان تک پہنچ جائے گی'' میں خاموشی سے جذباتی شخص کی باتیں سننے لگا، پھر اس نے مجھے جو تفصیل بتائی وہ واقعی دلچسپ تھی۔ پولیس آفیسر اس کا دوست تھا اور ناصر فرازی نے اسے بتایا تھا کہ وہ ایک انتہائی پہنچے ہوئے بزرگ کے ساتھ کام کر رہا ہے جن کا نام آصف خان ہے، چنانچہ پولیس آفیسر نے اس سے درخواست کی کہ ان بزرگ سے ان کی سفارش بھی کی جائے۔ وہ ایک مفرور قاتل کی تلاش میں ہے اندازہ یہ ہے کہ اگر وہ قاتل اس کے ہاتھ لگ گیا تو اسے انسپکٹر سے ڈی ایس پی بنا دیا جا گا۔ اس وقت بھی وہ ناصر فرازی کے ساتھ میرے پاس ہی آیا تھا تا کہ اسے اس کی مشکل

مل جائے۔ اتفاق سے ناصر فرازی نے اس سے یہ بھی کہہ دیا تھا کہ اگر میری نگاہ ہو گئی تو چٹکیوں میں کام بن جائے گا اور اس کا کام چٹکیوں میں بن گیا۔ اس بار وہ موت کے پھندے سے نہیں نکل سکا تھا اور انسپکٹر کی دلی خواہش پوری ہو گئی تھی۔ کمال کی بات ہے۔ واقعی خدا کی دین کا موئی سے پوچھئے احوال۔

میں ایک برا انسان تھا، پتا نہیں مجھ پر یہ نظرِ کرم کیوں ہو گئی تھی۔ میں تو سر سے پاؤں تک گناہوں میں ڈوبا ہوا تھا، لیکن وقت کی ہر تحریر میری تقدیر کے دروازے کھول رہی تھی۔ میں بلاوجہ ایک درویش بن گیا تھا، جبکہ حقیقی معنوں میں میرے اپنے چہرے پر بہت سی مکروہ لکیریں تھیں، لیکن بہرحال ایک بات ضرور تھی میرا دل نہیں چاہتا تھا کہ میں ان عطاء کی ہوئی قوتوں سے کوئی غلط فائدہ اٹھاؤں بلکہ میں اپنے آپ کو سرزنش بھی کرتا رہتا تھا کہ آصف خان، ہوش و حواس سے کام لو۔ جو ملا ہے، وہ بہت عظیم ہے۔ بجائے اس کے کہ تم دنیا کی دولت سمیٹ لو، اپنا عمل جاری رکھو۔ بے شک ناصر فرازی وغیرہ دولت کمانے کے خواہش مند تھے۔ یہ کام مجھ سے بہتر طریقے سے اور کون کر سکتا تھا لیکن میں نے دل میں یہ تہیہ کر لیا تھا کہ اس طرح سے کچھ حاصل نہیں کروں گا اور بہرطور فیصلے بھی آسمانوں سے ہی ہو جاتے تھے جیسے اس شخص کے بارے میں جو بے شمار افراد کا قاتل تھا...... ایک جنونی انسان۔ اسے جو سزا ملنی تھی وہ مل گئی اور میں اس کی کسی طرح کی مدد کے لئے مجبور نہ ہوا۔

اس کے بعد وقت کچھ اور آگے بڑھا اور جب ہم ایسی جگہ اس مقصد کے لئے بیٹھے ہوئے تھے تو ہمیں ہمارے مطلب کے لوگ کیوں نہ ملتے اور اس بار جو نوجوان مجھے ملا اس کا نام سلطان ظفر تھا۔ مزے کی بات یہ تھی کہ ہمیں ایسے ہی انسان ملتے تھے جن کا حدود اربعہ تھوڑا بہت میرے جیسا ہی ہوتا تھا۔

سلطان ظفر بھی ایک زمیندار کا بیٹا تھا اور اس نے اس طرح پرورش پائی تھی جس طرح زمیندار گھرانوں کے چشم و چراغ پرورش پاتے ہیں۔ ایک شخص سے باپ کی دشمنی ہو گئی جس کا نام فیض شاہ تھا اور سلطان ظفر نے فیض شاہ کی پوری حویلی جلا دی۔

بہرحال زمینداروں میں جب ٹھن جاتی ہے تو بڑے المیئے نمودار ہوتے ہیں۔ سلطان ظفر کو اپنی بستی سے فرار ہونا پڑا اور نہ جانے کتنی منزلیں طے کرتا ہوا وہ آخرکار ایک قبرستان پہنچا جہاں کچھ کردار اس کے اردگرد پھیل گئے۔ وہ ان کرداروں سے ناواقف تھا لیکن بہرحال وہ ان

کے ساتھ مل گیا۔

یہاں کی زندگی اپنے طور پر بالکل مختلف تھی۔ آدھی رات کو وہ یہاں آیا تھا۔ قبرستان جواء بھی ہوتا تھا۔ بوڑھا گورکن باقاعدہ ایک گروہ بنا کر رہتا تھا۔ بظاہر اس کا کام قبریں تھا، لیکن درحقیقت دوسرے بہت سے کام بھی ساتھ ساتھ ہی چلتے تھے۔

سلطان ظفر کو اس نے بڑے پیار سے اپنے ساتھ لیا اور دالان میں آ گیا۔ آگے کھلا تھا، جس وقت سلطان وہاں پہنچا تھا، صبح کے آثار نمودار ہو رہے تھے۔ صحن کی ایک دیوار ساتھ چھپر پڑا ہوا تھا۔ وہیں چولہا بھی تھا جس میں آگ جل رہی تھی۔ چولہے کے قریب ایک نوجوان عورت پراٹھے پکا رہی تھی۔ دیسی گھی کی خوشبو فضاء میں پھیلی ہوئی تھی۔ آہٹ کر اس نے اس طرف دیکھا اور سر سے دوپٹے کا آنچل کھینچ کر چہرے کو کسی طرح چھپا گورکن نے کہا۔

''چل بیٹا، جلدی پراٹھے پکا۔ پتا نہیں مہمان کب کا بھوکا ہے۔ آؤ بیٹا، تمہیں آرام کی بتا دوں۔ منہ ہاتھ وغیرہ دھو لیا؟'' سلطان نے گردن ہلا دی۔

گورکن اسے لے کر ایک کمرے میں پہنچ گیا۔ کمرہ صاف ستھرا تھا۔ اس میں دو چارپا بچھی ہوئی تھیں۔ فرش پر چٹائی بچھی تھی۔ کمرے میں دو افراد اور آ گئے۔ یہ گورکن کے سا والے تھے۔ وہ چٹائی پر بیٹھ گئے اور گورکن وہاں سے چلا گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد عورت اندر اس نے اس وقت بھی ہلکا سا گھونگھٹ نکال رکھا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک بڑی سی تھالی جس میں پراٹھوں کے ساتھ دو پیالی چائے بھی تھی، اس نے نظریں نیچی کیے ہوئے کہا۔

''میں پانی لاتی ہوں اور کسی چیز کی ضرورت ہو تو مجھے آواز دے لینا''۔ وہ باہر چلی گئی۔

چٹائی پر بیٹھے ہوئے دونوں آدمی لوٹے سے پانی لے کر کلیاں کرنے لگے، پھر انہوں۔ پراٹھے کھانا شروع کر دیئے۔ سلطان کو ایک دم گھر کا خیال آیا۔ بہرحال زمیندار کا بیٹا تھا، شا وشوکت میں زندگی گزاری تھی، لیکن یہ بدلی ہوئی زندگی بھی بری نہیں ہے جو کچھ کیا تھا اس پر نادم تھا نہ شرمندہ۔ فیض شاہ کو سزا ملنی ہی چاہیئے تھی، اس نے سلطان کے والد ظفر محمود سے جھگڑا مول لیا تھا۔ باقی رہا ظفر محمود وغیرہ کا معاملہ، تو اسے اپنے باپ کی قوتوں پر بھی بھرو تھا۔ انہوں نے بھی ہاتھوں میں چوڑیاں نہیں پہن رکھی تھیں، ان کے اپنے بھی آدمی موجود تھے خاص طور سے شکور اور غفورا۔

ایک ہی انداز ہوتا ہے اس عمر کا، بس حالات تبدیلی پیدا کرتے ہیں، ورنہ ساری سوچیں ایک جیسی ہوتی ہیں۔ قدرت نے مجھے کیسی نعمت سے سرفراز کیا تھا۔ میں نے بھی وہی کیا تھا جو ... نے کیا، صرف نام ماحول اور کردار بدلے ہوئے تھے ورنہ کام ایک ہی تھا۔ مجھے ان ... سے بڑی ڈھارس مل رہی تھی۔ سلطان شاہ نے کہا، بہت وقت اسی طرح گزر گیا۔ پھر ... سے فراغت حاصل کرنے کے بعد وہ اپنی جگہ سے اٹھے اور چارپائیوں پر دراز ہو گئے۔ سلطان خاموشی سے چارپائی پر لیٹا سوچوں میں گم تھا اور فضل دین چارپائی پر لیٹ کر خراٹے لینے لگا تھا۔ سلطان کی آنکھوں میں نیند کا شائبہ تک نہ تھا۔ بہرحال وہ تھوڑا سا الجھا ہوا تھا۔ زندگی کے بارے میں کوئی مناسب فیصلہ نہیں کر پایا تھا۔ ابھی تک اپنے آپ کو معمولی شخصیت ہی سمجھتا تھا، لیکن جن حالات میں وہاں سے فرار ہوا تھا، اس کے تحت خطرات تھے۔ ہو سکتا ہے، سائیں فیض بخش اپنے اثر و رسوخ سے کام لے کر پولیس کو اس کے پیچھے لگا دے۔ رات کو ہی بس اتفاق تھا کہ وہ پولیس کے ہاتھوں سے بچ گیا۔ جوا پارٹی پر چھاپہ پڑا تھا، اگر فضل دین کے ساتھ وہ بھی ان کے ہاتھ آ جاتا تو کیا کہا جا سکتا ہے کہ کیا ہوتا اور پھر ویسے بھی یہاں کتنا وقت گزار سکتا تھا۔ نکلنا تو ضروری تھا۔ ان تمام سوچوں نے ذہن پر دباؤ ڈال رکھا تھا۔

اس کی نگاہ کمرے میں مختصر سی کھڑکی پر پڑی جو پچھلے حصے کی جانب کھلتی تھی۔ باہر املتاس کا ایک جلا ہوا درخت نظر آ رہا تھا۔ درخت کے پتے گر چکے تھے اور شاخوں میں کونپلیں پھوٹ رہی تھیں۔ پھر اس پر غنودگی کا غلبہ ہو گیا۔ دوپہر کو آنکھ کھلی تو اس نے دروازے کی طرف دیکھا، وہی نوجوان عورت روٹی کی ڈلیا اور سالن کا برتن لئے ہوئے کھڑی تھی اور غالباً اس الجھن کا شکار تھی کہ اسے جگائے یا نہیں۔

سلطان جلدی سے اٹھ گیا تو وہ آگے بڑھ آئی اور اس نے ایک طرف ڈلیا اور سالن کا برتن رکھتے ہوئے کہا۔

''پانی لا رہی ہوں منہ ہاتھ دھو کر کھانا کھا لو''۔ یہ کہہ کر وہ بغیر کچھ کہے ہوئے باہر نکل گئی۔ سلطان نے اسے اس وقت پراٹھے پکاتے ہوئے دیکھا اور اس وقت ایک نگاہ اس پر ڈالی تھی۔ اس کے کپڑے صاف ستھرے تھے، بال خشک تھے، رنگت سانولی تھی، مضبوط اور صحت مند عمر بھی بائیس تیئس برس سے زیادہ نہیں ہو گی، لیکن چہرے پر ایک عجیب سا سُونا پن نظر آتا تھا...... ایک بجھی بجھی قبرستان جیسی شخصیت کی مالک۔ تھوڑی دیر بعد وہ جگ میں پانی

اور ہاتھ میں گلاس لے کر اندر آ گئی۔

’’زیادہ پانی لائی ہوں، منہ ہاتھ دھولو پھر روٹی کھالو‘‘۔

’’جگ رکھ دو، تمہارا شکریہ‘‘۔ سلطان نے کہا لیکن وہ جگ ہاتھ میں پکڑے ہوئے لو
رہی تو سلطان چونک کر بولا۔

’’کیا بات ہے جگ رکھ دو‘‘۔ ایک لمحے کے اندر اندر اسے عورت کی آنکھوں میں ابھر
عجیب سی پیاس نظر آئی لیکن سلطان شاید ابھی ان راستوں پر سفر نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اپنی جگہ
سے اٹھا اور دونوں ہاتھ پھیلا کر پانی سے منہ دھونے لگا۔ وہ جگ سے تھوڑا تھوڑا پانی ڈال رہی
تھی۔ چہرہ خشک کر کے سلطان روٹی کی جانب متوجہ ہوا تو وہ بولی۔

’’میری ضرورت ہے؟‘‘

اس کے لہجے میں ایک ہلکی سی شوخی تھی۔

سلطان نے آہستہ سے کہا، ’’نہیں‘‘۔

وہ کچھ لمحوں کے بعد وہاں سے چلی گئی اور سلطان روٹی کے پاس آ بیٹھا۔ پاگل تھی
سلطان کے اپنے ذہن پر جس وجود کا قبضہ تھا وہ بے حد حسین تھا۔ وہ کسی لالچ میں نہیں آیا
تھا حالانکہ مہر النساء کا نقش، نقشِ اول تھا۔ دل میں ذرا سی گنجائش ہوتو نقشِ اول نقشِ آخری رہتا
ہے، ورنہ بہت سی برائیاں سامنے آجاتی ہیں۔ دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد وہ باہر قبرستان میں
نکل آیا اور اِدھر اُدھر نگاہیں دوڑانے لگا۔

ایک قبر کے اوپر تین آدمی بیٹھے ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک بوڑھا تھا، دوسرا فضل
دین اور تیسرا ایک نیا آدمی تھا۔ سلطان کو دیکھ کر تینوں چونک پڑے اور سلطان کو ایک
احساس ہوا جیسے وہ تینوں کسی اہم موضوع پر بات کر رہے ہوں۔ اب سلطان کے لئے رکنا
مناسب نہیں تھا۔ وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا ان کے قریب پہنچ گیا۔ تیسرا آدمی بڑی تجسس بھری
نگاہوں سے سلطان کو دیکھ رہا تھا۔

’’تم لوگ کچھ باتیں کر رہے تھے۔ میں تو بس تم سے اجازت لینے آیا تھا۔ بڑا وقت گزر
لیا تمہارے ساتھ، بڑی مہربانی میرے لائق کوئی خدمت ہوتو بتاؤ‘‘۔

’’ارے نہیں نہیں، ابھی کہاں...... کل دن میں کسی وقت چلے جانا۔ آج رات کو میرے
ساتھ رہو‘‘۔ فضل دین نے کہا اور سلطان شانے ہلا کر بولا۔

’’تمہیں ہی تکلیف ہوگی، میرا کیا ہے، آج نہیں کل چلا جاؤں گا‘‘۔

’’مگر جاؤ گے کہاں رہے ہو؟‘‘

’’بس جہاں تقدیر لے جائے گی، ویسے کراچی جانے کا ارادہ ہے‘‘۔

’’ہاں یہ تو اور اچھی بات ہے۔ ساتھ ہی چلیں گے۔ یہاں سے میں تمہیں اسٹیشن تک لے
جاؤں گا۔ وہاں سے کراچی کے لئے ریل مل جائے گی۔ ہمارا انتظام ہو جائے گا، ساتھ ہی
چلو‘‘ سلطان نے ایک لمحے کے لئے سوچا پھر بولا۔

’’ٹھیک ہے، تم لوگ کچھ باتیں کر رہے تھے‘‘۔

’’ہاں...... اگر تم برا نہ مانو تو ایک چکر لگاؤ آؤ...... سب ٹھیک ہے کوئی خطرہ نہیں‘‘۔ فضل
دین نے کہا۔ سلطان نے گردن ہلائی اور وہاں سے آگے بڑھ گیا، لیکن اس کے ذہن میں یہ
خیال ضرور پیدا ہو رہا تھا کہ اصل قصہ کیا ہے؟ کہیں کوئی گڑبڑ ضرور معلوم ہوتی تھی۔

❁ ❁ ❁

رات تقریباً ساڑھے آٹھ بجے کھانا وغیرہ تیار ہوا۔ فضل دین اور سلطان کھانے پر بیٹھ
گئے۔ بوڑھا ان کے ساتھ شریک نہیں تھا۔ وہ لڑکی جس نے کئی بار عجیب سی نگاہوں سے سلطان
کو دیکھا تھا اور سلطان کو ہر بار یہ احساس ہوا تھا کہ وہ اس سے کچھ کہنا چاہتی ہے، اس وقت
بھی تھوڑے فاصلے پر کھڑی اسے دیکھ رہی تھی۔ سلطان کی نظر اس پر پڑی تو وہ ہولے سے
مسکرائی اور شرمائے ہوئے سے انداز میں باہر نکل گئی۔ سلطان کھانے میں مصروف رہا۔ کھانے
سے فراغت کے بعد فضل دین اسے لے کر باہر نکل آیا اور تھوڑے فاصلے پر ایک پکی قبر پر
جا بیٹھا۔

’’آج تو کوئی خطرہ نہیں، اگر آج پھر پولیس دھاڑ پڑ گئی تو؟‘‘ جواب میں فضل دین ہنس دیا
اور بولا۔

’’پولیس کی دھاڑ کبھی نہیں پڑتی۔ اسے تو دعوت دی جاتی ہے۔ اصل میں بابا نے یہ جوئے
کے اڈے قائم کر رکھے ہیں۔ چار، چھ، آٹھ بندے آجاتے ہیں مگر جب ہمیں اپنا کام کرنا ہوتا
ہے تو ان بندوں کو وہاں سے ہٹانا پڑتا ہے۔ کبھی کبھی تو آسانی سے کام ہو جاتا ہے، مگر جب
بات ان کی سمجھ میں نہیں آتی تو دھاڑ پڑوانی پڑتی ہے اور پچھلی رات بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ بابا
ادھر چلا گیا تھا اور پولیس آ گئی تھی‘‘۔ سلطان کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ اس نے کہا۔

"لیکن کام کیا کرتے ہوتم؟" فضل دین اسے دیکھنے لگا پھر بولا۔

"بات کوئی ایسی ویسی نہیں ہے۔ تمہیں جو اس سلسلے میں بتایا جارہا ہے، اس کی اک ہے"۔

"کیا......"

"یہ بتاؤ...... مال وال کی ضرورت ہے یا نہیں؟ کراچی معمولی جگہ نہیں۔ دس ہزار روپوں کا تو پتہ نہیں چلتا وہاں پر، مگر تم میرا ساتھ دو تو تمہیں کم از کم دس ہزار روپے مل ہیں"۔

"کیسے؟"

"نہیں پیارے! بات ایسے نہیں بنے گی۔ تمہیں پہلے وعدہ کرنا ہوگا۔ اصل میں بندے کی سخت ضرورت ہے مجھے ورنہ تمہیں تکلیف نہ دی جاتی"۔

"تم پہلے کام بتاؤ مجھے"۔

"اصل میں ہم لوگ مُردے سپلائی کرتے ہیں۔ قبروں میں سے ثابت ڈھانچے نکالے جاتے ہیں اور انہیں پہنچادیا جاتا ہے"۔

"کیا؟" سلطان اچھل پڑا۔

"ہاں یار! سب کچھ بک جاتا ہے، اس دنیا میں سب کچھ بک جاتا ہے"۔

"مم...... مگر ڈھانچے کون خریدتا ہے؟"

"ایک کمپنی یہ کاروبار کرتی ہے اور بہت سے ملکوں کو مال ایکسپورٹ کرتی ہے۔ ہمارے پاس ایک بڑا آرڈر ہے جسے ہم سپلائی کررہے ہیں"۔

"مگر کیسے؟" سلطان نے تجسس سے پوچھا۔

"قبرستان میں جتنی میتیں آتی ہیں، ہمیں ان کا پتہ ہوتا ہے۔ دس سے بارہ دن مہینہ مہینہ گوشت گلنے میں لگ جاتا ہے۔ پھر ہم احتیاط سے اسے نکال لیتے ہیں۔ بچے گوشت کی صفائی کرتے ہیں اور ڈھانچہ سوکھنے کے لئے محفوظ کردیا جاتا ہے۔ بابا نے تہ خانہ کھدوا رکھا ہے جہاں ہم یہ سارے کام کرتے ہیں، کیا سمجھا؟"

"مگر ان ڈھانچوں کا کیا ہوتا ہے؟" سلطان نے حیرت سے کہا۔

"یار بھوندو ہو تم۔ یہ جو میڈیکل کالجوں میں لڑکے اور لڑکیاں پڑھتے ہیں، ان

ڈھانچوں اور پنجروں کے بغیر ان کی پڑھائی کیسے ہوسکتی ہے۔ یہ ڈھانچے ملک میں اور ملک سے باہر ایسے ہی کالجوں کے لئے سپلائی کیے جاتے ہیں۔ اسپتالوں اور دوا بنانے والی کمپنیوں کو بھی ان کی ضرورت پڑتی ہے۔ تو نے یہ کبھی نہیں سوچا کہ اپنے اسپتالوں اور میڈیکل کالجوں میں جو انسانی ڈھانچے لٹکے نظر آتے ہیں، وہ کہاں سے آتے ہیں۔ کیا ڈھانچے درختوں پر اُگتے ہیں اور مُردے قبروں سے نکل کر میڈیکل کالجوں اور اسپتالوں میں جاتے ہیں۔ بھائی نہیں، یہ نہیں ہے تو کھود کر نکالے ہی جاتے ہیں"۔

"مگر...... مگر"۔

"کیا اگر مگر یار! بچوں جیسی باتیں کررہے ہو۔ تم کیا سمجھو اسپتالوں میں لاوارث لاشیں کیا ہوتی ہیں۔ ارے بھائی! پڑھنے والے لڑکے لڑکیاں ان کی چیر پھاڑ کرتے ہیں اور پھر وہ لاشیں اسپتال ہی کے ایک حصے میں زمین کھود کر دبا دی جاتی ہیں۔ سال سوا سال بعد جب کھال اور گوشت گل سڑ کر ہڈی بن جاتے ہیں تو ہڈیوں کا پنجر نکل آتا ہے۔ بڑا لمبا کاروبار ہے یہ۔ اب تمہیں کیا کیا بتائیں!" سلطان سرد نگاہوں سے فضل دین کو دیکھ رہا تھا۔ وہ تو اپنے آپ ہی کو بہت سخت دل اور خطرناک آدمی سمجھتا تھا، لیکن یہاں تو پتہ نہیں کیا کیا ہورہا تھا۔ بہرحال اس نے پُرخیال انداز میں گردن ہلائی اور بولا۔

"تو پھر یہ بتاؤ مجھے کیا کرنا ہے"۔

"آج رات تجھے میرے ساتھ کام کرنا ہوگا۔ انکار مت کرنا اور سن، پانچ سو روپے روز دوں گا اور دس ہزار روپے کراچی چل کر"۔

"ٹھیک ہے، جیسی تیری مرضی......" پھر باقی وقت سلطان نے سوچتے ہوئے گزار دیا کہ کیا کرنا چاہئے اور کیا نہیں کرنا چاہئے۔ کوئی بات سمجھ میں نہ آئی۔ بس سوچوں میں ڈوبا رہا پھر شام ہوگئی اور ہر طرف اندھیرا پھیل گیا۔ جو تفصیلات سلطان نے سنی تھیں، ان سے وہ اچھے خاصے ذہنی تکدر کا شکار ہوگیا تھا، لیکن خود اس کا اپنا بھی تو کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔ نیکی اور بدی کا تصور تو اس کے دل میں نہیں تھا۔ بس کام کی طرف سے ذرا سی الجھن کھا رہا تھا، لیکن رات کو فضل دین اسے لے کر اندھیرے میں آگے بڑھ گیا اور وہ ایک ایسی جگہ پہنچ گئے جو درختوں کے درمیان گھری ہوئی تھی۔ فضل دین نے وہاں موجود دو آدمیوں کو جن میں ایک بوڑھا تھا، مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"ہاں...... کیا خیال ہے، پھر کام شروع کردیا جائے؟" سکندر نے دوسرے لڑکے کو... جس کی عمر زیادہ نہیں تھی۔ دبلا پتلا مریل سا تھا اور آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی تھیں۔ ان... ایک کونے میں پڑی ہوئی کدالیں اٹھائیں اور اس لڑکے نے ان کدالوں کو کندھوں پر رکھ لیا... بیلچے فضل دین نے سنبھال لئے اور چاروں آگے بڑھ گئے۔ فضل دین نے آگے آگے کہا۔

"قبروں کو نشان تو لگا دیئے گئے ہیں نا؟"

"ہاں...... بے فکر ہو جاؤ"۔

سلطان خاموشی سے یہ کارروائی دیکھ رہا تھا اور اس کے دل میں یہ خیالات آرہے تھے... زندگی گزارنے کے لئے لوگ کیسے کیسے گھناؤنے کام کرلیا کرتے ہیں۔ بہرحال وہ وہاں... آگے بڑھے اور پھر ایک گھنی جھاڑی کے پاس پہنچ گئے۔ یہاں لالٹین رکھ دی گئی اور اس... دھندلی روشنی میں کام کا آغاز کردیا گیا۔ وہ لوگ قبر کا بالائی حصہ کھود رہے تھے اور پھر فضل... بھی اس کام میں شریک ہوگیا۔ وہ نیچے سے مٹی ہٹا رہا تھا۔ قبر کچی تھی اور مٹی مٹ مٹا کر... ہوچکی تھی۔ جب قبر اتنی کھد گئی کہ تختے نظر آنے لگے تو دونوں نے ہاتھ روک دیئے۔ تختوں... تو بدبو کے بھبکے اُٹھنے لگے اور قرب و جوار کا ماحول بہت ہی گندہ ہوگیا۔ فضل دین نے ایک... چادر نکالی اور اسے سلطان کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"لے، یہ چادر منہ کے گرد لپیٹ لے"۔ پھر انہوں نے خود بھی چادریں لپیٹ لیں... ایک ایک کرکے تمام تختے نکال دیئے۔ فضل دین ہدایت دیتا جا رہا تھا اور کہہ رہا تھا کہ دیکھو... اندر نہ گرنے پائے، کوئی ٹوٹا ہوا تختہ بھی نیچے نہ گرے ورنہ ڈھانچہ خراب ہوجائے گا۔ تختے... تو قبر کا منہ کھل گیا اور فضل دین نے ٹارچ کی روشنی قبر کے اندر ڈالی۔ سلطان نے بھی جھک... اندر جھانکا۔ قبر میں ڈھانچہ پڑا ہوا تھا۔ کھال اور گوشت گل سڑ کر خاک میں مل چکے تھے... سفید سفید ہڈیاں نظر آرہی تھیں، جن پر جگہ جگہ مٹی نظر آرہی تھی۔ سرخ سرخ چیونٹے... دوسرے کیڑے مکوڑے اِدھر اُدھر رینگ رہے تھے۔ منظر بے حد ہولناک تھا۔ پھر خود فضل... نے باقی کام کیا۔ اس نے ربڑ کے بڑے بڑے سیاہ جوتے پہنے، ہاتھوں پر دستانے چڑھائے... اور قبر کے اندر سے ڈھانچے کو نکالنے لگا اور بڑا سنبھال کر ڈھانچہ اوپر پہنچا دیا۔ پھر خود بھی... نکل آیا۔ اس کے بعد دوسری قبر کی کھدائی شروع کردی گئی۔ سب لوگ اس کام میں مصروف... تھے۔ دوسری قبر سے بھی ڈھانچے کی ہڈیاں اور کھوپڑی نکال لی گئی۔ یہاں تک کہ وہ تیسری...

...پہنچ گئے اور یہاں سے بھی ثابت ڈھانچہ نکال لیا۔ پھر وہ درختوں کے درمیان سے گزرتے ہوئے ڈیرے کی جانب چل پڑے اور اندر پہنچ گئے۔ بڑی مستعدی سے کام ہو رہا تھا۔ عورت نے ان لوگوں کو چائے بنا کر دی اور ادھر پیکنگ شروع ہوگئی۔ گویا سارے معاملات بڑے سلیقے سے کئے جاتے تھے۔

سلطان کے ذہن میں یہ کرید تھی کہ وہاں سے اس کے فرار کے بعد کیا صورتِ حال پیش آئی۔ بہرحال وہ کراچی جانا چاہتا تھا۔ یہ لوگ جرائم پیشہ تھے، جرم کرتے تھے اور انہیں پولیس کا تحفظ بھی حاصل تھا، اگر ان کے ساتھ ہی کراچی پہنچ جایا جائے تو آسانی ہوگی۔ وہاں چھپنے میں کوئی دقت نہیں ہوسکتی تھی۔ بچپن میں دو بار کراچی گیا تھا۔ دوسری بار ذرا ہوش و حواس درست تھے، چنانچہ اس ہنگاموں کے شہر کراچی کو دیکھنا تھا، اس وقت تو خیر ذہن میں کوئی تصور نہیں تھا کہ کبھی اسے بھی ان ہنگاموں میں پوشیدہ ہونے کی ضرورت پیش آجائے گی۔ لیکن اب وہ یہ سوچتا تھا کہ وہاں سے بہتر اور کوئی جگہ نہیں۔ بہرحال اس طرح وقت گزرتا رہا اور پھر ان لوگوں نے وہاں سے واپسی کا پروگرام بنایا۔ ڈھانچوں کو لے جانے کے لئے بڑی باقاعدگی سے کام ہوتا تھا، چنانچہ ایک خاص قسم کا ٹرک لایا گیا۔ اس میں پیٹیاں رکھی گئیں جن میں ثابت ڈھانچے بڑی احتیاط کے ساتھ پیک کئے گئے تھے اور پھر ان پر بھوسہ لادا جانے لگا۔ بھوسے کا اتنا بڑا ڈھیر ٹرک پر لادا گیا تھا کہ دونوں سمت آدھا آدھا پھیل گیا تھا، اس طرح ٹرک ڈرائیور، فضل دین اور سلطان تینوں یہ بھوسہ لے کر چل پڑے۔ سلطان نے اپنا حلیہ بدل لیا تھا۔ بڑی سی پگڑی، کُرتا اور گلے میں موتیوں کی مالا۔ راستے میں فضل دین نے بتایا کہ یہ ٹرک جانا پہچانا ہے۔ پولیس اسے راستے میں کہیں نہیں روکے گی اور کوئی پریشانی کی بات نہیں ہے۔ بہرحال یہ سارے چکر چلتے رہے اور وہ سفر کرتے رہے۔

شہر میں پہنچنے کے بعد فضل دین نے کہا۔

"ہاں اب ایسا کر سلطان! میں تجھے ایک جگہ بتائے دیتا ہوں۔ تُو وہاں جا کر رہ اور میں اپنا کام کرتا ہوں۔ پھر واپس تجھ سے وہیں آملوں گا"۔

"کون سی جگہ ہے وہ؟"

"ڈیرا ہے ہمارا ارے یار! بار بار سوال مت کیا کر۔ جب یار بن گیا ہے تو ہم بھی یاری نبھائیں گے تُو کیوں پرواہ کرتا ہے"۔ سلطان خاموش ہوگیا تھا۔

ایک کچی آبادی میں ٹرک تھوڑی دیر کے لئے رکا اور فضل دین سلطان کو لے کر گلیوں سے گزر کر ایک گھر کے دروازے پر رک گیا۔ دستک دی تو ایک بوڑھی عورت نے دروازہ کھولا۔

"ارے...... فضلو"۔ بوڑھی کے منہ سے نکلا تو فضل دین نے ہاتھ اٹھاتے ہوئے کہا۔

"بس بس...... زیادہ عشق مت بگھار، مہمان ہے یہ کوئی تکلیف نہ ہونے پائے اسے"۔

"ٹھیک ہے، آجاؤ"۔ بوڑھی عورت نے کہا اور سلطان ایک گہری سانس لے کر اس کے ساتھ اندر داخل ہوگیا۔ فضل دین واپس چلا گیا تھا۔ چھوٹا سا مکان تھا جس میں تین کمرے تھے، بیچ میں دالان تھا، بڑا سا صحن۔ یہ مکان جس تپلی سی گلی میں تھا، اسے دیکھ کر یہ اندازہ ہوتا تھا کہ یہاں چھوٹی چھوٹی جھونپڑیاں ہی ہوں گی، لیکن جگہ اندر سے کافی کشادہ تھی۔ باورچی خانہ اور غسل خانہ صحن میں بنا ہوا تھا۔ بوڑھی عورت سلطان کو ساتھ لئے دالان میں پہنچ گئی یہاں ایک بڑا سا تخت بچھا ہوا تھا، اس نے کہا۔

"بیٹھو..... کیا نام ہے تمہارا"۔

"آغا"۔ سلطان نے جواب دیا۔

"منہ ہاتھ دھولو یا نہانا چاہو تو نہالو، سفر کر کے آتے ہو۔ مٹی میں لپٹے ہوئے ہو"۔

"ٹھیک ہے میں نہالوں گا" سلطان نے کہا۔

بوڑھی عورت چلی گئی، سلطان اپنی جگہ سے اٹھا اور جوتے اتار کر غسل خانے میں داخل ہوگیا۔ کچی آبادی تھی، لیکن غسل خانے میں بھی بڑا معقول انتظام تھا، نہانے دھونے کا۔ نہانے کے بعد باہر نکلا تو بوڑھی نے کھانے پینے کی چیزیں تیار کی ہوئی تھیں۔ بہت ہی ع... کی چائے کی خوشبو فضاء میں پھیلی ہوئی تھی۔ سلطان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

سلطان نے کہا۔ "چائے تو بہت اچھی بنائی ہے تم نے"۔ لیکن بوڑھی کے انداز میں کیفیت پیدا نہ ہوئی۔ اس کا چہرہ بالکل سپاٹ تھا۔

بہرحال سلطان کھانے پینے کی چیزوں میں مصروف ہوگیا۔ کھانے سے فراغت بوڑھی نے کہا۔

"کمرے میں بستر لگا دیا ہے۔ آرام کرلو، کہیں جانا تو نہیں ہے؟"

"نہیں"۔ سلطان نے کہا اور کمرے میں جا بیٹھا۔ تھوڑی دیر تک پلنگ پر بیٹھا

لیٹ گیا۔ پہلی بار اس کے دل میں ذرا مختلف خیالات آئے تھے۔ ماضی میں جو کچھ کرتا رہا تھا، اس میں بڑی جارحیت تھی۔ کسی کو نقصان پہنچا دینا اس کے لئے کوئی مشکل کام نہیں تھا لیکن اب...... اب کیا کرنا ہے۔ وہ عظمت جسے وہ اپنے سینے میں بسائے رہتا تھا اور سوچتا تھا کہ کوئی اس کا مدِ مقابل نہیں ہے، اس وقت اس گمنام جھونپڑے میں جھلنگی سی چارپائی پر دراز تھی اور اس کے سامنے کوئی منزل نہیں تھی۔ بہرحال رقم تو اس کے پاس اچھی خاصی موجود تھی اور وہ طویل عرصے تک ہاتھ پاؤں ہلائے بغیر وقت گزار سکتا تھا، لیکن یہ کوئی عقل کی بات نہیں تھی۔ اتنا وہ جانتا تھا کہ لوگ اس کی حرکت کو نظر انداز نہیں کریں گے۔ اسے اپنے عمل کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا، یعنی جو کچھ کیا ہے اس کا خمیازہ اٹھانا پڑے گا، اسے لیکن بات وہیں آجاتی ہے۔ اگر گرفتار ہو کر پولیس کے ہاتھوں میں پڑ گیا تو یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔ ایسا تو ہر جرائم پیشہ شخص کے ساتھ ہوتا ہے۔ پھر میرے اندر کیا انفرادیت ہوئی۔ مجھے کوئی ایسا عمل کرنا چاہئے جس سے میری عظمت کا مقام اور معیار قائم رہے۔ گھر سے نکل کر کراچی تک پہنچ گیا تھا اور اب اس کے بعد بھی اگر کوئی ڈھنگ کا معاملہ نہ ہوا تو پھر صورتِ حال خراب ہو جائے گی۔ یہ تمام باتیں اس کے ذہن میں آرہی تھیں اور وہ مسلسل سوچوں میں ڈوبا ہوا تھا کہ اچانک دروازے پر آہٹ ہوئی اور اس نے چونک کر دروازے کی سمت دیکھا۔ کمرے کا ماحول نیم تاریک تھا، لیکن دروازہ کھلنے سے مدھم سی روشنی اندر آئی تھی اور اس روشنی کے ساتھ ہی ایک اور روشنی بھی اندر آگئی تھی۔ درحقیقت یہ روشنی ہی تھی۔ دودھ جیسا سفید رنگ، سبک نقوش، گدرایا ہوا بدن وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی پلنگ کے قریب پہنچ گئی۔ سلطان نے اٹھ کر بیٹھنے کی کوشش کی تو اس نے جلدی سے اس کے سینے پر ہاتھ رکھ دیا اور بولی۔ "سو گئے تھے؟" سلطان نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ آہستہ سے پلنگ پر بیٹھ گئی۔

"اماں نے کہا ہے کہ تمہاری خدمت کروں، تم فضل دین کے مہمان ہو"۔

سلطان نے تھوڑا سا اٹھ کر کہنیاں سرہانے سے نکالیں اور اسے دیکھتا ہوا بولا۔

"کون ہو تم؟"

"ثریا ہے میرا نام ہے"۔

"اماں کی بیٹی ہو؟" سلطان نے عجیب سا سوال کیا، لیکن ثریا نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ خوبصورت آنکھوں سے اسے دیکھ رہی تھی، پھر اس نے کہا۔

"بولو، کیا کرنا ہے؟"

"کیا مطلب؟"

"نہیں، میرا مطلب ہے کہ...... کہ......"

اس نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ سلطان اس کی بات سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا، وہ بولی

"سو تو نہیں گئے تھے؟"

"نہیں"۔

"رات کو یہیں رہو گے...... میرا مطلب ہے، رات کو آجاؤں؟" اور اس کے بعد اتنا احمق بھی نہیں تھا کہ بات اس کی سمجھ میں نہ آتی۔ اس نے کہا۔

"کیوں؟" جواب میں وہ مسکرادی پھر بولی۔

"سو جاؤ...... بس ٹھیک ہے نا"۔ اور اس کے بعد وہ اپنی جگہ سے اُٹھی اور باہر نکل جاتے ہوئے سلطان نے اس کے چہرے کی ایک جھلک دیکھی تھی۔ وہ شگفتگی سے مسکرا رہی تھی۔ شاید سلطان کی احمقانہ باتوں پر اسے اندازہ ہوگیا تھا کہ اناڑی ہے۔ سلطان دیر تک اس کے بارے میں سوچتا رہا۔ بہت سی باتیں اس کے ذہن میں آرہی تھیں۔ پھر دل میں سرور کی ایک لہر اُٹھی۔ نہ جانے باہر کی دنیا میں زندگی کے کتنے تجربات ہوں اپنے آپ کو ان تجربات کے لئے تیار کرلینا چاہئے۔ سکھر کی ایک حویلی میں زندگی کا آغاز انجام کم از کم مجھے پسند نہیں ہے، دوسروں کو پسند ہو یا نہ ہو۔ نہ جانے کب تک انہی میں ڈوبا رہا اور پھر نیند آگئی۔ جاگا تو تقریباً ڈھائی بجے تھے۔ ڈھائی بجے کے قریب جگہ سے اُٹھا۔ تھوڑی دیر تک سوچتا رہا اور اس کے بعد باہر نکل آیا لیکن باہر برآمدے نے جو منظر دیکھا، اس نے اسے ساکت کر دیا۔ وہی لڑکی جو اس کے پاس آئی تھی اور جس طرح کی پیشکش کی تھی، اسے سلطان نے سمجھ لیا تھا لیکن اس وقت وہ برآمدے ہوئے تخت پر جائے نماز بچھائے نماز پڑھ رہی تھی۔ اس نے اپنا چہرہ سفید چادر میں تھا۔ سفید چادر جیسا ہی اس کے چہرے کا رنگ بھی تھا۔ گہری کالی سیاہ آنکھیں جھکی ہوئی وہ اللہ کے حضور حاضر تھی۔ سلطان نے ایسے کسی منظر میں کبھی دلچسپی نہیں لی تھی، لیکن صورت حال بالکل مختلف تھی۔ یہ لڑکی دو عجیب کردار پیش کر رہی تھی۔ اس نے بڑے میں سلطان سے رات کو آنے کی بات کی تھی اور اب یہ سب کچھ...... کچھ لمحے سلطان

گزارا ...ں کے بعد واپس کمرے میں پلٹ گیا۔ نہ جانے کیوں اس کے ذہن پر ایک عجیب سا احساس نقش ہوگیا تھا۔ کوئی چھ بجے کے قریب فضل دین واپس آگیا۔ واپس آنے کے بعد اس نے کہا۔

"کہو شہزادے! گھر ہی پر لیٹے رہے یا باہر نکلے تھے؟"

"نہیں یار! سو گیا تھا"۔

"اچھا کیا رات کو جاگنا ہوگا...... اچھا اب یہ بتاؤ، ادھر رکو گے یا کسی ہوٹل میں چلیں؟"

"تمہارا کام ہوگیا؟"

"ہاں...... اپنا کام تو لگا بندھا ہے۔ یہ دس ہزار روپے تمہارے، جیسا وعدہ کیا تھا"۔ فضل دین نے نوٹ نکال کر سلطان کے سامنے ڈال دیئے تھے تو سلطان ہنسنے لگا۔ فضل دین پھر بولا۔

"رکھ لو محبت کا تحفہ ہے یہ"۔

"ٹھیک ہے لاؤ"۔ سلطان نے نہ جانے کیا سوچ کر وہ دس ہزار روپے کے نوٹ لئے اور اپنی جیب میں رکھ لئے۔ فضل دین بہت ہی گندا کام کرتا تھا، لیکن نہ جانے اس کے دل میں اچھائی کا یہ نکتہ کہاں چھپا ہوا تھا، فضل دین نے کہا۔

"ہاں...... تو بتایا نہیں تم نے؟"

"ایک دن یہیں رک جاتے ہیں پھر بعد میں دیکھا جائے گا"۔

"ہوں...... لڑکی پسند آگئی، ہے بھی بہت اچھی یار! عام قسم کی لڑکیوں سے بالکل مختلف، نہ لالچی، نہ خودغرض بلکہ اس کے اندر خدمت کا ایک ایسا جذبہ ہے کہ تم حیران رہ جاؤ گے"۔

"ویسے ایک بات نے مجھے حیران کر دیا ہے"۔ سلطان نے کہا۔

"کیا......؟"

"یار! دیکھو برائی تو برائی ہی ہوتی ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ بروں میں اچھے نہیں ہوتے، لیکن بہرحال ضمیر بھی ایک چیز ہوتی ہے۔ یہ لڑکی نماز پڑھ رہی تھی"۔

"ارے ہاں...... پانچوں وقت کی نمازی ہے"۔

"مگر مجھے یہ محسوس ہوا......"

"ٹھیک محسوس ہوا...... یہ بڑھیا اس کی دلالہ ہے۔ ماں واں نہیں ہے، بس اس نے اسے رکھا ہوا ہے اور بھی ایک آدھ لڑکی ہے اس کے پاس، دھندا کرتی ہے اور اپنا کمیشن لے لیتی

ہے۔ پولیس کو بھتہ دیتی ہے۔ کام چل رہا ہے۔ لڑکی کہیں اور رہتی ہے۔ ہفتے میں ایک آ اپنے گھر چلی جاتی ہے۔ ویسے مجھے بڑی پسند ہے۔ تم اس کے اندر ایک خاص بات دیکھو تو ٹھیک ہے پھر ادھر رکو، میں ذرا چلتا ہوں کچھ اور دوستوں سے بھی ملنا جلنا ہے''۔

''ہاں بالکل ٹھیک ہے''۔ رات کو کھانے وغیرہ سے فراغت حاصل ہوئی۔ بڑھیا کا انداز برقرار رہا۔ لڑکی بھی ایک دو بار سامنے آئی۔ سلطان یہیں رہا تھا۔ بہر حال اسے اپنے کوئی راستہ تلاش کرنا تھا۔ رات کے کوئی گیارہ بجے کا وقت ہوگا۔ وہ جاگ رہا تھا۔ لڑکی اس کے پاس آ گئی، اس نے گہری سیاہ آنکھوں سے سلطان کو دیکھا اور بولی۔

''جاگ رہے ہو؟''

''ہاں...... آؤ بیٹھو''۔ سلطان نے کہا پھر بولا۔

''نام نہیں بتایا تم نے اپنا''۔

''نہیں بتایا تھا؟''

''ہاں''۔

''چلو ٹھیک ہے...... ناموں میں کیا رکھا ہے، میں عام طور سے لوگوں کو اپنے غلط نام بتا کرتی ہوں اور کبھی کبھی مجھے یاد ہی نہیں رہتا کہ میں نے کس کو کیا نام بتایا ہے''۔

''وجہ؟''

''بس ایسے ہی، کون سے اچھے کام کرتے ہیں ہم، جو محبت سے لوگوں کو وہ نام بتائیں جو ہمارے ماں باپ نے اس وقت رکھے تھے، جب ہم بالکل معصوم اور پاکیزہ تھے۔ اس پاکیزہ وقت کا نام بعد میں استعمال کرنا اچھا نہیں لگتا''۔

سلطان حیرت سے اسے دیکھنے لگا اور بولا۔

''تو پھر یہ غلط کام کرتی کیوں ہو؟''

''ہر پانچ آدمیوں میں سے ایک آدمی یہ سوال ضرور کرتا ہے۔ جواب دیتے دیتے تھک گئے ہیں ہم۔ بس ہر انسان کے اندر کچھ مجبوریاں ہوتی ہیں۔ اپنے آپ ہی کو دیکھ لو۔ نہ جانے کہاں سے سفر کا آغاز کیا ہوگا اور دیکھو کہاں تک پہنچ گئے۔ ایسی ہی کہانیاں ہوتی ہیں انسا زندگی کے ساتھ''۔

''فلسفی ہو اچھی خاصی، نام کیا ہے؟'' سلطان نے کہا اور وہ ہنس پڑی پھر بولی ''شجیلا''۔

''واہ نام تو بہت خوب صورت ہے، مگر ظاہر ہے جعلی ہوگا''۔ وہ بھی ہنس پڑی اور بولی۔

''تمہارا کیا نام ہے؟''

''بتایا تھا نا، آغا''۔

''ہاں ہاں بتایا تھا...... آغا جی! یہ بتائیے کیا خدمت کروں آپ کی؟ پاؤں دبا دوں''۔

''فضل دین تمہاری بڑی تعریف کر رہا تھا، کہہ رہا تھا کہ لڑکی سچ بولتی ہے''۔

''وہ جھوٹ بول رہا تھا۔ ابھی میں نے تمہیں ناموں کے بارے میں ہی بتایا، بھلا اس میں کون سا ہے؟''

''تب بھلا ایک بات بتاؤ شجیلا!''

''ہاں پوچھو''۔

''جب تم نماز پڑھتی ہو تو کیا تمہارے دل میں جھوٹ ہوتا ہے، کیا اللہ کے سامنے بھی سچ ہیں بولتیں؟''

ایک دم سے اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس کے بدن میں تھرتھری دوڑ گئی ہو۔ کچھ دیر اموش رہی پھر بولی۔

''وہ تو سب کچھ جانتا ہے...... بھلا اس کے سامنے کون جھوٹ بول سکے ہے''۔

''بولتے ہیں، لوگ حرام کماتے ہیں اور نیکیوں کا پرچار کرتے ہیں۔ خیرات کرتے ہیں، کرتے ہیں، مسجدیں بنواتے ہیں اپنی ناجائز کمائی سے۔ کیا یہ اللہ کے سامنے سچ بولنے والی ت نہ ہوئی؟''

''ہاں...... ایسا تو ہے''۔

''خیر...... میں نے سنا ہے کہ تمہارے ماں باپ کہیں اور رہتے ہیں؟''

''ہاں...... وہ ایک اور بستی میں رہتے ہیں، میں ان سے بھی جھوٹ بولتی ہوں''۔

''کیا؟''

''میں نے میٹرک پاس کیا ہے۔ بچوں کو ٹیوشن وغیرہ بھی پڑھا لیتی ہوں۔ کچھ ایسے مشکل لگے ہیں، میرے ساتھ جن کی وجہ سے چھوٹے موٹے ٹیوشن میں گزارہ نہیں ہوتا۔ ماں باپ بیمار ہیں۔ ایک بھائی اور ایک بہن ہے۔ بھائی پانچ سال کا ہے۔ بہن سات سال کی ہے۔ ان سب کو پالنا پڑتا ہے مجھے۔ پہلے عزت کی روزی کمانے کی کوشش کی تھی۔ ایک گھر میں نوکری

بھی کی تھی، وہیں ایک سانپ نے مجھے ڈس لیا، بے آبرو ہوگئی اور وہ مجھے بلیک میل بھی
لگا اور پھر فاحشہ بن گئی۔ تھوڑا سا سفر طے کرنا پڑا تھا بس شرافت اور فحاشی کی بات ختم ہو
"اماں" مل گئیں۔ انہوں نے کہا کہ اس زندگی میں بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑ
ہم جیسے لوگوں کے ساتھ اگر رہو تو ان مشکلات سے بچی رہو گی۔ ماں باپ سے یہی کہا
کہ ایک ایسی جگہ نوکری کرتی ہوں جہاں مجھے وہیں رہنا پڑتا ہے۔ ہفتے میں ایک دن گھر
جاتی ہوں۔ دن بھر ان کے ساتھ رہتی ہوں اور واپس آجاتی ہوں۔ اب بہن اور بھائی
سکول میں ڈالا ہوا ہے۔ ماں باپ کا پرائیویٹ علاج ہورہا ہے...... سن لی کہانی؟" سلـ
چہرہ رنجیدہ رہا، پھر اس نے کہا۔

"بہت افسوس ہے شجیلا...... انسان اگر جذباتی ہو تو بہت سے وعدے کرنے کی کوشش
ہے اور پھر اسے خود اپنے وعدوں پر شرمندگی ہوتی ہے۔ میں تم سے کچھ نہیں کہوں گا۔ یہ تم
سے پیسے میری طرف سے...... اپنی مشکلات کے حل میں میرا حصہ سمجھ لو اور سنو...... جن
کا تم اظہار کر رہی ہو، میں پوری سچائی کے ساتھ تمہیں یہ بات بتا رہا ہوں کہ میں اس ط
انسان نہیں ہوں اور نہ ہی عیاشی کی غرض سے یہاں آیا ہوں۔ میرا فضل دین سے ک
واسطہ نہیں، صرف چند روز کا ساتھ ہے۔ کہیں سے چل کر یہاں تک آگیا ہوں اور یہاں
بھی چلا جاؤں گا۔ ایک وعدہ کر کے جا رہا ہوں، شجیلا! کاش! میں وہ بن سکوں جو ہوں
اندر سے بہت بڑا انسان ہوں اور باہر سے بہت چھوٹا۔ بس اتنا کافی ہے، اپنے تعارف
لئے۔ اگر باہر سے بھی بڑا انسان بن گیا تو تمہیں تلاش کروں گا اور ایک ایسا مقام دوں
تمہیں ایک معیاری زندگی دے دے۔" وہ سلطان کو دیکھتی رہی پھر اس نے دس ہزا
نوٹوں کو دیکھا اور بولی۔

"مگر یہ کس بات کا معاوضہ ہے؟"۔

"میں نے کہا نا...... تمہاری مشکلات کے حل کا ایک چھوٹا سا حصہ"۔

"بہت بڑا حصہ ہے یہ اور جس پیشے سے میں منسلک ہوں، اس میں اس کی حیثیت
سے بڑی ہے، چنانچہ میں انہیں خاموشی سے اپنے لباس میں چھپائے لیتی ہوں اور تمہار
کے بدلے بس ایک دعا دے سکتی ہوں کہ جس بڑائی کی تلاش میں تم ہو وہ تمہیں مل جا
سلطان مسکرا دیا، پھر بولا۔

"ہاں...... میرے لئے یہ دعا سب سے بڑی ہے"۔ وہ تھوڑی دیر تک سلطان کے پاس
بیٹھی رہی اور اس کے بعد چلی گئی۔ دوسری صبح فضل دین پھر اس کے پاس آیا تھا، اس نے کہا۔

"میں نے ہوٹل میں تمہارے لئے بھی ایک کمرہ لے لیا ہے۔ ہم تین دن یہاں رہیں
گے اور اس کے بعد واپس چلیں گے۔ آؤ...... اس کے بعد میں تمہیں کراچی گھماؤں گا"۔ وہ
دونوں وہاں سے چل پڑے۔ سلطان نے ایک درمیانے درجے کے ہوٹل میں برابر کے دو
کمرے لے لئے تھے۔ یہاں وقت گزرنے لگا اور پھر ایک دن فضل دین اور سلطان گھوم رہے
تھے۔ کلفٹن کے ساحل پر کہ انہیں ایک شخص ملا۔ وہ سلطان کو دیکھ کر اس کے قریب آگیا تھا۔

"تمہارا نام سلطان ہے نا؟" سلطان نے اسے پہچان لیا۔ یہ سائیں فیض بخش کا آدمی
تھا۔ اس کی آنکھوں میں عجیب سے تاثرات تھے۔ سلطان اسے گھورتا ہوا بولا۔

"اور تم سائیں فیض بخش کے آدمی ہو؟"

"ہاں، اللہ وسایا ہے میرا نام...... بس چھوٹا سا کام ہے میرا سائیں فیض بخش سے......
ابھی دو دن پہلے گوٹھ گیا تھا۔ پتہ چلا تم نے سائیں فیض بخش کی حویلی جلا دی ہے۔ سائیں فیض
بخش نے ڈیرا جما رکھا ہے، حویلی کے سامنے اور ابھی تک پولیس کو اس بارے میں اطلاع نہیں
دی لیکن وہ تمہارے بارے میں اچھے ارادے نہیں رکھتا"۔

"اب تم یہاں سے جاؤ گے اور اسے یہ بتاؤ گے کہ میں کراچی میں موجود ہوں"۔

"سودا ہوسکتا ہے...... اگر تم چاہو تو؟"

"کیسا سودا؟"

"سائیں ظفر محمود کے باغوں کا ٹھیکہ مجھے دلوا دو۔ پرچہ لکھ کر دے دو، اپنے ہاتھ سے ان
کے لئے۔ باغوں کا ٹھیکہ مجھے مل جائے گا تو سمجھ لو میری زبان بند رہے گی"۔

"تمہاری زبان کو تو میں ابھی اور اسی وقت بند کر سکتا ہوں...... پانی کا یہ بہت بڑا سمندر
آسانی سے تمہیں قبول کر لے گا"۔

"نہیں سائیں، ایسی کوئی بات نہیں ہے...... وہ دیکھو ادھر، وہ ایک جیپ کھڑی نظر آرہی
ہے نا۔ سات بندے ہیں ہمارے...... ایک اشارہ کریں گے تو جیپ تمہارے اوپر آنے کے
لئے تیز دوڑے گی"۔

"دھمکی مت دو، کیا چاہتے ہو؟" اس بار فضل دین نے آگے بڑھ کر غراتی ہوئی آواز میں کہا۔

''آپ کون ہو سائیں؟''

''وہ سات ہیں نا جیب میں اگر ادھر سے ستائیس نکل آئیں تو؟''

''تو بھاری پڑیں گے سائیں...... تھوڑے اِدھر کے مارے جائیں گے، تھوڑے اُدھر مگر ہم ایک حل پیش کر رہے ہیں نا''۔

''ابھی لکھ کر دے دیا جائے تمہیں کہ باغوں کا ٹھیکہ تمہیں مل جائے''۔

''نہیں سائیں! پتہ بتا دو...... زبان پر اعتبار کریں گے''۔

''تو ٹھیک ہے پتہ نوٹ کرلو، آجانا بات چیت کریں گے''۔ فضل دین نے ایک مرتبہ دہرایا اور اس شخص نے نوٹ کرلیا، پھر بولا۔

''ٹھیک ہے سائیں اعتبار کرتے ہیں۔ بڑے کام اعتبار کے سہارے ہی چلتے ہیں۔ کوئی سازش نہیں ہوگی۔ سائیں! ہم بھی ٹھیکیدار ہیں۔ باغوں کے ٹھیکے لیتے ہیں۔ پھل با کرتے ہیں۔ ایکسپورٹ کا کاروبار ہے، اپنا، کیا سمجھے''۔

''بس اعتبار کرتے ہو تو جاؤ......'' وہ ہنستا ہوا واپس چلا گیا۔ تب فضل دین نے کہا۔

''کیا خیال ہے گھومو گے یا واپس چلیں...... طبیعت الجھن کا شکار تو ہوگئی ہوگی''۔

سلطان نے ایک نگاہ فضل دین کو دیکھا۔ قبرستان میں مُردوں کے ڈھانچوں کا کار کرنے والا یہ آدمی عجیب وغریب تھا۔ اس نے دس ہزار روپے بھی سلطان کو دے دیئے۔ اور اس کے بعد بھی اس کی رفاقت کا دم بھر رہا تھا۔ واپس پلٹتے ہوئے سلطان نے پوچھا۔

''جو پتہ تم نے اسے بتایا ہے، وہ ٹھیک ہے''۔

''بالکل نہیں...... یار! یہ کراچی ہے۔ وہ اپنے آپ کو بہت زیادہ چالاک سمجھ رہا ہے پر یہاں ایک سے ایک بڑا ٹھیکیدار پڑا ہوا ہے اور وہ ایسا ٹھیکہ بجاتا ہے کہ اچھے اچھوں ٹھیکے ہو جاتے ہیں۔ ایسے ہی پتہ دے دیا ہے، بھاڑ میں جائے، دوبارہ ملے گا تو دیکھا جا گا''۔ دونوں ہوٹل واپس آگئے۔ فضل دین نے کہا۔

''کیا خیال ہے...... شجیلا کے پاس جاؤ گے؟''

''نہیں آرام کروں گا''۔

''دل بہلانا چاہو تو اور بھی بہت سے بندوبست ہو سکتے ہیں''۔

''نہیں...... آؤ بیٹھو''۔ سلطان نے کہا پھر بولا۔

''تم نے کوئی سوال نہیں کیا مجھ سے کہ اللہ وسایا ٹھیکیدار کیا کہہ رہا تھا''۔

''یار! دل تو چاہتا ہے کہ تم سے تمہارے بارے میں بہت کچھ پوچھا جائے۔ یقین کرو کہ تم اچھے لگے تھے، جب ہم دونوں قبر پر بیٹھے ہوئے تھے۔ نہ جانے کیوں مجھے یوں لگا تھا کسی بہت بڑے آدمی کے پاس بیٹھا ہوا ہوں اور اس کے بعد یقین کرو سارا کام اسی تاثر میں ہوا ہے، یعنی تم سے دوستی۔ تمہیں یہاں تک لانا، کھانا پینا، اٹھنا بیٹھنا اور آج تک کا یہ ساری محبت کیوں دل میں جاگی ہے۔ یہ اوپر والا ہی جانے۔ بہت سی باتیں انسان نہیں سمجھ پاتا ہے''۔ فضل دین کے الفاظ سلطان کے لئے بڑے عجیب تھے، سلطان نے کہا۔

''میں ایک بہت بڑے زمیندار کا بیٹا ہوں''۔ اور پھر سلطان نے فضل دین کو اپنے بارے میں سب کچھ بتا دیا۔ یہ ہلکے پن کی بات نہیں تھی۔ وہ اپنے آپ کو سب سے برتر سمجھتا تھا لیکن فضل دین نے اس کے ساتھ جتنے اچھے سلوک کئے تھے انہوں نے اسے مجبور کر دیا تھا کہ وہ فضل دین کو اپنا راز دار بنائے، چنانچہ اس نے فضل دین کو اپنے بارے میں پوری تفصیل بتا دی اور فضل دین کے چہرے سے پتہ چلنے لگا کہ وہ اس تفصیل سے بے حد متاثر ہوا ہے۔ بہت دیر تک وہ سوچتا رہا، پھر اس نے کہا۔

''تو پھر اب تم کیا کرو گے، آغا سلطان؟''

''بات اصل میں یہ ہے فضل دین! کہ نہ تو میں سائیں فیض بخش سے خوفزدہ ہوں نہ کسی اور سے، اگر مجھے کوئی خوف ہے تو صرف اپنے باپ سے ہے۔ ویسے بھی میں اپنے گھر میں کوئی ل ہم انسان نہیں ہوں۔ بس میری اپنی حرکتیں مختلف ہیں۔ باپ سے میں اس لئے خوفزدہ ہوں کہ اگر اس نے کبھی میرا گریبان پکڑ لیا تو میں اس کے ساتھ کوئی برا سلوک نہیں کر سکتا۔ باقی لوگوں کی مجھے کوئی پروا نہیں ہے''۔

''دیکھو بھائی سلطان! اصل میں تم سے صرف ایک بات کہنا چاہوں گا میں، وہ یہ کہ انسان کو اپنے آپ کو دنیا میں سب سے بڑا نہیں سمجھنا چاہئے...... اُونٹ اور پہاڑ کا مقولہ تم نے سنا ہوگا۔ کبھی نہ کبھی گڑبڑ ہو ہی جاتی ہے۔ میں تمہیں ایک بھائی کی حیثیت سے مشورہ دے رہا ہوں کہ یہاں رہ کر انتظار مت کرو۔ فرض کرو اگر سائیں فیض بخش ہی تمہارے سامنے آگیا تو زیادہ سے زیادہ تم یہی کر سکتے ہو کہ اسے جان سے مار دو یا کچھ اور تباہی پھیلا دو۔ مجرم بن جاؤ پھر کیا فائدہ کہ اِدھر سے اُدھر بھاگتے پھرو اور جو سامنے آجائے اسے زندگی سے محروم

کردو۔ کام ایسا ہونا چاہئے جو کوئی فائدہ دے۔ میری مانو تو تم ملک سے باہر نکل جاؤ۔ تم لئے بہت سے راستے کھل جائیں گے"۔

"ملک سے باہر؟" سلطان نے کسی قدر حیران نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہاں...... یہ ایک بہترین عمل رہے گا"۔ سلطان سوچ میں ڈوب گیا، لیکن فضل دین فوراً ہی اس کے خیالات کا سلسلہ منقطع کر دیا۔

"اگر سمندر کے راستے باہر نکلنا چاہو تو اس کا بندوبست میں دو چار دن میں کر ہوں۔ اصل میں ہمارا یہ مال تم سمجھ رہے ہو گے نا، باہر جاتا ہے اور ظاہر ہے قانونی ذریعے نہیں جاتا۔ اس میں غیر قانونی ذریعے اختیار کرنے ہوتے ہیں، لیکن میں تمہیں ایک بتاؤں۔ یہ غیر قانونی ذریعے بھی قانون کی نگاہ میں ہوتے ہیں۔ باقاعدہ ایک شپنگ کمپنی جو مقامی نہیں ہے، ہمارا رابطہ ہوتا ہے اور اس شپنگ کمپنی کے معاملے میں باہر کے لوگ ساری ذمہ داریاں قبول کرتے ہیں۔ ہمارا کام بس اتنا ہوتا ہے کہ مال کی پیٹیاں بندرگاہ پہنچا دیں، وہ بھی اس وقت جب ہمارے پاس کوئی آرڈر ہو اور میں نے تمہیں بتایا تھا بار ہم ایک آرڈر سپلائی کر رہے ہیں۔ یہ ہمارے مال کی آخری کھیپ تھی جو ہم نے یہاں ہے۔ مال کل دوپہر کو بندرگاہ تک پہنچ جائے گا۔ جہاز بھی جلد ہی لنگر اٹھا دے گا کیونکہ ساری لوڈنگ ہو چکی ہے اور اس کی روانگی کی تاریخ بھی طے ہو چکی ہے"۔

"گڈ، مگر ایک بات بتاؤ...... کاغذات وغیرہ کا کیا ہوگا"۔

"یار! جہاز کا کپتان خود تمہارا ذمہ دار ہوگا۔ کاغذات بھی وہی تیار کرے گا۔ ارے آج کی دنیا میں انسانی زندگی کے لئے بڑی آسانیاں پیدا ہو گئی ہیں۔ پہلے لوگ اندا ڈھول پیٹا کرتے تھے، اب وہ ڈھول پھٹ چکے ہیں۔ ہر بندہ اپنے لئے سب کچھ کر ہے۔ سب سے پہلے اپنے آپ کو دیکھو پھر دوسرے کو اور جب اپنے آپ کو دیکھنے کی بات ہے تو پھر یہ سمجھ لو کہ ہر مشکل کو آسان بنانے کی کوششیں بنیادی حیثیت رکھتی ہیں...... سمجھ ہو نا میری بات"۔

"یار کمال ہے، تم تو ایک فلاسفر نکلے...... پر ایک بات بتاؤ دوست! تم سے ہو جائے گی"۔ فضل دین ہنسنے لگا پھر بولا۔

"سچ کہوں تم سے...... میرا بھی ایک ماضی ہے، ایک کہانی ہے۔ بلاوجہ اس دھندے

تنہا آ گیا۔ انسانوں نے جب اتنا دباؤ ڈال دیا کہ زندگی کا دم گھٹنے لگا تو میں نے اپنے فضل دین کو جگایا اور فضل دین جب جاگا تو اس نے اس دنیا میں جینے کے راستے تلاش کر لئے...... سمجھ رہے ہو نا میری بات...... اب بولو کیا کہتے ہو؟"

"ٹھیک ہے، میں باہر جانے کے لئے تیار ہوں...... تم میرے لئے بندوبست کر دو"۔

"کوئی مسئلہ ہی نہیں...... اور سنو، تھوڑے سے پیسے خرچ ہو جائیں گے"۔

"اس کی تم پرواہ مت کرو، بلکہ مجھے اپنے پاس موجود رقم کے ٹریولر چیک بھی بنوانے ہیں تاکہ باہر میرے کام آ سکیں"۔

سارے معاملات اس انداز میں طے ہو گئے اور آخرکار فضل دین جیسے معمولی سے آدمی نے ایک اتنا بڑا کام کر ڈالا کہ تصور میں بھی نہ آ سکے۔ فضل دین نے اسے جہاز کے کپتان سے ملایا اور کپتان نے خوش دلی سے اسے خوش آمدید کہا اور اپنے جہاز پر قبول کر لیا۔ سلطان بہت ہی بے خوف اور نڈر انسان تھا، لیکن جب جہاز کے لنگر اٹھائے جا رہے تھے تو وہ ریلنگ کے ساتھ کھڑا ہوا، حبیب بنک پلازہ کی بلڈنگ دیکھ رہا تھا اور اس کے ساتھ ساتھ ہی قرب و جوار کے مناظر اس کی نگاہوں میں نمایاں تھے۔ کراچی کو تیسری بار دیکھا تھا اور اس بار ذرا اپنے طور پر دیکھا تھا لیکن بات وطن کی خوشبو کی تھی۔ ساری باتیں اپنی جگہ مگر دکھ کا کوئی احساس اس کے ذہن میں نہیں تھا...... لیکن نہ جانے کیوں اس وقت بندرگاہ کا آخری نظارہ کرتے اور غروب آفتاب کا منظر دیکھتے ہوئے دل کو ایک دکھ کا سا احساس تھا۔ بچپن کی یادیں بے شمار واقعات کی حامل ہوتی ہیں۔ ان یادوں کو دل سے نکالنا بڑا مشکل کام ہوتا ہے۔ نہ جانے کیوں اسے اپنا سینہ ارمانوں کا بے نشان قبرستان معلوم ہو رہا تھا۔ بہت دیر تک وہ ریلنگ سے لگا مختلف لوگوں کو دیکھتا رہا۔ ملکی اور غیر ملکی سبھی لوگ جہاز کے مسافر تھے، بہت دیر تک وہ اسی طرح کھڑا ساکت نگاہوں سے ماحول کا جائزہ لیتا رہا اور پھر اپنی جگہ سے ہٹ گیا۔

جہاز بندرگاہ سے کافی آگے نکل آیا تھا۔ کافی دیر تک سوچتے رہنے کے بعد وہ اپنے کیبن میں جانے کے ارادے سے سیڑھیوں کی جانب چل پڑا اور تیز تیز قدموں سے سیڑھیاں طے کرنے لگا، لیکن اچانک ہی وہ ایک بوڑھے آدمی سے ٹکرا گیا۔ بوڑھا آدمی اس کی ٹکر سے اپنا توازن نہ سنبھال سکا۔ وہ لڑکھڑا کر گرنے والا تھا کہ سلطان نے لپک کر اسے اپنے بازوؤں کی گرفت میں لے لیا۔

''نو پرابلم ینگ مین! نو پرابلم''۔

بوڑھے نے اپنے سفید بالوں کو سنوارتے ہوئے کہا اور پھر مسکرا کر بولا۔

''ایک عمر ہوتی ہے اور اس عمر میں انسان یقیناً دوسروں سے ٹکراتا ہے، لیکن کبھی کبھ طرح کی ٹکریں بے شمار حادثوں کا باعث بن جاتی ہیں''۔ اس نے جیب سے چشمہ نکا آنکھوں پر چڑھایا اور یہ چشمہ لگانے کے بعد وہ اور بھی پُروقار نظر آنے لگا۔ اس کی شخصیہ ایک مقناطیسیت تھی جسے ایک لمحے کے اندر اندر سلطان نے محسوس کیا، وہ بولا۔

''میں اس جلد بازی پر شرمندہ ہوں اور آپ سے معذرت چاہتا ہوں''۔ سلطا آگے قدم بڑھائے اور اچانک ہی اس نے اس کے کندھوں پر ہاتھ رکھ دیا اور بولا۔

''تم پھر جلد بازی کر رہے ہو دوست! میرے جسم سے ٹکرا کر تم نے جو تکلیف مجھے ہے، میں اس کے لئے تمہاری معذرت قبول کرتا ہوں مگر کچھ دیر تو رکو، اتنی جلد بازی بھی جب دو انسان آپس میں ملتے ہیں اور کوئی تم سے قربت چاہتا ہے تو تھوڑا اس کو وقت چاہئے اور جب بڑے اچھے محاورے کے ساتھ ہم لوگ یہ بات کہہ سکتے ہیں کہ ہم ایک کے سوار ہیں۔ کیا خیال ہے، ہے یا نہیں؟''

سلطان سمجھ گیا تھا کہ بڑے میاں تھوڑے سے جھکی ہیں اور باتیں کرنا چاہتے ہیں سلطان کو بھی کوئی جلدی نہیں تھی، اس نے ایک گہری سانس لی اور مسکرانے لگا۔ اتنی تیز فطرت کو تھوڑی سی لگام دینا بے حد ضروری تھا، اس نے کہا۔

''بے حد شکریہ''۔

''گڈ، اب تمہارے چہرے پر جو کیفیت نظر آ رہی ہے وہ بتاتی ہے کہ تم میری قربت مطمئن ہو۔ کیا میں تم سے ایک سوال کر سکتا ہوں؟''

''جی فرمائیے''۔ سلطان بولا۔

''تم اس وقت کیا سوچ رہے تھے، جب مجھ سے ٹکرا گئے تھے۔ کیا تم کسی ذہنی الج شکار ہو؟''

''جی، بالکل درست ہے لیکن آپ کے خیال میں کیا میں آپ کو اپنی الجھنیں بتانا کردوں''۔

''ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔ تمہارا لہجہ کسی قدر تلخ ہوگیا ہے۔ ظاہر ہے، کوئی بھی ایک

کسی اجنبی کو اپنی مشکل میں شریک نہیں کرتا۔ میں معافی چاہتا ہوں اپنے اس سوال کی، نے تمہارے لہجے کو ایک لمحے کے اندر اندر تلخ کر دیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ انسان کے اندر تلخی پیدا ہو جائے تو فوری طور پر اس سے الگ ہو جانا چاہئے تاکہ بعد میں محبت کی کی گنجائش رہے...... خدا حافظ''۔ بوڑھے نے کہا اور ریلنگ کی طرف بڑھ گیا۔

سلطان اپنے کیبن کی جانب چل پڑا تھا۔ جہاز کے عام مسافروں کی طرح اس نے پورا ایہ ادا کیا تھا اور اسے باقاعدہ کیبن الاٹ کیا گیا تھا۔ اس کی حیثیت ایک معزز مہمان کی سی چنانچہ اسے تمام آسائشیں بھی حاصل تھیں۔ جہاز کے کیبن میں اپنے بستر پر لیٹ کر وہ نہ انے کیسی کیسی سوچوں میں گم ہوگیا۔ کبھی کبھی وہ اپنے آپ سے یہ سوال بھی کرتا، میں کہاں رہا ہوں اور کیوں جا رہا ہوں، میں گھر سے کیوں بھاگا ہوں...... ظاہر ہے ظفر محمود صاحب حالات کا سامنا کریں گے جو سائیں فیض بخش کی حویلی جلنے کے بعد انہیں پیش آئیں اصولی طور پر تو مجھے ان کے اردگرد رہ کر حالات کا جائزہ لیتے رہنا چاہئے تھا اور ان کی کرنی چاہئے تھی، لیکن یہاں وہی بدقسمتی تھی۔ سائیں فیض بخش اگر حویلی جلنے کے واقعے کو انداز کر بھی دیتا تو خود ظفر محمود صاحب اس سے دشمنی کا اظہار کرتے اور صورت حال بڑی ل ہو جاتی...... بہرحال وہ اس بات کا بھی قائل تھا کہ تقدیر جو فیصلے کرتی ہے، وہی مناسب تے ہیں۔

رات کے کھانے کے بعد وہ عرشے پر آ گیا اور ریلنگ کے قریب کھڑے ہو کر چاند کی جا کرنوں کو دیر تک دیکھتا رہا۔ کھلی فضاء میں خاصا سکون محسوس ہو رہا تھا۔ اس نے چاروں ف نگاہیں دوڑائیں تو اندازہ ہوا کہ اس کی طرح دوسرے بہت سے مسافر بھی چاندنی کا اٹھا رہے ہیں۔ اچانک اسے اپنی پشت پر دبی دبی سرگوشیاں سنائی دیں۔ دو افراد باتیں ہے تھے۔ ان میں ایک عورت تھی اور ایک مرد، اس نے سر گھما کر دیکھا تو ایک لمحے کے حیرت زدہ سا ہو گیا۔ شام کے وقت سیڑھیوں میں ٹکرانے والا بوڑھا شخص ایک بہت حسین کی کے ساتھ گفتگو میں مصروف تھا، مگر اس لڑکی کو دیکھ کر نہ جانے کیوں سلطان کو حیرت کا شدید جھٹکا سا لگا۔ وہ سیاہ برقع میں ملبوس تھی، لیکن اس کے چہرے سے اٹھا ہوا نقاب نے والوں کو دعوتِ نظارہ دے رہا تھا۔ ایک لمحے کے لئے اسے ایسا لگا جیسے وہ کسی مافوق رت ہستی کو دیکھ رہا ہو۔ یہ ہستی اپنے چہرے کے نقوش سے پتہ نہیں کیا لگ رہی تھی۔ بہت

دیر تک سلطان اس کا جائزہ لیتا رہا۔ اس کے ذہن کے کسی گوشے میں اس لڑکی کا نقش
تھا، لیکن وہ کون ہے اور کیا ہے، یہ اسے بالکل یاد نہیں آ رہا تھا۔ ایک عجیب سی کرید اس کے
میں پیدا ہوگئی اور ایک لمحے کے لئے اس نے سوچا کہ بوڑھے سے تو اس کا تعارف ہے
آگے بڑھ کر اسے دیکھے اور معلومات حاصل کرے کہ آخر یہ لڑکی اس کے ذہن کے کون
حصے میں پوشیدہ ہے۔ ابھی وہ یہی سوچ رہا تھا کہ بوڑھا ریلنگ سے ہٹ کر سیڑھیوں کی جا
چل پڑا۔ اس کی ساتھی لڑکی نے اپنا چہرہ نقاب سے ڈھک لیا تھا، لیکن اس کے چہرے
نقوش گویا فضاء میں تیر رہے تھے۔ ایک عجیب سا انداز تھا، وہ سیڑھیوں سے نیچے اتر کر
سے اوجھل ہوگئے، لیکن نہ جانے کیوں سلطان کو ایک عجیب سا احساس ساکت کر چکا تھا۔ آخر
لڑکی کون ہے وہ تو اپنی محبوبہ سے یہ کہہ کر آیا تھا کہ وہ اس کا انتظار کرے اور دھمکی بھی دی تھی
اگر اس نے کسی اور کو زندگی کا ساتھی بنالیا تو اس کا ساتھی زندہ نہیں رہ سکے گا۔ مہرالنساء
بارے میں اسے بالکل علم نہیں تھا کہ وہ اسے چاہتی ہے یا نہیں، لیکن بہرحال وہ اسے ضرور
تھا...... بہت دیر تک نہ جانے کیسے کیسے خیالات اس کے دل کے دروازے پر دستک دیتے
رہے۔

سلطان ریلنگ سے ٹک کر سمندر کی لہروں کو دیکھنے لگا۔ ان لہروں میں اسے نہ جانے
کیا نظر آ رہا تھا۔ پھر اس نے گہری سانس لی۔ آسمان پر چاند کھلا ہوا تھا اور چاندنی وہاں
لوگوں کے قدم روکے ہوئے تھی، کیونکہ تاحدِ نظر پھیلے ہوئے سمندر کے نقوش اس قدر حسین
رہے تھے کہ بیان سے باہر ہو، اچانک ہی وہ چونک پڑا۔ کسی نے عقب سے پوچھا تھا۔

''سوری سر، کیا آپ کے پاس ماچس ہوگی؟ میرا لائٹر شاید بھیگ گیا ہے''۔ سلطان
سگریٹ نہیں پیتا تھا۔ ماچس اس کے پاس نہیں تھی۔ اس نے پلٹ کر معذرت آمیز لہجے میں

''معافی چاہتا ہوں۔ میں سگریٹ نہیں پیتا''۔

وہ شخص جو اس کے پیچھے کھڑا ہوا تھا، اپنے بھیگے ہوئے لائٹر کو جھٹکنے لگا۔ پھر اس نے

''ذرا بے احتیاطی سے کھڑا ہوا تھا...... پانی کی ایک تیز لہر نے چھینٹے اڑائے تو یہ
بھیگ گیا۔ وہ بار بار کلک کر رہا تھا اور سلطان اس کے چہرے کو دیکھنے کی کوشش کر رہا
اچانک ہی لائٹر جل اٹھا اور اس شخص نے ایک خوشگوار مسکراہٹ کے ساتھ اپنی سگریٹ
پھر مسکرا کر سلطان کو دیکھتا ہوا بولا۔

''آپ سگریٹ کیوں نہیں پیتے؟''

''بہت سے سوالات ایسے ہوتے ہیں جو جواباً کیے جاسکتے ہیں۔ میں آپ سے یہ پوچھتا
ہوں کہ آپ سگریٹ کیوں پیتے ہیں؟''

''ویری گڈ...... میرے خیال میں سگریٹ تنہائی کا بہترین ساتھی ہے اور ویسے بھی میں تنہا
ہوں اور آپ جانتے ہیں کہ سمندری سفر کس قدر اکتا دینے والا ہوتا ہے۔ سگریٹ ایک بہترین
ساتھی ہے۔ آپ پئیں اور غور کریں تو آپ کو اندازہ ہوجائے گا کہ تنہائی ہو، سگریٹ ہو، خاموشی
ہو تو آپ کو یوں لگتا ہے جیسے آپ اپنی کسی محبوبہ سے مدھم سرگوشیوں میں باتیں کر رہے ہیں''۔

''بالکل ٹھیک کہا آپ نے اور یہ زہریلی محبوبہ خاموشی سے آپ کے سینے میں خنجر اتار
رہی ہے''۔

''نکوٹین کی بات کر رہے ہیں آپ؟''

''جی...... اور نکوٹین کا زہر ساری دنیا میں تسلیم کرلیا گیا ہے''۔

''آپ فوری جوابی کارروائی کے ماہر ہیں۔ میرا نام سہیل ہے، کیوں نہ ہم لوگ ایک
دوسرے سے تعارف حاصل کرلیں''۔

''سلطان''۔ اس نے جواب دیا۔

''آپ کا پُروقار انداز آپ کو سلطان ہی ظاہر کرتا ہے۔ ویسے میرا تعلق لاہور سے ہے،
کیا سمجھے آپ؟''

''ہاں...... لاہور لاتعداد روایتوں کا امین''۔

''آپ کہاں کے رہنے والے ہیں؟''

''سکھر''۔ سلطان کے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔

''واہ...... بڑی خوشی ہوئی ویسے میں آپ کو بتاؤں کہ میں نسلاً ایرانی ہوں، مگر میرے
بزرگوں کا کاروبار چونکہ برصغیر میں ہر طرف پھیلا ہوا ہے، اس لئے میں نے اپنی رہائش لاہور
رکھی تھی۔ ہم لوگ یعنی میں اور میرے اہلِ خاندان اردو ہی بولتے ہیں۔ ویسے انگریزی اور
بنگالی میں نے اچھی طرح سیکھی ہے۔ کیا خیال ہے، اگر ہم جہاز کے ریستوران میں بیٹھ کر عمدہ
کافی پئیں تو گفتگو کرنے میں مزہ آئے گا۔ ویسے ایک سوال اور کرلوں آپ سے کہ آپ
لیتے ہیں؟''

"ہاں"۔ سلطان نے جواب دیا۔ وہ قہقہہ مار کر ہنسا اور پھر بولا۔

"دو تنہا مل جائیں تو تنہا نہیں رہتے آیئے، ہم اپنی تنہائی دور کریں"۔

وہ سلطان کو ساتھ لے کر اوپن ایئر ریستوران کی جانب چل پڑا۔ ریستوران م خاصی رونق تھی۔ وہ دونوں ایک میز کے گرد بیٹھے تھے اور کافی طلب کر لی۔ تھوڑی دیر م سرد ہوگئی اور سہیل اس سے باتیں کرتا رہا۔ تھوڑی دیر کے بعد سہیل کے بارے میں سل یہ اندازہ ہوگیا تھا کہ وہ خاصا شاطر اور تجربے کار آدمی ہے۔ اس کی باتوں میں بڑی گہ اور اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ دنیا کے بارے میں اس کی معلومات لامحدود ہیں۔ تھوڑی د بعد اچانک اس نے سوال کیا۔

"ایک بات بتاؤ سلطان"۔ سلطان اس کی جانب متوجہ ہوگیا تو وہ کافی کے گھونٹ میں اتارتا ہوا بولا۔

"تم نے زندگی میں محبت کی ہے؟" سلطان کے ہونٹوں پر مدھم سی مسکراہٹ پھیل اس نے کہا۔

"اس بات کو میں دل سے تسلیم کرتا ہوں کہ تم مجھ سے زیادہ تجربے کار ہو۔ تم سامنے کچھ بولتے ہوئے مجھے اپنے الفاظ پر غور کرنا چاہئے، لیکن کہہ دینے میں کوئی ہرج ہے کہ محبت کی نہیں جاتی بلکہ ہو جاتی ہے۔ یہ ایک کھیتی ہے جو دلوں کی سرزمین پر خودرو کی مانند پروان چڑھتی ہے"۔

"گڈ...... ویری گڈ...... تم نے بہت خوب صورت الفاظ میں یہ بات کہی ہے۔ میرے سوال کا جواب نہیں ہے۔ میں تو تم سے براہِ راست یہ پوچھ رہا ہوں کہ کیا سے محبت ہوئی ہے یا دوسرے الفاظ میں تم نے کسی سے عشق کیا ہے؟ ویسے میں تمہیں بتاتا چلوں کہ محبت سے میری مراد وہ محبت نہیں جو ماں بیٹے، بہن بھائی اور باپ بے بلکہ میں اس محبت کی بات کر رہا ہوں جو روح کے ویرانوں میں تمنا کے پھول کھلاتی ہے"۔

سلطان ہنس پڑا اور بولا۔

"ہم دونوں محبت کے بارے میں ضرورت سے زیادہ سنجیدہ نہیں ہوتے جا رہے کی شان میں قصیدہ خوانی کرتے ہوئے اچھے الفاظ نہیں تلاش کر رہے؟ ویسے تم مجھے معلوم ہوتے ہو"۔

ں، میں فلسفی بالکل نہیں لیکن خوش قسمت ضرور ہوں...... زندگی کے سفر میں، میں یں اس جہاز کے سفر کی بات نہیں کر رہا۔ زندگی کے سفر میں اگر ایک دوسرے کو سمجھنے والے ہی مل جائیں تو کیا ہی عمدہ بات ہوتی ہے۔ میں کیا بتاؤں تمہیں...... ایک عجیب و غریب بی میری ذات سے وابستہ ہے...... کاش میں تمہیں وہ کہانی سنا سکتا"۔

"کیا مطلب؟" سلطان نے سوال کیا۔

"بس میں یہ کہہ رہا تھا کہ محبت ایک عجیب و غریب شے ہے۔ میرے لئے بھی ایک لمحہ آیا جب میں نے سوچا کہ محبت کے بغیر زندگی کا تصور ہی ممکن نہیں۔ آہ کیا بتاؤں میرے ت کہ میں کیسی الجھن کا شکار ہوں۔ خیر چھوڑو ابھی ہمارا واسطہ بہت مختصر ہے۔ ویسے ے بارے میں میرا یہ اندازہ ہے کہ تم نے یقیناً محبت کی ہے۔ اب اپنی محبت کے سلسلے نہیں کامیابی ہوئی یا ناکامی، یہ میں نہیں کہہ سکتا لیکن میرا اندازہ ہے کہ تمہارے دل میں کے پودے ضرور پروان چڑھے ہیں۔ تمہاری محبت کا کیا ہوا، تم کہاں جا رہے ہو، تمہارا ہ کہاں ہے؟ یہ بات میرے علم میں نہیں لیکن میں کوشش کروں گا کہ اس سے واقف ں"۔ سلطان مسکرانے لگا تھا۔ بہرحال کافی دیر تک وہ وہاں بیٹھے اور اس کے بعد سہیل کراتے ہوئے کہا۔

"تمہاری آنکھوں میں سرخ ڈورے کھنچ گئے ہیں اور میں تم سے ہر قیمت پر دوستی رکھنا ہوں اور ایک دوسرے کے ساتھ دوستی رکھنے کا بہترین ذریعہ یہ ہوتا ہے کہ آپس میں ایک ے کا خیال رکھا جائے، اس لئے اب ہمیں اٹھ جانا چاہئے"۔ وہ اٹھا تو سلطان بھی اس کے ل اٹھ گیا اور پھر دونوں ریستورانوں سے باہر نکل کر اپنے اپنے کیبن کی جانب چل پڑے۔

❀ ❀ ❀

ظفر محمود واقعی ایک صلح جو انسان تھے، پہلے تو کافی دن تک اس کے ہرکارے اور خود شکور جوار کی آبادیوں میں اور دور دور تک سلطان کو تلاش کرتے رہے تھے، لیکن انہیں اس ں کوئی کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔ ادھر فیض بخش کو اس کے ساتھی اطلاعیں دیتے رہے ور اور غفور واقعی ان کے لئے بڑے اچھے ثابت ہوئے تھے کہ وہ ان دونوں کے درمیان صلح کی کوشش کرتے رہے تھے، لیکن جب سلطان کا کوئی پتہ نہیں چلا تو ایک دن سائیں ئیں نے غفورے سے کہا۔

''غفورے، میں نے ظفر محمود سے کہہ دیا ہے کہ اس کی حویلی کی جگہ اصطبل بناؤں اب اس کام کا آغاز کردینا چاہتا ہوں میں''۔

''سائیں فیض شاہ، آپ بہت دن سے ان خیموں میں رہ رہے ہو۔ یہ احساس بھی ہوچلا ہے کہ کیا آپ کے رہنے کے لئے کوئی ٹھکانہ نہیں ہے۔ سائیں میں آپ سے ہاتھ جوڑ کر درخواست کرتا ہوں کہ یہاں نہیں تو کسی بھی گوٹھ میں آپ کی بڑی جائیدادیں پھیلی ہیں۔ آپ اپنے خاندان والوں کو ادھر پہنچادو''۔

''ٹھیک ہے، میں ایسا ہی کرتا ہوں مگر تجھے ایک کام کرنا ہے غفورے''۔

''حکم سائیں؟''

''ظفر محمود کے کسی ایک بیٹے کو ہی اغوا کرکے لے آؤ۔ ہم اس کے بل پر ظفر محمود کو مجبور کریں گے کہ وہ اپنی حویلی گرادے اور وہ جگہ ہمارے حوالے کردے۔ یہ میرا حکم ہے''۔

''آپ کا حکم سر آنکھوں پر سائیں، ایسا ہی ہوگا''۔ غفورے نے کہا اور اس نے بعد طور پر اپنے بھائی سے مشورہ کیا تو شکور نے کہا۔

''غفور، کیا خیال ہے تیرا سائیں فیض شاہ اس کے بیٹے کو مار ڈالے گا؟''

''فیض شاہ اس طرح کا آدمی ہے تو نہیں مگر اس کے ساتھ جو کچھ ہوا ہے، وہ بھی خطرناک ہے۔ اگر اس کا دماغ پھر ہی گیا تو کوئی کیا کرے گا؟''

''ہاں یہ تو ہے...... تو پھر بتاؤ کیا کرنا چاہئے؟ میرے لئے تو یہ ضروری ہے کہ فیض شاہ کے حکم کی تعمیل کروں اور میں نے جو تجھے یہ بات بتائی ہے تو تو مجھے روک! شکورے...... چاہے بعد میں تو واپس اس لڑکے کو حاصل کرلینا''۔ شکورا کسی سوچ میں گیا، پھر اس نے کہا۔

''ٹھیک ہے، یہ بات چونکہ تُو نے مجھے بتادی ہے اس لئے میں تیرا راستہ نہیں روکوں گا لیکن ایک ذمہ داری میں تیرے اوپر لگاتا ہوں، جسے بھی اغواء کرے اس کی زندگی کو نقصان نہیں پہنچانا۔ چاہے بعد میں ان لوگوں کا جو بھی مسئلہ طے ہو''۔

''نقصان یوں نہیں پہنچے گا کہ سائیں فیض شاہ کے بارے میں اتنا جانتا ہوں کہ وہ وڈیرہ ضرور ہے مگر ظالم نہیں ہے۔ برا تو ہوا ہے اس کے ساتھ، ظاہر ہے یہ دولت مند اسی ساکھ پر جیتے ہیں۔ ساکھ ختم ہوجائے ان کی تو کیا رہ جاتا ہے ان کے پاس؟''

''بالکل ٹھیک کہتے ہو۔ تو پھر بولو کیا کرنا چاہئے، کسے اغواء کرو گے تم؟''

''کوئی بھی ایک'' غفورے نے کہا پھر بولا۔

''تو میری مدد کر''۔

''تم عمران ظفر کو لے جاؤ۔ اس وقت بھی وہ گوٹھ علی میں باغ کے اندر موجود ہے۔ ایک دن وہیں رہنے کا ارادہ کرکے گیا ہے''۔

''ٹھیک ہے، تو بے فکر رہ میں خیال رکھوں گا د بات صرف اتنی سی ہے کہ ان دونوں کے درمیان خونریز تصادم نہیں ہونا چاہئے''۔

''میں تو اس کے لئے ہی کوشش کررہا ہوں''۔ شکور نے کہا۔

''اور میں بھی''۔

''ویسے میں تجھے بتادوں غفور، یہ میری تیری ذاتی بات ہے۔ سائیں ظفر محمود بھی بہت پریشان ہے۔ ہم لوگ چپے چپے پر اسے تلاش کرتے پھر رہے ہیں، لیکن وہ لڑکا بہت چالاک ہے۔ باقی لڑکوں سے کہیں زیادہ''۔

''ہاں یہ بات تو میں جانتا ہوں''۔ بہرحال شکور کی ذمہ داری تھی کہ وہ اس بات کا علم بھی کسی کو نہ ہونے دے اور جب عمران ظفر کے ساتھی جو گوٹھ علی میں سندھڑی آموں کے باغ میں مقیم تھے۔ انہوں نے آکر اطلاع دی کہ اچانک ہی کچھ نقاب پوش آئے اور عمران ظفر کو پکڑ کر لے گئے تو حویلی میں کہرام مچ گیا اور ہر طرف شور و غوغا ہوگیا۔ ظفر محمود کی بیوی پچھاڑیں کھارہی تھی اور رو رو کر کہہ رہی تھی۔

''ہائے میرے باغ میں آگ لگ گئی۔ میری پھلواڑی کے دو پھول ٹوٹ گئے۔ سلطان کس طرح غائب ہوگیا اور عمران ہائے ہائے......'' ظفر محمود نے شکور کو ہدایت کی کہ تیاریاں کرلے، انہیں فیض شاہ کے پاس چلنا ہے۔ شکور جانتا تھا کہ ظفر محمود کا ذہن اس طرف جائے گا۔ بہرحال یہ بڑے کٹھن لمحات تھے۔ سائیں فیض شاہ اپنے خیمے میں ہی موجود تھا۔ البتہ اس کے اہل خاندان وہاں سے چلے گئے تھے۔ ظفر محمود کو دیکھ کر فیض شاہ نے طنزیہ انداز میں گردن ہلائی اور بولا۔

''آؤ ظفر سائیں آؤ، کہو کیسے ہو؟''

''جیسا ہوں تمہیں معلوم ہے فیض شاہ۔ میں تم سے ایک سوال کرنا چاہتا ہوں''۔

"ہاں سائیں بولو"۔

"تم بھی بال بچوں والے آدمی ہو ہمارے تمہارے جھگڑے بچوں تک تو نہیں پہنچنے چاہئیں"

"ہمارا تمہارا تو کوئی جھگڑا ہی نہیں ہے سائیں۔ تمہارے بیٹے نے مجھے جو دو بڑے زخم پہنچائے ہیں، وہیں سے جھگڑے کا آغاز ہوا ہے"۔

"سائیں فیض شاہ، آپ سلطان کو تلاش کرو...... اسے سزا دینے میں، میں بھی آپ کے ساتھ رہوں گا۔ میرے دوسرے بیٹے کو کیوں آپ نے اٹھوالیا؟" فیض شاہ نے ایک لمحہ کچھ سوچا پھر بولا۔

"دیکھو سائیں، بات اصل میں یہ ہے کہ ہم نے پولیس کی مدد نہیں لی، حالانکہ آپ کے سامنے ہی پولیس آئی تھی ہمارے پاس۔ بات ضرورت سے زیادہ بگڑ جاتی، اگر اب ہم خود ہی کر لیتے ہیں تو یہ زیادہ اچھا ہوگا...... ابھی میں آپ کو بولوں ظفر شاہ صاحب کہ آپ حویلی خالی کردو مجھے اس حویلی میں نہیں رہنا۔ میں نے آپ کو بول دیا کہ وہاں میرے گھوڑے بندھیں گے، اصطبل بناؤں گا میں...... یہ میرا فیصلہ ہے"۔

"کیا یہ بات مناسب ہوگی، کیا اس طرح میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل رہ جاؤں گا"

"وہ ہی باتیں ہیں سائیں...... آپ اگر اپنے بیٹے کے اغواء کی بات پولیس کو بتاؤ گے تو میں انکار کردوں گا۔ آپ اسے تلاش کرو گے، لیکن نہیں کر پاؤ گے۔ بات صرف ایک ہی ہے، یہ کام کردو"۔

"ٹھیک ہے، مگر میں ایک بات تم سے کہوں، مجھے تین دن کی مہلت دو۔ میں تمہیں اس کا جواب دوں گا"۔

"ٹھیک ہے سائیں، آپ جواب دو۔ ہم انتظار کریں گے"۔

"میرے بیٹے کو کوئی تکلیف نہیں ہونی چاہئے"۔

"نہیں ہوگی سائیں، پر ہم بھی آپ سے ایک بات کہے دیتے ہیں۔ پولیس کو خبر کرنے کی ضرورت نہیں۔ اسے تلاش بھی مت کرنا اگر اس کو تلاش کرنے والے وہاں پہنچ بھی گئے تو ہم انہیں مار دیں گے اور ہم نہیں چاہتے کہ ہمارے درمیان لال کھیل ہو۔ سمجھ رہے ہو نا، یہ کھیل نہیں ہونا چاہئے، ورنہ مرتے ہی رہیں گے، تمہارے اور ہمارے آدمی"۔

"ایسا نہیں ہوگا، میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں"۔ ظفر محمود نے کہا اور اس کے

وہاں سے واپس چل پڑا۔ فیض شاہ کے چہرے پر ایک نفرت بھری مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔

❀❀❀

سمندر کے سینے پر رواں دواں زندگی سلطان کے لئے ایک انوکھا تجربہ تھی۔ ویسے تو خیالات اس کے ذہن پر مسلسل یلغار کئے رکھتے تھے۔ سوچنے کے لئے اب تک کی زندگی کے مختلف واقعات موجود تھے، لیکن اس رات اس کے ذہن پر جو شکل سوار رہی، وہ اسی پُراسرار لڑکی کی تھی جسے اس نے اس بوڑھے شخص کے ساتھ دیکھا تھا۔ کسی بھی ایسی لڑکی کو دیکھ کر انسان ذہنی طور پر متاثر ہوسکتا ہے، لیکن یہ لڑکی اس کے ذہن کے نہ جانے کون سے حصے کو چھو رہی تھی، یہ بات سلطان کو سمجھ نہیں آرہی تھی۔ اسے مسلسل یہ احساس گھیرے ہوئے تھا کہ کہیں نہ کہیں اس لڑکی سے اس کی ملاقات ہوئی ہے اور وہ اس سے کسی طرح منسلک رہا ہے۔ لڑکی کے چہرے کے اجنبی نقوش اور خود اس کی اپنی محویت اس پر ایک اضمحلال سا طاری کئے ہوئے تھی۔ رات کے نہ جانے کون سے حصے میں نیند آگئی۔ پھر صبح کو اس نے ناشتہ اپنے کیبن میں ہی کیا اور اس کے بعد لباس تبدیل کر کے کیبن سے باہر نکل آیا۔ جہاز کی یہ زندگی اس کے لئے دلکش بھی تھی اور حیران کن بھی۔ اس نے سمندری سفر کے بہت سے واقعات سنے تھے، لیکن اب وہ خود ایک سمندری سفر سے گزر رہا تھا۔ جہاز کے بارے میں اسے علم ہوگیا تھا کہ یہ پہلے عدن جائے گا، اس کے بعد وہاں سے کہیں اور۔ بات صرف اپنے وطن سے نکلنے کی تھی، کوئی ایک ٹھکانہ مل جائے تو اپنی زندگی کے بارے میں سوچے۔ عرشے پر ایک جگہ کھڑے ہو کر وہ سمندر کی بپھری ہوئی موجوں کو دیکھنے لگا، پھر اچانک ہی اسے یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے اس کی گردن کو چھو کر دیکھا ہو۔ ایسا کون بے تکلف انسان ہوسکتا ہے جو اس کے ساتھ اس طرح کا مذاق کرے اور اس طرح کا مذاق کرنے والے کو وہ پسند بھی نہیں کرتا تھا۔ بڑی مشکل سے اس نے تھپک تھپک کر اپنی وحشی فطرت کو سلایا تھا۔ کوئی بھی لمحہ اس کی فطرت کو جگانے میں کامیاب ہوسکتا تھا، لیکن اس نے پلٹ کر دیکھا تو کوئی بھی وہاں موجود نہیں تھا۔ لوگ موجود تھے لیکن اس سے اتنے فاصلے پر کہ کسی کے اپنی گردن کو چھونے کا وہ تصور بھی نہیں کرسکتا تھا۔

سلطان کی نگاہ اس بوڑھے شخص پر پڑی جسے اس نے گزشتہ روز اس لڑکی کے ساتھ دیکھا تھا۔ اس وقت بھی بوڑھا اس سے تھوڑے فاصلے پر موجود تھا اور لڑکی اس کے ساتھ ہی تھی۔ اس کا نقاب الٹا ہوا تھا اور اس کا شفاف چہرہ اور غزالی آنکھیں سمندر کے نیلگوں پانی پر جمی ہوئی

تھیں۔ پھر نہ جانے کس طرح اس کی نگاہ سلطان کی جانب اُٹھ گئی۔ اس نے ایک دم رُخ تبدیل کرلیا اور پھر قدم قدم آگے بڑھنے لگی۔ بوڑھا بھی اس کے ساتھ ہی تھا۔ سلطان ... ہوئی نگاہوں سے اسے دیکھتا رہا۔ اس کے ذہن پر ایک بوجھ طاری ہوگیا تھا۔ کل اس ... اندھیرے میں دیکھا تھا مگر آج دن کی روشنی میں اسے دیکھ کر اس کی کیفیت اور زیادہ ... ہوگئی تھی۔ اس کا سارا وجود مضمحل ہوگیا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے دل پر منوں بوجھ آپڑا ... اچانک ہی سہیل اس کے پاس پہنچ گیا۔ اس وقت سہیل ایک بہت ہی عمدہ لباس میں ملبوس اور بہت جاذب نظر لگ رہا تھا۔

''ہیلو...... پہلے میں نے تمہارے کیبن پر دیکھا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ تم صبح خیزی کے عادی ہو۔ پھر میں تمہیں تلاش کرنے یہاں آ گیا''۔

''ہیلو سہیل...... کہو رات کیسی گزری؟''

''بہت اچھی...... اصل میں زندگی کے بارے میں میرے کچھ اصول ہیں۔ میں زندگی کو بہت قریب سے دیکھتا ہوں اور اس کے ساتھ ساتھ سفر کرتا ہوں، مگر مجھے معاف کرنا میرے دوست، کل بھی تمہاری کیفیت کچھ ایسی ہی تھی۔ تم مجھے کچھ بجھے بجھے سے نظر آرہے تھے۔ تمہاری شخصیت پر تبصرہ کرنے کے لئے معافی چاہتا ہوں، لیکن بات وہی ہے، اگر کوئی کسی ... دلچسپی رکھتا ہے تب ہی اس کے بارے میں غور کرتا ہے، آؤ آگے بڑھتے ہیں''۔

''میں تمہاری دوستی کی قدر کرتا ہوں سہیل''۔ سلطان نے کہا، اسی وقت اس نے بوڑھے کو دیکھا...... لڑکی اس وقت اس کے ساتھ نہیں تھی، لیکن بوڑھے کے انداز سے یوں لگ ... جیسے وہ تیزی سے سلطان ہی کی طرف بڑھ رہا ہو۔ سلطان حیران رہ گیا۔ نہ جانے بوڑھا ... سے کیا کہنا چاہتا تھا، لیکن بوڑھا سہیل کی جانب متوجہ ہوا اور اس نے کہا۔

''ہیلو مائی ڈیئر سہیل...... تم اس جہاز پر کہاں؟''

''ارے چچا آپ یہاں کہاں؟''

''حیرت کی بات ہے، دنیا بہت وسیع ہے میرے بچے۔ میں اس وقت ایک ... کے سلسلے میں یمن جا رہا ہوں...... مگر تم؟''

''میں بھی یمن جا رہا ہوں...... آپ سے یہاں ملاقات کی بالکل امید نہیں تھی۔ خوشی ہو رہی ہے مجھے۔ ان سے ملئے، یہ میرے دوست سلطان ہیں اور سلطان، یہ ...

...شم مدبر۔ کیا کیا تعریفیں کروں ان کی، بس یہ سمجھ لو کہ ایک بہت ہی بڑی شخصیت ہے ان کا نام پروفیسر سومن ہے''۔ یہ بڑا عجیب سا نام تھا۔ سلطان کو حیرت ہوئی۔ نقوش تھوڑے سے اجنبی ضرور تھے، لیکن بظاہر یہ لگتا تھا کہ وہ بھی ایشیا ہی کا باشندہ ہے، لیکن بہرحال اس نے حیرانی کا اظہار نہیں کیا۔

''اور سناؤ یمن کسی کام کے سلسلے میں جا رہے ہو؟''

''ہاں...... ظاہر ہے''۔

''بتاؤ گے نہیں؟''

''ہمیں اپنی معلومات، ایک دوسرے تک پہنچا کر اگر فائدہ حاصل ہوسکتا ہے تو ٹھیک ہے ورنہ اتنا کافی ہوتا ہے چچا سومن کہ ایک دوسرے سے عام باتیں کریں''۔ سومن بے اختیار مسکرا پڑا، پھر اس نے کہا۔

''اور مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوتی ہے کہ تمہاری بے شمار عادتیں تمہارے باپ کی عادتوں سے ملتی جلتی ہیں، وہ بھی تمہاری طرح دلیر اور مہم جو انسان تھا اور جس بات پر اڑ جاتا، اس کو منوائے بغیر نہیں ٹلتا تھا۔ کسی کو اپنے بارے میں کچھ نہیں بتاتا تھا''۔

''ظاہر ہے چچا سومن، بیٹے کی عادتیں باپ سے نہیں ملیں گی تو اور کس سے ملیں گی''۔

''اوکے...... شاید تم سے ڈائننگ ہال میں ملاقات ہو اور میرے ساتھ کچھ معزز خواتین بھی ہیں۔ امید ہے تم کوئی خیال نہیں کرو گے''۔ بوڑھے نے آگے قدم بڑھاتے ہوئے کہا۔

''نہیں، ہرگز نہیں''۔ پھر سلطان اور سہیل وہاں سے آگے بڑھ گئے۔ باقی وقت دونوں نے ساتھ ہی گزارا تھا۔ ڈائننگ ہال میں بھی دونوں ساتھ ہی تھے۔ سہیل بار بار سلطان کو دیکھنے لگتا تھا۔ ڈائننگ ہال میں بیٹھے بیٹھے اس نے کہا۔

''دوست یقین کرو، میں سرِ راہ دوستیاں کرنے کا قائل نہیں، لیکن اگر کوئی شخصیت مجھے متاثر کرتی ہے تو میرا دل چاہتا ہے کہ اسے دنیا کی ہر خوشی دے دوں۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ تم زیادہ تر کھوئے ہوئے رہتے ہو۔ دیکھو میری جان! زندگی سے فرار اچھی علامت نہیں ہے۔ زندگی سے مسکرا کر ملو گے تو زندگی تمہارے ساتھ مسکرائے گی اور اگر تم نے اس سے بیزاری کا اظہار کیا تو وہ تم سے زیادہ بے رحم ہوتی ہے، وہ تمہیں کچلتی ہوئی گزر جائے گی اور تم وقت کی ریت پر ماضی کے نشانات ڈھونڈتے رہ جاؤ گے۔ مجھے یوں لگتا ہے جیسے تم کسی شدید ذہنی دباؤ

کا شکار ہو"۔

"شاید...... لیکن براہ کرم...... مجھ سے اس ذہنی دباؤ کے بارے میں پوچھنا نہیں"۔

بہرحال کھانے کے بعد کافی پیتے ہوئے بہت سے موضوعات پر بات چیت ہوئی لمحے کے لئے سلطان کا دل چاہا کہ وہ بوڑھے پروفیسر سومن کے بارے میں معلومات کرے، لیکن نہ جانے کیوں اس نے ابھی یہ مناسب نہیں سمجھا تھا۔

دوپہر کے بعد وہ اپنے کیبن میں واپس آ گیا۔ سہیل اپنے کیبن میں چلا گیا تھا۔ لیکن لوگوں نے طے کیا تھا کہ شام کو ملاقات کریں گے۔ سمندر کے سینے پر بہتی ہوئی یہ بستی اس وقت ایک خاندان کی حیثیت رکھتی تھی۔ چاہے آپس میں شناسائی ہو یا نہ ہو۔ بہرحال جب عرشے پر پہنچا تو اس نے پروفیسر سومن کو دو خواتین کے ساتھ ریلنگ کے قریب دیکھا سمندر کی دلکش ہواؤں سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اس کے ساتھ عورتیں ہیں۔ سب کا انداز کچھ ایک جیسا ہی تھا۔ ابھی سلطان نے ادھر دیکھا ہی تھا کہ سے سہیل اس کے پاس پہنچ گیا۔

"ہیلو ڈیئر! میں اس بار پھر تمہارے کیبن کی جانب سے ہوتا ہوا آ رہا ہوں۔ میں سوچا کہ شاید ابھی تم کیبن سے باہر نہیں نکلے ہو گے۔ اوہو...... یہ پروفیسر سومن بھی موجود کیوں نہ اس سے فاصلہ اختیار کریں کیونکہ اس وقت وہ دو خواتین کے ساتھ ہے"۔ چنانچہ ایک ایسی جگہ رک گئے جہاں سے سارے جہاز کے عرشے کا نظارہ ہو رہا تھا۔ سومن اور اس ساتھی عورتیں سیاہ برقعوں میں ملبوس تھیں۔ سلطان نے محسوس کیا کہ سہیل بار بار غیر ارادی پر بوڑھے سومن کی جانب دیکھ رہا ہے۔ اس وقت اسے ان خواتین کے بارے میں بھی دلچسپی کا اظہار ہو رہا تھا، مگر پروفیسر اور اس کی ساتھی لڑکیوں کو اس کا اندازہ نہیں تھا، لیکن اچانک ہی ان میں سے ایک عورت نے پلٹ کر ادھر دیکھا۔ اس وقت اس کے چہرے نقاب اٹھا ہوا تھا۔ ایک لمحے کے لئے یوں لگا جیسے اس کی آنکھوں میں آسمانی بجلیاں کوند ہوں۔ اس کے دیکھنے کے انداز نے یہ بتا دیا کہ وہ سلطان اور سہیل کی اس دلچسپی سے نہیں، لیکن اس کے اس طرح دیکھنے سے سلطان کو ایک بار پھر ایسا ہی لگا تھا جیسے کوئی بات ہو گئی ہو۔ اس کا دل چاہا کہ اس کے قریب پہنچ جائے اور بہت قریب سے اسے اچانک ہی سہیل کی آواز اُبھری۔

"سوری ڈیئر، میں ذرا پروفیسر سے ملنا چاہتا ہوں...... تم یہیں رکو"۔ سہیل آگے بڑھ گیا۔ اس کا اس طرح چلے جانا بڑا عجیب سا لگا تھا اور سلطان پریشانی کے انداز میں سوچتا رہ گیا اس نے دیکھا کہ بوڑھے سومن نے سہیل کا استقبال بڑی گرم جوشی سے کیا۔ کچھ لمحے وہ باتیں کرتے رہے۔ اس کے بعد دونوں عورتیں، بوڑھا اور سہیل وہاں سے آگے بڑھ گئے تھوڑی دیر بعد سیڑھیوں میں غائب ہو گئے۔ بہرحال یہ ایک عجیب و غریب صورتِ حال پھر اس کے بعد سہیل سے سلطان کی ملاقات نہیں ہوئی، لیکن سلطان پر ایک عجیب سی بڑی کیفیت طاری رہی تھی۔ وہ اپنے آپ کو شرمندہ کر رہا تھا۔ اپنے آپ کو یہ یقین دلانے کی کوشش کر رہا تھا کہ اس کا تعلق اس لڑکی سے نہیں تھا۔ یہ کون ہے، کیا ہے اور اس کے حواس پر چھائی ہوئی ہے؟ یہ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ نہ جانے کتنا وقت اسی طرح گزر گیا۔ سہیل، اس کے کیبن میں بھی نہیں آیا تھا۔ رات کو کوئی ساڑھے دس بجے کے قریب جب سلطان کو بھوک نے آ گھیرا تو وہ باہر نکل آیا۔ عرشے پر اس وقت اکا دکا سر پھرے ہی گشت کر رہے تھے، فضا میں خاصی ٹھنڈک پھیل گئی تھی، اس لئے سلطان بھی ریسٹورنٹ میں آ کر بیٹھ گیا۔ اسی مناسبت سے اس نے اپنے لئے کافی طلب کر لی۔ وہ ہلکے ہلکے کافی کے گھونٹ اپنے حلق میں اتارنے لگا۔ اچانک ہی ایک اجنبی شخص سہیل کے پاس آ کر بولا۔

"میں یہاں بیٹھ سکتا ہوں، میرے دوست؟" سلطان نے چونک کر اسے دیکھا اور اشارے سے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ تب وہ شخص بیٹھ گیا اور اس نے کہا۔

"میں جانتا ہوں کہ تم بھی اسپانیہ کے دیوانے ہو، اسپانیہ جو اس جہاز پر سفر کر رہی ہے۔ میں نے انہیں دور دور سے دیکھا ہے۔ تم نہیں جانتے، وہ ایران کی رہنے والی ہے اور اس نے عاشقوں کی ایک فوج بنائی ہوئی ہے۔ آہ، تم تصور بھی نہیں کر سکتے کہ وہ کیا ہے، مگر وہ کسی کو قربت سے نہیں نوازتی۔ نہ جانے کتنے لوگ اس کے عشق میں خودکشی کر چکے ہیں"۔

سلطان حیرت سے اسے دیکھنے لگا۔ یہ تو بڑی احمقانہ بات ہے اگر اس لڑکی کو دیکھ کر اس پر وحشت طاری ہو جاتی کہ دوسروں کو بھی اس کا اندازہ ہو جاتا ہے تو یہ تو بڑی شرم کی بات زندگی کا ایک مشن اپنایا تھا اس نے۔ اس مشن کے لئے ہی اپنے گھر کو چھوڑا تھا اور اب اگر اس طرح ناکام رہ جائے تو یہ تو بڑے افسوس کی بات ہے۔ اس نے سوچا کہ اب وہ بچنے کی کوشش کرے گا، اس کے بعد وہ ریستوران سے اُٹھ گیا۔

سلطان نے شاید خواب میں بھی نہ سوچا ہو کہ گھر سے نکلتے ہی اس کی زندگی ایک الجھنوں سے آشنا ہو جائے گی اور یہی ہوتا ہے۔ جوانی کی سرکشی ہر چیز کو موم سمجھنے پر مجبور ہے، لیکن جب اُونٹ پہاڑ تلے آتا ہے تو صورتِ حال نا قابلِ فہم ہو جاتی ہے اور جب سمجھ آتی ہے تو یا تو وقت گزر چکا ہوتا ہے یا پھر دوسرے عوامل پیدا ہو جاتے ہیں، ناکامیوں مایوسیوں کے۔ پتہ نہیں یہ بچپن کی زندگی کا معاملہ تھا یا نقشِ اول، نقش آخر کہ وہ مہرالنسا ہدایت کر کے آیا تھا کہ وہ کسی اور سے رابطہ قائم نہ کرے۔ مہر النساء کی طرف سے کبھی اس اپنی پذیرائی نہیں پائی تھی۔ بلکہ اگر غور کرتا تو حسان کے ساتھ اس کی یگانگت کچھ زیادہ تھی شکل میں صرف زور آوری سے ہی کام لیا جا سکتا تھا، لیکن اب وہ یہ سوچ رہا تھا کہ باہر کی میں اپنے آپ کو ایسی حسین قربتوں سے دور رکھنا مشکل کام ہے اور پھر اس شخص نے تو اور دیوانگی طاری کر دی تھی، جس نے اس پُراسرار لڑکی کو ایک غیر انسانی مخلوق کہہ کر روشناس تھا، جبکہ وہ کوئی غیر انسانی مخلوق نہیں تھی، بلکہ پروفیسر سومن اب نگاہوں کے سامنے آ چکا اس کی سہیل سے بھی دوستی تھی اور اس کا یہی مطلب تھا کہ وہ ایک عام انسان ہے۔ بہرحال سارے معاملات بڑے سنسنی خیز کیفیت کے حامل تھے لیکن ایک بار پھر وہی ذہنی جھٹکا سلطان لگا۔ جب جہاز کے انجن بند ہو گئے اور وہ لنگر انداز ہو گیا۔ پتہ چلا کہ وہ لوگ یمن پہنچ ہیں۔ دوسرے مسافروں کی طرح وہ بھی اپنے سامان سمیت اتر گیا اور سہیل کا انتظار کر لیکن سہیل شاید پہلے ہی اتر گیا تھا۔ یہ بڑی پریشان کن بات تھی۔ اس نے تو سوچا تھا کہ کی دوستی اس اجنبی ماحول میں بڑی قیمتی ہے اور یمن میں قیام کے دوران اس کی ہو جائے گی، لیکن پتہ نہیں کیا مصلحت تھی کہ وہ بغیر ملے ہی چلا گیا۔ بہرحال وہ باہر آ ایک ٹیکسی ڈرائیور کو اس نے کسی اچھے ہوٹل میں لے جانے کے لئے کہا۔ ٹیکسی میں بیٹھ پُرخیال انداز میں چاروں طرف دیکھتا رہا۔ خیالات میں ابھی تک کوئی پختگی نہیں تھی۔ ساحلی علاقہ کافی خوب صورت اور پُرسکون نظر آ رہا تھا۔ اس نے ٹیکسی ڈرائیور سے کہا کہ ساحلی ہوٹل چلے اور ٹیکسی ڈرائیور نے گردن ہلا دی۔ کچھ لمحوں کے بعد ایک خوبصورت کے سامنے ٹیکسی رک گئی۔ عمارت انتہائی حسین تھی اور اس کو ایک نگاہ دیکھتے ہی یہ احساس تھا کہ اعلیٰ درجے کے ہوٹلوں میں سے ہے۔ یہ ہوٹل کافی مہنگا تھا، لیکن اس کے پاس

رقوم تھیں اور پیسے کا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ بس یہ خیال دل میں تھا کہ زندگی کو اپنے ڈھب پر نے کے لئے اسے کیا کرنا چاہئے۔ ہوٹل کی عمارت کے مطابق اس کا کمرہ بھی اتنا ہی شاندار میں دنیا کی ہر آسانی موجود تھی۔

پہلی بار سلطان نے سوچا کہ زندگی اتنی آسان کہیں بھی نہیں ہے۔ جتنی آسان اپنے گھر کی چار دیواری کے اندر تھی۔ دنیا کی ہر مشکلات سے فاصلہ تھا اور اپنے طور پر سوچنے کے لئے کچھ بھی نہیں تھا، جبکہ ہوٹل کے اس کمرے میں رہ کر وہ بہت عرصے تک اپنی اس رقم پر گزارہ نہیں کر سکتا تھا۔ زندگی کو آگے بڑھانے کے لئے کیا کرنا ہوگا۔ کوئی بات سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ شام کے گہرے سائے سیاہی پھیلا رہے تھے۔ وہ باتھ روم کی جانب چل پڑا اور دیر تک پانی سے اپنے جسم اور روح کو صاف کرتا رہا۔ بہت دیر تک کمرے میں وقت گزارا اور اس کے بعد لباس وغیرہ تبدیل کر کے ہوٹل کے وسیع ہال کی جانب چل پڑا۔ زندگی جو بھی راستے متعین کرتی ہے وقت خود بخود ان سے روشناسی کرا دیتا ہے۔ ایک قبرستان سے لے کر یمن تک کا یہ فاصلہ طے ہوا تھا۔ سارے کام ہنگامی طور پر ہو رہے تھے اور بات اسی سرکشی کی تھی جو اس کے اندر پروان چڑھ رہی تھی اور جس نے اسے زندگی کے سیدھے راستوں سے ہٹا کر ٹیڑھے میڑھے راستوں پر پھینک دیا تھا۔ ہوٹل کے ہال میں ایک طرف آرکسٹرا موسیقی کی تانیں اُڑا رہا تھا وہ ایک میز پر آ کر بیٹھ گیا جو اس کے لئے مخصوص تھی۔ ابھی اسے بیٹھے ہوئے زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ اچانک کوئی اس کے سامنے آ کھڑا ہوا، سر اٹھا کر دیکھا تو جہاز میں ملنے والا وہی سر پھرا شخص تھا جس نے اس حسین لڑکی کے بارے میں کچھ الفاظ کہے تھے۔ اس نے اس وقت خاصا مہذب لباس پہنا ہوا تھا اور چہرے سے بھی بالکل اسی انداز میں نظر آ رہا تھا۔ تب وہ کہنے لگا۔

"اگر اجازت ہو تو میں کچھ وقت تمہارے ساتھ گزارنا چاہتا ہوں"۔ اس کے لب و لہجے میں ایک ٹھہراؤ اور وقار تھا۔ اس وقت فطرت کی ساری سرکشی ہوا ہو چکی تھی۔ ایک اجنبی ملک اور اجنبی شہر میں مکمل طور پر تنہائی کا جو احساس ہو سکتا ہے وہ تھا، جبکہ مقامی لوگ اہل زبان بھی نہیں تھے اور ان کا اپنا ایک انداز اپنا ایک کلچر تھا، چنانچہ سلطان نے بڑی خوش اخلاقی سے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور وہ شخص اس کے سامنے بیٹھ گیا۔

"معافی چاہتا ہوں میں نہ جانے کیوں تم سے متاثر ہو گیا ہوں، مسٹر سلطان اور تمہیں حیرت

ہوگی کہ میں تمہارے ماضی سے بھی واقف ہوں...... کیوں ہے نا حیرت کی بات''۔ سلطان خاموشی سے اسے دیکھتا رہا اور وہ سلطان کو اس نظریئے کے تحت کہ شاید وہ اس سے کوئی سوال کرے۔

''آپ مجھ سے شناسائی کا اظہار کر رہے ہیں مسٹر، لیکن مجھے یاد نہیں آتا کہ میرا کبھی آپ سے واسطہ پڑا ہو، سوائے جہاز کی اس رات کے''۔

''وقت آنے پر اس کا جواب تمہیں خود بخود مل جائے گا کہ میں کون ہوں اور کیوں تمہارے ماضی کو کرید رہا ہوں۔ یہ ایک معقول بات ہے جو آخر کار تمہارے سامنے آجائے گی میرے خیال میں پہلے تم میرے چند سوالات کا جواب دے دو، پھر میں آپ کو خود بتادوں کہ میں ایسا کیوں کر رہا ہوں''۔

''جی فرمایئے''۔ وہ چند لمحات سلطان کا جائزہ لیتا رہا، پھر بولا۔

''میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ وہ لڑکی جس کا نام اسپانیہ ہے اور جسے تم دل و جان سے پیار کرتے ہو، اچانک کس حادثے کا شکار ہوئی تھی اور اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی جاننا چاہتا ہوں کہ کیا تم نے اس کی کسی ہم شکل کو دیکھا ہے؟'' اس کے الفاظ بڑے عجیب اور پُراسرار تھے سلطان ایک لمحے کے لئے سنسنی کا شکار ہوگیا۔ نہ جانے کیوں اس کے ذہن میں کچھ لہریں سی اٹھنے لگیں۔ اسے ماضی کے کچھ دھندلے دھندلے سے نقوش نمایاں ہوتے ہوئے محسوس ہوئے۔ اسے یوں لگا جیسے واقعی اسپانیہ نامی لڑکی کو وہ جانتا تھا، اس سے عشق کرتا تھا اور پھر وہ کسی حادثے کا شکار ہوگئی۔ اس شخص کے الفاظ سلطان کو اپنے ذہن کے پوشیدہ خانوں میں گردش کرتے محسوس ہوئے تھے۔ اس کے منہ سے غیر ارادی آواز ابھری۔

''مگر آپ کو اس بات سے کیا دلچسپی ہے؟''

''مجھے صرف تمہاری ذات سے دلچسپی ہے میرے دوست!'' اس شخص نے جواب دیا ''اور میں تمہیں مستقبل میں پیش آنے والے نادیدہ حادثات سے بچانا چاہتا ہوں، تمہیں میری باتیں ایک دیوانے کی بکواس محسوس ہوں گی، لیکن کچھ دن بعد جب تم پر تلخ حقیقتوں کی گرہیں کھلیں گی تو تم خود بخود یہ جان لو گے کہ ان میں کہاں تک سچائی ہے''۔

''دیکھئے مسٹر! میں پہلے ہی بہت پریشان ہوں...... براہ کرم آپ مجھے مزید پریشان نہ کریں''۔

''ٹھیک ہے میں چلتا ہوں، کوئی ایسی بات نہیں''۔ اس نے کہا اور سلطان کو عجیب نگاہوں سے

گھورنے لگا۔ ان نگاہوں میں نفرت کے انگارے سلگ رہے تھے۔ پھر وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور باہر چلا گیا۔

سلطان شدید الجھنوں کا شکار ہوگیا تھا۔ اس شخص کے الفاظ وزنی ہتھوڑوں کی طرح سر پر برس رہے تھے۔ وہ پریشان کن خیالات سے چھٹکارا پانے کے لئے سوچ رہا تھا کہ کیا کرنا چاہئے، اچانک اس کی نگاہیں ایک بار پھر سامنے کی میز پر پڑیں اور اس نے وہاں بوڑھے پروفیسر سومن کو دیکھا جو اس کی طرف شناسا نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ نہ جانے کیوں سومن کو دیکھ کر سلطان کے ہونٹوں پر ایک شگفتہ سی لہر دوڑ گئی۔ اس نے ہاتھ کے اشارے سے اسے سلام کیا اور اپنی میز پر آنے کی پیشکش کی، لیکن سلطان یہ نہیں دیکھ سکا تھا کہ دوسری طرف سے سہیل بھی بوڑھے کے ساتھ ساتھ چلا آرہا ہے۔ پھر دونوں اس کی میز پر آگئے۔ سہیل نے فوراً ہی کہا۔

''او ہو تم؟''

''بس، مجھ سے بات مت کرو...... تم بہت خود غرض آدمی ہو۔ اتنی دوستی کے بعد اس طرح مجھے چھوڑ کر چلے آئے۔ تمہارے اس عمل نے مجھے گہرا صدمہ پہنچایا ہے'' سہیل نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''بالکل ٹھیک کہتے ہو تم...... مگر تم یقین نہیں کرو گے کہ کچھ ایسی مجبوری ہوگئی تھی مجھے جس کی وجہ سے فوراً ہی مجھے جہاز سے نیچے اترنا پڑا۔ تم میری صداقت کا یقین نہیں کرو گے، لیکن میں تمہاری طرف سے بہت فکرمند تھا اور شاید تم اس بات پر یقین بھی نہ کرو کہ میں نے تمہیں تلاش کرنے کے لئے اس شہر کے آدھے ہوٹلوں کی خاک چھانی ہے''۔ سلطان نے طنزیہ نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

''بہت بہت شکریہ''۔

''چلئے چھوڑیئے ان تمام باتوں میں کیا رکھا ہے۔ مسٹر سلطان! یہ بتایئے کہ میرے لائق کوئی خدمت ہے؟''

''بس تمہارے لائق اور کیا خدمت ہو سکتی ہے؟''

''نہیں ایسی بات نہیں۔ تم دیکھنا ہم تمہارے کتنے کام آتے ہیں''۔

''بہت بہت شکریہ، حالانکہ مجھے اس کی اُمید نہیں ہے''۔

''آپ نے جس ہوٹل کا انتخاب کیا ہے، وہ بہت شاندار اور خوب صورت ہے، لیکن آپ

کو اس کی اجازت بالکل نہیں دی جاسکتی کہ آپ ہوٹلوں میں رہیں۔ آپ کو ہمارے ساتھ ہوگا''۔ سہیل کے لہجے میں گہرا خلوص تھا جسے سلطان نے اچھی طرح محسوس کرلیا۔ یہ ایک بات تھی جس کے لئے باقی سارے گلے شکوے ختم کئے جاسکتے تھے۔ سلطان نے کچھ وقت ہی یہ بات سوچی تھی کہ آگے قدم اٹھانے کے لئے اسے بڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑے اور وہ تنہائی والا معاملہ بھی تھا، لیکن اگر ایسا خلوص سے کہا جارہا ہے تو اس سے اچھی اور بات نہیں ہوگی، تاہم اس نے کہا۔

''اتنی زیادہ محبت کا اظہار مت کرو سہیل کہ میں غلطی کا شکار ہوجاؤں''۔

''جب تک تمہیں یہ احساس نہ ہوجائے کہ میں تمہارے ساتھ مخلص ہوں، اس وقت مجھ پر بھروسا نہ کرنا۔ تم اگر میرے ساتھ رہو گے تو مجھے انتہائی خوشی ہوگی اور یہ الفاظ پروفیسر سومن کے سامنے پورے خلوص کے ساتھ کہہ رہا ہوں'' پروفیسر سومن نے کہا۔

''اور تم اس شخص کو نہیں جانتے سلطان، یہ ایک ایسے باپ کا بیٹا جس کی تعریفیں کر ہوئے میری زبان نہیں تھکتی۔ اس شخص نے زندگی بھر خود پر اعتماد کیا اور وہی چیز اپنے بیٹے وجود میں اتاردی۔ اگر یہ تم سے اپنے ساتھ قیام کرنے کے لئے کہہ رہا ہے تو اس کا مطلب ہے کہ یہ غلط بیانی نہیں''۔

سلطان کے اندر خوشی کی ایک لہر اٹھ رہی تھی۔ یہ تو بہت اچھی بات تھی، اس طرح ان پُراسرار واقعات کے بارے میں جاننے کا موقع بھی مل جائے گا جو پیش آرہے تھے نہ جانے کیوں اب اس کے ماضی کو کرید رہے تھے۔

''ٹھیک ہے، اگر واقعی میری تقدیر میں اتنا اچھا دوست لکھا ہوا ہے تو میں انکار نہیں گا، لیکن آج نہیں، کل میں تمہارے ساتھ چلوں گا''۔

''آج رات کیوں نہیں؟''

''آج کی رات میں تنہائی کے سلگتے ہوئے جنگل میں گزارنا چاہتا ہوں''۔ سلطان اور سہیل مسکرا کر گردن ہلانے لگا، پھر بولا۔

''ٹھیک ہے...... ایک رات تمہیں دی جاتی ہے لیکن جناب! راتوں رات کہیں ہونے کی کوشش نہ کریں''۔

''نہیں، میں سچا انسان ہوں اور کوشش کرتا ہوں کہ کوئی ایسی بات نہ کروں جو سچا

راستے میں رکاوٹ ہو''۔

''گڈ...... یہ بہت اچھی بات ہے''۔ اس دوران بوڑھا سومن خاموشی سے سلطان کی صورت دیکھتا رہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے اس کے ذہن میں کوئی خاص خیال ہو یا پھر وہ سلطان کے چہرے پر ماضی کے کچھ نقوش تلاش کررہا ہو۔ کافی دیر تک ان لوگوں کے ساتھ نشست رہی اور اس کے بعد سہیل نے اجازت مانگ لی۔ سومن بھی اس کے ساتھ ہی اٹھ گیا تھا۔ جب وہ دونوں باہر چلے گئے تو سلطان بھی اپنی جگہ سے اُٹھ گیا۔ وہ یہ سوچ رہا تھا کہ ابھی کمرے میں جانے سے کوئی فائدہ نہیں۔ تھوڑا سا باہر کی دنیا کی سیر کی جائے۔

وہ ہوٹل کی عمارت سے باہر آگیا۔ ہر طرف ایک عجیب سی چہل پہل تھی۔ وہ اس چہل پہل میں کافی دور تک نکل آیا۔ چھوٹی چھوٹی کافی شاپ سڑک کے فٹ پاتوں پر بنی ہوئی تھیں اور ان میں اچھی خاصی رونق نظر آرہی تھی۔ ایک جگہ سے گزرتے ہوئے کافی کی بہترین خوشبو محسوس ہوئی تو ایک بار پھر بے اختیار کافی پینے کو دل چاہا اور وہ شاپ میں آکر بیٹھ گیا۔ ویٹر سے اس نے بلیک کافی طلب کی اور اس کے چھوٹے چھوٹے گھونٹ حلق میں اتارنے لگا۔ کافی کی کڑواہٹ ایک بار پھر ذہن میں گھٹن بننے لگی کہ اچانک ہی وہی چالیس سالہ شخص نظر آیا جو سلطان کو جہاز میں ملا تھا اور اب یہ اس کی تیسری ملاقات تھی۔ وہ تیزی سے آگے بڑھا اور اس کے قریب آگیا۔ آتے ہی اس نے دونوں ہاتھ میز پر ٹکاتے ہوئے کہا۔

''اور تم انہی راستوں پر سفر کررہے ہو جن راستوں سے میں تمہیں بچانا چاہتا ہوں''۔ سلطان نے چونک کر اسے دیکھا ایک بار پھر غصے کی لہر اس کے دماغ میں اٹھی، لیکن پھر اس نے سوچا کہ اس شخص کے بار بار آنے کی وجہ کیا ہوسکتی ہے۔ کم از کم اسے تھوڑی سی توجہ دے کر پوچھا تو جائے کہ بات کیا ہے، چنانچہ اس نے کہا۔

''دیکھو...... اگر تم واقعی کچھ بتانا چاہتے ہو تو آؤ بیٹھو، مجھے بتاؤ کہ تم آخر کس طرف میری رہنمائی کرنا چاہتے ہو...... تم کون ہو، کیا ہو؟''

''میں جو کچھ بھی ہوں تمہیں صرف اتنا بتانا چاہتا ہوں کہ تمہارے یہ نئے دوست تمہارے کچھ بھی نہیں ہیں۔ تمہاری آنکھوں پر جذبات کی پٹی بندھی ہوئی ہے۔ تم اس مصیبت پر غور نہیں کررہے جو تیزی سے تمہاری جانب آرہی ہے۔ دیکھو میری جان! اگر زندگی عزیز ہے تو اپنے دوستوں کی دعوت رد کردو اور جتنی جلدی ممکن ہوسکے اس ملک کو چھوڑ کر چلے جاؤ۔ ورنہ

یاد رکھو، مستقبل کی مصیبتیں تمہیں اتنی مہلت نہیں دیں گی کہ تم اپنی بہتری کے لئے کچھ سکو۔ کیا سمجھے"۔

"تم بیٹھنا پسند کرو گے یا یہاں سے رفع ہونا۔ بلاوجہ میرے ذہن کو پریشان کر رہے میں تمہیں کہیں کوئی نقصان نہ پہنچادوں"۔ سلطان غصیلے لہجے میں بولا۔ وہ دیر تک اسے گھو اور اس کے بعد تیزی سے پلٹ کر واپس چل پڑا۔ سلطان کے ذہن میں گرم گرم لہریں رہی تھیں۔ یہ شخص بلاوجہ اس کے ذہن کو خراب کر دیتا ہے۔ پتہ نہیں، کم بخت کیا چاہتا ہے کیا رہا ہے..... کوئی بات جو سمجھ میں آئے۔ بہرحال وہ غائب ہوگیا تھا، لیکن سلطان ان الفاظ پر غور کر رہا تھا۔ وہ شخص اسے مستقبل میں پیش آنے والے حادثات سے آگاہ کر رہا تھا وہ حادثات کیا ہوسکتے ہیں، کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ بہرحال جہنم میں جائے جو ہوگا، ہو جائے گا۔ میں نے تو مشکلات کے راستوں پر قدم بڑھا ہی دیا ہے۔

وہ رات سلطان کی زندگی کی بڑی عجیب وغریب رات تھی۔ نہ جانے کیا کیا خواب اسے نظر آتے رہے۔ ان تمام خوابوں میں وہ چہرہ مستقل اس کے حواس پر چھایا رہا تھا اور صبح جب اس کی آنکھ کھلی تو دل ہی دل میں اس نے مسکراتے ہوئے کہا، مہرالنساء تمہارا جادو ٹوٹ گیا ہے۔ مجھے اب اس حسین کا انتظار ہے، اسے تلاش کرنا میری زندگی کا مقصد ہے۔ شاید یہ میری عظمت کا ثبوت ہو کہ میں آسمان سے اتری ہوئی اس اپسرا کو اپنی زندگی میں شامل کرلوں۔

ناشتے سے فارغ ہوا تو دروازے پر دستک سنائی دی اور سلطان نے دستک دینے والے کو اندر آنے کا اشارہ کردیا۔ آنے والا سہیل کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا۔ اس نے آنکھیں بند کر کے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

"یار! ہر مرد کو کسی نہ کسی خوب صورت لڑکی سے ہی عشق ہوتا ہے۔ خوب صورتی انسان کی اپنی نگاہ کا قصور ہوتی ہے، یعنی کون کسے بھا جائے جیسے مجنوں کے لئے لیلیٰ جسے عام لوگ خوبصورت نہیں کہتے تھے، لیکن یہاں ایک عجیب وغریب واقعہ ہوا ہے۔ وہ یہ کہ مجھے ایک نوجوان سے عشق ہوگیا ہے اور وہ تم ہو۔ اچھا اس سے پہلے کہ تم میرے الفاظ پر کوئی تبصرہ کرو تمہیں ایک اہم اطلاع دینا ضروری ہے اور یقین کرنا جو ہوا ہے وہ بالکل اچانک ہوا ہے۔ پہلے سے کوئی منصوبہ نہیں تھا۔ پر دیکھو، ہونی ایسے ہی ہو کر رہتی ہے"۔

"کیا؟" سلطان نے تعجب بھرے لہجے میں کہا۔

"آج میری منگنی ہے..... ویسے تم یقین کرو، یہ دن برسوں کی خواری کے بعد نصیب ہوا ہے کہ میں اپنی محبوبہ جسے میں برسوں سے پیار کرتا چلا آیا ہوں، حاصل کرنے میں کامیاب ہوا ہوں۔ اس نے مجھ سے اقرار محبت کرلیا ہے۔ تم شاید یقین نہ کرو اس بات پر کہ وہ دنیا کی حسین ترین عورت ہے"۔ سلطان نے اس کا چہرہ دیکھا جو مسرت سے سرخ ہو رہا تھا۔ وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

"میری طرف سے مبارکباد قبول کرو"۔

"بہت بہت شکریہ..... میں سمجھتا ہوں یہ بھی تمہارے قدموں کی برکت ہے..... تم بڑے دوستوں میں شامل ہوئے تو یوں سمجھو کہ بہت سی خوشیاں میرے دامن میں آگئیں"۔

"مگر وہ کون ہے جسے تم اپنی زندگی کی کائنات بنا رہے ہو؟"

"آہ..... تم شاید اسے دیکھ چکے ہو، وہ چچا سومن کی بیٹی زمرد ہے"۔ سہیل نے خوشی سے جواب دیا، لیکن نہ جانے کیوں ان الفاظ کے ساتھ ہی سلطان کو اپنے دل کی حرکت بند ہوتی محسوس ہوئی۔ اس کے اندر شدید بے چینی کی لہر اٹھی تھی۔ غالباً اس کا چہرہ پیلا پڑ گیا تھا۔ اس نے ایک گہری اور بھاری سانس لی تو سہیل تعجب بھرے لہجے میں بولا۔

"ارے تم خیریت سے تو ہونا..... کیسی طبیعت ہے تمہاری"۔

"ٹھیک ہوں..... ٹھیک ہوں"۔

"بس تو پھر اب تم تیار ہو جاؤ..... آج کا دن میری زندگی کا اہم ترین دن ہے۔ آج میں کسی الجھن کو اپنے پاس نہیں دیکھنا چاہتا"۔

"سنو! میں تمہیں ایک بات بتاؤں۔ مجھے تھوڑا سا وقت اور دے دو۔ نہ جانے کیوں میں ذاتی طور پر کچھ پریشان ہوں..... مختصراً تمہیں اپنے بارے میں بتا چکا ہوں اور جتنا بتایا ہے، سمجھ لو کہ اس میں میرے لئے بے حد مشکلات ہیں۔ تھوڑا سا وقت مجھے اور دے دو"۔

سلطان کے الفاظ پر وہ ایک دم سے بجھ سا گیا۔ چند لمحے گہری نگاہوں سے اسے دیکھتا رہا پھر بولا۔

"سمجھ میں نہیں آتا، تم کیوں انکار کر رہے ہو۔ براہ کرم تیار ہو جاؤ۔ میں تو تمہیں لینے کے لئے آیا ہوں..... تمہارا یہ انکار میرے لئے دلی صدمے کا باعث ہوگا"۔

"نہیں سہیل! میں اس وقت تمہارے ساتھ چلنے کے لئے تیار نہیں ہوں اور یہی
لئے بہت ضروری ہے"۔

سہیل بہت دیر تک اسے اپنے ساتھ لے جانے پر اصرار کرتا رہا اور پھر جب سلطان
طرح اس کے ساتھ جانے پر راضی نہ ہوا تو وہ چلا گیا، لیکن جیسے ہی وہ باہر گیا، سلطان پر
برا وقت آگیا۔ وہ نہ جانے کیوں یہ محسوس کر رہا تھا جیسے اس کا دل سینے سے باہر نکل گیا
بہت دیر تک وہ غم و اندوہ میں بیٹھا رہا کہ ایک بار پھر دروازے پر دستک ہوئی اور اس
جلدی سے اپنے آپ کو سنبھال لیا اور بھاری لہجے میں بولا۔

"آؤ...... کون ہے بھئی"۔ کوئی اندر آگیا...... سلطان نے سر اٹھا کر دیکھا تو سامنے
شرابی کھڑا ہوا تھا۔

"تم نے اس کے ساتھ جانے سے انکار کر کے وقتی طور پر اپنی زندگی پر منڈلاتے ہو
خوفناک بادلوں کا رخ بدل دیا ہے، مگر اس بات کو تم نظر انداز مت کرنا کہ دشمن اپنے ایک
میں ناکام ہو کر دوبارہ پینترے بدل کر حملہ آور ہوتا ہے، سمجھے؟"

"ایک منٹ، ایک منٹ...... تم ادھر آؤ اور بیٹھو میرے ساتھ ورنہ اس کے بعد جو کچھ
اس کے ذمے دار تم خود ہو گے"۔ سلطان کے اس انداز پر نہ جانے کیوں اس کے ہونٹوں
مسکراہٹ پھیل گئی۔ وہ بیٹھ گیا اور اس نے کہا۔

"میرا نام دانش ہے...... تم یقیناً میرے نام کے بارے میں جاننا چاہتے ہو گے"۔

"لیکن تم نے تو مجھے کوئی اور نام بتایا تھا"۔

"جو کچھ بھی تھا، اس وقت میں تم سے بالکل مخلص ہوں...... میرا نام دانش ہے سمجھے"

"اور جو کچھ تم نے کہا ہے، تمہیں اس کا اندازہ ہے کہ تمہاری ہر بات مجھے بے بسی
کے کھولتے ہوئے سمندر کی گہرائیوں میں لے جا رہی ہے؟"

"ٹھیک ہے۔ آج کے بعد شاید تم سے میری ملاقات اس وقت ہو جب تم"۔ وہ ا
خاموش ہو گیا اور ساکت نگاہوں سے سلطان کو گھورنے لگا، پھر بولا۔

"ابھی وقت ہے کہ تم اس ملک سے جا سکتے ہو۔ پھر شاید یہ حالات نہ رہیں کہ تم
اپنے وطن آسانی سے جا سکو"۔

"وضاحت کرو، کیوں؟" سلطان نے سوال کیا۔

"میری زبان پر پہرے ہیں۔ میں اگر تمہیں کچھ بتانا بھی چاہوں تو شاید میری زبان میرا
ساتھ نہ دے سکے"۔

"مگر میں کیسے سمجھوں کہ تم کیا کہنا چاہتے ہو...... مستقبل میں پیش آنے والے ایسے کون
سے حالات ہیں جن سے تم مجھے آگاہ کرنا چاہتے ہو"۔

"آہ...... کاش! میں تمہیں کچھ اور بتا سکتا۔ میں تم سے صرف اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ تم فوراً
اس ملک کو چھوڑ دو"۔

"مگر کیوں...... آخر کیوں؟"۔

"دیکھو میں جانتا ہوں کہ میری اس نامکمل وضاحت سے تمہاری الجھن میں اضافہ ہی
ہوا ہوگا، کمی نہیں۔ یوں سمجھ لو کہ میں ایک ایسا انسان ہوں جو تمہیں مستقبل میں پیش آنے والے
واقعات سے آگاہ کر سکتا ہوں۔ میرے دل میں تمہارے لئے ایک درد ہے، یہ درد ہم سارے
انسانوں کا مشترکہ سرمایہ ہے مگر میں اس بات کی وضاحت کرنے سے مجبور ہوں کہ جو خطرات
کسی بھیانک اژدھے کی طرح تمہیں نگلنے کے لئے تمہارے قریب آ رہے ہیں، وہ کیا ہیں؟
اور کاش میں تمہیں بتا سکتا۔ تمہارے ساتھ گہری ہمدردی رکھتے ہوئے بھی میں اس کے علاوہ
تمہاری اور کوئی مدد نہیں کر سکتا"۔

دانش کی باتیں پگھلے ہوئے سیسے کی طرح سلطان کے کانوں میں اترتی رہیں۔ اچانک
ایک بار وہ پھر اُٹھ گیا تو اس نے جلدی سے کہا۔

"تم کچھ اور دیر نہیں بیٹھو گے؟"

"نہیں...... میری جان مجھے جانے دو۔ کاش تم مجھ پر یقین کر کے وہ سب کچھ کر لو جو میں
تم سے چاہتا ہوں"۔

دانش نے کہا اور اس کے بعد وہ پھر اس طرح باہر نکل گیا۔ سلطان پر بوکھلاہٹوں کے
دورے پڑ رہے تھے۔ باقی ساری باتیں اپنی جگہ، اپنی فطرت کے مطابق اس نے جو عمل کئے
تھے، ان پر وہ نہ تو شرمندہ تھا، نہ افسردہ۔ گھر چھوڑنے میں بھی اسے کوئی عار نہیں محسوس ہوئی
تھی، لیکن اب اس پر مصیبتوں کے جو پہاڑ ٹوٹے تھے وہ اس کے لئے بوکھلا دینے والے تھے۔
اور ان سے نمٹنا نہیں جانتا تھا۔ نہ جانے کب تک وہ تنہائی کی آگ میں جلتا ہوا سوچوں کے
سمندر میں غوطہ زن رہا۔ وسوسوں اور اندیشوں کے زہریلے ناگ روح کو ڈسنے لگے اور وقت

گزرتا رہا۔

شاید سہیل ناراض ہوگیا تھا کیونکہ دوسرا دن اور پھر تیسرا دن بھی گزر گیا، وہ سلطان کے پاس نہیں آیا تھا۔ سلطان ایک عجیب سی کشمکش میں مبتلا تھا۔ تیسرے دن وہ کمرے سے نکلا ساحل کی طرف چل پڑا۔ دیر تک ساحل پر مختلف ملکوں کے سیاحوں کو دیکھتا رہا۔ واپسی پر تو پیاس لگ رہی تھی۔ پیدل چلتے چلتے اسے ایک ساحلی ریستوران نظر آیا تو وہ اس کے سا رک گیا اور پھر اندر داخل ہوگیا۔ دن کا وقت تھا لیکن پھر بھی ریستوران میں کافی رونق تھی۔

وہ ایک کرسی پر بیٹھ گیا اور اس نے اپنے لئے کھانے کی کچھ اشیاء طلب کرلیں۔ قرب جوار میں بہت سے لوگ بیٹھے ہوئے تھے، اپنے اپنے معمولات میں مصروف لیکن اچانک ا میں سنسنی سی دوڑ گئی۔ ایک لمحہ کے لئے سلطان کو ماحول ساکت اور پتھریلے مجسموں کی ما محسوس ہوا۔ اس کی نگاہیں ان مجسموں کا تعاقب کرتی ہوئی آگے بڑھیں تو اس نے ایک عجیب غریب شخصیت کو دیکھا، قدرت کا ایک حسین وجمیل شاہکار عمارت میں داخل ہو رہا تھا۔ ا کے شفاف مرمریں بدن سے روشنی کی کرنیں پھوٹتی محسوس ہو رہی تھیں۔ اس کے ساتھ ا انتہائی دراز قد آدمی تھا جو اپنی نظروں سے چاروں طرف کا جائزہ لے رہا تھا۔ اچانک اس نظریں سلطان پر پڑیں اور سلطان نے اسے چونکتے ہوئے دیکھا۔ پھر وہ سلطان کی طر بڑھا اور اچانک سلطان کے ذہن میں ایک نام اُبھرا، حماد۔

اسے یوں لگا جیسے یہ چہرہ اس کا پرانا شناسا ہو۔ وہ بے اختیار اپنی جگہ سے اُٹھ کھڑا ہوا تھا۔

''ارے حماد تم......؟'' اس کے منہ سے نکلا۔

''ہاں، یہی سوال میں تم سے کرنا چاہتا ہوں۔ تم یہاں کہاں سے آئے، کیا تمہیں ا بات کا اندازہ ہے کہ تمہیں دیکھ کر مجھے کس قدر حیرت ہوئی ہے؟'' سلطان کے منہ سے آواز نکلی۔ اس کی نگاہیں اس حسن کے پیکر کی جانب اٹھیں جس کا کندن سا بدن دیکھنے والوں پر طاری کررہا تھا۔ سلطان کی نگاہیں اس کے دل فریب چہرے کا جائزہ لے رہی تھیں۔ پھر اپنی جھینپ مٹانے کے لئے ایک دم پلٹا اور کہا۔

''بیٹھو...... حماد! تم بیٹھو''۔ اور وہ دونوں بیٹھ گئے۔ سلطان کو چکر آرہے تھے۔ آخر یہ ہو رہا ہے، وہ کس سحر میں گرفتار ہوگیا ہے؟ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے کچھ پُراسرار قوتیں اس کے گرد جال بُن رہی ہیں۔ یہ چہرہ بھی اسپانیہ کے چہرے سے ملتا جلتا تھا اور اس قدر حسین تھا

بلا یقین کہا جاسکتا تھا۔ اس حسین مجسمے کی شکل وصورت بھی اسپانیہ سے بہت زیادہ مشابہت رکھتی تھی۔

''تم سے مل کر بہت خوشی ہوئی ہے حماد! میں تمہارے لئے کیا منگواؤں؟''

''ہم لوگ صرف کافی پئیں گے''۔ سلطان نے ویٹر کو اشارہ کرکے بہت ساری چیزیں لانے کو کہا۔

''مگر میں اس وقت کچھ نہیں پینا چاہتی''۔

لڑکی کی آواز اُبھری، اس کی آواز اس کی صورت سے زیادہ دلکش تھی۔ سلطان کو ایسا لگا جیسے جل ترنگ بج اُٹھے ہوں۔

''نہیں، کافی بہت اچھی ہے...... آپ پی لیجئے''۔ اور وہ خاموش ہوگئی۔

سلطان کہنے لگا۔

''تم نے ان سے میرا تعارف نہیں کرایا''۔

''مجھے نیلاب کہتے ہیں''۔ وہ خود ہی اپنا تعارف کرانے لگی پھر بولی۔ ''اور آپ کے بارے میں مجھے پتہ چل ہی چکا ہے کہ آپ کا نام سلطان ہے''۔

وہ مدھم سی آواز کے ساتھ بولی...... اس کی آواز اس کی مسکراہٹ اور کندن کی طرح دمکتا ہوا بدن سلطان کے ہوش وحواس پر بجلیاں گرا رہا تھا اور وہ نہ جانے کس کیفیت کا شکار ہوگیا تھا۔ پھر اس نے حماد کی طرف دیکھا اور بولا۔

''مگر تم یہاں کب آئے؟''

''بس یوں سمجھو، یہ سب نیلاب کی مہربانی ہے۔ اسے مغرب سے زیادہ مشرق سے لگاؤ ہے، اس لئے مجھے اس کا ساتھ دینا پڑا''۔

''نیلاب تمہاری کون ہیں؟''

''جان وجگر اور اس کے بعد بہت جلد تم اسے بھابی کہنے کا حق حاصل کرلو گے''۔

حماد نے مسکراتے ہوئے کہا اور شوخ نگاہوں سے نیلاب کے دلفریب وجود کا جائزہ لینے لگا۔ کچھ رسمی الفاظ ادا کرنے ضروری تھے، چنانچہ سلطان نے کہا۔

''میں آپ دونوں کو اس مقدس رشتے میں منسلک ہونے کی پیشگی مبارک باد دیتا ہوں''۔

کہنے کو تو اس نے یہ الفاظ کہہ دیئے، لیکن دل کی حالت عجیب سی ہو رہی تھی۔ لمحوں کا جادو

بکھر رہا تھا۔ حقیقت کی بے رحم دیوی اس کی روح پر کچوکے لگا رہی تھی، پتہ نہیں۔ یہ ہار
حسین وجود دوسروں میں تقسیم کیوں ہو گئے ہیں''۔

''کیا سوچ رہے ہو؟'' حماد کی آواز سن کر وہ چونکا۔

''بس میں ماضی کے قبرستان میں بھٹک رہا تھا''۔

''ماضی میں اگر حسن کی پذیرائی ہو تو انسان اس کے بارے میں ہمیشہ سوچتا رہ جاتا
لیکن میں یہ سمجھتا ہوں کہ اگر پذیرائی نہ ہوئی ہو تو پھر ماضی سے نکل کر حال کے راستوں پر
کرنا چاہئے''۔

''شاید...... چلو ٹھیک ہے، اچھا یہ بتاؤ کہاں رہ رہے ہو تم؟''

''بس وہ تھوڑے فاصلے پر میرا ہوٹل ہے''۔

''تم یہاں آئے ہو تو ہمارے ساتھ رہو۔ کیوں ہوٹلوں میں بھٹکتے پھر رہے ہو''۔ حماد نے

''نہیں ڈیئر، میری ذہنی حالت ایسی نہیں کہ میں دوسروں کے ساتھ رہ سکوں۔ ہاں
ضرور چاہوں گا کہ جب تک تم اس شہر میں موجود ہو، مجھے ملتے رہو''۔

''میں ضرور تم سے ملوں گا...... اچھا اب اجازت دو...... کل ملاقات ہوگی''۔

''مجھے انتظار تو نہیں کرنا پڑے گا؟''

''نہیں، یہ وعدہ میں کرتی ہوں کہ کل ان کی یادداشت انہیں لوٹا دوں''۔ حماد کے بجا
نیلاب نے جواب دیا۔ ان کے جانے کے بعد سلطان نے بل ادا کیا اور اپنے ہوٹل پہنچا
یہاں وہ عجوبہ اس کا منتظر تھا...... یعنی دانش۔

''تم میری ہدایت پر یقین نہیں کرو گے...... میں نے تمہیں مشورہ دیا تھا کہ تم فوراً
ملک کو چھوڑ دو مگر تم نے میری باتوں پر توجہ نہیں دی۔ دیکھو ابھی کل دوپہر تک کا وقت تمہارے
پاس ہے۔ اگر تم چاہو تو اپنی ذہنی الجھنوں سے نجات حاصل کر سکتے ہو۔ ورنہ پھر اپنی حماقت
سزا بھگتنے کے منتظر رہو''۔

''تم شاید میرے بارے میں کچھ نہیں جانتے دانش! میں جہاز جلا کر گھر سے باہر نکلا
اور میری واپسی کسی طور ممکن نہیں۔ میں ایک پتھر کا انسان ہوں...... خطرات سے بھاگ
فطرت کے خلاف ہے۔ تم اگر خلوص سے یہ سب کچھ کہہ رہے ہو تو میں تمہارا شکریہ ادا
ہوں، مگر ایک بات سمجھ لو، میں اب مصیبتوں کی تلاش میں ہوں اور جب تک مصیبت

نہیں کر دے گی، میں اسے تلاش کرتا رہوں گا''۔ وہ تھوڑی دیر تک سلطان کی صورت دیکھتا
پھر بولا

''ٹھیک ہے تمہاری مرضی، میں اپنا فرض پورا کرتا رہوں گا۔ اس پر یقین کرو نہ کرو''۔
جب وہ چلا گیا تو سلطان نے گہری سانسیں لیں...... یہ رات اس کے لئے بڑی ہولناک
اچانک ہی اس پر حقیقتوں کا انکشاف ہونے لگا تھا...... کیا ہے یہ سب کچھ؟ ایسا لگتا ہے
سمندر پر سفر میرے لئے ایک عذاب ہے یا وقت مجھے کوئی سزا دے رہا ہے۔ نہ پروفیسر
سے میری شناسائی تھی، نہ اس لڑکی زمرد سے جس کا نام مجھے بعد میں معلوم ہوا تھا۔ نہ
سہیل کو جانتا تھا اور نہ ہی دانش اور حماد کو، پھر میرے ذہن میں اچانک یہ بھٹکی کیفیت
طاری ہو جاتی ہے۔

سلطان کے ذہن میں لاتعداد خیال آنے لگے...... ایک لمحے کے لئے اسے اُن فلموں کا
خیال آیا جن میں دوسرے جنم کی کہانیاں ہوتی ہیں، لیکن اس خیال پر ہنسنے کے علاوہ اور کچھ
نہ کیا جا سکتا۔ دیوی دیوتاؤں اور جنم جنمان کی باتیں ایک ایسا مذاق ہے جو فلم بنانے والے
آپ سے کیا کرتے ہیں۔ وہ خود بھی ان کھوکھلی کہانیوں کو اچھی طرح جانتے ہیں۔ بھلا
دوسرے جنم میں اس دنیا میں آنے کا تصور کیا ہو سکتا ہے۔ کوئی لاجک نہیں ہے، اس کی، مگر پھر
میرے دماغ میں تمام فضول باتیں کیوں آتی ہیں۔ نہ تو میں حماد کو جانتا ہوں اور نہ بوڑھے
ان کو، نہ ہی زمرد کے بارے میں مجھے کچھ معلوم ہے اور نہ اس لڑکی نیلاب کے بارے میں جو
زمرد کا دوسرا روپ معلوم ہوتی ہے۔ بہرحال یہ سب کچھ پتہ نہیں کیا ہے۔ شاید دماغ میں کچھ
خلل پیدا ہوتی جا رہی ہے۔ رات کو نہ جانے کس وقت نیند کی دیوی نے اسے اپنی آغوش میں
لے لیا۔ دوسرے دن اس کی آنکھ اس وقت کھلی جب کوئی کمرے کا دروازہ بجا رہا تھا۔ دروازہ کھولا
سہیل کی شکل نظر آئی۔ وہ کافی اداس تھا۔ تھکے تھکے سے انداز میں اندر آ گیا اور کہنے لگا۔

''معاف کرنا میرے دوست! ان چند روز تک تمہارے پاس نہ آ سکا۔ اس کی وجہ کوئی اور
نہ تھی، بس یوں سمجھ لو کہ تقدیر کے بے رحم ہاتھوں نے مجھے لوٹ لیا۔ میں تباہ و برباد ہو گیا''۔

اس کے تھکے تھکے انداز، اترے ہوئے چہرے اور پریشان آنکھوں نے سلطان کو متاثر کیا
وہ تعجب سے بولا۔

''کیا ہوا، تم تو بہت مضبوط اعصاب کے مالک ہو، کیا بات ہے؟''

''زمرد نے شادی سے انکار کر کے مجھے زندہ درگور کر دیا ہے''۔ سہیل سسک اُٹھا۔ ''اگر مجھے اس سے شدید جذباتی لگاؤ نہ ہوتا تو میں اس عہد شکن لڑکی کی دھجیاں اُڑا دیتا۔ مگر افسوس.....'' اس نے گردن جھکالی اور افسردگی سے بیٹھ گیا، لیکن نہ جانے کیوں سلطان کے کے اندرونی گوشوں سے خوشی کا ایک احساس اُبھرا تھا۔ کچھ دیر تک وہ خاموشی سے سہیل کی صورت دیکھتا رہا، پھر اس نے کہا۔

''لیکن شادی سے انکار کی کوئی وجہ تو ضرور ہوگی؟'' سہیل نے اس بات کا کوئی جواب نہ دیا..... خاموش بیٹھا سوچتا رہا، اس کے چہرے پر عجیب سی کیفیت پیدا ہوگئی تھی، پھر اس نے کہا

''اور پتہ نہیں تم کیوں اس قیمتی ہوٹل میں رہنا چاہتے ہو۔ میں نے تم سے پہلے بھی کہا تھا کہ آخر کار تمہارے پاس موجود رقم تمہارا ساتھ چھوڑ جائے گی۔ معاف کرنا میں یہ نہیں کہتا کہ کوئی غریب آدمی ہو یا اپنا بوجھ خود نہیں اٹھا سکتے ہو، لیکن ایک دوست کی مخلصانہ پیشکش کو تم نے قبول نہیں کیا''۔

''پھر سہی، ویسے تو تم نے مجھے دوسرے دن آنے کو کہا تھا، لیکن تم خود غائب ہوگئے''۔

''ہاں..... میں جانتا تھا تم اس انداز میں سوچو گے اور اس طرح کی بات کرو گے، لیکن بس کیا کہوں میں تم سے..... اچھا اب چلتا ہوں''۔

سلطان نے اسے روکنے کی کوشش بھی نہیں کی تھی۔ اس کے جانے کے بعد وہ باتھ روم میں چلا گیا اور پھر باہر نکل آیا۔ یمن کے گلی کوچے اور بازار اس کے لئے اجنبی تھے۔ ماحول، کلچر، زندگی سب کچھ نیا نیا، وہ اس سب کچھ کا نظارہ کرتا رہا۔ یہاں تک کہ دوپہر گزری اور شام ہوگئی۔ پھر شام کو اس نے اپنے ہی ہوٹل کے ہال میں حماد اور نیلاب کو دیکھا۔ وہ ان کے قریب پہنچ گیا۔ حماد نے اسے دیکھ کر بڑی خوشی کا اظہار کیا تھا۔ اس کی منگیتر نیلاب بھی خاصی دلچسپی سے سلطان کو دیکھتی رہی تھی، اس نے کہا۔

''مجھے یوں لگتا ہے جیسے آپ ہماری آج شام کی ملاقات کو بھول گئے، کیونکہ جب ہم نے آپ کے کمرے کا جائزہ لیا تو پتہ چلا کہ آپ تو صبح ہی سے نکلے ہوئے ہیں''۔ وہ اپنی مترنم آواز میں کہہ رہی تھی اور سلطان اس کے الفاظ نہ سنتے ہوئے اس کے توبہ شکن حسن کا جائزہ لیتا رہا تھا۔ نیلاب کا شرمایا ہوا چہرہ اور چہرے کے بدلتے ہوئے رنگ اسے بہت ہی حسین لگ رہے تھے۔

''آپ کا بہت شکریہ مس نیلاب!'' سلطان نے کہا اور اسی وقت ایک ویٹر ان کی میز پر

اس نے کہا۔

''مسٹر حماد؟''

''ہاں کیوں، میں ہوں''۔

''آپ کا فون ہے جناب''۔

''اوہو اچھا..... میں جانتا ہوں یہ کس کا فون ہے''۔ اس نے کہا اور اپنی جگہ سے اُٹھ گیا۔ پھر وہ وہاں سے چلا گیا تھا اور نیلاب نے شرمائی ہوئی نگاہوں سے سلطان کو دیکھا تھا۔ سلطان اس وقت بھی نیلاب کا چہرہ دیکھ رہا تھا۔ وہ آہستہ سے بولی۔

''آپ کیا دیکھ رہے ہیں؟ میں نے کل بھی آپ کی آنکھوں میں ایک ایسی چمک دیکھی تھی جیسے آپ کی آنکھیں مجھ سے کچھ کہنا چاہتی ہوں''۔

''نہیں کوئی ایسی بات نہیں ہے..... میں آپ کو دیکھ کر حماد کی تقدیر پر رشک کرتا ہوں''۔ سلطان نے کہا اور نیلاب کے چہرے پر سرخیاں دوڑ گئیں۔

''ایک بات کہوں آپ سے؟''

''جی''۔

''میں اس کا آئیڈیل ضرور ہوں، لیکن وہ میرا آئیڈیل نہیں ہے''۔ اس کے لہجے میں کوئی خاص بات تھی جس نے سلطان کو ایک دم چوکنا سا کر دیا۔

''میں سمجھا نہیں''۔

''میں اس سے شادی نہیں کروں گی۔ مجھے اس سے ہمدردی ضرور ہے، مگر کوئی شخص محض بچپن کی دوستی کی خاطر دوسروں کے لئے اپنی زندگی قربان نہیں کر سکتا۔ میں اس سے شادی کسی قیمت پر نہیں کروں گی، کیونکہ میرے دل میں اس کے لئے وہ جگہ نہیں ہے''۔

''مگر وہ تو آپ کی طرف سے بہت پُر امید ہے''۔

''ہاں..... وہ ہے حالانکہ میں نے اسے پہلے بھی سمجھا دیا تھا کہ میں اس کی زندگی میں شامل نہیں ہو سکتی، لیکن وہ غلط فہمیوں کا شکار ہے۔ وہ دولت مند ہے۔ وہ اگر چاہے تو مجھ جیسی بہت سی لڑکیاں اسے اپنی زندگی کا ساتھی بنانا پسند کریں گی، مگر میں..... میں''۔

''مجھے حیرت ہوئی اس بات سے''۔

اچانک ہی حماد ان کے قریب آگیا اور سلطان کی نگاہیں اس کے چہرے کی جانب اُٹھ

گئیں..... ایک لمحے کے لئے اسے احساس ہوا تھا جیسے اس نے نیلاب کی باتیں سن لی ہ
وہ ایک سرد سی آواز میں بولا۔

''سوری ڈیئر نیلاب! مجھے ایک ایسی اطلاع ملی ہے جس کی وجہ سے مجھے یہاں سے جانا ہوگا اور مجبوری ہے کہ میں اسی وقت رخصت ہوجاؤں۔ مجھے معاف کرنا تم اگر میر ساتھ چلنا چاہوتو چلو ورنہ مجھے اجازت دو''۔ نیلاب تھوڑی دیر تک کچھ سوچتی رہی پھر بولی۔

''ٹھیک ہے.....تم اگر جانا چاہتے ہوتو جاؤ۔ میں ویسے بھی ابھی کچھ دن یہیں قیام کر گی''۔

''او کے..... خدا حافظ''۔ اس نے کہا اور تیزی سے باہر نکل گیا۔ نیلاب نے چند لمح کے بعد پتھریلے لہجے میں کہا۔

''شاید اس نے ہماری باتیں سن لی ہیں لیکن میں سمجھتی ہوں کہ یہ بہت اچھا ہے.....ق بڑے صحیح فیصلے کرتی ہے۔ نہ جانے اس کے بعد مجھے کس وقت یہ ناگوار فرض سرانجام دینا لیکن اچھا ہوا کہ خود ہی میرا راستہ صاف ہوگیا اور اس نے یہ بات سن لی''۔ بہت دیر سلطان اس کا چہرہ دیکھتا رہا۔ نہ جانے کیوں اس کے ذہن میں مختلف خیالات آرہے تھے۔ ایسے واقعات جن میں ایک عجیب سا ماحول تھا۔ پُراسرار کھنڈوات...... ان کھنڈرات سلطان کی روح کسی آوارہ پنچھی کی طرح بھٹکتی ہوئی۔ سلطان اس کے چہرے پر نگاہیں جما ماضی کے دھندلکوں میں گم تھا کہ اچانک اس کی آواز اُبھری۔

''کیا ہوا، آپ کہاں کھوگئے؟''

''نہیں ...... پتہ نہیں......بس آپ کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ نہ جانے کیا ہورہا میری زندگی کے ساتھ''۔

''بہرحال مجھے آپ سے مل کر بہت زیادہ خوشی ہوئی ہے۔ کیا خیال ہے، اب اٹھیں؛ سے؟''

''ہاں''۔ باہر نکلنے کے بعد نیلاب نے ٹیکسی روکی اور دوسرے دن ملنے کا وعدہ کرکے سے چلی گئی۔ سلطان اپنے کمرے میں آ گیا...... بہرحال یہ سب کچھ اس کے لئے بڑا عجیب اوراب تو وہ یہ سوچنا بھی چھوڑ چکا تھا کہ نہ جانے زندگی اسے کس راستے پر لے جارہی ؟ نہ جانے اس کا انجام کیا ہوگا۔

❁❁❁

یمن کے اس شاندار ہوٹل میں رہتے ہوئے کئی دن گزر چکے تھے۔ ایسا لگتا تھا جیسے ے کے بھنور نے سلطان کو اپنے جال میں جکڑ لیا ہو۔ کچھ اور مقصد لے کر گھر سے باہر نکلا یمن اب چوہا بن کر رہ گیا تھا۔ پتہ نہیں کیا ہوا تھا۔ پہلے وہ صرف اس بات سے افسردہ تھا ی لڑکی جو اس کے ہوش وحواس پر چھا گئی تھی، وہ اس سے چھن گئی اور سہیل اس کی زندگی کا ی بن گیا، لیکن بعد میں اس طرح نگاہوں سے اوجھل ہوگئی جیسے اس کا وجود ہی نہ ہو اور اب نیلاب، اس نے اس کے اردگرد عجیب سا جال بُن رکھا تھا۔ وہ کسی اور ہوٹل میں ٹھہری ہوئی تی۔ اس نے یہی بات بتائی تھی، لیکن اپنے بارے میں اس نے کوئی اور بات نہیں بتائی تھی۔ سلطان آنے والے مشکل لمحات کے باوجود اپنے آپ کو اس کی گرفت میں پاتا تھا اور سوچ رہا تھا کہ اب اسے کیا کرنا چاہئے۔ بہرحال حماد شاید یہ سمجھ چکا تھا کہ اب اس کی منزل نیلاب ہی ہے، ادھر نیلاب روزانہ سلطان کے پاس آجاتی تھی اور اسے اپنے ساتھ لئے ہوئے گھومتی پھرتی تھی۔ یمن کی پُراسرار آبادی اپنے اندر کچھ عجیب وغریب صفات رکھتی تھی۔ آخرکار ایک دن اس نے کہا۔

''آؤ..... میں تمہیں ایک ایسی جگہ لے چلتی ہوں، جہاں تمہیں بہت اچھا محسوس ہوگا''۔

سلطان تیار ہوگیا اور اس کے ساتھ چل پڑا۔ نہ جانے کیا سلسلہ تھا اور وہ اسے کہاں لے جاناچاہتی تھی۔ بہرحال اس کے بعد باہر نکل کر وہ ایک اسٹیشن ویگن میں بیٹھ گئی، خاص قسم کی ویگن تھی۔ اندر بیٹھ کر ویگن کے سیاہ پردے تان دیئے گئے اور وہ کسی نامعلوم سمت دوڑنے لگی۔ نیلاب نے اپنا چہرہ مکمل طور پر نقاب میں چھپا رکھا تھا۔ تقریباً دو گھنٹے تک یہ پُراسرار سفر جاری رہا اور اس کے بعد ویگن رُک گئی۔ نیلاب نیچے اتری اور اس نے اترتے ہوئے سلطان کو بھی نیچے اترنے کا اشارہ کیا۔

یہ ایک عجیب ہولناک سی جگہ تھی۔ رات اندھیری ہونے کی وجہ سے ریت کے اُبھرے ہوئے ٹیلے سیاہ بھوتوں کی مانند سر جھکائے بیٹھے معلوم ہورہے تھے۔ نیچے زبردست ریت تھی جس میں پاؤں دھنسے جارہے تھے اور اس پر سفر کرنا سخت مشقت کا کام تھا۔ نہ جانے کتنا فاصلہ طے کیا تھا کہ سانس چڑھ گیا۔ وہ سلطان کی رہنمائی کررہی تھی اور اس کا ہاتھ پکڑے ہوئے تھی۔ ابھی تک سلطان یہ نہیں سمجھ پایا تھا کہ آخر وہ اسے کہاں لے جارہی ہے۔ پھر ریت ختم

ہوئی اور پتھریلی زمین شروع ہوگئی، یہاں پہاڑی سلسلے پھیلے ہوئے تھے۔

اچانک ہی نیلاب رُک گئی۔ سامنے ہی ایک غار کا دہانہ نظر آرہا تھا، اس نے زمین سے ایک پتھر اُٹھایا اور اسے زور زور سے تین بار ایک چٹان پر مارا تو اچانک غار کے اندر روشنی جھلکنے لگی۔ کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دے رہی تھی۔ پھر کوئی مشعل لئے غار کے دہانے پر پہنچ گیا۔ وہ لمبے چوڑے بدن کا ایک اسپینش تھا۔ نہ جانے کیوں سلطان کو یہ لگ رہا تھا، جیسے کوئی پُر اسرار عمل شروع ہونے والا ہے۔ آنے والے نے کچھ الفاظ ادا کئے جن کا جواب نیلاب نے دیا اور اس کے بعد اس شخص کے پیچھے چل پڑی۔ اس نے اب بھی سلطان کا ہاتھ پکڑا ہوا تھا۔ غار صرف غار نہیں بلکہ ایک طویل سرنگ کی شکل رکھتا تھا۔ جو آگے چل کر کشادہ ہوگیا تھا۔ پھر ایک موڑ سے گھومنے کے بعد پتھروں میں تراشی ہوئی سیڑھیاں نظر آئیں اور وہ شخص مشعل لے کر سیڑھیوں پر رہنمائی کرتا ہوا نیچے اترنے لگا۔ یہ سیڑھیاں بھی شیطان کی آنت کی طرح لمبی ہوتی چلی گئیں، لیکن راستے میں جگہ جگہ دیواروں میں مشعلیں نصب تھیں۔ بالکل ایک پُر اسرار ماحول محسوس ہو رہا تھا۔ ایک عجیب و غریب انوکھی کہانی، کافی دیر سیڑھیاں اترتے رہے اور اس کے بعد ان کے قدم پتھریلی زمین پر آئے۔ اب وہ ایک ہی وسیع و عریض ہال میں تھے۔ جہاں مختلف مشعلیں روشن تھیں۔ ہال بے حد گرم تھا۔ اب شخص کی شکل بھی صاف نظر آرہی تھی جو ان کی رہنمائی کرتا ہوا یہاں تک لایا تھا۔ ہال کے دروازے سے نکل کر یہ لوگ ایک اور ہال میں پہنچے جہاں دور سے سامنے کی دیوار میں آتش دان دہکتا ہوا نظر آرہا تھا اور اس آتش دان کے قریب ایک شخص کھڑا ہوا تھا۔ آتش کے لپکتے ہوئے شعلے فضاء میں گھٹی گھٹی کیفیت پیدا کر رہے تھے۔ نیلاب نے اپنے چہرے سے نقاب اتار کر ایک طرف پھینک دیا اور آہستہ آہستہ آگے بڑھ کر اس شخص کے قریب پہنچ گئی پھر اس نے گردن جھکا کر کہا۔

”مقدس زرتاش! ہم آگئے ہیں“۔ سلطان حیران نگاہوں سے نیلاب کو دیکھ رہا تھا۔ اس کے اندر ایک عجیب و غریب تبدیلی رونما ہو رہی تھی۔ وہ ایک پتھریلے مجسمے کی طرح آتش دان میں کھڑی ہوئی تھی۔ پھر دفعتاً ہی آتش دان میں دہکتے ہوئے شعلے تیزی سے بھڑکنے لگے۔ ایک لمحے کے لئے سلطان کو یہ محسوس ہوا جیسے آگ کے جہنم نے ہر شے کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہو۔ حالانکہ وہ آتش دان سے کافی دور تھا لیکن اس کا سارا بدن پسینے میں شرابور ہوگیا تھا۔

بال آگ میں جلتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ اس نے گھبرائی ہوئی نگاہوں سے نیلاب کو دیکھا جس کی دونوں آنکھیں بند تھیں۔ اور ہاتھ دعا مانگنے کے انداز میں اٹھے ہوئے تھے۔ اچانک ہی اس نے دونوں قدم پیچھے ہٹ کر گھٹنوں کے بل بیٹھ کر دونوں ہاتھ اُوپر اٹھا دیئے۔

ادھر سلطان شدید تپش سے دیوانہ ہوا جا رہا تھا، اس کے ہوش و حواس ساتھ چھوڑتے جا رہے تھے۔ سر چکرا رہا تھا اور یوں لگ رہا تھا جیسے وہ ہوش سے بیگانہ ہوتا جا رہا ہو۔ تھوڑی دیر کے بعد ایسا ہی ہوا۔ وہ ہوش و حواس کھو بیٹھا اور نہ جانے کتنی دیر تک اسی طرح پڑا رہا۔ پھر وقت اسی طرح گزر گیا، رفتہ رفتہ اس کے ہوش و حواس واپس آنے لگے۔ تب اس نے محسوس کیا کہ اب وہ ماحول بدل چکا ہے، لیکن اس کے سارے وجود پر ایک عجیب سی کیفیت طاری تھی۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ شدید اذیت میں مبتلا ہو، لیکن یہ اذیت نہ کسی زخم کی تھی اور تکلیف کی۔ بہرحال اس نے اِدھر اُدھر نگاہیں دوڑائیں۔ رفتہ رفتہ اسے یاد آگیا تھا کہ صورتِ حال کیا ہوئی ہے۔ اس نے اِدھر اُدھر نگاہیں دوڑائیں، لیکن کچھ نظر نہیں آیا، حالانکہ مدھم مدھم روشنی چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی۔ اس نے آنکھیں بند کر کے زور زور سے ملیں۔ تب منظر اس کی نگاہوں کے سامنے نمایاں ہوگیا۔ قرب و جوار میں چاروں طرف پتھر ہی پتھر بکھرے ہوئے تھے۔ کوئی پہاڑی جگہ تھی جس کے دامن میں ایک چوڑے پتھر پر وہ لیٹا ہوا تھا۔ آس پاس گہرے گہرے کھڈ تھے جو خوفناک منہ کھولے ہوئے زندگی کے طلب گار نظر آنے تھے۔ وہ آہستہ آہستہ اپنی جگہ سے اُٹھا اور خوف و دہشت کے عالم میں ایک ایک قدم آگے بڑھانے لگا۔ یہ سب کچھ اضطراری طور پر ہو رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں کچھ بھی نہیں آرہا تھا کہ یہ کیا ہوا ہے۔ بہرحال وہ ایک ایک قدم آگے بڑھتا ہوا تھوڑی دیر کے بعد ایک غار کے دہانے کے پاس پہنچ گیا۔ اندازہ نہیں ہو رہا تھا کہ یہ کون سا غار ہے۔ کیا وہی ہے جس میں یہ پُراسرار واقعہ پیش آیا تھا۔ قرب و جوار میں نیلاب کی صورت بھی نظر نہیں آرہی تھی۔ پتہ نہیں کیا معاملہ ہے یہ۔ غار کے سامنے رک کر وہ تھوڑی دیر تک کچھ سوچتا رہا اور پھر اس نے اندر قدم بڑھا دیئے۔ کچھ انسانوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ وہ تھوڑی دیر تک کھڑا رہا۔ پھر آہستہ آہستہ آگے بڑھا۔ اس نے غار میں چاروں طرف نگاہیں دوڑائیں، پھر اچانک ہی غار میں دھواں ابھرنے لگا۔ سفید اور گاڑھا دھواں جو اس کے نتھنوں سے ٹکرایا تو اس پر ایک نشئی سی کیفیت طاری ہوگئی۔ اس کے بعد وہ چند ہی قدم آگے بڑھا تھا کہ پھر پتھریلے فرش پر ڈھیر ہو

گیا۔ حواس بحال ہوئے تو اس نے ان لوگوں کو دیکھا جو اس کے ساتھ ہی اس غار میں موجود تھے، جگہ جگہ بیٹھے ہوئے آپس میں مدھم آواز میں باتیں کر رہے تھے۔ ان میں سے ایک اپنی جگہ سے اٹھا اور اس کے قریب آکر بیٹھ گیا۔ وہ تھوڑی دیر تک خاموش بیٹھا رہا اور پھر بولا۔

''ہاں کیا کہتے ہو، یہ سب کچھ پسند ہے یا وہ چاہتے ہو جو تمہارے لئے آسمانوں کے راستے کھول دے؟''

''میں ان مشکلات سے نکلنا چاہتا ہوں''۔

''تو پھر آؤ...... ان کا راستہ غار کی دوسری طرف ہے''۔ یہ کہہ کر وہ خود بھی کھڑا ہوا اور سلطان کو بھی اس نے اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کیا۔ غار کے دوسرے دہانے سے باہر نکلے تو ایک عالی شان عمارت کا دروازہ نظر آیا۔ جس کے عقبی حصے میں سمندر پھیلا ہوا تھا۔ اس عمارت کی بناوٹ بڑی عجیب تھی۔ دیواروں پر بہت ہی بھیانک نقوش بنے ہوئے تھے، لیکن کچھ خوب صورت مناظر بھی تھے۔ اس عمارت کے اندر داخل ہونے کے بعد وہ دونوں ایک ہال کمرے کی طرف پہنچ گئے، جہاں پتھریلی کرسیاں بنی ہوئی تھیں۔ سامنے ہی ایک سنگین تخت موجود تھا۔ وہاں انتہائی خوب صورت تصویریں دیواروں پر نقش کی گئی تھیں۔ ایک ایک تصویر تصویر جاذب نگاہ تھی۔ اچانک سلطان نے ایک تصویر کو دیکھا، اس کے نقش و نگار مانوس سے محسوس ہوئے۔ وہ اسے دیکھتا ہی رہ گیا۔ اچانک اس نے محسوس کیا جیسے تصویر سے ایک دھیمی سی خوشبو نکل رہی ہو، پھر کوئی اس تصویر سے نمودار ہوا اور سلطان کی آنکھیں حیرت سے پھٹ گئیں...... آہ...... اگر یہ خواب ہے تو کیسا خواب ہے۔ یہ تو مسلسل ذہن و دل کو قابو میں ہوا تھا۔ کیا کروں، میں کیا کروں؟ وہ یہ سوچنے لگا۔ ساتھ لانے والے نے اسے ایک تخت بٹھا دیا۔ تبھی وہ حسین وجود جو ایک روشن ہیولے کے مانند تھا، سامنے آکر اس تخت پر بیٹھا اس نے اپنی نرم اور مترنم آواز میں کہا۔

''نجات کے راستے خود تلاش کئے جاتے ہیں۔ یہ راستے کہیں سے بھی نہیں ملتے تم ان راستوں کو تلاش کرنا چاہو تو ان کے لئے تمہاری رہنمائی کی جا سکتی ہے۔ آگ پرست، آگ کے پجاری، آگ کی افادیت کو نظر انداز نہیں کرسکتے، اے شخص! تو سامنے کھڑا ہو۔ تیرا نام سلطان ہے، کیا تو یہ بات جانتا ہے کہ آگ اس کائنات کی سب سے چیز ہے۔ آگ ہی پوجا کے قابل ہے اور آگ کے پجاری ہمیشہ مشکلات سے محفوظ رہتے

شے ہے جو کائنات کی ہر شے کو جلا کر خاکستر کر دینے کی قوت رکھتی ہے۔ یہ پتھروں کو، پہاڑوں کو، فولاد کو، غرض یہ کہ دنیا کی ہر چیز کو جلا دیتی ہے تو بتاؤ کیا یہ پوجے جانے کے قابل نہیں ہے؟ اے شخص! اپنا نام بدل دے۔ تیرا نام افراسیاب تعین کیا گیا ہے اور تجھے اپنے راستے پر لانے کے لئے بڑی جدوجہد کی گئی ہے تو اگر آگ کے راستے اپنا لے تو تیرے لئے ہر وہ چیز موجود ہے جس کا تو خواہش مند ہو، چاہے تو اسے نیلاب کہے یا اسپانیہ، زمرد کہے یا کچھ بھی کہے۔ جو تیری پسند ہے، وہ تجھے حاصل ہوگی''۔ نہ جانے سلطان کی زبان کیسے کھل گئی اس نے کہا۔

''میری طلب کیا ہے یہ میں جانتا ہوں، اے عورت! تو نہیں اور جہاں تک تو اس آگ کی بات کرتی ہے تو میرے ایک سوال کا جواب دے۔ کیا تو سمندر کو جلا سکتی ہے۔ کیا پانی کا ایک ریلہ تجھے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے فنا نہیں کر دیتا۔ پھر آگ سب سے برتر کیسے ثابت ہوئی؟ تو کسی بھی طرح مجھے آگ کی پوجا کے لئے مائل نہیں کر سکتی، تو نہیں جانتی میں عظیم ہوں تجھے خود میری عظمت کا اعتراف کرنا پڑے گا۔ بے شک میرے دل و دماغ پر تیری پرچھائیوں نے زخم ڈال دیئے ہیں، لیکن تیرا یہ راستہ بھی کھلا ہوا نہیں ہے۔ میرے دل میں جو کچھ ہے تو نہیں جانتی اور جہاں تک میرے مذہب اور ایمان کا تعلق ہے تو میری فطرت اپنی جگہ، اگر برائیاں ہیں تو میری اپنی ذات میں ہیں، میرے مذہب میں نہیں۔ تو آتش پرست عورت کسی بھی طرح مجھے اپنے مذہب کی طرف مائل نہیں کر سکتی''۔ چمکدار اور روشن ہیولے نے غضبناک انداز میں پہلو بدلا۔ اور پھر غراتی ہوئی آواز میں بولی۔

''نکال دو اسے یہاں سے، کون اسے لایا ہے۔ یہ ہمارے قابل نہیں ہے''۔ ابھی اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ اچانک تیز ہوا چلنے لگی۔ ایک شدید گرد آلود ماحول نگاہوں کے سامنے آگیا اور سلطان کو اپنی آنکھیں بند کر لینی پڑیں۔ زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ طوفانی شور کی آوازیں بلند ہوئیں اور اب اس نے اپنے آپ کو ایک لق و دق صحرا میں پایا۔ کہیں دور سے گھنٹیاں بجنے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر چاروں طرف دیکھنے لگا۔ پتہ نہیں یہ زمین کا کون سا حصہ تھا۔ گھنٹیوں کی آوازیں کہاں سے آرہی تھیں۔ دیر تک وہ اِدھر اُدھر دیکھتا رہا، جس طلسمی ماحول میں وہ پھنس گیا تھا، وہ خواب کا عالم نہیں تھا۔ سب کچھ ہوش و حواس میں تھا، چنانچہ اس نے قدم آگے بڑھا دیئے، پھر ایک بلند ٹیلے سے اس نے دیکھا تو کافی فاصلے پر اسے ایک چھوٹا سا قافلہ نظر آیا، سات یا آٹھ اونٹ سوار تھے جو ایک طرف جا رہے تھے۔ سلطان

نے چیخ چیخ کر انہیں آوازیں دینا شروع کیں اور اس کی آوازیں سن لی گئیں۔ کچھ ہی دیر بعد اونٹوں کا یہ قافلہ اس کے پاس پہنچ گیا تھا۔ ایک بدو نے اسے غور سے دیکھا اور کہا۔

’’کہاں جانا چاہتا ہے؟‘‘

’’کسی بھی آبادی میں چھوڑ دو، تمہاری مہربانی ہوگی‘‘۔

’’اس اُونٹ پر اس شخص کے ساتھ بیٹھ جا‘‘۔ بدو نے اشارہ کیا اور اپنی زبان میں کچھ کہنے لگا۔ ایک اونٹ بیٹھ گیا تھا جس پر ایک آدمی پہلے سے موجود تھا۔ سلطان کچھ طرح بدحواس تھا کہ اس نے اپنے ساتھ سفر کرنے والے کو بھی نہیں دیکھا۔ اُونٹ اپنی جگہ اُٹھا اور قافلہ ایک بار پھر چل پڑا۔ اس کے ساتھ بیٹھا ہوا آدمی آگے تھا اور وہ اس کے پیچھے تھا۔ کوئی سو، دو سو قدم چلنے کے بعد سامنے بیٹھے ہوئے شخص نے پلٹ کر دیکھا اور ایک بار سلطان کو چکر سا آ گیا۔ یہ دانش تھا۔

’’ہاں ہاں...... کسی قسم کے تاثر کا اظہار نہ کرو...... بالکل ٹھیک پہچانا تم نے۔ میں دوست یا دشمن جو کچھ بھی سمجھ لو وہ ہوں اور میرا نام دانش ہے، یاد آ گیا؟‘‘

’’ہاں‘‘۔ سلطان نے گھٹی گھٹی آواز میں کہا۔

’’تمہارا چہرہ بتاتا ہے کہ تم ان دلکش لمحات سے دور ہو چکے ہو جس کی نشاندہی میں کر دی تھی‘‘۔ سلطان نے گہری سانس لے کر دانش کو دیکھا اور کہا۔

’’میری سمجھ میں نہیں آتا، میں کس طلسم میں پھنس گیا ہوں‘‘۔

’’اب وقت آ گیا ہے کہ میں تمہیں اس بارے میں بتادوں۔ جہاز میں تم نے جس عالم کو دیکھا تھا، وہ کوئی زندہ وجود نہیں ہے۔ وہ صرف ایک عمل کی تراش ہے۔ سمجھ رہے تا...... عمل تنوین کے بارے میں کچھ جانتے ہو؟‘‘

’’نہیں‘‘۔

’’مسمریزم یا ہپناٹزم...... اس کے بارے میں کچھ معلوم ہے تمہیں؟‘‘

’’صرف نام کی حد تک‘‘۔

’’میں تمہیں بتاتا ہوں...... سمندر میں سفر کے درمیان اس نے تمہیں دیکھا، اس کا سومن ہے، پروفیسر سومن!‘‘

’’ہاں...... میں اسے جانتا ہوں‘‘۔

’’نہیں تم اسے نہیں جانتے وہ...... اچھا ٹھہرو، حسن بن صباح کا نام سنا ہے کبھی؟‘‘

’’تاریخ میں‘‘۔

’’تاریخ کے اسی حسن بن صباح کی بات کر رہا ہوں۔ شیطان کا وہ گروہ جس نے اپنی جنت بنائی ہوئی تھی، ہلاکو خان نے ختم کر دیا تھا، لیکن حسن بن صباح کے کچھ حواری، اس کے چند کے پیروکار باقی رہ گئے تھے۔ طویل عرصے تک وہ زیر زمین رہے اور اس کے بعد ایک بار پھر نظریات شیطان کی شکل میں دنیا میں بکھر گئے۔ طرح طرح کے مذاہب انہوں نے تخلیق کئے، کہیں کچھ، کہیں کچھ، فری میسنز کا نام تو تم نے سنا ہوگا؟‘‘

’’ہاں‘‘۔

’’خیر تو وہ شخص پروفیسر سومن بھی اسی گروہ کا ایک آدمی ہے اور ہپناٹزم کا ماہر۔ وہ انسانوں کو اس طرح اپنے جال میں پھانستا ہے کہ لوگ دیوانے ہو جاتے ہیں، اس قدر طاقتور ذہن کا مالک ہے وہ کہ تم سوچ بھی نہیں سکتے۔ اس نے تمہیں دیکھا اور پسند کر لیا اور اس کے بعد اس نے تمہارے دماغ پر نہ جانے کس طرح اپنی قوت قائم کی۔ ہپناٹزم کے ماہر کی ایک بات میں تمہیں بتاؤں۔ اگر وہ پیچھے سے حملہ آور ہوتا ہے تو گردن پر ایک چبھن کا احساس ہوتا ہے اور انسان پلٹ کر دیکھنے پر مجبور ہو جاتا ہے، بس وہی لمحہ ایسا ہوتا ہے جب ہپناٹزم کا ماہر اس پر اثر انداز ہو جاتا ہے اور اس کے ذہن کو کسی بھی شکل میں ترتیب دے لیتا ہے۔ اگر تم نے اس شکل کی کسی حسین عورت کو دیکھا ہوگا تو یقینی طور پر اس نے اسے تمہارے ذہن کے پوشیدہ خانوں میں محفوظ کر دیا ہوگا۔ تم بار بار اسے مختلف شکلوں میں دیکھتے رہے ہوگے اور یہ سب ہپناٹزم کا چکر تھا۔ وہ تمہیں اپنے ٹرانس میں لا کر حسن بن صباح کا پیروکار بنانے میں دلچسپی رکھتا تھا، بلکہ تم جیسی قوت ارادی کے مالک لوگوں کو توڑنا ان لوگوں کی سب سے بڑی کامیابی ہوتی ہے اور یہ اسی کو سب کچھ سمجھتے ہیں، چنانچہ اب وہ اپنی تمام تر قوت تم پر صرف کئے ہوئے تھا۔ وہ تمہیں نیلاب کی شکل دکھاتا تھا تو کبھی حماد کی حالانکہ ان میں سے کسی کا کوئی وجود نہیں تھا۔ اس نے تمہیں سہیل کی طرف سے ہوشیار کیا تھا۔ سہیل بھی انہی میں سے ایک تھا۔ ایک عجیب و غریب جال وہ تمہارے گرد بچھا رہے تھے۔ جب ان کے خیال میں تم پوری طرح ان کے شکنجے میں آ گئے، تمہارا دل و دماغ ان کے قبضے میں آ گیا تو انہوں نے تمہیں اپنے آپ میں شامل کرنے کی آخری کوشش کر ڈالی، مگر وہیں مار کھا گئے۔ تمہارے نظریات نے انہیں ہلا ڈالا اور وہ

اپنا مقصد پورا نہیں کر سکے تو انہوں نے تمہیں یہاں پھنکوا دیا۔ میرے عزیز دوست! میں نے تم سے کہا تھا ناں کہ یہ دشمن ہیں تمہارے، جس قدر جلد ہو یمن سے نکل جاؤ۔ میں نے کہا تھا۔ اگر قدرت تمہاری رہنمائی نہ کرتی اور تم ان لوگوں کے ارادوں کو ختم نہ کر دیتے تو طور پر تم بھی اپنا دین ایمان کھو بیٹھتے اور اس کے بعد شیطان کے ایک قریبی بازو ہوتے خاموش ہو گیا، بہت دیر تک سلطان پر سکتے کی سی کیفیت طاری رہی تھی۔

پھر اس نے سرسراتی آواز میں کہا۔

''کیا تم سچ کہہ رہے ہو؟''

''ہاں...... میں بالکل سچ کہہ رہا ہوں...... میری بات پر یقین کرو''۔

''بہت ہی سنسنی خیز بات ہے''۔

''اب بولو کیا ارادہ رکھتے ہو؟''

''دانش! مجھے ہپناٹزم کے بارے میں اور کچھ بتاؤ''۔ سلطان کے ذہن میں نہ جا خیال آیا تھا۔ دانش نے ایک بار پھر گردن گھمائی اور عجیب سے انداز میں بولا۔

''کمال ہے، میں نے تمہیں تمہاری زندگی کے مشکل لمحات سے آشنا کیا اور تم مجھ ہپناٹزم کے بارے میں سوال کر رہے ہو''۔

''ہاں کیونکہ میرے لئے یہ ایک دلچسپ عمل ہے۔ کیا کیا، کیا جا سکتا ہے، ہپناٹزم ذریعے؟''

''وہ کچھ جو ان لوگوں نے کیا۔ کسی کے دل و دماغ کو اپنے قابو میں کر لینا، اس سے ہر بات منوا لینا۔ تم دیکھو کہ جن انسانوں کا کوئی وجود نہیں تھا، ہپناٹزم کی قوت نے وہ انسان کر کے تمہارے سامنے پیش کئے اور تم نے انہیں زندہ وجود سمجھا۔ ان کے ساتھ اٹھے بیٹھے پیا۔ سب کچھ کیا اور وہ تمہارے قریب نہ آ سکے، کیونکہ ان کا کوئی وجود ہی نہیں تھا''۔

''آہ...... یہ تو بڑا پُراسرار عمل ہے، لیکن کیا یہ سب کچھ حسن بن صباح کے زمانے کے بعد ہی کیا جا سکتا ہے؟''

''نہیں، پروفیسر سومن ایک اعلیٰ پائے کا ہپناٹسٹ ہے۔ اس نے بھی یہ عمل کہیں سیکھا ہوگا۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ بعد میں حسن بن صباح کا پیروکار بن گیا اور اس کے کے لئے کام کرنے لگا جو اس سلسلے میں سرگرم عمل ہے''۔ سلطان گہری سوچ میں ڈوب

ذہن میں بھنور پڑ رہے تھے۔ اچانک ہی اس نے چونک کر کہا۔

''اگر کوئی ہپناٹزم سیکھنا چاہے تو؟''

''اب یہ زیادہ مشکل عمل نہیں ہے۔ وہ اگر سیکھنا چاہے تو سیکھ سکتا ہے''۔ سلطان پھر ہو گیا۔ ویسے واقعی یہ اس کی زندگی کا انتہائی حیرت انگیز دور تھا۔ اس کا مطلب ہے کہ اس نے جن خواتین کو دیکھا یا جن سے اس کی ملاقات ہوئی، ان کا کوئی زندہ وجود نہیں صرف ایک تخیل تھے، ایک خیال جو ذہن میں محفوظ کر دیا گیا تھا۔ آہ، اس کا مطلب ہے اگر انسان ہپناٹزم سیکھ لے تو بہت کچھ بن سکتا ہے۔ دنیا سے اپنی ذات کا لوہا منوایا جا سکتا اور یہاں سے سلطان کا ذہن ایک نئے راستے پر چل پڑا۔ تھوڑا فاصلہ طے کرنے کے اس نے کہا۔

''میرے دوست! ایک بات تو بتاؤ، وہ سب تو ایک تخیل تھے تو تم کون ہو؟'' جواب میں اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس نے آہستہ سے کہا۔

''دانش کو نہیں جانتے؟ دانش عقل کو کہتے ہیں، دانش علم کو کہتے ہیں۔ دانش اس قوت کو کہتے ہیں جو روزِ اول سے انسان کی بقاء کا ذریعہ بنتی ہے۔ سمجھے میرا نام دانش ہے اور دانش ہی کی حیثیت سے ہی میں نے تمہیں سب کچھ سمجھانے کی کوشش کی تھی اور نہ میرا کوئی وجود نہیں میں کسی جسم میں نہیں بلکہ صرف انسانی عقل میں رہتا ہوں سمجھے''۔ یہ کہہ کر اچانک ہی وہ سلطان کی نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔ اونٹ پر اب دوسری سواری کے طور پر اس کا کوئی وجود نہیں

❁❁❁

فرق صرف اتنا تھا کہ سلطان انتہائی سرکش تھا، منظرِ عام پر تھا۔ دنیا کی نگاہوں میں تھا بھی زمیندار ہی تھے۔ ایک اتنے بڑے زمیندار کے بیٹے لیکن وہ منظرِ عام پر نہیں تھے۔ بڑی بات یہ کہ کم از کم باپ کی نگاہوں میں سرخرو تھے اور ظفر محمود انہیں اس نگاہ سے نہیں دیکھتا تھا۔ وہ زمینداری کے کام بھی کرتے تھے اور اپنی باقی زندگی کے لئے بھی انہوں نے مکانات مہیا کر رکھی تھیں، لیکن محدود پیمانے پر یا اگر محدود کی حد سے بڑھے بھی تو کسی کی نگاہ میں آنے سے گریز کیا اور یہی ان کی کامیابی کا راز تھا۔ بہرحال عمران محمود کو اغوا کر لیا گیا تھا اور غفور اسے اپنا چہرہ دکھائے بغیر ایک ایسی جگہ لے گیا تھا جو سنسان سے علاقے میں

واقع تھی۔ سائیں فیض بخش کی ملکیت تھی۔ فیض بخش نے یہاں ایک ریسٹ ہاؤس
ہاؤس بنا رکھا تھا اور اسی میں اس نے اپنے مخالفین کے لئے ایک تہہ خانہ بنا رکھا تھا
انہیں با آسانی قید رکھا جا سکتا تھا۔ دور دور تک چٹیل اور پتھریلے میدان بکھرے ہوئے
ان میں درخت وغیرہ بھی نہیں تھے۔ بہر حال عمران نے وہیں آنکھ کھولی تھی اور حیران
تھا۔ غفور نے اسے بڑے مخصوص انداز میں اغوا کیا تھا۔ ہوش آنے کے بعد عمران نے
طرف دیکھا۔ غفور ابھی تک اس کی نگرانی پر مامور تھا۔ غفور کو عمران نے ایک لمحے
پہچان لیا اور شدید سنسنی کا شکار ہو کر رہ گیا۔

''سنو...... ادھر آؤ۔ یہ کون سی جگہ ہے اور مجھے یہاں کیوں لایا گیا ہے؟''
اس نے سوال کیا۔

''سائیں...... آپ کے والد کا جھگڑا چل رہا ہے، ہمارے سائیں فیض بخش سے
کے بھائی نے جو کچھ کیا ہے، وہ تو آپ کو معلوم ہی ہے۔ اب آپ کو اس کے بدلے یہاں
گیا ہے۔ سائیں ظفر محمود جب اپنے بیٹے کو ہمارے حوالے کر دیں گے تو آپ کو رہا
جائے گا''۔ عمران کی آنکھیں غصے سے سرخ ہو گئیں۔

''کیا یہ مناسب طریقہ ہے؟''

''سائیں! کیا مناسب ہے کیا نامناسب، یہ تو مالک ہی جانتے ہیں۔ ہم تو نوکر
ہیں۔ جو حکم ملتا ہے کر ڈالتے ہیں''۔

''اور کتوں کی موت بھی تم ہی مارے جاتے ہو''۔

''ہاں سائیں! آپ ٹھیک کہتے ہو۔ مالکوں تک بات نہیں پہنچتی۔ بات وہی
سائیں! کہ کتے تو مرنے کے لئے ہی ہوتے ہیں''۔

''ایک بات سمجھ لو، ہم کبھی کسی کو نقصان نہیں پہنچاتے لیکن اگر ہمیں نقصان پہنچایا
جس طرح تم نے دھوکے سے مجھے بے ہوش کر کے یہاں تک لانے کی جرأت کی ہے
کے بعد یہ حق بنتا ہے کہ ہم بھی تمہارے خلاف قدم اٹھائیں''۔

''آپ بالکل ٹھیک کہتے ہو سائیں۔ آپ کی جگہ کوئی بھی ہوگا ایسا کرے گا اور
جگہ بھی جو ہوگا وہ نقصان اٹھائے گا، مگر آپ سے ہاتھ جوڑ کر کہتے ہیں کہ جب تک آپ
تکلیف نہ پہنچائی جائے، آپ کوئی ایسا کام نہ کریں سائیں! جو آپ کو نقصان پہنچائے

بھی کیا، ہم ہیں ہی نوکر۔ نوکروں کا کام تو مرنا ہی ہوتا ہے نا سائیں''۔

''بہت زیادہ بکواس کرتا ہے''۔

''نہیں سائیں! آپ یقین کرو۔ ہم آپ کے بھی نمک خوار ہیں۔ ہمیں خود افسوس ہے
یہ برا کام ہمیں کرنا پڑا ہے۔ سائیں! ہمیں معاف کر دیں''۔

وقت گزرتا رہا۔ عمران کو اپنے اس جیل خانے میں اس بات کا اندازہ ہو گیا تھا کہ یہاں
نکلنا کوئی آسان کام نہیں۔ وہ بڑی پریشانی کا شکار تھا۔ سلطان نے جو کچھ کیا تھا، وہ اس
علم میں بھی تھا اور بھائیوں نے آپس میں بیٹھ کر یہ بات بھی کی تھی کہ سلطان کا یہ قدم ان
لئے نقصان دہ ہو سکتا ہے۔ بہر حال اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے۔ سلطان کے
بارے میں اچھی طرح جانتا تھا کہ اس کا ہاتھ آنا بہت مشکل ہے۔ دو دن کی قید کے بعد فیض
قید خانے میں پہنچا۔ فیض بخش وڈیرہ تھا، مگر مجموعی طور پر برا انسان نہیں تھا، البتہ چیونٹی بھی
جب دب جاتی ہے تو کاٹ لیتی ہے۔ تھوڑی سی گڑ بڑ چل رہی تھی۔ فیض شاہ اور ظفر محمود کے
درمیان لیکن وہ ایک سنگین شکل صرف سلطان کی وجہ سے اختیار کر گئی تھی ورنہ ایسی کوئی صورت
بھی نہیں تھی۔ اسے غصہ تھا اور پھر حویلی کا جل جانا کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ وہ تو اتفاق
کہ اہل خاندان باہر گئے ہوئے تھے اور وہ خود بھی ان کے ساتھ تھا۔ ملازمین اس لئے باہر
کہ مالکان حویلی میں موجود نہیں تھے۔ لاکھوں روپے کا ساز و سامان جل کر راکھ ہو گیا تھا اور
پوری حویلی کھنڈر بن گئی تھی۔ یہ معمولی بات نہیں تھی۔ آس پاس کے گوٹھوں کو بھی خبر مل گئی تھی
بہت سے لوگ اس سے ملنے کے لئے بھی آئے تھے۔ یہ تمام باتیں تھیں جن کی وجہ سے بھی
پر مجبور ہو گیا تھا۔ عمران ظفر کو دیکھ کر ایک لمحے کے لئے اس کے دل میں ایک دکھ بھرا
احساس ابھرا تھا۔ نوجوان اور خوبصورت لڑکا قیدی کی طرح سلاخوں کے پیچھے تھے۔ شیو بڑھا
ہوا تھا۔ بال بکھرے ہوئے تھے۔ ظاہر ہے وڈیرے کا بیٹا تھا، ایسے برے حال میں تو نہ رہتا
تھا لیکن فیض بخش کو اپنی جلی ہوئی حویلی یاد تھی۔ عمران ظفر نے اسے دیکھا اور سلام کر ڈالا۔

''وعلیکم السلام...... کیسے ہو؟ کوئی تکلیف تو نہیں ہے''۔

''ایک بے گناہ شخص کو آپ نے سلاخوں کے پیچھے ڈال دیا ہے، سائیں فیض بخش اور
پوچھتے ہو کہ کوئی تکلیف نہیں ہے۔ صرف پیٹ بھر کر روٹی ہی تو سب کچھ نہیں ہوتی۔ یا تو
نے کوئی قصور کیا ہوتا تو میں یہ سوچتا کہ مجھے اس کی سزا مل رہی ہے۔ قصور کسی نے کیا ہے

سائیں! نقصان مجھے پہنچ رہا ہے''۔

''ہوتا ہے، کبھی کبھی ایسا ہی ہوتا ہے۔ تم ہمیں یہ بتادو کہ سلطان ظفر کہاں چھپا ہوا ہے۔ اس نے ہمارے کھلیان جلائے، ہماری حویلی جلادی، ہماری زندگی لینے کی کوشش کی۔ تو سائیں ہم بھی انسان ہیں، ہم اسے کیسے چھوڑ سکتے ہیں''۔

''وہ میرا بھائی ہے، اگر اسے کوئی تکلیف پہنچی تو ظاہر ہے، میرے سینے میں ایک بھائی کا دل ہے، لیکن سائیں! یہ اس وقت کی بات ہے جب وہ آپ کے ہاتھ آجائے۔ دوسری بات یہ کہ ہم اس کے ساتھ شریک نہیں تھے۔ ویسے بھی وہ ہم سے مختلف قسم کا آدمی ہے۔ ہماری اس کی زیادہ بنتی نہیں ہے۔ پھر ہمیں اس کے بارے میں کیسے معلوم ہوسکتا ہے''۔

''کچھ بھی ہے۔ سائیں ظفر کو تو اس بارے میں معلوم ہوگا''۔

''ہاں..... اگر انہیں معلوم ہے تو کیا یہ بہتر نہ ہوتا کہ آپ اس سلسلے میں ان سے بات کرتے؟''

''کرلی تھی بات سائیں! کرلی تھی۔ ہم ایسا کرتے ہیں کہ تھوڑے دن انتظار کرلیتے ہیں اس کے بعد تمہیں نکال دیں گے اور تمہارے دوسرے بھائی کو لے آئیں گے۔ ہاں اگر ہمارے صبر کا پیمانہ لبریز ہوگیا اور ظفر محمود ہمیں بے وقوف سمجھتا رہا تو پھر صورتِ حال مختلف ہوگی''۔

''دیکھیں سائیں! میں یہ چاہتا ہوں کہ آپ مجھے رہا کردیں، مجھے جانے دیں یہاں سے، میرے اپنے بہت سے کام اٹکے ہوئے ہیں۔ میں کوشش کروں گا کہ اس مسئلے کا کوئی حل نکل آئے''۔

''نہیں سائیں نہیں۔ جب ہم نے یہ قدم اٹھادیا ہے تو اب اسے واپس نہیں لوٹائیں گے۔ ہم نے سیدھی سیدھی بات کردی ہے سائیں ظفر محمود سے کہ وہ اپنی حویلی گرادیں، کہیں اور چلے جائیں یہاں سے۔ ہم ان کی حویلی کی جگہ جانوروں کا باڑہ بنائیں گے، گھوڑوں کا اصطبل بنائیں گے تاکہ جب لوگ ہماری جلی ہوئی حویلی کے کھنڈرات کو دیکھیں تو ہم سے پوچھیں یہ حویلی کیسے جل گئی۔ ہم بتائیں گے انہیں کہ وہ اصطبل بنانے کے لئے یہ حویلی جلانی پڑی''۔

''یہ انتہائی کمینے پن کی بات ہے۔ تم اگر چاہو سائیں فیض بخش تو اپنی حویلی کی قیمت ان سے وصول کرسکتے ہو۔ تمہاری حویلی دوبارہ تعمیر کرائی جاسکتی ہے، لیکن یہ کیا بات ہوئی''۔

''بیٹا! ایسی درجن بھر حویلیاں ہم خود تعمیر کراسکتے ہیں۔ بات اس کی نہیں ہے بات عزت

زبان کی ہوتی ہے''۔

''دیکھئے..... سائیں فیض بخش! مجھے آپ کی باتوں پر غصہ آرہا ہے۔ بات اصل میں یہ ہے کہ جرم میں نے نہیں کیا ہے۔ ہماری اپنی ایک زندگی ہے۔ آنے والے وقت میں مجھے بھی ایک باعزت زندگی گزارنی ہوگی۔ اگر آپ نے ایک ناکردہ جرم میں مجھے نقصان پہنچانے کی کوشش کی اور یہاں قید رکھا تو پھر میری براہ راست آپ سے دشمنی ہوجائے گی''۔

''ہاں سائیں! یہ بات ہم جانتے ہیں۔ ظفر محمود کے سارے بیٹوں سے ہماری دشمنی چلے گی، ایک ایک کرکے۔ ابھی تو تم اکیلے ہو پتہ نہیں کس کس سے نمٹنا پڑے گا''۔ بہت دیر تک فیض بخش اور عمران کے درمیان باتیں ہوتی رہیں۔ نتیجہ کچھ بھی نہیں نکلا تھا۔ فیض بخش وہاں سے پلٹا، پھر اس نے غفورے کو دیکھا اور ہنس کر گردن ہلاتا ہوا بولا۔

''بڑا برا کیا ہے اس لڑکے نے اور تم لوگ بالکل ناکارہ ثابت ہوئے۔ وہ بے شک چالاک ہے، لیکن ابھی اس کی عمر ہی کیا ہے۔ کتنا تجربہ ہوگا اس کا، تم لوگ ایک لڑکے کو نہیں پکڑ سکتے؟''

''سائیں! پوری پوری کوشش کررہے ہیں، آپ یقین کرو چاروں طرف ہمارے آدمی بکھرے ہوئے ہیں''۔

''اس بچے کی باتیں سن کر مجھے شرمندگی ہوتی ہے۔ پورا پورا جوان ہے۔ کسی سرکشی پر آمادہ ہوگیا تو نقصان اٹھا جائے گا۔ سنو..... اسے سمجھانا، اسے کوئی تکلیف نہ ہونے دینا، کیا کیا جائے۔ برائی کس نے کی، نتیجہ کسے بھگتنا پڑ رہا ہے۔ مگر ظفر محمود کو دیکھو، اس کے کان پر تو جوں تک نہیں رینگ رہی تھی۔ بھائی! بیٹا پیدا کیا ہے تو اس کی پرورش بھی ٹھیک سے کی ہوتی۔ یہ کیا بات کہ وہ دوسروں کے لئے جان کا عذاب بنا ہوا ہے''۔

''ٹھیک ہے سائیں! آپ فکر نہ کریں''۔ غفورے نے کہا اور اس کے بعد سائیں فیض بخش چلا گیا۔

غفورا پھر سلاخوں کے پاس پہنچ گیا تھا۔ اس نے کہا۔

''عمران سائیں! آپ نے فیض بخش سے باتیں کی ہیں۔ کوئی بری بات نہیں کہی ہوگی انہوں نے، اور کسی بھی طرح آپ کو کوئی نقصان پہنچانے کی کوشش نہیں کی جارہی۔ سائیں، تھوڑے دن کی بات ہے بس! کام ہوجائے گا''۔ عمران نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ فیض بخش کی باتوں سے اس نے یہ اندازہ لگالیا تھا کہ فیض شاہ اسے آسانی سے چھوڑنے والا نہیں۔

چنانچہ اب دوسرے طریقے استعمال کرنے پڑیں گے اور وہ ان پر غور کرنے لگا تھا۔ کھانا لانے والے باقاعدگی کے ساتھ اسے کھانا اور چائے وغیرہ پہنچاتے تھے اور یہیں سے عمران نے ایک منصوبہ اپنے ذہن میں بنالیا تھا، چنانچہ رات کو جب فیض بخش کے آدمی کھانا لے کر آئے تو وہ اپنے منصوبے کے مطابق زمین پر سیدھا لیٹا ہوا تھا۔ اس نے آنکھیں بند کرلی تھیں اور آہستہ آہستہ کراہ رہا تھا۔ ان میں سے ایک نے دروازہ کھولا اور کھانے کی ٹرے لے کر اندر داخل ہوگیا۔ پھر اس نے عمران کو دیکھا اور بولا۔

''کیا بات ہے سائیں! آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟'' عمران نے کوئی جواب نہیں دیا۔ دوسرا آدمی جو دروازے پر کھڑا ہوا تھا پوچھنے لگا۔

''کیا بات ہے؟''

''دیکھو نا بے چارہ بے ہوش پڑا ہوا ہے شاید! کراہ رہا ہے آہستہ آہستہ''۔ دوسرا آدمی بھی ہمدردی سے اندر گھس آیا اور جھک کر عمران کو دیکھنے لگا، لیکن اسی وقت عمران کے دونوں ہاتھ اٹھے اور ان کے بال اس کے ہاتھوں میں آگئے۔ پھر اس نے انتہائی پھرتی سے انہیں زمین پر دے مارا۔ دونوں کے حلق سے کرب ناک چیخیں نکلی تھیں۔ عمران ایک تندرست و توانا اور طاقتور آدمی تھا۔ وہ ان دونوں کی گردنوں پر دباؤ ڈالنے لگا۔ ایک لمحے تک تو وہ لوگ لیٹے رہے پھر انہوں نے سنبھلنے کی کوشش کی مگر عمران کے خوفناک گھونسوں نے ان کے حواس ان سے چھین لئے تھے اور تھوڑی دیر کے بعد دونوں بے ہوش ہوکر فرش پر گر پڑے۔ عمران پھرتی سے کھلے ہوئے دروازے سے باہر نکل آیا، اسے اندازہ نہیں تھا کہ باہر کا منظر اور ماحول کیسا ہے؟ لیکن صورت حال کافی خوفناک تھی۔ باہر کتے کھلے ہوئے تھے اور یہ انتہائی خوفناک شکاری کتے اپنے شکار کی مزاج پرسی کرنا اچھی طرح جانتے تھے۔ تہہ خانے کی سیڑھیاں طے کرکے وہ اوپر پہنچا۔ باہر ایک راہداری تھی۔ اسے عبور کیا اور اس کے بعد کھلی جگہ نکل آیا۔ فارم ہاؤس کا وسیع عریض احاطہ دور تک پھیلا ہوا تھا۔ وہاں خوبصورت درخت اور پودے بھی لگائے گئے تھے۔ درمیان میں ایک روش تھی۔ عمران تیزی سے اس روش پر دوڑتا ہوا گیٹ کی جانب بڑھا اچانک اسے کتوں کی غراہٹ سنائی دی۔ چار شکاری کتے کسی انسان کی بو سونگھ رہے تھے۔ جیسے ہی ان کی آہ اُبھری عمران کے قدموں کی رفتار تیز ہوگئی۔ لکڑی کے چھوٹے گیٹ کو عبور کرنے میں اسے زیادہ دقت پیش نہیں آئی تھی، لیکن وہ محسوس کرچکا تھا کہ کتے اس کے پیچھے آرہے

کتوں نے بھی گیٹ سے باہر چھلانگیں لگائیں اور اپنے شکار کی جانب دوڑے۔ عمران نے پلٹ کر دیکھا۔ چار سیاہ قد آور کتے خونخوار آنکھوں سے اسے دیکھتے ہوئے اس کا پیچھا کر رہے تھے۔ عمران نے دوڑنے میں زندگی کی بازی لگادی، لیکن کتے بہت زیادہ تربیت یافتہ تھے۔ ابھی وہ فارم ہاؤس کے سامنے پھیلی ہوئی پتھریلی زمین پر زیادہ دور نہیں گیا تھا کہ اچانک کتوں نے اس پر چھلانگیں لگائیں اور اسے دبوچ لیا۔ عمران نے حتی الامکان ہاتھ پاؤں مارے، لیکن کوئی ہتھیار اس کے پاس نہیں تھا۔ کتے خوفناک انداز میں اس کا بدن بھنبھوڑ رہے تھے، دیکھتے ہی دیکھتے انہوں نے عمران کی گردن چبا کر پھینک دی۔ تھوڑی دیر میں عمران کی روح پرواز کرگئی تھی۔ ادھر قید خانے کے محافظ دوڑ پڑے تھے۔ کتوں کو کھولنے کے بعد وہ مطمئن ہوجایا کرتے تھے، لیکن اس وقت انہیں صورتِ حال کا صحیح اندازہ ہوگیا تھا اور جب وہ لاٹھیاں اور کتوں کی زنجیریں اور پٹے لے کر قریب پہنچے تو کتے عمران کو چیر پھاڑ کر برابر کرچکے تھے۔ محافظوں کے پورے وجود میں سنسنی دوڑ گئی۔ بہرحال پہلے انہوں نے کتوں کو قابو کیا اس کے بعد چیتھڑوں کی شکل میں اس وجود کو دیکھا جس میں زندگی کی کوئی رمق باقی نہیں تھی۔ وہ لرز گئے اور بمشکل تمام اسے اٹھا کر اندر لے آئے۔ کتے ابھی پُرجوش تھے، انہیں کتا خانے میں بند کردیا گیا اور اس کے بعد غفورے کو اطلاع دی گئی۔ تھوڑی دیر کے بعد غفورا وہاں پہنچ گیا تھا۔ انتہائی خوفناک صورتِ حال کو دیکھ کر اس کے بھی اوسان خطا ہوگئے تھے۔ عمران کا خون میں ڈوبا ہوا بدن اور گوشت کے لوتھڑے بتا رہے تھے کہ غفورے کا مستقبل کیا ہے، لیکن اس واقعے کی اطلاع سائیں فیض بخش کو دینا بھی ضروری تھا۔ اطلاع ملتے ہی فیض بخش پہنچ گیا۔ اس نے فارم ہاؤس کے ایک مخصوص کمرے میں عمران کی لاش دیکھی اور اس کی آنکھیں بند ہوگئیں۔

''میرے خدا...... یہ تو بہت برا ہوا...... ہم یہ تو کبھی بھی نہیں چاہتے تھے ہم...... آہ...... قصور نہیں ہے''۔

''سائیں! محافظ بتاتے ہیں کہ اس نے دو آدمیوں کو بے ہوش کرکے یہاں سے فرار کی کوشش کی تھی''۔

''کتے کے بچو! تم لوگ اس قابل نہیں ہو کہ کسی شریف گھر میں نوکری کرسکو۔ تم سب یہاں سے اتنی دور نکل جاؤ کہ میری آنکھوں میں نہ آسکو۔ اگر تم میں سے ایک کی شکل بھی میں

نے دوبارہ دیکھ لی تو سمجھ لو یہیں کتے تم پر چھوڑ دوں گا۔ فوراً چلے جاؤ یہاں سے
تُو نے بھی خیال نہیں کیا"۔

"سائیں! سب کچھ سمجھا کر گیا تھا"۔

"لعنت ہے تجھ پر...... لعنت ہے"۔ فیض بخش سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ عمران کی موت
بے پناہ دکھ تھا۔ یہ تو واقعی اس نے نہیں چاہا تھا، بلکہ اگر سلطان بھی اس کے ہاتھ آجا
کی بھڑاس وہ ضرور نکال لیتا۔ اسے برا بھلا کہہ کر، گالیاں دے کر، یا تھپڑ مار کر لیکن ایا
بھی نہ کرتا اس کے ساتھ۔

غفورا اس کے سامنے تھا۔ چاروں طرف ہُو کا عالم طاری تھا۔ ملازم جا چکے تھے۔
رہا اور پھر اس نے غفورے سے کہا۔

"اب بول کیا کرنا چاہئے؟" غفورے سے خود کوئی جواب نہیں بن پڑ رہا تھا۔
آہستہ کہا۔

"سائیں، میں کیا بتاؤں"۔

"دیکھو ہم دشمنی ضرور کرنا چاہتے تھے، لیکن ہمارا اپنا ایک انداز تھا۔ بے شک ہ
تھا کہ تھوڑے دن کے بعد ہم ظفر محمود کو معاف کر دیتے"۔

"سائیں! میں آپ کو بالکل سچ بتا رہا ہوں...... آپ کو معلوم ہے، میرا بھائی وہا
کرتا ہے اور جس طرح میں آپ کا وفادار ہوں، اسی طرح وہ بھی ان لوگوں کا وفادار
بھائیوں کی حیثیت سے ہم لوگ کبھی کبھی آپس میں بات کر لیا کرتے ہیں۔ سائیں
بالکل یہ بات معلوم نہیں تھی کہ سلطان آپ کو کوئی نقصان پہنچانا چاہتا ہے اور اب ظفر
اپنے بیٹے کو تلاش کر رہا ہے"۔

"یہی تو افسوس ہے، اس کا ایک بیٹا ہماری وجہ سے بھاگ گیا۔ تھوڑا سا سخت
بھی تھا۔ اس نے ہمیں نقصان پہنچایا، لیکن شکر ہے کوئی جانی نقصان نہیں پہنچایا۔
ہاتھوں اس کے بیٹے کا خون ہو گیا۔ ذمے داری تو ہماری ہی ہے۔ اب یہ بتاؤ کر
ڈرتے نہیں ہیں غفورے! ہم ہر طرح کے برے حالات کے لئے تیار ہیں، لیکن
اچھی لگے گی کہ ظفر محمود اگر ہمارے مقابلے پر آیا تو اس سے یہ کہنا پڑے یا ہمیں
پڑے کہ ہم نے اس کا بیٹا مار دیا۔ لوگ تھوکیں گے ہمارے منہ پر ایسا تو نہیں کرنا

"سائیں! آپ بہت مہربان آدمی ہو، بہت برا ہوا ہے یہ"۔

"اب تم ایک کام کرو...... اس بچے کی لاش کی تدفین کرو، مگر اتنی ہوشیاری سے کہ
ہمارے علاوہ کسی اور کو پتہ نہ چلے۔ خود کہیں جاؤ گڑھا کھودو۔ یہاں فارم ہاؤس میں نہیں
بلکہ کچھ لوگ جانتے ہیں کہ وہ فارم ہاؤس میں لایا گیا ہوگا۔ کہیں اور لے جا کر اس کی تدفین
کردو اور اس کے بعد یہ مشہور کردو کہ یہ بھاگ گیا ہے یہاں سے...... بڑی چالاکی سے کام کرنا
ہوگا نہیں، بہت ہی چالاکی سے...... سمجھے؟ وہ بندے جو زخمی ہوئے ہیں نا، ابھی تک انہیں نہیں
معلوم کہ کیا ہو گیا ہے۔ باقی ان لوگوں کو جو یہاں موجود تھے، اگر نکل نہیں گئے ہیں تو کم از کم
سال بھر کے لئے قیدی بنا دو تاکہ ان کی زبانیں باہر نہ کھل سکیں۔ سمجھ رہے ہو نا تم؟ یہی ظاہر
کرنا ہے کہ یہ لڑکا یہاں سے فرار ہو گیا اور کہیں روپوش ہو گیا ہے۔ ان لوگوں کو بھی کم از کم تسلی
رہے گی کہ یہ زندہ تو ہے۔ جاؤ میں غم میں ڈوب گیا ہوں۔ بہت دکھ ہوا ہے مجھے اس کی موت
کا۔ غفور، یہ کام کر لو گے یا کوئی پریشانی ہوگی تمہیں؟"

"نہیں سائیں! آپ بالکل اطمینان رکھو۔ سب کچھ آپ کی مرضی کے مطابق ہوگا"۔
غفورے نے کہا۔

تمام مراحل سے گزرنے کے بعد غفورے نے سائیں فیض بخش کو اطلاع دی کہ کام ہو گیا
ہے۔

"اب تم ایک کام کرو غفورے! خود ادھر چلے جاؤ اور ایک بات میں تم سے کہوں کہ یہ
بات اپنے بھائی شکورے کو بھی نہیں بتانا۔ یہی تمہاری وفاداری کا تقاضا ہوگا"۔

"نہیں سائیں! آپ اطمینان رکھئے یہ بات میں نہیں بتاؤں گا"۔ لیکن پھر اس نے کسی
اور کے بجائے شکورے ہی کو اپنا رازدار بنایا تھا، اس نے شکورے سے کہا۔

"کیا عمران گھر واپس پہنچ گیا؟"

"کیا مطلب...... اسے رہا کر دیا تم لوگوں نے۔ میرا مطلب ہے سائیں فیض بخش نے؟"

"رہا نہیں کیا۔ دو بندوں کو زخمی کر کے بھاگ نکلا ہے وہ"۔

"کیا واقعی؟"

"ہاں"۔

"یہاں نہیں پہنچا"۔

''میں یہی معلوم کرنا چاہتا تھا''۔

''نہیں...... یہاں نہیں پہنچا''۔

''سائیں! فیض بخش نے پیغام بھیجا ہے۔ ظفر محمود کے لئے''۔

''مل لو ان سے''۔ شکورے نے کہا اور وہ مختلف مراحل سے گزر کر ظفر محمود کے پاس پہنچ گیا۔ اس نے اپنے تیور بدل لئے تھے۔

''سائیں! ہم آپ کے غلام ہیں۔ نوکر ہیں آپ بڑے لوگوں کے۔ ہم سے جو کہا جاتا ہے، ہم وہی کرتے ہیں۔ ہاتھ جوڑ کر آپ کے پاس آئے ہیں۔ ہمیں اپنے آپ سے الگ نہ سمجھیں۔ سائیں فیض بخش نے پیغام بھیجا ہے آپ کے لئے''۔

''اب کیا پیغام ہے؟'' ظفر محمود نے کہا۔

''سائیں عمران ظفر دو بندوں کو زخمی کر کے وہاں سے نکل آئے ہیں۔ نقصان پر نقصان ہو رہا ہے سائیں فیض بخش کا۔ سائیں! آپ نے اس سلسلے میں مدد کرنی ہے۔ عمران ظفر کو سائیں فیض بخش مانگتے ہیں۔ اگر وہ یہاں آئے ہیں تو آپ ہمیں بتا دیجئے۔ بات بڑے لوگوں کے درمیان ہی ہوگی لیکن ہم اطلاع دے دیں گے کہ سائیں عمران محمود یہاں آگئے ہیں''۔ ظفر محمود کے چہرے پر ایک لمحے کے لئے خوشی کے آثار نظر آئے۔ اس نے کہا۔

''فرار ہو گیا ہے وہ؟'' اور پھر ظفر محمود نے ایک زبردست قہقہہ لگایا۔

''وہ یہاں نہیں آیا۔ اور عقل کا تقاضا یہی ہے کہ وہ یہاں نہ آئے، لیکن سائیں فیض بخش سے کہہ دینا کہ ہوش کی دوا کرے۔ اگر میرے بیٹے اس کے خلاف برائی کرنے پر آمادہ ہو گئے تو میں انہیں نہیں روک سکوں گا۔ حالانکہ قصور میرا نہیں ہوگا، لیکن پھر بھی وہ میرے بیٹے ہیں۔ مجھے ہی قصوروار ٹھہرایا جائے گا۔ سائیں فیض بخش سے کہو کہ ابھی تک ہمارے درمیان خون کی دشمنی نہیں ہوئی۔ کسی نے کسی کا خون نہیں کیا۔ اس لئے اس بات کو خونریز تصادم تک نہ جانے دو۔ کیا سمجھے؟ میرا یہ پیغام دے دینا اور سائیں فیض بخش سے یہ بھی کہہ دینا کہ اب میرے کسی بیٹے کو ہاتھ لگانے کی کوشش کی تو جواب گولی سے دیا جائے گا''۔

''جو حکم سائیں''۔ غفورے نے دونوں ہاتھ جوڑ کر گردن جھکاتے ہوئے کہا اور وہاں سے واپس چلا گیا۔ لیکن ظفر محمود کے چہرے پر خوشی و غم دونوں کے ملے جلے تاثرات تھے۔ اپنی بیوی کو یہ خوشخبری سناتے ہوئے اس نے کہا۔

''جمیلہ! عمران ان کے چنگل سے نکل آیا ہے۔ سلطان کا کوئی پتہ نہیں چلا۔ اللہ کا فضل ہے میرے بیٹے زندہ تو ہیں۔ حالات نارمل ہو جائیں گے تو وہ یہاں آ جائیں گے۔ سائیں فیض بخش کو بہرحال میں اس بات کے لئے آمادہ کر ہی لوں گا کہ وہ غصہ تھوک دے اور اپنا رویہ تبدیل کرلے ہم سے، ہم ایک اچھے ہمسائے کی حیثیت سے اس کے ساتھ رہنا چاہتے ہیں''۔ ظفر محمود کی بیوی کی آنکھوں میں بھی خوشی کے آنسو چمک آئے تھے۔ اس نے دونوں ہاتھ پھیلا کر کہا۔

''یا اللہ! بڑی محنت سے پروان چڑھایا ہے ہم نے انہیں۔ ہمیں کسی مشکل میں نہ ڈال، حالات ٹھیک ہو جائیں، یہی خوشی کی بات ہے کہ وہ دونوں سائیں فیض بخش کے چنگل سے نکل گئے ہیں''۔ اس نے یہ دعا مانگ کر چہرے پر ہاتھ پھیرے، لیکن بدنصیب عورت کو نہیں معلوم تھا کہ اس کے دل پر ایک گہرا داغ نقش ہو چکا ہے۔

❁ ❁ ❁

آخرکار قافلہ شہری آبادی میں داخل ہو گیا اور یہاں داخل ہوتے ہی قافلے کے سالار نے کہا کہ سلطان یہاں اتر جائے۔ سلطان کے دل میں عجیب و غریب خیالات تھے۔ کھوئے کھوئے انداز میں وہ نیچے اتر گیا۔ اسے اس بات پر بھی حیرت تھی کہ سالار نے اس کے ہمسفر کے بارے میں کچھ نہیں پوچھا تھا۔ بہرحال اونٹ وہاں سے چلے گئے...... سامنے ہی ایک مکان نظر آ رہا تھا۔ کچھ ایسی ذہنی تھکن سوار تھی سلطان پر کہ اس کے قدم اس مکان کی جانب اٹھ گئے۔ اس نے سوچا کہ مکان کے مکین سے تھوڑے سے آرام کے لئے درخواست کرے گا اور عارضی طور پر پُرسکون کر کے پھر یہاں سے آگے بڑھے گا۔ اس نے اس چھوٹے سے مکان کے دروازے کی بیل بجائی، اندر قدموں کی چاپ سنائی دی دروازہ کھل گیا، سلطان نے نہایت ادب سے گردن جھکا کر کہا۔

''جناب والا! آپ اس بات پر ہنسیں گے تو سہی کہ میں اپنے آپ کو فقیر نہ کہہ کر بھی آپ سے کچھ مانگنا چاہتا ہوں۔ اصل میں، میں ایک تھکا ہوا مسافر ہوں۔ اگر تھوڑی دیر کے لئے مجھے کہیں پناہ دے دیں تو آپ کا شکرگزار رہوں گا''۔

''اندر تشریف لے آئیے''۔

اندر والے شخص نے کہا اور سلطان کی نگاہیں اس کی جانب اٹھ گئیں۔ یہ آواز اسے شناسا محسوس

ہوئی تھی اور پھر جب اس نے اس شخص کا چہرہ دیکھا تو اس کے سارے وجود میں سنـ
گئے۔ ایک عجیب سی تھرتھری اس کے وجود میں نمودار ہوئی۔ یہ شخص پروفیسر سومن تھا جو
سے وہ نہ جانے کیسی کیسی خواریوں کا شکار ہوا تھا۔ پروفیسر سومن نے پھر مسکراتے ہوئے کہا
''اندر تشریف لے آئیے'' اور سلطان کے قدم خود بخود آگے بڑھ گئے۔

پروفیسر سومن نے اس کے اندر داخل ہونے کے بعد دروازہ بند کیا اور اسے ساتھ لـ
پڑا۔ ایک کمرے میں ایک آرام دہ بستر لگا ہوا تھا۔ سامنے ہی غسل خانہ نظر آ رہا تھا۔ اس نے
''آپ کے چہرے سے تھکن ظاہر ہو رہی ہے۔ وہ غسل خانہ ہے اور یہ بستر۔ اگر
آرام کر لیجئے اور مجھے یہ بتائیے کہ میں آپ کی کیا خدمت کروں؟'' سلطان اپنی کیفیت پر قابو
پانے میں مصروف تھا اور کافی حد تک اس میں کامیاب ہو چکا تھا۔ اس نے کہا:

''پروفیسر سومن! جو کچھ میرے ساتھ ہوا ہے، کیا آپ اعتراف کریں گے کہ وہ
صرف اور صرف آپ کی ذات سے ہے؟''

''ہاں...... لیکن اس وقت تمہیں مجھ سے کوئی خطرہ نہیں۔ اپنے آپ کو پرسکون کر
کے بعد جب اپنے آپ کو اس قابل پاؤ کہ مجھ سے بات کر سکو تو بات کرنا۔ ان میں
بھی بات تمہارے مفاد کے خلاف نہیں ہوگی''۔

سلطان نے سوچا کہ اب یہاں آ تو گیا ہی ہے۔ پروفیسر سومن سے بھی د
ہو جائیں، چنانچہ اس نے گردن خم کر کے کہا۔

''ٹھیک ہے۔ بھلا اب کسی تھکن کا کیا خیال۔ آپ مل گئے ہیں تو میں سمجھتا ہوں
سے گفتگو میری زندگی کا سب سے اولین مقصد ہے''۔

''میں تیار ہوں...... تم ایسا کرو غسل کر لو۔ اس کے بعد آرام سے انتظار
تمہارے لئے کچھ کھانے پینے کی چیزیں لے کر آتا ہوں''۔

غسل سے طبیعت بے حد فرحت انگیز ہو گئی تھی۔ وہ اپنا پرانا لباس پہنے ہوئے
کافی کی سوندھی سوندھی خوشبو فضاء میں اٹھ رہی تھی۔ ایک ٹرالی میں عمدہ قسم کے سینڈ
بسکٹ وغیرہ رکھے ہوئے تھے اور اس میں چائے کے برتن بھی موجود تھے۔ اسے با
پروفیسر سومن نے پیالیوں میں کافی انڈیلنا شروع کر دی تھی۔ کافی کے گھونٹ لیتے
نے کہا۔

میں ایک ہپناٹسٹ ہوں۔ اپنی زندگی میں لاتعداد تجربات کرتا رہا ہوں۔ ایک طویل
ترین تجربات میں گزارنے کے بعد جب وقت نے مجھے احساس دلایا کہ میں زوال
تو میرے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ اپنا فن کسی کو دے دوں۔ ایک ایسے شاگرد
تھی مجھے جو میرے اس فن کو سنبھالے۔ بہت سے لوگوں کو میں نے اس نگاہ سے دیکھا
مضبوط قوتِ ارادی کا مالک شخص اور ایک طاقتور ذہن، مجھے تمہارے اندر نظر آیا۔ میں
سفر ایک عام سی بات تھی، لیکن تمہیں دیکھنے کے بعد یہ خیال میرے دل میں پیدا ہوا
تم پر تجربات کروں اور یہ دیکھوں کہ تم شاگردی کے قابل ہو یا نہیں۔ میرے دوست!
تمہیں ہر طرح سے مکمل پایا۔ میں نے تمہارے ذہن کو مختلف الجھنوں کا شکار کیا۔
تخیلات حسین ترین عورتوں کی شکل میں تمہارے پاس پہنچے، لیکن تم نے اپنی قوتِ ارادی
لے کر ان میں سے کسی کو اپنی ہوس کی بھینٹ نہیں چڑھانا چاہا، ورنہ عموماً کسی حسین
صورت کے حصول کا تصور یہی شکل رکھتا ہے کہ اس پر قابو پا لیا جائے اور اپنی ضرورتوں کی
کر لی جائے۔ تم ایسے نہیں تھے۔ ایک عظیم ہپناٹسٹ کو تمہاری جیسی شخصیت کا مالک ہونا
ہے، میں نے تمہارا انتخاب کر لیا۔ یوں سمجھ لو، تم مسلسل میرے ہی راستوں پر سفر کر رہے ہو
اس وقت میری طلب پر یہاں موجود ہو''۔

سلطان پر حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ رہے تھے۔ اچانک اس کے اندر ایک دلچسپی ابھر آئی
وہ خود کو عظیم سمجھتا تھا اور عظیم بننا چاہتا تھا اور بھلا اس سے بہتر موقع اسے اور کہاں مل سکتا
چنانچہ ایک دم اس کا رویہ نرم ہو گیا اور اس نے کہا۔

''حقیقت یہ ہے پروفیسر سومن! کہ آپ کے لئے میرے دل میں اختلاف تھا، لیکن جو
تجربات آپ نے کئے ہیں، ان کے تحت میں یہ سمجھتا ہوں کہ یہ میری تقدیر تھی جو مجھے آپ
تک لے آئی ہے''۔

''اس کا مطلب ہے کہ تم خوشی سے میری شاگردی قبول کرتے ہو؟''

''جی، ویسے ہپناٹزم کے بارے میں آپ کچھ تفصیلات بتائیں گے؟''

''ہاں...... اب جبکہ تم اس پر آمادہ ہو گئے ہو تو میں تمہیں اس بارے میں ضرور بتانا پسند
کروں گا''۔

''میں واقعی دلچسپی سے یہ بات معلوم کرنا چاہتا ہوں''۔

''کیوں نہیں، میں تمہیں بتاؤں کہ خونِ جگر اگر پتھر میں بھی ڈالا جائے تو پتھر بھی دھ
لگے گا اور یہ بات تو تم جانتے ہو کہ انسانی دماغ ایک عظیم طاقت ہے۔ ہپناٹزم ایک ایسا ف
جس سے انسان کی توجہ کو صرف ایک طرف لگا کر ایسی کیفیت پیدا کی جاتی ہے جو ای
مراقبہ ہوتی ہے اور ہپناٹزم کا معمول اسی ذہنی یکسوئی کی وجہ سے اپنے عامل کے ہر حکم پ
کرتا ہے۔ ہم اس سلسلے میں بے شمار افراد کا نام لے سکتے ہیں جس سے بہت سی وضا
ہوسکتی ہیں۔ مثلاً اگر ہم جے لوئی آرٹن کی لکھی ہوئی کتاب کے نظریئے کے مطابق بات
ہیں تو ہپناٹزم اس آرٹ اور سائنس کا نام ہے جو توجہ کی صحیح ٹریننگ کر کے اسے صحیح استعما
قابل بناتی ہے۔ ہپناٹزم کے علمی حصے کو سائنس اور عملی حصے کو آرٹ کہا جاتا ہے۔ یہ بات
الیگزینڈر کینن کہتا ہے۔ ہم ہپناٹزم کے ذریعے ''معمول'' میں پاگل پن اور وہم پیدا
ہیں۔ اس سلسلے میں ایس جے وانٹ پیلٹ کہتا ہے کہ ہپناٹزم ایک ایسی سائنس ہے جس
ہم اعلیٰ ذہنی یکسوئی پیدا کر سکتے ہیں۔ ویسے ہپناٹزم کا لفظ نیند سے نکلا ہے۔ ہپنائس کا
ہے نیند مگر ہپنائس کو نیند نہیں کہا جاسکتا، کیونکہ نیند میں کوئی بات سنائی نہیں دیتی۔ اگ
سوتے ہوئے شخص سے بات کرنا چاہے تو وہ نہیں سن سکے گا۔ چاہے بات کرنے والا اس
قریب ہی کیوں نہ کھڑا ہو۔ میں اس کی تمام تفصیلات بتاتا ہوں لیکن اس سے پہلے میں
یہ بتاؤں کہ ہپناٹزم کی تاریخ بہت وسیع ہے۔ کوئی ایک شخص اسے اپنے نام سے منسوب
کر سکا۔ مختلف لوگوں نے مختلف طرح کے دعوے کئے، لیکن یہ دعوے بے مقصد ہیں اور
یا مسمریزم ایک بہت ہی عام چیز ہے، بشرطیکہ اسے اپنے طریقے سے حاصل کر لیا جائے۔
اپنے آپ سے منسوب کرنے والوں میں مسمر سب سے بڑی روایتی کیفیت رکھتا ہے۔ اس
ہپناٹزم کو مسمریزم کا نام دے کر اسے اپنی جانب منتقل کرنے کی کوشش کی، حالانکہ ہپنا
مسمریزم بہت قدیم چیز ہے۔ اگر تاریخ کا بغور مشاہدہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ہپنا
مسمریزم کی تاریخ اس زمانے میں بھی تھی جسے ہم جہالت کا زمانہ کہتے ہیں۔ جاہل اور
اقوام خالدیہ، قبائل قصبیہ اور عبرانی قوم مسمریزم سے علاج کیا کرتی تھیں۔ پہلے جڑی
سے علاج کے ساتھ ساتھ لوگ مسمریزم کے عالموں سے بھی رجوع کیا کرتے تھے۔ اس
قدیم کتابوں سے ملتا ہے۔ مصر میں بھی مسمریزم کا رواج تھا، چنانچہ ایک مؤرخ سلی وا
ہے کہ بعض لوگ مریضوں کو چھونے یا پھونک مارنے سے صحت مند کر دیتے تھے۔

جو یونان کا حکیم ہے، اسے خفیہ علاج کہتا ہے، وہ لکھتا ہے کہ یونان کے اکثر حکیم مریض
حصے کو جس میں درد ہوتا تھا، ہاتھوں سے ملتے تھے جس سے درد دور ہو جاتا تھا۔ یہ ایک
سلسلہ ہے جس کی تاریخ نہ جانے کہاں سے کہاں تک ملتی ہے۔ بس یوں سمجھ لو کہ
ریزم یا ہپناٹزم پر بے شمار تجربات ہوئے اور صورتِ حال وہیں تک پہنچی کہ انسانی دماغ کے
میں معلومات حاصل کر لو، کیونکہ انسانی جسم کو کنٹرول کرنے والا حصہ سر میں ہی واقع
دماغ کے کچھ اجزاء مفلوج ہو جائیں تو دیوانگی کا آغاز ہو جاتا ہے اور اگر دماغ زیادہ
ہو تو وہ اپنی دماغی قوت کو تیز کرتے ہیں اور یہ بات تو دنیا کا ہر شخص جانتا ہے کہ خیال کی
روشنی اور آواز کی رفتار سے زیادہ تیز ہوتی ہے اور خیال حواسِ خمسہ سے وجود میں آتا ہے۔
نے کوئی چیز دیکھی، وہ شے تمہیں خوبصورت لگی اور تم اس میں کھو گئے۔ خیال کیسے پیدا ہوا؟
ہے آنکھوں نے اس چیز کا مشاہدہ کیا اور اسے خیال کی جانب منتقل کر دیا۔ جس طرح ایک
عدسے سے شعاعیں گزر جاتی ہیں اور پھر اکٹھی ہو کر ایک جگہ پڑتی ہیں تو وہ کپڑا جل
تا ہے، انسان کے ذہن سے ہر وقت لہریں نکلتی رہتی ہیں، جس انسان کا ذہن زیادہ طاقتور
اس کے خیالات کی رو بھی طاقتور ہوگی اور وہ جس چیز کا خیال کرے گا، اس کی شبیہہ فوراً
آنکھوں میں گھوم جائے گی۔ انسان کا اعلیٰ ترین دماغ ہتھیار کی حیثیت رکھتا ہے اور اس
خارج ہونے والی لہریں جس چیز پر پڑیں گی، اسے متاثر کر لیں گی تو ہپناٹزم کی ابتدائی
ہے۔ تم کسی کو بھی سجیشن دے کر اسے اپنی مرضی کا عمل کرنے پر مجبور کر سکتے ہو۔ یہ تمہاری
کہی جائے گی، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس سے تم بہت کام لے سکتے ہو۔ اب اگر تم ذہنی
اس قدر طاقتور نہ ہوتے تو یقین کرو صرف معمول ہوتے جیسا کہ میں نے تمہارے ساتھ
لیکن تم اپنی دانش سے اپنے آپ کو بچاتے رہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے میں تم سے سمجھوتہ اور
کرنے پر مجبور ہوں''۔

سلطان کے ذہن میں تیز ہوائیں چل رہی تھیں۔ اسے اندازہ ہو گیا کہ اگر یہ قوت
کر لی جائے تو پھر اس کی عظمت میں کوئی مضائقہ نہیں رہے گا، کوئی کمی نہیں رہے گی۔
نے عاجزی سے کہا۔

''حقیقت یہ ہے پروفیسر سومن! کہ اس سے پہلے جو حالات میرے علم میں آئے، میں
بدظن ہو چکا تھا، لیکن اب مجھے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ میری تقدیر مجھے آپ تک لے آئی

ہے اور یقیناً میری تقدیر نے مجھے سہارا دیا ہے''۔

''تو یہ گھر تمہارے لئے حاضر ہے۔ یہاں میں تمہیں اپنے سارے عمل کی مشق کراؤں گا''۔

''ٹھیک ہے پروفیسر سومن! میں حاضر ہوں''۔

ہپناٹزم کے عمل کا آغاز ہوگیا۔ آنکھوں کو یکسوئی کی قوت دینے کے لئے شمع بینی کا عمل
کا ابتدائی حصہ تھا۔ رات کی تاریکی میں شمع روشن کرکے اس پر نگاہیں جمائے رکھنا۔ نہ جانے
کتنے دن تک آنکھوں کو یہ قوت دی گئی اور اس طرح دماغ کی صلاحیتیں بڑھنے لگیں۔ پھر
سے بات سورج تک پہنچ گئی اور تیز روشن سورج کی چمک کو اپنی آنکھوں میں جذب کرنے کا
عمل بے شمار دنوں تک جاری رہا۔ پروفیسر سومن اس کا استاد تھا اور اسے مختلف طریقوں سے
بینی اور ہپناٹزم کے عمل سے آگاہ کررہا تھا۔ بوڑھے پروفیسر نے بھی اپنے تمام معمولات ترک
کردیئے تھے۔ بات اصل میں وہی آجاتی ہے کہ تقدیر نہ جانے کس کس طرح انسانی زندگی
اس کے متعین کردہ راستوں پر چلاکر اس جگہ تک لاتی ہے، جہاں سے واقعات جنم لیتے ہیں
پروفیسر سومن کی اس سے صرف اتنی ہی دلچسپی تھی کہ وہ اسے اپنا علم دے دے۔ اب یہ تو
ہی جانتا ہے کہ اس کے پس منظر میں کیا تھا۔ پھر جب پہلا تجربہ پروفیسر سومن کی ہدایت پر
گیا تو پروفیسر سومن نے خوش ہوکر اسے مبارک باد دی۔

''بس..... اس کے بعد سیکھنے کا عمل ختم ہوجاتا ہے۔ ویسے تو علم ایک سمندر ہے اور اس
کو دماغ میں بند کرنا بھلا ممکن ہی کیسے ہے۔ جو کچھ تمہیں حاصل ہوگیا ہے، اسے استعمال کرو
مجھے خوشی ہے کہ میں اپنا ایک ہونہار شاگرد چھوڑے جارہا ہوں۔ اب تمہیں آخری عمل کرنا
جو میری اولین خواہش ہے اور اس کے بعد پروفیسر سومن نے جس عجیب وغریب خواہش کا
اظہار کیا جس نے سلطان کو ہلاکر رکھ دیا، اس نے کہا۔

''اصل میں، میں نے زندگی میں کیا اچھا کیا ہے، کیا برا؟ یہ میں نہیں جانتا لیکن میرا
تمام تر مطالعے اور میری تمام تر معلومات اس بات کا اظہار کرتی ہیں کہ موت ایک بے
تکلیف دہ عمل ہے اور اس عمل سے گزرنے کی سکت میں اپنے آپ میں نہیں پاتا۔ تمہیں
موت کا عمل مکمل کرنا ہے''۔

''جی..... میں سمجھا نہیں''۔ سلطان نے حیرت سے کہا۔

''ایک عامل کی حیثیت سے مجھے حکم دو کہ میں اپنا سینہ سانسوں سے خالی کردوں

بھی زندگی میں واپس نہ آؤں۔ خبردار! اس سلسلے میں نہ تو ہچکچاہٹ کا اظہار کرنا اور نہ
کرنا۔ یہ اپنے دوست کو تمہارا خراجِ عقیدت ہوگا''۔ یہ عمل انتہائی حیران کن تھا، جب
نے پروفیسر سومن کو مرجانے کا حکم دیا اور تھوڑی دیر کے بعد اس کا جسم زندگی سے خالی
پھر اس کے بعد بھلا یمن میں رکنا کیا معنی رکھتا تھا۔ سلطان اب اپنے اندر بے پناہ
پارہا تھا۔ جب اپنے طاقت ور استاد کو اس نے موت کی نیند سلادیا تھا تو بھلا دوسرے کیا
رکھتے تھے۔ چنانچہ جب وہ ایئرپورٹ پہنچا تو اس کے پاس ایک چھوٹا سا سوٹ کیس
میں چند جوڑے کپڑے کے علاوہ اور کچھ نہیں تھا اور تھوڑی سی کرنسی تھی۔ وہاں اس نے
ضرورت کے لوگوں کو یہ یقین دلایا کہ وہ ایک معزز مسافر ہے اور جہاز میں بھی عملے کے
نے اس کے لئے فرسٹ کلاس میں اعلیٰ درجے کی سیٹ مہیا کی اور یہ سارا عمل نہایت
سے ہوگیا تھا۔ صرف متعلقہ افراد کی آنکھوں کو دیکھنا پڑا تھا۔

نہ جانے کتنا عرصہ یمن میں گزارنے کے بعد وہ اپنے وطن واپس پہنچا تھا۔ کراچی کے
کی ایئرپورٹ پر اترنے کے بعد وہ ایک نظر نہ آنے والی شخصیت کے سے انداز میں
پورٹ سے باہر نکل آیا تھا اور ایک پرائیویٹ کار میں جو ایک ہوٹل کی ملکیت تھی، بیٹھ کر چل
اب ہر مسئلے میں فوراً ہی اپنی قوتوں کا استعمال کرنا ہلکے پن کی علامت تھا، چنانچہ اس
ہوٹل میں کمرہ حاصل کرتے ہوئے اپنے پاس موجود ڈالروں سے کام لیا اور اعلیٰ درجے
ہوٹل کے ایک کمرے میں منتقل ہوگیا۔ گویا زندگی کے جس سفر کا آغاز اس نے اپنی خواہش
پر کیا تھا، اب وہ تکمیل تک پہنچ گیا تھا اور اب اس سے آگے کی کہانی رقم کرنی ہوگی۔

اس عالی شان ہوٹل کے کمرے میں پہنچنے کے بعد اس نے اپنے لئے منصوبہ بندی کی۔
سے پہلے اپنے پاس موجود کرنسی کے ایک چھوٹے سے حصے سے اعلیٰ درجے کے لباس
۔ اعلیٰ درجے کے ہوٹل میں ان تمام چیزوں کی ضرورت تھی۔ پھر اس نے اپنے
عمل کا آغاز کردیا۔ سب سے پہلے اس نے معلومات حاصل کرنے کے بعد ایک ذریعہ
پا اور ریس کورس پہنچ گیا۔ یہ وہ جگہ ہے جہاں لوگ اپنی خوشی سے قلاش ہونے کے لئے
تھا اور وہ جو اپنی خوشی سے قلاش ہونا چاہتے ہیں، ان کے ساتھ کوئی بھی عمل غیر مناسب
تھا۔ البتہ طویل عرصے کے بعد اپنے ہم وطنوں کو دیکھ کر سلطان کو ایک خوشی کا احساس
بہرحال پہلی ریس کا آغاز ہوا اور ان کی بکنگ ہونے لگی۔ سلطان نے اجنبی نگاہوں

سے ریس کے گھوڑوں کو دیکھا اور ایک گھوڑا منتخب کر کے اپنے پاس موجود تمام رقم لگادی۔ پھر جب پہلی ریس کا آغاز ہوا تو اس نے اس گھوڑے پر نگاہیں جمادیں، جس نے رقم لگائی تھی۔ یہ گھوڑا غالباً فیورٹ نہیں تھا۔ چنانچہ اس کے بھاؤ بھی زیادہ تھے اسٹارٹنگ پوسٹ سے آگے نکلا۔ پہلا راؤنڈ طے کیا۔ دوسرا موڑ کاٹا اور اس کے بعد جیسے اس میں برقی قوت بھر گئی ہو۔ سلطان کی نگاہیں اس کے سر پر تھیں اور اس کا پورا بن گیا تھا۔ حیرت کی چیخیں نکلنے لگیں اور تھوڑی دیر کے بعد وہ گھوڑا اول نمبر پر آ گیا۔

گھڑ ریس جیتنے کے بعد سلطان کے پاس نوٹوں کا انبار لگ گیا تھا۔ تیسری، پانچویں ریس بھی اس نے جیتی۔ دوسری ریس جان بوجھ کر چھوڑ دی تھی۔ بے شمار نگاہیں طواف کرنے لگیں تو سلطان ریس کورس سے باہر نکل آیا۔ وہ جانتا تھا کہ ایسے لمحات بھی ہو سکتے ہیں۔ دوسرے دن اس نے اپنی ساری رقم بینک میں جمع کرادی۔ ابھی تک قابلِ ذکر واقعہ پیش نہیں آیا تھا، سوائے اس کے کہ اس نے پروفیسر سومن کے تجربات پر آزمائے تھے۔ کوئی انسان ابھی تک اس کے راستے میں رکاوٹ نہیں بنا تھا۔ بہرحال آسان ذریعہ تھا، لیکن ریس کورس میں ساتویں بار جب وہ داخل ہوا تو دو افراد جو کھڑے ہوئے تھے، اس کے اردگرد آ کھڑے ہوئے۔

"جناب عالی! آپ کو تھوڑی سی زحمت دیں گے۔ آپ براہِ کرم ہمارے ساتھ لائیے"۔

"کون ہیں آپ لوگ اور کیا زحمت دینا چاہتے ہیں؟"

"یہ ذرا ہمارے ہاتھوں کی طرف دیکھ لیجئے"۔ ان میں سے ایک نے کہا۔ ان پر ایک رومال سا پڑا ہوا تھا اور رومال کے نیچے سے ریوالور کی نال جھانک رہی تھی۔ نے سرد نگاہوں سے اسے دیکھا اور بولا۔

"مطلب کیا ہے اس بات کا؟"

"مطلب ہم نہیں کوئی اور آپ کو بتانا چاہتا ہے"۔ ریس کورس آفس میں جس شخص اس سے ملاقات کی وہ شاندار شخصیت کا مالک تھا۔ اس نے بڑے پُرتپاک انداز میں سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔

پچھلے کچھ عرصے سے ہم لوگوں کے درمیان بڑی بے چینی پھیلی ہوئی ہے

چاہتے ہیں کہ وہ کون سا ذریعہ ہے کہ جس گھوڑے پر آپ رقم لگاتے ہیں، وہ جیت جاتا ہے۔ معاف کیجئے گا بغیر کسی تعارف کے یہ براہِ راست سوال ذرا کچھ غیر مہذب ہے، لیکن جس ماحول میں ہم اور آپ ہیں، وہاں تہذیب کا زیادہ خیال نہیں رکھا جاتا"۔

"آپ ہیں کون؟ اب اپنے بارے میں بتادیجئے"۔

"بس ان لوگوں میں سے ایک ہوں بلکہ اس آرگنائزیشن کا صدر ہوں جس کے گھوڑے ریس میں دوڑتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ پچھلے کافی عرصے سے آپ ریس کورس سے ایک بڑی رقم باہر لے جاتے ہیں۔ ہم نے آپ کے ساتھ کوئی سخت سلوک نہیں کیا، لیکن پھر بھی اب مجبوری ہے کہ آپ کو اس معاملے میں زحمت دی جائے۔ کیا آپ ہم سے تعاون کرنا پسند کریں گے؟"

"نہ کروں تو؟"

"تو یہ دروازہ اندر آنے کے لئے تو کھلا ہوتا ہے باہر جانے کے لئے نہیں اور یہاں پر ایک ایسی جگہ بھی موجود ہے جہاں دو، چار انسانی جسموں کو خاموشی سے ٹھکانے لگا دینا کوئی مشکل کام نہیں ہوتا"۔

سلطان ہنسنے لگا، پھر اس نے کہا۔

"آج کی ریس میں اگر میں گھوڑے کی جگہ آپ کو دوڑا دوں تو کیسا رہے گا؟"

"مطلب؟"

"مطلب یہ کہ آج کی ریس میں آپ گھوڑوں کے پیچھے پیچھے دوڑیں گے۔ آپ اس آرگنائزیشن کے چیئرمین ہیں نا۔ کیسا لگے گا اور دوستو! یہ پستول جو تمہارے ہاتھ میں ہیں، ان کا رخ تمہاری اپنی طرف بھی ہو سکتا ہے۔ ہو کیا سکتا ہے بلکہ ہو جانا چاہئے"۔ سلطان نے مخصوص لہجے میں کہا اور دونوں ریوالور جو ان لوگوں کے ہاتھ میں تھے ان کی سمت گھوم گئے۔ ان کی انگلیاں ٹرائیگر پر تھیں اور وہ دہشت سے کانپ رہے تھے۔ یہ ایک دلچسپ تجربہ تھا۔ بات اصل میں یہ تھی کہ پروفیسر سومن بھی اس ضمن میں نت نئے اور انوکھے تجربات کرتا تھا اور یہ تجربات اسپانیہ اور نیلاب کی شکل میں سلطان کے سامنے آچکے تھے، سہیل کی شکل میں اور حما کی شکل میں یہ تمام تجربات اسے ہو چکے تھے۔ زمرد بھی سامنے آئی تھی۔ سب کے سب خیالی بت تھے۔ چنانچہ یہ بھی ایک دلچسپ تجربہ تھا کہ وہ لوگ خود کچھ نہیں کر رہے تھے، بلکہ لوہے کے

بے جان ٹکڑے ان کی جانب مڑ گئے تھے اور لمحوں میں انہیں زندگی سے محروم کرنے والے تھے۔ سلطان نے ہنس کر کہا:

''اگر میں تمہیں حکم دوں گا کہ اپنی انگلیاں ٹرائیگر پر دبادو تو پھر میرے الفاظ کا مزہ نہیں رہے گا۔ چنانچہ تم اپنے چیئرمین کو گھوڑ دوڑ کے میدان میں دوڑتے دیکھو گے؟''

یہی ہوا ریس شروع ہوئی تو نہ جانے کہاں سے وہ شخص ریس کے میدان میں داخل ہوگیا۔ گھوڑے دوڑے تو وہ ان کے پیچھے ہاتھوں اور پیروں کے بل دوڑنے لگا۔ شاندار سوٹ میں ملبوس لٹکتی ہوئی ٹائی۔ قہقہوں سے پورا میدان گونج اٹھا تھا اور وہ دونوں جو اپنے باس کے معمولی سے کارکن تھے۔ شدتِ حیرت سے آنکھیں پھاڑے اپنے باس کو دوڑتے ہوئے دیکھ رہے تھے اور وہ جس نے انہیں یہ منظر دیکھنے کی دعوت دی تھی، روپوش تھا۔ سلطان نے اپنا عمل تو مکمل کردیا تھا، لیکن بہرحال اسے دشمنیاں قبول نہیں تھیں، کیونکہ وہ جانتا تھا کہ پہلے بھی وہ پولیس کو مطلوب رہا ہوگا۔ گو انتہائی وقت گزر چکا تھا اور یقیناً اس کی فائل اب بند کردی گئی ہوگی لیکن پھر بھی اس کا احتمال تھا کہ پولیس کے ریکارڈ میں اس کا کیس موجود ہو۔ کتنی ہی بار اس کا دل چاہا تھا کہ وہ سکھر جائے اپنے گھربار کے بارے میں معلومات حاصل کرے، لیکن ایک نظریہ تھا اس کا اور اتفاق کی بات یہ تھی کہ وقت نے اس نظریئے کی تکمیل کردی تھی اور وہ اپنا مقام حاصل کرنے میں کامیاب ہوگیا تھا، لیکن اس طرح سے نہیں۔ ابھی تک بہت سی شخصیتیں اس کے راستے میں آئی تھیں۔ ریس میں اسے جیتتے دیکھ کر بڑے بڑے لوگوں نے اس تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کی تھی لیکن سلطان نے ابھی کسی کو اپنے قریب لانے کی کوشش نہیں کی تھی، البتہ اس نے یہ فیصلہ ضرور کیا کہ اب اس کے پاس جس قدر رقم جمع ہوچکی ہے وہ اتنی ہے کہ وہ شاندار زندگی کا آغاز کرسکتا ہے اور بات صرف ریس کورس تک ہی تو محدود نہیں، ابھی تو اور بھی راستے پڑے ہیں۔ جہاں تک اس کی اپنی معلومات کام کرتی تھیں، وہ کوششیں کررہا تھا اور اس کے بعد اس نے دوسرے منصوبوں کا آغاز کردیا۔ اس کا قیام ایک شاندار ہوٹل میں تھا اور اس ہوٹل میں وہ انتہائی باعزت شخصیت تصور کیا جاتا تھا۔ ہوٹل کا عملہ اور اس کے شناسا اس کا احترام کرتے تھے۔ بہت کم لوگوں سے اس نے شناسائی کی تھی اور اب وہ تمام کردار جو خیالی تھے اور خیالی حسن تو واقعی باکمال ہی ہوتا ہے، چاہے اسے نزاکتوں

کسی بھی منزل پر پہنچادیا جائے۔ چنانچہ حقیقت صرف ایک تھی، یعنی مہرالنساء جسے وہ کہہ کر آیا تھا کہ صرف دس سال اس کے انتظار میں گزار دے اور ابھی اس میں خاصا وقت باقی تھا، لیکن اسے یہ بات معلوم نہیں تھی کہ وہ ہوچکا ہے جس کے لئے وہ کچھ کہہ کر آیا تھا۔

سائیں فیض بخش، عمران محمود کی موت کے بعد کچھ اس طرح دل گرفتہ ہوگیا تھا کہ اس نے ظفر محمود سے دشمنی کا تصور بھی ترک کردیا تھا۔ یہاں اس کی نیک فطرت ابھر آئی تھی، اس کے ہاتھوں ایک انسان کا خون ہوگیا تھا اور وہ بھی انتہائی بدترین حالات میں۔ دوسرا لڑکا ظفر محمود کے ہاتھوں سے اس طرح نکل گیا تھا۔ سائیں فیض بخش خود بھی صاحب اولاد تھا اور اندر سے برا انسان نہیں تھا۔ گویہ عمل کا ردِعمل تھا، لیکن نشانہ ایک بے گناہ شخصیت بنی تھی۔ اس نے خود اسی جگہ جہاں اس کی حویلی جلی تھی، اپنی حویلی تعمیر کرائی اور اس کے بعد اس کے کسی بھی آدمی نے ظفر محمود کو کوئی تکلیف پہنچانے کی کوشش نہیں کی بلکہ وہ خود بھی دو تین بار ظفر محمود کے پاس گیا۔ ظفر محمود بیمار رہنے لگا تھا۔ بیٹے کی جدائی اس کے لئے ایک شدید صدمہ بن گئی تھی۔ اس کی بیوی بھی غمزدہ تھی۔ باقی بیٹے آہستہ آہستہ اس کی ذمے داریاں سنبھالتے جارہے تھے اور اب تو وقت بھی بے پناہ گزر چکا تھا۔ ظفر محمود نے ایک دن اپنی بیوی سے کہا۔

''بیٹوں کا تو کوئی مسئلہ نہیں...... اللہ تعالیٰ نے انہیں کوئی بیٹی نہیں دی۔ بیٹوں کی شادیاں بھی آہستہ آہستہ کرلی جائیں گی، لیکن بڑے بھائی کی بیٹی جوان کی اپنی ذمہ داری ہے، اس سے اگر سبکدوش ہوجائیں تو بہت اچھا ہو۔ مہرالنساء کے لئے لڑکا ذہن میں ہے۔ ایک بار سلطان کے ہاتھوں حسان کو تکلیف پہنچی تھی اور اس وقت سے بھائی شاہد مسعود کے دل میں میرے لئے بال پڑگیا ہے اور وہ تھوڑے سے کھنچ گئے ہیں لیکن میں اب اگر حسان کے لئے بات کروں تو ہوسکتا ہے وہ تیار ہوجائیں۔ بہرحال کوشش کرلینے میں کوئی ہرج نہیں۔ چنانچہ ظفر محمود، شاہد کے پاس کراچی پہنچ گیا۔ اس نے شاہد مسعود سے کہا کہ کئی سال سے وہ محسوس کررہا ہے کہ وہ کھچا ہوا ہے، لیکن اسے اچھی طرح معلوم ہے کہ اب وہ سلطان سے بالکل محروم ہوچکا ہے۔ قصور اس کا نہیں تھا بلکہ سلطان کا تھا جس نے حسان کو مارا پیٹا۔ دو دوستوں کے درمیان اتنی کھچاوٹ نہیں پیدا ہونی چاہئے۔ ظفر محمود کی دلی کیفیت کو شاہد اچھی طرح سمجھتا تھا۔ کھچاوٹ بے شک دل میں تھی، لیکن وہ بات اب بہت پرانی ہوگئی تھی۔ چنانچہ اس نے ظفر محمود

کو سینے سے لگالیا اور معذرت آمیز لہجے میں بولا۔

"انسان کے اندر کچھ کمزوریاں فطری ہوتی ہیں۔ میں بھی انہی فطری کمزوریوں کا ہوگیا تھا۔ آپ سے معافی چاہتا ہوں"۔

"نہیں...... بات واقعی جائز تھی تمہاری، مگر میں تو بے چارے سائیں فیض بخش کے لئے بھی کچھ نہیں کرسکا۔ اس کے علاوہ نہ جانے میرا بیٹا کہاں چلا گیا۔ عمران کی بات کررہا ہوں۔ میرا سارا وجود زخمی ہے شاہد۔ ایک درخواست لے کر آیا ہوں تمہارے پاس"۔

"کیا بات ہے، کہو؟"

"مہرالنساء میرے پاس میرے بھائی کی امانت ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اب اس امانت کو تم اپنی تحویل میں لے لو۔ میری صحت میرا ساتھ نہیں دیتی۔ میری خواہش ہے کہ حسان کے ساتھ مہرالنساء کا نکاح کردیا جائے اور میں اسے تمہارے پاس بھیج دوں"۔

"تم یقین کرو یہ میری دلی آرزو تھی، لیکن میں سوچ رہا تھا کہ کہیں میرے رویئے نے تمہیں مجھ سے بددل نہ کردیا ہو۔ اس سے اچھی تو کوئی بات ہو ہی نہیں سکتی۔ ادھر حسان بھی اس شادی پر خلوص دل سے آمادہ تھا۔ طویل عرصے کی یہ محبت پروان ہی چڑھتی ہی تھی۔ حسان اور مہرالنساء ایک دوسرے کو دل و جان سے چاہتے تھے، چنانچہ باقی مراحل طے ہونے میں کوئی دقت نہیں ہوئی اور مہرالنساء حسان کی ملکیت بن گئی۔ سلطان کے فرشتوں کو بھی اس بات کا علم نہیں تھا کہ مہرالنساء اب اسے مکمل طور سے بھول چکی ہے اور نہ ہی اسے سلطان کی دی ہوئی وارننگ یاد ہے۔ حسان اس کے خوابوں کی تعبیر تھا، اس کے ساتھ زندگی کا وقت خوبصورتی سے کٹ رہا تھا، لیکن انسانی زندگی ایسی ہی صفات کا نمونہ ہے۔ اسے قرار کہاں؟ سلطان زندگی تعمیر کررہا تھا، اس کے پاس بے پناہ دولت جمع ہوگئی تھی، چنانچہ اس نے ایک عالی شان کوٹھی خریدی تھی، کار خریدی گئی، ملازم رکھے گئے اور اپنے قرب و جوار میں ایک شاندار اور معزز شخص کی حیثیت اختیار کرگیا۔ شخصیت پہلے سے شاندار تھی۔ اسے اپنا گھر یاد تھا، مہرالنساء یاد تھی، لیکن ابھی کچھ اور چاہتا تھا۔ اس کے بعد وہ سکھر کا رخ کرنا چاہتا تھا۔

ایک شام جب وہ ایک جنرل اسٹور میں خریداری کررہا تھا، اس کی نگاہ سڑک کے دوسری طرف اٹھ گئی، جہاں ایک قیمتی کار میں ایک عورت بیٹھ رہی تھی۔

ان پر بجلی سی گری۔ وہ مہرالنساء تھی۔ سو فیصدی مہرالنساء...... وہ دیکھتا رہ گیا اور کار کر آگے بڑھ گئی۔

❀❀❀

ی دنیا تہہ و بالا ہوکر رہ گئی تھی۔ اب تک کی زندگی میں بہت سی خوبیاں اور بہت سی نہیں لیکن خوبی یہ تھی کہ اس نے کسی ایسی گندگی کو نہیں اپنایا تھا جو ضمیر کا داغ بن جاتی آج تک کی زندگی میں اسے جو آسانی حاصل ہوئی تھی اس سے اگر چاہتا تو کئی برائیاں کے دامن سے منسلک ہوچکی ہوتیں، لیکن مہرالنساء کے خیال کو اس نے اپنے ہر احساس پر رکھا تھا اور ان راستوں پر سفر نہیں کیا تھا، جو محبت سے محروم کرکے خواہشات کو بالکل ہی راتے ہیں۔ چنانچہ اس وقت اپنی مطلوبہ زندگی کو دیکھ کر جو کیفیت اس پر طاری ہوئی تھی۔ نے باقی تمام کیفیتوں کو پس پشت ڈال دیا۔ کار نگاہوں سے اوجھل ہوچکی تھی، اس کی کار ے فاصلے پر کھڑی ہوئی تھی اور ڈرائیور اس کے نزدیک کھڑا اس کا انتظار کررہا تھا۔ سلطان ن طاری ہوگیا۔ یہ سو فیصدی مہرالنساء تھی، لیکن کتنی بدلی بدلی سی۔ وہ انداز ہی نہیں تھا جو نساء کے بانک پن کا اظہار کرتا تھا۔ اس وقت اس کے اندر پختگی تھی، زمانہ شناسی تھی، لیکن ایسا ل ہوا؟ اس کے بعد جب وہ اپنی کار میں آکر بیٹھا تو ڈرائیور نے بڑے پُرادب لہجے میں کہا۔

"سر کہاں چلوں؟"

"سکھر"۔ سلطان نے جواب دیا اور ڈرائیور چونک کر اسے دیکھنے لگا۔ اپنی سیٹ پر بیٹھ کر نے کار اسٹارٹ کی اور ایک بار پھر معذرت آمیز لہجے میں بولا۔

"سر جی، بات میری سمجھ میں نہیں آئی، کہاں چلنے کے لئے فرمایا ہے آپ نے؟"

"سکھر...... سکھر نہیں جانتے۔ سندھ کا ایک شہر ہے"۔

"جی سر"۔

"نہیں جاسکتے تم...... اترو...... میں خود گاڑی ڈرائیو کرنا جانتا ہوں"۔

"نہیں سر! میں جانتا ہوں...... جاسکتا ہوں" ڈرائیور نے کہا اور کار کے آگے بڑھادی، ن یہ حکم اس کے لئے بڑا ہی عجیب تھا۔ اچانک اتنا لمبا سفر اس کے اپنے بیوی بچے بھی تھے، نہیں اطلاع دیئے بغیر اگر سات، آٹھ گھنٹے کے سفر پر نکل جاتا تو پریشان ہوسکتے تھے اور پھر

کون، جانے واپسی کب ہو؟ لیکن مالک کا حکم ناگہانی تھا، اب جو بھی ہوگا دیکھا جائے گا۔
ایک پٹرول پمپ پر کار روک کر اس نے کار کی ٹینکی فل کرائی اور اس کے بعد چل پڑا۔ خاموش بیٹھا ہوا تھا، لیکن اس کے اندر نہ جانے کتنے جوار بھاٹے اٹھ رہے تھے۔ وہ ایک سی وحشت کا شکار تھا۔ سوچوں کا نہ جانے کیسا کیسا انداز تھا...... کاش! ہوش و حواس سے کام لے کر اور اس کار کا نمبر ہی دیکھ لیا جس میں وہ نظر آئی تھی۔ فوری طور پر سکھر جانے کی ضرورت پڑ آتی۔ کار کے نمبر سے پتہ چل جاتا کہ کہاں کی کار ہے، مگر یہ بدلہ ہوا انداز...... کتنی تبدیلی ہے اس کے اندر...... اب آنکھیں کم از کم محبوب کے سلسلے میں تو اتنا دھوکہ نہیں کھا سکتی تھیں کہ کسی اور کو وہ مہر النساء سمجھ بیٹھتا۔ بات وہی بے پناہ محبت کی تھی اور اپنی محبت ہی میں دوا دھمکیاں دے کر آیا تھا لیکن کیا یہ دھمکی صرف دھمکی کی حد تک رہ جائے گی؟

طویل ترین سفر جاری رہا اور آخر کار وہ وہاں پہنچ گیا، جہاں اس نے زندگی گزاری تھی۔ تمام وسوسے اب بے مقصد ہو چکے تھے۔ وہ درحقیقت ایک طاقت بن کر واپس لوٹا تھا اور طاقت سے ٹکرانے والا اب صرف نقصان اٹھا سکتا تھا۔ یہ حویلی جسے وہ چھوڑ کر گیا تھا، جوں کی توں نظر آرہی تھی۔ سلطان نہیں جانتا تھا کہ زندگی کے یہ سات سال اس حویلی پر کیا کیا گزرے ہیں اور حویلی کے مکینوں پر کیا کیا بیتی ہے؟ شاندار چمچماتی ہوئی کار جب حویلی کے دروازے پر پہنچی تو چوکیداروں نے آگے بڑھ کر سوال کیا کہ کون ہے؟ اور کس سے ملنا چاہتا ہے؟ یہ اجنبی چوکیدار تھے اور سلطان کو نہیں جانتے تھے۔ سلطان نے دھڑکتے دل سے کہا۔

"چودھری ظفر محمود صاحب سے ملنا ہے"۔

"مگر سائیں آپ کون ہو اور بڑے سائیں سے کیوں ملنا چاہتے ہو؟"

ایک لمحے کے لئے جو احساس سلطان کے دل میں پیدا ہوا تھا، اسے قرار آگیا۔ اس نے پہلے ماں باپ کے بارے میں کبھی اس انداز سے نہیں سوچا تھا، لیکن خون، خون ہوتا ہے اور وسوسے فطرت کا ایک حصہ۔ اسے خوف ہوا تھا کہ کہیں آغا صاحب اس دنیا سے رخصت ہو گئے ہوں، لیکن چوکیدار نے جس انداز میں یہ بات کہی تھی اس سے دل کو ڈھارس ہوئی۔ اس نے کہا۔

"آغا صاحب سے کہو کہ ان کا ایک دوست ان سے ملنے آیا ہے۔ بس اتنا کہہ کر فوراً یہ دروازہ کھول دو۔ میں اتنی دیر انتظار نہیں کیا کرتا"۔

اس کے لہجے میں ایسا حکم تھا کہ چوکیداروں نے فوراً دروازہ کھول دیا۔ البتہ یہ حیرت انہیں ضرور ہوئی تھی کہ بوڑھے ظفر محمود صاحب سے اس نوجوان کی دوستی کب اور کیسے ہوگئی؟ کار حویلی میں داخل ہو کر اس کے پورچ میں رک گئی۔ ایک چوکیدار بھاگا ہوا پیچھے پیچھے آیا تھا۔ بہت سے ملازمین بھی آس پاس ٹہل رہے تھے۔ بھاگنے والے چوکیدار نے کہا۔

"صاحب جی! آپ کا نام کیا بتائیں؟"

وہ نئے تھے، اجنبی تھے لیکن سارے کے سارے نئے نہیں تھے۔ ایک پرانے ملازم نے ایک لمحے میں پہچان لیا اور فوراً اس کی جانب لپکا۔ اسی دوران کسی گوشے سے شکور بھی نکل آیا اور اس کے بعد ہنگامہ سا ہو گیا۔ ملازم چیختا ہوا اندر بھاگا تھا۔

"بیگم سائیں! سائیں ظفر! بڑے سائیں! سلطان جی آگئے...... بڑے سائیں! ہمارے سلطان جی آگئے"۔

شکور بھی قریب پہنچ گیا۔ سلطان آہستہ آہستہ پُر وقار انداز میں آگے بڑھا۔ ادھر ملازموں کی آواز نے بیگم صاحبہ اور آغا ظفر کو بھی آگاہ کر دیا کہ سلطان آگیا ہے۔ بیٹا کتنا ہی برا تھا لیکن تھا تو بیٹا۔ ماں باپ دوڑ پڑے اور اس کے بعد رقت آمیز مناظر کو کون روک سکتا تھا۔ آغا ظفر جیسا پتھر دل انسان بچوں کی طرح بلک رہا تھا۔

"ہائے بیٹے...... کلیجہ نکال کر لے گئے تم دونوں ہمارا۔ کلیجہ نکال کر لے گئے۔ بیٹے! بن بات مار گئے تم ہمیں"۔

"سنبھالئے خود کو بڑے سائیں! سنبھالئے خود کو آغا صاحب! آپ نے پتھر کا ٹکڑا سمجھا تھا مجھے، آپ نے مجھے اپنے راستوں پر چلانا چاہا تھا، لیکن میں نے آپ سے کہہ دیا تھا کہ آپ میری عظمت کو تسلیم کرلیں۔ قصور آپ کا تھا آغا جی! اگر آپ مجھے بڑا مان لیتے تو میں آپ سے شکست ہو کر کہیں نہ جاتا۔ میری بات نہیں مانی آپ نے۔ میں نے کہا تھا کہ میں عظیم ہوں دیکھ لیجئے میری عظمت کے ہزاروں ثبوت، کراچی کے قیمتی ترین علاقے ڈیفنس میں میری عظیم الشان کوٹھی ہے۔ کسی بھی طرح اس کوٹھی میں آپ سے کم ملازم نہیں۔ میری آمدنی بے پناہ ہے، میرے قدموں میں دولت کے انبار ہیں۔ میں دنیا کی ہر چیز خرید سکتا ہوں۔ سب کچھ

خرید سکتا ہوں، میں یہی آپ کو بتانا چاہتا تھا۔ آپ کی بزرگی آپ کا احترام میں نے کبھی نظر انداز نہیں کیا۔ وہ صرف آپ تھے جو میرے جسم پر کوڑے مار سکتے تھے، کسی اور کو نہ یہ حق نے دیا اور نہ دے سکتا ہوں۔ مگر آپ نے مجھے تسلیم ہی نہیں کیا۔ میں کیا کرتا"۔

"بھاگ جاؤ بیٹا! بھاگ جاؤ سمجھے، بھاگ جاؤ...... بڑی مشکل سے سائیں فیض بخش کی حویلی کے شعلے بجھے ہیں۔ بڑی مشکل سے مجھے قربانیاں دے کر امن ملا ہے۔ ہائے رے عمران! میرا عمران ایسا گم ہوا کہ اس کا کبھی پتہ ہی نہ چلا"۔

ماں باپ زاروقطار روتے رہے۔ سلطان کے لئے انوکھا انکشاف تھا۔ اندر پہنچ کر اس نے عمران کے بارے میں پہلا سوال کیا۔

"کیوں عمران کو کیا ہوا، کہاں ہے وہ اور وہ مہرالنساء بھی نظر نہیں آ رہی"۔

"کیا کرتا میں؟ مجھے بتا کیا کرتا میں؟ مجھے دیکھ رہا ہے تُو، ہڈیوں کا ڈھانچہ بن کر رہ گیا ہوں۔ غم کھا گئے ہیں مجھے۔ کیا کیا کرنا پڑا ہے اس دوران، میرا دل جانتا ہے۔ وہ میرے بھائی کی نشانی تھی۔ میں اس دنیا سے رخصت ہوجاتا تو کون تھا جو اس کی دیکھ بھال کرتا، اس کی شادی کرتا۔ اتنا بیمار تھا میں کہ زندگی کا تصور ہی ختم ہوگیا تھا۔ ایسے حالات میں مجھے خود شاہ سے بات کرنا پڑی۔ میں نے کہا وہ میرا بوجھ بانٹ لے اور اس نے دوستی کی لاج رکھی۔ اس نے میری ذمہ داری اپنے کندھوں پر لے لی اور عزت کے ساتھ مہرالنساء کو لے گیا"۔

"بیٹا! کتنا لمبا سفر طے کرکے آئے ہو تم...... کراچی سے آ رہے ہو؟" ماں نے کہا۔

"ہاں"۔

"جاؤ غسل کرو...... تمہارا کمرہ اسی طرح ہے۔ میں نے اس کمرے کے دروازے کو صرف ملازموں سے صاف کرانے کے لئے کھولا ہے۔ ورنہ تمہارا کمرہ بھی اسی جگہ موجود ہے اور میرے...... میرے عمران کا کمرہ بھی......" ماں رو پڑی وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور اپنے کمرے میں چلا گیا۔ ماضی کی ہر تصویر لمحوں کی تصویر محسوس ہو رہی تھی۔ لگ ہی نہیں رہا تھا کہ زندگی کے سال کھو گئے ہیں۔ یوں لگ رہا تھا جیسے کل رات وہ گھر سے بھاگا ہو، مہرالنساء سے یہ کہہ کر کہ اس کا انتظار کرے۔ دھت تیرے کی۔ کیسی کم بخت لڑکی نکلی۔ مجھ جیسے عظیم انسان کو چھوڑ کر جیسے بے وقوف اور گدھے انسان سے شادی کر ڈالی اور دو بچے بھی پیدا کر لئے۔ حسان تو خیر

بدترین سزا دی جائے لیکن اس کے بچے......؟ کتنے افسوس کی بات ہے کہ اس نہ مان کر اپنے بچوں کا مستقبل مخدوش کر دیا۔ نہیں، مہرالنساء میں عزم کا پکا ہوں، ہوگا اور اس کے بعد مجھ سے شادی کرنا ہوگی۔

وغیرہ سے فراغت کے بعد وہ بالکل پُرسکون ہوگیا تھا، کیونکہ ذہن میں جو منصوبے تھے، ان کی تکمیل کرنا جانتا تھا۔ پھر ماں باپ کے ساتھ رات کو دو، تین بجے آغا جی اس کے آنے سے بہت خوش تھے۔ ان کے چہرے پر رونق دوڑ گئی تھی۔ میں سے ایک واپس آ گیا، لیکن انہیں سائیں فیض بخش کا خوف تھا۔ رات کو اس سے پوچھا۔

نے بتایا تھا، کراچی میں تو نے کوٹھی بنالی ہے"

!"

تیرے پاس دولت کے انبار ہیں"۔

...... آغا جی! دولت اب میرے قدموں تلے ہے"۔

کوئی کاروبار کیا ہوا ہے؟"

بڑا کاروبار...... آپ یوں سمجھئے دنیا کے کئی ملکوں میں میرا کاروبار پھیلا ہوا ہے"۔

کی بات ہے، یہ سب کچھ تُو نے کیسے کیا؟"

آغا جی! میں نے آپ سے کہہ دیا تھا۔ وقت میری مٹھی میں ہے، یہ پہلے بھی فیض بخش نے آپ سے بدتمیزی کی تھی۔ آغا جی۔ آپ کے کسی اور بیٹے کی رگوں خون نہیں تھا کہ وہ باپ کے لئے سینہ تان کر کھڑا ہوجاتا۔ آغا جی! میں نے اس لائے، کیونکہ وہ ہمارے کھیت جلانے کی بات کرکے گیا تھا۔ میں نے اس کی حویلی اس نے پہلے یہ الفاظ کہے تھے۔ اس کے علاوہ میں نے اسے کوئی نقصان نہیں حال آغا جی! یہ ایک عظیم آدمی کا کام تھا جو میں نے کیا۔ اس کے بعد بھی اگر آپ مانتے ہیں تو آپ کی مرضی ہے۔ ایسا تو ہوتا ہے دنیا کے ہر بڑے آدمی کو اسی طرح ہے اور جب وہ اس دنیا سے چلا جاتا ہے تو پھر لوگ اس کی عظمت کے گیت گاتے اپنی زندگی میں ہی آپ لوگوں کو یہ بتا دینے میں کامیاب ہوا ہوں کہ میں عظیم تھا،

عظیم ہوں اور عظیم رہوں گا"۔

دوسرے دن جب آغا ظفر محمود اور اس کی بیوی یہ یقین کرنے کے لئے سلطان کے کمرے میں داخل ہوئے کہ جو کچھ کل ہوا ہے، وہ سچ تھا یا کوئی خواب۔ تو سلطان تیار تھا۔ ماں باپ بیٹے سے لپٹ گئے، بھائی وغیرہ بھی بظاہر خوشی کا اظہار کر رہے تھے۔ ان کے دلوں اور ذہنوں میں کیا خیال تھا، یہ صرف وہی جانتے تھے۔ یہ اندازہ لگانا مشکل تھا۔ یہ سوچنے کی بنیاد یہ تھی کہ اس وقت بھی انہیں سلطان سے کوئی خاص رغبت جب سلطان نے یہ واردات نہیں کی تھی اور یہاں سے فرار نہیں ہوا تھا۔ اب بھی انہوں نے بہت زیادہ خوشیوں کا اظہار نہیں کیا تھا۔ پتہ نہیں کیا سوچ رہے تھے، اس بارے میں ناشتہ وغیرہ کر کے فارغ ہوئے تو سلطان نے باپ سے کہا۔

"سائیں فیض بخش کے قدموں میں حاضری نہ دینا بزدلی ہوگی اور آپ جانتے ہیں میں بزدل نہیں ہوں۔ میں ایک قدم بھی یہاں سے نہ نکالتا لیکن مجھے یہ خطرہ تھا کہ ضرور تلاش کر کے سزا دینے کی کوشش کریں گے۔ اگر بات صرف سائیں فیض بخش کی میں یہاں سے کبھی نہ جاتا......"

"کیا بات کر رہا ہے بیٹے! اب سائیں فیض بخش اتنا چوہا بھی نہیں ہے کہ ہم نہ کرے۔ تم اگر سامنے آئے تو اسے سات سال پہلے کی تمام باتیں یاد آجائیں گی"۔

"سنیں...... میں چاہتا ہوں کہ آپ میرے ساتھ چلیں آغا صاحب! میں اس بھائی عمران کے بارے میں معلومات حاصل کروں گا۔ پوچھوں گا اس سے کہ عمران کہاں ہے اور وہ بتائے گا۔ باقی باتوں کی آپ فکر نہ کریں۔ ہاں! اگر آپ اس کا سامنا کر خوف محسوس کر رہے ہیں تو پھر یہ کام میں خود ہی کرلوں گا"۔

"نہیں...... میں بزدل نہیں ہوں بیٹا! ٹھیک ہے تیری مرضی، بس وہ تجھ پر ہاتھ کوشش نہ کرے"۔ سلطان مسکرا دیا تھا۔ جب ان کی جیپ سائیں فیض بخش کی نئی تعمیر حویلی پر پہنچی تو اتفاق کی بات یہ تھی کہ سائیں فیض بخش خود کہیں جانے کے لئے نکل رہا نے اپنی گاڑی روک دی جو حویلی سے برآمد ہو رہی تھی، لیکن آغا ظفر محمود کے ساتھ سلطان وہ ششدر رہ گیا۔ ایک لمحے تک تو اس کے منہ سے آواز بھی نہ نکلی۔ پھر اس نے سرد لہجے

...ئے آغا جی! آیئے اندر آجایئے...... چلو جیپ ریورس کرو"۔ سائیں فیض بخش نے ...ہوئے کہا۔

...آپ کہیں جا رہے ہیں سائیں فیض بخش تو ہم بعد میں آجائیں گے"۔ ظفر محمود نے کہا۔

...آیئے"۔ اور یہ کہہ کر اس کی جیپ ریورس ہوتی ہوئی واپس ایک جگہ آکھڑی ...نے ظفر محمود اور سلطان کے اترنے کا انتظار کیا۔ پھر ان لوگوں کو ساتھ لے کر اندر

...کیسے آئے ہو...... کہو کیسے ہو سلطان! کیا پھر بابا مجھے میری حویلی سے محروم ...ئے ہو؟ بڑی مشکل سے یہ حویلی دوبارہ تعمیر کی ہے۔ کیوں سائیں ظفر! ایسا کوئی خطرہ ...ہے مجھے؟"

"آپ مجھے شرمندہ کر رہے ہیں سائیں فیض بخش! بھلا اب ایسا کیسے ہوسکتا ہے؟"

"ہوسکتا ہے بابا! ہوسکتا ہے"۔ سائیں فیض بخش نے کہا اور ہنسنے لگا پھر بولا۔ "یہ لڑکا ...ہاں ہو آیا ہے؟ کیوں اتنے دن گھر سے بھاگا رہا یہ؟ ارے بابا! ساتھ رہے ہو، ساتھ ...رہو۔ کیا کرلیتا میں زیادہ سے زیادہ تمہارا؟ بابا، بچوں اور بوڑھوں میں اتنا ہی تو فرق ...نہیں جو کرنا تھا وہ تم کر بیٹھے، مگر تمہارے والد کو یہ بات معلوم ہے کہ جب پولیس آئی ...نے مجھ سے پوچھا کہ سائیں فیض بخش حویلی میں آگ کیسے لگی؟ تو میں نے کہا کہ بابا ...آگ تو آگ ہوتی ہے۔ اب تمہیں آگ لگا کر بتا تو نہیں سکتا کہ آگ کیسے لگی۔ جاؤ ...میں نے تمہارا نام نہیں لیا تھا سلطان"۔

"اور اس کے بعد سائیں فیض بخش آپ نے میرے بھائی کو اغوا کرلیا"۔ سلطان نے ...کہا اور فیض بخش کا چہرہ اتر گیا۔

...بابا...... غصے اور جوش میں وہ غلطی ہوگئی تھی، مجھ سے...... بعد میں مجھے اس کا بہت ...پر ایک بات پتہ نہیں چل سکی کہ عمران یہاں سے بھاگ کر کہاں گیا؟"

...یہی معلوم کرنے آیا ہوں...... سائیں فیض بخش! کہ عمران یہاں سے بھاگ کر ...آپ کو یہ بات ضرور معلوم ہوگی"۔ فیض بخش کا منہ ایک لمحے کے لئے کھلا پھر بند ...نے ہکلاتے ہوئے لہجے میں کہا۔

"میرے کو کیا معلوم بابا! وہ قید میں تھا...... ادھر سے نکل گیا"۔

"ایک منٹ سائیں! ایک منٹ، مجھے دیکھ کر بات کریں آپ"۔ سلطان،

سائیں فیض بخش نے نگاہیں اٹھا کر سلطان کو دیکھا۔ ایک لمحے کے لئے اسے یہ محسو
ان کے پورے وجود میں ایک جھٹکا سا پڑا ہو۔ بدن کی ساری نسیں تھرا کر رہ گئی تھیں
ایک دم سے گرم ہوا تھا اور اس کے بعد برف کی طرح منجمد ہو گیا۔ ان کی نگاہیں،
چہرے پر جمی ہوئی تھیں اور ان کے عضلات ڈھیلے پڑتے جا رہے تھے۔ کچھ لمحے انہ
کشمکش میں گزارے پھر اس کے بعد سلطان کی آواز ابھری۔

"ہاں...... اب آپ جو کچھ کہیں گے سچ کہیں گے...... کیا کہیں گے آپ؟"
اس نے سوال کیا۔

"سچ"۔ فیض بخش کی آواز کسی گہرے کنوئیں سے آتی محسوس ہوئی۔

"عمران کو آپ نے اغوا کیا تھا؟"

"ہاں...... عمران کو میں نے اغوا کرایا تھا"۔

"کون لایا تھا اسے اغواء کر کے؟"

"غفورا! میرے سارے بڑے کام وہی کرتا ہے"۔

"پھر کیا ہوا؟"

"اس میں کوئی شک نہیں کہ عمران نے فرار ہونے کی کوشش کی تھی، لیکن یہ
کتوں نے اس کی تکہ بوٹی کر دی۔ انہوں نے اسے چیر پھاڑ کر رکھ دیا۔ میں نے
اٹھوائی، اسے دفن کرا دیا اور یہ مشہور کر دیا کہ وہ فرار ہوا ہے۔ بس اور کیا کرتا۔
افسوس تھا"۔ ظفر محمود کا چہرہ ہلدی کی طرح زرد ہو رہا تھا۔ جب فیض بخش خامو
بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔

"مار دیا تُو نے میرے بچے کو...... مار دیا فیض بخش! پتہ چل گیا مجھے تیری
کا۔ اپنے کیے پر نادم ہو کر تُو نے میری ہمدردی کا دم بھرنا شروع کر دیا، یہ سوچ
تجھ سے اپنے بیٹے کا انتقام لینے پر نہ تُل جاؤں۔ خدا کی قسم! اگر مجھے یہ پتا ہوتا
بچے کو مار دیا ہے تو میں...... میں بھی تجھے کتنے کی موت مار دیتا"۔

سلطان سرد نگاہوں سے فیض بخش کو دیکھ رہا تھا، پھر اس نے کہا۔

"ٹھیک ہے...... سائیں فیض بخش! کتے انسانی جسم کو کیسے نوچتے ہیں، یہ تمہیں بھی پتہ چل جائے گا۔ سا سائیں فیض بخش! تمہیں یہ بات انتہائی آسانی سے پتہ چل جائے گی"۔ پھر بولا۔

"آیئے...... آیئے آغا جی آیئے"۔ اس نے باپ کا بازو پکڑا۔ فیض بخش کو جیسے ہوش آ گیا تھا، اس نے کہا۔

"ارے کہاں چلے آپ لوگ، بیٹھیے کچھ چائے پانی"۔ لیکن سلطان اپنے باپ کا ہاتھ پکڑے باہر نکل آیا تھا۔ باہر نکل کر وہ جیپ میں بیٹھا اور یہاں سے چل پڑا۔ ظفر محمود زار و قطار رو رہا تھا اور کہہ رہا تھا۔

"کاش! وہ حرام زادہ اپنے منہ سے اس بات کا اظہار نہ کرتا تو کم از کم میں اس امید میں تو رہتا کہ ایک نہ ایک دن میرا بیٹا ضرور واپس آ جائے گا۔ عمران میرا بچہ، میرا بچہ!" پھر وہ چونک کر بولا۔

"لیکن اس نے اتنی آسانی سے اس بات کا اعتراف کیسے کر لیا؟"

"اس لئے کہ ایک عظیم آدمی اس کے سامنے تھا، وہ جس کی عظمت کا تم نے اعتراف نہیں کیا۔ وہ جسے تم نے زندگی میں کچھ نہیں دیا۔ ظفر محمود، آغا جی! تم نے مجھ سے میری محبت چھین لی۔ عمران کو تو خیر جانا تھا، وہ چلا گیا لیکن میری محبت چھین لی تم نے، کیا تمہیں اس بات کا علم نہیں تھا کہ میں مہر النساء سے محبت کرتا ہوں؟"

"بتا چکا ہوں تجھے سلطان! بتا چکا ہوں"۔ جیپ حویلی سے کافی دور نکل آئی تھی۔ سامنے لق و دق میدان پھیلا ہوا تھا اور میدان میں اونچے نیچے ٹیلے بکھرے ہوئے تھے۔ پھر ایک جگہ سلطان نے جیپ رکوا دی اور اس کا رخ تبدیل کر دیا۔

"کیوں؟ کیا بات ہے، یہاں کیوں رک رہے ہو؟"

"تھوڑا سا انتظار کرنا پڑے گا آپ کو آغا جی"۔ سلطان نے اپنی گونجدار آواز میں کہا۔

"کون آنے والا ہے؟" آغا ظفر محمود نے پوچھا۔

"دیکھتے رہو"۔ تقریباً چالیس منٹ کے بعد اچانک ہی حویلی کے دروازے سے سائیں فیض بخش کی جیپ برآمد ہوئی اس میں غفورا بھی بیٹھا ہوا تھا۔ ایک ڈرائیور تھا جو جیپ ڈرائیو کر رہا تھا۔

حویلی سے کوئی سو گز آنے کے بعد فیض بخش کی جیپ رُک گئی۔ ڈرائیور اتر کر جیپ کا انجن دیکھنے لگا، اسی دوران فیض بخش اور غفورا بھی نیچے اتر آیا تھا۔ سلطان یہیں سے بیٹھے بیٹھے فیض بخش کو دیکھنے لگا۔ اچانک ہی نہ جانے کیا ہوا، چار ملازم بڑے بڑے شکاری کتوں کی زنجیریں پکڑے حویلی سے نمودار ہوئے تھے اور کتوں نے ایک دم اچھلنا کودنا شروع کردیا تو فیض بخش نے پلٹ کر کتوں کو دیکھا۔ یہی کیفیت غفورے کی بھی ہوئی تھی۔ پھر نہ جانے دونوں پر کیا دیوانگی سوار ہوئی کہ انہوں نے دوڑنا شروع کردیا۔ خونخوار کتے جو ان دونوں کو دیکھ دیکھ کر بری طرح اچھل رہے تھے، جیسے جوشِ غضب سے دیوانے ہو رہے ہوں، حالانکہ یہ کتے ہمیشہ فیض بخش کے پاؤں چاٹتے تھے اور جب بھی اسے دیکھتے تھے، اس کے قدموں میں لوٹ کر دُم ہلانے لگتے تھے، لیکن اس وقت ان کے چہروں سے جو وحشت عیاں تھی، وہ ناقابلِ فہم تھی۔ اس کے علاوہ فیض بخش نے جو دوڑنا شروع کیا تھا، وہ بھی عجیب و غریب تھا اور سب سے بڑی بات یہ کہ غفورا اس کا ساتھ دے رہا تھا۔ وحشی کتے اس بری طرح اچھل کود رہے تھے کہ ان کے محافظ ان کی زنجیریں نہ سنبھال سکے اور ان کی وحشت خیزی کو برداشت نہ کرسکے۔ ان کی آنکھیں انگاروں کی طرح سرخ ہوگئی تھیں۔ جبڑے کھل گئے تھے اور ان کے خونخوار نوکیلے دانت نظر آرہے تھے۔ یہاں تک کہ انہوں نے جھٹکوں سے اپنے محافظوں سے زنجیریں چھڑائیں اور اس کے بعد گلے میں بندھی ہوئی زنجیروں کو زمین پر رگڑتے ہوئے فیض شاہ اور غفورے کی طرف دوڑے۔ زنجیروں کی کھنکھناہٹ، کتوں کی ہولناک غراہٹیں پورے ماحول کو لرزا رہی تھیں۔ خود ظفر محمود آنکھیں پھاڑے یہ منظر دیکھ رہا تھا اور پھر لمحوں میں وہ سب کچھ ہوگیا جو انتہائی خوفناک تھا۔ بھلا فیض بخش اور غفورا کتوں کے مقابلے میں کیا دوڑ سکتے تھے۔ چند ہی لمحوں میں کتے چھلانگیں لگاتے ہوئے ان کے قریب پہنچ گئے اور پھر انہوں نے غرا کر ان دونوں کو دبوچ لیا اور اپنے لمبے دانتوں سے ان کے نرخرے ادھیڑ کر پھینک دیئے۔ پھر ان کے جسم کے مختلف حصوں پر حملے کرنے لگے۔ دونوں تڑپ رہے تھے اور زمین پر دھول اُڑ رہی تھی۔ وحشی کتے ان کے پورے بدن کو چیر پھاڑ رہے تھے۔ ان کا دل، کلیجہ اور اندرونی اعضاء آنتوں سمیت چاروں طرف بکھر گئے۔ کتوں نے لمحوں کے اندر انہیں زندگی سے محروم کردیا اور دونوں کی لاشیں ٹکڑے ٹکڑے ہوکر زمین پر بکھر گئیں۔

تب سلطان کی آواز اُبھری۔

"اور کیا تم اب بھی مجھے عظیم تسلیم نہیں کر گے آغا ظفر محمود!"

ظفر محمود جو اس دہشت ناک منظر کو دیکھ کر چکرا رہا تھا، آنکھیں پھاڑ کر سلطان کو دیکھنے لگا اور بے ہوش ہوگیا۔ تب سلطان نے اپنے ڈرائیور سے کہا۔

"واپس چلو"۔ خوفزدہ ڈرائیور نے بڑی مشکل سے جیپ کا رخ تبدیل کیا اور جیپ ظفر محمود کی حویلی کی جانب چل پڑی۔

❁ ❁ ❁

سائیں فیض بخش کی کہانی ختم ہوگئی تھی اور حالات ان کے خلاف نہیں تھے۔ ظفر محمود کے باقی بیٹے بہت خوش تھے، کیونکہ فیض بخش کی وجہ سے انہیں بہت سی الجھنوں سے گزرنا پڑتا تھا، اب چونکہ انہوں نے باپ کے غیر فعال ہونے کے بعد سارے کاروبار خود سنبھال لئے تھے، اس لئے فیض بخش ہی ان کے لئے سب سے بڑی رکاوٹ تھا۔ پھر ایک دباؤ بھی تھا کہ سلطان نے ان لوگوں کو نقصان پہنچایا تھا، لیکن اب سارے مسئلے حل ہو چکے تھے۔

ظفر محمود ابھی تک اعتدال پر نہیں آیا تھا، کیونکہ اس نے اپنی آنکھوں سے وہ ہولناک منظر دیکھا تھا۔ کوئی ایک ہفتہ اسی طرح گزر گیا۔ سلطان اب وہ سلطان ہی نہیں رہا تھا۔ پہلے وہ شوخ شریر اور کھلنڈرا سا لڑکا تھا، لیکن اب بہت مختصر عرصے میں بڑی کایا پلٹ ہوگئی تھی۔ آخر کار ظفر محمود کی حالت ٹھیک ہوئی تو اس نے سلطان کو طلب کرلیا اور جب سلطان اس کے پاس پہنچا تو ظفر محمود نے کہا۔

"مجھے بتاؤ گے نہیں تم کہ وہ سب کیسے ہوگیا؟"

"وہ ہونا تھا آغا جی! وہ تو ہونا ہی تھا۔ بدقسمتی یہ ہے کہ آپ نے کبھی بھی سلطان کی عظمت کو نہیں پہچانا اور یہی آپ کی غلطی ہے۔ میں آپ کے صحت مند ہونے کا انتظار کررہا تھا۔ یہ نہ سمجھیں کہ اس چھوٹی سی حویلی اور آپ کی معمولی سی جائیداد کا لالچ میرے دل میں ہوگا، میں آپ سے پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ ایک عظیم انسان کے لئے یہ ساری چیزیں بے قیمت ہوتی ہیں۔ میں جب بھی چاہوں، آپ کی اس پوری حویلی اور جائیداد کی قیمت ادا کرسکتا ہوں۔ اب مجھے اجازت دیجئے۔ آپ نے جو کچھ کیا ہے، مجھے اس کا حل بھی تلاش کرنا ہے۔ ہاں! ایک بات اور بتادوں آپ کو، وہ یہ کہ آپ کے پاس آستین کا ایک سانپ موجود ہے، جاننا چاہتے ہیں کہ وہ سانپ کون ہے"۔

"میں تمہاری بات سمجھا نہیں ہوں، تم نے جن باتوں کا تذکرہ کیا ہے، وہ میرے لئے
باہر ہیں"۔

"بہت سی باتیں ایسی ہوتی ہیں جن کا نہ سمجھنا ہی بہتر ہوتا ہے۔ البتہ آستین کے
کے بارے میں، میں آپ کو بتادوں"۔

تمام بھائیوں اور باپ کو ایک جگہ جمع کر کے سلطان نے شکور کو طلب کرلیا۔ شکور
بھائی کی موت کا علم ہو چکا تھا اور وہ شدید غم کی کیفیت کا شکار تھا۔ بات دور دور تک کی
میں نہیں آئی تھی کہ فیض بخش کو کیا ہوگیا۔ اچانک اس پر دیوانگی کے دورے پڑے تھے او
کے کتوں نے اسے بھنبھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ کسی کا کوئی قصور کہا ہی نہیں جاسکتا تھا۔ بس ظفر م
جسے یہ بات معلوم تھی کہ سلطان نے کیا کیا ہے۔ پھر جب سب لوگ جمع ہوگئے اور شکو
پہنچ گیا تو سلطان نے اس سے کہا۔

"شکورے! تیرے بارے میں کہا جاتا ہے تُو ظفر محمود کا سب سے وفادار آدمی ہے۔
تجھ سے ایک سوال پوچھتا ہوں۔ کیا تجھے عمران ظفر کی موت کا علم تھا؟" شکورے کا چہ
پڑ گیا، اس نے خوفزدہ نگاہوں سے اِدھر اُدھر دیکھا اور پھر سلطان کو دیکھنے لگا، لیکن وہی لم
کے لئے موت کا لمحہ ثابت ہوا۔ سلطان نے اسے اپنی آنکھوں کے سحر میں جکڑ لیا اور شکو
کے چہرے کے نقوش بدلنے لگے۔ کچھ لمحوں کے بعد وہ پوری طرح سلطان کے سحر میں آ
سلطان کی خوفناک آواز اُبھری۔

"کیا تجھے عمران ظفر کی موت کا علم تھا؟"

"ہاں"۔

"اس وقت جب وہ ہلاک ہوا تھا"۔

"ہاں...... اس وقت جب وہ ہلاک ہوا تھا"۔

"کیا تُو اس سازش میں شریک تھا؟"

"نہیں"۔

"پھر تجھے کیسے بات معلوم ہوئی؟"

"مجھے میرے بھائی غفورے نے بتایا تھا"۔

"تُو نے خاموشی کیوں اختیار کی؟"

"صرف اس لئے کہ دونوں گروہوں میں تصادم نہ ہوجائے۔ ہم ان کے درمیان ہونے
طرح کے معاملات سنبھالتے تھے۔ عمران ایک حادثے کا شکار ہوا۔ اس پر جان بوجھ
شکاری کتے نہیں چھوڑے گئے تھے"۔

"لیکن وہ مر چکا ہے، تجھے اس بات کا علم تھا"۔

"ہاں...... میں جانتا تھا"۔ شکورے نے جواب دیا اور ظفر محمود بے اختیار ہو کر اٹھ کھڑا ہوا۔

"کتے...... کتے! نمک میرا کھاتا ہے، وفاداری دوسروں کی کرتا رہا۔ جان سے مار دوں گا
تجھے"۔ بہرحال شکورے کی اچھی خاصی پٹائی ہوگئی لیکن ظفر محمود میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ
اسے جان سے مار سکتے۔ شکورے کو وہاں سے بھگا دیا گیا اور پھر سلطان نے اپنی واپسی کا
اعلان کردیا۔ اس نے کہا۔

"میرا پتہ رکھ لیا جائے۔ جب بھی اگر آپ لوگوں کو کبھی میری ضرورت ہو، آپ کسی
مشکل کا شکار ہوں، مجھے اطلاع بھیج دی جائے۔ ایک بڑا آدمی آپ کو صرف دے سکتا ہے۔
آپ لوگوں کے پاس کچھ بھی نہیں ہے جو اسے دیں"۔

اور پھر وہ وہاں سے رخصت ہوگیا۔ سینے کی آگ شدت سے بھڑکی ہوئی تھی۔ اسے
مہرالنساء پر سخت غصہ تھا۔ پتہ معلوم کر کے آیا تھا اور یہ محض اتفاق تھا کہ یہ پتہ اس کی رہائش گاہ
سے زیادہ فاصلے کا نہیں تھا۔ پھر جب وہ اپنی اعلیٰ درجے کی کار میں مہرالنساء کی کوٹھی میں داخل
ہوا تو مہرالنساء، حسان اور اس کے دونوں بچے کوٹھی کے خوبصورت لان پر شام کی چائے پی
رہے تھے۔ اس عالی شان کار کو دیکھ کر سب اس کی جانب متوجہ ہوگئے۔ پھر ایک انتہائی
خوبصورت سوٹ میں ملبوس نوجوان کو کار سے اترتے دیکھ کر مہرالنساء اور حسان کو عجیب سا
احساس ہوا۔ یہ شاندار جوان کچھ شناسا چہرے کا مالک تھے۔ سلطان مسکراتا ہوا اس جانب بڑھا
اور ان کے قریب پہنچ گیا۔ دونوں نے کھڑے ہو کر اس کا استقبال کیا تھا۔ اچانک ہی مہرالنساء
کے ذہن کو شدید جھٹکا لگا۔ اب اس نے سلطان کو پہچان لیا تھا۔ اس کے منہ سے بے اختیار
نکل گیا۔

"سلطان؟"

"ہاں مہرالنساء! جانتی ہو سلطان کسے کہتے ہیں؟"

"اوہو سلطان! تم......؟"

''خاموش رہو...... ایک بڑا آدمی جب کسی سے مخاطب ہو تو تم جیسے چھوٹے لو
درمیان میں نہیں بولنا چاہئے''۔ سلطان نے اسے ڈانٹتے ہوئے کہا۔

''گڈ...... یہ اتنا بڑا آدمی ہمارے گھر میں کیا کر رہا ہے؟'' حسان نے کہا۔

سلطان نے اب بھی اس کی جانب توجہ نہیں دی تھی۔ مہرالنساء کے چہرے کا رنگ
پڑتا جارہا تھا۔ دونوں بچے عجیب سی نگاہوں سے سلطان کو دیکھ رہے تھے، تب سلطان نے

''ہاں مہرالنساء! پہچان لیا تم نے سلطان کو۔ میں نے تم سے کچھ کہا تھا، حویلی سے
ہوئے، یاد ہے کیا کہا تھا میں نے تم سے؟''

''سلطان! انسان بنو۔ کسی کے گھر آکر اس سے اس لہجے میں بات کرنا کیا کوئی منا
عمل ہے؟''

''میں صرف ان لوگوں کو اہمیت دیتا ہوں جو مناسب عمل کا مطلب جانتے ہیں، منا
عمل کرنا جانتے ہیں۔ غیر مناسب لوگ نہ تو میرے لئے قابلِ عزت ہوتے ہیں اور نہ ہی
انہیں کوئی اہمیت دیتا ہوں''۔

''لیکن سلطان! آؤ بیٹھو...... تم تو بہت شاندار ہوگئے ہو''۔

''شاندار میں پہلے بھی تھا اور اب بھی ہوں۔ فرق صرف تم لوگوں کی نگاہوں کا ہے
کیا جانو، شان و شوکت کیا چیز ہوتی ہے۔ خیر تم مجھے باتوں میں لگانے کی کوشش نہ کرو۔ م
سے یہ پوچھ رہا ہوں کہ میں تم سے کچھ کہہ کر گیا تھا''۔

''میں نہیں جانتی کہ تم کیا کہہ کر گئے تھے''۔

''میں نے تم سے کہا تھا...... میں تمہیں یاد دلا رہا ہوں۔ میں نے تم سے کہا تھا کہ اگر
سال کے اندر اندر میں واپس نہ آجاؤں تو پھر تم آزاد ہو اور تم یہ سوچ لینا کہ یا تو کوئی د
لڑکی میرے دل تک پہنچ گئی یا میرا وجود اس دنیا سے اٹھ گیا ہے۔ دس سال سے پہلے پہ
کسی سے شادی نہیں کرو گی، لیکن تم نے میرے حکم کی تعمیل نہیں کی''۔

''تم مجھے حکم دینے والے ہوتے کون ہو؟ میں حسان سے محبت کرتی ہوں اور حسان
میری شادی ہوگئی۔ اب میرے دو بچے ہیں''۔

''افسوس! تمہارے اس عمل سے بہت سوں کو تکلیف پہنچے گی۔ بہت سوں سے مراد
بچے بھی ہیں اور یہ بے وقوف آدمی بھی جسے ایک بار میرے ہاتھوں مار کھانے کے بعد بھی

نے۔ اس نے یہ نہیں سوچا کہ وہ لڑکی میری مطلوب نظر ہے جس سے وہ شادی کر رہا ہے۔
نہیں حسان! میں نے اس کی وجہ سے تمہیں مارا تھا''۔

''میں تم سے کہنا چاہتی ہوں کہ......''

''بکومت۔ مجھے مہرالنساء سے بات کرنے دو۔ ہاں مہرالنساء! میں نے تم سے یہ بھی کہا
اگر تم نے ایسا کر ڈالا تو تمہیں شدید پچھتاوا ہوگا۔ تمہیں اپنے شوہر کو چھوڑنا پڑے گا۔
بچوں کو چھوڑنا پڑے گا۔ تم صرف میری ملکیت ہو۔ میں تمہارا حاکم ہوں اور تم میری محکوم!
میں تمہیں تھوڑا سا وقت دے رہا ہوں۔ اپنے شوہر سے تم طلاق لے لو۔ اپنے بچوں کو تم
کے پاس چھوڑ دو۔ یہ ان کی پرورش کرے گا۔ تم میرے ساتھ میری نئی نویلی دلہن کی
سے آؤ گی اور اگر تم نے ایسا نہ کیا تو......'' مہرالنساء کو بھی چڑ ہوگئی۔ اس نے غصیلے لہجے
کہا۔

''تو تم کیا کرو گے؟''

''دیکھنا چاہتی ہو؟''

''دیکھو...... یہ ایک شریف آدمی کی کوٹھی ہے اور میں''...... حسان نے پھر کہا، لیکن سلطان
پڑا۔ اس نے حسان کی طرف دیکھا اور بولا۔

''ہاں تم...... ادھر دیکھ کر بات کرو''۔ حسان نے غصیلے انداز میں سلطان کو دیکھا، لیکن
ے لمحے اچانک اس کے غبارے سے ہوا نکل گئی۔ آہستہ آہستہ اس کا چہرہ پھیکا پڑتا چلا
تب سلطان نے کہا۔

''تم زمین پر اوندھے لیٹ جاؤ اور گدھے کی آواز اپنے منہ سے نکالو''۔ حسان آہستہ
زمین پر بیٹھتا چلا گیا اور پھر اوندھا لیٹ کر گدھے کی طرح چیخنے لگا۔ دونوں بچے قہقہے لگا
ہے۔

''مما...... ڈیڈی گدھے بن گئے''۔ لیکن مہرالنساء کے چہرے پر انتہائی خوف کے آثار
اور وہ دہشت سے کئی قدم پیچھے ہٹ گئی تھی۔

''میں اگر چاہوں مہرالنساء تو تمہارے ہاتھوں، تمہارے شوہر کو قتل کرادوں۔ تم لوگوں
یہ پوچھتی پھرو کہ یہ بچے کس کے ہیں اور میرے قدموں میں آکر تم میری غلامی کرو، لیکن
ل کا ایک ہی منصب نہیں ہوتا۔ میں اسی مہرالنساء کو چاہتا ہوں جو بات بات پر مجھ سے لڑتی

تھی۔ میرے ساتھ کھیلتی تھی، مجھ سے شرارتیں کرتی تھی۔ افسوس! انسان دنیا میں بہت کچھ پاتا ہے لیکن بعض چیزیں ایسی ہوتی ہیں جو خوشی سے اسے نہیں ملتیں۔ میں تمہیں اصل حیثیت میں چاہتا ہوں۔ میری آرزو ہے کہ تمہارے دل میں میری محبت جاگے اور تم دنیا کو چھوڑ کر میرے قریب آجاؤ۔ مجھ سے کہو...... سلطان! غلطی ہوگئی۔ میں تمہیں سمجھ نہیں سکی تھی۔ سچی مہرالنساء میں تمہیں چاہتا ہوں۔ تمہیں بھی مجھے چاہنا ہوگا۔ لیکن سچے دل سے"۔

"یہ ممکن نہیں سلطان! یہ ممکن نہیں"۔

"تو پھر میرا فیصلہ بھی سن لو، اپنے شوہر کو دیکھ رہی ہو۔ گدھا چیخ چیخ کر آواز کر رہا ہے"۔ سلطان نے حسان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا، جو واقعی اتنی دیر سے مسلسل چیخ رہا تھا اور اب اس کی آواز بیٹھ گئی تھی اور گلا خشک ہوگیا تھا۔ دونوں بچے باپ کی پیٹھ پر جا بیٹھے تھے اور ٹخ ٹخ کر کے اسے گدھا سمجھ کر آگے بڑھانے کی کوشش کر رہے تھے۔ مہرالنساء دوڑ کر شوہر کے پاس پہنچ گئی۔ بچوں کو ڈانٹ کر ہٹایا۔ اسے سہارا دے کر اٹھانے لگی، لیکن وہ مچل مچل کر زمین پر لوٹیں لگانے لگا اور حلق سے جس طرح کی بھی آوازیں نکل رہی تھیں، نکالتا رہا۔ مہرالنساء اسے روکنے میں ناکام رہی تھی۔ بہت دیر تک یہ تماشا جاری رہا اور پھر حسان پر بے ہوشی سی طاری ہونے لگی اور کچھ دیر کے بعد اس نے سر زمین پر ڈال دیا۔

"یہ کیا تماشا لگا رکھا ہے تم نے، کیا کر دیا ہے تم نے میرے شوہر کو۔ میں پوچھتی ہوں کیا کیا ہے تم نے؟ مجھے بتاؤ۔ مجھے جواب دو"۔ اور سلطان نے جلتی ہوئی آنکھوں سے مہرالنساء کو دیکھا۔

"اس وقت جب اس نے تمہیں آم توڑنے کیلئے درخت پر چڑھایا تھا۔ میں نے اسے مارا تھا۔ مہرالنساء! اور میں نے اس سے کہا تھا کہ جو چیز میری ہوتی ہے، اسے کسی کو چھونے کی اجازت نہیں ہوتی۔ میں نے اسے سمجھا دیا تھا۔ اس نے نہیں سمجھا۔ میرے اہلِ خاندان اور تم مجھے معمولی انسان سمجھتے تھے۔ دیکھ لو، میں کتنا معمولی انسان ہوں۔ میں تم سے پھر یہی بات کہتا ہوں۔ اگر تم یقین کرنا چاہو تو کرو۔ بتاؤں تمہیں تم کیا کر سکتی ہو۔ میرے پیر چاٹ سکتی ہو تم"۔

"غلط فہمی کے مریض ہو۔ جاہل جانور ہو، کون سی عظمت ہے تمہارے اندر؟ بتاؤ کون سی عظمت ہے تمہارے اندر؟ کیا عظمت ہے؟ ایک گھٹیا آدمی ہو تم"۔

"مہرالنساء! دیکھو میں کتنا گھٹیا آدمی ہوں"۔ یہ کہہ کر وہ ایک کرسی پر بیٹھ گیا اور اپنے جوتوں کے فیتے کھولنے لگا۔ پھر اس نے مہرالنساء کی طرف دیکھا اور آہستہ سے بولا۔

"یہ میرے پاؤں ہیں۔ وہ تمہارا چہرہ اور اس کے اندر تمہاری زبان آؤ ذرا...... میرے پاؤں چاٹو"۔ مہرالنساء نے نفرت بھری آنکھوں سے اسے دیکھا تو اس نے اپنی آنکھیں مہرالنساء کی آنکھوں میں گاڑ دیں۔ اس کے ہونٹ خاموش تھے، لیکن ذہن مہرالنساء کے ذہن کو کنٹرول کر رہا تھا اور کہہ رہا تھا۔

"تمہارے حواس کا ایک حصہ جاگتا رہے گا، دوسرا سو جائے گا۔ جاگنے والا حصہ تمہیں یہ احساس دلائے گا کہ تم کیا کر رہی ہو اور سو جانے والا حصہ تم سے میرے حکم کی تعمیل کرائے گا۔ زمین پر بیٹھ جاؤ"۔ مہرالنساء نے ایک بار پھر اپنے اندر نفرت کی لہریں محسوس کیں اور اس کے بعد وہ جھکتی چلی گئی۔ پھر ہاتھوں پیروں کے بل چلتی ہوئی اس کے پاس آئی اور اپنی زبان اس کے پاؤں پر لگا دی۔ سلطان نے دونوں پاؤں پیچھے ہٹا لئے تھے۔

"بس اتنا کافی ہے۔ تم دیکھ رہی ہو۔ جان رہی ہو کہ تم کیا کر رہی ہو؟ لیکن تم وہ سب کرنے پر مجبور ہو۔ اب یہ الگ بات ہے کہ میں تمہیں وہ مقام نہیں دینا چاہتا۔ آنے والے وقت میں تم میرے شانوں سے شانہ ملا کر کھڑا ہونے والوں سے ہوگی اور یہ سوچ کر میں تمہیں شرمندہ نہیں ہونے دوں گا کہ میرے حکم پر تم میرے پاؤں چاٹنے پر مجبور ہوگئی تھیں۔ چنانچہ سیدھی کھڑی ہو جاؤ۔ میں تمہارے ذہن کو اپنی گرفت سے آزاد کرتا ہوں"۔ مہرالنساء ایک دم ہوش میں آگئی۔ اسے شدید حیرت تھی کہ اسے کیا ہوگیا تھا۔ بہرحال یہ مرحلہ بھی ٹل گیا اور اس نے کہا۔

"میری کوٹھی یہاں سے تھوڑے ہی فاصلے پر ہے۔ اس کا نمبر ذہن میں رکھو اور میرا ٹیلی فون نمبر بھی۔ تم مجھے یہ بتانا کہ تمہارا شوہر تمہیں کب طلاق دینے پر آمادہ ہے۔ اس سے بات کرلو۔ مہرالنساء یہ میں نے تم سے پہلے ہی کہہ دیا ہے کہ میرے سوا تم اس کائنات میں کسی کی نہیں ہو سکتیں۔ مجھے اس وقت کے لئے مجبور مت کرو۔ جب تمہارا شوہر اس دنیا میں موجود نہ ہو"۔ سلطان یہ کہہ کر واپسی کے لئے مڑ گیا اور مہرالنساء پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھتی رہی۔ سلطان اپنی کار میں بیٹھا اس کے ڈرائیور نے اپنی کار واپس موڑ کر گیٹ سے نکال دی۔ مہرالنساء پر سکتہ سا طاری تھا، جبکہ حسان نیم بے ہوشی کی کیفیت میں اپنی جگہ پڑا ہوا تھا۔ بہت دیر بعد اسے ہوش آیا تو اس نے چونک کر اِدھر اُدھر آنکھیں پھاڑیں اور حیرانی سے چاروں طرف دیکھنے لگا۔ پھر اس کے بعد واقعات کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہوگیا تھا۔ سارا نزلہ حسان پر ہی گر رہا تھا۔ ایک بار وہ پانی کے ٹاور پر چڑھ گیا۔ سیڑھیاں عبور کر کے اوپر پہنچا اور

منکی کے بالکل کنارے آکھڑا ہوا۔ خاصی بلند منکی تھی اور حسان اس سے کودنے پر آمادہ مہرالنساء اسے دیکھ کر خوف سے اپنے سانس بند ہوتے ہوئے محسوس کررہی تھی۔ پھر حسان کو آگیا جس آسانی سے وہ سیڑھیاں چڑھا تھا اس آسانی سے نیچے نہ اتر سکا۔ اس نے دہ زدہ لہجے میں کہا۔ ''میں نہیں جانتا کہ میں اوپر کیسے آگیا''۔ اس نے بتایا۔

''کہ اچانک ہی میرے ذہن میں ایک لہر سی اٹھی تھی اور میں نے سوچا تھا کہ بلند پہنچ کر ہوا میں اڑتا ہوا نیچے آجاؤں''۔ اس نے بہت خوفزدہ لہجے میں کہا۔

''ایسے بہت سے خیالات میرے دل میں آتے ہیں۔ کبھی دل چاہتا ہے کہ سا جاکر سمندر کی گہرائیوں میں اتر جاؤں اور سمندر کے نیچے کی دنیا دیکھوں۔ کبھی دل چاہتا سپر مین کی طرح ٹرین روکوں''۔ یہ ساری باتیں سن سن کر مہرالنساء شدتِ خوف سے دیوانی جارہی تھی۔ ادھر سلطان کے ٹیلی فون اس کے پاس آتے تھے اور حسان جو عمل کرتا تھا۔ سا اسے بتادیا کرتا تھا وہ کہتا تھا۔

''آج وہ سوچ رہا ہے کہ چلتی ہوئی ٹرین کو آگے سے ہاتھ لگا کر کس طرح روکا جا ہے۔ وہ ہر عمل ایک لمحے کے اندر کرسکتا ہے۔ مہرالنساء! لیکن میں اسے ایسا عمل کرنے روک دیتا ہوں، کیونکہ میں نہیں چاہتا کہ میری وجہ سے ایک انسان کی زندگی ضائع ہو۔ اگر ہوا تو وہ میری نہیں تمہاری وجہ سے ہوگا۔ کیا تم نے حسان سے طلاق لینے کے بارے میں کی ہے؟......جھوٹ نہیں بولو گی تم''۔

''نہیں میں نے بات نہیں کی''۔

''کیوں؟''

''اس لئے کہ میں تم سے شادی کبھی نہیں کروں گی۔ میرے اوپر رحم کرو سلطان، میر چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔ تم جانتے ہو کہ طلاق لینے سے کیا ہوگا۔ میرے بچے ساری عم بسی اور بے کسی کا شکار رہیں گے اور سلطان میں ایک بات اور بتادوں۔ یقین کرو روز سے میں نے تمہیں صرف اپنا بھائی سمجھا ہے، کیونکہ میں تمہارے ساتھ پل کر جوان ہوئی ہو میں نے کبھی تمہارے بارے میں اس انداز میں نہیں سوچا۔ تم میرے ساتھ یہ سلوک مت مجھ پر نہیں تو میرے بچوں پر رحم کھاؤ''۔

''تم نے مجھ پر رحم کھایا۔ میں نے وہ قوتیں حاصل کرلی ہیں، جو مجھے آخری عم

بنائے رکھ سکتی ہیں، لیکن میں تمہیں نہیں پاسکا اور جب میں صرف اپنی انا کی خاطر تمہیں کررہا ہوں تو تم نخرے کررہی ہو۔ میں نہیں جانتا تمہارے بچوں کو۔ میں یہ بھی نہیں جانتا مجھ سے نہیں حسان سے محبت کرتی تھیں۔ جب میں تم سے محبت کرتا ہوں تو تم بھی مجھ محبت کرتی ہو۔ سمجھیں، ایسا نہیں ہوسکتا۔ جو کچھ میں نے کہا ہے تم اس کے لئے ایک وقت نہیں کرلو ورنہ اس کے بعد تم بیوہ کہلاؤ گی، سمجھ رہی ہو نا تم''۔ مہرالنساء کی صحت گرنے لگی حسان بھی پریشان تھا، سلطان اس دن کے بعد ان کی کوٹھی میں نہیں آیا تھا، لیکن حسان اس سلسلے میں کہتا رہتا تھا۔

''مجھ پر عجیب وغریب کیفیتیں طاری ہوتی رہتی ہیں۔ مہرالنساء! ہم کیا کریں''۔ یہ تھی النساء کی کہانی اور اس کے بعد مہرالنساء شدید پریشانیوں کا شکار ہوکر اِدھر اُدھر بھٹکنے لگی اور دن اس نے مجھ سے رابطہ قائم کیا، کہنے لگی۔

''جو کچھ ہونا ہوتا ہے وہ تقدیر کا ایک حصہ ہوتا ہے۔ جناب! ہم ہر سلسلے میں اللہ سے مدد تے ہیں اور مدد کرنے والی ذات صرف ذاتِ باری کی ہے۔ اس کے حکم کے بغیر پتہ نہیں ہلتا اللہ رب العزت ہر مسئلے کے لئے کوئی نہ کوئی ذریعہ بناتا ہے۔ میرا ذہن محترم! آپ کی گیا اور میں آپ کے پاس آئی ہوں۔ مجھے بتایئے کہ اللہ نے شیطان کو یہ موقع دیا ہے وہ اپنی شیطانی حرکتوں سے مخلوق کو گمراہ کرے، لیکن مخلوق کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ اللہ کا سہارا کر شیطان کی حرکتوں سے محفوظ رہے اور اس کے لئے ذاتِ باری نے اپنی مخلوق کو لاکھوں سہارے دیئے ہیں اور شیطان مردود کو ناکامی کا منہ دیکھنا پڑتا ہے، لیکن اس کا اپنا بھی ایک ہے جو وہ آسانی سے کرتا رہتا ہے اور بہت سے لوگ اس کے آلہ کار بن جاتے ہیں۔ کیا کے حوالے سے آپ میرا ذریعہ نہیں بن سکتے؟

بات کچھ اس انداز میں شروع کی گئی تھی کہ میری ساری توجہ اس کی جانب ہوگئی۔ میں سے کہہ چکا ہوں کہ یہ کہانی میری نہیں بلکہ مہرالنساء کی ہے یا آپ اسے سلطان کی کہانی یا زمانے میں بکھری ہوئی لاکھوں داستانوں میں سے ایک جو بہرحال داستانیں ہوتی مجھ پر یہ ذمہ داری عائد ہوگئی تھی کہ میں ایک ایسے شخص سے رجوع کروں جو عجیب و قوتوں کا مالک ہے۔ اس وقت میں نہیں جانتا تھا کہ سلطان ہپناٹزم جانتا ہے اور وہ بھی جدید اور طاقتور انداز میں۔ اب میرے لئے ایک مشکل مسئلہ تھا کہ میں سلطان سے

کیسے رابطہ قائم کروں۔ میں نے اپنے ساتھیوں کو مہرالنساء کے بتائے ہوئے پتے پر بھیجا، انہیں ہدایت کی کہ جس طرح بھی ممکن ہوسکے۔ وہ سلطان سے رابطہ قائم کریں اور اسے دوست بنائیں۔ وہ لوگ اس میں مصروف ہوگئے۔ آخرکار ناصر فرازی نے ذہانت سے کام لے کر سلطان سے رابطہ قائم کرلیا، وہ اس کا طریقہ کار تھا۔ اس میں میری کوششوں کا دخل نہ تھا۔ ناصر فرازی نے کچھ اس طرح سلطان سے میرا تذکرہ کیا کہ سلطان نے مجھ سے ملنے کی خواہش کا اظہار کردیا اور ناصر فرازی نے اسے ملاقات پر آمادہ کرکے وقت کا تعین کرلیا۔ بہرحال میں سلطان کا انتظار کرنے لگا اور وقتِ مقررہ وہ میرے پاس آگیا"۔

شخصیت انتہائی شاندار تھی۔ میں نے بھی اس کی بھرپور پذیرائی کی۔ سب کچھ ایک منصوبے کے تحت ہورہا تھا۔ اس نے ہمارے اس کارخانے کو دیکھ کر طنزیہ انداز میں مسکراتے ہوئے کہا۔

"میرا خیال تھا آپ لوگ مختلف شخصیت کے مالک ہوں گے، لیکن آپ کے اس اڈے کو دیکھ کر یہ احساس ہوتا ہے کہ آپ لوگ بھی بس پیٹ پوجا کرنے والے لوگ ہیں"۔ میں نے فراخدلی سے سلطان کی باتوں کو برداشت کیا۔ صاف ظاہر ہورہا تھا کہ وہ انتہائی غرور میں ڈوبا ہوا ہے۔ اس نے مجھ سے سوال کیا۔

"مجھے ایک بات بتائیے جناب تنویمی قوتوں کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے"۔

"ان کا وجود ہے اور وہ بڑی طاقتور حیثیت رکھتی ہیں"۔

"اگر آپ کا واسطہ کبھی ان چیزوں سے پڑجائے تو آپ ان سے کیسے بچ سکتے ہیں"۔

"تمہارا اپنا اس بارے میں کیا خیال ہے سلطان؟"

"ہپناٹزم جادوئی علم ہے بلکہ وہ ایک مکمل جادو ہے، لیکن وہ سفلی علم نہیں ہے۔ نہ ہی اس کا روحانیت سے کوئی تعلق ہے۔ یہ صرف انسان کی ذہنی قوتوں کا اظہار ہے"۔

"شاید، لیکن تمہارا کیا خیال ہے کیا ہپناٹزم کسی موقع پر مار کھا سکتا ہے"۔

"ہرگز نہیں...... ہرگز نہیں...... یہ ممکن نہیں ہے"۔

"خیر...... تم ان باتوں کو چھوڑو۔ میں تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں"۔

"جی فرمائیے"۔

"مہرالنساء کا پیچھا چھوڑ دو۔ اسی میں تمہاری بھلائی ہے"۔

وہ ایک دم چونک پڑا، پھر گردن ہلاتا ہوا بولا۔

"ہوں...... اس کا مطلب ہے کہ یہ سب کچھ ایک منصوبے کے تحت ہوا ہے۔ یقیناً مہرالنساء یا حسان نے آپ سے رجوع کیا ہے"۔

"ہاں...... وہ بچی پریشان ہے۔ وہ شوہر پرست اور وہ بچوں کی ماں ہے۔ وہ اپنے بچوں اور اپنے شوہر کی سرپرستی میں پروان چڑھانا چاہتی ہے اور اس کی یہ خواہش بالکل جائز اور نیک ہے۔ میں تم سے درخواست کرتا ہوں کہ تم اس کا پیچھا چھوڑ دو۔ تمہارے ماں باپ جنہیں تم بھلائے ہو، تمہاری توجہ کے طالب ہیں۔ اپنی دولت سمیٹو اور واپس اپنے گھر چلے جاؤ"۔

"خوب...... اچھی ہے یہ نیکیوں کی تلقین، لیکن باقی باتیں بھی آپ کے علم میں آچکی ہوں گی"۔

"ہاں...... آچکی ہیں، اسی لئے میں تم سے یہ کہہ رہا ہوں"۔

"دیکھئے جناب! میں آپ کی توہین نہیں کرنا چاہتا۔ میں ہنس رہا ہوں، اس بات پر کہ کس طرح مہرالنساء نے کچھ سڑک چھاپ لوگوں سے رجوع کیا ہے اور یہ سمجھ رہی ہے کہ اس کا کام بن جائے گا"۔

"اس سے زیادہ تلخ الفاظ اگر کہنا چاہتے ہو اور اس میں تمہیں کچھ ذہنی سکون ملتا ہے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے سلطان، لیکن اپنے طور پر فیصلے کرلینے والے عام طور پر احمق کہلاتے ہیں۔ میں تمہاری اس بات پر ذرا بھی اعتراض نہیں کرتا کہ ہم سڑک چھاپ لوگ ہیں، لیکن میں تمہیں ایک بات بتائے دیتا ہوں۔ وہ یہ ہے کہ تمہیں بہرحال مہرالنساء کا پیچھا چھوڑنا ہوگا"۔ وہ مسکرایا اور بولا۔

"ایک شرط ہے"۔

"ہاں بولو"۔

"آپ اپنی آنکھوں سے یہ چشمہ اتار دیجئے۔ میری آنکھوں میں دیکھئے اور اس کے بعد فیصلہ کرلیجئے کہ معاف کیجئے گا، آپ کی یہ سڑک چھاپ قوتیں زیادہ حیثیت رکھتی ہیں یا پھر میری تنویمی قوتیں"۔

"یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔ ہوسکتا ہے میں تمہارا مقابلہ نہ کرسکوں اور ویسے بھی اگر تم مجھے سڑک چھاپ کہتے ہو تو میں تم سے یہ درخواست تو کرسکتا ہوں کہ سڑک چھاپ کی عزت رکھ لو

اور اس کی روزی کو برقرار رہنے دو"۔

"اگر کچھ ضرورت ہے تو مجھ سے مانگ لو، میرے دوست۔ میں تمہاری مالی مد کرسکتا ہوں، لیکن کسی کے ذاتی معاملات میں اس طرح گھسنا کبھی کبھی بڑے نقصان کا باعث بن جاتا ہے اور یہ نقصان تم بھی اٹھا سکتے ہو"۔

میں کچھ لمحے سوچتا رہا۔ پھر میں نے کہا۔

"گویا تم یہ کہنا چاہتا ہو کہ تم بہت بڑی قوتوں کے مالک ہو"۔

"بات شاید غرور کی منزل میں داخل ہوجاتی ہے، لیکن غرور کا حق بھی اسے ہی پہنچتا ہے جس کے پاس طاقت ہو۔ ایسا کرلو۔ ہم لوگ ایک ایک وار کرلیں، ایک دوسرے پر جو کامیاب ہوجائے"۔

میں نے ایک لمحے تک کچھ سوچا۔ شکار رینج پر آگیا تھا۔ میں جن عطا کردہ قوتوں پر بھروسہ کرسکتا تھا، بس وہی میری مشعل راہ تھیں ورنہ باقی کچھ بھی نہیں تھا، میرے پاس"۔ اس نے مسکراتے ہوئے گردن ہلائی اور کہا۔

"تو تم کیا چاہتے ہو؟"

"مہرالنساء آپ کے پاس آئی تھی۔ میں نے اس سے کہہ دیا ہے کہ میں حسان کو تلا کرکے اسے حاصل کرلوں گا۔ میری زندگی کا یہی مقصد ہے۔ وہ اپنے سہارے تلاش کر پھر رہی ہے اور اب اس نے آپ سے رجوع کیا ہے۔ آپ اس کے لئے جو کچھ کرسکتے ہیں ضرور کریں، مگر میں آپ سے ایک بات کہتا ہوں۔ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دو منٹ صرف کرلیں، اس کے بعد آپ جو کہیں گے میں کرلوں گا...... ورنہ پھر جو میں آپ سے کہوں وہ آپ کریں۔ کیا سمجھے آپ"۔

"پہلا وار تم کرو گے؟"

"آپ کرلیجئے۔ مجھے اعتراض نہیں ہے"۔

میرے لئے ایک دلچسپ مرحلہ آگیا تھا۔ جو آنکھیں میری آنکھوں کے حلقوں میں تھیں اور جو آنکھیں ضرغام یا پروفیسر ضرغام کی قوتوں کی عطاء کردہ تھیں، کیا وہ میرے لئے کارآمد ہوسکتی ہیں یا میں بھی اس ہپناٹزم کی قوت سے متاثر ہوجاؤں گا"۔

یہ انتہائی دلچسپ مرحلہ تھا اور میرا خیال ہے میرے مدِمقابل کے لئے انتہائی حیرت

بڑا عام لوگوں کے لئے ہوا کرتا تھا، بہت سے ایسے دلچسپ واقعات تھے جن میں میرے مدِمقابل بھڑ جاتے تھے اور اس کے بعد جب انہیں یہ اندازہ ہوتا تھا کہ میری تو آنکھیں ہی نہیں تو وہ ششدر رہ جاتے تھے۔ وہ مسکراتی ہوئی نگاہوں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ میں نے کہا۔

"دیکھو...... سلطان...... میں ایک دوست کی حیثیت سے ایک بھائی کی حیثیت سے تمہیں سمجھا رہا ہوں، اگر تمہیں کوئی قوت حاصل ہوگئی ہے تو اس پر غرور نہ کرو۔ ایسی قوتیں آنی جانی چیز ہوتی ہیں۔ آج تم اس کے سہارے اپنے دشمنوں کی تعداد میں کتنا ہی اضافہ کرلو۔ کل جب یہ قوتیں تم سے چھن جائیں گی تو تم خود سوچو اور اس کے علاوہ ایک بات اور دینے والی ذات بڑی ہے۔ اس نے اگر تمہیں کچھ دے ہی دیا ہے تو اسے غلط کاموں میں استعمال نہ کرو۔ یہی تمہارے حق میں بہتر رہے گا"۔

"دیکھو بھائی! ایک بات تم سے کہہ دوں۔ میں نے اس زمانے میں خاصی چوٹیں کھائی ہیں۔ بڑی ناکامیوں کا سامنا کیا ہے، میں نے اور اب جب مجھے یہ قوت حاصل ہوگئی ہے تو میں فرشتہ نہیں ہوں کہ درویش بن کر بیٹھ جاؤں اور دنیا کو معاف کرتا رہوں۔ مہرالنساء میری پہلی اور آخری آرزو تھی اور اب جب میں اسے حاصل کرنے کے قابل ہوگیا ہوں تو میرا ظرف اتنا بلند نہیں ہے کہ میں اسے نظرانداز کردوں"۔

"ہوں...... اگر عام حالات ہوتے تو تم یہ کوشش کرتے ہوئے اچھے لگتے سلطان...... لیکن اب وہ ایک گرہستن ہے۔ بال بچوں والی عورت"۔

"ہاں! مگر میرے لئے وہ آج بھی ایک چیلنج ہے اور تم برا تو مانو گے میرے الفاظ کا۔ تم بڑک چھاپ عامل پتھر کے ٹکڑوں کی طرح بکھرے نظر آتے ہیں۔ تمہاری اپنی اوقات کیا ہے، یہ میں تمہیں ابھی بتائے دیتا ہوں، چشمہ اتارو"۔

"اس سے پہلے ایک بات اور کرنی ہے تم سے۔ ابھی تم نے کہا تھا کہ میں تم پر وار کروں تم مجھ پر وار کرو جو بھی کامیاب ہوگیا وہ دوسرے کی بات مان لے گا"۔

"حالانکہ مجھے تمہاری بات ماننے کی کوئی ضرورت نہیں ہے، لیکن پھر بھی میں تمہیں موقع دے رہا ہوں"۔

"ٹھیک، چلو پھر تم ہی شروع ہوجاؤ"۔ میں نے کہا اور اس کے بعد میں نے اپنا چشمہ اتارا۔ وہ مسکراتی ہوئی نگاہوں سے مجھے دیکھ رہا تھا، لیکن چشمہ اتارنے کے بعد جب اسے میری

آنکھوں میں وہ گہرے گڑھے نظر آئے تو وہ حیرت سے اچھل پڑا اور وہ قدم پیچھے ہٹ گیا۔

"یہ...... یہ...... یہ کیا...... تم...... تم اندھے ہو"۔ اس کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

"ہاں میری آنکھیں نہیں ہیں"۔

"مم...... مگر تم...... تم...... تم تو اس طرح عمل کرتے ہو جیسے تمہاری آنکھیں موجود ہوں۔ میں نے کئی ایسے لوگوں کو دیکھا ہے جو نابینا ہوتے ہیں، لیکن ان کی حسیات بے حد تیز ہوتی ہیں، مگر تم، یہ تو بڑی عجیب بات ہوئی تم نے مجھے پہلے اس بارے میں نہیں بتایا"۔

"کون اپنے بارے میں بتانا پسند کرتا ہے۔ اب تم مجھے ہپناٹائز کرو"۔

"تمہاری آنکھیں ہی نہیں ہیں"۔

"یہ میرا قصور تو نہیں ہے۔ تمہارا کیا خیال ہے سلطان، تمہارے خوف سے میں نے اپنی آنکھیں نکال کر رکھ دی ہیں"۔

"تم بہت عجیب لگ رہے ہو مجھے۔ تمہارے چہرے کی کسی شکن سے پتہ نہیں لگتا کہ تم بغیر آنکھوں والے ہو"۔

"تم یقین کرو، ان ساری باتوں میں میرا کوئی قصور نہیں ہے لیکن تم اگر حسیات کی بات کرتے ہو تو میں تمہیں بتادوں کہ میں تمہارے لباس کا رنگ، تمہارے ہاتھ کی لکیروں تک کے بارے میں بتا سکتا ہوں"۔

"خیر یہ تو ممکن نہیں ہے"۔ وہ پھیکی سی ہنسی کے ساتھ بولا۔

"تمہارے جسم پر پنک کلر کی قمیض ہے، جس پر ہلکا بلیک چیک ہے اور تمہاری پینٹ ... کلر کی ہے۔ تمہارے جوتوں کا رنگ کالا ہے اور کچھ پوچھنا چاہتے ہو؟"

وہ واقعی شدت حیرت سے گنگ رہ گیا تھا۔ کافی دیر تک وہ پریشان رہا پھر اس نے کہا۔

"لیکن اب تو تمہاری شرط ختم ہوگئی۔ جب تمہاری آنکھیں ہی نہیں ہیں تو میں تمہیں ہپناٹائز کروں گا"۔

"دیکھا...... قدرت کے ایک ہلکے سے عمل سے تم کس طرح بے بس ہوگئے۔ ایک منٹ رکو۔ تم نے مجھے سڑک چھاپ عامل کہا ہے۔ عامل تو بہت بڑی چیز ہوتا ہے میں تو ایک ناچیز ہوں۔ ذرا ایک لمحے رکو۔ اس کے بعد فیصلہ کرنا کہ تمہیں کیا کرنا ہے"۔ میں نے

...ت وہ دوشالہ مجھے دنیا کی عظیم ترین شے محسوس ہوا۔ میں نے وہ دوشالہ اس کے سر پر ... اور وہ حیرت سے مجھے دیکھنے لگا، پھر بولا۔

"یہ کیا ہے؟" مگر میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ کچھ لمحے خاموش رہا، پھر میں نے کہا۔

"میں چاہتا ہوں کہ تم نیکیوں کے راستے اپناؤ اور اس بال بچوں والی عورت کو نظر انداز ... اچھی زندگی گزارو، اپنی قوت سے کسی کو نقصان نہ پہنچاؤ"۔

رفتہ رفتہ سلطان کی آنکھیں، بند ہوتی چلی گئیں۔ کوئی دو منٹ تک وہ اسی طرح آنکھیں ... کئے سر جھکائے بیٹھا رہا۔ دوشالہ اس کے سر پر پڑا ہوا تھا۔ پھر اس نے گردن اٹھائی اور ... نرمی سے بولا۔

"میں معافی چاہتا ہوں...... واقعی میری غلط سوچ نے مجھے غلط راستے دکھادیئے تھے۔ ... ہے محترم بھائی۔ مہرالنساء میرے لئے اب بہن کی حیثیت رکھتی ہے اور میں تمہاری تمام ... ت پر عمل کروں گا"۔

میرا دل خوشی سے جھوم اٹھا تھا، مجھے ایک بار پھر کامیابی حاصل ہوئی تھی۔ وہ تھوڑی دیر بعد مجھ سے اجازت لے کر چلا گیا۔ بعد میں ساری تفصیل میرے علم میں آگئی۔ اس نے ... سے معافی مانگی تھی اور اس سے کہا تھا کہ وہ آئندہ اس کے راستے میں نہیں آئے گا۔ ... قدرت کی ان نوازشوں کا کس دل سے شکریہ ادا کرتا۔ مجھ جیسے ناچیز کو اس نے کس عظیم ... سے نواز دیا تھا، جبکہ میں تو اس کے قابل بھی نہیں تھا۔ میں نے دنیا میں کون سی نیکی کی ... برائیوں کی پوٹ تھا میں لیکن دینے والا تو کسی کو کچھ بھی دے سکتا ہے۔

❁❁❁❁

ناصر فرازی، میں اور ہمارے دوسرے ساتھی ہر طرح سے اب ایک خوشحال زندگی گزار رہے تھے۔ کبھی کبھی شیطان میرے دماغ میں آگھستا تھا اور میں سوچتا تھا کہ میں اپنی ان پُراسرار ... کو صحیح طور پر استعمال ہی نہیں کر رہا۔ میں تو کچھ سے کچھ بن سکتا ہوں۔ میں وہ زندگی نہیں ... رہا جو مجھے گزارنی چاہئے۔

بہرحال یہ عطیات میرے لئے بڑی اہمیت کے حامل تھے۔ کافی دن گزر گئے تھے اور ... ناصر بور ہو رہا تھا، کہنے لگا۔

"یار ایسا لگتا ہے جیسے ہمارا کاروبار بند ہوگیا، بہت دن سے کوئی کلائنٹ ملا ہی نہیں"۔

"تمہیں کسی شے کی ضرورت ہے؟"

"نہیں، لیکن زندگی میں اگر جدوجہد اور تحریک نہ ہو تو زندگی بے معنی ہوتی ہے۔"

"انتظار کرو۔ ممکن ہے کوئی نئی کہانی دبے قدموں ہماری طرف بڑھ رہی ہو"۔ م مسکراتے ہوئے کہا۔

میرا کہنا بالکل ٹھیک تھا۔ کہانیوں کے بازار میں بھلا کہانیوں کی کیا کمی اور پ مشکلات میں گھر کر سہارے تلاش کرنا تو انسان کی فطرت ہے۔ وہ بھی کسی مشکل کا ش وقت اسے ہمارے پاس لے آیا تھا۔

"تم لوگ واقعی کچھ روحانیت رکھتے ہو یا صرف لوٹ مار کرنے بیٹھے ہو؟" ا بدتمیزی سے کہا۔ ناصر فرازی تو سرخ ہوگیا، لیکن میں نے حلیمی سے کہا۔

"یہ تو خود تمہیں فیصلہ کرنا چاہئے۔ اگر ہمیں لٹیرا سمجھتے ہو تو بہتر ہوگا کہ خود کو لٹنے سے

"میری بات کا برا تو نہیں منایا تم نے؟"

"تم بیمار ہو اور کسی بیمار کی بات کا کیا برا منایا جائے"۔

"تم نے بالکل ٹھیک کہا۔ خدا کے لئے مجھے بتاؤ کیا تم میری بیماری کا علاج کر سکتے

"کوشش کریں گے"۔

"میں اپنے ماضی میں ڈوب گیا ہوں۔ میرا ماضی میرا دکھ ہے"۔

"ضرور ہوگا۔ دل چاہے تو ہمیں اپنا دکھ بتاؤ...... میں نے ہمدردی سے کہا اور ا میں ڈوب گیا"۔ پھر گردن اٹھا کر بولا۔

❀❀❀

"ماضی بھی ایک انوکھی کہانی ہوتا ہے، لیکن کبھی کبھی زیادہ دور جانے کو دل نہیں انسان تنہا ہو تو کچھ بھی ہوسکتا ہے...... میں بھی تنہا تھا۔ نہ جانے میرے ساتھ کچھ ہوگیا لکھا ہوں، نوکری کر رہا تھا۔ کسی نے جرم کیا اور پھنس گیا۔

صاحبِ جرم بچ گیا...... اور قانون نے مجھے سزا دے دی اور وہ بھی پورے چار سال مقدمہ چلا...... جیل پہنچ گیا، لیکن انسپکٹر علی رحمان نے جیل جانے سے پہلے بھی کہا تھا کہ سکندر میں جانتا ہوں تم مجرم نہیں ہو۔

"سر میں کیا کروں"۔

"تم کچھ کر سکتے ہو نہ میں...... البتہ ایک بات میں کہنا چاہتا ہوں"۔

"؟"

"جیل سے چھوٹو تو مجھ سے ضرور ملنا"۔

"کیا فائدہ......؟" میں نے کہا۔

"میں چاہتا ہوں کہ تم عادی مجرم نہ بنو"۔

"سر یہ تو کوئی بات نہ ہوئی...... مجھے ناکردہ گناہ کی سزا سے بچائیے"۔

"افسوس...... کاش میں ایسا کر سکتا"۔

"جیل گیا...... چار سال کاٹے اور باہر کی دنیا میں آ گیا...... عجیب ہوگئی تھی یہ دنیا...... ل علی رحمان کو تلاش کیا گیا۔ انہوں نے مجھے پہچان لیا تھا مل کر خوش ہوئے اور بولے۔

"کیا کر رہے ہو آج کل؟"

"فیصلہ" میں نے کہا۔

"کیا فیصلہ؟"

"یہی کہ ایک سادہ لوح انسان کو اگر جرم کی دنیا میں لایا جائے تو اس کا مستقبل کیا ہوتا ہے...... برائیوں کے راستے کھلے ہوئے ہیں اور نیکیوں کے دروازے بند...... جیل میں ں نے بہت سی استادیاں سکھا دی ہیں۔ آزمانا نہیں چاہتا، لیکن اب حالات مجبور کر رہے ہ کچھ کیا جائے"۔

"کوئی نوکری نہیں ملی؟"

"نہیں"۔

"کس قسم کی ملازمت پسند کرو گے؟"

"محکمہ پولیس میں بھرتی کرا دیجئے"۔ میں نے ہنس کر کہا اور وہ بھی ہنس پڑے، پھر بولے۔

"تم ذہین اور تیز آدمی ہو، پڑھے لکھے بھی ہو...... محکمہ پولیس ہی سے متعلق کوئی کام ے سپرد کیا جائے تو کرو گے۔ غور کر کے جواب دو۔ کام دلچسپ اور ذہانت کا ہے اور میرا چاہتا ہے کہ تم پر اعتماد کر لوں...... ایک تجربہ ہی سہی...... عارضی ملازمت ہے...... تنخواہ دو معاہدہ پانچ ماہ...... پوری تنخواہ ایڈوانس"۔

"لائیے" میں نے ہاتھ پھیلا دیئے۔

''میں نے مذاق نہیں کیا...... یوں لگتا ہے جیسے مجھے تمہاری ہی تلاش تھی...... کچھ الجھن
تھا''۔

''ایک منٹ بیٹھو میں ابھی آیا''۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھ گئے اور میں انتظار کرتا رہا۔
واپس آ کر علی رحمان نے دس ہزار روپے میرے ہاتھ میں رکھ دیئے...... میں حیران نگاہوں سے
انہیں دیکھنے لگا۔ تو وہ بولے۔

''تمہیں سنجیدہ ہوتا ہے''۔

''مجھے کیا کرنا ہے''۔ میں نے بھرائے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''کوئی غیر قانونی کام''۔

''سو فیصد، قانونی خطرات سے محفوظ، بشرطیکہ تم خود کوئی خطرہ مول لینا پسند نہ کرو۔
سکندر...... ! ایک ایسا کیس میرے پاس ہے۔ جو ابھی پولیس کیس نہیں بن سکا، لیکن کچھ وجوہ
کے تحت مجھے اس پر کام کرنا ہے...... میں الجھن میں تھا کہ کیا کروں۔ اچانک مجھے تم سے
لینے کا خیال آیا ہے...... معاملہ دلچسپ ہے اور تمہیں اس کام میں لطف آئے گا، لیکن دیکھو
کے راستوں پر نہ نکل جانا...... قانون فولاد سے۔ زیادہ مضبوط ہوتا ہے...... وہ تمہیں نہیں چھوڑے
گا اور پھر میری نصیحت ہے کہ برائی کے راستے خوب صورت ضرور ہوتے ہیں، لیکن ان
اختتام دردناک ہوتا ہے''۔

''میں جانتا ہوں''۔

''خدا کو حاضر و ناظر جان کر کہو کسی بھی حالت میں یہ نہ ظاہر کرو گے کہ میں نے تمہیں
کام پر مامور کیا تھا اور جو کام تمہارے سپرد کیا جائے گا، اسے دیانت داری سے سرانجام دو گے''

''ایک گنجائش دیں''۔ میں نے کہا۔

''کیا؟''

''کام کی نوعیت معلوم ہونے کے بعد میں اگر اسے کرنا پسند نہ کروں تو یہ دس ہزار آپ
واپس کر کے خود بھی واپس جا سکتا ہوں''۔

''ہاں...... لیکن ان معاملات کو میری امانت تصور کرو گے اور اس گفتگو کو اپنی ذات سے
آگے نہ بڑھاؤ گے''۔ میں نے وعدہ کیا اور پھر وہ الفاظ دہرائے جو علی رحمان نے کہے
انہوں نے مطمئن انداز میں گردن ہلا دی اور میں نے کہا۔

''کیا آپ کو مجھ پر یقین ہے کہ میں یہ کام کر لوں گا''۔

''سو فیصد''۔ انہوں نے مسکرا کر کہا۔

''کیوں؟''

''پتہ نہیں......'' انہوں نے میرے ہی انداز میں کہا اور مجھے ہنسی آ گئی...... پھر ہم سنجیدہ
ہو گئے، علی رحمان نے کہا۔

''اس کا نام غلام غوث ہے...... ڈیفنس میں کوٹھی نمبر 709 میں رہتا ہے۔ اس کا دفتر
ڈیوس اسکوائر میں وہ منزلہ ہے، کمرہ نمبر 90، گیارہ بجے سے دو بجے تک ملتا ہے۔ تم اس کے
دفتر جاؤ گے اور ہاں، کیا تم ڈرائیونگ جانتے ہو؟''

''اچھی طرح''......

''لائسنس ہے''۔

''تھا...... میرے سامان کے ساتھ گم ہو گیا''۔

''کیا مطلب...... کیسے؟'' وہ چونک کر بولے اور میں نے انہیں پوری کہانی سنا دی، جس
پر انہوں نے ایک ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔

''تمہارا یہ نقصان بھی پورا کیا جائے گا''۔

''اس کی بات نہ کریں...... علی رحمان، میرے نقصانات تو بہت زیادہ ہیں...... آزاد
زندگی کے چار سال مجھ سے چھینے گئے ہیں، جبکہ کوئی گناہ نہیں کیا تھا...... میری شخصیت کا وقار
چھن چکا ہے...... میری حیثیت مسخ ہو گئی ہے۔ اب میں ایک سزا یافتہ آدمی ہوں''۔

''مجھے اس کا رنج ہے، کاش، میں یہ سب کچھ دے سکتا لیکن خیر چھوڑو، لائسنس کا مسئلہ
بھی حل کر دیا جائے گا۔ تو میں تمہیں غلام غوث کے بارے میں بتا رہا تھا۔ تمہیں کل بارہ بجے
اس کے پاس جانا ہے اسے ایک ڈرائیور کی ضرورت ہے...... تم اس کے ہاں نوکری کرو گے''۔

''ڈرائیور کی''۔

''ہاں اس میں ہتک نہ محسوس کرنا...... یہ ایک سرکاری کام ہے۔ تم اس سے کہو گے کہ
تمہیں سلطان احمد نے بھیجا ہے۔ بس اتنا کہہ دینا کافی ہے''۔

''وہ مجھ سے سلطان احمد کے بارے میں پوچھے گا''۔

''بالکل نہیں بس یہ نام کافی ہوگا''۔

''پھر کیا کرنا ہے؟''۔

"وہ تمہیں اپنی کوٹھی پر ہی رکھے گا، اس کوٹھی کی حالت پر گہری نگاہ رکھنی ہے...... غلام غوث خان تم پر اعتماد کرے گا، مگر تم اس پر اعتماد نہیں کرو گے...... وہ جو کچھ کہے گا اس پر غور کرو گے۔ پھر عمل کرو گے، کوئی غیر قانونی کام نہیں کرو گے اور اس کی اطلاع مجھے دو گے یا وہاں سے کوئی بات معلوم ہو تو مجھے اس کی اطلاع دو گے۔ مزید تفصیلات میں تمہیں بعد میں بتاؤں گا"۔

"وہاں کوئی جرم ہو رہا ہے؟"

"بظاہر نہیں لیکن ہو سکتا ہے۔ تم پر اسے روکنے کی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی، ہاں اگر صورتِ حال علم میں آجائے تو مجھے آگاہ کرنا ضروری ہے"۔

"ٹھیک ہے کام دلچسپ ہے، لیکن بعد میں اس جرم کا ذمہ دار مجھے نہ قرار دیا جائے"۔

"میں نے پہلے بھی ایسا نہیں کیا تھا...... تم ناتجربے کاری میں گرفت میں آگئے تھے، مگر اب تم ناتجربہ کار نہیں ہو"۔

میں گردن جھکا کر کچھ سوچنے لگا...... جو ہونا تھا وہ ہو چکا تھا اور میری کوشش سے وہ لمحات واپس نہیں آسکتے تھے، جن میں۔ میں نے ایک سنہرے دور کے خواب دیکھے تھے۔ اب، تو ان حسین لمحات کے سلگتے کھنڈر میرے سامنے تھے اور میں جینا چاہتا تھا...... ایک بے قصور نوجوان تھا میں، جس پر جرم مسلط کر دیا گیا تھا...... میں موت کی آرزو کیوں کروں، چنانچہ میں تیار ہو گیا"۔

"ڈرائیور کی تنخواہ بھی ملے گی"۔ میں نے کہا۔

"ظاہر ہے"۔ علی رحمان نے کہا۔

"اور یہ نوکری مجھے یقیناً مل جائے گی"۔

"یقیناً"۔

"تب پھر یہ تنخواہ میرے حق میں نہیں تھی...... آپ یہ رقم واپس لے لیں"۔ میں نے دس ہزار روپے علی رحمان کے سامنے ڈال دیئے اور وہ مسکرانے لگے پھر بولے۔

"نہیں مسٹر سکندر...... درحقیقت تم ڈرائیور نہیں ہو، تمہارا اصل کام وہ ہے جو ایک پولیس افسر کی طرف سے تمہیں دیا گیا اور اس کی تمہیں تنخواہ دی گئی ہے...... ڈرائیور کی تنخواہ کام کے دوران ہونے والی آمدنی تصور کر سکتے ہو"۔

"تب میں اس میں سے ایک ہزار روپے رکھے لیتا ہوں، باقی نو ہزار روپے میری

امانت، ویسے بھی ڈرائیور کی نوکری کے لئے جانے والے کے پاس دس ہزار روپے کی خطیر رقم نہیں ہونی چاہئے"۔

ذیشان سکوائر کی دوسری منزل کے کمرہ نمبر نو میں داخل ہو کر میں نے حیرت بھری نظروں سے وہاں کے ماحول کو دیکھا...... بڑا سا ہال نما کمرہ تھا...... دیواروں پر نفیس ووڈن ورک کرایا گیا تھا...... بہترین میزیں اور کرسیاں پڑی ہوئی تھیں...... سامنے ہی ایک گلاس کیبن بنا ہوا تھا، جس میں ایک کرسی پر کوئی نظر آرہا تھا، لیکن پورا ہال خالی تھا...... یوں لگتا تھا جیسے پورا اسٹاف چھٹی پر گیا ہوا ہو۔ میں جھجکتے ہوئے گلاس کیبن کی طرف بڑھ گیا۔

دروازہ کھولا، دبلے پتلے جسم کا ایک ادھیڑ عمر شخص قیمتی کرسی پر نیم مردہ کیفیت میں پڑا ہوا تھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور وہ گہرے سانس لے رہا تھا...... عجیب گھپلا تھا، کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا...... چند لمحات پریشان کھڑے رہنے کے بعد میں زور سے کھنکارا اور نیم مردہ شخص اچھل پڑا...... اس نے آنکھیں کھول کر خوفزدہ نگاہوں سے مجھے دیکھا اور پھر سنبھل کر بیٹھ گیا...... اس کا سانس دمے کے مریضوں کی طرح چل رہا تھا اور حلق سے ایک باریک سی آواز نکل رہی تھی۔ میں ہمدردانہ نگاہوں سے اسے دیکھنے لگا۔

یوں لگ رہا تھا کہ جیسے وہ کچھ بولنے کی کوشش کر رہا ہو، لیکن بول نہ پا رہا ہو...... پھر اس کی نگاہوں کا زاویہ تبدیل ہوا اور وہ ایک طرف دیکھنے لگا...... میری نگاہیں غیر ارادی طور پر اُٹھ گئیں...... وہاں پانی کا کولر اور گلاس رکھا ہوا تھا۔ میں فوراً اس طرف بڑھا اور میں نے اسے کولر سے پانی بھر کر پیش کیا۔ اس نے کانپتے ہاتھوں سے لیا اور پانی پینے کے بعد اس کا سانس اعتدال پر آنے لگا...... اس نے مجھے سامنے پڑی کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور میں کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گیا۔

"آپ بیمار ہیں جناب؟" میں نے نرم لہجے میں پوچھا۔

"ہاں...... ہاں"۔ اس نے آخری گہری سانس لی...... اور پھر بہتر نظر آنے لگا۔

"شکریہ، تم کون ہو؟"

"میرا نام سکندر خان ہے اور مجھے سلطان احمد نے آپ کے پاس بھیجا ہے"۔

"اوہ...... مگر مجھے تو ڈرائیور درکار ہے"۔

"میں اسی ملازمت کے لئے حاضر ہوا ہوں"۔

"تنخواہ اٹھارہ سو روپے ہوگی...... اس کے علاوہ رہائش اور کھانا...... چوبیس گھنٹے ساتھ رہنا ہوگا......کوئی اعتراض ہے؟"

"نہیں"۔

"یہ چابی ہے۔ بلیک ایکارڈ نیچے لاٹ پر کھڑی ہے۔ مجھے دو بجے گھر واپس جانا ہوگا"۔

"جی سر"۔

"سر نہیں......غلام غوث خان"۔

"بہتر!"...... میں نے چابی سنبھالی......نوکری قبول کرنے کے بعد مجھے اس کے سامنے کرسی پر بیٹھنے کا حق نہیں تھا۔

"کوئی اور حکم غوث صاحب"۔

"نہیں"۔ انہوں نے کہا اور میں نیچے اتر آیا۔

سب کچھ حیرت انگیز نظر آیا۔

اس نے مجھ سے میرے بارے میں کچھ نہیں پوچھا تھا...... انسپکٹر علی رحمان نے بھی یہی کہا تھا، مگر یہ سب کچھ پُراسرار تھا...... ایکارڈ نئے ماڈل کی اور شاندار تھی...... میں نے اس کا جائزہ لیا اور کپڑا نکال کر اسے جھاڑنے لگا...... کافی گندی ہو رہی تھی، جیسے اسے عرصے سے صاف نہ کیا گیا ہو۔ اس میں ٹیلی فون بھی موجود تھے...... اپنے کام سے فارغ ہو کر میں اندر بیٹھ گیا...... دماغ الجھنوں کا شکار تھا اور تو کوئی ایسی پریشانی نہیں تھی۔

انسپکٹر علی رحمان نے مکمل تحفظ کا یقین دلایا تھا۔ اس کے علاوہ خود میں بھی اتنا احمق نہیں تھا کہ صورتِ حال سے مغلوب ہو جاتا لیکن یہ ساری چیزیں کسی قدر حیرانی کا باعث تھیں...... آخر اس فرم کا اسٹاف کہاں گیا، وہ بیمار شخص تنہا وہاں کیوں بیٹھا ہوا تھا؟...... یہی الجھنیں تھیں۔ یہ بھی سوچ رہا تھا کہ انسپکٹر علی رحمان کو اس شخص کے گھر میں کسی قسم کا جرم ہونے کا خدشہ تھا؟...... پھر یہ سوچ کر اپنے آپ کو مطمئن کر لیا کہ چند لمحوں میں ہر بات تو سمجھ میں نہیں آجاتی...... رفتہ رفتہ ہی صورتِ حال کا اندازہ ہو سکے گا۔

غالباً دو بجنے میں دس منٹ رہ گئے تھے، جب مجھے ٹیلی فون پر اشارہ موصول ہوا اور میں نے جلدی سے ٹیلی فون ریسیو کیا...... اسی کی آواز تھی۔

"اوپر آجاؤ...... دفتر بند ہونے کا وقت ہو گیا ہے"۔ کار کا دروازہ لاک کر کے میں پھرتی

ی منزل میں پہنچ گیا...... وہ دروازے کے باہر ہی کھڑا ہوا تھا...... چابی میرے ہاتھ ے کر بولا۔

لگا دو"...... میں نے برق رفتاری سے اس کی ہدایت پر عمل کیا اور دفتر کا تالا بند واپس مڑا تو اس نے چابی وصول کرنے کے لئے ہاتھ پھیلا دیا...... پہلے کی نسبت اب بہتر نظر آرہا تھا...... نیچے اترا تو میں اس سے تیزی سے آگے بڑھا اور کار کا دروازہ دیا۔ وہ خاموشی سے کار کی سیٹ پر بیٹھ گیا اور بھرائے ہوئے لہجے میں بولا۔

"ڈیفنس"...... انسپکٹر علی رحمان مجھے اس کی رہائش گاہ کے بارے میں بتا چکے تھے۔ میں کا راستہ جانتا تھا اور اس سے پہلے بھی ایک دو بار اس سمت سے گزرا تھا اور اندازہ تھا کہ یہ لوگوں کی رہائش گاہ ہے...... میں وہاں داخل ہوا تو اس نے مجھے کوٹھی نمبر 709 کے بارے بتایا...... یہ ایک عالی شان کوٹھی تھی۔ میں نے کار کھلے دروازے سے اندر لے جا کر کھڑی ی...... وہ دوسری طرف کا دروازہ کھول کر خود ہی نیچے اتر آیا اور پھرتی سے باہر نکل آیا۔

"تم نے کیا نام بتایا تھا اپنا؟"...... اس نے انگلی اٹھا کر مجھ سے پوچھا۔

"سکندر خان"۔

"ہاں ٹھیک ہے......آؤ...... آؤ میرے سامنے آؤ"۔ اس نے کہا اور میں اس کے ساتھ اخل ہو گیا......کوٹھی کے صدر دروازے کے سامنے چار سیڑھیاں تھیں......ان سیڑھیوں پر تے ہوئے اس کے قدم کئی بار کانپے...... میں نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا اور اس کے چلتا ہوا ایک ہال میں داخل ہو گیا...... سامنے دیوار پر ایک بہت خوبصورت اور بہت بڑی لگی ہوئی تھی۔ اس نے مدھم لہجے میں کہا۔

"میری بیوی اس وقت آرام کر رہی ہوگی۔ آؤ میں تمہیں تمہاری رہائش گاہ دکھا دوں، وغیرہ ہے کچھ تمہارے پاس؟"

"نہ ہونے کے برابر"۔

"جب بھی فرصت ہو لے آنا، دیکھو اس طرف آؤ...... راہداری کے آخری سرے پر جو ہے، وہ تمہارے لئے ہے"۔ میں کمرے میں داخل ہو گیا اور کمرے کو دیکھ کر حیران رہ خاصا بڑا کمرہ تھا، کرسیاں صوفے وغیرہ پڑے ہوئے تھے...... فرش پر قالین بچھا ہوا ایک کونے میں ایک ٹیپ ریکارڈر رکھا ہوا تھا، دوسرے کونے پر ٹیلی ویژن سیٹ تھا......

غرض یہ کمرہ کسی ڈرائیور کے لئے نہیں معلوم ہوتا تھا...... میں نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے اُ
دیکھا تو وہ بولا۔

''ہاں...... یہاں کوٹھی میں سرونٹ کوارٹر موجود ہے، لیکن تم نے دیکھ لیا کہ میں کس قدر
ہوں...... چنانچہ تمہیں یہیں رہنا ہوگا تاکہ میری ضرورت کے مطابق میرے پاس پہنچ سکو۔''

''جی غوث صاحب''۔ میں نے آہستہ سے کہا اور گردن خم کرکے باہر نکل گیا۔ میں حیرا
نگاہوں سے کمرے کا جائزہ لے رہا تھا...... پھر مجھے ہنسی آ گئی۔ عالمِ خواب میں بھی، میں
کبھی ایسی رہائش گاہ کا تصور نہیں کیا تھا...... اور یہ سوچ کر خود ہی ہنس پڑا کہ یہ زندگی کم از
میرے جیسے کسی شخص کے لئے نہیں ہوسکتی...... لیکن اب میں ایسے ہی ایک شاندار کمرے
تھا۔ اگر کوئی مجھ سے ملنے آئے تو میری حیثیت سے مرعوب ہو جائے، لیکن یہاں میری حیثیت
ایک ڈرائیور کی تھی۔ اگر علی رحمان صاحب یہ نہ بتا دیتے کہ یہ سب کچھ عارضی ہے اور
عرصے کے بعد مجھے واپس جانا ہے تو میں یقینی طور پر دل ہی دل میں یہ آرزو کرتا کہ ڈرائیور
کی سہی، یہ نوکری اگر مجھے مستقل مل جائے تو میری خوش بختی ہے۔ اتنی شاندار کار میں
کرنا...... اتنے اعلیٰ درجے کی کوٹھی میں رہوں گا، ظاہر ہے کہ اس رہائش گاہ کے دوسرے
لوازمات بھی ایسے ہی ہوں گے۔ میں ایک صوفے پر بیٹھ کر یہ سوچنے لگا کہ اب مجھے کیا
چاہئے۔ میرے پاس کچھ بھی نہیں تھا۔

اچانک ہی سب کچھ مل گیا تھا...... ظاہر ہے کپڑوں کی ضرورت بھی ہوگی۔ ایک ہز
روپے میرے پاس موجود تھے جس میں چند جوڑے کپڑے آسکتے تھے...... اس کے علاوہ نو ہز
روپے علی رحمان کے پاس موجود تھے اور وہ انہیں دینے میں سنجیدہ نظر آ رہے تھے۔ چنا
عارضی ہی سہی لیکن اس حسین زندگی سے کیوں نہ فائدہ اٹھایا جائے، اپنے ذہن سے سب
کھرچ دیا جائے اور یہ دیکھا جائے کہ اس کوٹھی میں کیا کچھ ہو رہا ہے۔ ہوسکتا ہے کوئی
صورتِ حال بن جائے جس کی بناء پر مجھے یہاں مستقل رہائش مل جائے...... ذہن میں جر
کوئی تصور نہیں تھا اور فطرتاً بھی میں مجرم نہیں تھا...... میرے ساتھ جو کچھ ہوا تھا وہ آپ کے
میں آچکا ہے۔ مزید کہ اگر زندگی کوئی بہتر سہارا نہ دیتی تو شاید برائیوں کے راستے پر چل
جاتا، کیونکہ بہت سے علوم کا فنکار بن چکا تھا، لیکن ایسے کسی کام کے لئے دل نہیں چاہتا تھا۔
اجنبی لیکن انتہائی خوبصورت جگہ پر وقت گزرنے کا احساس بھی نہیں ہوا۔ پھر جونہی

لگی ہوئی گھڑی میں وقت دیکھا تو پونے پانچ بج چکے تھے...... بہت وقت گزر گیا تھا اور
ابھی تک میری طلبی نہیں ہوئی تھی۔ ظاہر ہے کوٹھی کے مکین آرام کر رہے ہوں گے، لیکن مجھے کیا
کرنا چاہئے۔ یہاں کمرے میں بیٹھے بیٹھے وقت گزارنا ایک نامناسب سی بات تھی۔ باہر نکل کر
دیکھا جائے کہ ماحول کیسا ہے۔ کتنے لوگ یہاں رہتے ہیں۔ جب کوٹھی میں داخل ہوا تھا تو
یوں لگ رہا تھا جیسے کوٹھی میں کوئی نہ ہو...... چوکیدار بھی نہیں تھا اور گیٹ کھلا پڑا تھا۔ کوئی بھی
شخص باآسانی اندر داخل ہوسکتا تھا۔

بہر طور میں اپنے کمرے سے باہر نکل آیا اور راہداری عبور کرکے سامنے والے حصے میں
پہنچ گیا۔ اس وقت بھی کوٹھی کا وسیع و عریض لان سنسان پڑا ہوا تھا، لیکن وہ گیٹ بند تھا جس
سے گزر کر میں اندر داخل ہوا تھا۔ بعد میں گیٹ میں نے بند نہیں کیا تھا، کیونکہ مجھے اس کی
ہدایت نہیں کی گئی تھی۔ دیر تک میں کیاریوں میں لہلہاتے پھولوں کا جائزہ لیتا رہا...... پھر کار پر
نظر پڑی اور میں کار کی جانب بڑھ گیا۔ گاڑی کی چابی اب بھی میری جیب میں موجود تھی۔
میں صرف وقت گزاری کے لئے کار کی صفائی کرنے لگا۔ پیڈ وغیرہ نکال کر جھاڑے اور خواہ مخواہ
اندرونی حصے میں کپڑا گھماتا رہا۔ مجھے اندازہ نہیں ہوسکا تھا کہ کس وقت کوٹھی کا گیٹ کھلا اور دو
افراد باہر نکل آئے...... میں نے کچھ آوازیں سنیں اور پلٹ کر دیکھا تو غلام غوث خان ایک
عورت کے ساتھ میری جانب آ رہا تھا۔ عورت اس سے تیز تیز لہجے میں گفتگو کر رہی تھی، جو اتنی
دور سے میری سمجھ میں نہیں آئی لیکن میں کپڑا ہاتھ میں سنبھالے سیدھا ہوگیا۔

غلام غوث خان گھریلو لباس میں تھا...... اس کے جسم پر ایک گاؤن تھا...... گاؤن تو
خوبصورت عورت بھی پہنے ہوئے تھی، لیکن وہ بالکل مختلف قسم کا تھا۔ میں نے گہری نگاہوں سے
اُس کا جائزہ لیا۔ اس کی عمر اٹھائیس سے تیس کے درمیان ہوگی...... لمبا قد تھا، لمبے لمبے سیاہ بال
اُن کے بارے میں اس کا چہرہ انتہائی سفید معلوم ہوتا تھا۔ سب سے حسین چیز اس کے چہرے
پر اس کی آنکھیں تھیں۔ جو گہری سبز اور بلیوں کی طرح نظر آتی تھیں...... البتہ جسمانی طور پر وہ
بھر گئی اور موٹاپے کی طرف مائل نظر آتی تھی۔ چہرے پر ایک خاص تمکنت تھی۔ وہ آہستہ آہستہ
چلتی ہوئی میرے نزدیک پہنچ گئی۔

میں نے آنکھوں میں ناپسندیدگی کے اثرات دیکھ لئے تھے، جبکہ غلام غوث خان بالکل
پرسکون نظر آرہا تھا۔

"مگر مجھے ہے...... تم سمجھتی کیوں نہیں"۔

"میں تم سے پہلے بھی کہہ چکی ہوں کہ اب حالات کو سنبھالنا ہماری ذمہ داری ہے۔ مگر جو کچھ کہہ چکی ہوں بھلا اس کے بعد کیا گنجائش تھی۔ تم بھی ڈرائیونگ کر سکتے ہو اور میں بھی کر لیتی ہوں۔ ہمیں ہر حالت میں پیسہ بچانا ہے"۔

"تم اس شخص کے سامنے ایسی باتیں کر رہی ہو۔ بیگم، میرے خیال سے یہ مناسب نہیں ہے۔ کسی بھی وقت مجھ پر سانس کا دورہ پڑ سکتا ہے...... ایسی حالت میں مجھے ڈرائیور کی ضرورت ہے...... سکندر خان، ان سے ملو یہ تمہاری بیگم صاحبہ ہیں"۔ میں نے سلام کیا جس اس نے کوئی جواب نہیں دیا اور آگے بڑھ گئی۔ اس کا رخ کیاریوں کی طرف تھا۔ غلام غوث گاؤن کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے اسے جاتے دیکھتا رہا پھر آہستہ سے بولا۔

"اس کی بدمزاجی کا خیال نہ کرنا...... اطمینان سے اپنا کام کرتے رہو اور ہاں پھول اس کی کمزوری ہیں، اگر کہیں تم نے باغبانی میں اس کا ہاتھ بٹا دیا اور پھولوں کے بارے میں کچھ گفتگو کر لی تو یوں سمجھو اس کی ساری مخالفت ختم ہو جائے گی"۔ یہ جملے ادا کرتا ہوا وہ تیزی سے آگے بڑھ گیا۔ مجھے اندازہ ہوا کہ غلام غوث خان اپنی بیوی سے کچھ ڈرتا ہے۔

شام رات میں ڈھل گئی...... میں نے یہ وقت باہر گزارا تھا۔ وہ دونوں کہیں نہیں گئے تھے...... اس دوران کھانے پینے کے لئے بھی کچھ نہیں ملا تھا...... کھانے کا کیا ہوگا۔ کم از کم آج تو یہاں کے معمولات کا جائزہ لینا ہوگا...... کل کچھ کرنا پڑے گا، لیکن رات کو ایک نئے کردار سے ملاقات ہوئی...... یہ بھی ایک دراز قد لڑکی تھی۔ عمر اکیس سال کے قریب، لباس سادہ چہرہ بے شک حسین البتہ شگفتگی سے عاری...... میرے لئے کھانا لائی تھی۔

"کل سے تمہارے دن کا آغاز ہوگا...... صبح کا ناشتہ کچن میں آکر لے لیا کرو...... دوپہر کھانا یہاں تین بجے کھایا جاتا ہے۔ رات کا نو بجے...... دونوں وقت کھانا میں پہنچا دیا کروں گی"۔

"آپ کون ہیں؟"

"میرا نام نیلم ہے"۔ اس نے کہا اور باہر نکل گئی۔ میں نے گہری سانس لی۔

اس سے قبل ایسے لمحات کبھی نہیں گزرے تھے۔ یہ کائنات اس قدر پُراسرار ہے۔ اس کا اندازہ اب ہو رہا تھا...... سب کچھ عجیب اور حیران کن تھا...... کچھ بھی نیچرل نہیں لگ رہا تھا۔ ایک پولیس آفیسر ایک ایسے شخص پر اتنا بھروسہ کر لیتا ہے جو چار سال کی سزا کاٹ کر

ایسا گھر جس میں کسی جرم کے ہونے کا امکان ہے...... صرف ایک نام دہرانے سے ملازمت مل گئی اور وہ بھی بڑے اعتماد کے ساتھ اور مجھے اس نام کے بارے میں کچھ نہیں ...... سب کچھ قابلِ یقین ہے لیکن یقین اس لئے کیا جا سکتا ہے کہ میں یہاں موجود ...... کھانا بہت عمدہ تھا...... میں نے کھانے کے بعد دیر تک اس لڑکی کے بارے میں سوچا وہ پھر یاد آئی اور میں ضروریات سے فارغ ہو کر کچن کی تلاش میں چل پڑا...... چائے ...نے رہنمائی کی، وہ کچن میں تنہا تھی...... مجھے دیکھ کر سہم گئی...... پھر خوفزدہ انداز میں ...ا۔

"تم مجھے یاد ہی نہیں رہے تھے"۔ اس نے کہا۔

"ناشتہ؟" میں نے سرد لہجے میں کہا۔

"کچھ دیر لگے گی، بیٹھ جاؤ"۔ اس نے کرسی کی طرف اشارہ کیا اور میں کرسی پر جا بیٹھا۔

"تمہارا نام کیا ہے؟"

"سکندر"۔ میں نے بتایا۔

"سکندر اعظم؟" وہ ہنس پڑی۔ اس نے رخ نہیں بدلا تھا...... وہ اوون پر مصروف تھی۔

...موڑی پر اس نے پلٹ کر دیکھا اور بولی۔

"تمہارے آنے سے میں بہت خوش ہوں...... انڈے کے ساتھ پراٹھا لو گے یا سلائس؟"

"پراٹھا مل سکے گا؟"

"ضرور"۔ اس نے کہا۔ "میں بہت خوش ہوں"۔

"کیوں خوش ہو؟" میں نے پوچھا۔

"خوش اس لئے ہوں کہ قوتِ گویائی ختم ہوتی جا رہی ہے...... زبان ہلانے کی ضرورت ...ش آتی تھی...... کوئی ہے ہی نہیں بات کرنے کے لئے...... تم سے بات کر کے عجیب ...ہا ہے"۔

"کیا یہ بھوت گھر نہیں؟"

"ہے"۔ اس نے کہا اور ٹرے سجا کر میرے سامنے رکھ دی۔

"اچھا بیٹھ کر ناشتہ کر لو...... وہ دونوں گہری نیند سو رہے ہوں گے"۔

"تم ناشتہ نہیں کرو گی؟"

''میں صرف چائے پیتی ہوں''۔

''وہ لوگ کس وقت جاگتے ہیں؟''

''نو بجے...... ساڑھے نو بجے ناشتہ کرتے ہیں۔ ساڑھے دس بجے غلام غوث وا
آفس کے لئے نکلتے ہیں''۔

''ناشتہ اتنی جلدی تیار کر لیتی ہو؟''

''ہاں...... بیگم صاحبہ ٹھنڈے پراٹھے کھاتی ہیں''۔

''پراٹھے؟'' میں نے کہا۔

''صرف دو عدد کنگ سائز، چار انڈوں کے ساتھ، چار سلائس، مارملیڈ اور مکھ
ساتھ کچھ حلوہ جات اصلی گھی میں ڈوبے ہوئے اور صرف تین کپ چائے اور وہ بھی ٹھنڈ
اس نے کہا اور ہنس پڑی، پھر چونک کر بولی۔

''کہیں میرے الفاظ ان لوگوں کے سامنے نہ دہرا دینا''۔

''تم یہاں نوکری کرتی ہو؟''

''ہاں''۔ اس نے جواب دیا۔

''کیا کام کرتی ہو؟''

''بہت سے...... فہرست بتانے سے کیا فائدہ، تم کچھ پڑھے لکھے ہو؟''

''معمولی سا''۔ میں نے جواب دیا اور وہ دوسری طرف متوجہ ہوگئی...... میں نے
کرلیا تو اس نے مڑ کر مجھے دیکھا۔

''ناشتہ کر چکے ہو؟''......

''ہاں!''

''تو اب جاؤ'' وہ خشک لہجے میں بولی اور میں حیران رہ گیا...... لگتا ہے اس کا
ہی تھا اور اب اچانک، ''بھوت گھر کا تیسرا بھوت جو لمحوں میں رنگ بدلتا ہے'' میں نے
دروازے کی طرف بڑھ ہی رہا تھا کہ اس نے کہا۔

''سنو میرے رویئے کو محسوس نہ کرنا...... یہاں کچھ سختیاں ہیں...... میرا اندازہ ہے
تم سے بے تکلف ہونے کی اجازت نہیں دی جائے گی...... ہاں اگر اس میں کوئی ..
ہوئی تو...... پلیز محسوس نہ کرنا تم''۔

میں نے ٹھنڈی سانس بھری اور کچن سے باہر نکل آیا...... ٹھیک ساڑھے نو بجے میں نے
...کی ٹرالی لے جاتے ہوئے دیکھا...... پھر واپس آ کر اس نے مجھے طلبی کی اطلاع
میں تیز قدموں سے چلتا ہوا ان دونوں کے سامنے پہنچ گیا...... غوث صاحب، بیگم سے
...ے تھے۔

''کیا بات ہے، کئی دن سے تمہاری خوراک کم محسوس کر رہا ہوں؟''

''لو اتنا تو کھاتی ہوں''۔

''کہاں...... یہ دیکھو بادام کی پلیٹ جوں کی توں رکھی ہوئی ہے اور ابلے انڈے...... میں
ڈاکٹر اسد کے پاس لے چلوں گا۔ وہ صحت ہی نہیں رہی تمہاری، کیوں مجھے پریشان
ہو؟''

''اپنے آپ کو دیکھ رہے ہو؟''

''میری بات چھوڑو، تم سے دگنی عمر ہے۔ اب صحت تو خراب ہونی ہی ہے...... میری
...اس میں ہے کہ تم خوش رہو، سکندر تم مجھے دفتر چھوڑ دو گے اور پھر واپس آ جانا...... بیگم صاحبہ
...جانا ہے''۔ غلام غوث خان اچانک مجھ سے مخاطب ہو گئے۔

''جی...... غلام غوث صاحب!'' میں نے ادب سے جواب دیا۔ غلام غوث صاحب
...پر نمک چھڑک رہے تھے۔ وہ انڈے بیگم صاحبہ کی طرف بڑھا کر بولے،...... لو''۔

''اُفوہ...... اب نہیں کھاؤں گی......'' بیگم نے ناز سے کہا۔

''جی نہیں، آپ انہیں کھائیں گی...... بس میں نے کہہ دیا''۔ غلام غوث خان صاحب
...ت لہجے میں کہا۔

''اللہ......'' بیگم صاحبہ نے پلیٹ لے لی۔ پھر چونک کر مجھے دیکھنے لگیں اور غرا کر بولیں۔

''اب یہاں کیوں کھڑے ہو، جاؤ''۔ اور میں خاموشی سے باہر نکل آیا......
...عقل چکرا کر رہ گئی۔ نہ جانے انسپکٹر علی رحمان پر کیا سنک سوار ہو گئی تھی...... یہاں کیا
...ہے، اس کوٹھی میں ہے ہی کون...... ایک عمر رسیدہ شوہر، ایک نوجوان بیوی اور ایک جوان
...ان میں سے کون مجرم ہے اور کیا جرم کر رہا ہے۔

پھر ایک اور خیال دل میں آیا...... ممکن ہے سرے سے کچھ نہ ہو...... انسپکٹر علی رحمان فطرتاً
...دلی تھا۔ وہ جانتا تھا کہ جس کیس میں مجھے سزا ہوئی ہے، اس میں، میں بے قصور تھا اور

نادانستگی میں بس آلہ کار بن گیا تھا...... اس کے بعد مجھے ایک بہتر زندگی حاصل کرنا
دشوار ہو رہی تھی...... ان حالات سے متاثر ہو کر اس نے اسی طرح مدد کرنی چاہی، مگر
بھی تسلیم نہیں ہو پا رہا تھا...... غلام غوث خان باہر نکل آئے اور میں نے ادب سے کار کا
کھول دیا اور انہیں لے کر چل پڑا...... غلام غوث خان کو ان کے دفتر میں اتارا تو وہ بولے

''جاؤ......اور سمجھا چکا ہوں کہ اس کے غصے کو محسوس نہ کرنا''۔

''جی''۔ میں نے آہستہ سے کہا اور منتظر تھا کہ غلام غوث خان اور کچھ کہے لیکن وہ
چل پڑا تھا...... میں نے کار واپس موڑی......صبر کے سوا اور کیا کر سکتا تھا...... واپس کوٹھی آیا
بیگم صاحبہ تیار ہو گئی تھیں...... انہوں نے مجھے تین پتے بتائے جہاں جانا تھا...... پہلی جگہ
منٹ رکیں، اس کے بعد واپس آ گئیں...... ان کا موڈ اس وقت خوشگوار لگ رہا تھا، کہنے لگیں

''تم گونگے ہو؟''

''نہیں بیگم صاحبہ''۔ میں نے ادب سے کہا۔

''تو گویا خاموش فطرت ہو''۔ اس نے سوال کیا اور میں نیاز مندی سے بولا۔

''نہیں بیگم صاحبہ...... ایسی بھی بات نہیں......لیکن آپ سے بات کرنے کی جرأت
کر سکتا ہوں؟''

''اس سے پہلے کہاں ملازمت کرتے تھے؟'' اس نے اچانک ہی سوال کیا، لیکن
جواب پہلے ہی سے موجود تھا۔ میں نے کہا۔

''ایک دواؤں کی کمپنی کے انگریز منیجر کے پاس، ذاتی ملازم تھا اس کا...... وہ انگلینڈ
گیا تو میں بے روزگار ہو گیا''۔

''تم سے کس نے کہا کہ غوث صاحب کو ڈرائیور کی ضرورت ہے''۔

''نہیں بیگم صاحبہ ایسی کوئی بات نہیں۔ بس میں نے خود ہی غوث صاحب کو کار
اترتے ہوئے دیکھا...... ان کی طبیعت خراب ہو رہی تھی۔ انہیں سنبھال کر میں نے ان
پہنچا دیا...... تب انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ میں کون ہوں اور کیا کرتا ہوں؟ میں
بتایا کہ میں بے روزگار ہوں تو انہوں نے مجھے ڈرائیور کی حیثیت سے رکھ لیا''۔

بیگم صاحبہ نے چند لمحات خاموش رہنے کے بعد کہا۔ ''یہ ایک افسوس ناک بات
سکندر خان کہ غلام غوث خان ذہنی طور پر متوازن نہیں ہیں...... کچھ ایسے حالات پیدا

ذہنی قوتیں کھو چکے ہیں اور بعض اوقات سوچے سمجھے بغیر بات کرتے ہیں...... تمہیں ابھی
ہوئے چند گھنٹوں سے زیادہ نہیں گزرے، لیکن نوجوان آدمی ہو...... مجھے تم سے ہمدردی
ہے بھی خاصے سلیقے کے معلوم ہوتے ہو...... کچھ پڑھے لکھے ہو؟''

''بہت معمولی سا......'' میں نے جواب دیا۔

''اسی لئے میں تمہیں صورتِ حال بتا دینا چاہتی ہوں...... یہ کوٹھی اور اس کی شان و شوکت
یہ بھی ہے، بالکل عارضی ہے...... بہت مختصر وقت رہ گیا ہے، جب یہ سب کچھ ہم سے چھن
جائے گا...... غلام غوث خان دیوالیہ ہو چکے ہیں۔ اس لئے ذہنی توازن بھی کھوتے جا رہے
...اگر تم انہیں پہنچانے ان کے دفتر گئے ہو تو تم نے دیکھا ہوگا کہ سجے سجائے دفتر میں وہ
وہاں اور تنہا بیٹھے رہتے ہیں۔ کچھ عرصہ پہلے اس دفتر میں بہترین کاروبار ہوتا تھا، لیکن غلام
خان کی غلط پالیسیوں سے نقصانات ہونا شروع ہو گئے...... نتیجہ یہ ہوا کہ فرم
طور پر دیوالیہ ہو گئی۔ اسٹاف کو چھٹی دے دی گئی۔ کاروبار بند ہو گیا اور اب غوث خان
اب وہاں بیٹھ کر لکیر پیٹتے ہیں...... یہی کیفیت ہماری کوٹھی کی ہے...... دنیا کی ہر چیز قرض پر
ہے اور اتنا قرض بڑھ چکا ہے ہم پر کہ بالآخر ہمیں وہ کوٹھی، دفتر اور وہاں کی ایک ایک چیز
پڑے گی...... ہمارے پاس اتنی سکت نہیں کہ ملازموں کو تنخواہ دے سکیں...... نیلم میرے
تو بہت عرصے سے ہے۔ وہ تنخواہ نہیں لیتی......خود بھی بے سہارا ہے اور ہماری مشکلات میں
ساتھ دے رہی ہے۔ تو یہ ہے صورتِ حال...... پہلے اس کوٹھی میں کئی ملازم تھے، لیکن میں
رفتہ رفتہ سب کو نکال دیا...... ان میں سے کچھ خود ہی چلے گئے۔ کیونکہ انہیں تنخواہ نہیں مل پاتی
کوئی کہاں تک انتظار کر سکتا ہے۔ میں نے بہت مشکل سے کچھ چیزیں فروخت کر کے ان
تنخواہیں ادا کیں۔ تم اس بات سے خود اندازہ لگا سکتے ہو کہ یہاں تمہارا مستقبل کیا ہے۔ ہم ہوا
پر رکھے ہوئے چراغ ہیں، کوئی بھی جھونکا ہمیں بجھا سکتا ہے...... تم میرے خیال میں
لئے یہاں سے رخصت ہو جاؤ...... اگر ضرورت مند ہو تو میں تھوڑی بہت مالی امداد کر سکتی
ہماری...... خواہ مخواہ اپنے آپ کو مشکلات میں ڈالنے کا کیا فائدہ؟''

میں بغور اس کی گفتگو سن رہا تھا اور سست رفتاری سے کار ڈرائیو کر رہا تھا...... اب اتنا
بے کار بھی نہیں تھا کہ ان باتوں کے جواب میں کوئی معقول بات نہ کر سکتا۔ میں نے
بھرے لہجے میں کہا۔

"کیا آپ مجھے انسان نہیں سمجھتیں بیگم صاحبہ؟"

"کیا مطلب ہے تمہارا؟"

"بیگم صاحبہ میرے سینے میں دل ہے...... ملازمتیں تو مجھے اور بھی مل سکتی ہیں، لیکن ا[ن] لوگوں کو چھوڑنا اب میرے لئے ممکن نہیں ہے...... پتہ نہیں کہاں اور کس جگہ کام آجاؤں۔ آپ نے غلام غوث خان پر غور نہیں کیا، جس وقت میں نے انہیں دیکھا وہ بالکل نیم مر[دہ] کیفیت میں تھے...... ان حالات کو جاننے کے بعد میں اس گھر کو نہیں چھوڑ سکتا"۔

"بالکل احمق ہو تم...... ہمیں تمہاری ہمدردی کی ضرورت نہیں...... ہم اپنے مسائل سے نمٹنے کی کوشش کریں گے، سمجھے تم۔ ہمیں تمہاری ضرورت نہیں ہے"۔

"معافی چاہتا ہوں بیگم صاحبہ، غوث صاحب کو میری ضرورت ہے...... تنخواہ ملنے نہ ملنے کا معاملہ بعد کا ہے" میں نے کہا۔

"بائیں سمت موڑ لو"۔ اس نے کہا۔

اس کے بعد اس نے اور کچھ نہیں کہا تھا...... میں نے اسے تیسری جگہ پہنچایا تو اس نے کہا

"اب تم یوں کرو کہ غوث صاحب کے پاس چلے جاؤ، ان کی طبیعت ٹھیک ہو تو انہیں کر ادھر سے گزر جانا اور مجھے ساتھ لے لینا...... اگر طبیعت خراب ہو تو انہیں گھر پہنچا کر میرے پاس آجانا"۔

میں واپس چل پڑا، ابھی کافی وقت تھا...... انسپکٹر علی رحمان سے ملنے کو دل چاہا اور ان[ہیں] تلاش کرنے میں ناکام نہیں رہا۔

"گڈ......" وہ مجھے دیکھ کر مسکرائے"۔ کہو کیسا تجربہ ہے؟"

"اجازت ہو تو سچ بول دوں...... برا نہ مانیئے گا"۔

"کہو"۔

"آپ نے مجھے جس گھر میں بھیجا ہے اس میں شاید میں اپنا ذہنی توازن قائم نہ رکھ سکوں"

"میں نے تم سے پوچھا کہ تم کس قسم کی ملازمت چاہتے ہو تم نے کہا تھا کہ محکمہ [پولیس] میں بھرتی کروادیجئے۔ ظاہر ہے تمہیں کانسٹیبل بھرتی نہیں کیا جاسکتا تھا۔ کسی مناسب عہ[دے] کے لئے عمدہ تربیت ضروری ہے اور شاید تم نہیں جانتے کہ پولیس کو جرم کے خلاف کیا کچھ کرنا ہوتا ہے...... یہ تمہاری ملازمت نہیں بلکہ امتحان ہے۔ اس کے بعد تم سے

[اجاز]ت کا وعدہ کیا ہے"۔

"وہ ایک دیوالیہ خاندان ہے، یہاں ایک بیوی پرست شوہر ہے...... ایک شوہر سے بے زار بیوی ہے...... ایک نوجوان ملازمہ ہے...... غلام غوث صاحب ایک خالی دفتر میں جاکر روز بیٹھ جاتا ہے، جہاں کوئی کاروبار نہیں ہوتا۔ اس کی بیوی ڈرائیور رکھنے کی مخالف ہے، کیونکہ وہ اسے تنخواہ نہیں دے سکتے"۔

"ہمیں اس کا علم ہے"۔ انسپکٹر رحمان نے سکون سے کہا...... پھر بولے۔

"تمہیں وہاں کوئی دقت ہوئی؟"

"نہیں...... مگر"۔

"مگر کیا؟"

"پھر بھی"۔

"پھر بھی کیا مشکل ہے؟"

"صرف ایک"۔ میں نے کہا۔

"کیا؟"

"میں نہیں جانتا کہ مجھے وہاں کیا کرنا ہے...... بیگم غوث خان نے مجھ سے پوچھا تھا کہ کس نے بتایا کہ غوث خان کو کسی ڈرائیور کی ضرورت ہے؟"

"کیا؟"

"جی سر! اس نے شکی نظروں سے پوچھا تھا"۔

"اوہ...... تم نے کیا جواب دیا؟" انسپکٹر علی رحمان نے چونک کر پوچھا اور میں نے انہیں تفصیل بتادی...... وہ خوش ہو کر بولے۔

"بہت خوب...... تمہارے بارے میں میرے اندازے بالکل درست نکلے"۔ وہ رکے، [سوچ]تے رہے اور پھر بولے۔

"یہ بھی چکر ہے، سلطان احمد صاحب ریٹائرڈ ڈی آئی جی ہیں اور غوث خان ان کا شناسا [ی]ا سا دوست۔ اس نے سلطان احمد سے درخواست کی تھی کہ اس کا تحفظ کیا جائے...... خطرہ ہے کہ ہلاک کردیا جائے گا...... اسے زندگی کا خطرہ ہے"۔

"کس سے"۔

"شاید اپنی بیوی سے...... سلطان احمد نے مجھ سے تذکرہ کیا، لیکن جرم سے پہلے کوئی
کارروائی نہیں کی جاسکتی۔ حالات کا اندازہ لگانے کے لئے ہمیں کسی غیر متعلقہ، لیکن ذہین
کی ضرورت تھی، جسے وہاں پہنچایا جاسکے اور میری نگاہِ انتخاب تم پر پڑی...... مجھے پولیس میں
سولہ سال گزر چکے ہیں۔ صاحبزادے...... میرا کچھ تو تجربہ تسلیم کرو...... مجھے یقین ہے کہ
بہت جلد صورتِ حال کا اندازہ لگا لو گے۔ اس کے علاوہ کچھ اور ایسے معاملات ہیں جن کی
تصدیق کردی جائے...... میں کسی ذمہ دار آدمی کے سپرد بھی یہ کام کرسکتا تھا، لیکن اس بار میں
نے ایک تجربہ کیا ہے"۔

علی رحمان صاحب کے انکشاف بڑے دلچسپ تھے۔ مجھے بڑا اچنبھا ہوا...... میں تو
مختصر ترین خاندان کے بارے میں بالکل ہی مختلف انداز سے سوچ رہا تھا...... گو مجھے وہاں پہنچے
زیادہ وقت نہیں ہوا تھا۔ لیکن بیگم صاحبہ نے جو کچھ بتایا تھا اس سے میں نے ایک تاثر قائم کیا
تھا...... میں سمجھتا تھا کہ بیگم غوث بے حد نیک فطرت خاتون ہیں۔ انہیں اپنے شوہر کا کاروبار
تباہ ہونے کا رنج تھا، مگر وہ ان حالات سے خوش اسلوبی کے ساتھ گزرنا چاہتی تھی اور اپنے
شوہر کو مشکلات کا شکار نہیں ہونے دینا چاہتی تھیں...... اس کے لئے انہوں نے کوٹھی کو
ضروری ملازموں سے خالی کردیا اور ہر ممکن طریقے سے بچت کررہی تھیں...... دوسری طرف غوث
صاحب تھے جن کے ہر انداز سے بیوی کے لئے محبت ٹپکتی تھی، مگر دوسری طرف یہ سب کچھ

"تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، نہ ہی تمہیں یہ سوچنا ہے کہ وہاں کیا ہوگا
بس تمہیں آنکھیں کھلی رکھ کر یہ اندازہ لگانا ہے کہ کون کیا کررہا ہے۔ یہ مختصر تفصیل معلوم ہونے
کے بعد چونکہ تم خصوصی طور پر ان باتوں پر نگاہ رکھو گے، اس لئے معلومات بھی حاصل
گے...... پولیس کو ان دونوں کے ماضی کی تلاش ہے اور بات صرف اتنی ہے کہ ریٹائرڈ ڈی
جی سلطان احمد، غوث علی شاہ کے خدشے کے پیش نظر یہ سب کچھ کررہے ہیں، بلکہ کچھ اور
بھی ہیں جن کی تصدیق کرنی ہے اور اس لئے جو کچھ تم کرو گے، اسی سے باقی معاملات بھی
ہوجائیں گے...... میرا مطلب سمجھ رہے ہو نا؟"

"زیادہ نہیں"۔ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"زیادہ سمجھنا بھی نہیں چاہئے۔ ورنہ تیز رفتاری ہوجائے گی اور تیز رفتاری تمہیں
سے دوچار کردے گی...... اس لئے جتنا سمجھ چکے ہو، اسی کے مطابق کام کرو...... ہاں جو

تم رپورٹ دیتے رہو گے، تمہیں آگے کے معاملات بتائے جاتے رہیں گے"۔

"گویا آپ میری تربیت بھی کررہے ہیں؟"

"یہی سمجھ لو"۔ علی رحمان نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"اچھا اب اجازت چاہتا ہوں"۔

"ٹھیک ہے، کسی بھی اہم واقعہ سے پریشان نہ ہونا۔ تم سے وعدہ کیا گیا ہے کہ تمہیں کسی بھی
مشکل میں کوئی نقصان نہیں پہنچے گا، کیونکہ تم قانون کے محافظ کی حیثیت سے کام کررہے ہو"۔

ان الفاظ پر دل تو بہت چاہا کہ علی رحمان سے بہت سے شکوے کروں، مگر یہ علی صاحب
کی شخصیت سے انحراف تھا...... وہاں سے اُٹھا اور دفتر چل پڑا...... غوث صاحب بہتر حالت
میں تھے۔ مجھے دیکھ کر اشارے سے پاس بلالیا...... میں ان کے کیبن میں داخل ہوگیا۔

"بیٹھو"۔ انہوں نے کہا اور میں بیٹھ گیا۔

"کیسی گزر رہی ہے؟"

"ٹھیک ہوں غلام غوث خان صاحب"۔

"کوئی پریشان تو نہیں؟"

"نہیں"۔

"کہاں کہاں گئے تھے لے کر؟" انہوں نے پوچھا اور میں نے تفصیل بتادی۔

"اور کوئی خاص بات؟"

"نہیں غوث صاحب"۔

"کبھی کوئی پریشانی ہو، کوئی ضرورت ہو تو مجھے بتادینا"۔

"جی غوث خان صاحب"۔ میں نے کہا۔

پروگرام کے مطابق میں اسے لے کر اس جگہ پہنچا جہاں مسز غوث کو چھوڑا تھا...... وہاں
سے انہیں ساتھ لیا اور کوٹھی واپس چل پڑا...... راستے میں غوث خان صاحب نے بیگم سے
پوچھا...... "کیا رہا؟"

"وہ مجھے منع تو نہیں کرسکتی تھی"۔

"تو کام بن گیا؟"

"ہاں سنو نائلہ کے پاس ایک ڈاٹسن بیکار کھڑی ہے...... مجھ سے کہہ رہی تھی کہ چاہوں تو

اٹھا لے جاؤں‘‘۔

’’چلتی ہوئی ہے؟‘‘ غوث صاحب نے پوچھا۔

’’ہاں پرفیکٹ کنڈیشن میں ہے‘‘۔

’’کون سا ماڈل ہے؟‘‘

’’75 کا‘‘۔

’’اٹھالو...... کتنے پیسے دینے پڑیں گے؟‘‘

’’میرا خیال ہے، پیسے نہیں لے گی‘‘۔

’’اوہو تو پھر تم نے تکلف کیوں کیا...... اٹھالیتیں، اس وقت تو ہمیں ہر سہارے کی ضرورت ہے۔ بیچ دیں گے...... اچھے خاصے پیسے مل جائیں گے۔ بعد میں اگر کوئی بات ہوئی تو دیکھ لیں گے...... ‘‘غلام غوث خان نے کہا‘‘۔

’’کیسی باتیں کر رہے ہیں آپ...... آخر سوسائٹی میں منہ بھی دکھانا ہے۔ ایسی حرکتیں کر کے کیا ہم عزت سے زندگی گزار سکیں گے؟‘‘

’’ارے نہیں نہیں...... میرا یہ مطلب نہیں ہے...... میرا مطلب تو بس یہ تھا کہ اگر کوئی ایسی چیز ہاتھ آرہی ہے تو کیا حرج ہے بھئی‘‘۔

’’برا نہ ماننا میری بات کا‘‘۔

’’کیا؟‘‘ غلام غوث خان نے پوچھا۔

’’مطلب یہ ہے کہ گاڑی ورکنگ آرڈر میں ہے...... تم استعمال کر لینا، مجھے کتنی تکلیف رہتی ہے...... میں یہ گاڑی چلالیا کروں گی، دوسری گاڑی وہ ہو جائے گی، کیا خیال ہے؟‘‘

غوث خان چند لمحات خاموش رہا...... پھر اس نے کہا۔

’’ہاں...... ہاں کیا حرج ہے...... ٹھیک ہے تو پھر تم یوں کرو کہ ٹیلی فون پر نائلہ سے کہہ دینا کہ ہم گاڑی منگوالیں گے‘‘...... بیگم غوث خاموش ہو گئیں۔

میں یہ تمام گفتگو سن رہا تھا۔ بڑے دلچسپ معاملات تھے ان میاں بیوی کے بھی، اگر حالات میرے علم میں نہ آجاتے اور صورتِ حال یہ نہ ہوتی جس کی بنا پر میں یہاں پہنچا تھا تو میں اسے ایک عام گھریلو بات سمجھتا لیکن اب خواہ مخواہ علی رحمان صاحب کے انکشافات کے بعد دل میں تجسس پیدا ہو گیا تھا۔ اب ہر چیز پر نگاہ رکھنے کو دل چاہتا تھا۔ کوٹھی کے معاملات

ل ویسے ہی تھے اور ان میں کوئی تبدیلی رونما نہیں ہوئی تھی۔

باقی وقت میں نے گھر میں ہی گزارا...... نہ بیگم صاحبہ کہیں باہر نکلیں اور نہ ہی غوث خان ب...... ویسے غوث خان صاحب نے میری رہائش گاہ سرونٹ کوارٹر کے بجائے اندر ہی رکھ مجھے بہتر کام کرنے کا موقع دیا تھا...... ان کی متجسس نگاہوں سے بھی میں نے یہ اندازہ قائم کیا تھا کہ غالباً وہ مجھ سے میرے بارے میں پوچھنا چاہتے ہیں، لیکن ہمت نہیں کر پا رہے تھے۔ اور وہ دن معمول کے مطابق گزر گیا اور کوئی ایسی بات محسوس نہ ہوئی جو خلافِ طبع ہوتی...... رے دن جب میں غوث خان صاحب کو لے کر آفس جانے لگا تو بیگم صاحبہ نے مجھ سے کہا۔

’’سنو سکندر...... وہ گھر تو تمہیں یاد ہے نا جہاں مجھے سب سے آخر میں چھوڑا تھا اور جہاں م مجھے لے کر واپس آئے تھے‘‘۔

’’جی بیگم صاحبہ!‘‘ میں نے جواب دیا۔

’’غوث خان صاحب کو دفتر چھوڑ دینا اور وہاں چلے جانا...... میں اپنی دوست نائلہ کو ٹیلی ن کر دوں گی...... تم اسے اپنا نام بتا دینا۔ وہ تمہیں ایک گاڑی دے گی...... اسے لے کر یہاں ر آجانا۔ بعد میں غوث خان صاحب کو لینے چلے جانا‘‘۔

’’جی بیگم صاحبہ‘‘۔ میں نے جواب دیا۔ راستے میں غوث خان صاحب نے مجھ سے کہا۔

’’گاڑی اٹھا کر پہلے کسی مکینک کے پاس لے جانا اور اس کا چیک اپ کر لینا، بعد میں ے گھر لانا۔ میں تمہیں پیسے دے دوں گا‘‘۔ میں نے غوث صاحب سے بھی اس کا وعدہ کر لیا۔ انہیں چھوڑنے کے بعد میں اس کوٹھی پر جا پہنچا۔ ایک نوجوان خاتون سے ملاقات ہوئی۔ میں نے اپنا نام بتایا تو انہوں نے گہرے نیلے رنگ کی ایک ڈاٹسن کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

’’یہ گاڑی اور اس کی چابی لے جاؤ‘‘۔ میں نے گاڑی اسٹارٹ کی اور اسے چلاتا ہوا باہر لے آیا۔ کسی مکینک سے میرا تعارف نہیں تھا لیکن پھر بھی ایک آٹو گیراج پر رکا اور وہاں سے اس کا چیک اپ کرایا۔ ایک سو روپے اسے دیئے جو غوث صاحب نے مجھے دینے کا وعدہ کیا تھا۔ مکینک نے گاڑی کو فٹ قرار دیا تھا۔ میں اسے لے کر کوٹھی پہنچ گیا۔ بیگم صاحبہ باہر میرا انتظار کر رہی تھیں...... نیلم بھی ان کے ساتھ تھی۔ وہ گاڑی کے قریب آگئیں اور اندر سے اس کا جائزہ لینے لگیں۔ پھر مطمئن انداز میں گردن ہلا کر بولیں۔

’’ٹھیک ہے...... میں نے غوث صاحب کو فون کر دیا ہے۔ دوپہر کو تم مجھے ساتھ لے کر

گاڑی میں چلنا۔ میں وہاں سے گاڑی اٹھالوں گی۔ مجھے کچھ کام ہیں''۔ میں دوپہر کو غوث صاحب کے دفتر پہنچ گیا۔ بیگم صاحبہ گاڑی کی چابی لے کر چل پڑیں...... غوث خان صاحب نے بھی ڈائسن کا بغور معائنہ کیا...... اور اس میں بیٹھنے کے بعد گھر کی سمت پلٹتے ہوئے بولے۔

''تم نے مکینک کو چیک کرالی ہے یہ گاڑی؟''

''جی غوث خان صاحب''۔

''بیگم صاحبہ نے اس کے بارے میں اور کچھ تو نہیں کیا؟''

''نہیں''...... میں نے جواب دیا...... رات کو غوث خان صاحب اور بیگم صاحبہ کہیں چلے گئے تھے۔ اس دوران غوث خان صاحب کی صحت خاصی ٹھیک ٹھاک لگ رہی تھی...... نیلم اور میں گھر میں تنہا تھے۔ میں نے جان بوجھ کر نیلم کی جانب رخ نہیں کیا...... ویسے بھی وہ بڑی پُراسرار سی لڑکی تھی، اس دن کے بعد سے آج تک مجھ سے سیدھے منہ بات نہیں کی تھی...... میں اپنے کمرے میں ہی تھا کہ دروازے پر قدموں کی چاپ سنائی دی اور نیلم چائے کی پیالیاں ٹرے میں رکھے میرے کمرے میں داخل ہوئی۔ میں نے سرد اور سپاٹ نگاہوں سے اسے دیکھا...... وہ اس وقت بھی الجھی الجھی سی نظر آرہی تھی...... چائے کی پیالیاں ایک جگہ رکھ کر وہ ایک پیالی میرے قریب لے آئی اور مجھے پیالی پیش کرتے ہوئے بولی۔

''موڈ ہے نا چائے کا؟''

''کیوں نہیں...... چائے سے کون انکار کرسکتا ہے؟''

''تم مجھ سے ناراض معلوم ہوتے ہو''۔

''نہیں نیلم صاحبہ...... ایسی کوئی بات نہیں''۔

''اس دن سے بالکل خاموش ہو، بات بھی نہیں کی مجھ سے؟'' میں نے نگاہیں اٹھا کر نیلم کو دیکھا اور بولا۔

''مجھے یوں محسوس ہوتا ہے نیلم صاحبہ کہ جیسے آپ مجھ سے دور ہٹنا چاہتی ہوں...... حالانکہ اس دن آپ نے یہ بھی کہا تھا کہ میرے آجانے سے آپ کو خوشی ہوئی ہے، لیکن بعد میں، میں نے محسوس کیا جیسے آپ مجھے ناگوار محسوس کررہی ہیں''۔

''بالکل نہیں سکندر...... ایسی کوئی بات نہیں۔ براہ کرم میری کسی بات کا برا مت ماننا میں بہت زیادہ پریشان حال اور الجھی ہوئی لڑکی ہوں''۔ میں خاموش نگاہوں سے نیلم کو دیکھا

چند لمحات کے بعد بولی۔

''بیگم صاحبہ نے محسوس کرلیا تھا کہ میں تم سے گھلتی ملتی جارہی ہوں، چنانچہ مجھے ڈانٹ پڑی اور کہا گیا کہ اگر میں عزت سے رہنا چاہتی ہوں تو اپنے آپ کو محدود رکھوں ورنہ خواہ مخواہ نکال دی جاؤں گی...... بس یہی وجہ تھی، مجھے تمہارا بھی احساس تھا کہ نہ جانے تم کیا سوچتے ہو؟'' میں چائے کے گھونٹ لیتا رہا...... نیلم کی جانب میں نے نظر نہیں اٹھائی تھی۔ وہ بھی خاموشی سے مجھے دیکھتی رہی، پھر اس نے کہا۔

''میرا خیال غلط تو نہیں تھا؟''

''کون سا خیال؟'' میں نے چونک کر پوچھا۔

''یہی کہ تم نے میرے بارے میں کوئی اچھی رائے قائم نہیں کی ہوگی''۔

''نہیں نیلم صاحبہ، لیکن انسان ہوں، خیالات تو ذہن میں آتے ہی ہیں جبکہ آپ نے مجھے ہر طرح کے سوالات پر پابندی لگادی ہے''۔

''میں نے؟'' وہ حیرت سے بولی۔

''کیوں...... غلط کہہ رہا ہوں میں؟''

''میرا تو خیال ہے، میں نے ایسی کوئی بات نہیں کی''۔ وہ تعجب بھرے لہجے میں بولی۔

''خیر...... آپ نے لفظوں میں یہ بات نہیں کہی، لیکن احساس ضرور دلا دیا ہے۔ آپ نے مجھ سے کہا تھا نا کہ تفصیلات پوچھنے نہ بیٹھ جاؤں، لیکن ظاہر ہے جب دو افراد آمنے سامنے ہوں اور کوئی انوکھی بات سامنے آتی ہے تو سوالات خود بخود ذہن میں پیدا ہوجاتے ہیں''۔

وہ عجیب سی نگاہوں سے مجھے دیکھتی رہی، پھر بولی۔

''نہیں...... اب اتنی بھی پابندیاں نہیں تم پر...... بس یوں سمجھ لو کہ جن باتوں کے لئے منع کیا گیا تھا، وہ باتیں میں تمہیں نہیں بتا سکتی...... ہر گھر کے اپنے معاملات ہوتے ہیں اور لوگوں کو ان کی پابندی کرنا ہی پڑتی ہے''۔

''بیگم صاحبہ میرے یہاں ملازم ہونے کے خلاف ہیں۔ ہوسکتا ہے مجھے جلد یہاں سے جانا پڑ جائے''۔

''تم مرد ہو۔ تمہیں دوسری نوکری تلاش کرنے میں کیا دقت ہوگی''۔

''نہیں، نوکریاں آسانی سے کہاں ملتی ہیں، بلکہ میرا خیال ہے عورتوں کو آسانی سے

ملازمت مل جاتی ہے۔ ویسے تمہیں تو ایسا کوئی خطرہ نہیں کیونکہ بیگم صاحبہ تمہارے خلاف ہیں
غوث خان صاحب"۔

میں نے کہا..... وہ خاموش ہوگئی اور دیر تک کچھ نہ بولی تو میں نے کہا۔

"ویسے تم بھی یہاں خوش نہیں معلوم ہوتیں۔ کیا تم یہاں نوکری کرنے پر مجبور ہو؟"

"ہاں" اس نے آہستہ سے کہا۔

"کیوں..... میرا خیال ہے تم پڑھی لکھی ہو اور نوجوان بھی ہو۔ کہیں بھی محنت کر سکتی
تمہارے دوسرے رشتے دار وغیرہ ہوں گے"۔

"نہیں کوئی نہیں"۔

"اوہ..... تنہا ہو؟"

"ہاں..... والد بچپن میں مرگئے تھے، والدہ بیمار رہتی تھیں..... میں نے میٹرک پار
تھا، والدہ نے شادی کردی مگر....." وہ سسکی لے کر خاموش ہوگئی۔

"مگر کیا؟" میں نے ہمدردی سے پوچھا۔

"شادی میرے لئے بھیانک تجربہ ثابت ہوئی۔ شوہر مجھ سے عمر میں ڈھائی گنا بڑا
نشہ آور ادویات کا رسیا تھا۔ اس کے ذرائع آمدنی بھی اچھے نہ تھے..... فاقے اور پریشانی
کے سوا مجھے کچھ نہ ملا۔ بیمار ماں میرے دکھوں کی تاب نہ لاسکیں اور مجھے مشکل میں چھوڑ کر اللہ کو
پیاری ہوگئیں..... میری مشکلات کا کوئی حل نہیں تھا..... تقدیر کے فیصلے کا انتظار کرتی رہی
اور فیصلہ میرے حق میں ہوگیا"۔

"کیا؟" میں نے بے صبری سے پوچھا۔

"وہ جس کا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا تھا، خدا کے عتاب کا شکار ہوگیا۔ نشے کے عالم
سڑک پار کر رہا تھا کہ ایک منی بس کے نیچے آکر ہلاک ہوگیا۔ بیوگی کا ایک سال گزارا اور
کشی کی عادی ہونے کی وجہ سے زیادہ دقت نہیں ہوئی، مگر کہاں تک، روٹی نہ سہی سر چھپانے
ٹھکانہ تو چاہئے تھا..... یہ پہلی جگہ ملی اور یہاں نوکری ہوگئی..... یہ گوشہ عافیت ہے کچھ پابندیوں
کے ساتھ، مگر یہ پابندیاں عزت کی زندگی کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں"۔

"اوہ، مجھے بہت افسوس ہوا، یہاں نوکری کرتے کتنا عرصہ گزرا؟"

"تین سال ہوگئے"۔

"یہ دونوں ہمیشہ سے ایسے ہی ہیں؟"

"ہمیشہ سے نہیں"۔ اس نے عجیب سے لہجے میں کہا پھر بولی..... "یہ دونوں دو سال سے
ہے تھا"۔

"دو سال سے"۔

"مجھے یہاں آئے ہوئے تین سال ہوگئے..... میرے آنے سے تین ماہ پہلے ان کی
شادی ہوئی تھی..... بیگم صاحبہ نئی نویلی دلہن تھیں اور غوث صاحب ان کے دیوانے..... وہ آج
بھی ان کے دیوانے ہیں، مگر دو سال سے حالات خراب ہوگئے..... غوث صاحب کو کاروبار
میں بڑے بڑے گھاٹے ہوئے اور حالات بگڑتے چلے گئے..... دفتر کا کام بند ہوا، قرضے
چڑھ گئے..... لاکھوں پریشانیاں اٹھ کھڑی ہوئیں..... گھر میں پانچ ملازم تھے۔ میرے علاوہ
ایک ایک کرکے انہیں جواب دے دیا گیا..... پہلے یہاں بہت کچھ ہوتا تھا، بیگم صاحبہ کی
بہت لڑکیاں اور لڑکے آتے تھے..... دعوتیں ہوتی تھیں. ہنگامے ہوتے تھے..... سب بند
ہوگئے اور اب قرضوں پر دارومدار ہے..... کبھی بیگم صاحبہ اپنی کسی دوست سے قرض لے آتی
ہیں اور کبھی غوث خان صاحب کچھ رقم قرض لے آتے ہیں یوں کام چل رہا ہے"۔

"غوث صاحب کی تو صحت بھی خراب ہوگئی ہے"۔

"ہاں، پریشان جو ہیں"۔

"مگر بیگم صاحبہ تندرست ہیں"۔

"کہاں..... بلڈ پریشر کی مریضہ ہیں..... کبھی کبھی حالات خراب ہوجاتے ہیں، مگر کھانے
پینے کی بے حد شوقین ہیں..... ہمیشہ کچھ نہ کچھ کھاتی پیتی رہتی ہیں..... پھل، مٹھائیاں، حلوے،
حالانکہ ڈاکٹر منع کرتے ہیں"۔

"غوث صاحب بھی ان کا بہت خیال رکھتے ہیں"۔

"حد سے زیادہ مگر"۔ نیلم خاموش ہوگئی۔

"مگر کیا؟"

"نہیں یونہی کہہ رہی تھی..... عجیب بات ہے بات گھوم پھر کر انہی لوگوں تک پہنچ جاتی
ہے۔ تم اپنے بارے میں بھی کچھ بتاؤ"۔

"میں بھی اس کائنات میں تنہا ہوں نیلم..... تھوڑا بہت پڑھا لکھا ہوں..... عرصے سے

نوکریاں کرتا ہوں اور بس‘‘۔

’’والدین...... بہن بھائی کوئی نہیں؟‘‘۔

’’ہاں کوئی نہیں‘‘۔ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

’’شادی نہیں کی؟‘‘

’’نہیں!‘‘

’’کیوں؟‘‘

’’اس لئے کہ میرے بارے میں کوئی سوچنے والا نہیں تھا‘‘۔ میں نے کہا اور وہ خامو ہوگئی، پھر چونک کر بولی۔

’’اب چلتی ہوں...... آج تم سے اتنی باتیں کر کے خود کو دوبارہ زندگی کے قریب محسو کر رہی ہوں ورنہ......‘‘ وہ برتن سمیٹنے لگی پھر بولی۔

’’میں نے تمہیں بتایا ہے کہ مجھ پر کیا پابندیاں ہیں...... میرے بارے میں کوئی غلط خیا دل میں نہ لانا اور میری خاموشی کو مجبوری سمجھنا‘‘۔ وہ برتن لے کر دروازے کی طرف چل پڑ پھر دروازے کی طرف رک کر بولی۔

’’میں نے تمہیں بتایا ہے کہ مجھ پر کیا پابندیاں ہیں...... میرے بارے میں کوئی غلط خیا دل میں نہ لانا اور میری خاموشی کو مجبوری سمجھنا‘‘۔ وہ برتن لے کر دروازے کی طرف چل پڑ پھر دروازے کی طرف رک کر بولی۔

’’میرے اور اپنے درمیان ہونے والی باتوں کو کبھی کسی کے سامنے نہ کہنا۔ میری نوکری سوال ہے‘‘۔ وہ باہر نکل گئی۔ میرے دل پر ایک عجیب تاثر چھوڑ گئی۔ میں دیر تک اس بارے میں سوچتا رہا...... پھر مجھے غوث صاحب اور بیگم صاحبہ کا خیال آیا...... صرف چند سا ہوئے ہیں، ان کی شادی کو، اس سے پہلے دونوں کیا کرتے رہے...... غوث صاحب کا کاروبا کیوں تباہ ہوا اور غوث صاحب کا یہ خوف کیا معنی رکھتا ہے کہ اس کی بیوی اسے قتل کر دے گی اچانک ہی ایک اور خیال میرے دل میں آیا...... کیوں نہ کسی وقت غوث صاحب اور بیگم صاحبہ کے کمرے کی تلاشی لی جائے...... علی رحمان صاحب نے مجھے یہاں کے حالات کا جائزہ لینے کے لئے بھیجا ہے۔ ہوسکتا ہے ایسی تلاشی سے مجھے کوئی کارآمد بات معلوم ہو جائے، لیکن اس میں خطرہ تھا...... میرے دل میں کوئی مجرمانہ تصور نہیں تھا۔ اگر کوٹھی میں مجھے سونے کے انبار

تو میرے دل میں کوئی بے ایمانی نہیں آسکتی تھی، کیونکہ میں فطرتاً برا نہیں تھا...... جیل کے بعد اتنے گر آگئے تھے کہ دولت مجھ سے چند قدم کے فاصلے پر تھی، لیکن ایک بار میں سے کوئی ذریعہ اختیار کرنے کے بارے میں نہیں سوچا تھا...... کسی قیمت پر دوبارہ جانا چاہتا تھا...... ایسی کسی کوشش سے کوٹھی کے مکین میری طرف سے بدظن بھی ہو سکتے احتیاط کی جاسکتی تھی...... اس وقت بھی وہ دونوں احتیاط اور اطمینان سے کوٹھی ہم پر چھوڑ گئے تھے، حالانکہ یہاں کافی قیمتی سامان تھا...... غوث صاحب کو تو مجھ پر اس لئے ہوگا کہ میں سلطان احمد کا بھیجا ہوا تھا مگر بیگم صاحبہ...... یہ کروں گا کسی دن لیکن احتیاط دوسرا دن حسب معمول تھا۔ اب میں وہی ڈاٹسن چلاتا تھا جو بیگم صاحبہ کی دوست نے تھی...... تین چار دن اسی طرح گزرے، کوئی خاص بات نہیں ہوتی۔

پانچویں دن دفتر پہنچنے کے بعد غوث صاحب نے مجھ سے کہا۔

’’کہو سکندر، کوئی خاص بات؟‘‘

’’نہیں غوث خان صاحب، سب ٹھیک ہے‘‘۔

’’بیگم صاحبہ نے تو تم سے کوئی بات نہیں کی؟‘‘

’’نہیں غوث خان صاحب، وہ مجھ سے بات ہی کہاں کرتی ہیں‘‘۔ میں نے سادگی سے دیا۔ غوث خان عجیب سی نگاہوں سے مجھے دیکھنے لگے، مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ کیا کہنا ہیں، مگر میں بھی ہوشیار تھا...... بالآخر انہوں نے کہا۔

’’سلطان احمد صاحب نے تمہیں میرے بارے میں کیا بتایا تھا؟‘‘

’’یہی کہ مجھے آپ کے پاس نوکری مل جائے گی‘‘۔

’’اور کچھ نہیں کہا تھا۔ انہوں نے؟‘‘ غوث خان صاحب کے انداز میں جھلاہٹ تھی۔

’’کہا تھا غوث خان صاحب!‘‘

’’کیا؟‘‘ وہ جلدی سے بولے۔

’’انہوں نے کہا تھا جب تک غوث صاحب تمہارے سامنے زبان نہ کھولیں اور تم سے تم خاموشی سے اپنا کام سرانجام دیتے رہنا‘‘۔ میں نے جواب دیا۔

’’کیا کام کرتے رہنا؟‘‘

’’آپ کی ڈرائیوری‘‘۔

''اوہ...... مجھے ڈرائیور کی ضرورت نہیں تھی''۔

''میں جانتا ہوں غوث صاحب''۔ میں نے سکون سے جواب دیا اور غوث صاحب مجھے گھورنے لگے پھر بولے۔

''تم محکمہ پولیس کے ملازم ہو؟''

''یہ میں نہیں بتا سکتا غوث خان صاحب''۔

''کیوں؟''

''اس کی مناہی ہے جی''۔

''کمال ہے، سلطان احمد صاحب بھی عجیب ہیں حالانکہ...... مگر تم نے کیا کیا، اوہ تم۔ میرے تحفظ کے لئے کیا کیا ہے؟''

''ابھی تک یہ معلوم کر رہا ہوں کہ آپ کو کیا خطرہ پیش آ سکتا ہے؟''

''کوئی بھی حادثہ پیش آ سکتا ہے، مجھے گہری سازش ہو سکتی ہے میرے خلاف، مجھے توا! ایسے مستعد آدمی کی ضرورت ہے جو میرا تحفظ کر سکے، میری صحت دیکھ رہے ہو...... روز بروز گر جا رہی ہے، اس قابل بھی نہیں ہوں کہ گاڑی چلا سکوں...... بعض اوقات ایسے دورے پڑتے! کہ اعصاب بے قابو ہو جاتے ہیں...... سب کچھ بے پناہ پریشانیوں کی وجہ سے ہے''۔

''آپ علاج کیوں نہیں کراتے...... غوث خان صاحب؟''

''علاج''۔ غوث صاحب نے ایک ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ ''شاید تم اس بات پر یقین کرو نہ کرو کہ میرے حالات واقعی بے حد خراب ہیں...... کاروبار بری طرح تباہ ہو چکا ہے قرض خواہوں کو دلاسا دینے کے لئے دفتر میں آ بیٹھتا ہوں، تاکہ وہ یہ نہ سمجھیں کہ میں ان منہ چھپا کر روپوش ہو گیا ہوں...... میں نے ان سے بہت جھوٹ بول رکھے ہیں اور انہی کام چلا رہا ہوں، مگر مجھ میں اور میری بیوی کے حالات میں بڑا فرق ہے''۔

''وہ کیا غوث خان صاحب؟''

''اس کا لاکھوں روپیہ بنکوں میں محفوظ ہے، اس نے سینکڑوں قسم کے سیونگ سرٹیفکیٹ لے رکھے ہیں...... اس کے علاوہ بھی اس نے نہ جانے کہاں کہاں سرمایہ کاری کر رکھی ہے یہ سب کچھ اس نے مجھ سے چھپا رکھا ہے...... آہ، اگر وہ میرا ساتھ دے تو میں پھر کروڑ سکتا ہوں مگر وہ...... وہ...... وہ مجھ سے اکتا چکی ہے، مجھ سے پیچھا چھڑانا چاہتی ہے''۔

''بظاہر تو ایسا نہیں ہے''۔

''بظاہر''۔ غوث صاحب نے تلخ لہجے میں کہا...... ''در پردہ وہ مجھ پر پانچ قاتلانہ حملے کر چکی ہے''۔

''جی!'' میں اچھل پڑا۔

''ہاں میرے دوست! میں غلط نہیں کہہ رہا''۔ غوث صاحب نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

''ان حملوں کی نوعیت کیا ہے؟''

''بتاؤں گا تو بھی یقین نہیں کر پاؤ گے...... بتانا نہیں چاہتا، لیکن اسے احساس ہو گیا ہے کہ میں اس کی طرف سے ہوشیار ہوں، اس لئے اب وہ جو کچھ کرے گی، بہت سوچ سمجھ کر کرے گی۔ میں اس بات سے خوفزدہ ہوں''۔

''آپ کے خیال میں وہ آپ سے پیچھا صرف اس لئے چھڑانا چاہتی ہیں کہ آپ قلاش ہو چکے ہیں''۔

''ہاں...... میں اس کے لئے کشش کھو چکا ہوں''۔

''لیکن وہ آپ سے طلاق بھی تو لے سکتی ہیں''۔

''ایسے کرنے میں اسے گھاٹا ہو جائے گا''۔

''کیوں؟''

''میرا ایک کروڑ کا بیمہ ہے جو اسے میری موت کی شکل میں مل سکتا ہے، مجھ سے علیحدہ ہو کر نہیں''۔

''اس کے پریمیم آپ کہاں سے ادا کرتے ہیں؟''

''قرض لے کر ہم نے اپنی ساکھ بنا رکھی ہے...... میں اپنے کچھ دوستوں سے قرض لے رہا ہوں وہ بھی اپنی کچھ دوستوں سے بظاہر قرض لیتی ہے، مگر میں جانتا ہوں...... یہ قرض نہیں ہوتا، اس نے یہ ڈاٹسن بھی خریدی ہے، کیونکہ اسے دوسری گاڑی درکار تھی۔ وہ بے حد چالاک ہے''۔

''بڑے سنسنی خیز حالات ہیں غوث صاحب، آپ خود ان سے علیحدہ کیوں نہیں ہو جاتے؟''

''بے موت مر جاؤں گا۔ کیونکہ اس کے بعد وہ مجھے سب کے سامنے عریاں کر دے گی، ہمارے ان اور آؤٹ معلوم ہیں''۔

''بظاہر تو آپ کے درمیان بے حد محبت ہے غوث صاحب، مجھے یہ سن کر بہت حیرت

ہوئی ہے"۔

"یہ محبت یکطرفہ ہے۔ میں بدنصیب اسے اپنی زندگی سے زیادہ چاہتا ہوں میرے لئے بہت قیمتی ہے، مگر میں اس کے ہاتھوں مرنا نہیں چاہتا...... میری آرزو ہے کھویا ہوا مقام پھر حاصل کرلوں، اس کے سامنے دولت کے انبار لگا کر اس سے محبت کی مانگوں...... آہ میں، میں"...... غوث صاحب کی آواز بھرا گئی...... میں نے کہا۔

"آپ کو یقین ہے کہ آپ پھر سے اسٹیبلش ہوسکیں گے؟"

"کوشش کررہا ہوں"۔

"مجھے بتائیے کہ میں آپ کی کیا مدد کرسکتا ہوں؟" میں نے ہمدردی سے کہا اور صاحب خاموشی سے سوچنے میں مصروف ہوگئے، پھر بولے۔

"میں اسے کوئی نقصان نہیں پہنچانا چاہتا...... خود زندہ رہنا چاہتا ہوں...... تمہیں نگاہ رکھنی ہوگی کہ وہ کہاں کہاں جاتی ہے؟ کس کس سے ملتی ہے...... تمہارے خلاف یہ اس کی ہمدردی حاصل کرسکتے ہو، اس کے راز دار بن جاؤ...... میں نے سلطان احمد صا سے کہہ دیا ہے کہ یہ کام ہفتے پندرہ دن کا نہیں، اس کے لئے وقت چاہئے...... میں تمہیں پیشکش کرنا چاہتا ہوں...... میری بات کا برا مت ماننا، انسان مجبور ہوکر ایسی بات کرتا ہے چاہتا ہوں کہہ دوں؟"

"جی غوث خان صاحب"۔

"تم کس حیثیت کے مالک ہو...... میں نہیں جانتا، اس کے باوجود میری پیشکش ڈرائیور کی تنخواہ کے علاوہ پانچ ہزار روپے تمہیں دوں گا...... یہ بات خفیہ رہے گی، چاہ سلطان احمد کو بھی نہ بتانا، بس تم اس کے بارے میں معلوم کرکے مجھے بتانا، یہ بتاؤ یہ تمہیں قبول ہے یا نہیں"۔

"دولت کسے بری لگتی ہے، غوث صاحب مگر آپ کے حالات ایسے کہاں ہیں؟"

"یہ تم مجھ پر چھوڑ دو...... جو کچھ میں کررہا ہوں، تمہیں اس کا اندازہ نہیں...... میرا کچھ نہیں، بس یہی پریشانیاں ہیں جنہوں نے میری صحت خراب کی ہے...... میری آرزو میرے اور اس کے درمیان سمجھوتہ ہوجائے، میں اسے بہت چاہتا ہوں"۔ غوث صاحب آواز بھرا گئی۔

"میں عجیب الجھن میں پڑ گیا تھا...... بڑے انوکھے واقعات تھے۔ ان کے پس پردہ کیا لوگ اپنے گھر کی چار دیواری کے اندر ایسے مضبوط رشتوں کے ساتھ بھی ایسے انوکھے کھیل لتے ہیں؟"

"کیا فیصلہ کیا تم نے؟"

"میں تیار ہوں...... غوث خان صاحب"۔

"تمہارا شکریہ سکندر خان...... اب تم اپنے پروگرام میں تھوڑی سی تبدیلی کرلو...... مجھے چھوڑ کر واپس گھر چلے جاؤ...... اس طرح تمہیں اس کے ساتھ رہنے کا موقع ملے گا اور تم اعتماد میں لے لو گے، مگر تم اسے مرد کی حیثیت سے متاثر مت کرنا۔ وہ اس چکر میں نہیں ے گی...... میں اسے اچھی طرح جانتا ہوں، وہ تمہیں بدکردار کہہ کر اس کوٹھی سے نکلوا دے گی اس میں، میں بھی تم سے انحراف کرسکتا ہوں، اب جاؤ"۔ میں غوث صاحب کے پاس سے گیا، مگر میرے سر میں ہانڈی پک رہی تھی۔ یا الٰہی اس دنیا میں یہ سب بھی ہوتا ہے...... اس کہانی کو دہراتے ہوئے غوث صاحب کا غم پھر سے ابھر آیا تھا...... ایک گھنٹے کے بعد میں نے غوث صاحب پر نگاہ ڈالی تو وہ برے حال میں نظر آئے، ان کو سانس کا دورہ پڑا تھا...... آنکھیں چڑھ گئی تھیں، حالت بہت خراب ہوگئی تھی۔ میں گھبرا گیا تھا۔ کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کروں...... مجبوراً غوث صاحب کے گھر ٹیلی فون کیا، نیلم نے فون ریسیو کیا تھا۔ نے اسے ساری صورتِ حال بتائی تو اس نے کہا کہ وہ بیگم صاحبہ کو اطلاع دیتی ہے، کچھ بعد بیگم صاحبہ کی آواز سنائی دی۔

"ہاں کیا بات ہے؟"

"غوث صاحب کو سانس کا دورہ پڑا ہے...... حالت بہت خراب ہورہی ہے۔ میں کیا کروں بیگم صاحبہ؟"

"انہیں سنبھال کر یہاں گھر لے آؤ...... یہاں دوائیں موجود ہیں...... پریشان ہونے کی ضرورت نہیں"۔

"جی بیگم صاحبہ"۔ فون بند کرکے میں نے غوث صاحب کو سنبھالا اور ہزار دقتوں کے دفتر کا کمرہ بند کرکے انہیں لے کر چل پڑا...... راستے بھر ان کی حالت سخت تشویش ناک ان کا سانس ٹھہر ہی نہیں رہا تھا...... سینہ دھونکنی بنا ہوا تھا۔

بس یوں لگ رہا تھا جیسے گھر تک وہ زندہ نہ پہنچ سکیں گے...... سانس کے ساتھ ساتھ کرب ناک آوازیں نکل رہی تھیں...... میں تیز رفتاری سے ڈاٹسن دوڑاتا ہوا کوٹھی پہنچ گیا۔ بیگم صاحبہ نیلم کے ساتھ برآمدے میں موجود تھیں...... غوث صاحب کو اندر پہنچا دیا گیا۔ میں نے کہا۔

"کسی ڈاکٹر کو لاؤں بیگم صاحبہ؟"

"نہیں...... دوائیں موجود ہیں، ٹھیک ہو جائیں گے"۔ بیگم صاحبہ نے خشک لہجے میں کہا...... میں وہاں رکا تو انہوں نے مجھے گھورتے ہوئے کہا۔

"کیا بات ہے؟"

"جی میرے لئے کوئی ہدایت؟"

"جاؤ آرام کرو"۔ انہوں نے اسی انداز میں کہا اور میں وہاں سے نکل آیا۔ غوث صاحب کا دل دکھ رہا تھا، محبت کا مارا مظلوم انسان...... عجیب الجھا ہوا کیس تھا، لیکن میرے حق میں منافع بخش...... کسی قدر انسانی ہمدردی کا معاملہ بھی تھا، مگر میں کیا کر سکتا تھا...... غوث خان نے بتایا تھا اور اتنا تو خود علی رحمان کو بھی معلوم تھا۔ باقی دن خاموشی سے گزر گیا۔ نیلم نے شام کو چائے دی، مگر نگاہیں اٹھا کر بھی مجھے دیکھا نہیں...... دوسرے دن نو بجے اس نے کہا۔

"غوث صاحب دفتر نہیں جائیں گے...... تم لان کی صفائی کرا دو اور الیکٹریشن کو بلا کر گھر کے کچھ پوائنٹ ٹھیک کرا دو"۔

"کیسی طبیعت ہے غوث صاحب کی؟"

"ٹھیک ہے"۔ اس نے کہا۔ پھر میں نیلم کے بتائے ہوئے کاموں میں مصروف ہو گیا۔ غوث صاحب پورا دن نظر نہیں آئے...... دوسرے دن بھی وہ دفتر نہیں گئے، البتہ شام کو میں نے انہیں بیگم صاحبہ کے ساتھ ٹہلتے ہوئے دیکھا بالکل ٹھیک تھے، مجھے بلا کر کہا۔

"کل دفتر چلنا اور ہاں مجھے دفتر چھوڑ کر تم گھر آ جایا کرو...... دفتر میں کام نہیں ہوتا، گھر میں ہوتے ہیں...... دیکھو لان کیسا اجڑا ہوا ہے، دیکھ بھال کر لو، باقی اور جو کام ہیں وہ نیلم تمہیں بتا دے گی، وقت پر مجھے لے آیا کرو، میں نے بیگم صاحبہ سے کہہ دیا ہے"۔

"جی غوث صاحب"۔ میں نے سعادت مندی سے کہا۔ بیگم صاحبہ نے میری طرف نگاہیں اٹھا کر بھی نہیں دیکھا...... پھر رات کا کھانا کھا کر میں لیٹ گیا۔ نیلم اس طرح رہی تھی

جان پہچان ہی نہ ہو، لیکن میں اس کی مجبوری سمجھتا تھا، چنانچہ اس کی حرکتوں پر توجہ نہیں دی۔

اس وقت پانچ بجے تھے، خواب خرگوش کے مزے لے رہا تھا...... کسی نے مجھے جھنجھوڑ کر جگایا۔ میں نے حیران نگاہوں سے جھنجھوڑنے والے کو دیکھا تو وہ نیلم تھی...... حیران نگاہوں سے اس کو دیکھا...... دھندلائی ہوئی آنکھوں میں نیلم کا چہرہ ابھر آیا تھا...... وہ مجھ پر جھکی ہوئی تھی۔ اس نے سرگوشی کے انداز میں کہا۔

"سکندر ہوش میں آؤ...... سنو، گاڑی احتیاط سے چلانی ہے۔ کوئی گڑبڑ ہے، اس کا خیال رکھنا، یہ اندازہ خود لگانا کہ اس میں کیا ہوا ہے...... تم ہوش میں تو ہو ناں...... میرے الفاظ تمہارے ذہن میں آ گئے ہیں ناں"۔ اس نے ایک بار پھر مجھے جھنجھوڑنے کی کوشش کی...... میں اس کی صورت دیکھ رہا تھا، پھر میں نے کہا۔

"کیا مطلب ہے...... کیا کیا ہے گاڑی میں...... کس نے کیا ہے؟"

"گاڑی احتیاط سے چلانا...... بس اس سے زیادہ مجھے کچھ نہیں معلوم"۔

وہ برق رفتاری سے واپس پلٹی اور کھلے ہوئے دروازے سے باہر نکل گئی۔ میں عجیب سوچ میں تھا۔ ذہن سائیں سائیں کر رہا تھا۔ اول تو کچی نیند سے جاگا تھا۔ آنکھیں بند ہونے لگیں، یقینی طور پر خواب نہیں تھا...... نیلم اندر آئی تھی...... اس نے مجھے اطلاع دی تھی، چند لمحے اسی طرح چکرایا چکرایا سا لیٹا رہا...... پھر اٹھ کر بیٹھ گیا...... کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا...... غسل خانے کی جانب گیا۔ سر پر خوب ٹھنڈا پانی بہایا جس سے دماغی کیفیت کچھ بحال ہوئی، نیلم کے الفاظ پر غور کرنے لگا۔ ہاں نیلم گاڑی کے بارے میں کچھ کہہ رہی تھی...... میں پھر سوچ کی گہرائیوں میں اتر گیا...... نیلم کہہ رہی تھی، گاڑی...... گاڑی...... بات سمجھ میں آ گئی تھی اور پھر اپنے بال سنوار کر باہر نکل آیا اور دیر تک دونوں ہاتھوں سے سر پکڑے بیٹھا گاڑی میں کیا، کیا ہے؟ کس نے کیا ہے؟ سوچتا رہا...... بہرحال صورتِ حال سنسنی خیز تھی۔ مجھے خود کو سنبھالے رکھنا ہے...... گاڑی میں آخر کیا مسئلہ ہے، نیلم نے اطلاع کیوں دی، اسے کیا خبر ہوا؟...... دل چاہا کچن میں جا کر معلوم کروں لیکن محتاط رویئے کی وجہ سے میں نہیں گیا، بے چاری میری وجہ سے مصیبت میں نہ پھنس جائے۔ اعصاب کو قابو میں رکھا اور پھر باہر...... بیگم صاحبہ اور غوث صاحب بھی جاگ گئے تھے۔ میں نے انہیں ٹہلتے ہوئے

دیکھا۔ عام طور سے یہ اتنی جلدی نہیں اٹھتے تھے۔ آج معمول کے خلاف بات تھی...... ان سے سوال تو نہیں کرسکتا تھا۔ گاڑی کی صفائی میں مصروف ہوگیا اور محتاط رویہ رکھا...... شدید تجسس تو میرے اندر لیکن گاڑی کو دیکھنے کا مطلب بیگم صاحبہ کے شبہ کا شکار ہونا تھا...... جب غوث صاحب گاڑی میں بیٹھے تو انہوں نے برآمدے سے انہیں خدا حافظ کہا...... یہ بھی معمول کے خلاف تھا، کیونکہ عموماً ایسا نہیں ہوتا تھا۔

میں ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا، مگر عجیب سی گھبراہٹ تھی، دل میں عجیب سے خیالات کہ سوئچ آن کیا تو بم دھماکہ ہوگا اور گاڑی کے پرخچے اُڑ جائیں گے...... ہمت کی، سوئچ دبایا، گیئر میں گاڑی ڈالی...... نیلم نے دروازہ کھولا...... فرسٹ گیئر میں گیٹ سے نکل آیا...... سیکنڈ گیئر لگایا اور گاڑی کی رفتار تیز کردی...... اس کے انجن سے آواز سننے کی کوشش کررہا تھا...... گو بہت زیادہ مشق نہیں تھی، مجھے لیکن یہ اندازہ ہوگیا تھا مجھے کہ کوئی گڑبڑ نہیں تھی...... میں نے بریک چیک کرنے کے لئے بریک پیڈل پر پیر رکھ دیا۔ دوسرے لمحے مجھے ایک جھٹکا سا لگا...... پیڈل نیچے بیٹھ گیا اور بریک نہیں لگا تھا...... رفتار تیز نہ تھی۔ سیکنڈ گیئر میں چل رہا تھا...... گاڑی روکنا مشکل کام نہ تھا...... اب ذہن بھی جاگ اٹھا...... سڑک سنسان تھی اور پریشانی کی کوئی بات تھی...... کوٹھی سے دور آگئے اور گاڑی کو دیکھا نہیں جاسکتا تھا...... عقب نما آئینے میں کوٹھی بالکل ہی گم پایا اور شبہ نہ رہا کہ گاڑی کو کوئی دیکھ لے گا...... غوث صاحب چونک پڑے تھے انہوں نے پیچھے سے کہا۔

''کیا بات ہے، خیریت؟''

''گاڑی کے بریک فیل ہوگئے ہیں''۔

''ہیں؟'' غوث صاحب کسی قدر ہراساں لہجے میں بولے۔

''جی ہاں...... بریک بالکل نہیں لگ رہے''۔

''ارے اچانک...... اچانک...... یہ کیسے ہوگیا؟ ایسی کوئی بات پہلے تو نہیں ہوئی تھی''۔

''بالکل نہیں جناب''۔ میں نے جواب دیا اور غوث صاحب گہری گہری سانسیں لگے...... پھر انہوں نے میری طرف دیکھ کر پھیکے سے انداز میں مسکراتے ہوئے کہا۔

''چھٹا قاتلانہ حملہ''۔ میں نے کوئی جواب نہیں دیا...... غوث خان صاحب بولے۔

''تمہارا کیا خیال ہے، کیا بریک خود فیل ہوگئے''۔

''خود بخود تو نہیں ہوسکتے جناب...... یقیناً کچھ کیا گیا ہوگا''۔

غلام غوث صاحب چند لمحات کچھ سوچتے رہے پھر بولے۔

''اب سمجھ میں آئی کہ اس نے ڈاٹسن کیوں خریدی ہے؟ وہ تو میں یہ سمجھتا تھا کہ اسے تکلیف ہوتی ہے، آنے جانے میں۔ اس لئے اس نے گھٹیا سی گاڑی خرید کر میرے حوالے کردی۔ اس نے عمدہ گاڑی داؤ پر لگا رکھی تھی۔ پھر اس نے سوچا کہ لاکھوں کی چیز کیوں ضائع کی جائے، تم سمجھ رہے ہوں نا...... اب تو یقین ہوا تمہیں میری باتوں پر''۔

''یہ سب کچھ...... غوث صاحب...... یہ سب کچھ حل تو نہیں ہے...... آپ کسی بھی وقت نقصان اٹھاسکتے ہیں...... بات اگر یہاں تک پہنچ گئی ہے تو آپ کو کوئی ٹھوس قدم اٹھانا چاہئے...... بلاوجہ آپ نے یہ الجھن پال رکھی ہے...... کسی بھی وقت کچھ بھی ہوسکتا ہے۔ آپ کی صحت پہلے ہی اتنی خراب ہے''۔

غوث صاحب نے کوئی جواب نہ دیا...... کچھ دیر سوچتے رہے پھر بولے۔

''اب کیا کریں؟''

''جو حکم غوث صاحب''۔

''کچھ ہونا ضرور چاہئے...... یہاں رک کر کیا کریں...... ویسے اس وقت میری سمجھ میں ایک بات ضرور آئی ہے۔ وہ تمہاری مخالفت اس لئے کرتی ہے کہ اس کا پلان خراب ہوگیا ہے، پہلے میں خود گاڑی چلاتا تھا۔ مجھ پر اچانک دورے پڑتے ہیں، ایسے ہی کسی لمحے کار کا حادثہ ہوسکتا تھا، مگر وہ دیر میں سوچتی ہے، تمہارے آنے سے پہلے ہی ایسی کوئی کھٹارہ گاڑی خریدنی چاہئے تھی...... وہ دیر سے سوچتی ہے''۔ غوث خان صاحب بے اختیار مسکرا پڑے۔ میں نے حیرانی سے اسے مسکراتے ہوئے دیکھا...... یہ مسکراہٹ بڑی جاندار تھی۔

اچانک انہوں نے سنبھل کر کہا...... ''اب تم یوں کرو کہ گاڑی کسی جگہ ٹکرا دو۔ ذرا ٹھیک ٹھاک ٹکر ہونی چاہئے...... گاڑی کا اگلا حصہ کافی خراب ہونا چاہئے۔ پھر اسے مکینک کے پاس پہنچادو اور اطمینان سے اسے وہاں کھڑے رہنے دو...... اس طرح ایک لمبے عرصے کے لئے اس سے ہمیں نجات مل جائے گی۔ چلو یوں کرو اس سامنے والے درخت کی طرف اس کا رخ کردو...... اسی گیئر میں ڈالو اور ایکسیلیٹر پر ایک بھاری پتھر رکھ دو...... بعد میں پتھر اٹھالینا''۔

یہ ساری کارروائی میرے لئے بھی سنسنی خیز تھی..... گاڑی درخت سے ٹکرا گئی اور پھر میں نے پتھر اٹھالیا..... پھر ہم ایک ٹیکسی کر کے دفتر پہنچ گئے..... غوث صاحب کی آنکھوں میں ایک شریر سی چمک تھی۔ ان کا موڈ بے حد خوشگوار تھا..... انہوں نے کہا۔

''جاؤ تم گاڑی کسی گیراج میں اٹھوادو..... مجھے مصروفیت کی وجہ سے سوچنے کا موقع نہیں ملا تھا، لیکن بدن میں پھریریاں دوڑ رہی تھیں..... اگر نیلم اطلاع نہ دیتی تو بڑا حادثہ ہوتا۔ نیلم کے لئے اچانک میرے دل میں بڑی محبت جاگ اٹھی تھی۔ واپس دفتر پہنچا تو غوث صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''میں نے اسے اطلاع دے دی ہے اور کہہ دیا ہے کہ ہم دونوں خیریت سے ہیں'' وہ ہنس پڑے پھر بولے، ''البتہ تمہاری خیریت نہیں ہے۔ خود کو تیار رکھنا فون پر چیخ رہی تھی کہ ڈرائیور کو بریک خراب ہونے کا احساس نہ ہوسکا، وہ کیسا ڈرائیور ہے؟''

''آپ مجھے بتادیں کہ مجھے کیا کرنا ہے؟'' میں نے سخت لہجے میں کہا۔

''اوہ یار..... میری مدد پر آمادہ ہوئے ہو تو پھر پوری مدد کرو..... کچھ بکواس کرے تو سن لینا، اس سے زیادہ کیا ہوگا..... چاہو تو اس ڈانٹ ڈپٹ کا بل الگ سے بنادینا، میں ادا کردوں گا..... اب بھگتنا تو ہے''۔ غوث صاحب نے ہنستے ہوئے کہا۔

دوپہر کو ٹیکسی سے گھر واپس ہوئی تھی۔ غوث صاحب نے ٹیکسی ایک سویٹ ہاؤس کے سامنے رکوائی اور مجھے آنے کا اشارہ کیا..... سویٹ مارٹ سے انہوں نے اخروٹ کا حلوہ، مکھانے کا حلوہ، بادام کا حلوہ کافی مقدار میں خریدا اور سارے ڈبے مجھ پر لدوا کر ٹیکسی میں آبیٹھے۔ ٹیکسی میں بیٹھتے ہوئے انہوں نے ہنس کر کہا۔

''یہ حلوے اس کا موڈ ٹھیک کرنے میں اکسیر کا کام کریں گے..... اپنی جیسی کوشش کرلیتے ہیں..... آگے اللہ مالک ہے''۔ میں نے کوئی جواب نہیں دیا، البتہ دل میں یہ ضرور سوچا تھا کہ علی رحمان نے بظاہر ایک آسان کام میرے حوالے کیا ہے، لیکن درحقیقت یہ ایک مشکل ترین کام ہے اور اس بھوت گھر میں دماغ کی چولیں درست رکھنا سخت مشکل ہے..... تاہم دو ہزار روپے علی رحمان کی طرف سے، اٹھارہ سو روپے ڈرائیور کے طور پر تنخواہ اور پانچ ہزار روپے اسپیشل معاوضہ..... آٹھ ہزار آٹھ سو روپے بہت ہوتے ہیں اور اس معاوضے پر یہ سب کچھ کیا جاسکتا تھا۔

ٹیکسی گھر کے سامنے رک گئی۔

''تم یہ سامان اٹھا کر دو منٹ کے بعد اندر آؤ۔ اس وقت صورتِ حال کیا ہوگی، میں جانتا ہوں''۔ میں نے گردن ہلائی..... ٹیکسی کا کرایہ غوث خان صاحب دے گئے تھے۔ میں نے سامان کے ڈبے اٹھائے اور گیٹ کی طرف بڑھ گیا..... برآمدے میں نیلم اور بیگم صاحبہ کھڑی نظر آرہی تھیں..... غوث صاحب ان کے پاس پہنچ گئے تھے۔ میں غوث صاحب کے حکم کے مطابق رکا اور یہیں سے میں نے انہیں بیگم صاحبہ کے ساتھ اندر جاتے ہوئے دیکھا..... نیلم البتہ کھڑی رہی تھی۔ جب غوث صاحب اندر چلے گئے تو میں بھی گیٹ سے اندر داخل ہوگیا..... نیلم نے آگے بڑھ کر خاموشی سے ڈبے میرے ہاتھ سے لے لئے اور تیزی سے واپس مڑ گئی۔

''نیلم..... سنو''۔ میں نے اسے پکارا اور وہ بغیر رکے اندر داخل ہوگئی..... میں سر کھجا کر رہ گیا..... ظاہر ہے گھر میں اگر کسی کی کھوپڑی درست ہوتی تو یہ گھر نرالا کیسے ہوتا..... میرے پاس اس کے سوا کیا چارہ تھا کہ میں بھی اپنے کمرے میں چلا جاتا۔

باقی دن خاموشی سے گزر گیا..... کوئی چھ بجے میں باہر نکلا اور نئی گاڑی کے قریب پہنچ کر اس کے دروازے کھول لئے۔ پائیدان وغیرہ نکال کر جھاڑنے لگا۔ روزانہ کا معمول تھا، یہ کوئی نئی بات نہیں تھی..... ابھی زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ اندر سے طوفان برآمد ہوا اور ایک سو ساٹھ میل فی گھنٹے کی رفتار سے میری جانب بڑھا..... اس نے میرے قریب پہنچ کر پائیدان میرے ہاتھ سے چھین کر دور اچھال دی اور کڑک دار لہجے میں بولی۔

''آئندہ تم میری گاڑی کے نزدیک نظر آئے تو میں تمہیں گولی مار دوں گی۔ سمجھے میری گاڑی کو ہاتھ مت لگانا''۔ میں نے سرد نگاہوں سے بیگم صاحبہ کو دیکھا اور دل میں سوچا کہ محترمہ میں بھی ٹھنڈے مزاج کا آدمی نہیں ہوں۔ اس کا ایسا جواب دے سکتا ہوں کہ آپ کو آخری دم تک یاد رہے گا، مگر علی رحمان نے مجھے کسوٹی پر رکھا ہے اور مجھے ان کے معیار پر پورا اترنا ہے، اس لئے مجبور ہوں..... بیگم صاحبہ بولیں۔

''تم ڈرائیور ہو یا گھسیارے..... تمہیں اندازہ نہیں ہوسکا کہ گاڑی کے بریک فیل ہیں؟''

''کیا مجھے اس کا اندازہ ہوجانا چاہئے تھا۔ بیگم صاحبہ؟'' میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا، مگر وہ غصے میں تھیں، انہوں نے میرے سوال کا مفہوم نہیں سمجھا اور بولیں۔

''گاڑی پر جو خرچ آئے گا وہ کون دے گا؟''

''مشین تو مشین ہے بیگم صاحبہ..... کوٹھی سے نکلتے ہوئے تو بریک درست تھے۔ راستے

میں فیل ہو گئے"۔

"بکواس کرتے ہو"۔ وہ غرائیں۔

"میں سمجھا نہیں بیگم صاحبہ، کیا وہ پہیئے خراب ہو چکے تھے؟" میں نے پوچھا اور وہ گئیں...... ایک لمحے کے لئے الجھیں پھر اسی انداز میں بولیں۔

"تم ہماری جان بخشی نہیں کر سکتے؟...... میں نے تمہیں ہر طرح سمجھایا ہے کہ ہ ڈرائیور کی ضرورت نہیں ہے...... ہم ویسے ہی برے حالات کا شکار ہیں۔ تم اور مصیبت بن ہم پر نازل ہو گئے ہو"۔

"میں آپ کا ہمدرد ہوں، بیگم صاحبہ، میں نے تو تنخواہ بھی نہ لینے کا فیصلہ کیا ہے"۔

"ہم تمہارا احسان نہیں لینا چاہتے"۔

"اس میں احسان کی کیا بات ہے...... انسان ہی انسان کے کام آتے ہیں"۔

"ہمیں تمہاری ضرورت نہیں سمجھے...... خدا کے لئے ہماری جان چھوڑ دو۔ گاڑی کر دی تم نے، اگر میرے شوہر کو کچھ ہو جاتا تو؟"

"آپ کے حق میں بہتر ہوتا"۔ میں نے کہا اور وہ دم بخود رہ گئیں...... میں نے غ سے غوث صاحب کو آتے ہوئے دیکھا تھا۔ وہ چیل کی طرح پرواز کرتے ہوئے ہمارے پہنچ گئے۔

"کیا بات ہے؟ کیا کہہ رہی ہو تم اس سے؟"

"آپ...... آپ اسے فوراً نکال دیں...... سمجھے آپ اسے فوراً نکال دیں...... یہ ب ہے۔ مجھ سے زبان چلاتا ہے"۔

"میں نے آپ کو سمجھایا تھا...... آپ سے کہا تھا کہ اس سے کچھ نہ کہیں"۔

"کیوں؟...... آپ کو وجہ بتانی ہو گی"۔

"مجھے اس کی ضرورت ہے"۔

"مجھے نہیں ہے"۔

"میں نے اپنی ضروریات بتائی تھیں، آپ کی نہیں"۔

"کیا ضرورت ہے آپ کو اس کی؟"

"میں گاڑی نہیں چلا سکتا، میری صحت کا کچھ اندازہ ہے آپ کو؟ کسی بھی وقت حاد

بولتا ہوں"۔

"ہم اپنے اخراجات نہیں بڑھا سکتے...... آپ اسے نکال دیں"۔

"نہیں نکالوں گا"۔

"نکالنا ہو گا آپ کو"۔ وہ غرائیں ان کا چہرہ سرخ ہونے لگا تھا۔

"دیکھتا ہوں کون نکالتا ہے اسے؟"

"میں نکالوں گی...... میں...... میں نکالوں گی، میں نکالوں گی"۔

بیگم صاحبہ بدزبانی کے انداز میں چیخیں۔ ان کا چہرہ بگڑنے لگا۔ پھر اچانک ہی وہ مسکرانے اور زمین پر گر پڑیں۔ غوث صاحب کے ہوش اُڑ گئے اور بدحواس ہو کر بیگم صاحبہ کو نے کی کوشش کرنے لگے...... لیکن وہ دھان پان تھے، کامیاب نہ ہو سکے...... مجھے ہی یہ انجام دینی پڑی تھی، مگر غوث صاحب کی پریشانی قابلِ دید تھی۔

"کسی ڈاکٹر کو بلا کر لاؤں غوث خان صاحب؟" میں نے پوچھا۔

"جان دے دے گی دوائی نہیں کھائے گی...... انجکشن سے اس طرح ڈرتی ہے جیسے بکری اے بلکہ ایک طرح سے کہہ لو کہ قصائی کی چھری سے"۔ انہوں نے غم آلود لہجے میں کہا اوش ہو گئے بڑا الجھا ہوا معاملہ تھا...... غوث صاحب مجھ پر کھل گئے...... کھلنا ہی تھا...... انے اپنی زندگی کے تحفظ کے لئے مجھے بلایا تھا، مگر اس کے باوجود انہیں بیگم صاحبہ سے ا کا خطرہ تھا۔ ان کی پریشانی قابلِ دید تھی...... پتھرائے ہوئے بیوی کے سرہانے بیٹھے تھے۔ میرا ان کے پاس رکنا ممکن نہیں تھا...... اس لئے میں وہاں سے چلا آیا...... کچھ دیر ہ چلا کہ بیگم صاحبہ ہوش میں آ گئیں اور ان کی کیفیت بہتر ہے۔

رات ہو گئی...... نیلم نے مجھے کھانا دیا تو میں نے کہا۔ "نیلم مجھے تم سے شکایت ہے"۔

"کیا بات ہے؟"

"دن اور رات کے کچھ ایسے حصے ضرور ہوتے ہیں، جب تمہیں خطرہ نہیں ہوتا۔ اس وتم مجھ مل سکتی ہو"۔

"سکندر میں بہت بزدل ہوں...... یقین کرو بہت بزدل ہوں...... کسی اور کو کچھ ہو نہ ہو، ن میری جان ضرور چلی جائے گی...... ان حالات میں بیگم صاحبہ مجھ پر بہت کڑی نگاہ ہیں۔ انہیں میرے اور تمہارے درمیان ذرا بھی یگانگت کا پتہ چل گیا تو یوں سمجھ لو مجھے

مرنا پڑے گا''۔

''حالانکہ تم نے میرے یہاں آنے پر بڑی خوشی کا اظہار کیا تھا''۔

''بعد میں مجھے جو ہدایات ملیں، وہ میرے خیال کے برعکس تھیں''۔

''بیگم صاحبہ کی طرف سے؟''

''یہ سوال کیوں کرتے ہو؟''

''اب کیا ہوگا؟ میرا مطلب ہے کہ بیگم صاحبہ اتنا شدید اختلاف کررہی ہیں، میرے میں تو کیا میں یہاں رہ سکوں گا''۔

''ہاں تم یہاں رہو گے''۔ وہ مسکرا پڑی اور میں تعجب سے اسے دیکھنے لگا۔

''میں سمجھا نہیں''۔

''حالات ہموار ہوگئے ہیں''۔

''کیسے؟''

''ایسا ہی ہوتا ہے...... کبھی غوث خان صاحب کی حالت خراب ہوجاتی ہے۔ وہ کے عالم میں بیگم صاحبہ کی ہر بات مان لیتے ہیں اور کبھی بیگم صاحبہ بیمار پڑتی ہیں تو شوہر ک ان کے دل میں پھٹ پڑتی ہے''۔

''یعنی الٹا معاملہ؟'' میں نے حیرت سے کہا۔

''یہاں کچھ سیدھا ہے؟'' وہ مسکرا کر بولی۔

''خدایا''۔ میں نے دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ لیا۔

''کھانا کھاؤ...... معدہ پُر ہوجائے تو خیالات زیادہ پریشان نہیں کرتے''۔ نیلم نے

''میرا معاملہ ہموار ہوگیا؟'' اس نے پوچھا۔

''ہاں بیگم صاحبہ نے اپنا مطالبہ واپس لے لیا ہے۔ اب شاید تمہاری مخالفت بھی نہ

''تمہیں کیسے معلوم؟''

''اتفاق سے یہ گفتگو، بلکہ یہ معاہدہ میرے سامنے ہی ہوا تھا''۔

''اوہ...... اور اب مجھے وہ سب سے اہم بات نہیں بتاؤ گی؟''

کون سی اہم بات؟''

''نیلم، تم نے مجھ پر بھی احسان کیا ہے۔ اگر تم مجھے ہوشیار نہ کردیتیں تو میں خود

ے میں ہلاک ہوسکتا تھا''۔

''اس انکشاف کا تعلق خالص میری ذات سے ہے''۔

''وہ کیسے؟'' میں نے پوچھا۔

''بس ہے...... تفصیل سن کر ہنسو گے''۔

''میں جاننا چاہتا ہوں نیلم، براہ کرم مجھے بتادو''۔

''مجھے...... یعنی میں سچے خواب دیکھتی ہوں، سکندر۔'' بہت سچے خواب دیکھے ہیں میں اور میرے خوابوں کا نتیجہ فوراً نکلتا ہے۔ میں کبھی فرصت سے تمہیں ان خوابوں کے ے میں بتاؤں گی جو میں نے دیکھے...... رات کو بھی میں نے خواب دیکھا تھا اور یہ ہی دیکھا کہ گاڑی کے بریک فیل ہوگئے ہیں اور تمہیں حادثہ پیش آگیا ہے''۔

''نیلم...... کیا یہ قابلِ یقین بات ہے؟'' میں نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔

''ہاں ہے تو...... کیونکہ جو کچھ میں نے تمہیں بتایا، وہ ہوا''۔

''تمہاری مرضی ہے نیلم...... اس کا صرف ایک نتیجہ نکال سکتا ہوں میں اور وہ یہ کہ تم مجھ اعتماد نہیں کرتیں...... خیر ایک طرح سے درست بھی ہے۔ ظاہر ہے ہمارے درمیان کوئی ایسا نہیں ہے۔ تمہاری مرضی نیلم...... میں آئندہ تم سے کچھ نہیں پوچھوں گا''۔

''بلاوجہ میری طرف سے بدظن ہورہے ہو، میں نے سچ بولا ہے تم سے''۔

''سچ نہیں بولا نیلم...... تم نے کہا تھا، گاڑی آہستہ چلانا۔ اس میں کچھ ہوا ہے اور اب تم نے بریکوں کے بارے میں بتایا''۔

''اوہ...... اب مجھے معلوم ہوچکا ہے کہ گاڑی کے بریک فیل ہوگئے تھے...... اچھا اب مجھے نا چاہئے وہ دونوں جاگ رہے ہیں''۔ نیلم چلی گئی اور میں اس کے بارے میں سوچتا رہا۔

اچانک مجھے احساس ہوا کہ بڑی فاش غلطی کررہا ہوں...... نیلم بے شک ملازمہ ہے، لیکن کچھ اور بھی تو ہوسکتی ہے...... وہ بھی کافی، پُراسرار کردار ہے...... اس نے جو کچھ اپنے بارے ما کہا ہے، کیا ضروری ہے کہ وہ درست ہو...... میں نیلم پر بھروسہ کرنا چاہتا ہوں، بلکہ میرے ما کے گوشے اس کے لئے نرم ہوگئے ہیں...... یہ چیز میرے لئے خطرناک ہوسکتی ہے...... ممکن ہے اعتماد میں کچھ ایسی باتیں نکل جائیں میرے منہ سے جو بعد میں خطرناک ثابت ہوں.... سا میں کوئی شک نہیں ہے کہ گاڑی کے بارے میں بتا کر اس نے مجھے حادثے سے بچایا تھا۔

دوسری صبح بہت جلد آنکھ کھل گئی تھی...... میں معمول کے مطابق کچن میں نہیں گیا
ساڑھے آٹھ بجے نیلم خود ہی میرے لئے ناشتہ لائی اور کچھ کہے بغیر باہر نکل گئی...... تب م
نے سوچا، نیلم پر نگاہ رکھنا بھی ضروری ہے۔ پھر اتفاق سے صبح کے ناشتے پر میں نے اس عجیب
وغریب جوڑے کو دیکھا تھا۔ ناشتے کی میز لاتعداد اور لوازمات سے بھری ہوئی تھی اور بیگم صاحبہ
کہہ رہی تھیں۔

''اللہ...... مجھ سے نہیں کھایا جارہا''۔

''دیکھو بیگم...... مجھے پریشان نہ کرو...... تمہیں میری پریشانیوں کا اندازہ ہے''۔

''میں نے کیا کیا ہے؟''

''آئینہ دیکھتی ہو کبھی؟''

''روز دیکھتی ہوں''۔

''میری آنکھوں سے بھی دیکھو کبھی...... کیا تھیں اور کیا ہوگئی ہو''۔

''اچھی خاصی اسمارٹ تھی، گول ہوتی جارہی ہوں''۔

''خاک گول ہورہی ہو...... میں کہتا ہوں جسم دکھاوے کا ہے، خون نہ ہونے کے
ہے جسم میں...... غذا ہی نہ پہنچے گی تو خون کہاں سے بنے گا...... تمہیں مقوی غذاؤں کی ضرور
ہے...... یہ مکھانوں کا حلوہ لو''۔

''ناک تک پیٹ بھر گیا ہے...... اب گنجائش نہیں ہے''۔

''تھوڑا سا اور لو پلیز...... تمہیں کھاتے دیکھ کر میرے دل میں ٹھنڈک اترتی ہے۔
تمہاری زندگی درکار ہے''۔

''تقدیر نے تو ہمارا ساتھ نہ دیا...... غوث''۔ بیگم صاحبہ نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔

''تقدیر ہمارا ساتھ ضرور دے گی...... تم فکر مند کیوں ہو...... ایک دن تمہیں بتاؤں گا
دیکھ لو، میں نے اپنی کھوئی ہوئی حیثیت پھر سے حاصل کرلی ہے''۔

''وہ دن کب آئے گا؟''

''آہ...... ضرور آئے گا...... کہیں سے کچھ رقم ہاتھ لگ جائے...... پھر دیکھنا کہ میں کیسے
کے چار اور چار کے آٹھ بناتا ہوں''۔

''صحت تو ساتھ چھوڑتی جارہی ہے تمہاری...... ہر وقت تمہارے لئے فکر مند رہتی ہوں

رہو گے...... کیسے کرو گے...... مجھ پر اتنا خرچ کرتے ہو اپنا علاج بھی نہیں کراتے...... کتنی
کہ اچھے ڈاکٹر کو دکھاؤ، مگر مجال ہے جو بات سنو!''۔

''ڈاکٹر مجھے بستر نشین کردے گا اور صحیح معنوں میں وہی میری موت ہوگی...... میں ڈاکٹر
مشورہ کرتا ہوں۔ اپنے بارے میں اور تمہارے بارے میں بھی''۔

''پتہ نہیں یہ ڈاکٹر زبیر کون ہیں؟ کبھی مجھے بھی تو ان سے ملاؤ۔ تمہاری بیماری کے بارے میں
ان سے...... ان سے، میرے لئے تو مشورہ دیتا رہتا ہے، تمہارے بارے میں کیا کہتا ہے وہ؟''

''ہارے بارے میں کیا کہے گا، جبکہ میں اپنی بیماری کو خود سمجھتا ہوں...... آہ...... مشکلات
جھے ڈھال کردیا ہے ورنہ......'' غوث صاحب نے کہا۔

بیگم صاحبہ اس گفتگو کے دوران مسلسل حلوے پر ہاتھ صاف کئے جارہی تھیں اور میں اس
عورت کو حیرت سے دیکھ رہا تھا...... اس غمناک گفتگو کے دوران حلوے کی پوری پلیٹ
کر گئی تھی...... غوث صاحب اس دن دفتر نہیں گئے تھے۔

شام کو وہ بیگم صاحبہ کو لے کر سیر کرنے نکل گئے۔ گھر میں نیلم اور میں رہ گئے تھے، لیکن
نے کمرے میں ہی رہا۔ میں نیلم سے ناراضی ظاہر کرنا چاہتا تھا، لیکن وہ میرے پاس نہ
البتہ رات کو کھانا رکھ کر چلی گئی تھی۔ نہ جانے میرے ذہن میں کیا خیال آیا...... میں بھی
کے بعد کمرے سے باہر نکل آیا...... نیلم اپنے کمرے میں چلی گئی تھی۔

خواب گاہ میں روشنی کرکے اس نے دروازہ بند کرلیا تھا...... ایسا کوئی ذریعہ نہیں تھا کہ
اندر جھانک کر دیکھ سکتا۔ چند لمحات میں وہاں رکا...... پھر یہ تگ و دو بیکار سمجھ کر وہاں سے
آ...... کھانا کھاتے ہوئے میں دیر تک سوچتا رہا کہ مجھے کیا کرنا چاہئے۔

دوسرے دن میں نئی گاڑی میں غوث خان کو لے کر دفتر روانہ ہوا...... طے یہ ہوا تھا کہ
گاڑی لے کر واپس آجاؤں گا...... راستے میں غوث خان صاحب نے کہا۔

''اس واقعہ نے تمہارے لئے حالات بہتر کردیئے ہیں''۔

''وہ کیسے غوث خان صاحب؟''

''اب وہ تمہاری مخالفت نہیں کرے گی...... اس نے مجھ سے وعدہ کرلیا ہے''۔

''یہ سب کچھ میرے لئے بے حد عجیب ہے غوث صاحب''۔

''میں جانتا ہوں مگر تم مجھے بتاؤ کہ میں کیا کروں؟ میں اسے چاہتا ہوں اور...... وہ......

وہ...... میری موت کی خواہاں ہے''۔

''آپ کے ذہن میں یہ خیال کیسے پیدا ہوا غوث خان صاحب؟''

''صرف خیال پر تو یہ سب کچھ نہیں کیا جاسکتا...... کون گھر کی بات باہر نکالنا پسند کرتا ہے؟''

''گویا آپ کو پورا یقین ہے؟''

''کتنی بار مجھ سے یہ سوال کرو گے؟''

''دراصل یہ سب کچھ میری سمجھ میں نہیں آرہا۔ اگر بیگم صاحبہ کبھی آپ کو نقصان پہنچا
میں کامیاب ہوجائیں تو آپ کو کیا فائدہ ہوگا۔ آپ تو جان سے جائیں گے اور فرض کیجئے
کے جرم کا راز فاش ہوجائے تو ظاہر ہے انہیں سزا ہوجائے گی اور آپ کو کیا ملے گا؟''

غوث خان صاحب پھیکے سے انداز میں ہنس پڑے۔ ''تمہارا دل چاہے تو تم اسے
دیوانگی کہہ سکتے ہو...... میں اسے اپنی زندگی سے زیادہ چاہتا ہوں، مگر وہ...... کوئی کیا کر
ہے...... کسی کے دل کو تو نہیں بدلا جاسکتا۔ وہ مجھ سے اس لئے بددل ہوچکی ہے کہ میں
ہوچکا ہوں۔ میں تھوڑا سا وقت چاہتا ہوں۔ اگر مجھے سنبھلنے کا موقع مل جائے تو میں
کچھ حاصل کرسکتا ہوں جو کھو چکا ہوں اور مجھے یقین ہے کہ اس وقت اسے اپنے کئے پر
ہوگا۔ مگر اسے اس کا یقین نہیں ہے اور وہ صرف میری موت کا انتظار کررہی ہے تاکہ
میرے حصے کی رقم مل جائے، مگر میں کچھ اور سوچ رہا ہوں جو میں تمہیں بتا چکا ہوں''۔

''آپ کے درمیان اس موضوع پر بات ہوئی ہے کبھی؟''

''کس موضوع پر؟''

''میرا مطلب ہے...... آپ نے اپنے بارے میں کبھی بیگم صاحبہ سے خدشہ کا اظہار کیا
''ظاہر ہے، وہ جو کچھ کررہی ہے وہ تو میں اس سے نہیں کہہ سکتا۔ ہاں وہ میری
سے فکرمندی کا اظہار کرتی ہے''۔

''کبھی آپ نے ان سے علیحدگی کا تذکرہ کیا؟''

''صرف ایک بار...... اور اسے دورہ پڑ گیا تھا...... اس نے بہت رنج کا اظہار کیا
خیال پر...... ویسے بھی اسے شدید بلڈ پریشر رہتا ہے''۔

''یہ خطرناک ہوسکتا ہے، جبکہ وہ علاج بھی نہیں کراتیں اس کا''۔

''اسے دواؤں سے چڑ ہے''۔

''ان کی خوراک بھی معاف کیجئے، بہت زیادہ ہے اور بلڈ پریشر کی مریضہ ہونے کے
ان اشیاء کو زیادہ پسند کرتی ہیں جن میں کولیسٹرول کی مقدار زیادہ ہوتی ہے''۔

''اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ مریضہ ہے، مگر یہ اشیاء اسے تندرست رکھتی ہیں۔ اس
نے بڑھتے ہوئے بدن کی وجہ سے ڈائٹنگ کی تھی جس نے اسے زندہ درگور کردیا تھا۔ وہ
ری تندرست رہتی ہے...... ان تمام چیزوں کا اسے بے حد شوق ہے...... اگر کبھی کمی
ہے تو وہ محسوس کرنے لگتی ہے''۔

''عجیب گورکھ دھندا ہے''۔ میں نے گہری سانس لے کر کہا۔ پھر اچانک مجھے خیال آیا
نے پوچھا'' یہ نیلم کیسی لڑکی ہے؟''

''نیلم......؟ کیوں؟'' غوث صاحب نے چونک کر پوچھا۔

''وہ کبھی بیگم صاحبہ کی آلہ کار نہیں بن سکتی''۔

''اوہ۔ ہرگز نہیں، وہ بہت پیاری بچی ہے...... بالکل معصوم اور بے ضرر، اگر اس کے کانوں
میں ایسی بات ڈال دی جائے تو کسی کو نقصان پہنچانے کے بجائے وہ خود ہی خوف سے
مر جائے گی...... میں بے وقوف نہیں، اس کا جائزہ لے چکا ہوں، تمہیں اس پر کوئی شک ہوا ہے؟''

''بالکل نہیں میں نے بس یونہی اس کے بارے میں سوچا تھا''۔

''نہیں...... اس پر کوئی شبہ نہ کرو۔ بیگم بھی اتنی بے وقوف نہیں کہ وہ اس سے کوئی ایسا
کام لینے کی کوشش کریں...... وہی بعد میں ان کی گردن پھنسانے کا باعث بن سکتی ہے''۔

میں غوث صاحب کی بات سے متفق نہیں تھا، لیکن کوئی اظہار بھی نہیں کرنا چاہتا تھا، انہیں
چھوڑ کر واپس پلٹا...... علی رحمان صاحب بہت یاد آرہے تھے اور پھر موقع بھی تھا، چنانچہ ان
کی طرف چل پڑا...... انہوں نے حسب عادت مسکرا کر میرا استقبال کیا تھا۔

''آپ نے جو کام میرے سپرد کیا ہے، اس کے بارے میں ایک سوال کرنا چاہتا ہوں''۔

''ضرور؟'' انہوں نے کہا۔

''یہ کام کوئی اور بھی کرسکتا ہے''۔

''کیا مطلب؟''

''آپ کو کوئی دوسرا بے وقوف نہیں ملا تھا؟''

''کوئی اہم بات ہوگئی ہے شاید؟''

"نہیں ایسی کوئی بات نہیں...... سب کچھ معمول کے مطابق ہے، ہوسکتا ہے کوئی نئی
بات بھی ہو جائے"۔

"کیا؟" انہوں نے دلچسپی سے پوچھا۔

"اس بار آپ کو مجھے چار سال کے لئے پاگل خانے پہنچانا پڑے گا، کیونکہ آپ نے
غیر سرکاری پاگل خانے بھیج دیا ہے"۔

"ہمت ہار رہے ہو"۔

"نہیں...... ہمت نہیں ہار رہا بلکہ میرے دماغ کے کل پُرزے کچھ گڑ بڑ ہونے لگے
ہیں"۔ میں نے کہا اور علی رحمان مجھے پُرخیال نظروں سے دیکھنے لگے اور پھر بولے۔

"درحقیقت یہ مسئلہ میرے لئے بھی اس قدر اہم نہیں...... عزیزم، یوں سمجھ لو
سلطان احمد صاحب کی مروت میں یہ سب کچھ کر رہا ہوں...... اخراجات بھی وہی کر رہے
اور ان کا بوجھ مجھ پر نہیں ہے...... تم اگر کچھ مشکل محسوس کر رہے ہو تو واپس آسکتے ہو......
میں نے تم سے بہت سی امیدیں وابستہ کرلی ہیں اور تجربہ کر کے بہت خوش تھا"۔

"تجربہ؟" میں نے سوال کیا۔

"پولیس دن رات یہی سب کرتی ہے۔ برخوردار ایسے جرائم شدید ذہنی کاوش سے
کیے جاتے ہیں...... سراغ لگتے ہیں، گتھیوں کو سلجھانے کے لئے بڑی محنت کرنی پڑتی ہے
تجربہ میں نے یہ کیا کہ ایک غیر سرکاری کام ایک غیر سرکاری شخص کے حوالے کردیا......
کام کسی تربیت یافتہ کے حوالے کیا گیا ہوتا تو وہ تربیت یافتہ افراد کی طرح کرتا۔ یہ غیر
سرکاری ہے۔ سمجھ لو سلطان احمد صاحب کو ڈیوٹی کے دوران ایک کیس ملا تھا...... جسے حل کرنے
میں ناکامی ہوئی ہے۔ یہ قتل کا معاملہ تھا، ان کی ایک عزیزہ کا، مگر کامیابی نہ ہوئی۔ قاتل نہ
پکڑے گئے...... ثبوت نہ ملا...... یہ داغ تھا، ان کے ذہن میں، جس وہ دور کرنا چاہتے
تھے...... اس کے لئے ریٹائر ہوکر بھی انہوں نے کوششیں جاری رکھیں...... تم سمجھ رہے ہو
یہ ان کا معاملہ بھی تھا اور رشتے کا بھی"۔

"جی!"

"غوث صاحب اس پائے کا آدمی نہیں تھا کہ ڈی آئی جی سلطان احمد اس سے دوستی
کرتے۔ یہ دوستی انہوں نے شبہے کی بنا پر کی تھی۔ اپنی عزیزہ کے قتل کے سلسلے میں انہیں

شبہ تھا۔ علی رحمان کے اس انکشاف پر میں اچھل پڑا۔

"غلام غوث خان پر؟"

"ہاں...... تمہیں حیرت ہے؟"

"وہ تو مرنجاں مرنج آدمی ہے اور...... اور"۔

"ان کے الفاظ کی روشنی میں تم اس پر غور کرو اور بتاؤ کیا وہ قاتل ہوسکتا ہے"۔ علی رحمان
رک کر بولے۔

"خدا کی پناہ...... میں کچھ نہیں کہہ سکتا"۔

"میں نے تم سے کہا ہے کہ تم صرف غوث خان کی بیوی پر نہیں بلکہ خود غوث خان پر بھی
نظر رکھنا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ غوث خان نہیں جانتا تھا کہ سلطان احمد اس عورت کا رشتے دار
ہے اور وہ قتل کی تفتیش اپنی نگرانی میں کراتے رہے ہیں۔ بات ادھر ادھر ہوئی مگر سلطان احمد
کے ذہن سے نہیں نکلا...... سلطان احمد بڑی مشکل سے اسے اپنے جال میں پھانس سکے تھے......
یہاں تک کہ غوث ان سے اپنے دل کی بات کہہ بیٹھا اور انہوں نے اس سے ہمدردی کرتے
ہوئے اسے یقین دلایا کہ وہ کچھ کریں گے...... انہوں نے مجھ سے بات کی اور میں نے اتفاق
سے تمہیں اس کے لئے منتخب کرلیا۔ اس کی اطلاع میں سلطان احمد کو بھی دے چکا ہوں"۔

"سلطان احمد صاحب سے تو اس کا رشتہ تھا، مگر غلام غوث خان سے اس کا کیا رشتہ تھا؟"
میں نے پوچھا۔

"میاں بیوی کا......" علی رحمان نے ایک اور دھماکہ کیا۔

"یعنی...... یعنی غوث خان صاحب اس سے پہلے بھی شادی کر چکا تھا اور یہ خاتون اس
کی دوسری بیوی ہیں"۔

"دوسری نہیں، چوتھی"۔

"اوہ...... میرے خدا...... میرے خدا...... وہ اس سے پہلے تین شادیاں کر چکا ہے"۔

"اور بھی بہت سی دلچسپ باتیں ہیں۔ سنو گے تو حیران ہو جاؤ گے۔ اس کی پہلی تینوں
بیویاں غیر طبعی موت مری تھیں"۔

"یعنی قتل؟"

"خدا بہتر جانتا ہے۔ سب سے پہلی بیوی...... مگر ٹھہرو۔ غوث صاحب کے بارے میں

تمہیں کچھ بھی بتانا مناسب رہے گا...... بہت پہلے وہ غوث خان نہیں تھا...... شاید تم نے کبھ
پریتم شاہ کا نام سنا ہوگا؟"

"کبھی نہیں سنا"۔

"فلم انڈسٹری کا ایک ناکام اداکار جو ایک نامور اداکارہ پھول وتی کی دریافت تھا۔ پھول وتی کا اصل نام نصیب جہاں تھا...... اسی طرح پریتم شاہ کا اصلی نام شیر خان تھا اور فلمی نام پریتم شاہ...... لڑکی کو اس سے محبت ہوگئی تھی، اس نے اپنی انتہائی کوشش سے پریتم شاہ کو ایک فلم میں اپنے مقابل ہیرو کا کردار دلوایا...... وہ فلم صرف پریتم شاہ کی وجہ سے فلاپ ہوگئی۔ پھر کئی فلموں میں ولن کا کردار ادا کیا، مگر اس میں بھی ناکام رہا۔ کچھ عرصہ اسے چھوٹے چھوٹے رول ملتے رہے، مگر اسے کسی حیثیت میں پسند نہ کیا گیا...... اس وجہ سے پھول وتی نے انڈسٹری سے ناراض ہوکر اداکاری ترک کردی اور پریتم شاہ سے شادی کرلی۔ وہ لاکھوں کی دولت رکھتی تھی۔ اس نے جذباتی ہوکر ساری دولت پریتم شاہ کے نام کردی۔ اسے بے حد دکھ تھا کہ انڈسٹری نے اس کے محبوب کا کیریئر نہ بننے دیا اور اس دکھ نے اسے شدید ذہنی صدمے سے دوچار کیا...... اس نے کئی ڈائریکٹروں کی پٹائی کردی اور ایک سرپھرے ڈائریکٹر نے اسے سرِعام گولی ماردی اور خود عمر قید بھگتنے نکل گیا"۔

"اداکارہ کی دولت پریتم شاہ کو مل گئی؟"

"صاف ستھرے قانونی راستے سے قتل کے ملزم کو سزا ہوئی، پھر پریتم شاہ یعنی شیر خان غلام غوث کے نام سے منظرِ عام پر آیا۔ اس بار اس نے یاسمین نامی لڑکی سے شادی کی تھی جس سے اس کی ملاقات ایک کلب میں ہوئی تھی...... یاسمین کو کوٹھی، کار اور لاکھوں روپے نقد کے علاوہ ایک ٹیکسٹائل مل جہیز میں ملی تھی، ویسے بھی اس کا باپ فوت ہوچکا تھا...... صرف اس کی ماں تھی، جس سے یاسمین کو بے حد پیار تھا...... شادی کے ایک سال بعد یاسمین کی ماں کا انتقال ہوگیا۔ اب وہ ماں کی موت کے صدمے سے پاگل ہوگئی، بعد میں اس نے دماغی ہسپتال کی بلند جگہ سے کود کر خودکشی کرلی اور غوث خان کو عرصہ دراز تک ساحل سمندر اور ویرانوں میں اداس دیکھا گیا...... رفتہ رفتہ اسے صبر آنے لگا، البتہ اس نے وہ ٹیکسٹائل مل بیچ دی تھی۔ یاسمین کی کوٹھی اور اس کی یاد دلانے والی ہر چیز اس نے بیچ دی اور روپیہ بنک میں جمع کروادیا...... روزینہ نے اس کا غم بانٹ لیا۔

روزینہ، سلطان احمد کی دور کی عزیزہ تھی...... وہ بھی تنہا اور دولت مند تھی...... غوث نے لاکھ مہر نقد ادا کیا اور بعد میں اپنی ساری دولت اس کے نام منتقل کردی اور خود اس کا ثانی رہ گیا...... روزینہ نے اس جذباتی قدم کا جذباتی جواب دیا اور اپنے شوہر کو کنگال نہ رہنے دیا۔ اس نے وہی جذباتی کارروائی کی تھی...... روزینہ نے بھی صرف ڈیڑھ سال غوث خان کا ساتھ دیا۔ اس کی کار کا حادثہ ہوگیا اور اس کا ڈرائیور ہلاک ہوگیا۔ ظاہر ہے اس کا نتیجہ سب سمجھ سکتے تھے۔ سلطان احمد اس دوران آن ڈیوٹی تھے...... انہوں نے سخت ترین تفتیش کرائی لیکن غوث خان بے داغ تھا...... وہ کسی جرم میں ملوث نہ پایا گیا، لیکن سلطان احمد کو تشفی نہ ہوئی تھی۔ وہ بعد میں بھی کوشش کرتے رہے، مگر کامیاب نہ ہو پائے...... پھر وہ ریٹائر ہوگئے...... تفتیش کے دوران وہ غوث کے سامنے کبھی نہیں آئے تھے، اس لئے غوث انہیں نہیں پہچانتا تھا۔ ایک جگہ اس کا تعارف ہوا اور سلطان احمد کے احساسات پھر جاگ اٹھے...... انہوں نے اس سے گہری دوستی گانٹھ لی...... انہیں علم ہوا کہ غوث صاحب نے پھر شادی کی، مگر اس بار اس کے ستارے گردش میں ہیں۔ جن محترمہ سے غوث نے شادی کی ہے وہ بھی دو عدد شوہروں کا ناشتہ کرچکی ہے...... اس کا ماضی بھی غوث سے مختلف نہیں۔ کسی زمانے میں وہ فیروز کمپنی کے مالک کی سیکرٹری تھیں۔ بعد میں فیروز علی خان نے ان سے شادی کرلی اور سوئٹزرلینڈ میں وفات پاگئے...... بیگم صاحبہ تنہا شوہر کی میت کے ساتھ واپس آئی تھیں اور بہت عرصے تک ایک مشہور بیوہ رہیں۔ پھر ان کی بیوگی دور ہوگئی...... تمیں گھوڑوں کے مالک ریس کورس کے شہنشاہ اکبر سیٹھ سے انہوں نے شادی کرلی۔

"اکبر سیٹھ نے اپنے ایک پسندیدہ گھوڑے کے غیر متوقع طور پر ہار جانے پر ریس کورس ہی میں خودکشی کرلی...... خیر سے غوث خان ان کے تیسرے شوہر ہیں...... اس طرح انہوں نے گویا غوث خان صاحب کا چیلنج قبول کیا ہے"۔

"تم بور تو نہیں ہو رہے، اس کہانی سے؟" علی رحمان نے پوچھا۔

"ہرگز نہیں، میرا تو سانس رک رہا ہے"۔ میں نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

"کیوں کیا کسی بیوہ سے شادی کر رہے ہو؟"

"اوہ...... شکر ہے نہیں، لیکن اس کے بعد کیا ہوا؟"

"خدا جانے کیا ہوا؟ غوث خوفزدہ ہوگیا، غالباً بیگم صاحبہ بھاری پڑ رہی ہیں"۔

"آپ کے خیال میں خطرہ غوث کو ہے یا اس کی بیوی کو؟"

"سلطان احمد صاحب کا کہنا ہے کہ غوث اپنی بیوی سے ایک قدم آگے ہے، اس کا تو زیادہ ہے"۔

"مگر خطرے کا اظہار تو اس نے کیا ہے؟"

"ہاں...... یہ ذرا الجھن کی بات ہے۔ سلطان احمد اس الجھن میں ہیں، مگر ان کا دل صاف نہیں ہو پا رہا تھا"۔

"وہ کیسے"۔

"یہ حقیقت ہے کہ غوث صاحب کے سلسلے میں نہایت باریک بینی سے چھان بین کی گئی مگر اس کے خلاف کوئی ثبوت نہ ملا، چنانچہ یہی طے پایا کہ اس کی بیویاں طبعی موت مری تھیں ان سب کی دولت غوث کے ہاتھ آئی تھی اور وہ ہری جھنڈیاں دکھا گئیں"۔

"یعنی؟"

"فیروز صاحب نے ان کے لئے بہت کچھ چھوڑا تھا...... عالی شان کوٹھی، کاروبار اور پھر اکبر سیٹھ کے بارے میں بھی لوگوں کے بہت سے اندازے تھے اور ہو سکتا ہے غوث صاحب کا بھی یہی خیال ہو...... بقول غوث، وہ بالکل قلاش نکلی۔ شادی کے بعد اس نے بتایا کہ درحقیقت اکبر سیٹھ نے اس لئے خودکشی نہیں کی تھی کہ اس کا فیورٹ گھوڑا ہار گیا تھا، بلکہ اس لئے خودکشی کی تھی کہ اس کا دیوالیہ نکل گیا تھا اور اس گھوڑے پر اس نے اپنی آخری پونجی بھی لگا دی تھی...... وہ صرف ساکھ سے کام چلا رہا تھا...... بات ماننے والی بھی تھی۔ چنانچہ جہیز میں بے چاری مسز غوث صرف تین گھوڑے اور ایک مکان لائی تھیں، مگر گھوڑے بھی رہن تھے چنانچہ وہ بھی گئے اور مکان سود میں چلا گیا"۔

"خدا کی پناہ، بڑی انوکھی کہانی ہے"۔

"دوسرا پہلو بھی مدنظر رکھو؟"

"وہ کیا جناب؟"

"جس دن سے غوث صاحب پر انکشاف ہوا، اسی دن اس کے کاروبار پر زوال آنا شروع ہو گیا...... اس کے اثاثے فروخت ہوئے، کاروبار بند ہو گیا اور وہ دیوالیہ ہو گیا"۔

"یہ کیسے ہوا؟"

"خدا بہتر جانتا ہے۔ اپنی بیوی کو وہ بہت چاہتا ہے اور اس کی خواہش ہے کہ اس کے لئے ے تارے توڑ لائے، مگر وہ اسے تارے توڑنے کے لئے آسمان پر بھیجنا چاہتی ہے"۔

"کیا غوث واقعی اپنی بیوی کو اتنا ہی چاہتا ہے کہ سب کچھ معلوم ہونے کے بعد بھی اسے رکھنے کی فکر میں سرگرداں ہے؟"

"خدا ہی جانے، اس کا سابقہ ریکارڈ تو اس بات کی نفی کرتا ہے کہ سب کچھ معلوم ہو اور اس سے مخلص ہو"۔

"حالانکہ اس بار اس کی بیوی قلاش ہے"۔

"نہیں، وہ بھی قلاش نہیں بلکہ ایک بڑی رقم کی بیمہ شدہ ہے۔" علی رحمان صاحب ہنس ے اور میں حیرت سے منہ پھاڑے انہیں دیکھتا رہا...... پھر انہوں نے کہا۔

"انہوں نے گھر کے تمام ملازموں کو نکال دیا ہے، اس لئے کہ وہ انہیں تنخواہ نہیں دے غوث صاحب خالی دفتر لئے بیٹھے ہیں اور اپنی ساکھ بحال کرنے کی فکر میں سرگرداں ہیں"۔

"گھر میں عیش و عشرت کا دور دورہ ہے۔ کسی شے کی کمی نہیں...... غوث صاحب نے 18 روپے تنخواہ کے علاوہ 5000 روپے ماہوار کی پیشکش مجھے الگ سے کی ہے"۔

"کیا؟" علی رحمان صاحب اچھل پڑے۔

"جی ہاں"۔

"اس کی تفصیل؟" انہوں نے پوچھا اور میں نے انہیں غوث صاحب کی سونپی ہوئی ذمہ داری بتا دی اور علی رحمان گردن ہلانے لگے۔

"اس کے علاوہ......؟" میں نے کہا۔

"غوث خان صاحب ایک کروڑ کے بیمہ شدہ ہیں...... اس رقم کی سالانہ پریمیم کیا ہوگی ر قلاش بیگم بھی بیمہ شدہ ہیں۔ ان کی پریمیم......؟ طرہ یہ کہ دونوں میاں بیوی قرض لے رزندگی گزار رہے ہیں۔ بیگم صاحبہ نے شوہر کی ہلاکت کے لئے گاڑی خریدی جو 50 ہزار 70 ہزار مالیت کی ضرور ہوگی"۔

"مجھے اس کیس کے اتنے پُرلطف ہونے کی امید نہیں تھی...... تمہاری جگہ میں ہوتا تو اس پورا پورا لطف لیتا"۔

"آپ نے طویل عرصہ تربیت اور اس کے بعد تجربے میں گزارا ہے جناب! اور میرے

بارے میں آپ جانتے ہیں"۔

"اوہ نہیں سکندر...... تجربہ وقت سے حاصل ہوتا ہے۔ تم کچھ کرو گے ہی نہیں تو تجربہ کیسے حاصل ہوگا...... اس وقت تمہارا دو شاطروں سے واسطہ ہے جنہوں نے بساط بچھا رکھی ہے اور اس پر بہترین کھیل کھیل رہے ہیں...... تمہیں یہ کھیلنا ہے اور میں تمہیں اتنا کمزور ذہن نہیں سمجھتا کہ یہ تمہیں بساط کا مہرہ سمجھ کر پیٹ دیں۔ تمہیں اپنا آپ منوانا ہے...... تمہیں فکر کس کی ہے، جب قانون ہے تمہارے ساتھ اور تم قانون کا کام کر رہے ہو"۔

میں گہری سانس لے رہا تھا...... دماغ کی چولیں ہل رہی تھیں...... کیسے انکشافات تھے۔ علی رحمان بھی کم نہیں ہیں۔ کوئی بھی نیا شوشہ چھوڑ دیتے ہیں۔ آخر وہ ایک گھاگ پولیس آفیسر ہیں۔

"غلام غوث خود بھی چالاک انسان ہے...... یہ بات ذہن میں رکھنا۔ اگر صرف چاہتوں کا معاملہ ہوتا تو وہ اپنے خدشات پولیس تک کبھی نہیں لاتا...... آخر اس سے اس کا کیا مقصد ہے؟" علی رحمان نے کہا۔

"ممکن ہے، وہ اسے احساس دلانا چاہتا ہو کہ تمام تر محبتوں کے باوجود وہ اپنا تحفظ بھی کر رہا ہے"۔

"ہاں یہ بھی ہے۔ مگر تمہارا یہ نکتہ بے بنیاد نہیں ہے۔ ممکن ہے تمہارا مسئلہ اس نے اپنی بیوی کی ذہانت پر چھوڑ دیا ہو اور بڑی گہرائی میں جا کر اسے یہ احساس دلانا چاہتا ہو کہ وہ اپنے تحفظ سے غافل نہیں ہے"۔

"آہ...... ان بے شمار نکتوں میں، کہیں میں بھی ایک نکتہ بن کر نہ رہ جاؤں"۔

"اکتانے سے زندگی کے مسائل حل نہیں ہوتے...... میرے خیال میں اب تمہارے پاس معلومات کا بہت بڑا ذخیرہ ہے، تم اس کے سہارے کام کر سکتے ہو"۔

"جی بہتر......" میں نے ٹھنڈی سانس لی اور اٹھ گیا...... پھر گاڑی چلاتا ہوا اس پُراسرار عمارت میں داخل ہوگیا۔ میں نے خود کو سنبھالا...... مجھ پر ذمہ داری عائد ہے...... جب تک بھی گاڑی چل جائے، 8 ہزار 8 سو روپے ماہوار کھرے کروں۔ یہ معاملہ ختم ہو جائے تو بعد میں دیکھا جائے گا کہ مستقبل کیا ہے۔

یہاں بیکار بیٹھنا مناسب نہ تھا، چنانچہ میں نے لان اور کیاریاں صاف کیں...... پھولوں کو درست کیا اور فالتو حصے کاٹے۔ مجھے اندازہ نہ ہوا کہ بیگم صاحبہ کب باہر نکلیں اور مجھے کتنی دیر سے کام

تے ہوئے دیکھ رہی تھیں...... اچانک میری نگاہ ان پر پڑی تھی۔ میں سنبھل کر سیدھا ہوگیا۔

"تم باغبانی سے واقف ہو؟" انہوں نے نرم لہجے میں کہا۔

"ک ک...... کوئی غلطی ہوگئی، بیگم صاحبہ؟" میں نے گھگھیائے ہوئے لہجے میں کہا۔

"نہیں...... تم نے کیاریاں بہت اچھی طرح سنواری ہیں۔ یہ کام تم نے کہاں سے سیکھا؟"

"سب کچھ کرتا تھا انگریز بہادر کے ساتھ"۔

"پڑھے لکھے بھی لگتے ہو"۔

"بس کام چلانے کی حد تک"۔

"مجھے ایک گلدستہ بنا کر دو"۔

"جی ابھی تیار کرتا ہوں"۔ میں نے کہا اور وہ اندر چلی گئیں...... دوسرا موقع تھا جب انہوں نے سیدھے منہ بات کی تھی، ورنہ تو ان کی نگاہ میں قہر وغضب کی بجلیاں کوندتی ہوئی لگتی تھیں۔ غبانی سے کوئی واقفیت نہ تھی، پھر بھی گلدستہ بنایا۔ ان کی توجہ چاہتا تھا...... پھولوں کی ترتیب جہ سے کی تھی، پھر گلدستہ بیگم صاحبہ کے کمرے میں لے گیا۔ وہ اندر موجود تھیں...... ڈریسنگ بل کے سامنے بیٹھی ہوئی چہرے کو کولڈ کریم مل رہی تھیں...... میں نے انہیں گلدستہ پیش کیا اور اسے ناقدانہ نگاہوں سے دیکھنے لگیں۔ پھر مسکرا کر بولیں۔

"سلیقہ ہے...... سامنے رکھے گلدان میں لگا دو...... مجھے ہر روز ملازم تازہ پھولوں کا گلدستہ بنا کر دیتا تھا، لیکن جب سے یہ ختم ہوا گلدان خالی رہ گئے اور سنو تم روزانہ ایک گلدستہ میرے لئے بنا دیا کرو"۔

"جی بیگم صاحبہ"۔ میں نے جواب دیا اور گلدستہ گلدان میں لگا دیا۔

"اور کوئی حکم بیگم صاحبہ؟"

"نہیں...... کل سے تم صاحب کو دفتر چھوڑ کر واپس آ جایا کرو...... بہت سے کام ایسے ہیں جنہیں کرنا چاہتی تھی لیکن مجبور تھی۔ کوئی تھا ہی نہیں...... نیلم بے چاری تنہا گھر کی صفائی کرتی ہے، کھانا پکاتی ہے۔ اس سے کام زیادہ لینا...... مطلب یہ کہ وہ بیمار پڑ جائے گی"۔

"جی بیگم صاحبہ"۔

"بس اب جاؤ"...... انہوں نے کہا اور میں کمرے سے باہر نکل آیا۔ دفعتاً مجھے احساس ہوا کہ باہر کوئی اور موجود ہے...... جو میرے واپس پلٹتے ہی چلا گیا...... احساس انوکھی چیز ہے۔

نیلم کے سوا اور کون ہو سکتا ہے...... تیزی سے سامنے والی راہداری کا رخ گیا...... راہداری ک
فاصلے پر ختم ہوتی تھی۔ نیلم کچن میں موجود تھی...... میں نے دروازہ کھولا اور نیلم کو دیکھا...... ا
کا تیز تیز سانس بتاتا تھا کہ وہ دوڑتی ہوئی یہاں آئی ہے۔ اس نے چونک کر میری طرف دیکھ
اور مسکرائے بغیر پوچھا۔

"ہاں، کوئی کام ہے؟"

"جی"...... میں نے سرد لہجے میں کہا۔

"کیا؟"

"ایک پیالی چائے مل سکتی ہے؟"

"بن رہی ہے...... میں تمہیں پہنچادوں گی، کہاں ہو اس وقت؟"

"گاڑی کی صفائی کرنی ہے، گندی ہو رہی ہے"۔

"چائے وہیں پہنچادوں؟"

"مہربانی ہوگی"...... میں نے جواب دیا اور کچن سے پلٹ پڑا مگر یہ سوچا کہ بیگم صاحبہ
کے قریب ہونے پر نیلم جاسوسی کیوں کر رہی تھی...... ایک بار پھر ذہنی کیفیت بیکار ہوگئی۔ بلاشبہ
ں بھوت گھر میں یہی تین کردار تھے جو اپنی اپنی جگہ الگ الگ نوعیت کے حامل تھے...... پچھلے
چھ وقت میں نیلم کے لئے میرے دل میں عجیب سے خیالات پیدا ہو گئے تھے، حالانکہ وہ
ھی لڑکی تھی لیکن اس کی شخصیت بھی کسی طور ان لوگوں سے کم پُراسرار نہ تھی۔ واپس باہر نکلا اور
ڑی کی دیکھ بھال کرنے لگا...... تھوڑی دیر کے بعد نیلم چائے کی پیالی لے کر باہر آگئی تھی۔

میں نے سرد نگاہوں سے نیلم کو دیکھا تو وہ مسکرادی۔

"تعجب ہے"۔ میں نے آہستہ سے کہا۔

"کس بات پر؟"

"تم کبھی کبھی مسکراتی بھی ہو"۔ وہ ایک دم سنجیدہ ہوگئی۔ چند لمحات کھڑی رہی پھر واپس
ی تو میں نے اسے آواز دی۔

"نیلم...... ہیلو"۔ وہ رک گئی۔

"برا مان گئیں تم میری بات کا؟"

"کیا جواب دوں؟"

"کیوں...... جواب اتنا مشکل تو نہیں ہے"۔

"تمہاری سمجھ میں نہیں آئے گا"۔

"ہاں بے وقوف جو ہوں"۔

"تم مجھ پر طنز کرتے ہو، حالانکہ تمہیں پوری طرح نہ جانتے ہوئے بھی میں نے خود کو تم پر
ہاں کر دیا تھا...... میری نگرانی ہوتی ہے۔ سکندر خدا کے لئے خطرہ نہ پیدا کرو، تم سے بات
روں گی، ملوں گی خود بھی اکتا چکی ہوں، بری طرح"۔

"میں تمہارا انتظار کروں گا نیلم"۔

"ہاں لیکن جلد بازی نہ کرنا چائے پی لو، پیالی واپس لے جاؤں"۔ میں نے چائے پی کر
یالی اسے واپس کر دی...... اور وہ خاموشی سے چلی گئی...... نہ جانے کب تک میں اس کے
ے میں سوچتا رہا۔ مگر وہ سمجھ میں نہیں آئی تھی...... وقت ہو گیا اور میں غوث صاحب کو لینے
ل پڑا"۔

"کہو کیا کیفیت ہے"۔ انہوں نے واپس آتے ہوئے پوچھا۔

"بیگم صاحبہ کچھ نرم نظر آئی ہیں"۔

"ہاں تمہاری مخالفت تو وہ اب نہیں کریں گی"۔

"اس کی کوئی وجہ ہے؟"

"اب اس نے نیلم کے علاوہ ایک آدمی کی ضرورت کو تسلیم کر لیا ہے۔ میں نے اسے سمجھایا
ہے"۔

"ان کی نرمی کی غالباً یہی وجہ ہو سکتی ہے"۔

"ہاں لیکن تم اس کیفیت سے فائدہ اٹھاؤ...... اس کی دلداری کرو اور اسے زیادہ سے
ہ متاثر کرنے کی کوشش کرو"۔

"جی......!" میں نے آہستہ سے کہا...... وہ شام خوشگوار تھی...... دونوں میاں بیوی ہشاش
ش نظر آرہے تھے...... شام کی چائے انہوں نے لان پر لگانے کا حکم دیا تھا۔ میں بھی سرگرم
۔ غوث صاحب نے کہا۔

"جاؤ نیلم کی مدد کرو۔ گھر کے دوسرے کام بھی دیکھ لیا کرو"۔ میں خاموشی سے کچن کی
رف چل پڑا...... کچن میں جھانک کر دیکھا، نیلم موجود نہیں تھی...... یہ ایک اضطراری کیفیت

ہی تھی کہ میں فوراً آڑ میں ہوگیا...... اس کا کوئی مقصد نہیں تھا...... نیلم نے مجھے نہیں دیکھا تھا...... وہ کچن میں داخل ہوگئی اور کچن کا دروازہ اندر سے بند کرلیا...... میرا تجسس بڑھ گیا اور میں نے ''کی ہول'' سے آنکھ لگا دی...... اندر کا منظر میرے سامنے تھا۔

چائے کی ٹرے سجی ہوئی رکھی تھی...... ٹرے میں چائے کے ساتھ جوس کا ایک گلاس بھی نظر آرہا تھا...... نیلم نے اپنے لباس سے کچھ نکالا اور میں نے اس چیز کو دیکھ لیا...... یہ ایک چھوٹی سی شیشی تھی۔ اس نے شیشی سے ہتھیلی پر کچھ انڈیلا اور پھر چٹکی بھر کے اسے اٹھالیا۔ اس کے بعد اس نے رخ بدل لیا۔ اس کی پشت ''ہول'' کے سامنے آگئی...... البتہ کسی برتن میں چمچ ہلانے کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی...... میرے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ نیلم نے ان مشروبات میں سے کسی میں کچھ ملایا تھا، پتہ نہیں کس میں...... چائے میں یا جوس میں، مگر کیا یہ کیسے پتہ چلے گا۔ لیکن کچھ ہوا تھا...... کچھ ضرور ہوا تھا۔

نیلم کے بارے میں میرا نظریہ ایک بار پھر تبدیل ہوگیا۔ جو کچھ بھی کرنا تھا، وہ کرچکی تھی...... میرا ذہن فوری طور پر ساتھ نہیں دے سکا تھا اور میں نے فیصلہ نہیں کیا کہ اس وقت مجھے کیا کرنا ہے لیکن نیلم کے سامنے مشکوک ہونا بھی مناسب نہیں تھا، چنانچہ میں دروازے سے تھوڑا پیچھے ہٹ گیا اور جب نیلم نے دروازہ کھولا تو اس طرح آگے بڑھا کہ جیسے ابھی آیا ہوں...... اس نے چونک کر مجھے دیکھا اور بولی۔

''خیریت، کیا بات ہے؟''

''کچھ نہیں...... غوث صاحب نے بھیجا تھا کہ تمہاری مدد کروں...... لاؤ یہ برتن مجھے دے دو''۔ وہ آہستہ سے ہنسی اور بولی۔

''برتن اتنے وزنی نہیں ہیں۔ میرے پیچھے چلے آؤ''۔ میں نے اس کی ہدایت پر عمل کیا۔ اس کے چہرے پر کوئی تاثر نہیں تھا...... اس کا مطلب تھا کہ وہ جو کررہی ہے، اس کی ماہر ہے۔ لیکن میری کیفیت اندر سے خراب تھی۔ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ بیگم غوث اور غوث صاحب کو کیسے خبردار کروں...... نیلم کے پیچھے چلتا ہوا وہاں پہنچ گیا، جہاں وہ دونوں موجود تھے۔ نیلم نے جوس کا گلاس غوث صاحب کے سامنے رکھا۔ چائے کے برتن بیگم صاحبہ کے سامنے اور پھر ہٹ کر کھڑی ہوگئی...... میں سخت پریشان تھا، لیکن جلد بازی بھی مناسب نہیں تھی...... کر بھی کیا سکتا تھا...... کیسے ہوشیار کرتا اور کیا کہتا۔ خاموشی ہی مناسب تھی۔ دونوں ہی اپنے مشاغل میں

ہوگئے۔ غوث صاحب بولے۔

''نیلم، میں نے سکندر سے کہہ دیا ہے اس سے کچن میں بھی مدد لیا کرو اور اس کے ساتھ گھر کے تمام کاموں میں بھی...... تم تنہا سارے کام نہیں کرسکتیں...... میرا خیال ہے سکندر تمہاری بہترین مدد کرے گا''۔

''جی غوث صاحب......'' نیلم نے ادب سے کہا۔

''جاؤ تم لوگ اپنا کام کرو۔ ابھی ہم لوگ یہاں دیر تک بیٹھیں گے''۔ میں نیلم کے ساتھ کچن میں آگیا...... اس نے کہا۔

''چائے پیو گے؟''

''نہیں''۔

''کیا بات ہے تمہارا چہرہ کیسا ہورہا ہے؟''

''نہیں کوئی بات نہیں...... ٹھیک ہوں کوئی کام ہے؟''

''فی الحال تو کوئی کام نہیں ہے۔ مجھے، ضرورت ہوئی تو میں تمہیں خود ہی بتادوں گی۔ کل سے پھر شروع کریں گے''۔

میں اپنے کمرے میں چلا آیا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ لیکن نیلم نے جو کچھ کیا تھا اس کا نتیجہ دیکھنا چاہتا تھا اور اس کا نتیجہ رات کو برآمد ہوگیا...... مجھے پتہ چل گیا کہ نیلم نے کس کے لئے کیا تھا؟ غوث صاحب کی حالت اچانک بگڑ گئی۔ اس کی اطلاع بھی نیلم نے مجھے دی تھی۔

''غوث صاحب پر سانس کا دورہ پڑا ہے...... بڑی بری حالت ہورہی ہے...... اور ذرا......''

میں تیزی سے نیلم کے ساتھ باہر نکل آیا...... بیگم صاحبہ غوث صاحب کے نزدیک بیٹھی تھیں اور غوث صاحب کی حالت بری تھی...... سانس سینے میں نہیں سما رہا تھا۔ حلق سے بھیانک آواز نکل رہی تھی اور وہ بری طرح ہاتھ پاؤں مار رہے تھے۔

''بیگم صاحبہ کیا خیال ہے، کسی ڈاکٹر کو بلاؤں یا انہیں کسی ڈاکٹر کے پاس لے جایا جائے؟'' میں نے پوچھا۔

''اوہ...... میں تو۔ میں تو پاگل ہوجاؤں گی۔ دماغ خراب ہوجائے گا میرا۔ انہیں تو کچھ نہیں ہوگا، لیکن میں...... پھر میں...... میرے اعصاب''۔ بیگم صاحبہ نے دونوں ہاتھوں سر پکڑ لیا۔

”آپ مجھے حکم دیں بیگم صاحبہ“۔

”کیا حکم دوں...... کوئی علاج نہیں کرتے...... سختی سے مخالفت کرتے ہیں، اگر ڈاکٹر کے پاس لے جایا گیا تو خودکشی کرلیں گے، بتاؤ میں کیا کروں...... ایسی ہی حالت ہوجاتی ہے بے شک ٹھیک ہوجاتے ہیں لیکن...... لیکن کسی وقت حالت بہت زیادہ بگڑ بھی سکتی ہے“۔

غوث صاحب کو دورہ ضرور پڑا تھا، لیکن ہوش و حواس میں تھے۔ دونوں ہاتھ اٹھاکر پھولے ہوئے سانس کے ساتھ کہا۔

”تم لوگ...... تم لوگ، فکر نہ کرو...... ٹھیک ہے...... ٹھیک...... عارضی ہے، سب کچھ عارضی ہے...... ٹھیک ہوجاؤں گا“۔

”دیکھا تم نے، جاؤ بلاوجہ اپنا وقت برباد کررہے ہو...... میں تو عرصے سے یہ سب کچھ دیکھ رہی ہوں...... کچھ نہیں کرسکتی...... میں اس سلسلے میں کچھ نہیں کرسکتی“۔ بیگم صاحبہ کی ہدایت پر میں وہاں سے نکل آیا...... نیلم البتہ وہیں رہ گئی تھی۔ نہ جانے کیوں؟

کمرے میں آکر میرے بدن پر سنسنی سی طاری ہونے لگی۔

”یہ تو اب کھلا کھلا معاملہ ہوگیا تھا کہ نیلم غوث صاحب کے خلاف کوئی کارروائی کررہی ہے۔ ہوسکتا ہے یہ کارروائی بیگم صاحبہ کے ایماء پر ہو، لیکن اب یہ میرے علم میں آگئی تھی اور اب مجھے یہ دیکھنا تھا کہ نیلم غوث صاحب کو یہ کیا چیز دے رہی ہے جس سے ان کی حالت ہوجاتی ہے...... اوہ...... اس کا مطلب ہے کہ غوث صاحب کا خدشہ بالکل درست ہے مگر...... مگر...... وہ احمق آدمی خود ہی پاگل تھا، کوئی بھلا کیا کرسکتا ہے، اس کے لئے...... علی رحمان صاحب کو یہ اطلاع دینا ضروری ہے۔ یقیناً ان کے کانوں میں یہ بات ڈالنا ضروری ہے“۔ نیلم اب پوری طرح میری نظروں میں مشکوک ہوگئی تھی۔

حالانکہ اس سے پہلے میرے دل کے کچھ گوشے اس کی کہانی سننے کے بعد نرم ہوگئے تھے اور اس کے بارے میں نہ جانے کس کس طرح سوچنے لگا تھا، لیکن اس وقت ان حالات نے نیلم کو میری نگاہوں میں بے حد مشکوک کردیا تھا...... مجھے افسوس بھی ہوا لیکن کیا کرسکتا تھا...... علی رحمان صاحب ہی اس سلسلے میں اگر کوئی حکم دیتے تو اس کی تعمیل ہوسکتی تھی...... نہ جانے رات کو کون سے حصے تک یہ تمام باتیں سوچتا رہا۔ صبح کو مقررہ وقت پر نیلم سے ملاقات ہوئی...... میں نے فوراً ہی غوث صاحب کی کیفیت پوچھی تو نیلم ہنس کر بولی۔

”دورہ ایک آدھ گھنٹے کا ہوتا ہے۔ اس کے بعد غوث صاحب نارمل ہوجاتے ہیں“۔

”آخر ایک دن ایسا ضرور آجائے گا۔ جب وہ نارمل نہیں ہوسکیں گے“۔

”کیا مطلب؟“

”مطلب...... میں ڈاکٹر تو نہیں ہوں کہ مطلب بتاؤں“۔

اس دن غوث صاحب دفتر نہیں گئے تھے۔ دن کو دس بجے کے قریب میری ان سے ملاقات ہوئی تو...... واقعی وہ حیرت انگیز طور پر بہتر حالت میں تھے...... کہنے لگے۔

”تمہیں یہاں کوئی کام ہے سکندر؟“

”نہیں غوث صاحب“۔

”آج میں دفتر نہیں جاؤں گا۔ تم چابیاں لے لو، بس سے دفتر چلے جاؤ اور پورے دفتر کی صفائی کر ڈالو...... بہت دن سے میں یہ سوچ رہا تھا کہ ایک دن پورے دفتر کی صفائی کر دی جائے...... یہ کام تمہارے لئے ممکن ہوگا یا نہیں؟“

”کیوں نہیں غوث صاحب!“ میں نے کہا۔

”جس وقت بھی کام سے فارغ ہوجاؤ، واپس آجانا۔ میرا آج کہیں بھی نکلنے کا پروگرام نہیں ہے......“ میں نے گردن ہلادی اور اس کے بعد دفتر چل پڑا۔

دفتر واقعی بری طرح غلیظ ہورہا تھا...... میں نے اس دوران تھوڑا بہت کام ضرور کیا تھا، لیکن باقاعدہ آفس تھا، اس کی صفائی کرتے ہوئے میں سوچنے لگا، کیسی عجیب بات ہے کہ یہ شاندار دفتر قائم کیا گیا تھا...... لیکن اب یہاں کچھ نہیں ہوتا...... معاملات واقعی اس قدر الجھے ہوئے تھے...... کہ مجھ جیسے آدمی کی عقل بھی چکرا کر رہ گئی تھی۔

بڑے ہال نما کمرے کی میں نے مکمل صفائی کرڈالی جس میں میزیں وغیرہ پڑی ہوئی تھیں...... تمام میزوں کی درازیں کھول کر دیکھیں، بہت سے سادہ کاغذات پڑے ہوئے تھے لیکن کوئی ایسی چیز نہیں تھی جو قابلِ توجہ ہوتی۔ پھر غوث صاحب کے کیبن میں داخل ہوگیا۔ دفتر بند کرنے سے پہلے دفعتاً میری نگاہ لوہے کی ایک الماری پر پڑی جو تھوڑی سی کھلی ہوئی تھی۔

نہ جانے کیوں میرے ذہن میں تجسس جاگا...... میں نے اس الماری کا ہینڈل پکڑ کر کھولا...... اس سے پہلے میں نے اس پر توجہ نہیں دی تھی...... نہ جانے غوث صاحب اسے کھلا

رکھتے تھے یا بند رہتی تھی۔ الماری میں البتہ بہت سے فائل اور کاغذات رکھے ہوئے تھے۔ یہ ریکارڈ سمیت کر اس الماری میں منتقل کر دیا گیا تھا۔ اس الماری کے مختلف حصے تھے۔ میری نگاہ خصوصاً اس حصے کی جانب مبذول ہوگئی جسے تجوری کہا جا سکتا تھا۔ اس کو کھول کر دیکھا تو ا میں براؤن رنگ کا لفافہ رکھا ہوا تھا، اس کے علاوہ اس تجوری میں اور کچھ نہیں تھا۔

میں نے لفافہ نکال لیا اور اس میں رکھے ہوئے کاغذات دیکھنے لگا...... یہ کام میری لائن کا تھا، اس لئے اسے سمجھنے میں ذرا بھی نہ الجھا...... کاغذات میں بینک اسٹیٹمنٹس بھی جو مختلف بنکوں کے تھے اور ان میں جو رقومات لکھی ہوئی تھیں، وہ ناقابل یقین تھا...... بڑی رقمیں جن کی مالیت بے پناہ ہوجاتی ہے...... میں نے حیرانی سے آنکھیں پھاڑیں، اسٹیٹمنٹس غوث صاحب ہی کے تھے۔

میں نے ان پر پڑی ہوئی تاریخیں دیکھیں اور مزید حیران ہوگیا، کیونکہ یہ تاریخیں زیادہ پرانی نہیں تھیں...... لیکن...... لیکن یہ سب کیا ہے؟ اگر غوث صاحب کے اثاثے ہیں تو پھر...... پھر وہ دیوالیہ کیسے ہوگئے؟ سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ میں نے تمام کاغذات کے بعد انہیں احتیاط سے ان کی جگہ رکھ دیا۔ کچھ اور کاغذات بھی تھے جو ٹائپ شدہ تھے۔ میں نے انہیں دیکھا اور مزید حیرت کا شکار ہوگیا۔ ان کاغذات میں کچھ شیئرز کی تفـ تھیں اور جو سب سے زیادہ حیران کن بات تھی، وہ یہ کہ بیگم صاحبہ کے اپنے اثاثو تفصیلات تھیں اور...... یہ تاریخیں بھی زیادہ پرانی نہیں تھیں اور یہ تفصیلات غالباً کچھ کاغذا نقول کی شکل میں تھیں، کیونکہ یہ فوٹو اسٹیٹ تھیں۔ میں احمقوں کی طرح یہ تمام چیزیں د اور میری الجھنوں میں بے پناہ اضافہ ہوتا گیا...... ان کاغذات کی رُو سے بیگم صاحبہ دولت مند تھیں اور غوث خان کی دولت کی تو کوئی حد ہی نہیں تھی لیکن پھر یہ سب کچھ تاریخیں انہیں زیادہ تفصیلات کی شکل میں پیش کر رہی تھیں، میں نے تجوری بند کرنے الماری بھی بند کر دی اور کسی خیال میں ڈوب گیا، لیکن ابھی زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ بڑے دروازے سے غوث خان صاحب اندر داخل ہوتے ہوئے نظر آئے اور تیر کی طرح جانب لپکے۔ اس سے پہلے میں نے ان کے انداز میں یہ پھرتی نہیں دیکھی تھی...... اند ہی وہ مجھے مشکوک نگاہوں سے دیکھنے لگے۔ میں نے حیرانی سے منہ کھول کر کہا۔

''آپ غوث صاحب...... آپ کو تو آفس نہیں آنا تھا؟''

''ہاں...... کچھ...... کچھ کام تھے، کچھ کاغذات جنہیں دیکھنا تھا، بحالت مجبوری آنا پڑا''۔ صاحب نے آواز پر قابو پاتے ہوئے کہا اور پھر میری طرف دیکھ کر بولے۔

''تم نے ابھی تک دفتر کی صفائی ختم نہیں کی؟''

''باہر کے کمرے کی صفائی ختم کی ہے...... ابھی تو اندر داخل ہوا ہوں''۔

''یہاں کوئی صفائی وغیرہ نہیں کی تم نے؟''

''ابھی کہاں غوث صاحب لیکن آپ تھوڑا سا وقت دے دیں۔ میں صفائی کر لوں گا''۔

''نہیں...... نہیں...... تم ذرا باہر رکو، میرے کمرے کی صفائی بعد میں کر لینا...... مجھے یاد رہا تھا کہ کمرے کا دروازہ کھلا چھوڑ گیا ہوں...... میرا خیال ہے پچھلے دن...... اوہ! اس کو کھول کر دیکھا تم نے......؟'' انہوں نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا اور میں دل میں خدا کا شکر ادا کرنے لگا کہ چند لمحات قبل ہی میں نے یہ الماری بند کی تھی۔

''نہیں غوث صاحب، ابھی تو میں اس دفتر میں داخل ہوا ہوں...... یہ الماری تو لاک ہے''

''نہیں شاید کھلی رہ گئی ہے۔ ذرا دیکھو تو''۔ انہوں نے کہا اور میں نے ہینڈل کے اوپر رکھ کر اسے کھولا۔

''جی ہاں کھلی ہوئی ہے''۔

''چلو ٹھیک ہے...... اتفاق سے اس کی چابی بھی میں اپنے ساتھ نہیں لایا...... خیر تم باہر رکو''۔ صاحب نے کہا اور میں باہر نکل آیا...... میرا ذہن سائیں سائیں کر رہا تھا...... غوث صاحب شکوک کیفیت بتاتی تھی کہ اچانک ہی انہیں الماری کھلی رہ جانے کا احساس ہوا اور وہ بیماری عالم میں ادھر دوڑ پڑے ہیں، لیکن اب صورتِ حال میرے لئے ناقابلِ برداشت ہوگئی یہ نیا انکشاف تھا...... دو باتیں جمع ہوگئی تھیں اور مجھے علی رحمان صاحب کو یہ تفصیلات بتانی تھیں...... میں باہر آکر بیٹھ گیا...... کچھ دیر کے بعد غوث صاحب بھی واپس آئے اور

''آؤ...... چل رہے ہو گھر؟''

''جو حکم آپ کا...... اگر آپ کی اجازت ہو تو یہ دفتر بھی صاف کر لوں؟''

''بھئی رہنے دو آج...... بس میں تو یونہی آگیا...... ایک کاغذ دیکھنا تھا۔ خصوصی طور پر

اسے دیکھ لیا...... چلو واپس چلتے ہیں"۔

"آپ گاڑی لائے ہیں؟"

"تو اور کون لاتا؟" غوث صاحب نے جواب دیا اور میں ان کے ساتھ باہر نکل آیا۔ کچھ
کے بعد ہم گھر پہنچ گئے تھے...... غوث صاحب کو غالباً یہ اطمینان ہوگیا تھا کہ میں ان کی الما
کھول کر نہیں دیکھ سکا...... اور یقیناً وہ اسی الماری کی وجہ سے بھاگ کر آئے تھے۔ گھر آنے
بعد مجھے باہر جانے کا موقع نہ ملا اور میں رحمان علی کے پاس نہ جاسکا۔ بیگم صاحبہ کے کمرے
صفائی کی ذمہ داری سونپی گئی تھی...... نیلم بھی میرے ساتھ تھی اور کچھ شگفتہ سی نظر آرہی تھی۔

"تم بڑے باہمت نظر آتے ہو؟"

"کیوں؟"

"ان حالات میں گزارا کررہے ہو، جبکہ تمہاری تنخواہ کا معاملہ بھی کھٹائی میں ہے"۔

"ایک آدھ مہینہ تو دیکھنا ہوگا...... غوث خان صاحب نے ملازم رکھا ہے مجھے۔ بات
بنی تو دیکھا جائے گا۔ وقت تو گزر ہی رہا ہے"۔

"اور کوئی نہیں ہے تمہارا......؟ کوئی تو ہوگا"۔

"کیا بات ہے...... آج مجھ سے باتیں کرتے ہوئے تمہیں ڈر نہیں لگ رہا؟"

"تمہیں میری خاموشی سے شکایت تھی ناں...... بس میں نے ہمت کرلی ہے۔ آخر انسا
ہوں۔ مالکوں کی باتیں دوسروں سے نہیں کہوں گی، لیکن زبان پر تو تالے نہیں لگائے جاسکتے

"تم نے اعلانِ بغاوت کردیا ہے"۔ میں نے کہا اور وہ ہنس کر خاموش ہوگئی۔
کرتے ہوئے مجھے بیگم صاحبہ کے کمرے میں سے ایک چھوٹی سی شیشی ملی جس میں ننھی
گولیاں بھری ہوئی تھیں...... میں چونک پڑا...... میں نے کسی خیال کے تحت شیشی اپنے
میں چھپالی اور کاموں میں مصروف ہوگیا...... دل میں خیال آیا تھا کہ ممکن ہے یہ وہی شیشی
جو کچن میں نیلم کے پاس تھی۔ نیلم کو اس کا علم نہیں ہوسکا تھا...... اس رات کھانا کھانے کے
بھی نیلم دیر تک میرے پاس بیٹھی رہی۔ اس نے مجھ سے میری پسند کے کھانوں کے بار
میں بھی پوچھا تھا...... دوسرے دن میں نے خصوصی طور پر علی رحمان سے ملاقات کا
نکالا...... غوث صاحب کو دفتر پہنچانے کے بعد میں نے کہا۔

"غوث صاحب، کوئی کام نہ ہو تو مجھے دو تین گھنٹے کے لئے چھٹی دے دیں"۔

"ہاں...... ہاں چلے جاؤ...... کوئی کام ہے؟"

"جی غوث صاحب کچھ لوگوں سے ملوں گا"۔

"ضرور جاؤ، سلطان احمد سے ملاقات ہوگی؟" انہوں نے کہا۔

"نہیں غوث صاحب وہاں سے تو جب حکم ملے گا تب ہی جاؤں گا"۔

"ہاں...... ہاں جاؤ کوئی بات نہیں"۔ غوث صاحب نے کہا اور میں نے کار کی چابی ان کے
ردی...... پہلے میں ایک کیمسٹ کے پاس پہنچا تھا...... شیشی اسے دکھا کر میں نے کہا۔

"ذرا دیکھئے بھائی یہ کون سی دوا ہے...... میں نے ڈاکٹر کے پرچے کے مطابق منگوائی
میری بیوی کہتی ہے یہ وہ دوا نہیں ہے جو پہلے استعمال کرتی تھی"۔ کیمسٹ نے شیشی
ے دیکھا، ایک گولی نکال کر چیک کی پھر بولا۔

"یہ تو بلڈ پریشر کے لئے ہے...... مگر بہت ہائی پوٹینسی کی ہے...... ڈاکٹر کے مشورے کے
ال نہ کرانا...... تمہاری بیوی کو بلڈ پریشر رہتا ہے"۔

ہاں"۔

تب پھر یہ دوا ٹھیک ہے"۔ کیمسٹ نے کہا اور میں وہاں سے واپس پلٹ آیا، مگر بات
یں نہیں آئی تھی...... اگر غوث صاحب کو یہ گولیاں دی جارہی تھیں تو ان کا بلڈ پریشر
ے تھا...... سانس کا مرض انہیں کیوں لاحق ہوگیا...... ہوسکتا ہے کہ اس کے کچھ سائیڈ
ں...... علی رحمان صاحب ہی اس کے بارے میں صحیح تحقیق کرسکتے ہیں۔

رحمان کو تلاش کرنا پڑا...... مجھے دیکھ کر ہمیشہ کی طرح خوش ہوئے تھے، بولے۔

اب عالی، سنایئے کوئی اہم بات؟"

ں کا فیصلہ تو آپ ہی کرسکتے ہیں، علی رحمان صاحب میں تفصیل عرض کئے دیتا
ں نے کہا اور اس دوران کی تمام رپورٹ علی رحمان صاحب کو دے دی، علی صاحب
گئے تھے۔ پھر ان کے چہرے پر عجیب سی چمک نمودار ہوگئی وہ بولے۔

تم کہتے ہو کہ تم کچھ نہیں کررہے، زبردست کارنامہ انجام دیا ہے، تم نے...... تمہاری
روشنی میں آگے بڑھنے کا موقع ملا ہے...... یہ سب کچھ واقعی سخت حیران کن ہے......
یک خود بخود فیل تو نہیں ہوتے ہوں گے اور فرض کرو اگر ایسا ہو بھی جاتا تو نیلم
یار کیوں کرتی...... اس لڑکی کا کردار واقعی بے حد پُراسرار اور خطرناک ہے، میرا

خیال ہے تم اس پر پوری نگاہ رکھو اور اس کے زیادہ سے زیادہ قریب ہونے کی کوشش کرو۔ ا
سے تمہیں بہت کچھ معلوم ہو سکتا ہے اور ہاں اس شیشی سے کچھ گولیاں نکال لینا۔ میں
تمہاری تمام رپورٹ پر تحقیقات کروں گا...... تم بس آنکھیں کھلی رکھو اور اپنی حفاظت بھی کر
علی رحمان کو یہ رپورٹ دے کر میں مطمئن ہو گیا، پھر اس دوران واپس آنے کے بعد میں
موقع پاتے ہی وہ شیشی اس کی جگہ رکھ دی تھی...... نیلم کے انداز میں جو تبدیلی تھی، اس
مجھے حیرت بھی ہو رہی تھی اور میں مشکوک بھی ہو گیا تھا۔

''میں نے آج تمہاری پسند کا کھانا بھی پکانا ہے''۔ اس نے کہا۔

''اس میں زہر تو نہیں ہے؟'' میں نے پوچھا اور نیلم تعجب سے دیکھنے لگی۔

''میں سمجھی نہیں''۔

''میں تم پر حیران ہوں نیلم''۔

''کیوں؟''

''تمہارے اندر اس ماحول سے بغاوت کا جذبہ اچانک پیدا ہوا اور تمہیں پوری آزا
بھی مل گئی۔ اس کے پسِ پردہ کوئی راز تو نہیں ہے؟''

''کیا راز ہو سکتا ہے؟'' اس نے کسی قدر افسردگی سے پوچھا۔

''معاف کرنا...... اس دن تم نے سچا خواب دیکھا تھا''۔ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''تو پھر؟''

''اور نہ صرف غوث صاحب بلکہ میں بھی بچ گیا۔ اس غلطی کا ازالہ تو نہیں کرنا چاہ
میں نے کہا اور نیلم میرے الفاظ سمجھنے کی کوشش کرنے لگی۔ میں نے یہ اندازہ ضرور لگا لیا تھا
نیلم میرے اس سوال پر حیران نہیں بلکہ افسردہ ہوئی تھی...... نیلم نے ٹھنڈی سانس لی اور گر
جھکا لی...... میں نے اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپکتے دیکھے تھے...... پھر اس نے میرے سا
رکھے کھانے سے نوالہ توڑ لیا اور اس کھانے کو خود کھانے لگی...... اس کی آنکھوں سے
آنسو بہہ رہے تھے۔

''ارے نیلم...... اوہ...... نیلم معاف کرنا...... اوہ نیلم سوری، بھئی مذاق کا برا مان گئیں
نیلم نے کوئی جواب نہیں دیا...... اس نے کھانا میرے سامنے رکھا اور مسلسل روتی رہی
اس سے معذرتیں کرتا رہا تھا، پھر اس نے بقیہ کھانا اٹھایا اور باہر نکل گئی۔ میں سنتے کے عا

کہتا رہا...... نیلم کے اس انداز میں مجھے عجیب سی کیفیت محسوس ہوئی تھی...... رات کافی
مجھے ہنسی آ رہی تھی...... اس سوال نے مجھے بھوکا مار دیا تھا، صبح کو جاگا تو سخت بھوک لگ
باورچی خانے میں جا پہنچا...... نیلم معمول کے مطابق مصروف تھی۔ میں نے ہنس کر
بری سزا پوری ہو گئی یا نہیں؟'' اس نے نگاہیں اٹھا کر مجھے دیکھا مگر منہ سے کچھ نہ کہا۔

''میں بھوکا ہوں''۔ میں نے کہا۔

''مجھے کیا کرنا چاہئے؟'' اس نے کہا۔

''مجھے کھانے کو دو''۔

''کچن میں ساری چیزیں زہر آلود نہیں ہوں گی، اپنی پسند سے جو چاہے لے لو''۔ اس

''نیلم میں نے مذاق کیا تھا...... آئندہ نہیں کروں گا''۔

''پراٹھا بنا دوں؟''

''بنا دو......'' میں نے کہا۔ وہ خاموشی سے کام میں مصروف ہو گئی...... پھر اس نے ناشتہ
سامنے رکھ دیا اور میں کھانے میں مصروف ہو گیا...... پیٹ بھر کر اٹھتے ہوئے میں نے کہا۔

''میں چلتا ہوں، نیلم...... مجھے افسوس ہے کہ میں نے تمہارا دل دکھایا بس اس سے زیادہ
ا ہوں گا''۔

وث صاحب بالکل ٹھیک تھے...... دفتر پہنچ کر بولے۔ ''آج تم میرے کمرے کی صفائی
مجھے باہر کے کچھ کام ہیں...... دوپہر تک واپس آ جاؤں گا''۔

''آپ گاڑی لے جائیں، غوث صاحب''۔

''ہاں! کوئی حرج نہیں''۔

و چلے گئے الماری بند تھی، مگر مجھے اب اس سے کوئی دلچسپی نہیں تھی...... کمرے کی صفائی
پھر غوث صاحب واپس گئے اور اس کے بعد کوٹھی پہنچ گئے...... بیگم صاحبہ کی طبیعت
ی...... غوث صاحب رات تک باہر نہیں نکلے...... دوسرے اور تیسرے دن بھی بیگم
طبیعت درست نہ ہوئی...... دوپہر کو غوث خان صاحب نے کہا۔

''ہم ڈاکٹر کے پاس جا رہے ہیں، واپسی میں ہمیں دیر بھی ہو سکتی ہے۔ تم لوگ فکر نہ
ا اس دن بھی غوث صاحب خود ہی گاڑی لے گئے تھے...... بیگم صاحبہ کچھ زیادہ بیمار تھیں،

کیونکہ پچھلی سیٹ پر لیٹ کر گئی تھیں...... گاڑی باہر نکل گئی تو میں گیٹ بند کر کے واپس پلٹا... نیلم اندر موجود تھی، اس دوران مجھ سے وہ کھنچی کھنچی رہی تھی...... میں نے خود ہی اس سے دو بار بات کرنے کی کوشش کی تھی اور اس نے ضرورت سے زیادہ جواب نہیں دیا تھا...... اس کے بعد بھی شام تک اس سے کوئی بات نہیں ہوئی...... شام کی چائے لے کر وہ میرے کمرے میں آئی تھی...... چائے رکھ کر وہ رکی، مجھے دیکھ کر بولی۔

"کچھ اور چاہئے؟"

"نہیں نیلم شکریہ"۔ میں نے نرمی سے کہا...... وہ پھر بھی واپس نہیں گئی اور کھڑی رہی میں نے چونک کر کہا۔

"بیٹھو نیلم، مجھ سے کوئی کام تو نہیں؟"

"ہاں ہے"۔

"اوہ...... بیٹھو پلیز"۔ میں نے خوش اخلاقی سے کہا اور وہ بیٹھ گئی۔

"مجھے تم سے شکایت ہے سکندر"...... اس نے کہا۔

"مجھے افسوس ہے...... اگر بات اس دن کی ہے تو میں تم سے معافی مانگ چکا ہوں، تم نے مجھے معاف نہیں کیا"۔

"تم نے سکندر، تم نے اس دن مجھے شدید دکھ پہنچایا تھا...... ایسی بات کہی تھی تم نے کہ...... کہ تمہارے بارے میں میرے تصورات کے سارے بت ٹوٹ گئے تھے۔ سکندر اپنی سطح سے بہت نیچے گر کر آج تم سے کچھ باتیں کر رہی ہوں...... اس کے بعد میں خود کو حقیر سمجھوں گی...... میرا دل فیصلہ کر چکا ہے۔ سکندر، میں بہت تھک گئی ہوں...... شاید اس زیادہ میری قوتِ برداشت میرا ساتھ نہ دے سکے...... میں خاموش رہی تو سکندر...... تو نہ جا کیا ہو جائے گا"۔

"اگر تم مجھے اس قابل سمجھتی ہو نیلم، تو جو دل چاہے کہو...... شاید میرے بارے میں فیصلہ بدل جائے"۔

"جو کچھ میں تمہیں بتاؤں گی سکندر...... ہر خدشے سے بے نیاز ہو کر بتاؤں گی، نتیجہ بھی نکلے پرواہ نہیں...... آخر کچھ نتیجہ تو نکلے، کچھ تو ہو"۔

"تو پھر سو چو مت...... بولتی رہو"۔

"مجھے ایک بات کا جواب دو...... اس گھر کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟"

"میں حیران ہوں...... یہ دونوں میاں بیوی انوکھے ہیں"۔

"اتنے عجیب کہ تم یقین نہیں کرو گے اور میں...... میں ان کے درمیان رہ کر ذہنی مریض بنی جا رہی ہوں...... تمہیں کوئی نقصان ہو یا نہ ہو، میرے دماغ کی شریانیں ضرور پھٹ جائیں گی۔ میں تمہیں اپنے بارے میں جو کچھ بتا چکی ہوں...... وہ بالکل صحیح ہے...... میں لاوارث ہوں۔ یہاں نوکری مجھے اس لئے پسند آئی تھی کہ میں دنیا کی بری نگاہوں سے محفوظ ہوں۔ میں یہاں بہت خوش تھی لیکن...... لیکن"۔

"نیلم...... میں ہر حالت میں تمہارا دوست ہوں...... کچھ بتے ہوئے ہر خوف کو ذہن سے نکال دو۔ مجھ سے تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچے گا"۔

"میں اس بھیانک ماحول سے، قاتل ماحول سے نکلنا چاہتی ہوں...... سکندر، نہ جانے کیوں مجھے لگتا ہے، جیسے مجھے کچھ ہو جائے گا اور کچھ نہیں تو...... میں قانون کے جال میں ضرور پھنس جاؤں گی...... یہ لوگ مجھے ضرور پھانسی چڑھوائیں گے...... سکندر میں تمہیں سب کچھ بتاؤں گی۔ میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا ہے...... سکندر یہاں کا ماحول بہت خوفناک ہے۔ بیگم صاحبہ کی خواہش غوث صاحب کی موت ہے...... وہ ایک نہ ایک دن انہیں ضرور ہلاک کر دیں گی۔ وہ مار دیں گی انہیں"۔

"کیسے؟" میں نے سنبھل کر پوچھا اور نیلم نے آنکھیں بند کر لیں۔

اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا...... کچھ دیر کے بعد اس نے آنکھیں بند کئے کئے کہا۔ "یہاں نوکری کرنے کے بعد تو بہت ٹھیک رہا، میں بھی خوش تھی...... پھر بیگم صاحبہ نے غوث صاحب کے اندر کیڑے نکالنے شروع کر دیئے...... ان کے سامنے وہ ہمیشہ ٹھیک رہتی ہیں...... لیکن ان کے پیچھے ان کے بارے میں طرح طرح کی باتیں کرتی رہتی ہیں...... میں تمہیں وہ باتیں نہیں بتا سکتی۔ پھر ایک دن انہوں نے مجھ سے کہا۔ نیلم ایک کام کرنا ہوگا...... میں نے اقرار کر لیا تو انہوں نے مجھے ایک شیشی دے کر کہا کہ ہفتے میں دن ایک ایک گولی بڑی احتیاط سے خاموشی سے غوث صاحب کے مشروبات میں شامل کر دیا کرو...... انہوں نے ایسی ایسی باتیں کر کے مجھے خوف زدہ کیا کہ میں بیان نہیں کر سکتی...... میں وحشت زدہ ہو گئی تھی، لیکن پھر بھی میں نے ہمت کی، میں نے غوث صاحب کو یہ بات بتا دی"۔

دی؟" میں اچھل پڑا۔

"ہاں، پہلی گولی دینے سے پہلے ہی یہ بات بتادی...... غوث صاحب نے ان میں سے دو گولیاں مجھ سے لے لیں اور کہا کہ بیگم صاحبہ کو یہی بتاؤں کہ میں یہ گولیاں انہیں استعمال کراچکی ہوں...... پھر سکندر انہوں نے مجھے بتایا کہ وہ زہریلی گولیاں ہیں۔ سلو پوائزن، جس سے آہستہ آہستہ ان کی صحت خراب ہوتی جائے گی اور نتیجہ موت نکلے گا۔ میں لرز گئی تھی۔ غوث صاحب بولے، میں اسے دیوانوں کی طرح چاہتا ہوں نیلم...... میری زندگی کا مقصد اس کی زندگی ہے...... میں جانتا ہوں اسے اب کیا احساس ہے، مجھ سے اس کی توقعات پوری نہیں ہوئیں...... میرا کاروبار تباہ ہوگیا ہے...... میرے پاس دولت نہیں رہی، لیکن میرا عزم ہے میں اسے اتنی دولت کما کر دوں گا کہ اس سے سنبھالی نہ جاسکے اور پھر وہ، وہ خود اپنے کئے پر شرمندہ ہوگی...... میری آرزو ہے کہ وہ خوش رہے تندرست رہے۔ مجھ سے جتنا بھی بن پڑا، میں اس کی خدمت کروں گا...... تم ایک کام کرو نیلم"۔

"کیا غوث صاحب؟" میں نے پوچھا۔

"دیکھو یہ اسی انداز کی، اسی رنگ کی گولیاں ہیں...... یہ شیشی اپنے پاس رکھ لو، اس کی ہدایت کے مطابق مجھے اس میں سے گولی دیتی رہو۔ یہ گولیاں بے ضرر ہیں اور وٹامن کی ہیں...... ان سے مجھے نقصان نہیں پہنچے گا...... وہ جب تمہیں نئی شیشی دے مجھے بتادو اور میں اسے ان گولیوں سے تبدیل کرتا رہوں گا...... میں بس اتنا جینا چاہتا ہوں کہ اس کے لئے دولت اکٹھی کرلوں گا...... البتہ تم اگر میری زندگی چاہتی ہو تو مجھے اس کے اقدامات سے آگاہ کرتی رہا کرو...... غوث صاحب فرشتہ صفت انسان ہیں، وہ بیوی کے ہاتھوں اس کی دانست میں زہر کھا رہے ہیں، مگر اسے امرت دے رہے ہیں...... اس کے کھانے پینے کا خیال رکھتے ہیں...... غوث صاحب کی حالت کبھی کبھی خراب ہوجاتی ہے"۔

"ان کی یہ کیفیت کتنے دنوں سے ہے؟" میں نے پوچھا۔

مجھے وہ صبح یاد آگئی تھی۔ جب میں نے کچن میں نیلم کی کارستانی دیکھی تھی...... نیلم جذباتی اور افسردہ ہونے کے باوجود مسکرادی...... پھر اس نے کہا۔

"غوث صاحب بے حد چالاک انسان ہیں...... وہ کسی زمانے میں فلمی اداکار رہ چکے ہیں...... ان گولیوں کے استعمال کے بعد انہوں نے زبردست ڈائٹنگ شروع کررکھی ہے......

صرف جوس پیتے ہیں اور وٹامن کھاتے ہیں اور کبھی کبھی ان پر مصنوعی دورے پڑتے ہیں...... انہوں نے ڈائٹنگ کرکے اپنی صحت کم کی ہے تاکہ بیگم صاحبہ یہ سمجھیں کہ ان کی گولیاں اثر کررہی ہیں، ورنہ وہ بالکل تندرست ہیں...... وہ صرف بیمار ہونے کی اداکاری کرتے ہیں اور مجھ سے اپنی پرفارمنس پوچھتے ہیں"۔

"اوہ میرے خدا...... بیگم صاحبہ کو شبہ نہیں ہوا؟"

"بالکل نہیں"۔

"کمال ہے، مگر غوث صاحب نے بیگم صاحبہ کو سمجھایا نہیں"۔

"پتہ نہیں، بیگم صاحبہ کا کہنا ہے کہ غوث صاحب بے حد شاکر انسان ہیں، ان کا کاروبار تباہ نہیں ہوا بلکہ انہوں نے اسے فروخت کرکے اپنی دولت چھپادی ہے۔ بس اپنی گڈول محفوظ کی ہے تاکہ بیگم صاحبہ کی دولت ہڑپ کرکے اپنے کاروبار کو ازسرِنو شروع کرسکیں"۔

"بیگم صاحبہ کے پاس دولت ہے؟"

"یہ تو اللہ جانے لیکن، کئی بار ان کے فون آتے ہیں جن پر ہونے والی گفتگو سے اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے بھی اپنی دولت انڈر گراؤنڈ کردی ہے"۔

"گاڑی کا کیا قصہ تھا؟"

"بیگم صاحبہ کئی بار تشویش کا اظہار کرچکی تھیں کہ کہیں ڈرائیونگ کرتے ہوئے غوث صاحب کو دورہ نہ پڑ جائے...... ایسی حالت میں قیمتی گاڑی بھی تباہ ہوسکتی ہے...... وہ کوئی پرانی گاڑی خریدنا چاہتی تھی...... تمہاری مخالفت بھی انہوں نے اس لئے کی تھی کہ یہ چانس تمہاری وجہ سے ہاتھ سے نہ نکل جائے...... پھر انہوں نے کہا تم بھی جہنم میں جاؤ، جاتے ہی نہیں تو وہ کیا کرسکتی ہیں"۔

"گڈ...... پھر کیا ہوا"۔ میں نے پوچھا۔

"انہوں نے ڈانسن میں کچھ کیا تھا...... میں نے اتفاق سے دیکھ لیا تھا...... میں یہ تو نہیں جانتی کہ انہوں نے کیا کیا تھا، لیکن وہ گاڑی کے نیچے سے نکلی تھیں...... ان کے ہاتھوں میں اوزار تھے اور ہاتھ کالے ہورہے تھے...... اس کے علاوہ چھپ چھپ کر واپس آئی تھیں...... اس مجھے شک ہوگیا اور میں نے تمہیں بتایا تھا"۔

"تم نے بے شک اس دن ہم دونوں کی جان بچالی تھی، مگر تمہارے خیال میں غوث

صاحب بے وقوف نہیں؟''

''تم دیکھتے ہو، اس کے باوجود انہیں دیوانوں کی طرح چاہتے ہیں...... عمدہ عمدہ لباس خریدتے ہیں ان کے لئے، اعلیٰ سے اعلیٰ کھلاتے ہیں...... ان کی صحت کے لئے فکرمند رہتے ہیں، حالانکہ بیگم صاحبہ کو اپنے موٹاپے کا شدید احساس ہے اور یہ سچ ہے کہ بہت مختصر عرصے میں ان کا وزن بے پناہ بڑھا ہے''۔

''وزن کی وجہ سے انہیں ہائی بلڈ پریشر ہونا چاہئے''۔ کیا وہ بلڈ پریشر کی مریض ہیں؟''

''بالکل ہیں...... انہیں بلڈ پریشر رہتا ہے مگر دوائیوں سے وہ بہت گھبراتی ہیں...... سوائے وزن کم کرنے کی گولیوں کے اور کچھ نہیں کھاتیں''۔

''اوہ...... کیا وہ وزن کم کرنے کی گولیاں استعمال کرتی ہیں؟''

''اپنی دانست میں''۔

''کیا مطلب؟''

''ڈاکٹر کے مشورے سے انہوں نے وزن کم کرنے کی گولیاں منگوائی ہیں، مگر غوث صاحب انہیں صرف طاقت کی گولیاں استعمال کراتے ہیں''۔ میں سوچ میں ڈوب گیا...... کیمسٹ نے مجھے بتایا تھا کہ وہ گولیاں جو میں بیگم صاحبہ کے کمرے سے لے گیا تھا، لو بلڈ پریشر کے مریضوں کیلئے ہیں، جبکہ بیگم صاحبہ کو ہائی بلڈ پریشر تھا...... میرے خیال میں تو وہ گولیاں بیگم صاحبہ کیلئے خطرناک ہوسکتی تھیں...... نیلم نے میرے خیالات کا سلسلہ منقطع کردیا...... وہ بولی۔

''بیگم صاحبہ نے ایک ایک کرکے تمام ملازم نکال دیئے...... ان کا کہنا تھا کہ ان حالات میں وہ ان کے اخراجات کی متحمل نہیں ہوسکتیں...... تمہارے بارے میں وہ تشویش کا شکار ہوگئی تھیں''۔

''کیا کہتی تھیں؟''

''یہی کہ یہ شخص ان کے راستے میں دشواریاں پیدا کرے گا...... مجھے سختی سے ممانعت کی تھی کہ میں تم سے ربط وضبط نہ رکھوں''۔

''پھر تم نے بغاوت کی؟'' میں مسکرا کر بولا۔

''نہیں میری اتنی جرأت کہاں تھی''۔

''کیا مطلب؟''

''مجھے حکم ملا تھا''۔

''کیا حکم ملا تھا؟''

''یہی کہ اب تم سے دوستی کروں...... اندر سے تمہارا جائزہ لوں۔ یہ پتہ چلاؤں کہ تم ہمارے کتے ہو یا نہیں''۔

''اوہ...... وہ مجھ سے کام لینا چاہتی تھیں؟''

''شاید...... انہوں نے مجھے اس بارے میں کچھ بتایا نہیں لیکن ان کا خیال تھا کہ تم ان تے میں مشکل بن سکتے ہو، اگر کچھ رقم دے کر تمہیں بھی اپنے ساتھ شامل کرلیا جائے تو ان ہوجائے گا، مگر وہ اس میں جلد بازی نہیں کرنا چاہتی تھیں...... انہوں نے مجھے حکم دیا لے میں تم سے قربت حاصل کروں...... تم سے تمہارے ماضی کے بارے میں پوچھوں اور ازہ لگانے کی کوشش کروں کہ تم لالچ میں آسکتے ہو یا نہیں اور...... اور''۔

''بے دھڑک کہو نیلم...... میں تمہیں راز داری کا یقین دلاتا ہوں اور تمہارے اس اعتماد رے دل میں تمہارا احترام بھی پیدا ہوگیا ہے اور کیا کہا تھا نیلم؟''

''انہوں نے کہا تھا کہ میں تمہارے دل میں اپنی محبت پیدا کروں...... یہ بھی کہا تھا، نے کہا کہ اگر تم...... اگر تم بیگم صاحبہ کے مددگار بن جاؤ تو اپنے مقصد کی تکمیل کے بعد ونوں کو یکجان کردیں گی''۔

''ایں؟'' میں نے منہ پھاڑ کر کہا...... نیلم نے نگاہیں جھکالی تھیں، اس کے چہرے پر نہ کیسی کیسی ملی جلی کیفیات نظر آرہی تھیں۔

''یہ...... یہ ان کا کہنا تھا۔ سکندر یہ بڑے لوگ غریبوں کو اپنا کھلونا سمجھتے ہیں...... وہ تے ہیں کہ ان کا سوچا پتھر کی لکیر ہوتا ہے...... وہ جو کچھ کرسکتے ہیں وہ کسی اور کے لئے ممکن ہوسکتا''۔

''تم نے ان کی ہدایت پر عمل نہیں کیا۔ نیلم؟'' میں نے شرارت سے مسکراتے ہوئے کہا۔

''کیا؟'' اس نے پوچھا۔

''مجھ سے تو آج تک تم نے ایسا رویہ ہی اختیار نہیں کیا؟''

''یہ سب کچھ کسی کے کہنے سے ہوسکتا ہے سکندر...... دل تو ہر انسان کا یکساں ہوتا ہے...... اب سکندر، یہ سب کچھ تمہیں بتا کر تو میں اب کچھ اور ہی کرنا چاہتی ہوں۔ میں اب ان کی ار نہیں بن سکتی...... میں نے فیصلہ کرلیا ہے...... سکندر، خدا کی قسم میں نے فیصلہ کرلیا ہے۔

"کیا فیصلہ کیا ہے نیلم؟"

"سارے حالات تمہیں بتا چکی ہوں...... تم بھی ان واقعات سے لاعلم نہیں رہے دل بھی ہلکا ہوگیا...... تم نے مجھ سے ایسی بات کی حالانکہ میں ان سے زیادہ تمہارے لئے مند تھی...... میں سوچتی تھی کہ کہیں بیگم صاحبہ اپنی سازش کی تکمیل کرتے ہوئے تمہیں کوئی نقصا نہ پہنچا دیں...... سب کے اپنے رشتے ہوتے ہیں۔ کون کس کے لئے کیا ہوتا ہے، کوئی دوسر نہیں جان سکتا...... بیگم صاحبہ نہ جانے خود کو کیا سمجھتی ہیں، میں بھی تو انسان ہوں"۔

"بیشک ہمارے درمیان ان تمام باتوں سے الگ رشتہ ہے...... ہے ناں؟" میں مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"ایں؟" وہ چونک پڑی پھر اس کا چہرہ شرم سے سرخ ہوگیا...... پھر اس کی آنکھوں آنسو ٹپکنے لگے...... میں نے آگے بڑھ کر اس کے شانے پر ہاتھ رکھا اور اس کے دوپٹے اس کے آنسو خشک کرنے لگا۔ پھر میں نے کہا۔

"اس سے قبل یہ رشتہ تھا یا نہیں نیلم...... آج یہ رشتہ قائم ہوگیا ہے...... ہمیشہ ہمیشہ لئے اور نیلم تم نے جو فیصلہ کرلیا ہے، وہ میں نہیں جانتا لیکن میں نے جو فیصلہ کیا ہے، وہ یہ کہ اب میں باقی زندگی تمہارے ساتھ گزاروں گا...... تم مزید کچھ نہ کہنا، نیلم میں تم سے مح کرتا ہوں...... تم میری آرزو ہو"۔

"ہمیں یہاں سے نکلنا ہوگا، سکندر...... یہاں ضرور کچھ ہوجائے گا...... ہم پھنس جا گے۔ میں تم سے بھی یہ ہی کہنا چاہتی ہوں...... یہاں سے نکل چلو سکندر...... دنیا بہت ہے۔ ہم کوئی ٹھکانہ ضرور تلاش کرلیں گے"۔

"کیوں نہیں نیلم...... لیکن تمہارا ارادہ کیا ہے؟"

"پہلے میں تمہیں یہ سب کچھ بتا کر یہاں سے چلی جانا چاہتی تھی۔ تم سے بھی ک چاہتی تھی کہ یہ نوکری چھوڑ دو...... یہ خطرناک ہے، مگر اب ہم دونوں یہاں سے چلیں گے"۔

"خاموشی سے؟"

"ہاں"۔

"آہ...... یہ اس سے زیادہ خطرناک ہوگا...... وہ ہم پر کوئی الزام لگا سکتے ہیں...... چور کا، ڈاکہ زنی کا، بیگم صاحبہ اپنی سازش پر فوری عمل کرکے کہہ سکتی ہیں کہ ان کے ملازم یہ کر

ائی گئے...... تم نے یہ نہیں سوچا؟" میرے ان الفاظ پر نیلم کا رنگ پیلا پڑ گیا، اس نے کہا۔

"ہاں میں نے یہ نہیں سوچا تھا، اب کیا کریں سکندر؟"

"مجھے سوچنے کا موقع دو"۔ میں نے کہا اور نیلم خاموش ہوگئی۔ اس کے چہرے کے رنگ لتے رہے اور پھر وہ پُرسکون ہوگئی، مگر میرے دماغ میں ہانڈی پک رہی تھی...... اب مجھے کیا نا چاہئے...... دل و دماغ تہہ و بالا ہوگئے تھے...... بڑی پُراسرار کہانی تھی۔ علی رحمان ب کے خیال کے عین مطابق...... رات ہوگئی کوئی نو بجے غوث صاحب کا فون موصول ا..آواز گھبرائی ہوئی تھی۔

"سکندر! فوراً اسپتال پہنچ جاؤ...... بیگم صاحبہ کو ہارٹ اٹیک ہوا ہے...... وہ انتہائی ہداشت کے شعبے میں ہیں...... جلدی آجاؤ"۔ نیلم کو صورتِ حال بتا کر میں چل پڑا...... غوث ب کے بتائے ہوئے اسپتال پہنچا تو غوث صاحب پاگل ہو رہے تھے۔

اچانک دورہ پڑا تھا...... حالت خراب ہوگئی، ڈاکٹر کچھ بتا ہی نہیں رہے...... نہ جانے کیا ا؟

گر پھر ڈاکٹروں نے بتایا کہ ہارٹ اٹیک کے ساتھ ساتھ بیگم صاحبہ کو برین ہیمبرج بھی یا تھا، وہ زندہ نہیں بچ سکی تھیں...... غوث صاحب کی بری حالت ہوگئی، لیکن میری ذمہ داری ہ اور ہی تھی، میں نے فوراً ٹیکسی پکڑی اور علی رحمان کے پاس پہنچ گیا۔

میں نے انہیں پوری اطلاع دی تو انہوں نے پُرخیال انداز میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

"ہاں...... اس کا مطلب ہے کہ غوث صاحب کامیاب ہوگئے...... دونوں اپنی اپنی بساط ئے ہوئے تھے اور اپنے اپنے مہرے چل رہے تھے۔ غوث صاحب کامیاب ہوگئے اور اس ہ یہ تھی کہ انہیں ایک بیوی کا زیادہ تجربہ تھا...... میرا مطلب ہے کہ بیوی صاحبہ نے صرف دو ئے تھے، جبکہ وہ خود غوث صاحب کا چوتھا شکار تھی۔ کامیابی غوث صاحب ہی کو ہونی تھی"۔

اس شخص کی مشکل یہ تھی کہ ان واقعات سے نمٹنے کے بعد یہ اس احساس کا شکار ہوگیا تھا بیگم صاحبہ کی موت اس کی وجہ سے ہوئی ہے۔ وہ ایک طرح سے نفسیاتی الجھن میں پڑ گیا تھا اسے اس سلسلے میں مدد چاہتا تھا۔

"تم تین دن کے بعد ہمارے پاس آؤ"۔ ناصر فرازی نے کہا۔

"کیوں تین دن میں تم کیا کرو گے؟"

"تمہاری مشکل کا حل تلاش کریں گے"۔

"تین دن میں......؟"

"ہاں! اتنا وقت تو درکار ہوگا"۔

"چاہے اس دوران مجھ پر کچھ بھی بیت جائے؟"

"تم نے جو واقعات سنائے ہیں ان میں کوئی ایسی بات تو نہیں جس سے تمہارے لئے کوئی خطرہ ہو"۔ میں نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

"اوہ...... یہی تو تم نہیں سمجھ رہے ہو......ٹھیک ہے میں تین دن کے بعد تمہارے پاس آؤں گا"۔ وہ چلا گیا اور میں اور ناصر فرازی دماغ سوزی کرنے لگے کہ بھلا ہم اس کے لئے کیا کر سکتے ہیں...... کوئی فیصلہ مشکل تھا، لیکن ہوا یوں کہ تین دن، چار دن، ایک ہفتہ، دو ہفتے اور پھر کافی وقت گزر گیا، لیکن وہ واپس نہیں آیا...... ناصر فرازی نے کہا۔

"آصف خان، کچھ بوریت نہیں ہو رہی؟"

"وہ تو ہماری زندگی کا حصہ ہے"۔ میں نے مسکرا کر کہا۔

"کوئی تبدیلی ہی نہیں ہے زندگی میں"۔

"واقعی یہ تو ہے"۔

"کچھ سوچو......!"

"مثلاً؟"

"یہی تو مشکل ہے۔ کچھ کیا ہی نہیں جا سکتا"۔

"میرا خیال ہے کہ ہم حاتم طائی کی طرح دنیا گردی کو نکلیں اور لوگوں کے سوالات کا حل تلاش کریں!" میں نے کہا اور ناصر فرازی ہنسنے لگا پھر بولا۔

"سب قصے کہانیاں ہیں...... کون کسی کی مشکل میں پھنستا ہے"۔

"ہمیں جو کردار ملتے ہیں، ان کی شعاعیں ہماری زندگی میں کچھ رنگ بکھیر دیتی ہیں"۔

"ہاں...... لیکن ہماری زندگی کے رنگ پھیکے ہی ہیں"۔

"تو پھر آؤ...... ان رنگوں کو گہرا کریں"۔

"کیسے؟"

"وطن چھوڑیں، آوارہ گردی کریں"۔

"واقعی یہی ہونا چاہئے"۔ بات دونوں کے دل کو لگ گئی...... کچھ دن تیاریوں میں صرف ... پھر ہم دونوں نے اپنے راستے بدل لئے...... ناصر فرازی کہاں گیا، میں نہیں جانتا لیکن ...احت کی ایک لائن بنائی اور چل پڑا...... زندگی بہت حسین لگ رہی تھی...... ملک ...نکل کر میں نے اپنے رنگ ڈھنگ بھی بدل لئے تھے۔ اکثر آنکھیں ننگی رکھتا تھا، ...ے ان دو گڑھوں کا اب میں عادی ہو گیا تھا، چنانچہ انہیں چھپانا ضروری نہیں سمجھتا تھا۔ ...لے میں بہت سے دلچسپ واقعات پیش آ چکے تھے۔ اس دن بھی سڑک کے کنارے کھڑا ...ک عبور کرنا چاہتا تھا کہ ایک خوشرو جوان میرے پاس آ گیا۔

"آیئے پلیز......" اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر کہا اور میں نے اسے حیرت سے دیکھا......

"...کہا نہیں"۔

"آپ سڑک پار کرنا چاہتے ہیں نا......؟"

"اوہ...... ہاں، شکریہ......" میں نے صورتِ حال کو سمجھ کر کہا اور اس کے ساتھ سڑک عبور ...کے نقوش عجیب تھے۔ مجھے وہ اپنا ہم وطن بھی لگ رہا تھا...... کسی کو دوست بنالینا ...لئے کوئی مشکل بات نہیں تھی۔ اس کا نام احمد اسدی تھا۔ میں نے اسے اپنی آنکھوں ...ے میں کچھ نہیں بتایا تھا، لیکن اس نے مجھے اپنے بارے میں سب کچھ بتا دیا، بلاشبہ وہ ...ہبت کا مالک تھا۔

ایک بے چین زندگی، ایک مضطرب روح، بس اس کے سوا کچھ نہیں۔

"نہ جانے سکون کہاں ہوتا ہے؟ میرے استادِ محترم کا کہنا ہے کہ اس کا ایک واضح پس ...ہے...... میں اس آغوش سے محروم ہوں، جس سے سکون کے چشمے پھوٹتے ہیں"۔

"کون؟"

"ماں...... ! جس کے سینے سے ابلنے والے دودھ کی دھاروں میں شیر کوثر کی آمیزش ...ہے۔ اس کے لمس میں مکمل طور پر فرشتوں کی پاکیزگی ہوتی ہے اور روح کو سکون حاصل ...ہے۔ ماں سے محروم بچے اس نعمت سے بہرہ ور نہیں ہوتے اور یہ ان کی ازلی بدقسمتی ...ہے۔ بنیادی خسارہ جو موت کے وقت تک پورا نہیں ہوتا۔ میری ماں بچپن میں ہی مر گئی ...کس نے پرورش کی، خدا بہتر جانتا ہے۔ ہوش سنبھالا تو یورپ کے ایک ملک میں تھا۔ ...ہ آفریدی کے گھرانے میں جو ایشیا کے ایک غیر مسلم ملک کے رہنے والے تھے، کبھی

یوگنڈا میں آباد تھے، بعد میں ترک سکونت کر کے نہ جانے کیوں ازمیر میں آ کر آباد ہو گئے ت
میں نے طویل عرصہ ان کے اہل خاندان کے ہمراہ گزارا...... بعد میں جہانزیب آفری
انتقال ہو گیا اور ان کے اہلِ خاندان منتشر ہو گئے۔ لیکن اس وقت میری عمر 21 سال ہو چکی
اور میں اپنے پاؤں پر کھڑا ہو گیا تھا۔ والد صاحب نے ازمیر میں بھی میرے لئے
بندوبست کر دیا تھا۔ وہ خود اپنے آبائی وطن میں قیام پذیر تھے۔ انہوں نے کبھی مجھے اپنے
وطن لے جانے کی بات نہیں کی۔ میرے دل میں بھی کبھی یہ خیال نہیں آیا۔ وہاں کون تھا
معلوم ہی نہیں تھا۔ کس کے لئے وہاں جاتا۔ نعمان اسدی صاحب سال میں ایک بار آ
تھے۔ میرے ساتھ قیام کرتے تھے مجھے بس اتنا معلوم تھا کہ وہاں ان کا کاروبار ہے
کاروبار کے بارے میں نہ انہوں نے کبھی بتایا، نہ میں نے پوچھا...... بہت واجبی سا رشتہ تھا
باپ بیٹوں کے درمیان۔

البتہ میرے اپنے مشاغل تھے، تعلیمی مشاغل سے فارغ ہو کر میں تین کام کیا کرتا
ورزش جس نے میرے بدن کو فولاد بنا دیا تھا، یا پھر قدیم زبانوں پر تحقیق، قدیم تاریخ
دلچسپی نے مجھے پُراسرار شخصیت حاکف خدام تک پہنچایا تھا۔ وہ ازمیر میں ایک سرکاری محکمے
ملازمت کرتے تھے۔ انہوں نے مجھے اپنا تمام فاضل وقت دے دیا تھا اور خود بھی مجھ میں
دلچسپی لیتے تھے، جتنی میں ان میں۔

میرا تیسرا مشغلہ مصوری تھا اور اس کی وجہ شاید اس مغربی ملک کا ماحول تھا۔ میں یہ
نہیں جانتا تھا کہ ایک باپ نے اپنے بیٹے کے قیام کے لئے اس ملک کا انتخاب کیوں کیا
لیکن اس ملک کی فضاء مجھ پر اثر انداز ہوئی تھی۔ یہاں کے رہنے والے قدرتی طور پر فنکا
صلاحیتوں کے مالک ہوتے ہیں۔ فرانز پال، پیٹر ہوگ، ریجرانت، روسوڈی، جان سٹن
فان گوگ، فنِ مصوری کے ستون مانے جاتے ہیں اور ازمیر کا سنیک میوزیم کسی بھی طرح
تاز، ٹودو، نیشنل آرٹ، اوپچی اور پراڈو سے کم نہیں ہے۔ مجھے ونسنٹ فان گوگ نے رنگوں
سحر میں جکڑا تھا، جس نے سورج مکھی کے زرد چمکیلے پھولوں کو سورج کے آتشیں گولے
آہنگ کر کے ایک شاہکار تخلیق کیا تھا، اسی سے متاثر ہو کر میں نے مصوری شروع کی تھی
عرصہ کے بعد حاکف خدام نے میری کچھ تصویروں کو دیکھ کر میری طرف غور سے دیکھا تھا
"کس سے سیکھا ہے؟"

"فان گوگ سے"۔ میں نے جواب دیا اور حاکف خدام سوچ میں گم ہو گئے، پھر آہستہ

1853ء میں پیدا ہوا، کوئلے کی کانوں میں مزدوری کی، کچھ عرصہ ایک چرچ میں پادری
pressionism کا موجد، تیز رنگوں کا سیا بڑا انسان تھا، لیکن تم اسے فالو نہ کرو"۔
ں نے کوئی جواب نہیں دیا اور بات ٹل گئی۔

نعمان اسدی پچھلی بار مجھ سے ملنے آئے تو تھکے تھکے سے تھے۔ پہلے جیسے نظر نہیں آتے
ں اسے کیا کہا جاتا کہ ہم باپ بیٹوں کے درمیان بڑا تکلف تھا۔ وہ صرف بوقتِ
باتیں کرتے تھے۔ میں نے زندگی کا بیشتر حصہ اس آرزو میں گزارا تھا کہ کبھی ان کے
باپ کی شفقت جاگے۔ وہ محسوس کریں کہ مجھے ان ضرورتوں کے علاوہ بھی کچھ درکار
وہ بھی خاموش رہے، میں بھی خاموش رہا۔

اکف خدام نے کہا۔ "کسی سے عشق کرتے ہو؟"
نہیں......"
کیوں؟"
پتا نہیں"۔
زندگی پتھر نہیں ہوتی اکتا گئے تو تخریب کار بن جاؤ گے"۔
نہیں بنوں گا"۔ میں نے کہا۔
طرت سے جنگ مشکل ہے"۔ وہ بولے اور میں نے خاموشی اختیار کر لی۔ وہ میرے
...... میں نے ان سے دنیا کی قدیم زبانیں سیکھی تھیں اور اتنی سیکھی تھیں کہ وہ حیران رہ

ہیں کچھ بتا کر یہ احساس ہوتا ہے کہ جیسے اپنا کوئی قیمتی سرمایہ محفوظ لاکر میں رکھ دیا اور
پر انٹرسٹ بھی مل رہا ہو، یعنی اس میں اضافہ ہو رہا ہو"۔
نے کہا تھا، فان گوگ کو پینٹ نہ کرو...... میں نے خاموشی اختیار کر لی تھی، کیونکہ
تحقیق نہیں تھا، وہ بولے۔
رت سے جنگ مشکل ہے"۔ میں خاموش ہو گیا، کیونکہ استاد کا اس سے زیادہ احترام
تھا، میں کسی عمل کو اپنا موقف نہیں بناتا تھا لیکن اگر بنا لیتا تھا تو پھر وہ میرا وجود ہوتا تھا۔

اناش ایک خوب صورت لڑکی تھی، جو چیز دیکھنے میں اچھی لگے وہی خوب صورت ہو
ہے...... اناش خوب صورت تھی۔ حاکف خدام کی شاگرد تھی۔ انہی کے گھر اس سے ملاقات
ہوئی تھی۔

"یہ برف میں دبا ہوا انسان ہے۔ کیا برف کی اس سل کو توڑا جا سکتا ہے؟" خدام نے کہا

"آسانی سے"۔ اناش نے مسکرا کر کہا۔ میں اس کے رخساروں میں پڑنے والے گڑھو
کا ذکر نہیں کرنا چاہتا جو مسکراتے ہوئے بہت اچھے لگتے تھے، لیکن اس کی آنکھوں کی چمک میں
مجھے چیلنج چھپا ہوا محسوس ہوا۔ میں نے ان دونوں کی باتوں میں داخل نہیں دیا تھا اور یہ خاموشی
میرے موقف کا اظہار ہوتی تھی۔

"اناش بھی قدیم علوم، تاریخ کے پوشیدہ پہلو اور زمانہ قدیم میں طریقہ اظہار اور علوم
پر ریسرچ اسکالر ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ تم دونوں ایک دوسرے سے رابطے رکھ کر اپنے علم میں
اضافہ کرو احمد اسدی، تمہیں اعتراض تو نہیں ہے؟"

"نہیں......" میں نے جواب دیا۔

اناش نے بڑی خوب صورتی سے اپنی جدوجہد کا آغاز کیا۔ اس نے مجھے ہوٹل ایمبا
میں پہلا ڈنر دیا۔ یہ قدیم طرز تعمیر کا ایک ٹاور شاہکار تھا۔ ایک برٹش سوداگر کا گھر جسے بعد
ہوٹل بنا دیا گیا تھا۔ پھر ہم نہ جانے کہاں کہاں کی سیر کرتے پھرے۔ اناش سے میرا ربط
بہتر تھا، اس نے مجھ سے کہا۔

"تمہارا مستقبل کا کیا منصوبہ ہے؟"

"میرا حال ہی میرا مستقبل ہے"۔

"میں نہیں سمجھی"۔

"مگر میں نے جواب دے دیا ہے"۔

"مسٹر حاکف خدام کا کہنا ہے کہ تم عورتوں سے کچھ کھنچے رہتے ہو"۔

"ہاں"۔

"کیوں؟"

"اس لئے کہ مجھے عورت سے شکایت ہے"۔

"کیا؟"

"وہ میری ماں تھی، لیکن اس نے مجھے مامتا نہیں دی۔ مجھے خود سے دور رکھا"۔

"مگر میں نے سنا ہے...... مسٹر حاکف خدام نے بتایا تھا کہ وہ مر گئی"۔

"اسے جینا چاہئے تھا...... میرے لئے"۔

"عجیب بات کہہ رہے ہو"۔

"شاید"۔

"کمال ہے بھئی، کوئی مرنے والا جسے موت آ جائے وہ"۔

"یہ میرا موقف ہے"۔ اس نے مجھے گہری نظروں سے دیکھ کر کہا۔

"عورت کے دوسرے روپ بھی تو ہیں۔ ہوسکتا ہے وہ کسی اور حیثیت سے سہاری
بی، تمہاری تشنگی دور کر دے"۔

"یہ تجربہ میرے شیڈول میں نہیں ہے"۔

"یعنی کوئی عورت تمہارے دل میں نہیں اتر سکتی؟"

"نہیں"۔

"اور میں؟" آخرکار اس سے رہا نہ گیا۔

"تم مجھ پر تجربہ کر رہی تھیں...... اگر ہمت ہے تو حاکف خدام سے کہہ دینا، تمہارا تجربہ ناکام
......میں نے اس وقت تم دونوں کی گفتگو کا جواب نہیں دیا تھا۔ اب جواب دے دیا ہے"۔

"تم خود کو کیا سمجھتے ہو...... کیا سمجھتے ہو آخر؟" اس نے رو دینے والے انداز میں کہا اور
گئی۔ کئی دن کے بعد حاکف خدام نے کہا۔

"اناش بیمار ہے"۔

"اسے کسی اچھے ڈاکٹر سے رجوع کرنا چاہئے"۔ میں نے ایک بوسیدہ کتاب پر نظریں
رکھ کہا تو حاکف خدام ٹھنڈی سانس لے کر خاموش ہو گئے۔

چند روز بعد میں نے حاکف خدام صاحب کو ایک لفافہ دیتے ہوئے کہا۔

"نعمان اسدی صاحب انتقال کر گئے ہیں"۔

"تمہارے والد؟" حاکف خدام اچھل پڑے اور انہوں نے لفافہ میرے ہاتھ سے لے
وہ بڑی بے صبری سے لفافے کا کاغذ پڑھنے لگے۔ یہ خط میرے والد کے وکیل احتشام
نے بھیجا تھا۔ اس میں لکھا تھا کہ نعمان اسدی نے ان کے پاس وصیت نامہ محفوظ کرا دیا

ہے۔ اس کے تحت مجھے وطن واپس آ کر اپنی جائیداد وغیرہ کا نظام سنبھالنا ہے اور سیاہ و سفید کرنا ہے۔ خط میں میرے والد صاحب کے اہلِ خاندان کے بارے میں بھی لکھا تھا۔

"لیکن نعمان اسدی صاحب کا انتقال کب ہوا؟ کسی نے تمہیں خبر نہیں دی؟"

"کسی نے نہیں"۔

"اور تمہاری اپنے اہلِ خاندان سے کبھی ملاقات نہیں ہوئی۔ تم وطن جاؤ، ہوشمندی سے یہ سب کچھ سنبھالو جو دل چاہے کرو...... جانا ضروری ہے"۔

میں وطن چل پڑا...... واقعی ضروری تھا۔ میں نے کسی کو اطلاع نہیں دی تھی، ایک ہوٹل میں قیام کر کے میں نے احتشام احمد کو فون کیا۔

"میرا نام احمد اسدی ہے اور میں آپ کے خط کے جواب میں یہاں آیا ہوں"۔

"اوہ بیٹے ایئرپورٹ سے بول رہے ہو؟ مجھے اپنی آمد کی اطلاع بھی نہیں دی۔ میں آ رہا ہوں"۔

"میں ہوٹل فیروزن سے بول رہا ہوں۔ روم نمبر تین سو اکیس"۔

"اچھا ٹھیک ہے۔ میں آدھے گھنٹے کے اندر پہنچ رہا ہوں"۔ احتشام احمد شکل سے ہی وکیل لگتے تھے۔ کسی قدر پستہ قامت۔ گورے رنگ اور شفاف سر کے مالک...... سوٹ کی تراش بہت عمدہ تھی۔ ایک اسسٹنٹ کے ساتھ تھے جسے بعد میں انہوں نے لاؤنج میں بھیج دیا۔

"تمہیں کسی نے نعمان اسدی صاحب کی موت کی اطلاع نہیں دی؟"

"نہیں"۔

"حالانکہ تمہارے دو چچا، ایک پھوپھی اپنے بھائی کی موت پر خودکشی تک کے لئے تیار تھے"۔ میں نے احتشام صاحب سے چچا اور پھوپھی کا مطلب پوچھا تو وہ افسردگی سے مسکرا دیئے، پھر بولے۔

"ہاں مجھے معلوم ہے تم سے ان لوگوں کا کوئی تعلق نہیں رہا"۔ احتشام صاحب گہری سانس لے کر خاموش ہو گئے...... پھر بولے۔

"نعمان صاحب کو کینسر ہو گیا تھا...... کینسر ڈکلیئر ہونے کے بعد ایک بار وہ تمہارے پاس گئے بھی تھے، لیکن شاید انہوں نے تمہیں کچھ نہیں بتایا تھا؟"

"انہوں نے کبھی مجھے کچھ نہیں بتایا تھا...... بہرحال آپ نے مجھے کیوں طلب کیا ہے؟"

"تمہاری جائیداد اور کچھ اثاثے ہیں۔ یہ بہت زیادہ نہیں لیکن پھر بھی اتنے ہیں کہ ی زندگی سکون سے گزر سکتی ہے اور تمہارے اہلِ خاندان ان کے لئے پریشان ہیں، کیونکہ ی صاحب کی زندگی میں وہی ان سے فائدہ اٹھاتے رہے ہیں اور اب اگر وہ تمہاری تحویل چلے گئے تو"۔

"وہ محروم رہیں گے"۔

"ہاں انہیں احساس ہے، تمہیں تمہارے والد کی موت کی اطلاع نہ دے کر وہ مجھ سے ع کرتے رہے ہیں، مجھے پیشکش کی جاتی رہی ہے لیکن بہرحال اسدی صاحب میرے ت بھی تھے۔ گہرے راز دار دوست"۔

"مجھے کیا کرنا ہے؟"

"ان تمام چیزوں کے بارے میں فیصلہ کر لو۔ جائیداد فروخت کرنا چاہو تو فروخت کر دو۔ قل ہو جائے گی اور اگر یورپ چھوڑنا چاہو تو؟"

"ان کی تفصیل موجود ہے"۔

"بالکل یہ دیکھ لو"۔ احتشام صاحب نے ایک فائل نکال کر میرے سامنے رکھ دی۔

نعمان اسدی صاحب کی کوٹھی میں، میں احتشام صاحب کے ساتھ ہی داخل ہوا تھا۔ کوٹھی بڑی تھی، لیکن بے ہنگم، جھاڑ جھنکار سے اٹی ہوئی۔ لان تھا۔ سوئمنگ پول تھا۔ لان پیلے کی سوکھی گھاس سے بھرا ہوا تھا۔ سوئمنگ پول ناہموار گڑھے کے سوا کچھ نہیں نظر آتا تھا۔ ئیت پوری عمارت کی تھی۔ پھر کوٹھی میں پہلے شخص سے ملاقات ہوئی۔ چہرے پر نعمان ی صاحب کے نقوش موجود تھے۔ ہمیں دیکھ کر حیران رہ گئے تھے۔ پھر سنبھل کر بولے۔

"خیریت احتشام صاحب؟ یہ کون صاحب ہیں؟"

"احمد اسدی آپ کے بھتیجے...... احمد یہ شاہد اسدی ہیں تمہارے چچا"۔ شاہد اسدی کا چہرہ ڑ گیا۔ ایک لمحہ سکتے کے عالم میں گزارا پھر انہوں نے ہمیں ساتھ آنے کا اشارہ کیا اور جا کر ڈرائنگ روم میں بٹھا دیا جو کسی قدر بہتر تھا، اس کے بعد وہ اندر چلے گئے اور کچھ ہی بعد چند دوسرے افراد کے ساتھ اندر داخل ہو گئے۔ دو نوجوان لڑکے جو صورت سے پڑھے معلوم ہوتے تھے۔ تین چار لڑکیاں، کچھ خواتین شاہد اسدی جیسے ایک اور صاحب جن کے میں بعد میں پتہ چلا کہ وہ میرے والد صاحب کے دوسرے بھائی فیضان اسدی ہیں۔

"آپ کو علم ہے، وکیل صاحب ہم ان سے پہلے کبھی نہیں ملے؟"

"جی میں جانتا ہوں"۔

"پھر کیسے تسلیم کرلیا جائے کہ یہ ہمارا بھتیجا ہے؟"

"میرے پاس ناقابل تردید ثبوت موجود ہیں جن سے ان کی شناخت ہوجائے گی"۔

"ان ثبوتوں کے بعد ہی ہم اسے گلے لگائیں گے۔ بس یہ ثابت ہوجائے کہ یہ ہمارے بھائی کی نشانی ہے"۔ احتشام صاحب نے مقامی ماحول کے مطابق کرتب دکھا کر ان لوگوں میری شناخت کرادی اور شاہد اسدی صاحب نتھنے پھیلاتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے۔

"میرا بچہ، میرا لعل، میرے مرحوم بھائی کی نشانی"۔ وہ دونوں ہاتھ پھیلا کر آگے بڑھے اور میرے قریب پہنچے تو میں نے ایک انگلی کھڑی کرکے ان کے سینے پر رکھی اور انہیں پیچھے دھکیلتے ہوئے کہا۔

"میں اس سرکس سے دلچسپی نہیں رکھتا، آپ اپنی جگہ تشریف رکھئے۔ میرے والد کا کم مجھے بتائیے میں اس میں قیام کروں گا"۔

شاہد اسدی رک رک کر سینہ مسلتے ہوئے بولے۔ "باپ کی طرح بداخلاق ہے"۔

"احتشام صاحب...... پولیس کے کچھ اہم لوگوں سے رابطہ کرنا چاہتا ہوں، مجھے عمارت ان لوگوں سے خالی کرانا چاہئے تاکہ میں اس کے بارے میں بہتر فیصلہ کرسکوں"۔ اگر آپ اپنے ان لوگوں سے معاملہ طے کرلیں تو بہتر ہے اور اگر ضروری سمجھے ہا یہاں فون موجود ہیں اور ڈائریکٹری میں پولیس آفیسر کا نمبر"۔

ان سب کے چہروں پر ہوائیاں اُڑنے لگیں۔ شاہد اسدی نے کہا۔

"میاں ہمیں گفتگو کرنے کا موقع دو آخر تم ہمارا خون ہو یہ سب تمہارے اپنے ہیں"۔

میں نے کچھ دیر توقف کیا کوٹھی کا نقشہ ذہن میں دہرایا۔ بڑے گیٹ کے پاس کچھ کوا بنے ہوئے تھے۔ جو بوسیدہ اور ٹوٹے پھوٹے پڑے ہوئے تھے۔ میں نے کلائی پر بندھی گھڑی دیکھ کر کہا۔

"ایک گھنٹہ بہت ہوتا ہے۔ آپ اسی ایک گھنٹے کے اندر اندر گیٹ کے پاس بنے ہو کوارٹروں میں منتقل ہوجائیں۔ یہ عارضی وقت دے رہا ہوں آپ کو ایک گھنٹے کے بعد اگر کی صورت یہاں نظر آئی تو میں پولیس طلب کرلوں گا۔ اس کے بعد پولیس آپ کے با

ہی فیصلہ کرے گی۔ آئیے احتشام صاحب!" میں اٹھ کر ڈرائنگ روم کے باہر آ گیا۔ احتشام صاحب میرے پیچھے آئے تھے۔ عقب سے فیضان اسدی کی آواز سنائی دی۔

"تو وکیل صاحب نے خوب پڑھا دیا، صاحبزادے کو مگر آپ نے اپنے حق میں اچھا نہیں کیا وکیل صاحب"۔

اس کوٹھی کی تلاشی لیتے ہوئے احتشام صاحب بولے۔ "پولیس سے واقعی مدد لے لو۔ یہ اچھے لوگ نہیں ہیں...... مجھے اجازت وہ کچھ پولیس افسر میرے دوست ہیں"۔

"یہاں ملازم نہیں ہیں؟"

"کبھی تھے لیکن سب چلے گئے۔ یہ لوگ ہی یہاں قابض رہے"۔

"نعمان اسدی کیسے آدمی تھے۔ کیا وہ ان لوگوں کے درمیان خوش تھے؟"

"وہ ان لوگوں کے درمیان رہتے ہی کہاں تھے۔ بس نہ جانے کہاں کہاں وقت گزارتے تھے"۔

"آپ جانا چاہیں تو جاسکتے ہیں۔ میں خود آپ سے ملاقات کروں گا"۔ میں نے احتشام صاحب سے کہا اور وہ چونک کر مجھے دیکھنے لگے۔ پھر مسکراتے ہوئے خدا حافظ کہہ کر چلے گئے۔

میں نے اپنے والد کا کمرہ تلاش کیا۔ کمرے کے کاٹھ کباڑ کی تلاشی لے رہا تھا کہ ایک صاحبزادی اندر داخل ہوئیں۔ بڑی سی ٹرے اٹھائے ہوئے تھی۔ جس پر چائے کے برتن سجے ہوئے تھے...... مسکرا کر بولیں۔

"میرا نام ناہید اسدی ہے۔ چائے پی لیں...... میں نے خود بنائی ہے"۔

میں نے انہیں گھور کر دیکھا...... "آپ کا حکم ماننا ضروری ہے؟"

"مانیں تب کی بات ہے"۔ انہوں نے شوخ آنکھوں سے مجھے دیکھا۔

"آئیے......" میں نے نرم لہجے سے کہا اور دروازے کی طرف مڑ گیا۔ وہ جانے کیا سمجھ کر میرے پیچھے باہر نکل آئیں۔ ٹرے ان کے ہاتھوں میں تھی۔ دروازے سے چند قدم دور رک کر میں نے ان سے کہا۔

"جائیے مجھے دوبارہ آپ کی صورت نظر نہ آئے"۔ میں نے کمرے میں واپس آکر دروازہ بند کرلیا۔

❁❁❁❁

وہ رات میں نے نعمان اسدی کے کمرے میں ہی گزاری تھی۔ پوری کوٹھی پر جھاڑو پھری ہوئی تھی۔ میں یہاں آتو گیا تھا لیکن سوچ رہا تھا کہ کیوں آیا ہوں، بڑی الجھن، بڑی نفرت محسوس ہو رہی تھی ان لوگوں سے یہ سب مجھے مردار خور گدھ محسوس ہو رہے تھے، جو کسی کی لاش کے گرد بیٹھے اپنی مکروہ چونچوں سے لاش کی انتڑیاں کھینچ رہے ہوں ...... مجھے اس بات کا گلہ نہیں تھا کہ انہوں نے مجھے نعمان اسدی کی موت کی خبر کیوں نہیں دی تھی۔ نعمان اسدی نے خود ہی کبھی مجھ سے کوئی رغبت کا اظہار نہیں کیا تھا۔

دوسری صبح کچھ عجیب سی آوازیں کانوں میں ابھریں۔ یہ آوازیں کوٹھی کے عقبی حصے سے آرہی تھیں۔ میں تجسس میں ڈوبا ہوا وہاں پہنچ گیا...... گول دائرے کی شکل میں زمین کھودی گئی تھی اور اس دائرے کے اندر تین چار نوجوان لنگوٹیاں باندھے ورزش کر رہے تھے، لیکن انوکھی ورزش جو میں نے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ میرے چچا صاحبان بھی وہاں موجود تھے اور تعریفی نظروں سے ان نوجوانوں کو دیکھ رہے تھے۔ وہ آپس میں الجھے ہوئے جوان سیدھے ہوگئے اور مجھے دیکھنے لگے اور ان کے چونکنے پر باقی سب بھی میری طرف متوجہ ہوگئے۔ شاہد اسدی اور فیضان اسدی کے چہرے اتر گئے۔ الجھے ہوئے جوانوں میں سے ایک جو اچھے تن و توش کا مالک تھے۔ سانولے رنگ، چھدرے بال اور گلے میں تعویذ تھا۔ نوکیلی مونچھوں کی وجہ سے اس کا چہرہ عجیب سا لگ رہا تھا۔ چند قدم آگے بڑھا اور میرے پاس آکر بولا۔

”تو تم ولایتی پہلوان ہو۔ سنا ہے بڑی تڑی شڑی جمائی ہے آتے ہی۔ میرے بارے میں معلوم نہیں تھا تمہیں“۔

”یہ سب کون ہیں؟“ میں نے اشارے سے دوسروں کے بارے میں پوچھا۔

”پٹھے ہیں اپنے...... یہاں تمہاری دال نہیں گلے گی، چاند کے ٹکڑے ہم کھوپڑی کے سکھ ہیں...... قسم استاد کمالے کی کھوپڑی گھوم گئی تھی تمہارے بارے میں سن کر۔ یار رشتے دار ہو آئی گئے ہو وقفہ تو چار چھ روز ہمارے ساتھ رہو، کھاو پیو سیر کرو، پھر چھٹی کھاؤ...... وہ وکیل صاحب دشمنی کر رہے ہیں تم سے، ان کی باتوں میں نہ آئیو“۔

”میرے ہوتے ہوئے کس کی جرأت ہے کہ ہم سے یہ کوٹھی خالی کرائے، تم جانتے نہیں ہو ہمیں“۔

”ان سب سے کہو دوبارہ ادھر کا رخ کیا تو اپنے پیروں پر واپس نہیں جائیں گے“۔

”ٹھیک کہہ رہے تھے، ابا جی، بولتے خوب ہو۔ ملاؤ ہاتھ پہلوان“۔ اس نے ہاتھ بڑھا دیا۔

”نہیں ثاقب میں نے منع کیا تھا تجھے، کچھ بھی ہے تیرا خون ہے، تیرے تایا ابا کا بیٹا ہے“۔ شاہد اسدی نے کہا۔

”یہ سمجھتا کیا ہے اپنے آپ کو۔ ہمارے دروازے پر آکر ہمیں ہی تڑی، ہاتھ ملا پہلوان مرد کا بچہ ہے تو“۔ اس نے پھر ہاتھ بڑھا کر سینہ تانتے ہوئے کہا۔

میرا دماغ سناٹے میں آگیا تھا۔ میں نے ایک قدم آگے بڑھا کر اس کی کلائی پکڑی اور اس نے پھرتی سے اپنے بدن کو جنبش دی۔ غالباً کوئی داؤ لگانے کی کوشش کی تھی مگر میں نے زور سے گھمایا اور درمیان میں پھینک دیا۔ پھر میں نے جنون کے عالم میں گاؤن اتار پھینکا اور اس دائرے میں داخل ہوگیا۔ سارے پٹھے اچھل اچھل کر باہر پھدک گئے۔

ثاقب کروٹ بدل کر اٹھا تو میں نے ایک ٹھوکر اس کی پسلیوں پر رسید کردی۔ پھر میں سب کچھ بھول گیا۔ ثاقب کی سرخ لنگوٹی مجھے نظر آرہی تھی اور میری آنکھوں میں کسی خونی درندے جیسی سرخی ابھر آئی تھی۔ میں اسے بھنبھوڑ رہا تھا۔ اٹھا اٹھا کر پٹخ رہا تھا۔ دوسرے لوگ نہ جانے کیا کیا کہہ رہے تھے، چیخ رہے تھے، میرے پاس آکر مجھے پکڑ رہے تھے۔ دہائیاں دے رہے تھے، رو رہے تھے مگر میں اسے دیکھ رہا تھا۔ اس کے بدن میں جنبش تھی اور یہی تحریک مجھے پسند تھی، جب تک وہ ہلتا رہے گا میں اسے مارتا رہوں گا۔ دوسرے لوگ کس طرح میرے ناخنوں سے زخمی ہوئے، مجھے معلوم نہیں تھا۔ میں نے تو انہیں اس وقت دیکھا جب ثاقب ساکت ہوگیا وہاں سے پلٹا تو سب بھرا مار کر پیچھے ہٹ گئے اور عورتیں کانپ رہی تھیں۔ ایک خاتون کہہ رہی تھیں۔

”ارے خدا اسے غارت کرے، ہائے دیکھ تو لو، ہائے قیمہ کردیا میرے بچے کا“۔ میں نے اپنا گاؤن اٹھا کر پہنتے ہوئے کہا۔

”آپ لوگ جتنی جلدی ہوسکے اس عمارت سے نکل جائیں۔ جب تک نہ جاسکیں تو ہال کوارٹروں میں رہیں۔ اندر کوٹھی میں کوئی نہ آئے“۔ میں وہاں سے دو قدم آگے بڑھا، پھر پلٹ کر رک کر کہا۔ ”اور سنیں اس آدمی نے مجھ پر قاتلانہ حملہ کیا تھا۔ میں نے جو کچھ کیا ہے اپنے بچاؤ کے لئے کیا ہے۔ پولیس کو یہی بیان دوں گا میں“۔

دوپہر کو احتشام صاحب خود آگئے، انہیں ابھی صورتِ حال نہیں بتائی گئی تھی ورنہ وہ مجھ

سے تذکرہ ضرور کرتے۔ میں ان کے ساتھ ہی باہر نکل آیا راستے میں وہ بولے۔

''بڑا سکوت ہے۔ میرے خیال میں یہ سب منصوبہ بندی کررہے ہیں۔ ویسے انہوں نے تمہاری بات مان لی ہے؟''

''میں اس کوٹھی میں قیام کروں گا۔ ایک ملازم چاہئے آپ کے بھروسے کا۔ کھانے پینے کی اشیاء بھی، محتاط اور ہوشیار آدمی ہو''۔

''میں بندوبست کردوں گا...... جائیداد کے سلسلے میں کچھ کام کرنا ہے۔ تمہاری ضرورت ہوگی۔ آؤ پہلے کسی ریستوران میں چلتے ہیں''۔

شام کو واپس لوٹا تو کوارٹروں میں روشنی تھی۔ اندر کی عمارت تاریک نظر آرہی تھی۔ قمر میں نے کچن دکھایا اور وہ سامان کے تھیلے لئے ہوئے کچن میں داخل ہوگیا...... کام کا آدمی تھا۔ ڈرائیور سے لے کر باورچی تک، گاڑی وہی واپس چلا کر لایا تھا جو احتشام صاحب نے میرے استعمال کے لئے دی تھی۔

دوسرے دن دوپہر سے کچھ پہلے ایک عجیب وغریب شخصیت سے واسطہ پڑا، وہ آنسوؤں سے تر چہرہ لئے اندر داخل ہوئی تھی۔

''پھوپھی ہوں تیری بیٹا، بے بس اور مظلوم ہوں۔ سب کے ظلم کا شکار ہوں، جوتیوں میں ڈال رکھا ہے مجھے، بے حقیقت بے حیثیت ہوں...... بیٹا میری ایک پیسے کی مدد نہ کرنا مگر مجھ سے میرا رشتہ نہ چھیننا۔ میں ان کی طرح تیری دولت کی پیاس نہیں رکھتی۔ بیٹا ایک پیسہ مانگوں تو جوتے مار کر نکال دینا...... ارے میں تو اپنے بڑے بھیا کے خون کی بو سونگھتی آئی ہوں...... آنکھوں کی پیاس بجھانے آئی ہوں۔ چلی جاؤں گی...... ہائے مجھے تو کسی نے بتایا بھی نہیں تھا۔ وہ تو بس اللہ کو منظور تھا کہ ثاقب مل گیا دواؤں کی دکان پر۔ اس سے پتا چل گیا کہ تُو آیا ہے''۔

اس عورت کے بدن سے ایک عجیب سی خوشبو اٹھ رہی تھی۔ ایک اجنبی سی خوشبو جس نے نہ جانے دماغ کے کون سے حصے کو متاثر کیا تھا کہ وہ مجھے بری نہ لگی۔

''آپ کون ہیں؟'' میں اپنے سوال پر خود حیران ہوا۔

''تیرے باپ کی بہن ہوں بیٹا۔ حمیدہ ہے میرا نام، بیٹا! بڑے بھیا مرگئے کسی نے مجھے بتایا نہیں...... غریب جو ہوں۔ ارے یہ تو مجھ سے رشتہ ہی توڑ بیٹھے ہیں۔ تو مجھے پھوپھی ضرور سمجھنا میرے بچے ایک پیسہ مانگوں تو منہ پر جوتا مارنا''۔

''آپ آرام سے بیٹھیں...... مجھے اپنے بارے میں بتائیں''۔ پھوپھی کے شوہر تھے، دو بچے۔ شوہر کسی دفتر میں کلرک تھے۔ بیٹے پڑھ رہے تھے اور بس۔

''مجھے ایک بات بتایئے؟'' میں نے کہا۔

''ضرور بیٹے...... جو دل چاہے پوچھ؟''

''ان لوگوں کا میرے باپ سے کیا رویہ تھا''۔

''ارے بھیا تو جیتے جی مردہ تھے۔ ان کے ساتھ کسی کا رویہ کیا خراب ہوتا، انہی کی ان پر تو پل رہے تھے، یہ سارے کے سارے، مگر بیٹا بڑی بری گزری ان کی۔ ان کی دولت یہ تو سب نے محبت کی انہیں کسی نے نہ چاہا۔ بس ان کی ہاں میں ہاں ملا کر انہیں لوٹتے رہے، کھاتے رہے۔ ایک ہم تھے کہ جنہوں نے کبھی بڑے بھیا کے سامنے ہاتھ نہ پھیلایا...... وہ تو دنیا سے بیگانے تھے۔ بھلا کرے بھابی کا...... ارے سنو، تمہاری ماں تم سے نہیں ملتیں؟''

''جی؟''

''تم اپنی ماں سے ملتے ہو؟''

میں حیرت سے اس عورت کو دیکھنے لگا۔ یہ پاگل تو نہیں ہے۔ کتنی انہونی بات کہہ رہی ہے۔ کیا اسے اتنا بھی نہیں معلوم کہ میری ماں مرچکی ہے۔ میں اسے متجسس نظروں سے دیکھتا رہا وہ خود ہی بولی۔

''بڑے بھیا تو ایسے تھے کہ جہاں بیٹھیں محفل زعفران زار بن جائے۔ کون ہے ان میں کے مقابلے کا۔ ارے یہ ساری زندگی ان سے جلتے رہے۔ انہوں نے ہی ان سب کو سنبھالا انہوں نے جان بوجھ کر بڑے بھیا کے مرنے کی خبر نہیں دی''۔

''جانتے ہو کیوں؟ صرف اس لئے کہ جو عیش کررہے ہیں ختم ہوجائیں گے''۔

''آپ نے میری ماں کے بارے میں کیا کہا تھا؟'' میں نے کہا۔

''کیسی ہیں بھابی زمرد جہاں، اب تو بوڑھی ہوگئی ہوں گی؟''

''آپ کو ان کے بارے میں علم نہیں؟''

''کیا؟''

''یہی کہ وہ مرچکی ہیں''۔

''ایں...... مرگئیں؟''

''آپ نعمان اسدی کی بہن ہیں؟''

''ہاں ہوں''۔

''آپ کو اتنا نہیں معلوم کہ میری ماں مرچکی ہیں، اس وقت جب میں شاید ایک دو سال کا بھی نہیں تھا''۔

''کیا؟'' خاتون منہ کھول کر بولیں۔

''آپ ان کے بارے میں کیا جانتی ہیں؟''

''نہیں بیٹا...... تمہاری بات جاری سمجھ میں نہیں آئی۔ اللہ رکھے تمہاری عمر تو کافی ۔ ابھی زیادہ پرانی بات نہیں ہے۔ وہ مجھ سے بھی ملی تھیں''۔

''تمہیں یقین ہے وہ میری ماں تھیں؟''

''ہاں بیٹے''۔

''کیا میرے باپ کی دوسری بیوی؟''

''نہیں بیٹے زمرد جہاں کی بات کررہی ہوں...... اکبر ضیاء خاندان سے ان کا تعلق ہے...... وہ تو ضیاء کا زوال ہوگیا ورنہ ہمارا تو وہ حشر ہوتا کہ اللہ دے بندہ لے۔ ان کی موت کی خبر تو کبھی نہیں سنی ورنہ جہان میں پھیل جاتی''۔

''آپ سے کیوں ملی تھیں؟''

''تمہارے ہی سلسلے میں...... تمہارے بارے میں معلوم کرنے مجھ غریب کے جھونپڑے میں آئی تھیں''۔

''مجھے میری ماں اور باپ کے بارے میں تفصیل بتائیے''۔

''بڑے بھیا نے اپنا کاروباری سلسلہ بیرون ملک تک پھیلا دیا تھا۔ کافی عرصہ وہاں رہے۔ بس وہیں بھابی زمرد جہاں سے شادی ہوگئی۔ سب مخالف ہوگئے...... اللہ بخشے، ابا نے خودکشی تک کی دھمکی دے دی تھی۔ ایک دن بھی بھابی کو کوٹھی میں نہ رہنے دیا...... سسرال آئی تھیں، لیکن ہوٹل میں رہنا پڑا۔ بس وہیں سے ان کا دل کھٹا ہوگیا۔ آخر تم پیدا ہوئے، لیکن بھیا اور بھابی کی نہ بنی۔ بھیا تمہیں لے کر یہاں آ گئے۔ پھر کہیں اور چلے گئے...... اس کے بعد انہوں نے تمہیں کبھی نہیں دیکھا...... بھیا آتے رہے...... یہاں بھی رہتے رہے مگر بہت کم، یہی لوگ یہاں عیش کرتے تھے۔

انہوں نے بھیا پر جال ڈال رکھے تھے اور انہی کی دولت پر کود رہے تھے۔ بھابی زمرد کئی بار یہاں آئیں، کبھی بھیا کے سامنے، کبھی ان کے پیچھے ہوٹلوں میں قیام کرتی تھیں۔ بھیا کبھی ان کے ساتھ نہ رہے۔ ہمیں بس اتنا معلوم تھا کہ وہ تمہیں حاصل کرنا چاہتی تھیں، مگر بھیا ٹس سے مس نہ ہوئے۔ ہاں اگر دور ہوتا ضیاء کا تو دوسری بات تھی...... بہر حال بھیا نے اس سے قطع تعلق تو ضرور کرلیا تھا، لیکن دل میں وہ زمرد جہاں کو بہت یاد کرتے تھے اور یہی یاد انہیں لے ڈوبی...... ایک عمر کی کہانی ہے۔ کل کی سی بات معلوم ہوتی ہے''۔

''آپ کہاں رہتی ہیں؟''

میں مہربان خاتون کے ساتھ ان کے گھر گیا...... بوسیدہ حالی اور افلاس بھرے ماحول میں مخلص لوگ نظر آئے جو کسی کی محبت اور التفات کا تصور کھو بیٹھے تھے۔ ایسے لوگ کسی کے ذرا سے التفات پر دیوانے ہوجاتے ہیں۔ یہ دیوانے پروانے بن کر مجھ پر نثار ہونے لگے۔

پھر وہ ازلی سکون میں بھونچال کی رات ثابت ہوئی۔ صدیوں سے خاموش ٹھنڈے دھارے کو آتشیں طوفان نے لپیٹ لیا۔ راکھ کے آسمان سے لگے ڈھیر کے نیچے دبی آگ ابلنے لگی اور میں خاکستر ہونے لگا۔ ماں ہے، زندہ ہے، باپ کے پُراسرار اصول کے نیچے دبی ہوئی ہے۔ وہ تاریکیوں میں گم ہوگیا اور اپنی دانست میں تمام کہانیاں ختم کرگیا۔ انتہا پسند انسان نے مرنے سے پہلے ایک نیکی کا کام کر جاتا تو کیا برا تھا۔ بدن کے ٹکڑے کو جدا کردیا تھا اس نے۔

دولت جائیداد اثاثے سب کچھ ہیچ تھے۔ صدیوں کی اس طلب کے سامنے اصلی ورثہ تو ماں تھی۔ باقی سب جوتوں کے نیچے دبا ہوا تھا۔ ایک ٹھوکر سے اسے چار گنا کرسکتا تھا۔ کون غلط کون درست اس کا فیصلہ بعد کی بات تھی۔ اس کی صورت تو دیکھی جائے کیسی ہے۔

سب کچھ اس انکشاف کا صدقہ دے دیا۔ مہربان خاتون کو ماں کی قیمت چکادی۔ سورج نکلنے سے پہلے احتشام صاحب کی رہائش گاہ پہنچ گیا جو پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی، لیکن ان کے گھر کا پتا درج تھا۔

ڈرائنگ روم میں احتشام صاحب کا استقبال کیا جو الٹا گاؤن پہنے ہوئے اندر داخل ہوئے تھے''۔ بالکل خیریت ہے آپ کے ساتھ ناشتا کرنے حاضر ہوا ہوں''۔

''بخوشی...... مجھے صرف تمہارے اتنی صبح آنے کا اضطراب تھا''۔ احتشام صاحب نے کہا مسکراتے ہوئے بیٹھ گئے۔

"چائے کے لئے کہہ دیجئے"۔

"آجائے گی...... ملازموں کو ہمارے یہاں ہونے کا علم ہے"۔

"آپ سے کچھ معلومات درکار ہیں"۔

"ہوں، کہو؟"

"خاتون زمرد جہاں کی کہانی کیا ہے؟" میں نے سوال کیا اور احتشام صاحب نے گردن جھکالی، پھر بولے۔

"مجھے یقین تھا کہ بہت جلد تم یہ سوال لے کر آنے والے ہو، لیکن میں بھی اس وعدے کے سامنے مجبور تھا، جو میں نے اپنے دوست نعمان سے کیا تھا"۔

"کیا وعدہ تھا؟"

"یہی کہ میں اپنے طور سے تم پر کوئی انکشاف نہیں کروں گا، کیونکہ صرف میں تھا جو یہ جانتا تھا کہ تم کہاں ہو؟"

"اوہو اس کا مطلب ہے کہ یہ لوگ مجھے نعمان اسدی کی اطلاع دے ہی نہیں سکتے تھے۔

"یہ بھی ہے، لیکن اگر انہیں علم بھی ہوتا تو تمہیں کبھی نہ بتاتے۔ بہرحال اب یہ وعدہ ختم ہو چکا ہے، کیونکہ نعمان ہی کا کہنا تھا کہ اس کی موت کے بعد سارے اصول ختم ہوجائیں گے اور پھر تم اپنے ہر عمل کو اپنی مرضی کے مطابق کرو گے"۔

"خاتون زمرد جہاں حیات ہیں؟"

"ہاں"...... احتشام صاحب نے پُراعتماد لہجے میں کہا اور میرے وجود میں کیف وسرور کی اجنبی ٹھنڈک اترنے لگی۔ میں نے صدیوں کی تپش میں کمی محسوس کی تھی۔

"کہاں ہیں؟"

"ایک اسلامی ملک میں"۔

"قصہ کیا تھا؟" میں نے کہا اور احتشام صاحب اس پُراسرار داستان کے آغاز کے لئے مناسب الفاظ تلاش کرنے لگے۔ اتنی دیر میں ملازم چائے لے آیا...... اس نے چائے بنا کر ہمارے سامنے رکھی اور ہم اس کی واپسی کا انتظار کرنے لگے۔ جب وہ باہر نکل گیا تو میں نے کہا۔

"آپ غور وخوض میں دیر کر رہے ہیں، جبکہ میری بے چینیوں میں اضافہ ہو رہا ہے"۔

"نہیں، میں مناسب جگہ منتخب کر رہا ہوں، جہاں سے اس داستان کا آغاز کروں"، تم نہیں

اؤ گے...... مجھ پر بہت سی ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں، جس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ میں نعمان اسدی کا قانونی مشیر ہی نہیں بلکہ اس کا دوست بھی ہوں...... اس کے مرنے کے رض بھی مجھ پر عائد ہوتا ہے کہ تمہیں کہانی اس طرح سناؤں کہ تمہارا ذہن معتدل رہے اری سوچ کے دھارے غلط سمت نہ اختیار کرلیں"۔

"میرا خیال ہے آپ پرزور بیان پر زیادہ توجہ دے رہے ہیں، جبکہ میرا رواں رواں چیخ کہ اصل حقیقت جس قدر جلد ہو میرے سامنے آجائے"۔ میں نے بدن کی اینٹھن پر نے ہوئے کہا۔

"مجھے اس کا احساس ہے"۔

"اس کے باوجود آپ نے ابھی تک آغاز نہیں کیا"۔ میں نے دانت پیس کر کہا۔

"چائے لو...... ٹھنڈی ہوکر بے کار ہوجائے گی"۔ وہ بولے اور میں نے عالم جنون میں کی پیالی پر ہاتھ مارا اور وہ میز، فرش اور دیوار کو لتھیڑتی ہوئی دور جا گری۔

احتشام صاحب بے اختیار اچھل پڑے...... معصوم صفت انسان تھے اور میرے غصے کو نہ کے اور حیرت سے اس منظر کو دیکھتے ہوئے بولے۔

"ارے...... اوہ...... یہ کیا ہوگیا...... کوئی بات نہیں۔ میں ملازم کو بتاتا ہوں، بلکہ جلدی ۔ بعد میں صفائی ہوجائے گی مگر یہ ہوا کیسے؟"

ہوتا ہے...... انسان ہر حالت میں انسان ہوتا ہے۔ علم حاصل کرتا ہے، شہرت کے آسمان پاتا ہے۔ اپنی ذہانت سے اپنی علمیت سے، لیکن یہی انسانی مخلوق کبھی کبھی کسی عام سی معصوم بچے کی مانند پلکیں جھپکاتی ہے، کچھ بھی نہیں سمجھ پاتی۔

احتشام صاحب کی بھی اس وقت یہی کیفیت تھی، وہ میرے اضطراب کو نہیں سمجھ پائے اپنی ہی دھن میں مست تھے، پھر وہ جلدی سے اٹھے اور اپنی چائے کی پیالی میرے رکھتے ہوئے بولے۔

ایکس کیوزمی...... میں ملازم کو بلاتا ہوں۔ وہ یہ سب صاف بھی کردے گا اور چائے کی پیالی میرے لئے لے آئے گا۔ تم نے دیکھا ہوگا کہ میں نے ابھی اس کپ کو ہاتھ بھی یا ہے"۔ وہ اٹھ کر آگے بڑھے تو میں نے عقب سے ان کا الٹا گاؤن پکڑ لیا۔ وہ یہ سمجھ کر شاید ان کا گاؤن کسی چیز میں پھنس گیا ہے، لیکن اسے میرے ہاتھ میں پھنسا دیکھ کر

حیران رہ گئے۔ میں نے ایک جھٹکے سے انہیں کھینچ کر ان کی جگہ بٹھا دیا اور بولا۔

''چائے کا یہ کپ میں نے پھینکا ہے، کیونکہ اس وقت میں چائے سے پہلے اپنی ماں کے بارے میں جاننا چاہتا ہوں''۔

''ایں......'' وہ حیرانی سے بولے اور کسی قدر بوکھلائے ہوئے نظر آنے لگے۔ ان کے انداز میں ایک عجیب سی کیفیت پیدا ہوگئی تھی۔ شاید نروس ہوگئے تھے۔ میں سلگتی آنکھوں سے انہیں دیکھتا رہا۔ احتشام صاحب کچھ گھبرائے ہوئے تھے، اب انہوں نے توقف نہیں کیا اور بولے۔

''تمہارا خاندان مالی طور پر کچھ بھی نہیں تھا۔ اس کا اندازہ تم نے لگالیا ہوگا۔ یہ مرزا نعمان اسدی تھے جنہوں نے اس خاندان کی تقدیر بدلی اور انتھک محنت سے کامیابیاں حاصل کرتے چلے گئے...... انہوں نے اپنے نکھٹو بھائیوں کو ہمیشہ آگے بڑھا کر کاروبار میں شریک کرنے کی کوشش کی، لیکن کوئی کارآمد نہیں ثابت ہوا۔ وہ خود ہی سب کچھ کرتے رہے اور کاروبار پھلتا پھولتا رہا۔ یہاں تک کہ وہ کاروبار کے لئے تمہاری ماں کے آبائی ملک پہنچ گئے۔ وہاں انہوں نے کافی عرصہ قیام کیا اور وہیں ان کا تعارف تمہاری ماں یعنی زمرد جہاں سے ہوا۔ وہ ظہور مہدی کی صاحبزادی تھیں اور ظہور مہدی اس ملک کے امیر ضیاء کے قریبی عزیز تھے۔ حکومت کے اہم عہدے پر فائز تھے۔

بہرحال باہمی رضامندی سے دونوں کی شادی ہوگئی۔ ابتداء میں اس شادی کو چھپایا گیا...... نعمان اسدی، خاتون زمرد جہاں کو پاگلوں کی طرح چاہتے تھے۔ پھر وہ انہیں یہاں لائے لیکن یہاں ان کے خلاف طوفان کھڑا کردیا گیا۔ یہاں تک کہ یہ کوٹھی جو ایک ٹوٹے پھوٹے گھر کی شکل بدل کر خود نعمان اسدی صاحب نے بنائی تھی، زمرد جہاں کے لئے بند کردی گئی۔ انہیں ہوٹل میں رکنا پڑا۔

زمرد جہاں بھی شعلہ مزاج تھیں، انہوں نے ان سب سے نفرت کا اظہار کیا اور نعمان سے کہا کہ یہاں کا کاروبار ختم کرکے اس کے ساتھ واپس ان کے وطن چلیں اور وہیں پر سکونت اختیار کریں۔ نعمان نے کہا کہ وہ حالات سنبھالنے کی کوشش کرتے ہیں، لیکن زمرد جہاں تنہا واپس چلی گئیں۔ بعد میں نعمان اسدی بھی ان کے پاس چلے گئے...... وہاں ناچاقی کچھ زیادہ بڑھ گئی۔ اس کی تفصیل مجھے نہیں معلوم...... تم پیدا ہوئے تو نعمان خاموشی سے تمہیں لے کر یہاں واپس چلے آئے۔

اس طرح وہ زمرد جہاں کو یہاں آنے پر مجبور کرنا چاہتے تھے۔ پھر کچھ عرصہ بعد امیر زوال پذیر ہوگئے...... ظہور مہدی کے پورے خاندان کو گرفتار کرلیا گیا اور حالات نہ جانے کیا ہوئے۔ خاتون زمرد ان مفروروں کی فہرست میں تھیں، جن پر انعام مقرر کیا گیا تھا۔ انڈر گراؤنڈ ہوگئی تھیں...... نعمان اسدی نے بہت سے جوڑ توڑ کئے اور ایسے حالات پیدا کئے کہ خاتون کو وہاں سے نکال لائیں، لیکن ان کا ایک ہی مطالبہ تھا کہ ان کا بیٹا انہیں واپس دیا جائے۔ تم نعمان اسدی کا واحد سہارا تھے جس سے وہ محبت کے اس ٹوٹے رشتے کو جوڑ سکتے تھے، پھر شاید خاتون زمرد جہاں کو یہاں دیکھا گیا جو شاید تمہیں حاصل کرنے آئی تھیں۔

نعمان تمہیں ملک سے باہر لے گئے، درمیان کی تفصیل مجھے نہیں معلوم۔ طویل عرصے بعد مجھے معلوم ہوا کہ تم یورپ میں ہو...... یہ بات صرف مجھے معلوم تھی۔ زمرد جہاں بیگم اب تک مفرور ہے اور ان کے ملک کی حکومت انہیں تلاش کررہی ہے، لیکن ان کے گرد کوئی مضبوط حصار ہے اور وہ خود بہت اہم شخصیت اختیار کرچکی ہیں اس لئے اب بھی وہیں ہیں، اس دوران انہوں نے کئی بار یہاں آکر تمہارے حصول کے لئے کوششیں کیں، لیکن تمہارا پتہ نہ معلوم کرسکیں۔ نعمان اسدی محبت کی آگ میں جل کر خاکستر ہوگئے، انہیں کینسر ہوگیا اور وہ خاموشی سے مرگئے۔ بس یہ کہانی ہے۔

''میری ماں زندہ ہیں؟''

''ہاں...... یہ بات میں پورے یقین سے کہہ سکتا ہوں''۔

''کہاں ہیں؟''

''اس تفصیل سے تم یہ اندازہ لگاسکتے ہو کہ مجھے ان کے بارے میں نہیں معلوم۔ بس اتنا جانتا ہوں کہ ایران میں ہیں، لیکن کس جگہ یہ نہیں بتاسکتا''۔

''نعمان اسدی نے کبھی نہیں بتایا؟''

''نہیں''۔

''میرے لئے انہوں نے کیا کہا تھا؟''

''وصیت نامہ تیار کرنے کے سوا کچھ نہیں''۔

''کوئی شرط ہے میرے لئے؟''

''نہیں''۔

"کوئی ذریعہ ہے زمرد جہاں کی تلاش کا؟"

"ایک نام بتا سکتا ہوں گو میرا ان سے براہِ راست کوئی واسطہ نہیں رہا، لیکن مشہور نام ہے اور تلاش کرنے پر تم حیدر ساوی سے مل سکتے ہو۔ بیرسٹر حیدر ساوی تہران کی ایک معتبر شخصیت ہیں اور یہ سو فیصد تمہیں زمرد جہاں سے ملا سکتے ہیں"۔

"میں اس دولت اور جائیداد کے سلسلے میں اپنا فیصلہ سنانا چاہتا ہوں۔ آپ اپنے طریقۂ کار کے مطابق اپنے واجبات وصول کر کے میرا کام کر دیں"۔

"کیا کہنا چاہتے ہو؟"

"میری جائیداد جس کی تفصیل میں دیکھ چکا ہوں، تمام میری پھوپھی کے نام منتقل کر دی جائے۔ کاروبار کی فروخت سے جو رقم حاصل ہوئی ہے وہ میرے نام پر ہالینڈ میں منتقل کر دی جائے۔ میں اس کے بارے میں تمام امور تحریری طور پر آپ کو پیش کر دوں گا"۔

"غور کر لو بیٹے...... جلد بازی اور جذبات"۔

"شکریہ...... آپ وہی کریں جو میں کہہ رہا ہوں...... اگر مشکل ہو تو مجھے بتا دیں تاکہ میں......"

احتشام صاحب ہنسنے لگے پھر بولے...... "تمہیں وہی ہونا چاہئے جو تم نظر آ رہے ہو ٹھیک ہے"۔

ماں کی زندگی کی اطلاع دینے والی پھوپھی کو کروڑ پتی اور چچاؤں کو ان کے اہلِ خاندان سمیت قلاش اور بے گھر کر کے میں اپنی ماں کی تلاش میں نکل پڑا۔ واقعات کے بیچ و... میرے علم میں تھے لیکن ان دونوں کے جھگڑے میں مجھے ثالث بنایا جا سکتا تھا...... غلطی نما... اسدی صاحب کی تھی کہ انہوں نے میری ناسمجھی میں مجھے ماں کے نام سے بیگانہ کر دیا اور جوا... ہو کر بھی مجھے اپنے اعتماد میں نہیں لیا اور سرد مہری سے اپنا بویا کاٹتے رہے۔

ماں کا تصور میرے دل میں گدگدی پیدا کر رہا تھا اور میں اپنے گرد آلود وجود میں نمایا... تبدیلی محسوس کر رہا تھا۔ دنیا اب مجھے اتنی برف زدہ نہیں لگ رہی تھی ہاں کچھ دوسرے عوامل ... تھے جن پر مجھے سوچنا پڑ رہا تھا۔ مثلاً یہ کہ زمرد جہاں طویل عرصہ سے حکومت وقت کے ... بلیک لسٹ ہیں اور میں ان کا بیٹا ہوں تاہم اس کے لئے کچھ نا ہوگا۔ میں نے اپنی دولت ا... لئے ہالینڈ منتقل کرائی تھی۔

تہران میں داخل ہو گیا۔ اب تک کی زندگی [illegible] کیفیت کا شکار رہی تھی لیکن ا...

...خود اپنی تبدیلیوں سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ ایران کا اپنا مقام تھا اور حاکف خدام سے بارہا ...ان کی تاریخ اور وہاں کی قدیم زندگی پر گفتگو ہو چکی تھی۔ نادیدہ ایران کے بارے میں بھی اتنا ...نا تھا کہ بہت سے لوگوں کو نہیں معلوم ہوگا۔

ایک اعلیٰ درجے کے ہوٹل میں قیام کیا اور وہاں بیٹھ کر حیدر ساوی کی تلاش کا منصوبہ ...یا۔ بالکل مشکل کام نہیں تھا، کسی بھی قانون دان سے ان کے بارے میں معلوم ہو سکتا تھا۔ ...ل کے کمرے میں گھسے رہنا بے کار تھا۔ شام ہو رہی تھی۔ باہر نکل آیا ہلکی کہر میں لا تعداد ...شنیاں جھلملا رہی تھیں۔ پیدل چل پڑا۔ اچھی طرح تھکنے کا ارادہ تھا۔ چنانچہ نہ جانے کہاں ...ے کہاں نکل آیا۔ میدانِ سپاہ سے گزرا تو خیابان فردوسی پر آ نکلا جس کے آخری سرے پر شاعر ...دوسی کا مجسمہ شاہنامے کی جلد تھامے کھڑا تھا۔ بدلے ہوئے تہران کا پرانی داستانوں سے ...ازنہ کرتا ہوا آگے بڑھتا رہا پھر جب تھک گیا تو ایک ٹیکسی روک کر ہوٹل واپس آ گیا لیکن ...مختصر واک میں کام کی جگہ دیکھ لی تھی اور دوسرے دن ان معلومات سے فائدہ اٹھایا۔ سیاہ ...ٹ میں ملبوس ادھیڑ عمر عاطف اکبر نے مجھے بتایا۔

"بہت بڑی ہستی کے مہمان ہیں آپ۔ حیدر ساوی ہمارے استاد ہیں اگر آپ حکم کریں ...ں خود وہاں لے کر چلوں"۔

"شکریہ...... آپ مجھے ان کا پتہ بتا دیجئے"۔

"وہ اپنی قرون کی قیام گاہ میں ملیں گے۔ ان دنوں وہیں مقیم ہیں۔ قرون کوہِ شمران کے ...میں ہے اور شہر سے دو ہزار فٹ کی بلندی پر ہے۔ اصل میں ان دنوں تہران سخت گرم ہے ...ا قرون میں بہار کا موسم ہوگا"۔

"وہاں ان کا پتہ؟"

"میں لکھے دیتا ہوں"۔ عاطف اکبر نے اپنے کارڈ کی پشت پر حیدر ساوی کا پتہ درج کر ...ر خود ایک ٹیکسی روک کر ڈرائیور سے مجھے قرون لے جانے کے لئے کہا۔ مؤدب ڈرائیور ...یکسی آگے بڑھا دی۔

پُر رونق بازار اور بلند عمارتوں کا سلسلہ آہستہ آہستہ پیچھے رہ گیا۔ شہری ہنگامے ختم ہو گئے ...ڑک کے پہلو میں سفر کرتی ندی کی شر شر سنائی دینے لگی جس کے ساتھ پرندوں کی ...ہیں شامل تھیں۔ موسم میں نمایاں تبدیلی محسوس ہونے لگی۔ سڑک کے دونوں سمت پھولوں

اور گھنے سبز چناروں کی قطاریں تاحدِ نگاہ چلی گئی تھیں اوپر سے یہ درخت سر جوڑے ہوئے تھے اور یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے ٹیکسی کسی سرنگ میں سفر کر رہی ہو۔

تہران بہت پیچھے رہ گیا تھا لیکن راستے سنسان نہیں تھے۔ رنگین کاریں جگہ جگہ کھڑی نظر آرہی تھیں۔ سڑک اور پتھریلی چٹانوں کے درمیان سر پٹختے پُرشور دریا کے کنارے درختوں کی چھاؤں میں لوگ پتھروں پر خوشنما قالین بچھائے بیٹھے پکنک منا رہے تھے۔

ڈرائیور نے ٹیکسی مطلوبہ جگہ روک دی۔ 20 ریال ادا کر کے اس خوبصورت عمارت کی طرف بڑھ گیا جو بلندی پر نظر آرہی تھی۔ عاطف اکبر نے مجھے لوکیشن بھی بتا دی تھی۔ بہت ناہموار سیڑھیاں عبور کر کے میں اس بڑے پھاٹک کے پاس آ کھڑا ہو جو اندر سے بند نہیں تھا لیکن آس پاس کوئی نہیں نظر آرہا تھا۔ میں نے ارد گرد نظر ڈالی گھنے درختوں پر پھدکتے پرندوں کے علاوہ کوئی نہیں نظر آرہا تھا۔ دروازے پر اطلاعی گھنٹی بھی نہیں تھی۔ کسی قدر الجھن کا شکار ہو گیا۔ اب کیا کروں؟

حیدر سماوی سے ملنا بے حد ضروری تھا۔ اس کے لئے ہر خطرہ مول لیا جا سکتا تھا۔ یہاں کوئی نہیں تھا۔ اندر ضرور ہوگا۔ زیادہ سے زیادہ معذرت کرنی پڑے گی۔ دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔ بہت خوبصورت جگہ تھی۔ دونوں طرف لوہے کے کٹرے بنے ہوئے تھے جن میں رنگین پرندے پھدک رہے تھے۔ عمارت کا مرکزی دروازہ تھوڑے فاصلے پر تھا۔

"کوئی ہے...... کوئی ہے؟" میں نے رک کر آواز لگائی۔ کچھ فاصلے پر ایک قیمتی اسکارف پڑا نظر آرہا تھا شاید اُڑ کر آگرا تھا۔ میں نے دوسری آواز لگائی۔ اب یہ سکوت کچھ پُراسرار سا لگا تھا، ہو سکتا تھا وہ تنہائی پسند ہوں اور انہوں نے یہاں کسی ملازم کو رکھنا پسند نہ کیا ہو۔

"یہاں کوئی ہے؟" اس بار میں نے دروازے کے بالکل قریب جا کر کہا۔ پھر زور سے تھپتھپایا۔ دروازہ اندر کو دبا اور میں نے دھکا دے کر اسے کھول دیا۔ پھر کسی قدر جھلاہٹ کے عالم میں قدم اندر رکھا اور صدر دروازے سے بھی اندر داخل ہو گیا۔ سامنے ہی سنگِ مرمر کا ایک مجسمہ نظر آیا تھا ایک نگاہ میں وہ مجھے مجسمہ ہی محسوس ہوا تھا۔ کوئی زندہ وجود اس قدر حسین نہیں ہو سکتا تھا۔ باریک سلکی لباس میں ملبوس پتھریلے نقوش اور اس قدر دلکش کہ آنکھوں کو یقین نہ آئے لیکن پھر میں نے اس میں جنبش دیکھی اور میرے حلق سے ایک آواز نکل گئی لیکن میرے حلق سے نکلنے والی دوسری آواز نارمل نہیں تھی۔ گردن کی پشت پر شدید ضرب پڑی تھی

...نے کو اس مہارت سے گردن کے نازک حصے پر مارا گیا تھا کہ آنکھوں میں ستارے ...ہو گئے۔

پھر بھی گھومنے کی کوشش کی دوسری ضرب بھی عین اسی جگہ پڑی اور تمام ستارے ڈوب گئے۔ اپنی تمام تر جسمانی قوتوں کے باوجود میں حواس قائم نہیں رکھ سکا۔ پھر ہوش کی ...ہوئی تو خود کو ایک صاف ستھرے کمرے میں پایا۔ کسی اسپتال کا جنرل وارڈ معلوم ہوتا ...ہے کے فریم والے چند بستر پڑے ہوئے تھے جن میں دو بستروں پر دو بزرگ شخصیتیں ...رہی تھیں۔ وہ دونوں بستر پر پاؤں لٹکائے بیزار بیٹھے تھے، مجھے ہوش میں محسوس کر کے ...نے مجھ پر نگاہ ڈالی اور پھر رخ بدل لیا۔ میں اٹھ کر بیٹھ گیا لیکن وہ دوبارہ میری طرف ...نہیں ہوئے۔ میں خود اپنی جگہ سے اٹھا اور ان کے سامنے آگیا۔ انہوں نے پھر مجھے دیکھا منہ سے کچھ نہ بولے۔

"کیا یہ اسپتال ہے؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں......" ان میں سے ایک نے کہا۔

"پھر کون سی جگہ ہے"

"جہنم......" دوسرے نے بیزاری سے کہا اور میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔

"آپ لوگوں نے بہت سے گناہ کیے ہوں گے"۔ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"ہوش میں آئے ہو...... ابھی چکھو گے...... پیشی کے بعد واپس آؤ تو ہمیں اپنے گناہوں ...رے میں بتانا۔ پھر ہم بھی تمہیں اپنے گناہ بتا دیں گے"۔

"پیشی......؟" میں نے سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھ کر کہا

"دیکھو نہ ہم تم سے گفتگو کرنا چاہتے ہیں نہ تمہارے لئے ذریعہ معلومات بنیں گے۔ براہ ...یں پریشان نہ کرو"۔ ان میں سے ایک نے کہا۔

"کیا تمہیں اس لعنتی شخص کے بارے میں معلوم ہے؟"

دوسرے نے اچانک سوال کیا لیکن میں اس سے کچھ پوچھ بھی نہیں سکا تھا کہ دروازہ کھلا ...ئی اندر داخل ہو گئے۔ وہ پستول تانے ہوئے تھے اور چہروں سے بے حد کرخت نظر تھے وہ سیدھے میری طرف آئے اور انہوں نے پستول سیدھے کر کے مجھے اشارہ کیا۔ دروازے کی سمت تھا۔ وہ منہ سے کچھ نہیں بولے، میں خاموشی سے دروازے کی طرف

بڑھ گیا۔ ایک روشن راہداری سے گزر کر مجھے ایک تنگ کمرے میں لایا گیا تھا جہاں درمیان میں ایک کرسی پڑی ہوئی تھی اور کچھ نہیں تھا۔

مجھے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا گیا۔ میں بے چوں چرا اس پر بیٹھ گیا۔ دونوں پستول بردار میرے دونوں طرف کھڑے ہو گئے۔ چند لمحوں میں ایک دراز قد شخص اسی دروازے سے اندر داخل ہوا اور میرے سامنے آ کھڑا ہوا۔ وہ کڑی نگاہوں سے مجھے گھور رہا تھا۔ پھر اس نے کہا۔

''ہمیں تم سے کچھ معلومات درکار ہیں۔ شرط عائد کی جاتی ہے کہ صرف سچ سنا جائے گا جھوٹ کی سزا بدترین ہوگی۔ کیا تم جواب دینے کے لئے تیار ہو؟''

''نہیں......'' میں نے سکون سے کہا اور وہ چونک پڑا۔ کچھ دیر وہ بول نہ سکا...... غالباً اس جواب کی اسے توقع نہ تھی اور اس کے بعد کے الفاظ اس کے پاس نہیں تھے۔

''تمہارا انکار دیوانگی ہے، تمہیں اس نکار کے بعد کے عوامل کا اندازہ نہیں ہے'' اس نے خود کو سنبھال کر کہا۔

''شاید ایسا ہی ہے''۔

''ٹھیک ہے۔ تمہارے ساتھ جو کچھ ہوگا اس کے ذمے دار تم خود ہو گے۔ اسے آپریشن روم میں لے آؤ۔ کوئی گڑبڑ کرے تو گولی مار کر زخمی کر دو''۔

میں نے آپریشن روم تک آنے میں کوئی گڑبڑ نہ کی البتہ جب انہوں نے مجھے ایک کرسی پر بٹھا کر باندھا تو گڑبڑ کر گیا۔ ہالینڈ میں میرے پاس کرنے کو کچھ نہیں تھا۔ فطرت کچھ ایسی تھی کہ میرے زیادہ دوست نہیں بن سکے تھے۔ حاکف خدام کے علاوہ کسی سے رابطہ نہیں تھا اور ہم دونوں اپنے آپ پر ہی تجربات کرتے رہتے تھے۔ قدیم زبانوں کی تحقیق کے ساتھ قدیم علوم بھی ہمارے زیر نگاہ رہتے تھے اور ہم ان کی حقیقت کا تجزیہ کرتے رہتے تھے۔ چنانچہ کئی ایسی چیزوں کی مشق کی تھی جن کا جدید علوم میں کوئی نشان نہیں تھا۔

مثلاً حواس خمسہ پر فوقیت۔ دماغ کے بیس ہزار خلیوں میں سے صرف چند خلیے زیر عمل ہوتے ہیں باقی خفیہ طور پر باڈی کنٹرول کرتے ہیں اور سب کی تحریک الگ الگ ہوتی ہے۔ ہم نے کچھ اور خلیوں سے شناسائی حاصل کی تھی اور ان سے رابطہ کر لیا تھا۔ حواس خمسہ پر تو ہمارا پورا کنٹرول تھا۔ چھونے کی حس کو سلا دیا جائے تو بدن پتھر کا ٹکڑا ہو جاتا ہے اور ہر اذیت اس کے لئے بے اثر ہوتی ہے۔ سونگھنے کی حس کو ناکارہ کر دیا جائے تو خوشبو اور بدبو بے مقصد۔ دیکھنے کی حس

بند کرلو تو نظر نہ آئے وغیرہ۔ ہم دونوں اس عمل کے ماہر ہو گئے تھے۔

اس وقت کرسی پر بیٹھتے ہوئے میں نے اپنے جسم میں غیر محسوس طریقے سے سانسوں کے ذریعے ہوا کو قید کر لیا تھا اور میرے پورے بدن کی حسیات بڑھ گئی تھیں۔ جو رسیاں میرے پیروں اور بدن سے باندھی گئی تھیں نہ تو میرے جسم کو ان کا احساس تھا نہ میں ان کا قائل تھا۔ بدن کی ہوا خارج کر کے میں انہیں با آسانی ڈھیلا کر سکتا تھا۔ اور خود کو ان سے آزاد کر سکتا تھا۔ میں نے اس وقت صرف یہ کام کیا تھا۔

دو آدمی ان میں اور شامل ہو گئے۔ اب ان کی تعداد چار ہو گئی تھی جن میں وہ دراز قد بھی شامل تھا۔ اس نے سرد لہجے میں کہا۔

''تمہارے بارے میں ہمیں کچھ نہیں معلوم تم کون ہو کیا ہو۔ بہر حال تمہاری ہٹ دھرمی کا نتیجہ ہے۔ تمہاری دلیری کہیں اور تمہارے کام آتی تو بہتر تھی۔ تمہیں اب بھی موقع دیا جائے گا۔ ابتداء ہلکی اذیت سے ہو گی اور پھر تمہاری ضد ہمارے جنون کو ہوا دے گی''۔

''مجھ سے کیا معلومات درکار ہیں؟'' میں نے کہا۔

''کتاب کے اوراق کہاں ہیں؟''

''حیدر سماوی سے تمہارا کیا تعلق ہے''

''اس کے علاوہ؟''

''حیدر سماوی کہاں ہیں؟''

''بس تین سوال؟''

''ہاں......''

''ان کے جوابات تمہیں درکار ہیں یا تمہارے علاوہ کسی اور کو؟''

''گڈ اس کا مطلب ہے کہ تمہیں حالات سے آگاہی ہے۔ بہر حال اس بات کا جواب لازمی نہیں ہے''۔

''ٹھیک ہے۔ اب شروع ہو جاؤ''۔ میں نے کہا اور وہ نہ سمجھنے والے انداز میں مجھے دیکھنے لگا۔

''کیا مطلب؟''

''وہی'' میں نے تمہیں تمہارے سوالات کے جوابات دینے سے منع کر دیا''۔ میں نے کہا

اور وہ مشتعل ہو گیا۔ اس نے جیب سے لائٹر نکال کر اسے روشن کیا اور آگے بڑھ کر اسے میرے پنجے کی پشت پر رکھ دیا۔ لائٹر میرے ہاتھ میں جلتا رہا ہے۔ میں نے تکلیف کے احساس کے خانے کو بند کر لیا تھا اور میرے ہاتھ کی کیفیت ایسی ہی تھی جیسے آگ کسی پتھر کے ٹکڑے پر جل رہی ہو۔ سب کی توجہ اس طرف مرکوز تھی اس لئے میں نے دوسرا عمل کیا۔ بدن سے ہوا خارج کر کے میں نے بندشیں ڈھیلی کر لیں۔ دراز قامت نے لائٹر میرے ہاتھ سے ہٹا لیا پھر بولا۔

''اب میں اسے تمہارے رخسار پر روشن کروں گا اور تمہارا چہرہ بدنما ہو جائے گا۔ پھر اس کے بعد''۔ دراز قامت نے اتنا ہی کہا تھا کہ اچانک دروازے سے وہی لڑکی اندر داخل ہوئی جسے میں نے حیدر سماوی کی رہائش پر دیکھا تھا۔ وہی جسے دیکھ کر احساس ہوتا تھا کہ اس کا تعلق اس بدنما سیارے سے نہیں ہے۔

''مسٹر داور...... مسٹر داور ایک منٹ''۔ اس نے کہا اور دراز قامت اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔ ''ذرا ایک منٹ......'' اس نے اشارہ کیا اور داور میرے پاس سے ہٹ کر اس کے قریب پہنچ گیا۔ لڑکی نے ہاتھ میں پکڑی ہوئی ایک تصویر اس کے سامنے کر دی اور سرگوشی میں کچھ کہنے لگی۔ داور نے تصویر کو دیکھا پھر اس کے چہرے پر ناگواری کے آثار نمایاں ہو گئے تھے۔

مجھے مزید موقع مل گیا اور میں نے پہلے دونوں پاؤں آزاد کئے پھر ہاتھوں کی رسیاں نکال لیں۔ اس کے بعد میں کسی چکنی مچھلی کی طرح پھسل کر بدن کی بندشوں سے آزاد ہو گیا۔ دونوں پستول بردار جیسے ہی میری طرف متوجہ ہوئے میں نے کرسی اٹھا کر پوری قوت سے ان پر دے ماری اور وہ اس کی ضرب سے ایک دوسرے پر ڈھیر ہو گئے۔ میں نے چھلانگ لگائی اور ان دونوں کے پستولوں پر ہاتھ ڈال دیئے۔ باقی لوگ ہکا بکا رہ گئے تھے۔ میں نے فوراً ڈائریکشن بدلی اور دروازے کے مقابل آ گیا۔ اب میرے دونوں ہاتھوں میں پستول ان کی طرف تنے ہوئے تھے۔ میں نے سرد لہجے میں کہا۔

''تم سب ترتیب سے کھڑے ہو جاؤ۔ اپنے ہاتھ بلند کر لو''۔

''اصل میں مسٹر......'' دراز قامت نے کہا چاہا تو میں نے پستول سے فائر کر دیا۔ گولی نے اس کے بازو میں سوراخ کر دیا تھا۔ وہ بازو پکڑ کر درد سے کراہنے لگا۔

''میری، میری تو سن لو۔ کچھ غلط فہمی ہو گئی تھی تم ہمیں معاف کر دو''۔

''ترتیب سے کھڑے ہو جاؤ، دیوار کے ساتھ''۔ میں نے سرد لہجے میں کہا۔ لڑکی سب

سے پہلے بھاگ کر دیوار کے ساتھ جا لگی تھی۔ اس کی آنکھیں خوف سے پھیلی ہوئی تھیں۔ وہ بلا کی ایک خوبصورت گڑیا لگ رہی تھی۔

دوسرے تمام افراد سخت دہشت کے عالم میں دیوار سے جا لگے۔ البتہ وہ زخمی اپنی جگہ کھڑا رہا تھا جس کے بازو میں گولی لگی تھی۔ میں نے پستول سے اسے اشارہ کیا۔

''م...... میں...... اپنے پیروں پر کھڑا نہیں ہو سکتا''۔ اس نے سہمے ہوئے لہجے میں کہا۔

''تو پھر اس بے کار شے کا کیا فائدہ۔ جو اپنا کام سرانجام نہ دے سکے''۔ میں نے پستول کا رخ اس کی طرف کیا تو اس نے دیوار کی طرف چھلانگ لگا دی اور دوسروں کے ساتھ جا کھڑا ہوا۔

''وری گڈ!'' میں نے مسکرا کر گردن ہلا دی۔

''مجھ پر رحم کرو...... میں زخمی ہوں۔ خون تیزی سے بہہ رہا ہے۔ زیادہ خون بہہ گیا تو میں مر جاؤں گا''۔ زخمی گڑگڑا کر بولا اور میں نے اپنے ہاتھ کی پشت اس کے سامنے کر دی۔

''یہ کیا ہے، کیا یہ گوشت پوست سے بنا ہوا انسانی ہاتھ نہیں ہے''۔ میرے ہاتھ کے جلے ہوئے زخم دیکھ کر ان کے چہرے جھک گئے۔ میں ان کے چہروں کو پڑھ رہا تھا۔ بہت معمولی سے پشیمان ہوئے تھے وہ لیکن لڑکی کافی متاثر نظر آ رہی تھی۔

''جو کچھ تم کر چکے ہو اس کے عوض سودے بازی ہو سکتی ہے...... گڑیا تم آگے آؤ''۔

''م...... میں......'' لڑکی رندھی ہوئی آواز میں بولی۔

''ہاں تم...... آؤ آگے آؤ''۔ میں نے اشارہ کیا تو لڑکی لرزتے قدموں سے آگے بڑھ آئی۔ ''تم لوگوں کے علاوہ یہاں اور کتنے افراد ہیں؟''

''اور نہیں ہیں''۔ وہ منمنائی۔

''جھوٹ!''

''نہیں اور کوئی نہیں ہے''۔

''چلو اعتبار کر لیا۔ اب تم یوں کرو کہ ان سب کے ہاتھ پاؤں رسی سے کس کر باندھ دو، کچھ یہ ٹکڑے استعمال کر لو جو مجھے باندھنے کے لئے استعمال کئے گئے تھے۔ عقب میں اور رسی بھی پڑی ہے لیکن گڑیا! انہیں اس طرح باندھنا جیسے انہوں نے مجھے باندھا تھا۔ ورنہ...... چلو''۔ آخر میں میری کڑک ابھری تھی اور لڑکی نے رسی کی طرف چھلانگ لگا دی تھی۔ زخمی کو رسی

باندھتے ہوئے اس نے البتہ میری طرف دیکھا تھا۔

"پہلے اس کے زخم پر کوئی کپڑا کس دو۔ اس کے بعد اسے رسی سے باندھ دو"۔ پھر اس کے بعد میری ہدایات پر مکمل عمل ہو گیا تو میں نے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

"اب تم ان کے پاس انہی کی طرح بیٹھ جاؤ"۔ وہ خاموشی سے یہاں جا بیٹھی۔ میں نے سب سے پہلے وہ تصویر اس شخص سے حاصل کی جو لڑکی لے کر اندر داخل ہوئی تھی۔ یہ ایک شخص کی تصویر تھی جو مجھ سے بہت مختلف تھی۔ لڑکی نے بے اختیار کہا۔

"ہم اس کے دھوکے میں تمہیں لے آئے ہیں"۔

"دلچسپ، لیکن درمیان سے نہیں"۔

"دیکھو جو غلطی ہم سے ہو گئی ہے ہم اس کا تمہاری خواہش کے مطابق ازالہ کرنے کو تیار ہیں"۔ اس بار ایک مرد نے کہا۔

"یقیناً تمہیں ازالہ کرنا ہو گا"۔

"بولو کیا چاہتے ہو؟"

"کچھ سوال کرنے ہیں، تم سے"......

"پوچھو......"

"اوراق کے علاوہ بقیہ کتاب کہاں ہے؟" میں نے سوال کیا اور ان کے چہرے ہونق ہو گئے۔ وہ سب ایک دوسرے کی صورت دیکھنے لگے۔ میں نے ایک پستول جیب میں رکھا اور ہاتھ میں لئے آگے بڑھا۔ ان کی خوفزدہ نگاہیں میرے ایک ایک قدم کا جائزہ لے رہی تھیں۔ میں نے دراز قامت ہی کو نشانہ بنایا اور پستول کی نالی اس کی پیشانی پر رکھ کر اس کی جیب سے ایک خوبصورت لائٹر نکال لیا جس نے اپنے شعلے کا نشان میرے ہاتھ پر کندہ کر دیا تھا۔ لائٹر روشن کر کے میں نے اس کے چہرے پر ٹھوڑی کے نیچے لگا دیا۔ وہ ایک لمحہ بھی شعلے کی آگ برداشت نہیں کر سکا اور اس کے حلق سے ایک دل خراش چیخ نکلی۔ میں نے لائٹر ہٹا لیا اور آہستہ سے کہا۔

"یہ نمونہ تھا۔ تم نے کہا تھا کہ شعلہ میرے رخسار کو بدنما کر دے گا۔ میرا خیال ہے مؤثر اور کارآمد دھمکی نہیں تھی۔ میں اس بار جب لائٹر روشن کروں گا تو تمہارے داہنی آنکھ کو نشانہ بناؤں گا اور یہ آنکھ ہمیشہ کے لئے اپنی بینائی کھو بیٹھے گی اور اگر تم اس تکلیف کو میری برداشت کر گئے تو پھر تمہاری دوسری آنکھ کو نشانہ بناؤں گا"۔

میں نے کہا اور لائٹر کو جنبش دی اور وہ دہشت زدہ انداز میں چیخ پڑا۔

"خدا غارت کرے دن ہی برا تھا کہ کتاب...... کتاب کی نشاندہی کر دی جائے گی، یہ لڑکی جانتی ہے کہ وہ کتاب کہاں ہے"۔ دراز قامت آدمی نے کہا۔

"اور تم یقیناً جھوٹ نہیں بول رہے ہو گے؟"

"ہاں میں نے سچ کہا ہے"۔

"کیوں لڑکی؟" میں لڑکی کی جانب دیکھا اور اس نے اتنی زور زور سے ہاں میں گردن ہلائی کہ مجھے لطف آ گیا۔

"ٹھیک ہے۔ میرا دوسرا سوال، حیدر سماوی کہاں ہیں؟"

وہ لوگ ایک بار پھر حیرت زدہ رہ گئے اور دراز آدمی نے گلوگیر آواز میں کہا۔

"جناب امیر کی قسم! اگر ہمیں اس بارے میں معلوم ہوتا تو ہم تم سے یہ سوال کیوں کرتے، ہمیں علم نہیں ہے۔ ہم بالکل نہیں جانتے۔ ہم تو انہی کی تلاش میں ان کی رہائش پر گئے تھے لیکن وہیں دستیاب نہ ہو سکے اور تم وہاں آ گئے۔ ہمیں علم تھا کہ یہ شخص جس کی تصویر تم نے ابھی دیکھی ہے، حیدر سماوی کے لئے کام کر رہا ہے اور ایک طرح سے ان کے باڈی گارڈ کی حیثیت رکھتا ہے۔ ہم تمہیں اس کے دھوکے میں پکڑ کے لے آئے جبکہ ہمیں یہ تصویر بعد میں دستیاب ہوئی۔ اس وقت جب ہم تمہارے بارے میں تفصیلات معلوم کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ چنانچہ ہمیں نہیں معلوم کہ حیدر سماوی کہاں ہیں۔ آہ...... اگر تم مناسب سمجھو تو میرا ہاتھ کھول دو میں جلی ہوئی جگہ پر شدید تکلیف محسوس کر رہا ہوں"۔

میرے ہونٹوں پر سفاک مسکراہٹ پھیل گئی۔ میں نے کہا۔

"بے جا مطالبات میرے جنون کو ہوا دیں گے۔ اس لئے صرف اتنی بکواس کرو جس کا میں متحمل ہو سکوں اور یہ بتاؤ حیدر سماوی سے تم لوگوں کا کیا تعلق ہے؟" میں نے وہی سوال ان سے کئے تھے جو انہوں نے مجھ سے کئے تھے۔ ان میں سے ایک نے کہا۔

"ہمارا ان سے براہِ راست کوئی تعلق نہیں ہے۔ ایک بہت بڑی شخصیت کے لئے ہم کام کر رہے ہیں، اور ہم تک یہ احکامات مختلف ذرائع سے پہنچتے ہیں۔ یوں سمجھ لو کہ ہم تو کرائے کے لوگ ہیں اور ہمیں صرف یہ ہدایات دی گئی تھیں کہ یہ کتاب حیدر سماوی سے حاصل کر لی جائے۔ کس شخصیت کو اور کیوں اس کتاب کی حاجت تھی وہ ہمارے علم میں بالکل نہیں ہے۔ ہم

نہیں جانتے کہ وہ کون ہے لیکن ایک ایسا شخص جس کا نام احترام علوی ہے اس کتاب کو حاصل کرنے کے لئے ہمیں معقول معاوضہ دے چکا ہے۔ اگر تم چاہو تو ہم تمہیں احترام علوی کا پتہ دے سکتے ہیں اور بس۔

جب ہم نے یہ کتاب حاصل کی اور احترام علوی کو پیش کی تو اس نے کتاب ہمارے منہ پر مار دی اور کہا کہ اسے مکمل کر کے لائیں۔ اس کتاب کے کچھ اوراق غائب تھے اور وہ وہی اوراق ان لوگوں کو درکار ہیں جو اس کتاب کو حاصل کرنے کے لئے ہمیں بہت بڑا معاوضہ ادا کر رہے ہیں۔ ہمارا ایک چھوٹا سا گروہ ہے جو انہی افراد پر مشتمل ہے اور ہم بڑے بڑے لوگوں کے لئے ایسے کام سرانجام دیتے ہیں ورنہ عام حالات میں ہم ایک باعزت حیثیت کے مالک ہیں۔ اس سے زیادہ اگر کوئی اور بات تمہارے علم میں آجائے تو تم ہر وہ سلوک کرنے کے حق دار ہو جو تمہاری پسند کے مطابق ہو"۔ دراز قامت آدمی نے کہا اور میں اسے گھورتا رہا۔ میں نے اس بات پر غور نہیں کیا تھا کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے یا سچ۔ یہ تو ایک تفریحی عمل تھا ایک چھوٹا سا انتقام جو مجھے ان لوگوں سے لینا تھا لیکن کتاب میرے لئے باعث دلچسپی بن گئی۔ میں نے لڑکی سے کہا۔

"گڑیا مجھے وہ کتاب درکار ہے"۔

"میں ابھی لے کر آتی ہوں"۔ وہ جلدی سے اٹھ کر کھڑی ہوئی۔

"ارے نہیں...... نہیں۔ ایسے کہاں گڑیا۔ تم باہر جاؤ گی ٹیلی فون پر کسی کو اطلاع دو گی اس کے بعد وہاں سے غائب ہو جاؤ گی۔ ظاہر ہے سب سے پہلے تمہیں اپنی زندگی بچانے کی کوشش کرنا ہوگی۔ چلو میں تمہارے ساتھ چلتا ہوں"۔

"میں ایسا نہیں کروں گی، لیکن تم چلو"۔ وہ بولی اور میں نے گردن ہلا دی۔ پھر میں اس لڑکی کے ساتھ باہر آیا اور وہ مجھے لئے ہوئے راہداریاں عبور کر کے آخر کار بڑے کمرے میں پہنچ گئی۔

مکان کافی خوبصورت تھا اور اعلیٰ درجے کے فرنیچر سے آراستہ تھا۔ کمرے میں ایک الماری تھی جس کے عقب میں ایک پوشیدہ تجوری بھی تھی۔ میں نے لڑکی سے زیادہ فاصلہ نہیں رکھا تھا اور پستول کی نال اس کی کمر میں چبھوتا رہا تھا کیونکہ عین ممکن تھا کہ الماری سے دوسرا پستول بھی برآمد ہو جائے یا کوئی ایسی شے جس کی موجودگی مجھے نقصان پہنچائے لیکن لڑکی

نا پائے کی شخصیت نہیں معلوم ہوتی تھی۔

ویسے بھی اس کی حرکات سے اس کی عمر کے مطابق بچکانہ پن جھلکتا تھا۔ اس نے تجوری میں ہاتھ ڈال کر ایک لفافہ نکالا جو چمڑے سے بنا ہوا تھا اور پھر اس لفافے میں سے اس نے ایک کتاب نکال کر میرے سامنے کر دی جس پر نہایت نفیس اور قیمتی جلد بنی ہوئی تھی۔ میں نے وہیں اس کتاب کو کھول کر دیکھا۔ ایک قلمی نسخہ تھا لیکن زیادہ قدیم نہیں تھا۔ فارسی زبان میں لکھا ہوا تھا۔ بہر حال اس کی تفصیل کیا تھی۔ یہ فوری طور پر یہاں جاننا ضروری نہیں تھا لیکن میرے ذہن میں جس منصوبے نے سر ابھارا تھا میں اس کی تکمیل میں مصروف تھا۔

میرے اشارے پر لڑکی نے تجوری بند کی اور ہم لوگ واپس اس کمرے میں آگئے۔ دروازہ کھول کر اچانک اندر داخل ہوئے تو وہ تمام لوگ اچھل پڑے جو یہاں قید تھے۔ میں نے ان افراد کو پشت سے پشت ملائے ہوئے دیکھا اور میرے ہونٹوں پر زہریلی مسکراہٹ پھیل گئی۔

"غالباً تم لوگ ایک دوسرے کی بندشیں کھولنے کی کوشش کر رہے تھے لیکن میں تمہیں بتاؤں کہ یہ تمہارے حق میں بہتر رہا کیونکہ اگر تم میں سے کسی ایک کے بھی ہاتھ کھل جاتے تو میں اس پستول کی دو گولیاں اس کے سینے میں اتار دیتا۔ لڑکی نے چونکہ بد عہدی نہیں کی اور تم لوگوں کو مناسب طریقے سے باندھا ہے اس لئے میں اسے دل احترام دیتا ہوں اور اب تم سے میرا آخری سوال ہے۔ یہ بتاؤ یہ کون سی جگہ ہے اور جہاں سے تم نے مجھے اغوا کیا ہے وہاں سے اس کا کتنا فاصلہ ہے؟"

"عزیزی یہ قرون ہی کا علاقہ ہے اور ہم ترائیوں سے تھوڑے فاصلے پر اس جگہ مقیم ہیں جہاں سے قرون کا بڑا علاقہ شروع ہوتا ہے۔ تم اسے کوہ خدام کا دامن کہہ سکتے ہو"۔

"اس عمارت میں کوئی ایسی گاڑی موجود ہے جس سے میں واپسی کا سفر کر سکوں؟"

"ہاں...... باہر ایک لینڈ کروزر کھڑی ہوئی ہے"۔

"اس کی چابی......"

"میری جیب میں ہے"۔ ایک خوفزدہ شخص بول اٹھا۔ وہ لوگ مجھ سے پوری طرح مسحور ہو گئے تھے اور کافی خوفزدہ نظر آ رہے تھے۔ میں نے آگے بڑھ کر اس شخص کی جیب سے چابی نکال اور اس کا جائزہ لینے کے بعد اسے جیب میں رکھ لیا۔ پھر میں نے انہیں تہران میں اپنے ہوٹل کا پتہ بتاتے ہوئے کہا۔

"میں اس ہوٹل کے کمرے میں مقیم ہوں۔ یہ کتاب میں اپنے ساتھ لئے جا رہا
جس سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں۔ یوں سمجھ لو کہ یہ صرف تمہارے اس غلط اقدام کی سزا ہے
نے میرے ساتھ کیا اور میرا وقت بھی ضائع کیا۔ مجھے حیدر ساوی کی تلاش ہے۔ ایک
عام سلسلے میں جس کا کسی لڑائی سے کوئی تعلق نہیں۔ اگر تم اس کتاب کا حصول چاہتے ہو
میرے پاس تمہاری امانت کے طور پر ہے۔ اس کے اوراق کا مجھے کوئی علم نہیں، تم انہیں حا
کرنے کے لئے جو چاہو وہ کر سکتے ہو لیکن اگر حیدر ساوی مل جائے تو دس منٹ کے لئے تم
پر اس سے بات کرا دو۔ یہ کتاب تمہاری امانت ہے۔ میں اس سے کوئی دلچسپی نہیں رکھتا یہ تم
واپس مل جائے گی۔

سمجھ رہے ہو ناں، میری بات۔ یہ بطور ضمانت ہے اور اس وقت تک مجھ تک پہنچ
کوشش مت کرنا جب تک حیدر ساوی تمہیں نہ مل جائیں اور تم ٹیلی فون پر مجھ سے ان کی
نہ کرا دو۔ نمبر تمہارے پاس موجود ہے۔ اب میں چلتا ہوں۔ یہ لڑکی تمہاری بندشیں کھول
گی"۔ میں نے اسے اجازت دی۔

"لیکن خبردار کسی غلط نیت سے مجھ تک آنے کی کوشش مت کرنا اور حیدر ساوی کے حـ
سے پہلے اس کتاب کو طلب بھی نہ کرنا۔ سمجھ رہے ہو۔ ورنہ اپنی زندگی کے زیاں کے خود
دار ہو گے"۔ میں نے کتاب کا لفافہ سنبھالا اور وہاں سے واپس پلٹ پڑا۔ جاتے ہوئے
نے باہر کا دروازہ بند کر دیا تاکہ یہ لوگ فوری طور پر میرا تعاقب کرنے کی کوشش نہ کریں
میں راستوں کو خود تلاش کرتا ہوا باہر نکل آیا۔ سیاہ رنگ کی قیمتی لینڈ کروزر کے بارے میں
ان کی اطلاع غلط نہیں تھی اور وہ جس ذہنی کیفیت کا شکار ہو گئے تھے وہ غلط اطلاعات کے
نہیں ہو سکتے تھے۔

میں نے لینڈ کروزر کا دروازہ کھولا اور اسے سٹارٹ کر کے چل پڑا۔

تاحدِ نظر تاریکی اور سناٹے کا راج تھا۔ سڑکیں سنسان تھیں۔ راستوں کا صحیح طور
اندازہ نہیں تھا لیکن سڑکیں کہیں نہ کہیں لے ہی جایا کرتی ہیں اور ایک مناسب سفر کرنے
بعد میں شہری آبادی میں داخل ہوا تو پہلے ہی مرحلے پر مجھے یہ معلوم ہو گیا کہ یہ تہران ن
لیکن میں احمق نہیں تھا۔ لینڈ کروزر کو ایک مناسب جگہ پارک کیا، وہاں سے ٹہلتا ہوا آگے
اور کچھ دیر بعد ایک ٹیکسی نے کافی رات گئے مجھے میرے ہوٹل کے دروازے پر پہنچایا۔

لباس وغیرہ تبدیل کرنے کے بعد میں نے اپنے ہاتھ پر اس زخم کا نشان دیکھا۔ میں
اپنے ذہن کو حکم دیا تھا کہ ہاتھ کے اس زخم کو تکلیف کو محسوس نہ کیا جائے اور اس حکم کی
تعمیل ہو رہی تھی لیکن اب اتنی رات گئے ظاہر ہے اس زخم کا کوئی علاج میرے لئے ممکن
تھا۔ پھر بھی میں نے پہلے اس پر ایک رومال لپیٹا اور بستر پر دراز ہو گیا اور اس کتاب کا
ورق کھول لیا۔ فارسی کی یہ تحریر با آسانی میری سمجھ میں آ رہی تھی اور میں اوراق الٹتے ہوئے
کے موضوع کا اندازہ لگا رہا تھا یہ امیر ایران کی سوانح عمری تھی۔

لیکن سوانح عمری کا انداز نہیں تھا بلکہ امیر سے متعلق کسی گمنام اور پُراسرار شخص کی یادداشتیں
جو شاید امیر سے گہری قربت اور دوستی رکھتا تھا اور اس کے تمام خفیہ رازوں سے واقف تھا
عام پر نہیں آتے تھے۔ کتاب کی تحریر انتہائی دلچسپ تھی اور میں ان اوراق میں اس طرح
ہوا کہ رات گزرنے کا کوئی احساس بھی نہ ہو سکا۔ پھر میں اس جگہ پہنچا جہاں سے کتاب
اوراق پھٹے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ ان اوراق کا تخمینہ میں نے تقریباً 14 صفحات لگایا اور
کے بعد کتاب مسلسل تھی لیکن جو اوراق گم تھے وہ واقعی اہمیت کے حامل تھے تاہم یہ سارا
میرے لئے قطعی طور پر باعثِ دلچسپی نہیں تھا۔

پھر میں اس وقت چونکا جب دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے جلدی سے کتاب
کر رکھی اور تکئے کے نیچے رکھا ہوا پستول اٹھا لیا جو میری ملکیت نہیں تھا۔ اس پستول کو
ہاتھ میں چھپا کر میں نے دروازے کی جانب دیکھا اور پھر اپنی جگہ سے اٹھنے کی کوشش ہی
تھا کہ دروازہ آہستہ سے کھلا اور میری نگاہیں آنے والے کی جانب اٹھ گئیں۔ یہ ہوٹل کا
جو صفائی کا سامان ہاتھ میں لئے ہوئے اندر داخل ہوا تھا۔

اس نے لیمپ کی طرف دیکھا پھر میری طرف لیکن دروازے سے روشنی کا جو طوفان
ل ہوا تھا اس سے مجھے یہ احساس ہوا کہ دن خاصا چڑھ چکا تھا اور دن کے اس حصے میں
روشنی دیکھنے والے کو اتنا ہی متحیر کر سکتی ہے۔ تاہم سب سے پہلے میں نے ان دونوں
کو چھپانے کا بندوبست کیا جو دیکھ لئے جاتے تو خواہ مخواہ بات کا بتنگڑ بن جاتا۔ پھر
لے کے سلام کا جواب دے کر اس سے کہا۔

"تم اپنا کام جاری رکھو، بستر بعد میں درست کر دینا میں دیر سے جاگنے کا عادی ہوں"۔
"معافی چاہتا ہوں جناب"۔ اس نے مؤدب لہجے میں کہا اور صفائی کرنے لگا۔ دوسرا

آدمی تھوڑی دیر کے بعد آیا اور گلدان میں نئے پھول لگا کر چلا گیا۔ پھر وہ اپنے کام سے فا
ہوئے تو میں نے بھی بستر چھوڑ دیا۔ غسل وغیرہ کیا اس کے علاوہ اشیاء جن کی حفاظت مقصو
چھپانے کے لئے میں نے مناسب جگہ تلاش کی اور اپنے طور پر انہیں محفوظ کر دیا۔

میں ان لوگوں کو چیلنج کر کے آیا تھا اور یقینی طور پر سپر مین نہیں تھا کہ اگر وہ آجاتے تو ہ
ہر قیمت پر شکست ہی دے دیتا۔ بس ایک ایسا داؤ چلایا تھا میں نے کہ ممکن تھا مجھے حیدر
کے بارے میں تفصیلات معلوم ہو جاتیں ویسے یہ مرحلہ خاصہ مشکل ہو گیا تھا اور جو واقعات
سلسلے میں پیش آئے تھے وہ میرے مقصد سے بالکل میل نہیں کھاتے تھے۔

اس کام کے لئے میرے دل میں جو تپش ہو سکتی تھی بلکہ مجھے تو جلد از جلد اپنا مقص
تھا اور اس کے لئے میں مناسب صورتِ حال کا تعین کرنا چاہتا تھا۔ بہر حال تمام معمو
سے فارغ ہونے کے بعد ناشتا طلب کیا اور ناشتا کرنے بیٹھ گیا۔ نہ جانے ذہن کے گو
میں کیسے کیسے تصورات ابھر رہے تھے، میری شخصیت پر سے وہ خول کچھ وقت کے لئے ہٹا
بچپن سے مجھے پر مسلط تھا۔ ایک ایسے نام کی زندگی کی خبر ملی تھی جو شاید میرے دل میں د
بن کر خاموش بھی ہو گیا تھا لیکن اب...... اب بلا وجہ اس میں مشکلات پیدا ہو رہی تھیں۔

کون سا ایسا ذریعہ ہو سکتا ہے جس سے مجھے صحیح صورتِ حال کا علم ہو سکے اور بغیر کسی
کے یہ معلوم ہو سکے کہ زمرد جہاں کہاں ہے۔ بہر طور اب یہ فیصلہ کرنا تھا کہ آئندہ اقدا
ہوں گے؟ مامون رضا اگر دوبارہ رجوع کرنے کی کوشش کرتا تو یہ بھی ایک بے مقصد عمل
نہ جانے کیا قصہ ہے اور اس کتاب کے سلسلے میں حیدر سماوی کیوں الجھ گیا ہے؟ بہت دیر تک
معاملات پر بیٹھا سوچتا رہا۔ ذہن کے گوشوں میں بہت سے خیالات آ رہے تھے۔

لیکن پھر اچانک ایک خیال نے ذہن میں جگہ پائی اور میں اس پر غور کرنے لگا۔ کتا
نوعیت اور اہمیت کچھ بھی ہو، اگر حیدر سماوی کسی ایسے مسئلے میں الجھ گیا ہے تو پہلی بات تو
اپنی رہائش گاہ پر نہیں ملے گا۔ دوسری بات یہ کہ قرون میں اس کی وہ رہائش گاہ بڑی محفوظ
کی حامل ہے اور جب اسے تلاش کرنے والے اسے وہاں نہ پا کر مایوس ہو گئے ہوں
وقت حیدر سماوی کے لئے اس سے بہتر اور کوئی ٹھکانہ نہیں ہو سکتا۔ وہ عمارت اتنی زیادہ
قدر مستحکم ہے کہ اگر حیدر سماوی ایک ذہین آدمی ہے تو وہ اس عمارت میں اپنی رہائش کو ترج
گا۔ بلکہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس وقت بھی وہ اسی عمارت میں موجود ہو۔ اب اسے تلاش

ناکامی کا سامنا کر چکے ہوں اور میں اتفاقیہ طور پر ہی وہاں پہنچ گیا تھا۔ یہ خیال میرے ذہن
کافی پختگی اختیار کرتا چلا گیا اور اس خیال کی تکمیل کا عمل یہ تھا کہ میں قرون کا رخ کروں اور
کے لئے میں نے دوپہر کے بعد کا وقت متعین کیا۔ شام کو پانچ بجے نکلنا سب سے موزوں
گا اور اس وقت تک ہوشیاری سے ان لوگوں کے فون کا بھی انتظار کر لیا جائے تو کوئی حرج
۔ چنانچہ شام تک کا بقیہ وقت میں نے ہوٹل میں اپنے کمرے میں ہی گزارا۔ طبیعت پر کچھ
ن بھی مسلط ہو رہی تھی لیکن کیا کیا جا سکتا تھا۔ وقت جن حالات کی ترتیب کرتا ہے ان میں
لی آسان نہیں ہوتی۔

تیاریوں کے بعد پانچ بجے میں اپنے معمول کی رہائش گاہ سے باہر نکل آیا۔ اب مجھے
ن تک جانے کے راستے معلوم ہو چکے تھے چنانچہ ٹیکسی مجھے ایک بار پھر لے کر اسی عمارت
جانب چل پڑی۔ البتہ اس بار پہلے سے زیادہ محتاط رہنا ضروری تھا اور میں نے ٹیکسی کو ایک
جگہ چھوڑ دیا جہاں سے ٹیکسی ڈرائیور بھی کسی کو یہ نشاندہی نہ کر سکے کہ میں کہاں اترا ہوں۔
میں نے چاروں طرف کا جائزہ لینے کے بعد اپنے قدم اسی عمارت کی جانب بڑھا دیئے۔
پُراسرار اور سنسان عمارت سناٹے میں ڈوبی ہوئی تھی۔ شام کے سائے اس پر لرز رہے
۔ موسم کی کیفیت کچھ عجیب سی تھی اور ایک پُراسرار خاموشی پر مسلط تھی۔ میں نے عمارت میں
لے کے لئے بھی ایسی جگہ کا انتخاب نہیں کیا جہاں سے عمارت کے کسی مکین کو میرے بارے
معلومات حاصل ہو سکیں بلکہ عمارت میں داخل ہونے کے لئے میں نے تھوڑی سی محنت اور
ت کے ساتھ ایک ایسی بہتر اور مناسب جگہ تلاش کر لی جہاں سے عمارت میں داخلہ تھوڑا سا
ما بے شک تھا لیکن ناممکن نہیں۔

ایک مفروضے پر اتنی محنت کر ڈالنا ہو سکتا ہے ایک عام آدمی کے لئے ایک احمقانہ عمل ہو
عمل اس وقت بھی اپنی کاوش، اپنی محنت سے بد دل نہیں تھا۔

بہر حال عمارت میں، میں نے ایک ایسی جگہ منتخب کی جہاں سے میں دور دور تک کا جائزہ
سکوں اور مجھے کوئی نہ دیکھ سکے۔ شرط یہی ہے کہ کسی کو یہاں میری آمد کے بارے میں علم
ا ہو۔ اپنی جانب سے تو بھرپور کوشش کر لی تھی کہ ہر نگاہ سے پوشیدہ رہوں لیکن بہر حال
ے کی عقل بھی اہمیت رکھتی ہے ممکن ہے کوئی ماحول سے روشناس رہنے کے لئے اس سے
بہتر اور منتخب جگہ رکھتا ہو۔

پھر میں یہاں ایک طویل وقت گزارنے کے لئے تیار ہو گیا۔ میں جانتا تھا کہ اس عمارت میں کوئی بھی ایسا شخص نہیں جو مداخلت کرے لیکن اس کے باوجود احتیاط زندگی میں ہمیشہ کارآمد رہتی ہے بشرطیکہ اسے صحیح جگہ اختیار کیا جائے۔ ایک جگہ ساکت بیٹھے رہنا جس قدر مشکل کام ہو سکتا ہے شاید اس کا اندازہ نہ کیا جا سکے لیکن صبر کرنا میری عادت تھی اور میں بڑے سکون کے ساتھ یہاں منٹ اور گھنٹے گزارنے لگا۔

سورج چھپ گیا، تاریکی ہو گئی اور پھر رات کے سفر کا آغاز...... میں بہت سے مسائل سوچ رہا تھا اور سوچیں وقت گزاری کا بہترین ذریعہ ہوتی ہیں۔ چنانچہ بہت سا وقت گزر گیا۔ میں ہنس بھی رہا تھا اپنے آپ پر لیکن کسی کام کے لئے اگر ایک رات صرف کر دی جائے تو قیامت نہیں ٹوٹ پڑتی اور پھر کام بھی ایسا جس کا تعلق میری زندگی کے سب سے اہم پہلو سے تھا۔

خیر اس طرح بہت سے گھنٹے گزر گئے۔ میری کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی مجھے وقت کے بارے میں بتا رہی تھی اور اصولی طور پر اب اتنا وقت ہو گیا تھا کہ اس کے بعد میرا یہاں ٹھہرے رہنا حماقت کے سوا کچھ نہیں تھا۔ دور دور تک نگاہیں دوڑانے کے باوجود مجھے کوئی ایسی شخصیت نظر نہیں آئی تھی اور نہ ہی کسی ایسی آہٹ کے سننے کا اتفاق ہوا تھا جس سے یہ احساس ہوتا اس بھوت گھر میں کسی بھوت ہی کی موجودگی کی توقع کی جا سکے۔ پھر میں نے اپنی جگہ چھوڑ دی

اب اصولی طور پر مجھے اس عمارت کا جائزہ لینا چاہیے تھا۔ کم از کم پچاس فیصد اندازہ گیا تھا کہ عمارت خالی ہے اور حیدر سماوی نے اس انداز میں نہیں سوچا جس انداز میں میں سوچا۔ یعنی وہ یہاں نہیں آیا ہے حالانکہ ایک ایسی جگہ جہاں دشمن مایوس ہو گئے ہوں، رہائش کیلئے سب سے بہتر ہوتی ہے لیکن بہرحال ہر شخص کا اندازِ فکر مختلف ہوتا ہے اور ضروری نہیں حیدر سماوی میری ہی لائنوں پر سوچے، سو میں نے اپنی جگہ سے ہٹنے کے بعد عمارت میں قدم رکھ دیا اور ایک طویل راہداری سے گزرنے لگا۔ پھر اچانک ہی مجھے عجیب احساس ہوا۔ راہداری کے فرش پر روشنی کی ایک ہلکی سی چمک تھی لیکن میرے قدموں کی آواز نہ ہونے کے برابر تھی، شاید سن لی گئی اور وہ چمک معدوم ہو گئی لیکن میری حساس نگاہوں نے لکیر کا جائزہ لے لیا تھا جو دور سے آئی تھی اور ختم ہو گئی تھی۔ میں اس لکیر کے مرکز کو اپنے ذہن میں بٹھا چکا تھا۔ تب میں اپنی جگہ پر ساکت ہو گیا۔ میرا دل خوشی سے اچھل رہا تھا کہ کم از کم میرے ایک اندازے کی تصدیق ہو گئی یہاں کوئی ذی روح ضرور موجود ہے اور جو شخص

رہے میں بلکہ کسی ایسے کمرے میں مدھم روشنی جلا کر بیٹھا ہے یہاں سے دور دور کا جائزہ لیا ہے تو اس کا مقصد ہے کہ وہ اس کمرے کی افادیت سے باخبر ہے لیکن اب اسے دھوکہ دینے کے لئے ایک طویل اور صبر آزما وقت ضروری تھا۔ وہ ستون جس کی آڑ میں، میں نے اپنے آپ کو ساکت کر لیا تھا، اس جگہ سے کوئی ساٹھ گز کے فاصلے پر تھا جہاں سے روشنی کی رمق آئی تھی اور یقینی طور پر کسی حساس شخص نے اپنے کانوں سے میرے قدموں کی یہ ہلکی سی آہٹ بھی سن لی تھی اور محتاط ہو گیا تھا لیکن اب طویل اور صبر آزما وقت گزار کر اس کے شبہ کو غلط ثابت کرنا تھا اور یہی کامیابی کی دلیل تھی۔

ستون کے پاس کھڑے کھڑے میرا سر کسی ایسی چیز سے ٹکرایا جس سے ہلکی سی چٹ کی آواز ہوئی تھی۔ میں نے فوراً ہی اپنا سر وہاں سے ہٹایا اور ہاتھ کو اس جگہ رکھا جہاں سے یہ آواز آئی تھی۔

یہ سوئچ بورڈ تھا جس پر مختلف سوئچ لگے ہوئے تھے اور یقیناً ان سے روشنی ہو سکتی تھی۔ وہ تو شکر ہے کہ میرا سر ایک ایسے سوئچ سے ٹکرایا تھا جس کا اپنے مرکز سے کنکشن نہیں تھا ورنہ پھر بھانڈا پھوٹ جانا تھا۔

میں نے جلدی سے واپس اسے اسی کی جگہ دبا دیا لیکن چٹ کی یہ آواز بھی ان حساس کانوں کے لئے شک کا باعث بن گئی ہوگی۔ اب جو کچھ ہوا ہے وہ تو ہو ہی چکا ہے۔ محتاط انداز میں کھڑے رہنا ہی کامیابی کی دلیل ہو سکتی ہے ورنہ اگر حیدر سماوی یہاں موجود ہے تو پھر وہ اس طرح چھپا ہوگا کہ دوبارہ شاید میں اسے تلاش نہ کر سکوں۔

میں نے اپنی سانسوں پر قابو پا لیا تھا اور اتنی آہستگی سے سانس لے رہا تھا کہ خود میرے کانوں کو ان کی آواز محسوس نہ ہو سکے ورنہ رات کے سناٹے میں سانسوں کی بازگشت بھی آرام سے سنی جا سکتی ہے۔

جس شخص کے حساس کانوں نے میرے قدموں کی چاپ سن لی تھی، وہ یقیناً ایک صلاحیت انسان تھا لیکن اب میری باری تھی۔ میں اپنے طور پر اسے دھوکہ دینے کی کوشش کر رہا تھا اور یقیناً اتنی طویل خاموشی کے بعد اس کے ذہن میں یہ تجسس ضرور پیدا ہوا ہوگا کہ میری طرف سے دوبارہ تحریک کیوں نہیں ہوئی چنانچہ اب میرے کان ادھر کی آواز پر لگے ہوئے تھے۔

پھر مجھے ہوا کی سرسراہٹوں نے احساس دلایا کہ کوئی دروازہ کھلا ہے۔ اس نفیس کوٹھی کے

دروازے بے آواز تھے لیکن بس ایک احساس تھا جس نے مجھے محتاط کر دیا تھا اور پھر میرا یہ شبہ یقین میں تبدیل ہو گیا۔ قدموں کی وہ چاپ کسی بھی طرح میری چاپ سے زیادہ نہیں تھی تاہم وہ اپنی تیز تیز سانسوں قابو نہیں پا سکا تھا۔ قدموں کی چاپ اور اس کا تیز تنفس میں محسوس کر رہا تھا اور میری خصوصی صلاحیتیں اس شخص کا تصور کر رہی تھی جو آہستہ آہستہ اسی راہداری کی سمت آ رہا تھا۔ نیز یہ کہ میری آنکھیں اندھیرے میں دیکھنے کی عادی ہو چکی تھی۔ اس لئے اب میں اس کے سائے کو بھی بخوبی دیکھ رہا تھا جو دیوار کے ساتھ ساتھ چپکا ہوا آگے بڑھتا ہوا آ رہا تھا

اگر یہ حیدر سمادی ہے تو اس کا تعلق وکالت کے شعبے سے ہے۔ ایک وکیل ایسے مشکل حالات میں اگر اپنے پاس اسلحہ رکھے اور اسے استعمال کرنے کے بارے میں سوچے تو اس اپنا انداز کیا ہو گا۔ یقینی طور پر وہ اسلحے کا ماہر تو نہیں ہو گا۔ اس نے اپنے داہنے ہاتھ میں پستو پکڑ رکھا ہو گا اور اسے اپنے جسم سے تقریباً ایک فٹ آگے کئے ہوئے ہو گا۔ اس کا قد پانچ ف دس انچ کے اندر اندر ہے تو اس کے ہاتھ کی بلندی کیا ہو سکتی ہے۔ میں ان تمام چیزوں جائزہ لے رہا تھا۔

ہو سکتا ہے وہ حیدر سمادی ہو لیکن اگر اس کے ہاتھ میں پستول ہے اور وہ ایسے شخص کو د ہے جو اس کے لئے اجنبی ہے تو موجودہ حالات کے تحت وہ پستول کو فوراً استعمال کرنے دریغ نہیں کرے گا۔ اس کے علاوہ اگر وہ میری رینج میں آتا ہے اور میں اتفاقیہ طور پر دریاف ہونے والے اس سوئچ بورڈ سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتا تو ظاہر ہے یکے بعد دیگرے ا ایک سوئچ دبانے کی صورت میں مجھے اتنے لمحات گزر جائیں گے کہ وہ میرا نشانہ لے ہاں اس کا ایک طریقہ یہ ہو سکتا ہے کہ ان تمام سوئچ پر ایک کھڑا ہاتھ اس طرح مارا جائے اس راہداری میں موجود روشنی کا جو بھی سوئچ ہو، وہ اس کی زد میں آ جائے چنانچہ میں اس لئے بھی تیار ہو گیا۔ میرا اپنا پستول میرے ہاتھ میں تھا اور میں نے اب سانس مکمل طور پر روک لیا تھا۔

اس وقت میں اپنے مدِ مقابل کہیں بہتر پوزیشن میں تھا۔ پہلے اسے مجھ پر شبہ ہوا تھا وہ محتاط ہو گیا تھا لیکن اب اس نے اس خیال کو متزلزل کر دیا تھا اور وہ یقین کی منزل سے تھا۔ اس کے قدم آہستہ آہستہ میری طرف آ رہے تھے۔ یہاں تک کہ وہ میرے سامنے گزرا اب مجھے تین مرحلے پوری کامیاب سے طے کرنے تھے۔

پہلے مرحلے میں، میں نے ہاتھ سیدھا کر کے سوئچ بورڈ پر مارا۔ دوسرے مرحلے میں پلٹ لگائی، تیسرا مرحلہ سب سے مشکل تھا اور اس کے لئے مجھے دقیقہ درکار تھا اور بھی۔ پہلے عمل نے راہداری کو بقعہ نور بنا دیا۔ زمین پر گرنا بے حد کامیاب رہا کیونکہ دیگرے دو فائروں کی آواز ابھری اور گولیاں دیوار پر لگیں۔ اگر مدِ مقابل ہتھیار کے استعمال ایکسپرٹ ہوتا تو اسے وقفے کے بغیر تیسرا فائر ضرور کرنا چاہئے تھا اور نشانہ بدل کر لینا تھا لیکن اناڑی کھلاڑی ایک دم اپنے عمل کا نتیجہ جاننے کے خواہشمند ہوتے ہیں اور انتظار تے ہیں جبکہ ایسی سچویشن میں تیسرا فائر ہی سب سے کامیاب ہوتا ہے کیونکہ شکار اپنی ہار چکا ہوتا ہے اور عام حیثیت میں آ جاتا ہے۔

بہر حال مدِ مقابل نے اسی کمزوری کا اظہار کیا اور میں نے اپنی مہارت دکھا دی۔ بے شک کام تھا کہ میری چلائی ہوئی گولی صرف پستول کی نالی چھوئے اور اس ہاتھ کو نقصان نہ پہنچے پستول ہو، لیکن ایسا ہی ہوا اور ایسا کیسے ہوا؟ یہ ایک طویل داستان ہے بلکہ میری زندگی کی تان کا تعلق ہی اس نکتے سے ہے اور آگے چل کر میں اس بارے میں تفصیل بتاؤں گا۔

پستول اس کے ہاتھ سے نکل گیا اور اس کی پھٹی پھٹی آنکھیں مجھ پر گڑ گئیں لیکن ان آنکھوں ن نہیں تھا، ایک عجیب سی چمک تھی۔

"ہیلو!" میں نے سرد لہجے میں کہا لیکن اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ میرے اندازے الق وہ سو فیصد حیدر سمادی تھا۔ ہر پیشے کے لوگوں کا ایک انداز ہوتا ہے۔ پروفیسر اپنی ے پہنچانا جاتا ہے۔ ڈاکٹر لائر، سب کا اپنا اپنا انداز ہوتا ہے اور یہ شخصیت خود بخود بن ہے۔

"آپ کیلئے خطرہ اب بھی باقی ہے اور سر اس سے بہتر ہے کہ آپ بہت جلد کوئی مناسب کرلیں۔ میں آپ کے ان دشمنوں میں سے نہیں ہوں جو آپ کو نقصان پہنچانا چاہتے ہیں"۔

"پھر کون ہو تم؟" اس نے حیرت انگیز پھرتی سے اپنے آپ کو سنبھال لیا تھا۔

"تعاون کریں مجھ سے، یہاں اس سچویشن میں سب کچھ جاننے کی کوشش نہ کریں"۔

"مجھے پاگل سمجھتے ہو"۔ وہ غرایا اور میرا پارہ چڑھ گیا۔

"چلو!" میں نے سرد لہجے میں کہا اور پستول کی نال کو گردش دی۔ وہ ایک لمحہ مجھے گھورتا کھلی سی ہنسی ہنس پڑا۔

"ایکسپوز ہو گئے ناں۔ ایک لمحے میں کھل گئے ناں۔ میرے بھی خواہ میرے دور
کہاں چلوں؟ بولو"۔
"وہاں جہاں تھے"۔
"اوہ تمہارا خیال ہے......" اس نے بات درمیان میں چھوڑ دی۔ پھر پلٹتا ہوا بولا
"آؤ......" میں نے سوئچ بورڈ پر پھر ہاتھ مارا اور تاریکی پھیل گئی لیکن اس کے ساتھ ہی
ساوی زمین پر لوٹ لگا دی۔ اس نے وہ پستول تاک رکھا تھا جو اس کے ہاتھ سے گرا
لیکن وہ مجھ سے زیادہ مہارت کا ثبوت نہ دے سکا یا اندھیرا ہونے کی وجہ سے اس
اندازے کی غلطی ہو گئی۔ جبکہ میں نے غلطی نہیں کی اور میری ٹھوکر نے پستول کو کیرم کے اسٹرائیکر
کی طرح دور پھینک دیا۔
"اس عمر میں شعبدہ گری زیب نہیں دیتی۔ تم مجھے مسلسل نقصان پہنچانے کی کوشش میں
سرگرداں ہو۔ جبکہ میرے ہاتھوں تمہیں ابھی تک کوئی نقصان نہیں پہنچا۔ مجھے تم سے ایک
معمولی سا کام ہے اور میں...... اٹھو...... کھڑے ہو جاؤ۔ میرے غصے کو آواز نہ دو......"
میں نے جھک کر اسے کمر سے پکڑ کر اٹھایا اور اسے پہلی بار احساس ہوا کہ میری جسمانی
قوت کیا ہے پھر میں تقریباً سیدھا ہو گیا۔
"کہاں چلوں......؟"
"اس جگہ جسے تم محفوظ سمجھتے ہو"۔
"کس کے لئے؟"
"اپنے اور میرے دونوں لئے"۔
"اب شاید کوئی جگہ محفوظ نہیں"۔ وہ پھٹی پھٹی آواز میں بولا۔
"کیوں"۔
"اس لئے کہ تم یہاں بھی پہنچ گئے"۔
"میں پہنچا ہوں، دوسرے نہیں"۔ میں نے کہا۔
"تم اکیلے ہو؟"
"ہاں کیوں......؟ میں نے سوال کیا لیکن اس نے اس سوال کا جواب نہیں دیا اور
بڑھ کر ایک کمرے میں داخل ہو گیا۔ چھوٹا سا کمرہ تھا جس میں بے شمار کتابیں بھری

ہیں۔ فرش پر، الماریوں میں شیلف ہی شیلف تھے لیکن وہ ان کے درمیان سے گزر کر ایک
بوسیدہ شیلف تک پہنچا اور پھر اسے گھما کر ایک دروازہ بنا لیا۔ یہ بے حد وسیع کمرہ تھا۔ ٹھنڈا اور
پُرسکون، بہترین فرنیچر سے آراستہ۔ شیلف سے نمودار ہونے والا دروازہ خود بخود بند ہو چکا تھا۔
خفیہ کمرے کے اندر اتنی مناسب روشنی تھی کہ ہم دونوں بہ آسانی ایک دوسرے کو دیکھ
سکتے تھے۔
"اب کیا کروں؟" اس نے کسی قدر طنزیہ لہجے میں پوچھا۔
"آرام سے بیٹھ جاؤ"۔
"شکریہ"۔ وہ بیٹھ گیا۔
"میں نہیں جانتا مسٹر حیدر ساوی کہ آپ جیسا معزز شخص کس الجھن میں گرفتار ہے۔ آپ
ایک باعزت پیشے سے منسلک ہو کر کن مجرموں کے جال میں پھنسے ہوئے ہیں۔ امیر کی زندگی
سے متعلق اس کتاب کا کیا کھیل ہے۔ جس کے کچھ اوراق آپ کے پاس موجود ہیں اور کوئی
انہیں حاصل کرنے کے لئے کوشاں ہے۔ بہر حال نہ مجھے اس کتاب سے دلچسپی ہے نہ اوراق
سے......"
"تو کیا تم؟"
"ہاں میری کہانی عجیب ہے۔ میں آپ سے معلومات حاصل کرنے کیلئے آیا تھا کہ مشکل
میں گرفتار ہو گیا"۔
"اوہ...... میرے خدا کل...... وہ...... تم تھے؟"
"کیا مطلب؟"
"کیا کل تمہیں یہاں سے اغوا کیا گیا تھا؟"
"ہاں آپ جانتے ہیں؟"
"میں یہیں پوشیدہ تھا"۔
"ویری گڈ، آپ ایک ذہین انسان ہیں"۔
"لیکن پھر تم کون ہو؟"
"آپ پُرسکون ہوں تو میں آپ کو بتاؤں۔ نہ صرف تفصیل بتاؤں بلکہ حسبِ ضرورت
آپ کی مدد بھی کروں۔ اگر آپ جرائم پیشہ افراد کے خلاف پولیس وغیرہ کی مدد چاہیں تو میں

اس کے لئے عمل بھی کر سکتا ہوں''۔

حیدر سماوی اب مجھے غور سے دیکھ رہا تھا۔ غالباً اب وہ اپنے تجربے کی آنکھ استعمال کر رہا تھا۔ پھر اس نے کہا۔

''مجھے بتاؤ تم کون ہو؟''

''میں دوسرے ملک سے آیا ہوں۔ یہاں میں نے عاطف اکبر نامی ایک شخص سے، جس کا تعلق آپ کے پیشے سے ہے اور جو آپ کا بے حد احترام کرتا ہے، آپ کے بارے میں معلوم کیا تو پتہ چلا کہ آپ اس وقت اپنی قرون والی رہائش گاہ پر مقیم ہیں۔ میں ٹیکسی لے کر یہاں پہنچا اور آپ کے اس مکان میں آوازیں دیتا ہوا اندر داخل ہوا لیکن یہاں کچھ لوگ موجود تھے۔ انہوں نے مجھے دھوکے سے زخمی کیا اور اغوا کر کے لے گئے''۔

''کہاں......؟'' حیدر سماوی نے بے اختیار پوچھا۔

''یہیں قرون کی ایک عمارت میں''۔

''تم اس کے بارے میں جانتے ہو؟''

''جائے وقوعہ جانتا ہوں''۔

''اس عمارت کو پہچان سکتے ہو؟''

''ہاں''۔

''اوہ، معاف کرنا میں درمیان میں مداخلت کر بیٹھا ہوں۔ آگے بتاؤ''۔

''جب میں ہوش میں آیا تو انہوں نے مجھ سے تین سوال کئے''۔

''کیا؟'' وہ دلچسپی سے بولا۔ اب اس کے چہرے پر بے حد اشتیاق کے آثار نظر آ رہے تھے۔

''پہلا سوال تھا کہ کتاب کے اوراق کہاں ہیں؟ دوسرا سوال تھا کہ حیدر سماوی سے تمہارا کیا تعلق ہے؟ اور تیسرا سوال تھا کہ حیدر سماوی کہاں ہیں؟''

''خوب''۔ وہ ہاتھ ملاتا ہوا بولا۔

''بہر حال میں ان سے بچ کر نکل آیا۔ مجھے پریشانی ہو گئی تھی کہ یہ سب کیا ہے؟''

''تم ان کے چنگل سے کیسے نکلے؟''

''میں......! ان میں سے ایک زخمی ہو گیا تھا باقی کو میں نے معاف کر دیا کیونکہ وہ بھی غلطی کا شکا ہو گئے تھے اور انہوں نے مجھے یہاں کسی اور کے دھوکے میں پکڑ لیا تھا''۔

حیدر سماوی نے تعریفی نظروں سے مجھے دیکھا پھر بولا۔

''تم دوبارہ یہاں کیسے آئے؟''

''بس یہی خیال تھا کہ آپ کے لئے اب اس سے محفوظ کوئی جگہ نہیں ہو گی''۔

''اوہ......شاید......تم بے حد ذہین نوجوان ہو۔ مجھ سے کیا کام تھا؟''

''ایک پتہ درکار ہے جس کے لئے میں آپ سے ملنا چاہتا تھا''۔

''بتاؤ، کیسا پتہ درکار ہے؟''

''خاتون زمرد جہاں ان کا نام ہے۔'' میں نے کہا اور حیدر سماوی کے چہرے کے عضلات کھنچ گئے ایک لمحے کے لئے یوں محسوس ہوا جیسے وہ سکتے میں آ گیا ہو لیکن خود کو سنبھالنے کا ماہر تھا۔ اس نے خود کو نارمل کیا اور بولا

''کیا کام ہے ان سے؟''

''آپ ان کے بارے میں کتنا جانتے ہیں؟''

''طویل عرصے کا ساتھ ہے، ایک زمانہ تھا کہ......مگر وہ امیر کے دور کی بات ہے''۔

''آپ نے کبھی نعمان اسدی کا نام سنا ہے؟''

''ہاں وہ شخص زمرد جہاں کا شوہر تھا''۔

''اور ان دونوں میں علیحدگی ہو گئی تھی''۔

''ہاں......''

''وجہ کا علم ہے......؟''

''ہاں اس شخص کا گھرانہ کچھ غیر مہذب تھا۔ زمرد جہان بڑی چاہت سے وہاں گئی تھی لیکن ان کے ساتھ بہتر سلوک نہیں ہوا اور وہ بددل ہو گئی۔ سب یکساں لگے، یہاں اپنے ملک میں زمرد جہاں نے نعمان اسدی کے ساتھ بہترین سلوک کیا تھا اور اس کے کاروبار کو عروج دیا تھا لیکن جب زمرد جہاں بددل ہو گئی اور اسدی اس کے بیٹے کو لے کر فرار ہو گیا تو امیر کا زوال ہو گیا ورنہ، اسدی کو لینے کے دینے پڑ جاتے''۔

''ہوں''۔ میں نے گہری سانس لی، پھر کہا۔ ''نعمان اسدی کا انتقال ہو گیا''۔

''اوہ...... مجھے علم نہیں، مگر......تم......تم کون ہو......اور......؟''

''میں احمد اسدی ہوں......''

''اسدی خاندان سے ہو......؟''

''ہاں......؟''

''کیا تعلق ہے نعمان اسدی سے؟''

''ان کا بیٹا ہوں''۔

پہلے تو حیدر ساوی نے ان الفاظ پر غور نہیں کیا۔ پھر اس پر بم بلاسٹ ہو گیا۔ اس کی کیفیت کچھ ایسی ہی ہو گئی تھی۔

''بیٹے......یعنی اس کی اور زمرد جہاں کی اولاد؟''

''ہاں......اور اب اپنی ماں سے ملنے آیا ہوں۔ اسدی صاحب کے وکیل نے مجھے بتایا تھا کہ زمرجہاں کا پتہ مجھے آپ سے مل سکتا ہے''۔

''ہاں یقیناً کیوں نہیں......کیوں نہیں میرا بھی تم سے گہرا تعلق ہے......اہم تعلق''۔

''وکیل نے مجھے بتایا تھا''۔

''میرے بچے ہو تم میری اولاد کی مانند ہو''۔ حیدر ساوی نے کہا اور ایک عجیب سے اضطراب کا شکار نظر آنے لگا۔ میں نے اس کا چہرہ دیکھا اور مجھے ایک عجیب سا احساس ہوا۔ اس کی آنکھوں میں جرم جھانک رہا تھا جبکہ چہرے کے تاثرات مختلف تھے۔ اس نے کہا۔

''لیکن تم میرا......میرا مطلب ہے''۔

''ایک سوال حیدر ساوی''۔

''ہاں پوچھو''

''آپ کا اس خاندان سے کیا تعلق ہے؟''

''میں اس کا قدیم بہی خواہ ہوں۔ امیر کے دور میں اس کے تمام قانونی امور کا نگران میں ہی تھا۔ جب تمہارے والد تمہیں لے کر چلے گئے تو میں نے تمہارے حصول کے لئے بڑی کوششیں کی تھیں لیکن انہی ایام میں امیر زوال پذیر ہو گئے اور بہت سے مسائل کھڑے ہو گئے''۔

''خاتون زمرد جہاں کہاں ہیں؟''

''وہ اسی اسلامی ملک کے ایک شہر میں......وہ......آہ میرے بچے تم سے مجھے مل کر کتنی خوشی ہوئی ہے۔ تم بے شک اپنی ماں سے مل لینا لیکن مجھے سرخرو ہونے کا موقع دو''۔

''میں سمجھا نہیں''۔

''خوشی کی یہ خبر میں انہیں سناؤں گا''۔

''میں بے تاب ہوں''۔

''میں بھی زیادہ وقت صرف نہ کروں گا۔ ہمیں اس وقت ایک ایک پیالی کافی کی اشد ضرورت ہے''......

''کافی؟''

''یہاں اس کا انتظام ہے۔ مجھے بس چند لمحوں کی مہلت دو''۔ وہ میرے جواب کا انتظار کیے بغیر اٹھا اور باہر نکل گیا۔ میں نے اس کی چال پر بھی غور کیا تھا۔ بدن کے ہر عضو کی ایک زبان ہوتی ہے۔ پورا بدن بولتا ہے۔ زبان الفاظ تراشتی ہے۔ دماغ زبان کو ان کی ساخت دیتا ہے لیکن باقی اعضاء خیالات کی ترجمانی کرتے ہیں بشرطیکہ ان کی زبان سمجھنے کی صلاحیت ہو۔ اس وقت حیدر ساوی بے ترتیب تھا۔

اس کے خیال اور عمل میں ہم آہنگی نہیں تھی۔ اس کا عمل مشکوک تھا۔ کیوں، کافی، یہ ایک ناب گفتگو میں کافی کہاں سے داخل ہو گئی۔ اور پھر میری خواہش کے بغیر......یہ کافی گڑبڑ ہے۔

اب میرا ذہن ہدایات دینے لگا اور میں نے اس کے مشورے سے کچھ فوری فیصلے کیے۔ حیدر ساوی کو واپسی میں کوئی پانچ منٹ لگے تھے۔ وہ کافی کے برتنوں کے ساتھ اندر آیا تھا۔ پھر اس نے ایک پیالی میں کافی انڈیل کر مجھے دی اور دوسری خود لے کر کچھ فاصلے پر جا بیٹھا۔

میں اس دوران بندوبست کر چکا تھا ایک گلدان اٹھا کر میں نے اپنی نشست کے پاس ایسی جگہ رکھ لیا تھا جہاں سے وہ نظر نہ آ سکے۔ پھر میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔

''ایکسیوزمی مسٹر ساوی......مجھے تھوڑا سا پانی درکار ہے۔ آپ براہ کرم مجھے یہ بتا دیجیے کہ......''

''اوہ ہو......میں لاتا ہوں تم کہا جاؤ گے''۔

''نہیں مجھے شرمندہ نہ کریں''۔

''جی......ایک منٹ''۔ حیدر ساوی نے کہا وہ باہر نکل گیا۔ اس کے باہر جاتے ہی میں نے کافی کی پیالی اٹھائی، اسے سونگھا۔ مجھے اندازہ ہو گیا کہ کافی سے اٹھنے والی بھاپ میں کافی کے علاوہ کسی اور شے کی بھی بہت ہلکی سی بو ہے۔ میں نے مسکرا کر کافی اس کی جگہ رکھ دی۔ حیدر ساوی ایک گلاس اور ٹھنڈے پانی کا جگ لے آیا تھا۔ میں نے اس سے جگ لے کر ایک

گلاس پانی پیا لیکن اس میں بھی میں نے احتیاط کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا۔

حیدر سماوی نے اپنی پیالی سے کافی کے چند گھونٹ لئے۔ میں نے پیالی اٹھا کر ہ
سے لگائی لیکن اپنے فن کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس سے ایک گھونٹ بھی نہیں لیا جس کا ا
نہیں ہو سکا۔ میں نے کہا۔

''میری ماں کی صحت کیسی ہے؟''

''بہتر ہے''۔ حیدر سماوی بولا۔

''شاید یہ بات آپ کو معلوم نہ ہو کہ نعمان اسدی نے مجھے میری ماں کی موت کی خبر دی

''کیا مطلب؟'' حیدر سماوی چونک کر بولا۔

''مجھے اب سے چند روز قبل یہ معلوم نہیں تھا کہ میری والدہ حیات ہیں اور جب مجھے
کا علم ہوا تو میں بے چین ہو گیا۔ میں نے پیالی دوبارہ ہونٹوں سے لگائی۔ بالکل غیر م
انداز سے اس کا محلول گلدان میں گراتا جا رہا تھا۔

''یقیناً ایسا ہی ہوگا لیکن زمرد جہاں نے اپنے لئے بڑے غلط راستے منتخب کئے۔ کا
ایسا نہ کرتیں''۔

''کیسے غلط راستے؟'' میں نے آواز میں تھوڑی سی لکنت پیدا کر کے کہا۔

''ہمارے خاندان برسوں سے یکجا تھے، بڑی ہم آہنگی تھی۔ ہمارے درمیان لیکن
جہاں نے انوکھے کھیل شروع کر دیئے''۔

''کیا؟''

''امیر کی کہانی ختم ہو چکی ہے۔ گڑے مُردے اکھاڑنے سے کچھ حاصل نہیں ہوتا لیکن
نے ایک تحریک کا آغاز کیا ہے۔ کچھ حاصل نہ ہوگا اسے اس تحریک سے۔ پہلے میں نے ا
سمجھایا لیکن اس نے مجھ سے بیر باندھ لیا۔ میں اس ملک کا ایک قانون داں ہوں اور اس
مفادات مجھ پر فرض ہیں۔ مجھے ایک ایسی کتاب کا علم ہوا ہے جس میں امیر کی سوانح حیا
درج کی گئی تھی۔ اس میں ایسے انکشافات تھے جن سے امیر کی موت کے باوجود ایک تحر
کا انکشاف تھا۔ میں نے کتاب کے حصول کے لئے جدوجہد کی اور اسے پا لیا لیکن پھر؟''

وہ رکا اس نے چونک کر مجھے دیکھا۔ مجھے احساس ہوا کہ وہ مجھ پر غور کر رہا ہے۔
کے اندازے کے مطابق مجھے اب تک بے ہوش ہو جانا چاہئے تھا حالانکہ میں بے ہوش

ہوا۔ یہ کہانی مجھے عجیب لگ رہی تھی لیکن صبر سے کام لینا تھا۔ پیالی کی بقیہ کافی فرش پر گری پھر
پیالی نیچے گر گئی اور آخر مجھے زمین پر آنا پڑا۔

میں بے سدھ ہو کر گر گیا۔ حیدر سماوی نے فوراً اپنی پیالی نیچے رکھی اور کھڑا ہو گیا۔ پھر وہ
میری طرف لپکا تو میں نے آنکھوں کی وہ جھری بند کر لی جس سے میں اس کی حرکات کا جائزہ
لے رہا تھا۔ وہ میرے قریب آ بیٹھا اور اس نے طاقت لگا کر مجھے سیدھا کر دیا۔ ایک لمحہ میرا
جائزہ لیتا رہا۔ پھر برق رفتاری سے اپنی جگہ سے اٹھا اور باہر نکل گیا۔ اب مجھے یہ فیصلہ کرنا تھا
کہ اس کے بعد کیا کروں۔ اصل میں، میں یہ جائزہ لینا چاہتا تھا کہ مجھے بے ہوش کر کے وہ کیا
کرنا چاہتا ہے۔ ابھی یہی سوچ رہا تھا کہ باہر جا کر اسے دیکھوں کہ وہ واپس آ گیا۔ اس کے
ہاتھوں میں رسی تھی۔

''گڈ......'' میں نے سوچا، حیدر سماوی صاحب ذہین ہیں۔ وہ قریب آ گئے۔ طاقت لگا کر
مجھے اوندھا کیا۔ پھر مزید طاقت سے میرے دونوں ہاتھ پشت پر کئے جس میں انہیں شدید
پریشانی کا سامنا کرنا پڑا کیونکہ میں ہاتھوں کی ایسی ڈائریکشن نہیں دینا چاہتا تھا کہ انہیں مکمل
کامیابی حاصل ہو جائے۔ ان سے جو بن پڑا کیا۔ پھر پیروں کی جانب متوجہ ہو گئے۔

وہ اس مشقت سے ہانپنے لگے۔ بہر حال فارغ ہو گئے۔ اس کے بعد انہوں نے آگے کا
ل کیا۔ وہ فون کے قریب پہنچے اور نمبر ڈائل کرنے لگے۔ کچھ دیر انتظار کیا۔ پھر بولے،

''خاتون زمرد جہاں سے بات کراؤ! بکواس مت کرو انہیں بتاؤ میں حیدر سماوی بول رہا
ں۔ ہاں حیدر سماوی''۔ پھر کوئی ایک منٹ تک مکمل خاموشی رہی۔

''ہاں...... میں ہی ہوں زمرد جہاں...... مجھ سے زیادہ کون تمہارے بارے میں جان سکتا
ہے۔ چھوڑو ان باتوں کو تم نے تو شاید ساری زندگی دوستوں کو دشمن سمجھا ہے''۔ اور دوسری طرف
ی آواز سنتا رہا پھر بولا۔

''عقل کا فتور ہے دیکھو! اگر میں دشمن ہوتا تو اس قدر جدوجہد نہ کرتا۔ سیدھا قانون کا
ارا لیتا اور تم جانتی ہو، یہ انکشافات حکومت کے لئے کتنی اہمیت کے حامل ہوتے، مجھے کیا کیا
زازات نہ ملتے لیکن تمہارے خاندان سے، تم سے یہ میری دوستی ہی ہے جس نے مجھے اس
ت سے باز رکھا...... ہاں زمرد جہاں، غور کرو...... غور کرو...... بے وقوف ہو تم غلط مقصد چنا
تم نے اپنی زندگی کے لئے۔ نقصان اٹھاؤ گی۔ کچھ نہیں بگاڑ سکو گی تم اور تمہاری تنظیم حکومت

کا...... بھٹک گئے ہو تم لوگ...... میں جانتا ہوں تم کس کے لئے کام کر رہے ہو۔ کون تمہاری ڈور ہلا رہا ہے۔ اس کے جال میں نہ آؤ۔ زمرد جہاں، تمہیں خود بھی معلوم ہے کہ وہ لوگ کیا چاہتے ہیں۔ ٹھیک ہے۔ زمرد جہاں...... ٹھیک ہے...... اس سے زیادہ وفا شعار نہیں ہو سکتا میں محبِ وطن ہوں۔ اپنے وطن کو سازشوں سے بچانا چاہتا ہوں۔ اس تنظیم کے خاتمے کے لئے میری مدد کرو۔ پلیز زمرد جہاں، اچھا ٹھیک ہے۔ زندگی میں دوسرے بے شمار مشغلے ہوتے ہیں۔ میں بھی مجبور ہوں۔ ابھی تک میں نے قانون کا سہارا نہیں لیا لیکن لگتا ہے تم مجھے مجبور کرو گی...... تم سے کچھ اور کہنا چاہتا ہوں، ہاں...... بیٹا اسے بھول گئیں؟ جوان ہو چکا ہے۔ شاندار ہے۔ خوبصورت ہے۔ اپنے باپ کی طرح...... اتفاق سے میرے پاس ہے...... ہاں جھوٹ نہیں بول رہا۔ تمہاری تلاش میں آیا ہے۔ نعمان اسدی مر چکا ہے اور اب وہ ماں کو تلاش کر رہا ہے۔ نہیں زمرد جہاں میں جھوٹ نہیں بول رہا۔ بالکل سچ کہہ رہا ہوں۔ ہاں اس وقت بھی وہ میرے پاس ہے۔ میں نے اسے بے ہوش کر دیا ہے''۔

''تفصیل جاننے دو زمرد جہاں...... ہم جن حالات سے گزر رہے ہیں، وہ تمہارے پیدا کردہ ہیں، اُفوہ...... دل چاہے تو یقین کر لو ورنہ تمہاری مرضی ہے۔ ہاں!...... وہ ہے اور میں اسے تمہارے حوالے کرنا چاہتا ہوں۔ نہیں زمرد جہاں یہ فریب نہیں ہے۔ بخدا بالکل سچ کہہ رہا ہوں میں...... ہاں وہ کتاب میرے حوالے کر دو۔ وہ کتاب میرے حوالے کر دو۔ اوراق میرے پاس ہیں۔ نہیں، مجھے پوری کتاب درکار ہے۔ نہیں، زمرد جہاں یہ ممکن نہیں ہے...... جانتی ہو میں ضدی انسان ہوں۔ کیا فائدہ تمہیں بیٹے کے نام پر سامنے آنا پڑے ممکن ہے وقت گزر جائے...... کیا...... تم اتنی سنگدل ہو۔ افسوس...... تمہاری مرضی، چلو ٹھیک ہے۔ میں تم سے آخری بار رابطہ کروں گا اور تمہارے بیٹے سے تمہاری بات کراؤں گا۔ پھر بھی تمہارے اندر تبدیلی رونما نہ ہوئی تو...... میں اپنے اخلاقی فرض سے بری الذمہ ہو جاؤں گا۔ او کے...... خدا حافظ''۔

اس نے فون بند کر دیا لیکن مجھ پر حیرتوں کے لاتعداد دروازے کھل گئے تھے اور میں اس گفتگو سے حالات کا تجزیہ کر رہا تھا۔ میرے دل میں کچھ اور عجیب احساسات جنم لے رہے تھے۔ بہرحال میں نے اپنا عمل کیا اور موقع پاتے ہی تھوڑی سی کوشش سے بندشوں سے نجات حاصل کر لی لیکن اسی طرح پڑا رہا جیسے پڑا تھا۔

حیدر سماوی دیر تک فون کے پاس بیٹھا کچھ سوچتا رہا۔ پھر ایک ٹھنڈی سانس لے کر اٹھا اور میری طرف بڑھا۔ تب میں اٹھ کر بیٹھ گیا اور حیدر سماوی کے حلق سے حیرت آواز نکلی۔ وہ دم بخود رہ گیا تھا۔ میں نے اپنے پاؤں سے کھلی ہوئی رسیاں ایک طرف ڈال دیں اور سرد لہجے میں کہا۔

''ایک طرف بیٹھ جاؤ''۔

''خدایا، خدایا''۔ اس کے منہ سے نکلا اور وہ بیٹھتا چلا گیا۔ میں آگے بڑھا اور میں نے بازو سے پکڑ کر اٹھایا پھر ایک کوچ پر لے جا کر بٹھا دیا۔

''تم بے شک ایک تجربے کار انسان ہو لیکن ایک غلطی کی ہے تم نے۔ وہ یہ کہ میرے بارے میں صحیح اندازہ نہیں لگا سکے۔ اپنی دانست میں مجھے بے ہوش کر کے تمہیں سب سے پہلے پستول کو قبضے میں کرنا چاہیے تھا''۔

''تم...... تم بے ہوش نہیں ہوئے تھے؟''

''نہیں......''

''لیکن کافی میں بڑی سریع الاثر دوا تھی۔ اتنی طاقتور کہ ایک گھوڑے کو بے ہوش کر دے''۔

''کافی، میری طلب نہیں تھی''۔

''کیا مطلب؟''

اس کی زبردستی پیشکش اور میری خواہش کے بغیر اس کی تیاری کے لیے نکل جانا ایک غیر ...ئل تھا''۔

''اوہ......'' وہ آہستہ سے بولا۔

''پیالی کی کافی اس گلدان میں ہے''۔

''اور رسیاں؟'' اس نے بے اختیار پوچھا۔

''میں نے تمہیں اپنی کہانی سنائی تھی۔ یہ زخم اس کا ثبوت ہے اور میں ان کے درمیان سے نکل آیا تھا''۔

''تو پھر......؟''

''اس سے تمہیں میری کارکردگی پر غور کرنا چاہیے تھا''۔ میں نے کہا اور حیدر سماوی مجھے دیکھنے لگا۔ پھر اس کے ہونٹوں پر بے اختیار مسکراہٹ پھیل گئی۔

''خدا تمہیں زندگی دے، یہ صلاحیت تم نے کہاں سے حاصل کی ہے؟''

"بے مقصد سوال ہے"۔

"نہیں، بے مقصد نہیں ہے۔ یہ ذہانت، یہ عمل، غیر معمولی ہیں۔ کہاں پرورش پائی ہے؟"

"میں نے کہا نا، اس کا جواب نہیں دوں گا"۔

"زندگی میں کبھی اپنی ماں سے ملے ہو؟"

"نہیں"۔

"وہ دیوانگی کی حد تک سخت گیر ہے، تمہارے والد سے مفاہمت ہو سکتی تھی اس کی لیکن......"

"اب وہ باب بند ہو چکا"۔

"ہاں، ماں سے ملو گے؟"

"ضرور ملوں گا، لیکن وہ کہانی مکمل کرو گے تم جو ادھوری رہ گئی تھی"۔

"ہاں...... اب میں خوشی سے تمہیں وہ کہانی سناؤں گا۔ تم نے میرے تجربے کو شکـ دی ہے"۔

"کہانی سناؤ"۔ میں نے کہا۔

"تم ماں کی طرح سخت گیر، بے تاثر، کسی احساس کا اظہار نہ کرنے والے ہو۔ جبکہ تمہارا با ایک نرم خو انسان تھا۔ زمرد جہاں اگر اس سے تعاون کرتی تو وہ اس سے کبھی منحرف نہ ہوتا"۔

"یہ کہانی ہے!"

"سناتا ہوں...... سناتا ہوں"۔ حیدر سماوی نے کہا۔ اس نے ایک بار پھر چولا بدل تھا۔ اب اس کے چہرے پر ایسے آثار تھے جیسے وہ مجھ سے بہت متاثر ہو۔ اس نے کہا۔

"بہت کچھ تمہیں بتا چکا ہوں۔ اب مختصراً بقیہ تفصیل سنو۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ز جہاں امیر کے خاندان سے ہے لیکن اس میں بھی شک نہیں کہ کچھ عرصہ سے ایک تحریک سرگ عمل ہے۔ یہ امیر پسندوں کی تحریک ہے جو نہ جانے کیا چاہتے ہیں لیکن جو کچھ چاہتے ہیں ا کے نام سے منسلک کر کے چاہتے ہیں۔ تمہاری ماں اسی تحریک کی سرگرم رکن ہے اور اس میں شامل ہو کر کام کر رہی ہے۔ یہ قلمی نسخہ امیر کے ایک بہت قریبی ساتھی کی تحریر ہے جس اس نے اس کی تاریخ لکھنے کے ساتھ کچھ ایسے انکشافات بھی کیے تھے جن سے اس تحریک کی جڑوں تک کا پتا چلتا تھا۔ تم یقین کرو، جب وہ کتاب میرے ہاتھ لگی تو میں پڑھ کر اتنا خوفزدہ ہوا کہ میں نے وہ صفحات اس کتاب سے جدا کر دیئے"۔

"کتاب تمہیں کہاں سے ملی تھی؟"

"ایک شخص کی ذاتی لائبریری سے"۔

"کون تھا وہ؟"

"وہی شخص جس نے کتاب لکھی تھی"۔

"وہ حیات ہے؟"

"نہیں، بہت پہلے مر چکا ہے"۔

"کیا وہ کتاب اس تحریک میں کام کرنے والوں کے لئے اہمیت رکھتی ہے؟"

"بے حد!"

"انہوں نے پہلے اسے حاصل کیوں نہ کیا؟"

"تلاش نہیں کر سکے تھے"۔

"پھر کیا ہوا؟"

"میں نے زمرد جہاں کو سمجھایا کہ اصل میں یہ تحریک کسی جامع اصول پر مبنی نہیں بلکہ یہ بڑے ملک کی طرف سے اس اسلامی ملک کے خلاف ایک سازش ہے لیکن زمرد جہاں اس کا الٹا اثر لیا"۔

"یعنی؟"

"مجھ پر حملہ ہوا اور کتاب مجھ سے لے لی گئی۔ اس کے بعد انہیں احساس ہوا کہ اس کے ت غائب ہیں اور زمرد جہاں نے تمام دیرینہ تعلقات پس پشت ڈال کر مجھ سے دشمنی کا ظہار کر دیا اور میری زندگی کے درپے ہو گئی"۔

حیدر سماوی خاموش ہو گیا۔ اب میرے لیے سوچنے کے لمحات تھے۔ میں دیر تک خاموش پھر میں نے کہا۔

"اب آپ کا کیا ارادہ ہے؟"

"بہت بدل ہو چکا ہوں۔ تم یقین کرو سیدھا سیدھا متعلقہ حکام سے رجوع کر سکتا ہوں۔ نکل جائے گا اور بہت سے لوگ منظر عام پر آ جائیں گے۔ پھر جو کچھ ہو گا، اسے میں سنبھال سکوں گا لیکن میں یہ نہیں چاہتا تھا"۔

"وہ گروہ کتنا بڑا ہے؟"

”وہ کتنا ہی بڑا ہو لیکن اس کی پشت مضبوط......“

”صفحات کہاں ہیں؟“

”میرے پاس ہیں“

”مجھے دے دو“۔

”کیا؟“

”ہاں...... وہ صفحات مجھے دے دو“۔

”یہ مشکل ہے“۔

”تمہیں اس مشکل سے گزرنا ہوگا“۔ میں نے کہا اور وہ عجیب سی نظروں سے مجھے
لگا۔ پھر اس نے کہا۔

”وہ میرے لیے کچھ نہیں ہیں لیکن حکومتِ وقت کے لیے بہت کچھ ہیں اور تحریک
ان سے خوفزدہ ہیں، تم ان صفحات کا کیا کرو گے؟“

”اپنی ماں کو تحفہ بھیجوں گا“۔

”کیا یہ جائز ہوگا؟“ وہ دکھ بھرے لہجے میں بولا۔

”نہیں“۔

”مطلب؟“ وہ چونک پڑا۔

”وہ صرف تحفہ ہوگا، بیٹے کی طرف سے ماں کے لئے۔ پھر میں پوری کتاب ان ا
کے ساتھ ضائع کر دوں گا اور اپنی ماں سے کہوں گا کہ وہ اس تحریک سے علیحدگی اختیار کر
اور میرے ساتھ چلے“۔

”وہ ایسا کبھی نہ کرے گی“۔

”اسے کرنا ہوگا“۔

”ناممکن ہے بیٹے۔ وہ بہت گہرائی میں اُتر چکی ہے“۔

”اب میں آ گیا ہوں“۔

”تم نے شاید خود کو غلط کیلکولیٹ کر لیا ہے“۔

”کیا مطلب؟“

”وہ تمہاری بات نہیں مانے گی“۔ حیدر سماوی نے کہا اور مجھے اس کی یہ بات بہت

لی۔ میں نے کچھ وقت خاموش رہنے کے بعد کہا۔

”نعمان اسدی نے بچپن سے مجھے بتایا تھا کہ میری ماں مر چکی ہے۔ میں نے زندگی کا
طویل سفر ایک حسرت بھرے احساس کے ساتھ طے کیا ہے کہ میں ماں جیسی نعمت سے محروم
ہوں۔ پھر نعمان اسدی کا انتقال ہو گیا اور مجھے علم ہوا کہ میری ماں نے مجھے تلاش کرنے کی
کوشش کی ہے۔ میں اس سے ملوں گا اور پھر اس سے کہوں گا کہ وہ یہ سب کچھ چھوڑ کر میرے
لیے جیئے۔ مجھے میری محرومیوں کا نعم البدل دے اور مجھے یقین ہے کہ وہ ایسا کرے گی“۔

”تمہیں یقین ہے؟“

”ہاں“۔

”اپنے اس یقین پر شرمسار ہو گے“۔

”نہیں...... ماں کا آرزومند رہا ہوں، بڑا مان ہے مجھے اس پر...... میں سمجھتا ہوں کہ وہ
، پر اپنی کائنات لٹا دے گی اور اگر اسے مجھ سے زیادہ مشن عزیز ہوا تو میں اس سے علیحدہ ہو
وں گا اگر اس کے لیے مجھ سے زیادہ پیاری اور کوئی شئے ہے تو پھر ماں کے لیے میرا نظریہ
ل جائے گا اور میں اس کے ساتھ نہ رہ سکوں گا“۔

حیدر سماوی مجھے دیکھتا رہا۔ پھر بولا۔ ’ابھی تم نے کہا تھا کہ تم اسے وہ کتاب بطور تحفہ دو
“۔

”ہاں“۔

”کیا صرف وہ اوراق جو اسے مطلوب ہیں اور جو میرے پاس ہیں؟“

”نہیں، پوری کتاب“۔

”کتاب گروہ کے افراد لے جا چکے ہیں“۔

”مجھے علم ہے“۔

”میرے عزیز! اگر اپنے آپ کو اتنا مستحکم سمجھتے ہو تو صرف مجھ بوڑھے پر ستم نہ کرو۔ اپنی
یتیں اپنی جوانی ان لوگوں پر بھی صرف کرو۔ حیدر سماوی وعدہ کرتا ہے کہ اگر تم ان لوگوں
، کتاب حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے تو نہایت خوشی کے ساتھ وہ اوراق تمہیں پیش کر
گا“۔

میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ میں نے کہا۔

"جلد بازی صرف نوجوانی میں نہیں کی جاتی بلکہ کسی بھی عمر میں کر لی جاتی ہے۔ کیا تم نے یہ فیصلہ کن بات کہنے میں جلد بازی نہیں کی ہے؟"

"جو کچھ بھی کہا ہے، میرا وعدہ اٹل ہے"۔

"شاید بعد میں تمہیں افسوس ہو"۔

"گھمنڈ بری چیز ہے۔ بیٹے، خیال رکھنا شاید تمہارے لیے آسان نہ ہو"۔

"تم ہر حالت میں اپنے وعدے پر قائم ہو؟"

"ہاں"۔

"تو پھر سنو! کتاب میرے پاس ہے"۔ میں نے حیدر ساوی سے کہا اور اس کے چہرے کے تاثرات سے لطف اندوز ہونے لگا۔ پھر اس نے یقین نہ کر کے کہا۔

"تم نے پہلی بار اپنا امیج توڑا ہے"۔

"کیوں؟"

"یہ جھوٹ بول کر"۔

"نہیں کتاب میں نے حاصل کر لی تھی ان سے"۔

"کب...... کیسے؟" اس نے کہا اور میں نے اسے گزرے ہوئے واقعات سنا دیے۔ وہ ہلکے سے انداز میں ہنس کر بولا۔

"کاش، تم یہ جھوٹی کہانی مجھے نہ سناتے"۔

"میں نے انہیں چیلنج کر دیا تھا کہ میں فلاں ہوٹل میں مقیم ہوں۔ وہ مجھ سے مل سکتے ہیں۔ چنانچہ جب میں نے یہاں آنے کے لیے ہوٹل چھوڑا تو سوچا کہ ممکن ہے میرے پیچھے وہاں آئیں اور میرے کمرے کی تلاشی لیں اس طرح انہیں مشقت کے بغیر کامیابی ہو جائے گی"۔

"تو پھر؟"

"اس لیے میں کتاب اپنے ساتھ ہی لے آیا"۔

"کیا؟" حیدر ساوی کی سرسراتی آواز ابھری۔

"اور اسے ایسی جگہ پوشیدہ کر دیا جہاں سے واپسی میں اسے آسانی سے اپنے ساتھ لے جا سکوں۔ یعنی اس عمارت کے گیٹ کے پاس ایک خلاء میں...... وہ وہاں موجود ہے"۔

"نوجوان لڑکے، عجیب بات کہہ رہے ہو"۔

"ہمارے درمیان معاہدہ ہو چکا ہے"۔

"ہاں"۔ وہ پُرجوش لہجے میں بولا۔

"تو پھر آؤ۔ تم وہ بقیہ صفحات ساتھ لے لو۔ میں تمہیں وہ کتاب دکھا دیتا ہوں"۔

"نہیں، پہلے میں کتاب دیکھوں گا"۔

"اس کے لیے تمہیں میرے ساتھ چلنا ہوگا۔ میں تمہیں کھونا نہیں چاہتا"۔

"میں تیار ہوں"۔ وہ بولا۔ میں نے اس سے غلط نہیں کہا تھا۔ ایسا ہی ہوا تھا۔ وہ خطرہ ول لے کر عمارت کے گیٹ تک میرے ساتھ آیا اور میں نے کتاب نکال کر اس کے سامنے ر دی۔ اس نے ایک نگاہ میں اسے پہچان لیا تھا وہ مضطربانہ انداز میں بولا۔

"آؤ...... آؤ، اندر...... یہ جگہ مخدوش ہے"۔

روشنی میں اس نے کتاب دیکھی پھر مجھے دیکھنے لگا اور بولا، "میں نہیں جانتا کہ نعمان دی نے کس خیال کے تحت تمہاری تربیت اس اعلیٰ انداز میں کی۔ میں اپنے وعدے کا پابند ں۔ آؤ، تمہیں صفحات دے دوں"۔

اس نے بھی ان صفحات کو چھپانے کے لیے ایسی ہی جگہ کا انتخاب کیا تھا جہاں کسی کا تصور ی نہ پہنچ سکے۔ صفحات میرے حوالے کر کے وہ حسرت بھرے لہجے میں بولا۔

"اے کاش! تم اپنی ماں کے مشن کے شریک نہ بنو۔ کاش وہ تمہیں اپنے فریب کا شکار نہ ر سکے"۔

"میں نے اب تک تم سے کوئی جھوٹ نہیں بولا"۔ میں نے کہا، "اگر مجھ پر کچھ بھروسہ ہے تو اس بات پر بھی یقین کر لو کہ اگر میری ماں نے اس تنظیم سے کنارہ کشی اختیار نہ کی تو میں اس ے کنارہ کش ہو جاؤں گا"۔

"ٹھیک ہے۔ میں نے تم پر اعتبار کر لیا"۔

"اب مجھے بتاؤ، میں اس سے کہاں مل سکتا ہوں؟"

"تین فون نمبر نوٹ کر لو۔ وہ ان میں سے کسی پر ضرور مل جائے گی۔ نہ ملے تو اسے اپنے بارے تا دینا۔ میرا مطلب ہے جو فون سنے اسے"۔ اس نے خود ہی کاغذ پر مجھے یہ نمبر لکھ دیئے۔

"تمہارا کیا ارادہ ہے؟"

"میں ابھی یہاں رہوں گا"۔

"ٹھیک ہے، میں چلتا ہوں"۔ میں نے کہا۔ وہ مجھے گیٹ تک چھوڑنے آیا تھا پھر اس نے کہا۔

"پڑوسی ملک جاؤ گے؟"

"ہاں، ظاہر ہے"۔

"ذریعۂ سفر کیا اختیار کرو گے؟"

"دیکھ لوں گا"۔ میں نے کہا۔

"نہیں، تمہیں ابھی اپنے آپ سے لاپرواہی نہیں برتنی چاہیے کیونکہ حقیقتوں کا ادراک نہیں ہو سکا اور دھوکے میں تمہیں نقصان پہنچایا جا سکتا ہے"۔

میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ میں نے کہا۔

"میں اس نقصان سے بچنے کی کوشش کروں گا"۔

"خدا تمہاری حفاظت کرے"۔ حیدر سماوی نے کہا اور میں عمارت سے نکل آیا۔

❁❁❁❁

درحقیقت میرے ذہن میں کچھ بھی نہیں تھا۔ میں تو ان واقعات کے طلسم میں کھویا ہوا تھا۔ حیدر سماوی کا مؤقف میں نے دل سے تسلیم کیا تھا اور میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ خاتون زمرد جہاں اب لکیر کیوں پیٹ رہی ہیں۔ جو وقت گزر گیا تھا، اس کی واپسی تو ممکن ہی نہیں تھی۔ بلکہ ت میرے علم میں آ چکی تھی کہ خاتون زمرد جہاں امیر کے خاندان سے ہیں۔ اس طرح ے میرا ابھی تھوڑا سا تعلق اس خاندان سے قائم ہو گیا تھا لیکن اب تو کچھ بھی باقی نہیں رہا تھا۔ امیر کے اہلِ خاندان خاموش زندگی گزار رہے تھے۔

حیدر سماوی کی یہی بات سمجھ میں آئی تھی کہ بڑی طاقتیں اس اسلامی ملک کے خلاف جو کھیل کھیل رہی تھیں، اس میں انہوں نے مقامی لوگوں کو بھی ملوث کر لیا تھا اور بہر طور یہ بات لازمی تھی کہ نقصان انہی کا ہوگا جو اس سلسلے میں کارروائیاں کر رہے ہیں۔ اس اسلامی ملک کی حکومت نے اور اس کے عوام نے اپنے وطن کے تحفظ کے لیے ہر اس جذبے کا اظہار کیا تھا جس سے ان کے ٹھوس اور اپنے مؤقف پر پوری طرح مضبوطی سے قائم ہونے کے ثبوت ملتے تھے۔ زمرد جہاں غلط راستوں پر ہیں۔ ہو سکا تو انہیں سمجھانے کی کوشش کروں گا۔ ان خیالات سے یہ فائدہ ضرور ہوا کہ میں نے کافی طویل فاصلہ طے کر لیا اور ایک ایسی شاہراہ جو پڑوسی ملک کی

جاتی تھی، پیدل چلتا رہا اور پھر وہ ٹیکسی اتفاقیہ طور پر گزرتی ہوئی نظر آئی جو خالی تھی۔ ڈرائیور وشی سے میری مطلوبہ جگہ جانے کے لیے تیار ہو گیا کیونکہ وہ بھی قرون سے خالی جا رہا تھا۔ یوں میں شہر میں داخل ہو گیا اور شہر میں داخل ہونے کے بعد میری حسیات کام کرنے ں۔ اب اتنا سپر مین بھی نہیں بننا چاہیے کہ واپس اپنے ہوٹل جاؤں۔ جن لوگوں کو چیلنج کر کے تا ممکن ہے انہیں میرے سلسلے میں ہدایت نہ ملی ہوں اور وہاں میرا انتظار کیا جا رہا ہو چنانچہ نے ہوٹل کی تلاش ضروری تھی۔ میں کچھ دیر کے بعد درمیانے درجے کے ایک ہوٹل میں ہو گیا۔ یہاں کمرے کے حصول میں مجھے کوئی دقت پیش نہیں آئی تھی۔

ہوٹل بہت سستا تھا اور اندر سے غیر معیاری بھی نہیں تھا۔ ضرورت پوری کی جا سکتی تھی۔ پہ کچھ دیر کے بعد جوتے وغیرہ اتار کر میں بستر پر دراز ہو گیا۔ سامان تو دوسرے ہوٹل میں تا۔ بہر حال اسے بھی دن کی روشنی میں حاصل کیا جا سکتا تھا لیکن اب اس کے بعد مجھے فیصلے کرنے تھے۔ زمرد جہاں کا پتہ چل گیا تھا حالانکہ جب سے اس بات کا علم ہوا تھا کہ ماں ہستی جس کے لیے ساری زندگی حسرتوں کا شکار رہا تھا، میری زندگی میں موجود ہے، اس سے دل میں ایک آگ سی لگی ہوئی تھی لیکن ہر کام مرضی کے مطابق نہیں ہو جاتا۔ ہمیں ت و واقعات کا تابع رہنا پڑتا ہے اور انہی کے مطابق عمل کرنا ہوتا ہے۔

چنانچہ جو وقفہ میری زندگی میں تھا ماں سے ملاقات کے لیے، اسے تو گزارنا ہی تھا۔ کیا ب و غریب حالات ہیں۔ مجھے خاتون زمرد جہاں کا علم ہو چکا ہے لیکن میں ہوا میں پرواز کے ان تک نہیں پہنچ سکتا تھا۔ یہ صرف جذباتی باتیں ہیں کہ خون کا سمندر جب شدت سے زن ہوتا ہے تو ہر رکاوٹ دور ہو جاتی ہے۔ میرا خیال ہے، ایسا نہیں ہے۔ ہر چیز وقت اور ت کے تابع ہوتی ہے۔ زندگی میں لاتعداد تجربات کیے تھے لیکن اندازہ یہ ہو رہا تھا کہ ت کے لئے زندگی مختصر ہے اور ہر لمحہ ایک نئے کھیل کا آغاز کرتا ہے اور ہم ساری زندگی ا کے محتاج رہتے ہیں۔

پھر حیدر سماوی کی کہانی پر ذہن دوڑانے لگا اور اپنے پہلے تصورات سے الگ نہ رہا۔ ماں زرد دل میں طوفان اٹھا رہی تھی۔ مجھے ماں کے تصور کے ساتھ لاکھوں واقعات یاد آ رہے چھوٹے چھوٹے واقعات جن پر میں خاص طور سے توجہ دیا کرتا تھا، اس لیے کہ ماں سے اتھا۔ ماں نے بچے کی جان بچانے کی خاطر زندگی قربانی کر دی، ماں نے یہ کیا، ماں نے

وہ کیا میکسم گورکی کا ناول ''ماں'' بھی پڑھا تھا میں نے اور نہ جانے کیا کیا واقعات...... اصل میں
ماں سے محرومی نے مجھے اس سلسلے میں خاص طور سے متوجہ کر رکھا تھا۔

رات نہ جانے کیسے گزری۔ دن کی روشنی زیادہ پائیدار ہوتی ہے۔ چنانچہ میں نے ہوٹل کا یہ کمرہ خالی کر دیا لیکن اسے اپنے نام پر بک رہنے دیا تھا۔ وقت اور حالات نہ جانے کیا رخ متعین کریں۔ ان کے لیے پہلے سے تیار رہنا ضروری ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد ٹیکسی نے مجھے میرے ہوٹل کے سامنے اتار دیا۔ یہاں آسانیاں تھیں۔ ہوٹل میں داخل ہونے کے بعد میں نے لباس وغیرہ تبدیل کیا۔ اس سے فارغ ہو کر ٹیلی فون کے پاس آ گیا۔ تینوں نمبر میں نے اپنے پاس رکھ لیے تھے اور پھر دھڑکتے دل کے ساتھ میں نے پہلا نمبر ڈائل کیا۔ تھوڑی دیر کے بعد فون ریسیو کر لیا گیا تھا اور کسی مرد کی آواز سنائی دی۔

''فرمائیے؟''

''میں خاتون زمرد جہاں سے گفتگو کرنا چاہتا ہوں''۔

''کون ہیں آپ؟''

''ان سے کہیئے احمد اسدی ان سے بات کرنا چاہتا ہے''۔

''براہِ کرم نام دوبارہ دہرایئے''۔

''احمد اسدی''۔

''آپ کو انتظار کرنا ہوگا''۔

''کتنی دیر؟''

''بس ہولڈ کیجئے۔ ابھی تھوڑی دیر میں رابطہ قائم کرا دیا جائے گا''۔ دوسری طرف سے کہا گیا اور میں ریسیور ہاتھ میں لیے انتظار کرتا رہا۔ کچھ دیر کے بعد وہی آواز سنائی دی۔

''ہیلو''۔

''ہاں بول رہا ہوں''۔

''کیا یہ ممکن نہیں کہ آپ دس منٹ کے بعد رِنگ کر لیں؟''

''کیوں خیریت؟''

''خاتون زمرد جہاں اس وقت قرب و جوار میں موجود نہیں لیکن ٹھیک دس منٹ کے اندر اندر انہیں تلاش کر لیا جائے گا یا پھر آپ اپنا فون نمبر دے دیجیے۔ ہم آپ سے رابطہ قائم کر لیں گے''۔

''نہیں، ٹھیک ہے۔ میں دس منٹ کے بعد دوبارہ فون کرتا ہوں لیکن خیال رکھیے ٹھیک دس منٹ بعد''۔

''بالکل...... بالکل......'' دوسری طرف سے کہا گیا اور میں نے کسی قدر جھلائے ہوئے انداز میں فون بند کر دیا لیکن بہرحال یہ ایک نیچرل بات تھی اور اس میں کسی قسم کی جھلاہٹ کا مظاہرہ بڑی اپنی کسی خواہش کا نتیجہ تو ہو سکتا تھا دوسرے کی غلطی نہیں۔ لیکن یہ دس منٹ بڑے قیامت کے گزرے تھے۔ بے چینی عروج کو پہنچ رہی تھی۔ دل و دماغ میں ہیجان برپا تھا۔ ماں سے ملنے کے امکانات پیدا ہو گئے تھے۔ ماں...... ماں...... ماں...... اور جب گھڑی کی سوئی دس منٹ کا فاصلہ طے کر چکی تو میں نے دوبارہ نمبر ڈائل کیا اور دوسری طرف سے وہی آواز سنائی دی۔

''میں بول رہا ہوں احمد اسدی''۔

''جی ہولڈ کیجئے''...... دوسری طرف سے کہا گیا۔ جانے کیوں مجھے ایک عجیب سا احساس ہوا اب بھی ہولڈ کرنا ہے مجھے، میں نے دل میں سوچا لیکن زیادہ نہ سوچ سکا کیونکہ چند لمحات کے بعد مجھے ایک عمر رسیدہ آواز سنائی دی تھی۔

''ہیلو''۔

''ہیلو...... کیا خاتون زمرد جہاں بول رہی ہیں؟'' میں نے سوال کیا۔

''ہاں میں بول رہی ہوں''۔

''میرا نام احمد اسدی ہے اور لوگ کہتے ہیں کہ میں آپ کا بیٹا ہوں''۔ میں نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔ کوشش کے باوجود آواز کی لرزش پر قابو نہیں پا سکا تھا دوسری طرف بھی خاموشی طاری ہو گئی تھی اور میں نے اس سے یہی اندازہ لگایا تھا کہ خاتون زمرد جہاں بھی جذبات کے ان لمحات سے گزر رہی ہیں جو انسانی زندگی میں ایک نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔ میں نے پھر کہا۔

''ہیلو''۔

''ہاں''۔

''خاتون کیا آپ مجھ سے ملنا پسند فرمائیں گی؟''

''تم نعمان اسدی کے بیٹے ہو؟''

''جی؟''

''کہاں سے بول رہے ہو''۔

میں نے اپنے ہوٹل کا نام بتایا تو دوسری طرف سے آواز آئی۔

"تھوڑی دیر انتظار کرو، سرخ رنگ کی ایک کار جس کا نمبر 4040 ہے، تمہارے ہو
کے سامنے آ کر رکے گی اس میں ایک نیگرو ڈرائیور ہوگا تمہیں ہوٹل سے باہر آنا پڑے گا۔ نیگ
ڈرائیور کے ساتھ بیٹھ کر میرے پاس آ جاؤ"۔

"بہتر ہے۔ کتنی دیر لگے گی؟" میں نے سوال کیا۔

"بس زیادہ سے زیادہ پندرہ منٹ"۔

"او کے"۔ میں نے کہا۔

"او کے، خدا حافظ"۔ دوسری جانب سے کہا گیا اور فون بند ہو گیا۔

میرے دل و دماغ کی عجیب سی کیفیت تھی۔ کیا ماں ہے، اسے تو پرواز کر کے اپنی اولا
تک آ جانا چاہیے تھا لیکن کچھ سرد مہری سی محسوس کر رہا تھا۔ پھر ممکن ہے وہ حالات جس م
زمرد جہاں نے اپنے آپ کو ملوث کر لیا تھا، اسے محتاط رہنے پر مجبور کرتے ہوں اور وہ ہر لمح
میں اپنے آپ کو محفوظ رکھنا چاہتی ہو۔ دل کو یہی تسلی دے کر بہلا لیا کیونکہ حالات کا تھوڑا بہ
علم بھی تھا۔ میں ہوٹل سے باہر نکل آیا تھا اور پھر سرخ کار کو آتے ہوئے دیکھا تھا۔ سیاہ ف
ڈرائیور نے کار ہوٹل کے سامنے والے فٹ پاتھ کی جانب روک دی اور میں تیز قدموں
چلتا ہوا اس طرح پہنچ گیا۔

"میرا نام احمد اسدی ہے"۔ میں نے پچھلا دروازہ کھولتے ہوئے کہا اور نیگرو ڈرائیو
مشینی انداز میں گردن ہلا دی۔ میں اندر بیٹھا تو اس نے کار آگے بڑھا دی۔ کار مختلف را
طے کرتی ہوئی آگے بڑھنے لگی اور میری نگاہیں ان مناظر میں بھٹکنے لگیں جو یہاں کی ثقافت
حصہ تھے۔

نیگرو ڈرائیور کار کی رفتار خاصی تیز رکھے ہوئے تھا اور کار اس خوبصورت شہر کی وسیع سڑکو
پر دوڑ رہی تھی۔ اسپیڈ بتانے والی سوئی 100 اور 120 کلومیٹر کے درمیان تھرک رہی تھی۔ م
کسی قدر حیران تھا۔ پتا نہیں، یہ سفر کتنی طوالت کا حامل ہے۔ ڈرائیور کے انداز سے تو پتہ
تھا جیسے وہ شہر سے کہیں باہر جاتا چاہتا ہو حالانکہ خاتون زمرد جہاں نے اس کی کوئی وضاحت نہ
کی تھی۔ میں نے محسوس کیا جس شہر میں ہوٹل تھا وہ کافی پیچھے رہ گیا ہے اور اب کار ایک
دریا کے کنارے سفر کر رہی تھی۔

دریا، سڑک اور پتھریلی چٹانوں کے درمیان سر پٹختا ہوا زور شور سے بہہ رہا تھا۔ دریا کے
کنارے درختوں کی چھاؤں میں لوگ پتھروں پر بچھے ہوئے قالینوں پر بیٹھے پکنک منا رہے
تھے۔ غالباً آج تعطیل کا دن تھا اور بیشتر لوگ اس پُرفضا مقام کی رنگینیوں سے لطف اٹھانے
کے لیے یہاں پہنچ گئے تھے۔ ایک موڑ پر دریا گھنے درختوں کی اوٹ میں گم ہو گیا اور آگے جا
کر کار سامنے والے پہاڑی سلسلے کی جانب بڑھنے لگی۔ راستوں میں خوش ذوقی کے لیے
چھوٹے چھوٹے ریستوران بنے ہوئے تھے۔ بلند درختوں کے خوشگوار اور خنک ماحول میں، ہوا
کی سرسراہٹوں کے ساتھ بہتے ہوئے دریا کے شور میں زندگی رواں دواں تھی اور میں حیرانی سے
یہ سوچ رہا تھا کہ آخر یہ سفر کتنا طویل ہے اور خاتون زمرد جہاں نے مجھے کہاں بلایا ہے۔ ویسے
لمحوں لمحوں میں کچھ اور احساسات بھی جنم لینے لگتے تھے۔ کہیں کوئی سازش نہ ہو گئی ہو، کہیں کسی
نئے کھیل کا آغاز نہ ہو گیا ہو؟ کالے رنگ کا ڈرائیور کار کی رفتار سست ہی نہیں کر رہا تھا بلکہ
اس نے رفتار اور بڑھا دی تھی۔

عمیق گھاٹیاں اور خطرناک موڑ راستے میں آ رہے تھے لیکن رفتار بتانے والی سوئی 120
اور 130 کے درمیان لرز رہی تھی اور بھی گاڑیاں سڑک سے گزر رہی تھیں۔ سامنے سے کوئی
گاڑی آتی نظر آتی اور میں دانت کچکچا کر ڈرائیور کے سر کو دیکھنے لگتا لیکن بس پلک جھپکتا اور
ایک زناٹے سے وہ گاڑی غائب ہو جاتی۔ فر اور سرو کے درختوں کے درمیان گاڑی تیزی سے
رواں دواں تھی۔ نرم و ملائم دھوپ اور اس کی چمک قابلِ دید تھی۔

دریا کے دوسری طرف بلند چٹانوں کی شکلیں بدل رہی تھیں اور نہ جانے کیا کیا انداز پیش
کر رہی تھیں۔ کہیں وہ بلند مینار نظر آتیں، کہیں ہیبت ناک قلعے اور کہیں خوفناک سیاہ جانوروں
کی شکلیں۔ پھر دریا پر تعمیر کردہ بند عبور کرنے کے بعد ایک موڑ پر گھاٹی کے نیچے ایک باغ نظر
آیا اور میں نے محسوس کیا کہ کار کی رفتار اب کچھ سست ہونے لگی ہے۔

غالباً منزل قریب آ رہی تھی لیکن یہ راستہ...... یہ راستہ میری توقع سے اتنا برعکس تھا کہ
میں نے خواب میں بھی نہیں سوچا تھا۔ کم بخت ڈرائیور پتھر کے بت کی مانند تھا۔ اس نے اپنے
منہ سے ایک بھی لفظ نہیں نکالا تھا اور میں نے بھی اپنی پُروقار شخصیت کو برقرار رکھا تھا اور اس
بارے میں ایک لفظ بھی نہیں پوچھا تھا۔ پھر کار سڑک سے ایک ڈھلوان سطح کی طرف اتر گئی۔

یہ ذیلی سڑک بھی اتنی طویل تھی کہ اس کا آخری سرا نظر نہیں آتا تھا لیکن پھر کافی فاصلہ

طے کرنے کے بعد ایک اور شاخ اس ذیلی سڑک سے بھی کٹی اور ڈرائیور نے کار کی رفتار سُ کر کے اس کار کا رخ بائیں سمت کر دیا۔ میں نے اب تک جس صبر و سکون سے کام لیا تھا، وہ مثل حیثیت کا حامل تھا اور اب بھی میں نے اس سکون کو قائم رکھا تھا لیکن اب مجھے اندازہ گیا تھا کہ وہ جو سبز رنگ کا خوشنما کھلونا نظر آ رہا ہے، وہی کار کی منزل ہے۔ ایک عجیب غریب جگہ تھی اور نہ جانے کیوں خاتون زمرد جہاں نے اپنے لیے اسے منتخب کیا تھا۔

بہر حال اس عمارت کو دیکھنے کے بعد ایک بار پھر وہی جذبات اور وہی احساسات میر دل میں جاگ اٹھے۔ یہاں زمرد جہاں ہے...... میری ماں...... وہ مجھے دیکھے گی تو شد جذبات سے دیوانی ہو جائے گی اور مجھے زندگی کا سب سے منفرد سب سے انوکھا تجربہ ہوگا۔ عجیب لمحہ میری زندگی میں آنے والا ہے۔ وہ لمحہ، جس کے تصور نے میرا مزاج بدل دیا ہے۔ گاڑی اس عمارت کے بڑے اور خوشنما گیٹ سے اندر داخل ہو کر صدر دروازے پر رک گ دروازے پر دبلی جسامت کی ایک عورت کھڑی تھی۔ قیمتی سوٹ میں ملبوس لیکن بے اثر شخصیت کی مالک۔ رنگ شفاف لیکن چہرہ جھریوں سے بھرا۔ نقوش واجبی، دو مرد اور ایک لڑکی اس عقب میں مؤدب کھڑے تھے۔

ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا۔ یہ زمرد جہاں ہیں! میں نے دل میں سوچا، بہر حال میں سے اتر کر نیچے آیا اور غیر جذباتی انداز میں چلتا ہوا آگے بڑھا۔

زمرد جہاں پتھرائی ہوئی کھڑی تھی۔ مجھے اس کے اندر جذبوں کی کوئی تحریک نظر نہ آئی۔ وہ خاموش نگاہوں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ جب میں اس کے قریب پہنچا تو اس نے ایک قدم آگے بڑھایا اور اپنے پست قامت وجود کو بلند کرنے کی کوشش کی۔ میں نے خود سر جھکا تھا۔ اس نے میرے رخسار پر ایک واجبی سا بوسہ دیا بالکل غیر جذباتی انداز تھا۔ نہ جانے کیو دل کے گوشوں میں برف سی جمتی ہوئی محسوس ہوئی۔

''آؤ''۔ اس نے کہا اور میں اس کے ساتھ اندر داخل ہو گیا۔

بے حد حسین عمارت تھی۔ انتہائی خوش ذوقی کی آئینہ دار لیکن میں اپنے بجھے دل کو شگفتہ کر سکا۔ بے دلی کے ساتھ اندر داخل ہو گیا۔ ایک بڑے اور اسی اعلیٰ انداز سے آراستہ کمرے م داخل ہونے کے بعد اس نے ایک صوفے کی طرف اشارہ کر کے مجھے بیٹھنے کے لیے کہا اور خ میرے سامنے بیٹھ گئی۔

اس بات پر بھی مجھے دھچکا لگا۔ وہ کس قدر غیر جذباتی ہے! میں نے سوچا پھر میرے دل دوسرے احساسات پیدا ہونے لگے۔ کچھ ایسے احساسات جو حقیقت سے تعلق رکھتے تھے۔

بولی۔

''دل چاہتا ہے، تم سے بہت سی باتیں کروں لیکن بہتر ہے کہ تم اس سفر کی تھکن دور کر کمرہ میں نے تمہارے لیے مخصوص کیا ہے۔ وہ سامنے واش روم ہے''۔

''میں واش روم کی ضرورت محسوس نہیں کر رہا''۔ میں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

''پھر مجھے کچھ دیر کے لیے اجازت دو۔ میں ابھی تم سے ملتی ہوں''۔ اس نے کہا اور ری ہوگئی۔ میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی۔ اسے عقب سے دیکھتا رہا۔

''ماں!'' میرے ذہن میں آواز ابھری۔ ماں ایسی ہوتی ہے! پھر وہ کہانیاں...... وہ کہانیاں غلط ہیں یا زمرد جہاں مختلف ہے؟ فیصلہ مشکل تھا۔

پھر دوسرے خیالات دل میں آئے۔ زمرد جہاں ایک مشن پر کام کر رہی ہے۔ کیا اپنے انہ مقصد نے اسے اس قدر بے اثر کر دیا ہے، ویسے ایک اور خیال بھی دل میں آیا تھا۔ ن زمرد جہاں کی عمر کیا ہوگی؟ اگر وقت حالات اور صعوبتوں نے اسے اس قدر نڈھال کر ہے تو دوسری بات ہے۔ ورنہ نعمان اسدی اس سے کہیں زیادہ خوبصورت اور اسمارٹ تھے۔ ن ہے یہ عمر میں بھی ان سے بڑی ہو۔ پھر وہ کون سے عوامل تھے جنہوں نے انہیں زمرد اں سے عشق کرنے پر مجبور کر دیا۔ شکل و صورت بھی بس واجبی سی تھی۔ اس میں کوئی حسن ں تھا۔ پھر...... اوہ۔ میرے ذہن میں دوسرا خیال آیا۔ نعمان اسدی کے ماضی کے بارے میں معلوم تھا۔ وہ بے حیثیت انسان تھے۔ ممکن ہے اس ملک میں امیر کی عزیزہ ہونے کی حیثیت انہیں زمرد جہاں سے مالی فوائد حاصل ہوئے ہوں اور یہ شادی اور عشق کاروباری ہو۔ ایسا ہو سکتا ہے۔

میں اپنی جگہ بیٹھا رہا۔ بڑی مایوسی ہوئی تھی اور بہت افسردہ ہو گیا تھا۔ پھر ایک عورت اور مرد آئے اور انہوں نے مجھے ساتھ چلنے کے لیے کہا۔ اس بار دوسرے خوشنما کمرے میں د جہاں نے میرا استقبال کیا اور میں پھر ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔

''تم اپنا سامان ساتھ نہیں لائے؟''

''نہیں''۔

''کیوں کیا ہمارے ساتھ رہنے کا ارادہ نہیں؟''

''یہ میں کیسے جان سکتا ہوں؟''

''کیا مطلب؟''

''یہ تو آپ کے رویے پر منحصر تھا''۔

''میرے رویے کے بارے میں تمہارا کیا خیال تھا؟''

''ماں کے بارے میں سنی ہوئی کہانیاں میرے تجربات سے مختلف نکلیں''۔ میں
اور وہ خاموش ہوگئی۔ چند لمحے خاموش رہی پھر بولی۔

''تمہیں اس کی وجہ نہیں معلوم؟''

''جاننا چاہتا ہوں''۔

''تمہارے باپ کا رویہ میرے ساتھ کیسا رہا؟''

''یہ میں کیسے بتا سکتا ہوں''۔

''کیا مطلب؟''

''آپ کو نہیں معلوم؟''

''تمہیں معلوم ہے کہ نہیں؟''

''نہیں، مجھے کون سناتا''۔

''تم کہاں تھے؟''

''یورپ میں''۔

''کہاں؟'' وہ حیرت سے بولی۔

''یورپ میں''۔

''اوہ''۔ وہ کچھ دیر کے لیے خاموش ہوگئی۔ پھر اس نے کہا۔ ''نعمان اسدی نے تم
مجھ سے چھپانے کے لیے وہاں رکھا تھا۔ تمہارے ساتھ ان کا رویہ کیسا تھا؟''

''جیسا آپ کے ساتھ''۔

''کیا مطلب؟''

''اتنا ہی سرد، اتنا ہی غیر جذباتی۔ اس پوری زندگی میں میرے اور ان کے درمیان کم

دا نہیں ہوئیں''۔

''میرے بارے میں انہوں نے کیا بتایا؟''

''یہی کہ آپ مر چکی ہیں''۔

''ہاں اس نے مجھے زندہ درگور کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ اس نے اپنی دانست میں یہ
کر لیا تھا..... تمہیں میری زندگی کا ثبوت کیسے ملا؟''

''وطن واپس آ کر''۔

''وطن میں تمہاری ملاقات کس سے ہوئی؟''

''نعمان اسدی کے خاندان سے''۔

''تم نے انہیں کیسا پایا؟''

''تبصرہ نہیں کرنا چاہتا''۔

''حیدر سماوی سے کیوں ملے تھے؟''

''میرے وکیل نے مجھے بتایا تھا کہ صرف حیدر سماوی تمہیں تمہاری ماں کا پتہ بتا سکتا
ہے''۔ میں نے جواب دیا۔

''اس نے میرے بارے میں کیا بتایا؟''

''وہ سب کچھ جو حقیقت ہے۔ اس نے مجھے ایک تنظیم کے بارے میں تفصیل بتائی''۔

''تمہارے ذہن میں اس کے لیے کیا تاثر ہے؟''

''یہ بیکار بے حقیقت عمل ہے جس کا نہ کوئی مفہوم ہے نہ مقصد''۔ میں نے کہا

''مستقبل میں تمہارا کیا ارادہ ہے؟''

''بتانا پسند نہیں کرتا''۔

''یورپ میں کیا کرتے ہو؟''

''پڑھتا ہوں''۔

''شادی کر لی؟''

''شادی''۔ میرے ہونٹ نفرت سے مسکرا دیئے۔ میں نے اسے کوئی جواب نہیں دیا اور
اس کے بعد وہ بھی خاموش ہوگئی۔

اس خاموشی کو چند لمحے گزرے تھے کہ کمرے کی اندرونی خوبصورت چلمن ہٹی، چاندی کی

گھنٹیاں بجیں اور میری نگاہیں اس طرف اٹھ گئیں۔ بے حد قیمتی سرخ رنگ کے گاؤن میں ملبوس ایک متناسب بدن کی دراز قامت عورت وہاں نمودار ہوئی۔ آتشیں رنگ جو سرخ لبادے سے دہک رہا تھا، اخروٹی رنگت کے بال، بادام جیسی بڑی بڑی آنکھیں جن کا رنگ بالکل براؤن تھا۔ انتہائی جاذب نظر نقوش، پُروقار چال۔ اس کے پیچھے ایک حسین لڑکی تھی جسے میں نے ایک نگاہ میں پہچان لیا۔ یہ وہی لڑکی تھی جس سے دوبار میرا سابقہ پڑ چکا تھا۔ جس نے مجھے اغوا کیا تھا اور جسے دوسرے مرحلے پر میں نے شکست دی تھی۔

عورت آگے بڑھی تو زمرد جہاں احترام سے کھڑی ہوگئی۔ عورت نے پاٹ دار آواز میں کہا۔

''ٹھیک ہے وانیہ، تم جاؤ۔ یہ میرا ہی بیٹا ہے، میرا لختِ جگر۔ اٹھو احمد اسدی میں تمہاری پیشانی بھی چوموں گی تمہیں گلے بھی لگاؤں گی کیونکہ میں تمہاری ماں ہوں۔ میں زمرد جہاں ہوں......!!!''

''اعصاب ایک بار پھر شدید تناؤ کا شکار ہو گئے۔ یہ دیوانگی کا کھیل نہیں تھا۔ میرے جذبے میری طلب اس آنکھ مچولی کو قبول نہیں کر رہی تھی۔ میں اسے اپنے جذبوں کے ساتھ مذاق سمجھ رہا تھا۔ پہلی عورت جس نے سرد مہری کا برتاؤ کر کے میری ان امنگوں پر تالے لگا دیئے تھے جنہیں لے کر میں یہاں تک پہنچا تھا۔ زمرد جہاں کی تلاش میں مجھے خاصی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا تھا اور اس کے بعد جب زمرد جہاں کو میرے سامنے آنا چاہیے تھا تو اس کے جذبات فطری طور پر میرے جذبات سے کم نہ ہوتے۔ زندگی جذبات ہی کا تو کھیل ہے۔ جذبات نہ ہوں تو انسانی جسم کا کیا کہا جائے۔ خاتون زمرد جہاں میری جانب بڑھی اور میرے قریب پہنچ گئی۔

غالباً اس نے محسوس کر لیا تھا کہ میں پتھریلے بت کی مانند خاموش کھڑا ہوں، تب اس نے اپنے دونوں ہاتھ میرے بازوؤں پر رکھے۔ مجھے دیکھتی رہی اور میرا سر اپنا ہاتھ اونچا کر کے نیچے جھکایا اور پیشانی کو بوسہ دیا۔ پھر میرے دونوں ہاتھوں کو چوما اور دو قدم پیچھے ہٹ کر مسکرائی نگاہوں سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔

''میرے تصور سے بھی آگے...... میرے خیالات سے بھی بلند، حالانکہ لوگ مجھے ایک دراز قامت عورت کہتے ہیں لیکن جس کی پیشانی چومنے کے لیے مجھے اس کا سر جھکانا پڑا وہ میری اولاد ہے۔ آہ! ایک لمحے میں یہ محسوس ہوتا ہے جیسے مجھے نعمان اسدی کی تمام برائیوں کو معاف کرنا پڑے گا۔ کم از کم اس نے مجھے ایسا بلند و بالا بیٹا دیا ہے جس پر میں فخر کر سکتی ہوں۔ کوئی

تذبذب کا شکار ہو سکتا ہے لیکن ایک ماں ایک لمحے میں اپنے بیٹے کو پہچان لیتی ہے...... تم میری اولاد ہو اور میں نے لوگوں سے کہہ دیا تھا کہ نعمان کتنی ہی سازشیں کر لے، میرے بچے کو مجھ سے دور کرنے کے لیے اس دنیا کے آخری سرے پر بھیج دے لیکن ایک دن ایسا ضروری ہے گا جب وہ مجھ تک پہنچے گا اور آج میں اپنے دعوے میں سرخرو ہوں۔ آؤ تم اس طرح سرد مہری سے کیوں کھڑے ہوئے ہو۔ ماں ہوں میں تمہاری۔ آؤ...... میرے ساتھ آؤ''۔

اس نے ایک بار پھر میرا ہاتھ پکڑا اور مجھے لیے ہوئے اس چاندی کی گھنٹی والے دروازے کی جانب چل پڑی۔ ادھر ایک راہداری تھی جس کا اختتام ایک بڑے سے کمرے پر ہوتا تھا لیکن راہداری کی دونوں شاخیں دائیں بائیں پھوٹ گئی تھیں اور ادھر بھی بہت سے کمرے نظر آ رہے تھے۔ جب ہم کمرے کے دروازے کے سامنے پہنچے تو دروازہ خود بخود کھل گیا۔ اطراف میں کوئی موجود نہیں تھا۔ اس نے اپنی خوبصورت بادامی آنکھوں سے مجھے اشارہ کیا اور میں اس کے ساتھ کمرے میں داخل ہو گیا۔ وہ آہستہ سے بولی۔

''تم خاموش کیوں ہو؟'' دروازہ خود بخود بند ہو گیا۔ اندر جو فرنیچر اور ساز و سامان نظر آ رہا تھا، وہ صحیح معنوں میں کسی شہزادی کی خوابگاہ سے کم نہیں تھا۔ اس نے ایک بہت ہی قیمتی اور اونچے صوفے کی جانب اشارہ کیا جس پر بیٹھنے کے بعد انسان سب کی نگاہوں سے روپوش ہو جاتا تھا۔ میں بیٹھ گیا اور وہ میرے بالکل قریب بیٹھ گئی۔ اس کی آنکھوں میں ممتا کی جھلک تھی۔ وہ آہستہ سے بولی۔

''تم بولتے کیوں نہیں احمد اسدی! میری زندگی، مجھ سے بولو۔ مجھ سے بات کرو''۔ میں نے نگاہیں اٹھا کر اسے دیکھا اور کہا۔

''کیا ایک نگاہ میں پہچاننے والی ماں ٹیلی فون پر میری آواز نہیں پہچانی تھی؟''

''کیا مطلب؟''

''میں مطلب بتانا نہیں چاہتا''۔

''میں نے تمہاری آواز پہلے کب سنی تھی؟ زندگی میں پہلی بار تو مجھے یہ سنہرا دن دیکھنا نصیب ہوا ہے۔ میں نے تمہاری آواز کو نہیں پہچانا تھا، بھلا میں جھوٹ کیوں بولوں گی؟''

''اور میرا چہرہ؟''

''وہ میں نے پہچان لیا''۔

''کس طرح؟''

''بس اس میں مجھے اپنی ماما کے نقوش ملتے ہیں''

''میں طویل جدوجہد کرنے کے بعد یہاں پہنچا ہوں اور تم تک آنے کے لیے بے شمار مراحل سے گزرنا پڑا ہے اور اس کے بعد جب میں اپنے جذبات کے ساتھ تم تک پہنچا تو میری ملاقات دوسری عورت سے کیوں کرائی گئی؟''

زمرد جہاں کے چہرے پر ایک لمحے کے لیے عجیب سے تاثرات پھیل گئے۔ پھر وہ ایک گہری سانس لے کر آہستہ سے بولی۔

''تو کیا تم اس بات سے ناراض ہو؟''

''مجھے اپنے سوال کا جواب درکار ہے''۔ میں نے بدستور سرد لہجے میں کہا اور وہ کسی قدر تشویش سے مجھے دیکھنے لگی۔ پھر آہستہ سے مسکراتے ہوئے بولی۔

''سرد مہر، بے رحم اور سخت لہجہ...... کیا یہی تمہارا مزاج ہے؟''

میں نے خاموشی اختیار کیے رکھی تو اس نے جلدی سے کہا۔

''میں ان دنوں کچھ ایسے حالات کا شکار ہوں جس کی تفصیل میں تمہیں ضرور بتاؤں گی۔ اس کے پیشِ نظر ہم ہر آنے جانے والے پر غور کر لیتے ہیں۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ کوئی ایسا شخص میرے پاس آئے جس نے اپنے بازو پر بارود باندھ رکھا ہو اور وہ مجھ پر خودکش حملہ کر دے۔ اس کے امکانات ہیں اور یہی وجہ ہے کہ اس عورت کو تمہاری ماں کے طور پر تمہارا انٹرویو لینے کے لیے بھیجا گیا''۔

''چلو ٹھیک ہے، میں اس حقیقت کو تسلیم کیے لیتا ہوں۔ اب مجھے یہ بتاؤ کہ نعمان اسدی سے تمہاری علیحدگی کیوں ہوئی''۔

''دیکھو، ان باتوں کے لیے تو ابھی ہمارے پاس بہت وقت پڑا ہے۔ کم از کم مجھے اس کا موقع دو کہ میں تمہاری آمد کی خوشی محسوس کر لوں۔ تم میرے بارے میں کیا جذبات رکھتے ہو؟''

''جو حقیقت ہے وہ یہی ہے کہ میں نے تمہیں پہلی نگاہ میں ماں جیسا نہیں پایا۔ البتہ ہمارے درمیان مفاہمت ہو سکتی ہے لیکن بہرحال میں ان جذبوں کو مکمل نہیں پا سکا جن کا تصور دل میں لے کر یہاں تک آیا تھا''۔

زمرد جہاں کچھ دیر خاموش رہی پھر اس نے کہا۔ ''تم بے سر و سامانی کے عالم میں یہاں

ہو۔ تمہارا سامان کہاں ہے؟''

''اس ہوٹل میں جہاں سے میں نے تمہیں ٹیلی فون کیا تھا''۔

''مجھے اس کا پتا بتاؤ؟''

ٹھیک ہے، پتا سن لو''۔ اور میں نے اپنے ہوٹل کا پتا دہرا دیا۔

زمرد جہاں نے اپنے قریب رکھے ہوئے ایک چوکور ٹیلی فون کا بٹن دبایا اور کسی کو ہدایت ں۔ وہ بڑے کر و فر سے ہر کام کر رہی تھی اور میں محسوس کر رہا تھا کہ اس میں واقعی ایک ئی چیز ہے جو شاید میری ماں کے اندر ہی ہوسکتی ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ باپ کے مزاج ں میرے اندر میری ماں کی خصوصیات زیادہ سمائی ہوں۔ اس نے کہا۔

'کتنا سنگدل تھا وہ شخص جس کا نام نعمان اسدی تھا۔ جس نے مجھے ان ضرورتوں سے بھی ہونے دیا جو ماں کے اندر بیٹے کے لیے ہوتی ہیں۔ احمد تم بالکل محسوس نہ کرنا کہ میں ساتھ کس طرح پیش آ رہی ہوں لیکن بس یوں سمجھ لو کہ مجھے ماں کی حیثیت سے رہنے اگیا۔ مگر یہ باتیں بہتر ہے کہ ہم فارغ اوقات میں کریں۔ فی الحال تم آرام کرو۔ مجھے ے کام کرنے ہیں۔ اس کے بعد ڈنر پر ہم مفصل گفتگو کریں گے۔ آؤ، میں تمہیں تمہارا ادوں اور اس کے بعد تمہارا لباس وغیرہ بھی آ جائے گا اور پھر ہم آرام سے باتیں گے''۔

ں نے اس کی بات سے انحراف نہیں کیا اور وہ مجھے ایک دوسرے کمرے تک پہنچا گئی۔ نے دوبارہ میرے شانے کو بوسہ دیا اور کمرے سے باہر نکل گئی۔ میں ایک آرام دہ کرسی دگیا۔

رے میں اعلیٰ درجے کا فرنیچر سجا ہوا تھا۔ طرح طرح کی تصاویر آویزاں تھیں اور ان ے زمرد جہاں کے رجحانات کا اندازہ ہوتا تھا لیکن مجھے کسی شئے سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ لف خدام کے ساتھ جو وقت گزرا تھا، وہ منفرد نوعیت کا تھا اور اس کے بعد ایک ا پورا کرنے کے لیے اپنے وطن واپس آنا پڑا تھا۔ وہاں لالچ اور ہوس کا کھیل دیکھ کر بائیں ہاتھ کا کام تھا اور اس سلسلے میں مجھے کمال حاصل تھا۔ لوگ کہتے ہیں کہ جلد فیصلے بہتر نہیں ہوتے لیکن میرا خیال اس کے برعکس ہے۔ میں کہتا ہوں، جن فیصلوں یدا ہو جاتا ہے، وہ صحیح ہو ہی نہیں سکتے۔ صحیح فیصلہ لمحوں میں ہوتا ہے اور وہی کار آمد ہوتا

ہے۔ پھر اپنے وطن سے اپنی ماں کے آبائی وطن پہنچا کیونکہ مجھے اس کی زندگی کی خبر دی گئی تھ
حقیقت یہ ہے کہ حاکف خدام کا بھی یہی کہنا تھا کہ ماں باپ کے بغیر اولاد ایک عجیب کیف
کا شکار ہو جاتی ہے اور میں اسی کیفیت کا شکار تھا۔

باپ تھا، نہ ہونے کے برابر...... ماں کا تصور دل میں یہ تھا کہ اس کا اس کائنات میں کوئی
نہیں اور ان دونوں چیزوں نے مجھے ایک عجیب وغریب فطرت کا مالک بنا دیا تھا۔ بہرحال
کی آرزو لے کر یہاں آیا تھا۔ اس کی تلاش اور تگ و دو کی اور جب محبت کا ایک طوفان بپا
آتش فشاں لے کر اس کے حضور پہنچا تو وہ بوڑھی عورت آ گئی جس نے ان تمام تصورات کو
میٹ کر دیا اور آتش فشاں سرد ہو گیا، طوفان ساکت ہو گیا۔ تب زمرد جہاں نے ماں کے
پر سامنے آ کر ذہن کو کچھ اور جھٹکے دیئے اور اب میں سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ تصورات کی
حقیقت کی دنیا سے بالکل الگ ہوتی ہے۔ ماں کے بارے میں بے شک کچھ لوگوں نے انوکھی
دلچسپ کہانیاں لکھی ہیں لیکن اگر زمرد جہاں ہی ماں ہوتی ہے تو پھر یہ کہانیاں، دوسری کہانی
کی طرح صرف اختراعات ہیں۔

تقریباً ایک گھنٹہ اسی طرح خاموش بیٹھے بیٹھے گزر گیا اور میں نہ جانے کون کون
جہانوں کا سفر طے کرتا رہا۔ زمرد جہاں کسی خاص کام میں مصروف ہو گئی ہوں گی۔ کوئی ا
گھنٹے کے بعد ہوٹل سے میرا سامان آ گیا اور اس کے ساتھ ہی وہ حسین لڑکی جسے ملا
حیدر سماوی کی قیام گاہ میں دیکھا تھا اور جس نے مجھے اغوا کیا تھا، اندر داخل ہو گئی۔

اس وقت اس کے چہرے پر پھول کھلے ہوئے تھے اور کم بخت اس وقت پوری کی پورا
گلستان معلوم ہو رہی تھی۔ اس کے ہونٹ مسکرا رہے تھے۔ پھر اس نے سر جھکائے جھکائے
انکھیوں سے مجھے دیکھا۔ اپنی دانست میں اس نے مجھ پر ہلاکتوں کے بہت سے وار کر ڈالے
تھے اور شاید وہ یہ سوچ رہی تھی کہ میں اس کی آنکھوں کے میزائلوں کا شکار ہو گیا ہوں لیکن
مجھے جانتی نہیں تھی۔ پھر اس نے اپنے خوبصورت بالوں کو ایک جھٹکا دیا اور سیدھی کھڑی ہو گئی
غالباً اس احساس کا شکار ہو گئی تھی جسے پندارِ حسن کی توہین کہا جاتا ہے۔ تب آہستہ آہستہ میرے
قریب پہنچی اور بولی۔

"مجھے پہچانا؟"

"جسے زندگی میں ایک بار دیکھ لیتا ہوں۔ اسے کبھی نہیں بھولتا۔ تمہیں میں نے دوبارہ دیکھا

وہ کھنکتی ہوئی آواز میں ہنس پڑی پھر بولی۔ "لیکن ایسے نہ دیکھا ہوگا جیسے اب دیکھ رہے ہو"۔

"اگر مبہم گفتگو کرنے کی عادی ہو تو میں معافی چاہتا ہوں۔ بات وضاحت سے کرو۔ میں
پوچھوں گا کہ تمہاری اس بات کا کیا مطلب ہے"۔

"اوہو...... ہاں خاتون زمرد جہاں نے بتایا تھا کہ ذرا سخت مزاجی ہے آپ کے اندر"۔

"شاید، بات پھر بھی مکمل نہیں ہوئی"۔

"کچھ نہیں، بس میں یہ ہی سوچ رہی تھی کہ اب آپ کے کیا تاثرات ہوں گے ہمارے
بارے میں"۔

"ٹھیک ہے، تم جو کچھ سوچ رہی تھیں وہ تمہاری اپنی سوچ ہے"۔

"کیا آپ مجھ سے بات نہیں کرنا چاہتے؟"

"میں نے اس کا اظہار نہیں کیا"۔

"زمرد جہاں نے کہا ہے کہ میں ڈنر تک آپ کے ساتھ رہوں اور آپ سے باتیں کروں"۔

"کریں مجھے کوئی اعتراض نہیں"۔

"شکریہ، میرا نام دانیہ ہے!" وہ سامنے بیٹھتے ہوئے بولی۔

"میں نے یہ نام اس وقت سنا تھا جب زمرد جہاں نے تمہیں واپس جانے کیلئے کہا تھا"۔

"گڈ...... اور آپ کا نام تو میں جانتی ہوں"۔

"خوشی کی بات ہے"۔

"آپ کیسی باتیں کرتے ہیں"۔

"ناپسند ہیں؟"

"نہیں یہ تو نہیں کہوں گی لیکن بس ایسا لگتا ہے جیسے آپ گفتگو کرنا نہ چاہتے ہوں"۔

میں نے ایک گہری سانس لی اور اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ پھر وہ بولی۔

"آپ باتیں کیجیے ناں"۔

"تمہاری تنظیم کا کیا نام ہے؟" میں نے کہا اور وہ چونک پڑی۔ چند لمحات مجھے دیکھتی رہی
اے۔

"اس کا جواب دینا میرے لیے ممکن نہیں"۔

"شادی شدہ ہو؟"

"نہیں......" وہ حیرت سے بولی اور میرے آگے بولنے کا انتظار کرنے لگی لیکن میں کچھ آگے نہیں کہا تھا۔ شاید وہ خود ہی میری باتوں سے بیزار ہو گئی تھی اور تھوڑی دیر کے بعد سے معذرت کرتے ہوئی بولی۔

"مجھے کچھ کام یاد آ گئے ہیں، اجازت دیجیے"۔ اور پھر میرے اجازت دینے سے پہلے کمرے سے باہر نکل گئی۔ میرے ہونٹوں پر ایک آسودہ سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

پھر رات ہو گئی۔ میں نے یہ وقت گزار لیا تھا۔ خاتون زمرد جہاں نے میرے کر میں آ کر مجھ سے ملاقات کی۔ وہ اس وقت دوسرا لباس پہنے ہوئے تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے ا حسین لباس پہننے اور میک اپ کرنے کے علاوہ اور کوئی کام نہیں۔ وہ کسی بھی طور پر مجھے ما حامل نظر نہیں آتی تھی۔ بہرحال میں نے اس موضوع پر سوچنا چھوڑ دیا تھا۔

میں نے لباس تبدیل کر لیا تھا۔ ایک ہاف آستین کی شرٹ اور پتلون، اس نے مجھے د اور کہنے لگی۔

"تمہارا قد و قامت، تمہاری بلندی اور تمہارا ورزشی جسم دیکھنے کے بعد مجھے یوں محسو ہوتا ہے جیسے میں اپنی پشت پر ایک دیوار تعمیر کرنے میں کامیاب ہو گئی ہوں۔ آؤ میرے سا ہم ڈنر ٹیبل پر چلتے ہیں"۔

ڈنر ٹیبل بہت شاندار تھی۔ سونے اور چاندی کے برتن سجے ہوئے تھے اور ان کے درمیا نہایت نفاست سے اعلیٰ درجے کا کھانا چنا ہوا تھا۔ خاموش اور باوردی ملازم آہستہ آہستہ اپنا کا سرانجام دینے لگے اور ہم ماں بیٹے کے درمیان کھانا سرو کیا جانے لگا۔ باقی اور کوئی میز پر نہیں تھا کھانے سے نہایت خاموشی کے ساتھ فراغت حاصل کی گئی اور پھر ملازموں نے بر اٹھائے اور کافی کا سامان میز پر سجا دیا تو خاتون زمرد جہاں نے کہا۔

"ہمیں یہیں گفتگو کرنی چاہیے، کیا یہ جگہ تمہیں پسند نہیں آئی؟"

"ہاں......" میں نے آہستہ سے کہا۔

"تم اتنے ہی کم گو ہو یا مجھ سے اب تک کبیدہ خاطر ہو؟" خاتون زمرد جہاں بولی۔

"نہیں، میں کم بولتا ہوں"۔

"یہ بتاؤ کہاں رہے، کہاں پرورش پائی، کس کے بارے میں کیا تجربہ ہے؟"

"یورپ میں رہا۔ مختلف لوگوں میں رہا ہوں۔ دنیا کے بارے میں تجربے ہی کرتا رہا۔ برے والد نعمان اسدی مجھ سے بہت کم ملاقات کیا کرتے تھے...... صرف کام کی باتیں۔ آپ کے بارے میں انہوں نے کہا تھا کہ آپ مر چکی ہو اور میں نے آپ کو مرحومہ ہی تصور کیا تھا۔ پھر نعمان اسدی کی موت کی اطلاع ملی تو ایک ناگوار فرض سرانجام دینے کے لیے میں واپس آیا۔ کچھ لوگوں سے ملاقات کی اور اس کے بعد پتا چلا کہ آپ زندہ ہو"۔

"وہ شخص قابلِ نفرت تھا۔ بعض اوقات جذبات میں کیے گئے فیصلے کس طرح زندگی بھر کا عذاب بن جاتے ہیں، یہ کوئی میرے دل سے پوچھے اور پھر یہ تو مجھے بعد ہی میں پتہ چلا کہ وہ نہائی گھٹیا خاندان سے تعلق رکھتا ہے۔ یقیناً ان لوگوں سے تمہاری ملاقات ہوئی ہو گی؟"

"معیار کا تجزیہ کرنا بڑا مشکل کام ہے ہر شخص اپنا اپنا ایک معیار بنا لیتا ہے۔ وہ موضوع ختم ہو گیا۔ میں یہاں تمہاری تلاش میں آیا تھا۔ بہت سے خاکے بہت سے تصورات بنا کے اور شاید نعمان اسدی کی موت کے بعد جب ایک آزاد زندگی حاصل ہوئی ہے، میں اس وقت کو اپنے لیے ایک فیصلہ کن وقت کہتا ہوں"۔

"میں تمہارے الفاظ سمجھنے کی کوشش کر رہی ہوں"۔

"نہیں، اپنے ذہن پر زور نہ دو، میں جو بات کرتا ہوں اس کی وضاحت بھی کرتا ہوں"۔

"ہاں کہو"۔

"یہاں کیا کر رہی ہو؟"

"زندگی میں جو کچھ کھو چکی تھی، اس نے مجھے نڈھال کر دیا تھا۔ نعمان اسدی نے سازش کر کے مجھے تم سے دور کر دیا۔ ماں کی ممتا مجھے دیکھنے ہی نہ دی۔ اولاد کیا ہوتی ہے، اس کا احساس ہی اس شخص نے مجھ سے چھین لیا اور آخر کار میں نے اپنے لیے مشغلے تلاش کیے۔ بعد میں احساس ہوا کہ زندگی کی ذمہ داریاں تو کچھ اور بھی ہوتی ہیں۔ چنانچہ ان میں سے کچھ ذمہ داریاں قبول کر لیں اور سرگرمِ عمل ہو گئی۔ مجھے جینے کی آسانیاں حاصل ہو گئی تھیں"۔

"میرے لیے افسردہ تھیں؟"

"ہاں......"

"آپ مجھے بھول گئی تھیں؟"

"انکار نہیں کروں گی"۔

''میرے مل جانے کے بعد آپ کے دل میں کیا تاثرات ہیں؟''

''بہت خوش ہوں''۔

''اس لیے کہ ایک بیٹا مل گیا ہے؟''

''ہاں...... بڑا مان ہوتا ہے۔ اپنی اولاد پر اور پھر وہ ایسی اولاد جسے دیکھ کر رشک آئے۔ تم میرے بیٹے ہی نہیں بلکہ اب میرے مشن میں میرے دستِ راست بھی بنو گے''۔

''مشن کیا ہے؟''

''ابھی معلوم کر لو گے؟''

''ہاں......''

''یہ جلد بازی نہیں ہوگی؟''

''نہیں، کیونکہ میں ذہن پر بوجھ رکھنے کا عادی نہیں ہوں''۔ میں نے جواب دیا۔

خاتون زمرد جہاں سوچ میں ڈوب گئیں۔ چند لمحات اس کے چہرے کے تاثرات تبدیل ہوتے رہے پھر وہ سرد لہجے میں بولی۔

''ہم امیر کے خاندان کو دوبارہ برسرِ اقتدار لانا چاہتے ہیں''۔

''کیوں؟''

''اس لیے کہ موجودہ طرزِ حکومت سے ہمیں اختلاف ہے۔ اقتدار کا حقدار امیر کا خاندان تھا لیکن جو کچھ ہوا ہے اس سے ہم اتفاق نہیں رکھتے''۔

''اس ملک کی پالیسی بالکل ٹھیک چل رہی ہے۔ حکومت اپنے مقاصد پورے کر رہی ہے لوگ مطمئن ہیں''۔

''لیکن ہم مطمئن نہیں ہیں''۔

''تنظیم کتنے افراد پر مشتمل ہے؟''

''کافی لوگ ہیں۔ ان کی تعداد تقریباً ڈیڑھ سو کہی جا سکتی ہے''۔

''اس ملک کی آبادی کتنی ہے؟''

''کیوں؟'' زمرد جہاں نے سوال کیا۔

''حکومت سے غیر متفق لوگوں کی تعداد ڈیڑھ سو ہے جبکہ باقی آبادی حکومت سے اتفاق کرتی ہے اور جو باب ختم ہو گیا ہے اسے دہرانا عقلمندی نہیں ہے''۔

''یہ باتیں تم نہیں سمجھ سکتے۔ اول تو تم یہاں کے باشندے نہیں ہو۔ دوسری بات یہ کہ تنظیم کی گہرائیوں میں بہت کچھ ہے''۔

''وہ بہت کچھ کیا ہے؟''

''افسوس یہ بتایا نہیں جا سکتا''۔

''لیکن میں جانتا ہوں''۔

''کیا جانتے ہو؟''

''یہی کہ اس اسلامی ملک کی سرفروشانہ پالیسی بہت سے ممالک پسند نہیں کرتے جو اس ملک پر اپنا ویسا تسلط چاہتے ہیں جو امیر کے دور میں تھا''۔

''تمہیں ایسی باتیں نہیں کرنی چاہئیں''۔

''کرنی چاہئیں، میں بچہ نہیں ہوں۔ ڈیڑھ سو افراد جو دوسروں کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی بنے ہوئے ہیں، لاکھوں افراد کی زندگی خطرے میں ڈالنے کا باعث بنیں گے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ اس تنظیم سے تمہاری علیحدگی کے بعد تنظیم کی بقا کس شکل میں ہوگی لیکن میں تمہیں ان حالات سے علیحدہ کرنا چاہتا ہوں''۔

''کیسی بچوں جیسی باتیں کر رہے ہو؟''

''نہیں خاتون زمرد جہاں میں ان سے اتفاق نہیں کرتا''۔

''تم مجھے کس انداز سے مخاطب کر رہے ہو۔ میرے کان اس بات کے خواہشمند ہیں کہ تم مجھے ماں کہہ کر پکارو''۔

''میں تمہیں یورپ لے جانا چاہتا ہوں''۔

''کیا......؟'' وہ حیرت سے بولی۔

''ہاں...... میں تمہیں ماں کہہ کر پکاروں گا لیکن اس وقت جب میں تمہیں ماں کے روپ میں دیکھوں گا''۔

''نہیں احمد، یہ ممکن نہیں ہے''۔

''تم پر میرا بہت قرض ہے۔ زمرد جہاں! تمہیں میرا قرض اتارنا چاہیے''۔

''کیسا قرض؟''

''بچپن سے آج تک میں ماں کی محبت کے لیے ترستا رہا ہوں اور اب میں چاہتا ہوں

کہ مجھے تمہاری وہ محبت ملے جو میرا حق ہے۔ میں آج بھی اپنے آپ کو ایک ننھا بچہ سمجھنے کے لئے تیار ہوں، میرا دل چاہتا ہے کہ میں اپنا سر تمہاری آغوش میں رکھ کر آنکھیں بند کر لوں۔ یہ میرے دل کی پیاس ہے۔ میرا دل تمہیں ماں کہنے کو چاہتا ہے لیکن میں تمہیں ماں کے مقدس روپ میں دیکھنا چاہتا ہوں۔ میں تمہیں یورپ لے جانا چاہتا ہوں اور تمہیں میرے ساتھ چلنا ہوگا“۔

”میں تمہاری خواہشوں کا احترام کرتی ہوں۔ میں جانتی ہوں کہ تم دھوکے میں رکھے گئے ہو لیکن اس وقفے میں جو میرے اور تمہارے درمیان رہا، میری ذہنی کیفیات بہت سے رخ دھار چکی ہیں۔ میں نے بڑی ستم رسیدہ زندگی گزاری ہے اور آخر کار میں اپنے ان جذبوں کو دفن کرنے میں کامیاب ہوگئی ہوں جو مضطرب کر دیتے ہیں اور آج میں ایک ٹھوس شخصیت کے طور پر تمہارے سامنے ہوں۔ احمد اسدی! میں تم سے وعدہ کرتی ہوں کہ جوں جوں میرے دل میں تمہاری محبتوں کے چراغ جلتے رہیں گے، میں تمہارے تمام قرض اتار دوں گی لیکن تمہیں اپنے باپ کی طرح مجھ سے منحرف نہیں بلکہ میرے مقاصد میں میرا ہمسفر بننا ہوگا“۔

”خاتون زمرد جہاں! یہ ممکن نہیں ہے“۔

”ایسی باتیں مت کرو۔ میں تنظیم میں اتنا اعلیٰ عہدہ رکھتی ہوں کہ تم تصور نہیں کر سکتے“۔

”بہرحال تنظیم میرے بعد وجود میں آئی ہے۔ مجھ سے پہلے نہیں اور میں اپنے مؤقف کو درست تسلیم کرتا ہوں“۔

”لیکن میں اسے نہیں مانتی“۔ خاتون زمرد جہاں کے انداز میں کچھ برافروختگی رونما ہوئی اور میں نے گہری نگاہوں سے اسے دیکھا۔ چند لمحات وہ خاموش رہی، پھر اس نے کہا۔

”وہ کتاب! وانیہ نے اس بارے میں مجھے تفصیل بتائی ہے۔ اس نے بتایا کہ وہ کتاب تمہارے پاس ہے“۔

”ہاں وہ میرے پاس موجود ہے اور میں نے اسے تمہاری آدمیوں سے حاصل کیا ہے“۔

”ہاں یہ پوری تفصیل میرے علم میں لائی گئی ہے اور اب جب مجھے یہ علم ہوا کہ کتاب کو حاصل کرنے والا میرا اپنا بیٹا ہے تو میں خوب ہنسی اور میں نے ان لوگوں کا خوب مذاق اڑایا۔ میں نے ان سے کہا دیکھو! یہ میرا خون ہے جو اس قدر قوت رکھتا ہے کہ تم لوگ اس کا مقابلہ نہ کر سکے“۔

”یہی تمہیں آگے بھی سوچنا چاہیے، خاتون زمرد جہاں! کہ تم اپنی تنظیم کے ان افراد کو میرے مقابلے میں آنے سے روکو“۔

”میرا خیال ہے کہ تم ایک ایسی ضد کر رہے ہو جس کے بارے میں تمہیں کچھ نہیں معلوم ب کچھ بے حد ضروری ہے۔ تم سمجھنے کی کوشش کرو“۔

”اور جو کچھ میں سمجھ لیتا ہوں اور مجھے یقین ہوتا ہے کہ یہ میں نے غلط نہیں سمجھا تو پھر وہ ف میرا ایمان بن جاتا ہے۔ تم جانتی ہو کہ تمہارے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے یں نے حیدر سماوی کا سہارا لیا تھا۔ حیدر سماوی نے تم سے رجوع کیا تھا کہ اگر کتاب اس حوالے کر دی جائے تو وہ تمہارا بیٹا تم سے ملا دے گا۔ میں نے حیدر سماوی کو یہ چیلنج کیا کہ ری ماں میرے لیے اپنی تمام مصروفیات ختم کر دے گی اور وہ صرف میرے ساتھ رہے گی اور تصور کے ساتھ میں نے اس سے تمہاری کتاب کے وہ اوراق بھی لے لیے جن کے لیے تم ن نہ جانے کب سے سرگرداں تھے۔ یہ سب کچھ میں نے بیٹھک کر لیا ہے لیکن اس کے بعد نے آپ کو اس بات کا حق دار سمجھتا ہوں کہ تمہیں یہ سب کرنے سے روک دوں“۔ خاتون رد جہاں کے چہرے پر شدید اشتیاق کے آثار پیدا ہوگئے تھے۔ اس نے کہا۔

”تم نے حیدر سماوی سے وہ صفحات بھی حاصل کر لیے؟“

”ہاں، خاتون زمرد جہاں“۔

”کہاں ہیں وہ؟“

”میرے پاس محفوظ ہیں۔ ظاہر ہے، میں انہیں ہوٹل میں دوسروں کے رحم و کرم پر نہیں ہوڑ سکتا تھا“۔

”اوہ میرے خدا! لاؤ! وہ مجھے دے دو۔ تم نہیں سمجھتے آہ...... تم نے وہ کر دکھایا ہے جس ا توقع تم سے کی جا سکتی تھی۔ میری زندگی، میری روح، وہ اوراق مجھے دے دو“۔

”ان اوراق میں اس ملک کے خلاف سازش کی گئی ہے“۔ میں نے کہا۔

”یہ تمہاری غلط فہمی ہے“۔

”نہیں خاتون زمرد جہاں یہ غلط فہمی نہیں ہے“۔

”کتاب کہاں ہے؟ مجھے دکھاؤ تو سہی“۔ وہ بولی

کتاب کو میں نے اپنے پاس بالکل محفوظ رکھا تھا چنانچہ میں نے وہ کتاب نکال کر اسے ھائی...... خاتون زمرد جہاں نے ہاتھ بڑھایا تو میں نے اسے پیچھے کرتے ہوئے کہا۔

”اسے میرے ہاتھوں میں دیکھو تو بہتر ہے“۔ اچانک ہی اس کا چہرہ لال بھبھوکا ہوگیا۔

وہ ایک دم اپنا چولا بدلنے لگی اور اس نے سرد لہجے میں کہا۔

''یہ میری رہائش گاہ ہے۔ یہ میرا گھر ہے۔ یہاں چپے چپے پر میرے جاں نثار پھیلے ہوئے ہیں اور میرے سامنے آنے والے یہ بات جانتے ہیں کہ انہیں میرے ہر حکم پر بس ہاں کہنا ہو ہے۔ سمجھ رہے ہو نا تم...... اور تم میری اولاد ہونے کے باوجود مجھ سے اس قدر منحرف ہو''۔

میرے ہونٹوں پر تلخ مسکراہٹ پھیل گئی، میں نے آہستہ سے کہا۔

''خاتون زمرد جہاں! آپ نے مجھے جو کچھ بتایا ہے اس کے لیے شکریہ! کم از کم اس سے مجھے آپ کی شخصیت کو سمجھنے کا موقع تو ملا۔ ایک بار پھر میں آپ سے عرض کر رہا ہوں کہ میری رگوں میں آپ ہی کا خون ہے بلکہ شاید زیادہ شدید ہے۔ اس لیے مجھ سے ایسی گفتگو نہ کیجیے جو مجھے آپ سے بالکل ہی منحرف کر دے کیونکہ ابھی تک آپ لوگوں کے رویے کی بنا پر میں اپنے آپ کو آپ سے دور ہی سمجھ رہا ہوں''۔

خاتون زمرد جہاں نے بغور مجھے دیکھا اور پھر ایک ٹھنڈی سانس لے بولیں۔

''ہاں...... ٹھیک ہے، اب تمہارا کیا مؤقف ہے؟''

''تمہیں میرے ساتھ یورپ چلنا ہوگا''۔

''یہی الفاظ، یہی انداز تمہارے باپ کا بھی تھا اور وہیں سے ہمارے درمیان اختلافات کا آغاز ہوا تھا۔ آج وہ کہانی پھر دہرائی جا رہی ہے''۔

''لیکن اس کہانی کا انداز مختلف ہے۔ میں تمہارے وجود کا ایک حصہ ہوں جبکہ نعمان اسدی تمہارا شوہر تھا''۔

''میں اپنے اس ہاتھ کو جنبش دے سکتی ہوں دیکھ رہے ہو نا؟'' اس نے اپنا ایک ہاتھ فضا میں لہراتے ہوئے کہا۔

''ہاں''۔

''اور میں اپنے بدن کو بھی جنبش دے سکتی ہوں، یوں''۔

''ٹھیک ہے''۔

''اور تم کہتے ہو کہ تم میرے وجود کا حصہ ہو''۔

''ہاں، مانتا ہوں لیکن دنیا سے گہرا تعلق رہا ہے۔ تم سے تو تعلقات کا اب آغاز ہوا ہے اور اس کے بعد فیصلہ ہوگا کہ یہ تعلقات کس نہج تک پہنچ سکتے ہیں''۔

''مجھے سوچنے کا موقع دو''۔ وہ آہستہ سے بولی اور میں اس کا چہرہ دیکھنے لگا۔

وہ نہیں جانتی تھی کہ حاکف خدام نے مجھے کون سے علوم سے آراستہ کیا ہے۔ میں جانتا تھا کہ آنکھیں ہر احساس کی غماز ہوتی ہیں اور اگر آنکھوں کو پڑھنے کا فن جان لیا جائے تو سچ اور جھوٹ کی تمیز کی جا سکتی ہے۔ چنانچہ مجھے یہ احساس ہوا کہ اچانک ہی اس کے اندر مکر بیدار ہوا ہے۔ میری ماں نے میرا مؤقف تسلیم نہیں کیا تھا بلکہ اپنے مؤقف کے لیے وہ کوئی منصوبہ بندی کر رہی تھی۔ پھر اس نے بے اختیار مسکراتے ہوئے کہا۔

''کیسا عجیب ہے میرا بیٹا، کتنا حیران کن! اور جب میں مکمل طور پر یقین کرنے میں کامیاب ہو جاؤں گی کہ تم میری زندگی کا ایک حصہ ہو تو کتنی خوشیاں ہوں گی مجھے، آہ......! شاید رات بہت زیادہ ہو چکی ہے کیا تم سونا پسند کرو گے؟''

''ہاں میرا بھی سونے کا وقت ہو رہا ہے''۔

''تو پھر چلو میں تمہیں تمہارے کمرے میں چھوڑ دوں گا''۔

''نہیں، خاتون زمرد جہاں! مجھے وہ سب کچھ کرنے دیجیے جو بیٹے کا حق ہوتا ہے''۔

''یعنی؟''

''میں آپ کو آپ کی خواب گاہ تک چھوڑ کر شب بخیر کہوں گا''۔ وہ ہنسی اور اس نے اشارے سے مجھے ساتھ آنے کے لیے کہا۔ تب میں اس کی شاندار خواب گاہ کی طرف چل پڑا۔ خواب گاہ میں داخل ہونے کے بعد وہ کچھ جذباتی سی ہو گئی۔ اس نے کہا۔

''تم نے ابھی تک مجھے میرے وہ حقوق نہیں دیئے جن کی میں حقدار ہوں''۔ میں آہستہ آہستہ چلتا ہوا اس کی مسہری پر جا بیٹھا اور میں نے گردن جھکا لی۔ وہ خاموش نگاہوں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔

''میں تمہیں تمہارے وہ حقوق دینا چاہتا ہوں لیکن میرا مؤقف بھی سمجھو۔ تنظیم کے معاملات میں الجھ کر تم مجھے وہ سب کچھ نہ دے سکو گی جو میری برسوں کی خواہش ہے۔ میری بات مانو، میرے ساتھ یورپ چلو''۔

''آہ...... کاش یہ ممکن ہوتا، میں واقعی تمہاری بات مان لیتی لیکن میں نے جس کھیل کا آغاز کیا ہے، اب وہ اس نہج پر پہنچ چکا ہے کہ اگر میں اس میں کچھ تبدیلیاں کروں تو بے شمار افراد کی زندگی خطرے میں پڑ جائے گی''۔

"میں تمہیں اپنے لیے جذباتی دیکھنا چاہتا ہوں"۔

خاتون زمرد جہاں اپنی جگہ سے آگے بڑھی۔ اس نے الماری سے شب خوابی کا لباس نکالا اور اسے ایک اسٹینڈ پر ڈال دیا پھر بولی۔

"میں اس موضوع پر تم سے کل بات کروں گی"۔

"جیسا تم پسند کرو۔ مجھے اعتراض نہیں ہے"۔

میں اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا اور وہ عجیب سی نگاہوں سے مجھے دیکھنے لگی۔ پھر میں نے اس سے آہستہ سے کہا۔

"شب بخیر......" اور اس وقت میں نے اس کے لہجے میں ایسی لرزشیں پائیں جو کسی خاص تصور کا پیش خیمہ ہوتی ہیں۔ تب میں اس کے کمرے سے نکل کر اپنے کمرے کی جانب چل پڑا۔

حاکف خدام کا کہنا تھا کہ وقت اپنے فیصلے خود کرتا ہے اور سب سے بڑی کامیابی اس شخص کو حاصل ہوتی ہے جو وقت پر نگاہ رکھے۔ ہم اگر کسی ایسے شخص سے دھوکہ کھا گئے جس کے لیے ہمارے دل میں بہت اچھے اور پاکیزہ جذبات ہوتے ہیں تو اس سے زیادہ بدتر عمل اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ لہجے کی لرزش اور نگاہوں کے زاویے بتاتے ہیں کہ سچ کیا ہے اور جھوٹ کیا چنانچہ ہمیں اپنے دشمنوں سے زیادہ دوستوں سے محتاط رہنا چاہیے چونکہ یہاں ہماری سوچ کے دائرے سکڑے ہوئے ہوتے ہیں۔

اور حاکف خدام کے افکار میرے لیے ہمیشہ ہی معاون ثابت ہوئے تھے۔ سو اس وقت بھی میں نے ان تمام تصورات کو ذہن میں رکھا تھا۔ ایک طویل عرصے کی جدائی جتنا فاصلہ اور جتنا خلاء پیدا کر دیتی ہے، اس خلاء میں پاؤں نہیں پڑنا چاہیے۔ اپنے کمرے میں آ کر میں نے لباس تبدیل کیا اور مسہری پر لیٹ گیا لیکن ان تمام تصورات کے ساتھ جو میرے محافظ ہو سکتے تھے اور یہ تصورات نیند کو دور بھگا رہے تھے۔ یہ رات اگر بے خوابی کے عالم میں بھی گزر جائے تو کوئی حرج نہیں چونکہ نگاہوں کے زاویے اور آواز کی لرزشیں اس رات کو فیصلہ کن بنانے کا اعلان کر رہی تھیں۔

سو یہی ہوا۔ کوئی دو بجے کا وقت تھا کہ مجھے دروازے کے باہر آہٹ محسوس ہوئی۔ میرے کان ان حساس آہٹوں کو سننے میں مصروف ہو گئے جو بڑی محتاط تھیں۔ پھر میری باریک بین

نگاہوں نے دروازے کے "کی ہول" سے ایک پتلے سے پائپ کے سرے کو اندر داخل ہوتے ہوئے دیکھا اور میں دلچسپی سے اس کا تجزیہ کرنے لگا۔ ایک لمحے کے ہزارویں حصے میں میرے ذہن میں وہ اصل بات آ گئی جو ہو رہی تھی، یا کی جا رہی تھی اور دوسرے لمحے میں نے سانس بند کر لی۔ مجھے حبس دم کی خاصی مشق تھی اور یہ مشق یوگا کی ورزشوں کے ساتھ میری زندگی کا معمول تھی۔ چنانچہ میں نے دم سادھ لیا اور پُرسکون نظروں سے پائپ کی جانب دیکھتا جو بہت مدھم نظر آ رہا تھا لیکن اس سے نکلنے والا سفید دھواں خاصی مقدار میں نکل رہا تھا۔ اب اور دھواں سارے کمرے میں پھیل گیا اور میں خاموشی سے اسے دیکھتا رہا۔

پھر اس کا سلسلہ بند ہو گیا۔ غالباً میری ماں نہیں چاہتی تھی کہ زیادہ مقدار میں خواب آور گیس مجھے ہوش و حواس سے عاری کر دے یا ایسا کوئی نقصان پہنچائے جو میرے لیے خطرناک ثابت ہو۔ بس اتنی ہی مقدار اندر داخل کی گئی تھی کہ ایک انسان آسانی سے بے ہوش ہو جائے پھر جلدی سے دروازہ کھول دیا گیا لیکن کوئی بھی اندر داخل نہیں ہوا بلکہ وہ لوگ گیس کے اخراج ہونے کا انتظار کرنے لگے۔

پھر کچھ افراد گیس ماسک لگائے اندر داخل ہوئے اور میں نے ان میں سے زمرد جہاں اور اس کو پہچان لیا۔ باقی تین مرد تھے اور سب کے سب گیس ماسک پہنے ہوئے تھے۔ پھر انہوں نے کمرے کا پنکھا کھول دیا حالانکہ ایئر کنڈیشنر چل رہا تھا لیکن وہ پنکھا کھول کر گیس کو باہر خارج کرنا چاہتے تھے۔ پھر ان کے اپنے خیال کے مطابق گیس کے اثرات زائل ہو گئے اور انہوں نے دروازہ بند کر کے کمرے میں تیز روشنی کر دی۔ اب مجھے تھوڑی سی اداکاری کرنی تھی۔

چنانچہ میں اس طرح بے سدھ ہو کر لیٹ گیا جیسے بے ہوش ہوں۔ پھر بھی وہ لوگ گیس ماسک لگائے ہوئے تھے اور میں ننگے چہرے کے ساتھ یہاں موجود تھا۔ ہو سکتا ہے گیس کے تھوڑے بہت اثرات کمرے میں ہوں اس لیے میں نے اپنے حبس دم کی مشق کو نہیں چھوڑا تھا اور بدستور دم سادھے ہوئے تھا۔ سب سے پہلے میری ماں میرے قریب آئی اور اس نے غور کر کے مجھے دیکھا۔ میرے تنفس کا اندازہ کیا اور اس کے بعد گہری سانس لے کر بولی۔

"کاش! تم میری بات ویسے ہی مان جاتے احمد اسدی۔ کیا خیال ہے، کیا گیس کے اثرات زائل ہو گئے ہیں؟"

"ہاں مادام! مجھے پوری طرح اندازہ ہو چکا ہے"۔ ایک مردانہ آواز سنائی دی اور سب

نے اپنے چہرے سے گیس ماسک اتار دیئے۔ ان تین افراد کو تو میں نہیں جانتا تھا لیکن خاتون زمرد جہاں اور وانیہ کی تصدیق ہوگئی پھر میرے اندازے کے مطابق وہ لوگ اپنے اصل کام میں مصروف ہو گئے۔ سب سے پہلے میرے تکیے کے نیچے دیکھا گیا۔ پھر میرے لباس کا جائزہ لیا گیا۔ مسہری کا اچھی طرح جائزہ لینے کے بعد وہ لوگ اس الماری کی جانب متوجہ ہوئے جس میں میرا سامان رکھا ہوا تھا۔ میں جانتا تھا کہ وہ کیا تلاش کر رہے ہیں۔ بے اختیار مسکرانے کو دل چاہتا تھا لیکن ظاہر ہے مسکرا نہیں سکتا تھا کیونکہ کمرے میں تیز روشنی ہو رہی تھی اور بے ہوشی کے عالم میں بھی ہونٹوں کی جنبش کو محسوس کیا جا سکتا تھا۔

رفتہ رفتہ ان کے انداز میں بے چینی پیدا ہوتی جا رہی تھی۔ خاتون زمرد جہاں خود بھی الماری کے پاس موجود تھیں پھر انہوں نے الماری کے عقب میں ہاتھ ڈال کر دیکھا۔ اس کے بعد اس کے اوپری حصے پر اور پھر وہ واش روم میں داخل ہو گئے۔ اب وہ کمرے کے ایک ایک گوشے کی تلاشی لے رہے تھے اور ان کے انداز میں کچھ ایسی بے اختیاری پائی جاتی تھی کہ مجھے بڑا لطف آ رہا تھا۔ کوئی پندرہ، سولہ منٹ تک وہ اپنا یہ عمل دہراتے رہے پھر خاتون زمرد جہاں نے کہا۔

"اوہ میرے خدا! اس کا مطلب ہے کہ یہ ہوشیار تھا لیکن لیکن، کہاں، چلو دیکھو، تلاش کرو۔ اندازہ لگاؤ کہ وہ کتاب کہاں چھپا سکتا ہے۔ اوہ میرے خدا! یہ تو بہت ہی برا ہوا۔ یقیناً ہوش میں آنے کے بعد اسے احساس ہو جائے گا کہ کوئی انوکھا عمل ہوا ہے۔ پھر یہ سوچ گا غور کرے گا اور مجھ سے بدظن ہو جائے گا۔ ہم اس کے مقابلے میں ناکام رہے ہیں۔ آہ، ہم صحیح طور پر اندازہ نہیں لگا سکے کہ یہ کس قدر طوفانی صلاحیتوں کا مالک ہے۔ اوہ میرے خدا...... اس کا مطلب ہے کہ اسے شبہ تھا اس بات کا کہ کتاب اس سے حاصل کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ یہ...... یہ بہت چالاک ہے۔ بہت چالاک ہے۔ یہ......" زمرد جہاں پریشانی کے عالم میں بولے جا رہی تھی۔

"اب ہمیں کیا کرنا چاہیے خاتون"۔

"پورے گھر کی تلاشی لو۔ ہر اس جگہ کو دیکھو جہاں ایسی کوئی شے چھپائی جا سکتی ہو۔ سنو جو کچھ میں کہہ رہی ہوں اسے غور سے سنو۔ یہ میرے کمرے سے نکل کر اپنے کمرے تک آیا اور یقیناً اس دوران اور کہیں نہیں گیا بلکہ وہاں سے یہاں تک آیا ہے۔ اس کے اس راستے کی تلاشی لے لو۔ پوری طرح اچھی طرح"۔

"ٹھیک ہے"۔ وانیہ تینوں افراد کے ساتھ باہر نکل گئی۔ زمرد جہاں کمرے کے وسط میں ڑی مجھے دیکھتی رہی۔ میں کبھی کبھی آنکھوں میں درز پیدا کر کے اس کی صورت دیکھ لیتا تھا۔ ر پر دونوں ہاتھ رکھے ہوئے کھڑی ہوئی تھی۔ اس نے کہا۔

"احمد اسدی! کیا کیا جائے، وقت نے کچھ اس طرح ہماری کہانی ترتیب دی ہے کہ ے درمیان وہ رشتہ ہونے کے باوجود جو تمام رشتوں سے مقدس اور مقدم ہے، وہ کیفیات وہ جذبات نہیں پیدا ہو سکے جو ماں اور بیٹے کے درمیان پیدا ہوتے ہیں۔ میں نہیں جانتی میرے دل میں تمہاری چاہت ہے کہ نہیں۔ ہاں یہ تصور بڑا خوشگوار محسوس ہوا تھا کہ ایک ین، توانا اور قابلِ دید شخصیت کا مالک نوجوان میرا بیٹا ہے۔ میری اولاد ہے۔ میں نے تو میں سوچا تھا کہ مجھے فخر کا ایک اور موقع مل رہا ہے لیکن تم، آخر تمہاری رگوں میں اپنے باپ ون ہے اور مجھ سے انحراف تمہاری فطرت کا ایک حصہ ہے لیکن تمہیں مجھ سے تعاون کرنا چاہیے اس کے لیے ماں اور بیٹے کے رشتے میں ایک نئی روایت کا آغاز کیوں نہ ہو جائے۔ ہیں مجھ سے تعاون کرنا ہوگا۔ احمد اسدی!"

وہ آہستہ آہستہ قدموں سے واپس پلٹی۔ ایک بار پھر اس نے پورے کمرے میں نظر دوڑائی، نت کو دیکھا اور پھر ایک گہری سانس لے کر آگے بڑھی اور لائٹ بجھا دی۔ پھر کمرے سے ل گئی۔ میرے حساس کان اب بھی اس کا جائزہ لے رہے تھے اور میں نے ایک لمحے میں زہ لگا لیا کہ کمرے کا دروازہ باہر سے بند نہیں کیا گیا حالانکہ جو الفاظ اس نے ادا کیے تھے، ے مجھے یہ شبہ ہو گیا تھا کہ ممکن ہے اب یہاں مجھ پر سختی کا آغاز کر دیا جائے اور اس کے لئے م یہ ہی ہوتا کہ وہ مجھے قید کر دیتی اور کمرے کا دروازہ باہر سے بند کر دیا جاتا۔

بہرحال یہ ایک الگ صورتِ حال تھی۔ کون جانے کب ان کی واپسی ہو جائے البتہ راہداری میں ان لوگوں کی بھاگ دوڑ محسوس کر رہا تھا اور میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔ آرام سے یہ لوگ اپنی کارروائیاں کر لیں، اس کے بعد میں فیصلہ کن قدم اٹھاؤں گا۔

چنانچہ میں آرام سے لیٹا رہا لیکن میرا یہ اندازہ غلط ثابت ہوا۔ اس کے بعد میرے کمرے نہیں آیا تھا اور وہ لوگ اپنی کوششوں میں مایوس ہو چکے تھے۔ دل تو چاہ رہا تھا کہ اچھی صورتِ حال کا جائزہ لوں جو باہر درپیش ہے، لیکن یہ فی الحال ممکن نہیں تھا اس لیے اختیار کر لی اور وقت گزرنے کا انتظار کرنے لگا لیکن اس کے ساتھ ساتھ ہی مجھے اپنے

مستقبل کا فیصلہ بھی کرنا تھا۔ طبیعت میں وہی سیماب بھرا ہوا تھا۔ میں یہ تجزیہ کر رہا تھا کہ خاتون زمرد جہاں مکمل ماں نہیں بلکہ شاید اس کے سینے میں ممتا کے وہ جذبے ختم ہو چکے ہیں جن کا وجود بہرطور ملتا ہے اور جب ماں اصلی حالت میں مجھے نہیں ملی تو پھر ایک ایسی عورت کو ماں کہنے یا تسلیم کرنے سے کیا فائدہ جس کے راستے میں ہزاروں مصلحتیں ہوں۔ اگر خاتون زمرد جہاں مجھے دیکھ کر بے اختیار ہو جاتی، وہ ساری طلب مجھے سونپ دی جاتی جو میرے سینے میں پوشیدہ تھی تو شاید یہ بھول جاتا کہ مجھے اس کے مفادات کے لیے مجرمانہ اقدام کرنے پڑ رہے ہیں۔ وہ صرف ماں ہوتی اور میں اس کے احکامات کا تابع۔ یہ واقعی میری فطرت کا ایک حصہ تھا اور میں اس سے انکار نہیں کر سکتا تھا لیکن اب، اب صورتِ حال وہ نہیں رہی تھی۔ اب میرے سامنے ایک ایسی عورت تھی جس نے اپنا مقصد حاصل کرنے کے لیے مجھے خواب آور گیس سے بے ہوش کرنے کی کوشش کی تھی چنانچہ کیا فائدہ ان لکیروں کو پیٹنے سے؟ میں جس رشتے کی تلاش میں آیا تھا، وہ درحقیقت ختم ہو چکا تھا۔ ان لوگوں کا کہنا تھا، ماں مر چکی ہے۔ وہ واقعی مر چکی ہے اور کسی مُردے سے محبت کی توقع واقعی نہیں کی جا سکتی۔ بات ختم ہو گئی تھی لیکن اب ذرا فطرت کے دوسرے پہلو کو بھی تسکین دے لی جائے چنانچہ اس کے بعد میں سونے کی کوشش کرنے لگا۔

دوسری صبح البتہ بالکل پُرسکون تھی۔ چہروں پر تجسس ضرور نظر آ رہا تھا۔ سب سے پہلے ملاقات وانیہ سے ہی ہوئی۔ اس نے میرے کمرے میں جھانکا تھا اور مجھے جاگتے دیکھ کر میرے پاس آ گئی تھی۔ میں نے توقع کے خلاف کسی قدر دلچسپی سے اس سے کہا۔

''ہیلو وانیہ! کیا دیکھنے آئی تھیں؟'' وہ میرا لہجہ تبدیل پا کر اندر داخل ہو گئی اور آہستہ سے بولی۔

''دیکھ رہی تھی کہ آپ جاگ گئے ہیں یا نہیں''۔

''کوئی خاص بات؟''

''وقت کچھ زیادہ ہو گیا ہے اور خاتون زمرد جہاں ناشتے کے لئے آپ کے جاگنے کا انتظار کر رہی ہیں''۔

''اوہ، معافی چاہتا ہوں، تم چلو میں آتا ہوں''۔ اس نے ایک نگاہ مجھے دیکھا اور پھر واپس جانے کے لیے مڑ گئی۔

بے وقوف لڑکی! اس کے علاوہ بھی ان کی زندگی میں کچھ اور ہوتا ہے۔ آسمان کی بلندیوں پر پہنچا دو، یہ اپنا انداز نہیں بدلیں گی۔ میں نے دل میں سوچا پھر شیو وغیرہ کر کے اپنے آپ

سنوارا، لباس تبدیل کیا اور کمرے سے باہر نکل آیا۔ خاتون زمرد جہاں کو غالباً یہ اطلاع دے دی گئی تھی کہ میں تیار ہو رہا ہوں اور تھوڑی دیر بعد میں ناشتے پر پہنچ جاؤں گا۔ چنانچہ وہ ناشتے کے کمرے میں بیٹھی ہوئی میرا انتظار کر رہی تھیں۔ ملازمین باادب کھڑے تھے اور ان کی متفکر نگاہیں دروازے کی جانب لگی ہوئی تھیں۔ میں اندر داخل ہوا اور میں نے دست بستہ انہیں سلام کیا بلکہ آگے بڑھ کر ان کے داہنے ہاتھ کو اٹھایا اور ہونٹوں سے لگا کر تعظیم دی۔ انہوں نے بھی میری پیشانی چومی تھی۔ ہم دونوں ایک دوسرے سے نیا کھیل کھیل رہے تھے۔ میں نے بس ایک لمحے کے لیے محسوس کیا کہ خاتون زمرد جہاں نے مجھے متفکرانہ نگاہوں سے دیکھا لیکن دوسرے لمحے انہوں نے اپنے چہرے کے تاثرات بدل لیے اور بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ میں کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گیا۔

''آج معمول سے کچھ زیادہ دیر تک سوئے یا دیر تک سونے ہی کے عادی ہو؟''

''نہیں، میں اسے ایک عجیب اتفاق کہہ سکتا ہوں۔ اتنی گہری نیند کبھی نہیں سوتا اور پھر صبح اٹھنے کے بعد طبیعت اس قدر بوجھل بھی نہیں ہوتی، پتا نہیں آج کیا ہوا۔ اس وقت بھی جسم پر کہولت سوار ہے''۔

''موسم اور جگہ بدلنے سے کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے۔ ناشتا کرو، طبیعت بہتر ہو جائے گی''۔

اور میں سعادتمندی سے ناشتے میں مصروف ہو گیا۔ اس دوران بالکل خاموشی طاری رہی تھی۔ ناشتا ختم ہوا اور خاتون زمرد جہاں نے عادت کے مطابق کہا۔

''میرا ذہن مسلسل تمہارے بارے میں سوچوں میں ڈوبا ہوا ہے۔ ہاں یقیناً یہ اتفاق ہے کہ ہمارے درمیان......'' اس نے جملہ ادھورا چھوڑ کر اس ملازم کی جانب دیکھا جو گردن جھکائے ہوئے اندر آ گیا تھا اور اس نے ہمارے سامنے کچھ پھل رکھ دیئے تھے۔ زمرد جہاں نے اٹھتے ہوئے کہا۔

''آؤ میرے کمرے میں چلو۔ وہ محفوظ جگہ ہے۔ ورنہ یہ لوگ کبھی کبھی احمقانہ حرکات بھی کر دیتے ہیں''۔

میں اٹھ گیا اور تھوڑی دیر کے بعد زمرد جہاں کے کمرے میں جا کر بیٹھ گیا۔ وہ گہری سانس لے کر مسہری پر جا بیٹھی تھیں۔ انہوں نے کہا۔

''تم نے مجھے بری طرح الجھنوں کا شکار کر دیا ہے''۔

''ہاں بالکل اتفاق ہے کہ ہم زندگی میں پہلی بار ملے لیکن ہمارے راستے صاف نہ نکلے اور ایک احمقانہ اختلاف کی دیوار درمیان میں آ کھڑی ہوئی''۔

''میں سمجھتی ہوں، اس میں تمہاری جارحیت شامل ہے۔ اور بُرا نہ ماننا، میں نے خود بھی رات بھر سوچا ہے کہ آخر تمہاری رگوں میں بھی نعمان اسدی کا خون ہے۔ خون کے اثرات انسانی فطرت پر یقینی طور پر اثر انداز ہوتے ہیں''۔

''مانتا ہوں خاتون! لیکن اب میں اس مؤقف پر غور کرنے پر مجبور ہوں کہ اب تک میں اپنے باپ کو ایک غلط انسان سمجھتا رہا ہوں لیکن کیا میری ماں ایسی تشدد پسند اور تند خو فطرت کی مالک نہیں ہو سکتی کہ میرے باپ کو مجبوراً وہ رویہ اپنانا پڑا ہو''۔

خاتون زمرد جہاں کی تیوریوں پر بل پڑ گئے۔ میرے ان الفاظ کو شاید وہ برداشت نہیں کر پائی تھیں۔ انہوں نے کہا۔

''تو کیا تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ ہمارے درمیان اختلافات کی وجہ میری سخت فطرت تھی؟''

''ہر چیز کے دو پہلو ہوتے ہیں اور صرف ایک پہلو کو ذہن میں رکھنا، میں سمجھتا ہوں، دانشمندی نہیں ہوتی''۔

''مجھ سے منطق نہ بگھارو۔ وہ ایک سنگدل آدمی تھا۔ اس کی سنگدلی کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ آج میرا بیٹا میرے سامنے پہلی بار آیا ہے اور میرے افکار و خیالات سے منحرف ہے''۔

''افسوس، اگر اس کی عمر چھ سال ہوتی تو وہ یقیناً عقل و خرد سے عاری ہوتا۔ اور وہ کرتا اور کہتا جو آپ کی زبان سے نکلتا۔ زمرد جہاں! لیکن میں اس عمر میں پہنچ چکا ہوں جس میں اپنی سوچ رکھتا ہوں اور میں سمجھتا ہوں کہ آپ جن مقاصد کے لیے کام کر رہی ہیں، وہ ایک مُردہ گھوڑے میں جان ڈالنے کی کوشش کے سوا اور کچھ نہیں ہے اور میں اپنے تجربے کی بنیاد پر اس کوشش کو دانشمندی نہیں کہہ سکتا''۔

''یہ تمہارا خیال ہے۔ تم ابھی ان عوامل سے واقف نہیں ہو۔ ہمارے ان اقدامات سے آگاہ نہیں ہو جو ہم اب تک کر چکے ہیں''۔

''آپ نے جو کچھ مجھے بتایا، وہ یہ ہے کہ ڈیڑھ یا دو سو افراد ایک تنظیم کی بنیاد رکھتے ہیں اور ان کے مقاصد اتنے خطرناک ہیں کہ آگے چل کر لاکھوں انسانوں کی زندگی خطرے میں پڑ

نا ہے''۔

''اپنا حق حاصل کرنے کے لیے قربانیاں دینی ہی پڑتی ہیں''۔

''اپنی یا بے گناہ انسانوں کی؟'' میں نے پھر ایک تلخ سوال کر دیا اور خاتون زمرد جہاں نقش متغیر ہو گیا۔

''گویا تم اپنے مؤقف پر سختی سے قائم ہو؟''

''کیا آپ اس بات کو پسند نہیں کریں گی زمرد جہاں؟''

''کیا بکواس کرتے ہو؟'' زمرد جہاں نے میری بات کاٹ دی اور میں مسکراتی نگاہوں سے دیکھنے لگا۔ پھر میں نے کہا۔

''کیا غلطی ہو گئی؟''

''تم مجھے خاتون زمرد جہاں..... خاتون زمرد جہاں کہے جا رہے ہو۔ حالانکہ تم جانتے ہو میں تمہاری ماں ہوں۔ ابھی تک تم نے ایک بار بھی مجھے ماں کہہ کر مخاطب نہیں کیا''۔

اور ان الفاظ پر میرے ہونٹوں پر بھی تلخ مسکراہٹ پھیل گئی۔

''اس کی کچھ وجوہات ہیں''۔

''کیا وجوہات ہیں، ماں کو ماں کہنے میں بھی کیا مصلحتیں آڑے آتی ہیں''۔

''خاتون زمرد جہاں! اس کی وجہ جو کچھ ہے، آپ کو اس کا اچھی طرح علم ہے''۔

''ٹھیک ہے، اگر تم اپنے آپ کو بہت طاقتور اور ذہین سمجھتے ہو تو میں بھی اپنے ذہن اور کے دروازے بند کر سکتی ہوں''۔ میرے ہونٹوں پر تلخ مسکراہٹ پھیل گئی۔ میں نے آہستہ کہا۔

''میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ کیا آپ اپنے وہ راستے ترک کر سکتی ہیں جن پر آپ دوڑ رہی ہیں؟''

''نہیں''۔

''میرے لیے..... اپنے بیٹے کے لیے بھی نہیں؟''

''نہیں احمد اسدی، میں تڑپ اور ممتا کی دیوانگی سے نکل چکی ہوں۔ تمہارے باپ نے دیوانہ ہونے کا موقع نہیں دیا۔ اب میں مختلف مزاج رکھتی ہوں''۔

''تو گویا اس تنظیم کو چلاتے رہنے کا فیصلہ آپ کا آخری فیصلہ ہے''۔

''بالکل آخری فیصلہ''۔

''کم از کم اس سلسلے میں، میں آپ پر فخر کرسکتا ہوں۔ خاتون زمرد جہاں! کہ آپ اپنے معاملات میں اٹل ہیں''۔ بہرحال کسی کو اس کے اصولوں سے ہٹانا غیر مناسب بات ہے۔ میرا خیال ہے اس کے بعد مجھے آپ سے یہ سب کچھ نہیں کہنا چاہیے''۔

''تم اپنے بارے میں بتاؤ...... تم نے کیا فیصلہ کیا؟''

''یہ کہ میں آپ سے تعاون نہیں کرسکتا اور چونکہ مجھے آپ کے اندر وہ شے نظر نہیں آئی جس کی تلاش میں، میں نے ایک طویل سفر طے کیا ہے اس لیے میں اب اپنے والد کی رائے سے ہی اتفاق کر لیتا ہوں''۔

''کون سی رائے سے؟''

''یہ کہ وہ وجود مامتا میں دیوانہ ہوتا ہے، جو کسی بجلی کے ننگے تار پر اولاد کا پاؤں پڑنے سے بچانے کے لیے خود اس تار پر گر پڑتا ہے وہ جو خود سیلاب کی نذر ہو جاتا ہے اور بچوں کو خشکی پر پھینک دیتا ہے۔ وہ ماں شاید صرف ایک کہانی ہے...... یا اگر کہانی نہیں بھی تو کم از کم وہ خاتون زمرد جہاں نہیں ہے''۔

''کہہ سکتے ہو...... ضرور کہہ سکتے ہو''۔

''نہیں، صرف کہہ نہیں سکتا، تجربہ کر چکا ہوں۔ گیس کی زیادہ مقدار انسان کو موت کی نیند بھی سلا دیتی ہے اس میں شک نہیں کہ آپ نے وہ مقدار کم رکھی لیکن یہ بھی ایک معصومیت ہے کہ جس شخص کو آپ نے خواب آور گیس چھوڑ کر بے ہوش کرنا چاہا، اس کے بارے میں آپ یہ نہیں جانتیں کہ وہ اپنے آپ کو محفوظ رکھنے کی کس قدر صلاحیتیں رکھتا ہے''۔

خاتون زمرد جہاں کا چہرہ پھیکا پڑ گیا۔ ایک لمحے کے لیے ان کے بدن پر کپکپی سی طاری ہوگئی لیکن بہرحال دل گردے والی عورت تھیں۔ ایک جھرجھری سی لے کر اپنے آپ کو سنبھالا البتہ کچھ کہنے کے لیے دیر تک اسے الفاظ نہیں مل سکے تھے۔ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''اور آپ کی ہر کیفیت سے میں اچھی طرح روشناس ہو رہا ہوں۔ خاتون زمرد جہاں! شکر ہے میں نے آپ کو ابھی تک ماں کہہ کر نہیں پکارا۔ ورنہ شاید کچھ فرائض مجھ پر عائد ہو جاتے''۔

''تو تم...... تم...... تو تم...... تمہیں''۔

''ہاں، جس بات کا اظہار میں نے واضح الفاظ میں کیا ہے ظاہر ہے وہ میرے علم میں ئی۔ آپ لوگ گیس ماسک لگا کر اندر آئے اور وہ سب کچھ کیا جو آپ کی آرزو تھی لیکن آپ ں میں کامیاب نہیں ہو سکے۔ مجھے آپ کی آنکھوں میں وہ گلابی ڈورے صاف نظر آ رہے ہیں رات بھر جاگنے کا نتیجہ ہیں اور اس وقت بھی میں نے تجزیہ کر لیا تھا کہ ناشتے میں آپ مجھے ئی بے ہوشی کی دوا تو نہیں دے رہیں۔ خاتون زمرد جہاں! آپ اس تنظیم کو چلا رہی ہیں جو ے ملک کے خلاف ہے اور ایک شخص آپ کے قابو میں نہیں آ سکتا پھر سوچ لیجئے غور کر لیجئے''۔

''اس کا مقصد ہے تم واقعی میری توقع سے بہت زیادہ چالاک ہو۔ نعمان اسدی ایسا نہیں تھا''۔

''شکریہ خاتون زمرد جہاں! آپ نے میرے باپ میں کوئی تو ایسی صفت پائی جسے آپ ہ سکیں کہ ان کے اندر یہ برائی نہیں تھی۔ بہرحال......''

''دیکھو، اب صورتِ حال بالکل مختلف ہوگئی ہے۔ وہ کتاب کہاں ہے۔ مجھے دو؟''

''اور اس کے بعد؟''

''اس کے بعد سب کچھ تمہاری مرضی پر منحصر ہوگا۔ تم جانا چاہو تو جا سکتے ہو۔ میرے پاس ہو گے تو یوں سمجھ لو کہ زندگی عیش سے گزرے گی۔ کوئی تکلیف نہیں ہوگی تمہیں اور، اور گزرنے والا وقت شاید میرے دل میں تمہارے لیے وہی تڑپ، وہی دیوانگی پیدا کر دے۔ بھی میں واقعی ان جذبات و احساسات سے دور ہوں''۔

''اصول کی بات ہے۔ کتاب میرے لیے ایک بے مقصد چیز ہے کیونکہ میں بہت مختصر وقت کہ یہاں سے چلا جاؤں گا۔ مجھے ان تمام معاملات سے کوئی دلچسپی نہیں اور اب چونکہ ان سے براہ راست بھی نہیں رہا اس لیے میرا یہاں رکنا تو ایک بیکار سی بات ہوگی لیکن چونکہ یہ کتاب کہ نے اپنی محنت سے حاصل کی ہے اور اس کے لیے مجھے نقصانات پہنچانے کی کوشش بھی کی گئی ہے۔ اس لیے اب وہ میری ہی ملکیت ہے اور میں اسے لے کر یہاں سے جا رہا ہوں۔ اس ملاقات کا شکریہ، جس نے کم از کم مجھے یہ ذہنی تقویت تو بخشی کہ رشتوں کے بارے میں میرا تصور غلط تھا اور اب میں اس سے زیادہ اس سلسلے میں کچھ نہیں کہنا چاہتا''۔

''دیکھو احمد، کتاب میرے حوالے کر دو۔ ورنہ اچھا نہیں ہوگا''۔

''اور جو برا ہوگا، اس میں اپنے آپ کو شکست خوردہ دیکھ کر ممکن ہے آپ یہ سوچنے پر

مجبور ہو جائیں کہ آپ کو اپنے فیصلے پر نظر ثانی کرنی چاہیے"۔

"میں کہتی ہوں، کتاب کہاں ہے؟"

"آپ لوگ اسے تلاش نہیں کر سکتے ناں؟"

"کتاب کہاں ہے؟" وہ غرائی اور اچانک ہی تڑپ کر اس نے اپنی جگہ چھوڑی اور ایک میز کی دراز کھول کر اس میں سے پستول نکال لیا۔ میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ میں نے آہستہ سے کہا۔

"تو کیا آپ پستول مجھ پر چلا سکتی ہیں؟"

"ہاں...... میں پاگل ہوں۔ لوگوں کا یہی کہنا ہے کہ جو فیصلہ کرتی ہوں، اسے کرنے کے لیے اپنے آپ کو زندہ آگ میں جلا سکتی ہوں"۔

"آہ...... میرا مظلوم باپ جس نے زندگی بھر اپنی زبان سے کبھی آپ کے بارے میں ایک بھی برا لفظ نہیں کہا لیکن کیا کتاب حاصل کرنے کے لیے آپ واقعی مجھے ختم کر دیں گی؟"

"مجبوری ہے۔ بالکل مجبوری ہے"۔

"تو پھر ٹھیک ہے، زمرد جہاں! کتاب آپ کو دے کر میں اس ملک سے نکل جاؤں گا۔ ظاہر ہے میرا یہاں رہنا ایک بے مقصد عمل ہوگا۔ آیئے میرے ساتھ"۔ میں اپنی جگہ سے اٹھ کر دروازے کی جانب چلا تو وہ تیزی سے اٹھ کر میرے قریب آ گئی اور میرے ساتھ قدم آگے بڑھانے لگی لیکن احمد اسدی اس کے تصور سے بہت آگے کی چیز تھا۔ دروازے کی جانب معمولی انداز میں چلتے ہوئے میں نے ایک لمحے کے لیے زمرد جہاں کو کن انکھیوں سے دیکھا اور ایک لمحہ کے لیے ان کی توجہ پستول سے الگ پائی تو دوسرے لمحے میرا چوڑا ہاتھ ان کی کلائی پر پڑا۔

اور بہر حال یہ وجود اسی خون سے عالمِ وجود میں آیا تھا لیکن اب اس کی قوت اس وجود سے کہیں زیادہ تھی جو اپنے آپ کو قادر سمجھتا تھا۔ پستول خاتون زمرد جہاں کے ہاتھ سے گرا اور میں نے مہارت کے ساتھ اس پر ضرب لگا دی اور وہ مسہری کے نیچے چلا گیا لیکن میں جانتا تھا کہ خاتون زمرد جہاں کا گھر ہے اور چپے چپے پر اس کے آدمی موجود ہیں۔ ابھی میرے خلاف کسی خاص عمل کا آغاز نہیں ہوا تھا لیکن اس کے منہ سے نکلی ہوئی ایک چیخ یہاں میرے لیے دشمنوں کے گروہ پیدا کر سکتی تھی۔

چنانچہ اس عمل کے ساتھ ہی میں نے اس کے ہونٹوں پر ہاتھ رکھا اور پھر اس کا بایاں بازو

اٹھا کر اس کی گردن پر جما دیا۔ اس طرح وہ میرے ایک ہی ہاتھ میں بے بس ہو گئی تھیں۔ ایک دراز قامت خاتون تھیں۔ اچھا تن و توش رکھتی تھیں لیکن احمد اسدی کے بارے میں کچھ نہ جانتی تھیں۔ میں نے انہیں ایک کھلونے کی طرح لٹکایا اور کہا۔

"اس وقت میں دنیا کا بدترین عمل کرنے جا رہا ہوں۔ وہ عمل جس کا تذکرہ شاید میں کبھی کسی سے نہ کر سکوں لیکن جب رشتوں کو اس طرح پامال کر دیا جاتا ہے تو نفرت بھی کئی گناہ زیادہ ہو جاتی ہے۔ خاتون زمرد جہاں! آیئے میں آپ کو وہ کتاب دوں تا کہ کم از کم آپ کے دل میں یہ حسرت نہ رہے کہ اپنی اولاد سے کچھ مانگا تھا مگر وہ نہ دے سکی"۔ میں اسے لٹکائے ہوئے اس کی مسہری کے پاس پہنچا اور پھر مسہری کے گدے کا کونہ اٹھا کر وہ کتاب نکالی۔ یہ کتاب میں نے اس وقت خاتون زمرد جہاں کی مسہری کے گدے کے نیچے رکھ دی تھی جب پہلی رات وہ مجھے اپنے کمرے میں لائی تھیں اور پھر چند لمحات کے لیے مڑ کر الماری سے اپنا لباس نکالنے لگی تھیں۔ میں جانتا تھا کہ اگر ایک چور نگاہوں کے سامنے ہو تو اپنی دولت چھپانے کے لیے چور کے کوٹ کی جیب سب سے محفوظ جگہ ہوتی ہے اور میں نے اسی چھوٹی سی حکایت پر عمل کیا تھا اور اس کے بہترین نتائج حاصل کیے تھے۔

"یہ کتاب میں تمہیں پیش کر رہا ہوں لیکن اصول اصول ہوتے ہیں"۔ میں نے کہا اور کتاب خاتون زمرد جہاں کے لٹکے ہوئے ہاتھ میں تھما دی۔ اس نے بری طرح کتاب کو دبوچ لیا تھا لیکن جو تکلیف اسے میرے اس عمل سے ہو رہی تھی وہ اس کے لیے ناقابلِ برداشت تھی اور اس کا بدن مسلسل جدوجہد میں مصروف تھا۔ میں نے اس سے کہا۔

"بچپن میں، میں نے تمہیں کوئی تکلیف نہیں دی اور تم میری طرف سے ہمیشہ آزاد رہیں۔ بس اب یہ معمولی سی تکلیف تمہیں پہلی اور آخری بار میری جانب سے اٹھانی پڑی ہے۔ اس کے لیے معافی چاہتا ہوں۔ کتاب حاصل کرنے کا تمہارا شوق پورا ہو گیا لیکن میرا مؤقف اپنی جگہ ہے چنانچہ اب میرے اور تمہارے درمیان تمام رشتے ختم ہو جاتے ہیں کیونکہ تم بھی مجھ پر پستول تان چکی ہو اور مجھے یوں محسوس ہوتا ہے خاتون زمرد جہاں! کہ واقعی تم اپنے مؤقف کے لیے اپنے بیٹے کی زندگی سے بھی کھیل سکتی تھیں اور اس کے بعد تم یہ اظہار کرتیں کہ تنظیم کے لیے تم نے اپنے بیٹے کو بھی قربان کر دیا لیکن میں قربان ہونے کے لیے نہیں تھا۔ مجھے اپنی زندگی میں بہت کچھ کرنا ہے اور یہ کتاب، یہ میرے اصولوں کی نمائندگی کرتی

ہے۔ اس لیے افسوس میں اسے تمہارے پاس نہیں رہنے دے سکتا‘‘۔

میں نے اس کے مڑے ہوئے ہاتھ کو چھوڑا اور پھر اس کی گردن کی ایک مخصوص رگ دبا لیا۔ خاتون زمرد جہاں کے منہ سے ایک عجیب سی آواز نکلی اور کتاب اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ وہ خلاء میں ہاتھ مارنے لگی اور اس کی آنکھوں کے زاویے بدلنے لگے۔ بس دو سیکنڈ کافی ہوتے ہیں، اس رگ کو دبانے کے بعد حواس کے ختم ہونے میں۔ چنانچہ جب میری ماں بے ہوش ہوگئی تو میں نے اسے بڑے احترام سے اپنے بازوؤں میں اٹھایا اور بستر پر لٹا دیا۔ چند لمحات کھڑے ہو کر اس کا چہرہ دیکھتا رہا۔ ایک لمحے کے لیے دل میں ایک حسرت ایک ہوک سی اٹھی تھی لیکن میں نے فوراً ہی خود کو سنبھال لیا اور اس کے بعد کتاب اٹھا کر اپنے لباس میں رکھی اور خاموشی سے کمرے سے باہر نکل آیا۔ آس پاس کوئی موجود نہیں تھا۔ سب جانتے تھے کہ بات ماں بیٹے کے درمیان ہے اور آپس میں ہی پوری ہو جائے گی چنانچہ کسی کی مداخلت حماقت کے سوا کچھ نہیں تھی۔

میں خاموش قدموں سے باہر نکلا۔ تھوڑے فاصلے پر ایک کار کھڑی ہوئی تھی جس کا ڈرائیور قریب ہی موجود تھا وہ بھاگ کر میرے پاس آ گیا تو میں نے اس سے سرد لہجے میں کہا۔

’’مجھے کچھ دیر کے لیے چلنا ہے‘‘۔

اس نے جلدی سے عقبی دروازہ کھولا اور میں اندر بیٹھ گیا۔ اس نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی اور کار آگے بڑھا دی۔ بڑا گیٹ ادب کے ساتھ کھلا اور کار باہر نکل آئی۔ کسی بھی ایسی جگہ سے جہاں کوئی شخص دشمن قرار دے دیا گیا ہو، اتنے سکون اور اطمینان سے نکل آنے کا شاید پہلا ہی واقعہ ہو۔ ڈرائیور سفر کرتا رہا اور پھر شہری علاقے میں ایک عمارت کے سامنے میں نے ڈرائیور سے گاڑی روکنے کے لیے کہا اور اس نے گاڑی پارکنگ سائیڈ پر لگا دی۔

یورپ جانے کے لیے پورے انتظامات کرنے تھے کیونکہ میں جانتا تھا کہ زمرد جہاں کے ہاتھ اتنے کوتاہ بھی نہیں ہیں کہ وہ میری تلاش کے لیے سخت جدوجہد نہ کر ڈالے لیکن حیدر سماوی سے ملنا بھی ضروری تھا چنانچہ یہ دونوں کام میں نے ایک ساتھ شروع کر دیے۔ یورپ روانگی کے لیے مجھے کچھ وقت انتظار کرنا پڑ رہا تھا اور یہ بات میرے لیے خاصی پریشان کن تھی لیکن حیدر سماوی سے ان کی رہائش گاہ پر ہی ملاقات ہوگئی۔ غالباً وہ ابھی تک وہیں حالات کا انتظار کر رہا تھا۔ میں اس سنسان رہائش گاہ میں داخل ہوا تو تھوڑی ہی دیر کے بعد حیدر سماوی

برے سامنے آ گیا۔ مجھے دیکھ کر بے حد خوش ہوا، کہنے لگا۔

’’میں یہاں تمہارے انتظار میں نہیں تھا بلکہ یوں سمجھو کہ جب فرصت کے لمحات ہوتے ہیں تو یہ جگہ میرے لیے بہترین ثابت ہوتی ہے۔ خیر یہ تو میرا معاملہ ہے لیکن تم سناؤ خاتون زمرد جہاں سے ملاقات ہوگئی؟‘‘

’’ہاں‘‘۔

’’کیا یہیں اسی شہر میں؟‘‘

’’ہاں‘‘۔

’’حالانکہ وہ زیادہ تر دوسرے شہر میں ہوتی ہیں‘‘۔

’’یہاں بھی شاید ان کی خاصی رہائش گاہیں ہیں‘‘۔

’’ہاں، وہ واحد خاتون ہیں جو امیر کی قربت میں ہونے کے باوجود بہت سی مشکلات سے ر رہی ہیں‘‘۔

میں نے اپنے لباس سے کتاب نکال کر حیدر سماوی کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔

’’اس میں وہ اوراق موجود ہیں جو میں آپ سے قرض کے طور پر لے گیا تھا لیکن ایک رط، ایک وعدے کے ساتھ‘‘۔ حیدر سماوی نے کوئی جواب نہیں دیا البتہ اس کی متجسس نگاہیں رے چہرے کا جائزہ لے رہی تھیں۔ میں نے کہا۔

’’اور میں نے وعدہ کیا تھا کہ اگر میں اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکا تو اپنی ماں کے اصد پر چلنے کی بجائے واپسی کو ترجیح دوں گا اور میں نے اپنے اس وعدے کی پابندی کی ہے۔ کتاب اب آپ کی ملکیت ہے بیرسٹر حیدر سماوی! اور آپ اس بات کے مجاز ہیں کہ اس کے تحت اس ملک کے خلاف ہونے والی سازشوں کا قلع قمع کریں جو درحقیقت یہاں کے شمنوں کی کاوشیں نہیں بلکہ غیر ممالک اس اسلامی ملک کو کمزور کرنا چاہتے ہیں میں نے اس ؤقف کو دل سے مان لیا ہے‘‘۔

’’آہ کیا خاتون زمرد جہاں؟‘‘

’’نہیں، حید سماوی! ماں اور بیٹے کا رشتہ ظاہری طور پر ہزار بار ختم ہو جائے لیکن ماں ر حال میں ہمیشہ قابلِ احترام رہتی ہے کہ وہ اولاد کو جنم دیتی ہے۔ میرے اور میری ماں

کے درمیان جو عوامل رہے، وہ اس کے اور میرے درمیاں ہی رہنے دیں۔ ہاں، اتنا مَیں آپ کو ضرور بتادوں کہ میں اپنے مؤقف میں اپنی ماں کو قائل نہیں کر سکا اور میرے اور ان کے درمیان شدید اختلافات پیدا ہو گئے''۔

حیدر ساوی نے کتاب کو احتیاط سے اپنے لباس میں پوشیدہ کیا اور بولے۔

''تو پھر اب تم؟''

''باپ کی موت کی اطلاع مل گئی تھی۔ ماں کو پہلے ہی مُردہ سمجھتا تھا۔ لوگوں نے کچھ وقت کے لیے دھوکے میں مبتلا کر دیا اور بتایا کہ ماں زندہ ہے لیکن مجھے وہ ماں نہیں ملی جس کی مجھے تلاش تھی اور جو ملی وہ میری فطرت سے الگ تھی، اور اس سے بہتر میرا اپنا ماحول ہے۔ میں یورپ واپس جاؤں گا۔ وہاں میری زندگی کے بہت سے سال گزرے ہیں اور میرے لیے ایک بہتر مقام ہے''۔

''صرف ایک بات کا جواب دے دو۔ اس کے لیے بھی درخواست ہی کر رہا ہوں جواب دینا یا نہ دینا تمہاری مرضی پر منحصر ہے''۔

''پوچھئے''۔

''خاتون زمرد جہاں اور تمہارے درمیان ایسی چپقلش ہو گئی ہے جس کی بنا پر خاتون زمرد جہاں ہر حالت میں تمہارا اور اس کتاب کا حصول چاہیں گی''۔

''ہاں''۔

''تب ایک بزرگانہ مشورہ ہے اور وہ بھی تمارے والد کے رشتے سے کہ تم یہاں کے کسی ایسے مقام سے یورپ کا سفر کرو جو عام حیثیت رکھتا ہو اور اس کی وجہ صرف اتنی سی ہے کہ زمرد جہاں تمہاری واپسی کبھی پسند نہیں کریں گی کیونکہ وہ فطرتاً شدت پسند ہیں''۔

میں نے حیدر ساوی کی بات کو سمجھا پھر کہا۔

''لیکن میں میرا جانا تو ضروری ہے''۔

''ہاں...... بے شک اور میں تمہارے لیے ایسا بندوبست کر سکتا ہوں کہ تمہیں یورپ جانے میں کسی خاص مشکل کا سامنا نہ کرنا پڑے گا''۔

میں نے حیدر ساوی کی یہ پیشکش قبول کر لی تھی اور پھر حیدر ساوی نے غالباً اس کتاب

تحفظ کے پیشِ نگاہ یا اپنے کسی منصوبے کے تحت، وجہ کچھ بھی ہو لیکن انہوں نے میرے ئے ایک آئل ٹینکر پر اس اسلامی ملک سے پڑوسی ملک تک کا سفر طے کیا تھا۔ یہ سفر میرے لیے بڑی دلچسپی کا باعث تھا حالانکہ بہت سے وسوسے بہت سے الجھے ہوئے سوالات رے ذہن میں تھے لیکن زندگی میں ہر طرح کے مشکل حالات کا سامنا کرنا چاہیے۔

یورپ پہنچنے کے بعد میں نے سیدھے حاکف خدام کی جانب رخ نہیں کیا بلکہ ایک ہل میں قیام کر کے کچھ وقت اپنے آپ کو پُرسکون کرنے میں صرف کیا اور وہ تمام تصورات ہن سے نکالے۔ زندگی کے یہ چند روز جو تنہائی بے مقصد سفر میں گزارے گئے تھے اپنے ہن سے کھرچ کر پھینکے تب حاکف خدام کی جانب پہنچا اور اس حیرت ناک انسان نے برا پُرتپاک خیر مقدم کیا۔ اس کی آنکھیں میرے چہرے کا جائزہ لے رہی تھیں لیکن اس نے رے بارے میں کوئی سوال نہیں کیا بس مجھ سے میری خیریت پوچھی۔

''ہاں میں بالکل ٹھیک ہوں۔ آپ اپنے بارے میں بتائیے''۔

''ہم دونوں ایک دوسرے کو بالکل درست نظر آ رہے ہوں گے۔ تمہارا کیا خیال ہے؟''

''بلکہ میں تو محسوس کر رہا ہوں کہ آپ کی صحت ان چند روز میں پہلے سے کافی بہتر ہو گئی ہے''۔

''اور میں نے تمہارے چہرے میں مایوسی کی وہ لہر دیکھی ہے جس سے میں نے اندازہ یا ہے کہ جو تصورات تم اس سفر کے لیے سجا کر روانہ ہوئے تھے ان میں سے کچھ ایسے شکستہ ئے ہوں گے جنہوں نے تمہیں ملول کیا ہے''۔

''یقیناً اور میں آپ سے جھوٹ نہیں بولتا، حاکف خدام! البتہ یہ جاننا چاہتا ہوں کہ ھکن کو صاف کرنے کا طریقہ کیا ہو سکتا ہے''۔

''نہایت آسان۔ اپنے ذہن سے وہ تصورات نکال دو، وہ لمحات ضائع کر دو اپنی اشت سے جو تمہارے لیے باعثِ تکلیف بنیں۔ تاہم اس مشورے کے ساتھ میں ایک ت ایک ساتھی یا ایک بزرگ ہونے کی حیثیت سے تم سے یہ سوال کرنا چاہتا ہوں کہ کم گزرے ہوئے واقعات مجھے بتادو۔ یہ میرا حق بھی ہے اور اس کے لیے بہتر مشورہ دے ہوں''۔

"مجھے کوئی اعتراض نہیں"۔

"البتہ اس کے لیے اتنی جلد بازی ممکن نہیں۔ یہ تو صرف درخواست تھی"۔

"جو میں نے قبول کرلی"۔ میں نے مسکرا کر کہا اور حاکف خدام بغور مجھے دیکھنے لگا۔ پھر بولا۔

"یہ مسکراہٹ بھی تمہاری ذاتی نہیں اور اپنے کسی احساس کو چھپانے کی کوشش ہے"۔

"انسان کی نگاہ اتنی تیز بھی نہیں ہونی چاہیے کہ دوسروں کے پاس کچھ باقی ہی نہ رہے"۔ میں نے کہا اور حاکف خدام بھی مسکرانے لگا اور پھر بولا۔

"ہمدردوں سے کوئی بات چھپانا ضروری نہیں ہوتا۔ یہ ایک بے مقصد عمل ہوتا ہے اور میں جانتا ہوں کہ تم مجھے ہر طرح سے قابلِ اعتماد سمجھتے ہو"۔ چنانچہ اس رات کھانے سے فارغ ہونے کے بعد میں نے حاکف خدام کو الف سے لے کر یے تک ساری تفصیل بتادی اور حاکف خدام عجیب عجیب سے احساسات کا مظاہرہ کرتا رہا۔ وہ اس پوری داستان پر سخت حیران تھا اس نے بہت دیر تک خاموشی اختیار کیے رکھی اور اس کے بعد آہستہ آہستہ بولا۔

"کیا چیز ہے یہ انسان! کیا چیز ہے، کوئی سمجھ سکتا ہے اسے، کوئی یہ دعویٰ کرسکتا ہے کہ وہ انسان کے اندر جھانک سکے، بتاؤ کیا ہے یہ سب کچھ۔ ہم زندگی کو کس کس رنگ میں دیکھنے کے عادی ہو گئے ہیں۔ رشتے ناتے ساری چیزوں کے بارے میں ایک تصور صدیوں سے چلا آیا ہے اور ہم اسے تسلیم کرتے ہیں لیکن کہیں کہیں اسی تصور کو ایسی شکست ہوتی ہے کہ ناقابلِ برداشت محسوس ہو۔ کیا انسان صرف اپنے آپ کو سمجھنے کا دعویٰ کرسکتا ہے۔ میں یہ سمجھتا ہوں احمد اسدی! کہ اگر کوئی شخص اپنی زندگی بھر کی کاوشوں سے اپنے آپ ہی کو جان لے تو شاید اس پر کائنات کے تمام راز ہائے سربستہ منکشف ہو جائیں۔ بہت مشکل کام ہے، بلکہ ناممکن۔ رشتے ناتے، محبتیں، چاہتیں، دل سے تعلق ہوتا ہے ان کا، لیکن کبھی کبھی یہ دلوں میں کتنی مختلف شکلوں میں ظاہر ہوتی ہیں"۔

"ایک منٹ استاد۔ کیا یہ بھی صدیوں کی روایت کا حصہ نہیں کہ چاہتوں کا تصور یا کی داستانوں کا تعلق دل سے ہوتا ہے۔ حالانکہ طبی سائنس دل کے بارے میں کچھ اور تصورات رکھتی ہے اور ہم ہر شئے کو دماغ سے منسوب کرتے ہیں۔ یہ دل اور دماغ کا جھگڑا

یا ہے؟"

"بات ایک دوسرا رخ اختیار کرگئی"۔ حاکف خدام نے کہا۔

"ہاں...... اس میں کوئی شک نہیں کہ شعرو شاعری کی دنیا میں اور زندگی کے دوسرے سائل میں دل کو بھی موردِ الزام قرار دیا جاتا ہے لیکن یہ الزام کبھی ثابت نہیں ہوسکا"۔

"استاد محترم! ہم لوگ اب تک جو کچھ کرتے رہے ہیں۔ کیا وہ بھی روایتی نوعیت کا ل نہیں رہا؟"

"مثلاً؟"

"علوم خفتہ...... جن کے بارے میں کہا گیا ہے کہ لامحدود ہیں۔ میں آپ سے ایک ال کرتا ہوں کہ کیا ہر تصور دماغ میں نہیں پیدا ہوتا۔ کیا ہر چیز کی طلب دل سے تعلق رکھتی ے کیا یہ تجزیہ ایک دلچسپ عمل ثابت نہیں ہوسکتا؟"

حاکف خدام سوچ میں ڈوب گئے کچھ دیر کے بعد انہوں نے آہستہ سے کہا۔

"تم نے ایک بے حد الجھا ہوا سوال کر دیا ہے کیا میں تمہیں اس بات کا جواب دے وں گا؟"

میں نے کچھ نہ کہا، رات خاصی ہو گئی تھی چنانچہ گھڑی میں وقت دیکھنے کے بعد میں کہا۔

"اور یہ بہتر نہ ہوگا کہ کل کا دن ہم کہولت کا شکار رہیں۔ زندگی کے بہت سے مشاغل صارف ہیں سو میں آپ سے اجازت چاہتا ہوں"۔

لیکن اپنی خواب گاہ میں پہنچنے کے بعد کسی قسم کے غم و اندوہ کا شکار ہونے کی بجائے ف خدام اور اپنے درمیان ہونے والے کچھ الفاظ میں مقید ہوگیا۔ دل و دماغ کا جھگڑا ہے۔ انسان کے اپنے وجود میں تصورات کی شکل کیا ہوتی ہے؟ محبتوں کا مرکز کیا چیز انسانی نمود منسوبیت رکھتی ہے لیکن اس منسوبیت کے مستقبل سے کیا ربط ہیں؟ ماں جنم دینے کے بعد اس کی پرورش کرتی ہے، پال پوس کر جوان کرتی ہے، باپ اس کی تا ہے کفالت اور دیکھ بھال کرتا ہے لیکن اس کے بعد کبھی کبھی وہ بچے ماں باپ سے ریاں اختیار کرلیتے ہیں کہ یقین نہ آئے۔ وہاں یہ روابط کس طرح ٹوٹ جاتے ہیں؟

کیا ہے یہ سب کچھ، اس کا تجزیہ کیسے کیا جائے؟ اور جب کبھی ایسا ہوتا تھا کہ میں استادِ محترم حاکف خدام کے ساتھ کسی مسئلے میں الجھ جاتا تھا اور اس کا کوئی سلجھا ہوا حل سامنے نہیں آتا تھا تو پھر ہماری راتیں بے رنگ ہو جاتی تھیں اور اس وقت سوچوں کے سمندر میں نہ جانے کتنے طویل سفر کیے جاتے تھے۔ تو یہ رات بھی سفید کاغذ پر رواں دواں لکیروں کی رات ثابت ہوئی اور سوچوں کے دائرے نہ جانے کہاں سے کہاں تک پھیلتے رہے یہاں تک کہ باہر قدموں کی آواز سنائی دی اور میں حیران ہو کر دروازے سے باہر نکل آیا۔ سو دیکھا کہ ہمارا نیپالی ملازم چائے کی ٹرالی دھکیلتا ہوا ایک جانب جا رہا تھا اور صبح کی مدھم مدھم روشنی ماحول کو اپنی گرفت میں لینے کے لیے آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہی تھی میری آہٹ سن کر وہ رک گیا تو میں نے پوچھا۔

''یہ کیا؟''

''شاب...... بڑا شاب چائے مانگا، میں جاتا ہے''۔

''اتنی صبح؟'' میں نے سوال کیا۔

''شاب جاگتا ہے''۔

میں نے ٹرالی پر جھانک کر چائے کے برتن دیکھے۔ بہر حال یہ تو ممکن نہیں تھا کہ صرف ایک ہی آدمی کے لیے چائے ہوتی۔ میں منہ دھوئے بغیر نیپالی ملازم کے پیچھے پیچھے حاکف خدام کے کمرے میں داخل ہوا اور میں نے دیکھا کہ وہ ٹیبل لیمپ جلائے کاغذ سامنے رکھے لکیریں کھینچ رہے ہیں اور میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ میں ان سے کچھ کہے بغیر سامنے والے واش روم میں گیا چہرہ اور آنکھیں دھوئیں اور تولیے سے انہیں خشک کر کے حاکف خدام کے پاس کرسی پر آ بیٹھا۔ میں نے کہا۔

''استادِ محترم! یہ بے وقت کام کرنے کیسے بیٹھ گئے؟''

''کیا وقت ہوا ہے؟''

''صبح کے پونے چھ''۔

''کیا؟'' حاکف خدام حیرت سے بولے۔

''جی ہاں۔ پونے چھ بجے ہیں''۔

''تم اتنی جلد کیسے جاگ گئے؟''

''اس لیے کہ مجھے بھی اپنے سامنے رکھے ہوئے کاغذوں پر ایسی لکیریں بنانے کا شوق ہو آیا تھا اور انہی لکیروں میں الجھ کر صبح ہو گئی''۔

حاکف خدام بے اختیار مسکرا دیئے اور پھر بولے۔

''یہی ذہنی ہم آہنگی کبھی کبھی مجھے سخت پریشان کر دیتی ہے اور اس وقت جب تم اپنے وطن گئے تھے تو کئی بار میں نے بڑے دکھ بھرے انداز میں سوچا تھا کہ کیا ہمارے درمیان رفاقت ختم ہو گئی۔ کیا وہاں ملنے والی محبتوں میں کھو کر تم یورپ واپس آنا پسند کرو گے لیکن رفاقتیں ایسی ہی کہانیاں سناتی ہیں بلکہ میں تو سمجھتا ہوں کہ کبھی کبھی ایسی رفاقتیں عجوبہ بن جاتی ہیں۔ بہر حال ان کا تعلق بھی دماغ اور انسانی وجود میں پوشیدہ بہت سے خزانوں سے ہوگا''۔

''اور میرے ذہن میں ایک تصور آیا ہے پہلے اسے عرض کروں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ آپ اس کا اظہار کریں اور مجھے خاموش رہنا پڑ جائے''۔

حاکف خدام نے مسکرا کہا۔ ''لیکن اس اظہار سے پہلے اگر ہم کیتلی کے اندر پڑے ہوئے چائے کے پانی کو چائے کی پیالوں میں ظاہر کر دیں تو کیا زیادہ موزوں نہیں ہوگا؟''

''یہ عمل میں کرتا ہوں''۔ میں نے کہا اور چائے کا ایک کپ استادِ محترم کے سامنے کیا، دوسرا خود لے کر بیٹھ گیا۔ پھر ہم چائے کے چھوٹے چھوٹے گھونٹ لے کر آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے سے تبادلہ خیال کرتے رہے اور اس وقت تک کوئی کچھ نہ بولا جب تک چائے کا آخری گھونٹ ہمارے معدے میں منتقل نہ ہو گیا۔ حاکف خدام نے کہا۔

''ہاں اب کہو کہ تم نے رات بھر کی سوچ سے کیا نتیجہ اخذ کیا؟''

''استادِ محترم! دنیا کی قدیم زبانیں، نوادرات پر ریسرچ، سائنس کے مختلف پہلوؤں پر نظریات اور تجرباتی زندگی اور جو کچھ حاصل کیا گیا، اسے کتاب میں درج کیا گیا لیکن ابھی اس کتاب کے چند ہی اوراق پُر ہو سکے ہیں۔ کیا اس مختصر زندگی میں تجربات کی یہ کتاب مکمل ہو سکے گی؟''

ہم غور فکر میں ڈوب گئے۔ اب میرے ذہن سے ہر تصور دور ہو چکا تھا جو مجھے غم کا شکار کر سکتا تھا اور یہ قوت میرے اندر تھی شاید ابتداء ہی سے جب احمد اسدی نے

مجھے یہ احساس دلایا تھا کہ محبتوں کا میری زندگی میں کوئی دخل نہیں۔ میں بہت دیر تک سوچ میں ڈوبا رہا اور میں چاہتا تھا کہ حاکف خدام کو بھی میں نے اپنی راہ پر لگا دیا ہے۔ وہ بار بار پُرخیال انداز میں مسکرانے لگتا تھا۔ پھر بہت دیر غور خوض کے بعد میں نے کہا۔

''استادِ محترم! انسانی خیالات کے لیے کوئی ایسا عمل ضروری ہے جس سے ہم اس کے بارے میں تفصیل جان سکیں''۔

''ہپناٹزم''۔ حاکف خدام نے کہا۔

''ہپناٹزم کیا ہے؟'' میں نے سوال کیا۔

''کیا مطلب؟''

''میں جانتا ہوں کہ ہپناٹزم کے ذریعے آپ کسی کو اپنا مطیع کر کے اس کے اندر کی کہانی جان سکتے ہیں لیکن ہپناٹزم کیا چیز ہے وہ کہاں سے وجود میں آیا؟''

''ٹیلی پیتھی''۔

''ٹیلی پیتھی کیا ہے؟''

''اوہ، اس کا مقصد ہے کہ تم ستاروں کے دوسری طرف جھانک رہے ہو''۔

''ستارے کیا ہیں؟'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا اور حاکف خدام ہنس پڑے۔

''اوہ...... اب تو ہر لفظ بے معنی ہے''۔

''ہمیں کہیں ایسی جگہ سے آغاز کرنا چاہیے استادِ محترم! جسے ہم اپنا کہہ سکیں۔ جو ظہور میں آ چکا ہے۔ وہ دوسروں کا عمل ہے۔ کچھ ہمارا اپنا ہو''۔

''کیا؟''

''ہاں۔ یہ لفظ اپنی جگہ مکمل ہے اور ہم اسے جنبش نہیں دے سکتے؟''

''سوچو...... غور کرو اور اس کے لیے اپنے گھر کے دروازے بند کرلو''۔

ہم یونہی کرتے تھے اور جب ہمیں کسی الجھے ہوئے نکتے کو سلجھانے کے لیے باعمل ہونا پڑتا تھا تو دنیا سے کنارہ کشی بہتر ہوتی تھی۔ اور ایسا ذرا کم ہی ہوتا تھا کہ میں اور حاکف خدام کسی ایک موضوع پر متفق ہو جائیں لیکن جب ہوتا تھا تو یوں ہوتا تھا کہ ہم دنیا سے کنارہ کشی اختیار کر کے صرف اپنا کام کرتے تھے۔

اور تیاریاں شروع ہوگئیں۔

ہمارے الگ الگ کمرے تھے جن میں ہم نے نہ جانے کیا کچھ الم غلم بھر رکھا تھا۔ بس ان کمروں میں رکھے ہوئے ریفریجریٹر بھرنے تھے اور تمام انتظامات جو ہمیں کسی مسئلے پر پہنچنے کے لیے درکار ہوتے تھے۔ سو پھر یوں ہوا کہ دروازے کو لاک کر دیا گیا اور باہر وہ بورڈ لگا دیا گیا جس سے آنے جانے والوں کو پتا چلے کہ ہم گھر میں موجود نہیں۔ ٹیلی فون کے بیرونی تار ڈس کنکٹ کر دیئے گئے۔ ہاں انٹرکام جیسی ایک چیز ہمیشہ ہمارے درمیان رہتی تھی اور اس کے لیے یہ معاہدہ تھا کہ جب تک کسی کو کوئی حادثہ نہ پیش آ جائے دوسرے کو متوجہ نہ کیا جائے بشرطیکہ وہ حادثہ موت نہ ہو۔ سو اس وقت بھی ان تمام معاہدوں کا اعادہ کیا گیا اور اس کے بعد ہم دونوں سر پھرے اپنے اپنے کمروں میں جا چھپے۔ یوں ایک طرح سے ہمارا دنیا سے رابطہ ختم ہوگیا تھا اور ان دنوں میں نہ ہمارے پاس دیواروں پر کیلنڈر ہوتا تھا اور نہ گھڑیاں کہ وقت کا احساس دلا کر ذہن کو مضطرب نہ کر سکیں۔

لوگ شاید اس بات پر یقین نہ کر پائیں لیکن بیشتر ایسے مسئلے جو پیچیدہ اور الجھے ہوئے ہوتے تھے ہم انہیں اسی عالم میں سلجھاتے تھے اور اب بھی یہی مرحلہ درپیش تھا۔ کاغذات پر تحریریں لکھی جاتیں اور مڑے تڑے کاغذات کے انبار بڑھتے جاتے۔ سو یہی ہو رہا تھا جب تک نیند بے بس نہ کر دیتی یا تھکن نڈھال نہ کر دیتی، اپنی جگہ سے اٹھنا خلافِ آداب تھا اور خلافِ اصول بھی، کچھ لے کر ہی اور وہ بھی وہ کچھ جس کا کوئی نتیجہ برآمد ہو سکے، اپنی جگہ سے اٹھا جا سکتا تھا ورنہ نہیں۔ گھڑیوں اور وقت کا صحیح اندازہ واقعی نہ ہو سکا۔ سوچیں دماغ کو کھولانے لگیں، آنکھوں کے گرد حلقے پڑ گئے بدن پر تھکن طاری ہو گئی لیکن کوئی عمل کوئی ایسا نہ ہوا جو یہ ظاہر کرے کہ انسان کے اپنے وجود میں کیا ہے، ابھی تک ذہن میں نہیں آ سکا تھا اس وقت ایک طرح کی دیوانگی ذہن پر سوار تھی۔

جب میں نے کاغذ پر رکھے ہوئے محدب عدسے کو دیکھا اس کے نیچے لکھے ہوئے الفاظ اپنی جسامت سے کچھ گنا بڑے نظر آ رہے تھے۔ بے خیالی کے عالم میں عدسے کو اوپر کیا تو لفظ مزید بڑے ہونے لگے۔ اسے نیچے جھکایا تو وہ اپنی جسامت کے مطابق نظر آئے اور اسی لمحے ایک خیال میرے دل میں آیا کہ کیا کوئی ایسا طریقہ کار ہو سکتا ہے جس

سے یہ الفاظ مختصر ترین ہوتے جائیں اور اس کے بعد نگاہوں سے اوجھل ہو جائیں۔

اگر کسی بے جان شے پر یہ مائیکرو پروسیس کارگر ہو سکتا ہے تو کسی جاندار پر کیوں نہیں۔ یہ ایک مصنوعی عمل ہے جو صرف نگاہ کی حد تک ہے لیکن مائیکرو فلمیں اپنا مختصر وجود رکھتی ہیں اور اگر انہیں بڑے پروجیکٹر پر دکھایا جائے تو وہ صحیح شکل میں نظر آتی ہیں لیکن اگر ٹھوس اجسام بھی اسی طرح مائیکرو کر دیئے جائیں تو کیا ان کے ذریعے کوئی عمل کیا جا سکتا ہے اور پھر یہ تصور جنون بن گیا اور اس جنون میں ایک طویل وقت گزر گیا۔ ابھی تک حاکف خدام کی جانب سے کوئی اطلاع موصول نہیں ہوئی تھی حالانکہ ہمارے درمیان صرف چند گز کا فاصلہ تھا لیکن یہ فاصلہ ایک طویل وقت اختیار کر چکا تھا اور میرے جنون نے ایک تصور ایجاد کیا ابھی یہ تصور تھا لیکن اسے عملی شکل دینے کے لئے وہی سب کچھ ذہن میں آ رہا تھا جس نے دنیا میں بڑی بڑی ایجادات کرائی ہیں اور موجد انسان ہی تھے۔ وہ کوئی آفاقی حیثیت نہیں رکھتے تھے۔ میں نے ایک تھیوری تیار کی اور یہ تھیوری مختلف پہلوؤں سے گزرنے کے بعد آخرکار ایک تحریری شکل اختیار کر گئی۔ تب میں نے انٹرکام پر حاکف خدام کو مخاطب کیا اور انہوں نے بڑی بے صبری کے ساتھ میری آواز وصول کی گئی۔

''آپ خیریت سے ہیں استاد محترم؟''

''ہاں اور شدید تھکن کا شکار ہوں کیونکہ ابھی تک مختلف موضوعات پر سوچتے سوچتے کوئی موثر بات ذہن میں نہیں آ سکی، لیکن چونکہ تم نے مجھے مخاطب کیا ہے اس لیے میں بے چین ہوں کہ جلد آؤ اور مجھ سے ملو اور بتاؤ وہ کون سا تصور ہے جس نے تمہیں مخاطب کرنے پر مجبور کر دیا''۔

''ہو سکتا ہے، یہ صرف ایک مذاق ہو اور آپ مجھے اس پر سرزنش کریں لیکن بہرحال آپ سے گفتگو کرنا چاہتا ہوں لیکن صحیح حالت میں اور اس کمرے میں جہاں ہم پُرسکون نشست رکھتے ہیں''۔

''میں اب سے بیس منٹ بعد تک پہنچ رہا ہوں''۔

''ٹھیک ہے......'' میں نے کہا اور اس کے بعد میں نے انٹرکام بند کر کے واش روم کی جانب رخ کیا تھا جہاں چہرے سے وہ داڑھی صاف کر دی تھی جو اس دوران نکل آئی

تھی۔ لباس بھی دوسرا پہن لیا تھا کیونکہ میرے بدن پر موجود لباس سے تعفن کے بھبکے اٹھ رہے تھے۔ البتہ جب حاکف خدام کے پاس کمرے میں پہنچا تو ہم دونوں ہی شکل و صورت سے ہشاش بشاش نظر آ رہے تھے۔

ہم اس طرح ایک دوسرے سے ملے جیسے برسوں کے بچھڑے ملتے ہیں۔

''تمہاری صحت خراب ہو گئی ہے؟'' حاکف خدام نے تشویش سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔

''نہیں...... یہ مختصر خوراک اور بے آرامی اور بے اعتدالی کا نتیجہ ہے ورنہ میں ٹھیک ہوں''۔

''تم نے ضرور کوئی مؤثر بات سوچی ہے''۔

''جب تک آپ کی طرف سے اس کی تصدیق نہ ہو میں اسے مؤثر نہیں کہہ سکتا''۔

''میں ابھی تک کوئی بہتر بات نہیں سوچ سکا۔ تاہم مجھے بتاؤ تم نے کیا حل نکالا ہے؟''

حاکف خدام نے کہا اور میں انہیں اپنا مؤقف بتانے کے لیے موزوں الفاظ تلاش کرنے لگا پھر میں نے کہا۔

''کیا ہم اس بات پر متفق ہو گئے ہیں، استاد محترم! کہ اس کائنات میں رشتوں کا وجود نہیں''۔

''نہیں......'' حاکف خدام نے ٹھوس لہجے میں کہا اور میں سرد نظروں سے انہیں دیکھنے لگا۔

''آپ اس بات سے اختلاف رکھتے ہیں؟''

''سو فیصد اختلاف۔ یہ تمہاری نامکمل سوچ ہے۔ کچھ وقتی عوامل کا نتیجہ ورنہ تم نے مجھ سے کبھی اس موضوع پر بات نہیں کی ہے''۔

''ہاں شاید ایسا ہے تو پھر میں یہیں سے آغاز کرتا ہوں''۔

''ضرور......''

''محبت کیا چیز ہے؟''

''کیا تمہیں اس کائنات میں اپنے موجود ہونے کا یقین ہے؟''

''ہاں ہے......''

"ہوں، میں تم سے اس بارے میں کوئی جذباتی بات نہیں کہوں گا نہ تمہیں کوئی جھوٹا حوالہ دوں گا یعنی تمہارے والدین کا تذکرہ کر کے لیکن خوش بختی سے ہمارا تعلق ایسے مذہب سے ہے جو ہمیں خلاء میں نہیں چھوڑتا اور ہمارے اندر پیدا ہونے والے ہر سوال کا جواب دیتا ہے۔ سب سے پہلی محبت خالقِ کائنات کو اپنے محبوب ﷺ سے ہے جس کے لئے اس نے یہ ساری دنیا سجا دی تا کہ وہ خوش رہے۔ اس سے ٹھوس ثبوت نہ ممکن ہے، نہ ضروری۔ لیکن بات اس سے آگے بڑھاتے ہیں۔ اس کے بعد محبت خالق کو اپنی مخلوق سے ہے۔ تمہارے پاؤں کے ناخن سے لے کر سر کے پاؤں تک اس کی محبت کے عکاس ہیں۔ اس لیے تمہیں ہر ضرورت سے مرصع کر دیا ہے تا کہ تمہیں کوئی مشکل نہ رہے۔ اس کا مطلب ہے کہ محبت کا وجود ہے"۔

"آپ اس اساس کو بہت بلندیوں تک لے گئے ہیں استادِ محترم"۔ میں نے کہا۔

"بلندیوں پر بسیرا کرو گے تو پستیوں کا ادراک ہوگا، پستیوں سے آغاز نہ کرو کہ پہنچ محدود رہے"۔

"میں انسانی رشتوں کی بات کر رہا تھا"۔

"سب موجود ہیں کیونکہ یہ خالق نے مخلوق کو دیئے ہیں"۔

"پھر زمرد جہاں بیگم کیا ہے؟"

"ٹیڑھے راستوں کی مسافر۔ جب منزل نہ پائے گی تو واپس پلٹے گی تاسف کے ساتھ"۔

"اُف...... آپ نے مجھے پہلے مرحلے میں متذبذب کر دیا"۔

"سوچ کے زاویے درست کرو، مجھے استاد کہتے ہو"۔

"ہاں......" میں نے گہری سانس لی۔

"جو حقیقت مان لی جائے اسے اپنانا پڑتا ہے......" میں نے کہا۔

"اناش کو میں نے اسی لیے تم تک پہنچایا تھا...... وہ مفرور تھی"۔

"جانے دو...... بس اس احساس میں لچک رکھو۔ اب آگے بڑھو"۔

"ہم انسانی فطرت پر تحقیق کرنا چاہتے ہیں اور بات دل و دماغ کی آجاتی ہے"۔

"کیا نظریہ ہے؟"

"کیا انسان کے اندر سفر ممکن ہے؟" میں نے کہا۔ حاکف خدام گہری سوچ میں گم ہو گیا۔

"کہاں تک؟" کچھ دیر کے بعد اس نے کہا۔

"پورے وجود میں"۔

"وجود سے باہر رہ کر؟"

"نہیں۔ اس طرح ہم حقائق کو نہ پا سکیں گے......"

"تب......؟"

"ہمیں انسان میں داخل ہونا ہوگا......"

"کیسے......؟"

"ایک محدب آئینہ آنکھ کے لئے کسی شے کو انلارج کر دیتا ہے کوئی عمل کسی ٹھوس جسم کو ...مختصر کر سکتا ہے کہ وہ ایک ننھے سے جرثومے کی شکل اختیار کر جائے جبکہ کروڑوں ...بیرونی ذرائع سے انسانی جسم میں داخل ہو جاتے ہیں"۔

حاکف خدام کے چہرے پر ایک جوش نمودار ہوا۔ اس کے بعد اس نے خاموشی اختیار ...کی۔ میری بات ان کے دل کو لگی تھی اور اب وہ اس پر غور کر رہے تھے بہت دیر کے ...نہوں نے کہا۔

"سو فیصد سائنسی عمل لیکن قابلِ غور، حساس اہمیت کا حامل، ایکس ریز ایجاد ہو کر پرانی ...ہیں۔ یہ لیزر کا دور ہے۔ ایکسرے سے بات الٹراساؤنڈ تک آگئی اور پھر اس سے ...ڑھ کر اب کچھ ایسے مائیکرو آلات ایجاد کر لیے گئے ہیں جنہیں انسانوں کے جسم میں ...ر کے ان سے نتائج حاصل کئے جاتے ہیں مائیکرو آلات، ہم یہاں تک آ کر رکتے ہیں ...ی اسٹاپ ہے کیونکہ احمد اسدی! بات یہیں تک ہے نا؟"

"یقیناً استادِ محترم!"

"گویا ہمیں یہاں پہنچنا ہے۔ ان آلات کا موجد کون ہے، اس سے آگے وہ کیا سوچ ...ے۔"

"گویا آپ اس بات سے متفق ہیں کہ انسانی جسم میں داخل ہو کر اس کے وجود میں

چھپے ہوئے پوشیدہ راز حاصل کئے جاسکتے ہیں"۔

"ایک مؤثر تصور ہے لیکن ہمارے حاصل کئے ہوئے علوم اس کے لیے بے مقصد ہیں۔ ہمیں دوسرے سہارے تلاش کرنے ہوں گے"۔

"ہم اس کے لیے سرگرداں ہو جائیں گے"۔ میں نے کہا اور حاکف خدام کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ انہوں نے کہا۔

"ہم نہیں صرف تم...... یہ تمہارا شعبہ ہے"۔

"کیا مطلب؟" میں حیرت سے اچھل پڑا۔

"میرے اور تمہارے درمیان اس قدر ہم آہنگی کہاں ہے؟"

"میں اب بھی نہیں سمجھا استاد محترم!"

"تم غیر انسانی صفات کے حامل، ان اقدار کو نہیں مانتے جو انسانی ہیں۔ میں آج تک تمہارا ایک طرفہ ساتھ دیتا رہا ہوں۔ بہت سے ایسے مرحلے آئے ہیں جب مجھے تمہاری ذات سے مایوسی ہوئی ہے"۔

میں حیرت سے انہیں دیکھتا رہا۔ پھر وہ بولے۔ "حالانکہ تم مجھے احترام سے استاد کہہ رہے ہو"۔

"میں اپنی کوتاہیوں کی نشاندہی چاہتا ہوں"۔

"تمہاری فطرت، تمہاری سرشت، تم عورت سے اس لیے گریزاں تھے کہ تمہاری ماں نے تمہیں مامتا نہیں دی تھی۔ ہم نے تسلیم کیا ہے کہ محبت کا وجود ہے اور اسے مختلف رنگ دیئے گئے ہیں ماں پہلے عدم میں تھی وجود میں آئی اور تمہیں مطمئن نہ کرسکی۔ اس میں کیا قصور ہے کیا ہر عورت کا؟ بولو جواب دو"۔

"نہیں استاد محترم! صرف میری ماں ہی کا"۔

"عورت کے مختلف روپ ہیں۔ اناش مغرور تھی لیکن تم جوان ہو خوبصورت ہو کوئی لڑکی تم سے متاثر ہوسکتی ہے"۔

"تو پھر استاد محترم؟"

"پہلے دل میں گداز پیدا کرو۔ محبت کا گداز اس کے بعد کہانی آگے بڑھے گی"۔

"لیکن ہماری تحقیقات کا اس عمل سے کیا تعلق ہے؟"

"تم مرد سے اس لیے گریزاں تھے کہ تمہارے باپ نے تم سے شفقت نہ کی۔ بارے میں کیا خیال ہے؟"

"آپ نے ہمیشہ مجھے اپنے التفات کے سائے میں رکھا"۔

"تمہیں اعتراف ہے؟"

"ہاں......"

"ثابت ہوا کہ محبت کا وجود ہے"۔

"جی"۔

"تو سینے میں محبت کا گداز پیدا کرو، کسی کے پیار کو اپناؤ۔ محبت ایک دلکش تصور ہے وہ کی طلب پر عطا کیا گیا، اس کی قربت پاؤ گے تو وہ آگ سرد ہوگی جو تمہارے دل میں رہی ہے اور جب ٹھنڈک ملے گی تو آگے بڑھنے کو دل چاہے گا"۔

"بات میرے عمل میں آپ کی شرکت کی ہے آپ نے یوں ابتداء تو نہیں کی تھی بلکہ ی سوچ کا ساتھ دینے کے لیے آپ نے مجھ سے علیحدگی اپنائی تھی"۔

"ہاں اس وقت ہمارے سامنے کوئی نشان نہیں تھا۔ اب ایک دھبہ نظر آیا ہے"۔

"مگر اس دھبے سے عورت کیسے نمودار ہوگئی؟" میں نے پریشان لہجے میں کہا۔

"یہ میری تم سے سودے بازی ہے"۔

"اوہ...... تو میں کیا کروں؟"

"محبت"۔

"اور منزل کی تلاش؟"

"وہ میں کروں گا"۔

"تب آپ میرا ساتھ دیں گے؟"

"ہاں......" حاکف خدام نے کہا اور میں نے گردن جھکا لی، پھر ہم ایک دوسرے سے ا ہو گئے۔ اپنی علیحدہ رہائش گاہ میں آکر میں نے اس مشکل مرحلے کے بارے میں سوچا۔ اکف خدام پر شدید غصہ آیا۔ فضول شرط لگا دی ہے مجھ پر۔ نہ جانے اس شخص کے ذہن

میں یہ سودا کیوں سمایا۔ پہلے تو نہایت عمدہ شخصیت کا مالک تھا، اچانک اسے کیا ہوگیا۔ بہت ہی غور کیا بڑی جھنجھلاہٹ ہوئی۔ دل میں سوچا کہ وہ بیشک قدیم زبانیں پڑھنے میں بے مثال ہے اور اس کا علم لازوال ہے نہ تو وہ کوئی سائنسدان ہے اور نہ اعلیٰ وسائل رکھتا ہے یہ سیاہ فام میری ایک طلب سے واقف ہو کر مجھے بلیک میل کر رہا ہے۔ کیا مجھے بلیک میل ہونا چاہیے۔

نہیں ...... میں اس کی اعانت کے بغیر بھی اپنے مقصد کے لیے قدم بڑھا سکتا ہوں۔ کامیابی یا ناکامی کا فیصلہ وقت کرے گا۔ یہ نہ کر سکوں گا تو ورزش کروں گا۔ یا پھر مصوری۔ حاکف خدام پر غصہ شدت اختیار کر گیا پھر اچانک مجھے خیال آیا اور میرے ہونٹوں پر زہریلی مسکراہٹ پھیل گئی میں نے اپنی جگہ سے اٹھ کر ٹیلی فون پر حاکف خدام کے نمبر ڈائل کیے۔

"ہیلو! کیا بات ہے احمد اسدی؟" میں دنگ رہ گیا۔ حاکف کو کیسے معلوم ہوا کہ میں احمد ہوں۔ ایک بار پھر اس کی پُراسرار شخصیت کا احساس ہوا تھا۔

"آپ میرا ساتھ دیں گے استاد محترم! صرف میرے لیے یا آپ کو خود بھی اس سے دلچسپی ہے"۔

"نہیں، میں خود بھی دلچسپی رکھتا ہوں۔ پُراسرار زبانیں، انوکھے علوم میری زندگی ہیں"۔

"کچھ حاصل کرنے کے لیے پیار ضروری ہے؟"

"کوئی، نیا خیال دل میں پیدا ہوا ہے؟"

"ہاں...... آپ عورت کے پیار سے کیوں محروم ہیں کوئی عورت آپ کی زندگی میں کیوں نہیں؟" میرا لہجہ طنزیہ ہوگیا لیکن حاکف خدام نے ایک قہقہہ لگایا تھا پھر اس نے کہا۔

"اس لیے کہ میرا کالا چہرہ اور بھدے نقوش کسی کی توجہ نہیں حاصل کر سکے اور بدشکل لڑکیاں مجھے پسند نہیں تھیں۔ کوئی خوبصورت عورت خواہ وہ میری عمر کی کیوں نہ ہو اگر آج بھی مجھ سے اظہارِ الفت کرے تو میں اسے اپنی زندگی سونپ دوں"۔

میں نے دانت پیس کر فون بند کر دیا۔ نفرت کے دن نفرت کی راتیں، بے سکون ہوگیا تھا۔ چار دن گزر گئے تھے۔ حاکف خدام نے خود بھی فون نہیں کیا تھا۔ یہ اس کے مؤقف کا اظہار تھا۔ اس نے اپنے مؤقف میں تبدیلی نہیں کی تھی۔ تب میری ہمت پست ہوگئی مجھے

احساس ہوا کہ اگر زندگی میں کوئی شناسا نہ ہو، کسی سے بات نہ کی جائے تو طبیعت میں کیسی بے کیفی ہوتی ہے اور صلاحیتیں کس طرح کند ہو جاتی ہیں۔ عورت، محبت کمبخت اناش کہاں ہے۔ وہ شناسا تھی اصل بات جانتی تھی اگر اس سے رجوع کیا جائے تو۔

فلیٹ کی کھڑکی سے جھانک کر میں نے عورت کی تلاش میں نگاہ دوڑائی۔ بے شمار عورتیں تھیں...... بوڑھی، جوان مختلف مشاغل میں مصروف کچھ بچے بھی سنبھالے ہوئے تھیں اب اس منظر سے مجھے کراہیت ہونے لگی تھی، ٹھیک ہے میں اپنے اندر لچک پیدا کروں گا۔ ان میں سے کسی کی قربت حاصل کرنے کی کوشش کروں گا۔ اسی شام میں لباس تبدیل کر کے باہر نکل آیا۔ میری کار سڑکیں ناپتی رہی پھر ایک خوبصورت ریستوران میں جا بیٹھا۔

ویٹر کے آنے پر میں نے جوسز کی کال ٹیل طلب کر لی۔ آرڈر سرو ہونے کے بعد میں چھوٹے چھوٹے سپ لیتا رہا۔ میری نظریں بھٹک رہی تھیں تب وہ میرے پاس آ گئی۔

"ہیلو......" اس نے دلنواز آواز میں کہا اور میں نے اپنا گلاس رکھ دیا اسے دیکھا، اس نے خوبصورت لباس پہن رکھا تھا شکل وصورت بھی اچھی تھی۔

"ہیلو......" مجھے ایک دم اپنے مشن کا خیال آ گیا۔

"کیا تمہیں میری ضرورت ہے؟" اس نے سوال کیا اور میں چونک پڑا۔

"تمہیں کیسے معلوم؟" میں نے حیرت سے کہا۔

"تمہاری اداسی، تنہائی اور متلاشی نگاہوں نے مجھے آواز دی ہے"۔ وہ مسکرا کر بولی اور بیٹھ گئی۔

"تمہیں یقین ہے کہ تم مجھے تسخیر کر لو گی"۔ میں نے اسے کرخت نظروں سے دیکھ کر کہا۔

"نہیں میں تو خود مخمور ہو گئی ہوں تمہارے قریب آ کر۔ تم کیوپڈ سے زیادہ خوبصورت، ارکس سے زیادہ سڈول اور جوان ہو۔ اب تک کہاں تھے؟"

"کیا میں تم سے محبت کر سکتا ہوں؟" میں نے سوال کیا۔

"نہیں......" وہ بولی۔

"کیوں......؟"

"اس لیے کہ میں تم سے محبت کرنے لگی ہوں"۔ اس نے کہا اور مجھے بے حد سکون محسوس ہوا۔ اچھا ہے میری ناتجربے کاری کا یہ شعبہ وہ خود سنبھال لے گی اور احمق حاکف خدام کو اصل بات کا پتہ بھی نہیں چلے گا۔ وہ یہی سوچے گا کہ میں نے خود سب کچھ کیا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اناش سے بہت مختلف تھی۔ اناش نے مجھے چیلنج کیا تھا اور مجھے چیلنج کرنے والے کو آج تک کامیابی نہیں حاصل ہو سکی تھی۔

"تم کیا پیو گی؟"

"جس جگ میں جھلکتے ہوئے رنگ بہت خوبصورت ہیں"۔ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ میں نے ویٹر کو بلا کر مزید آرڈر دیا۔ وہ مسکرا کر بولی۔

"تمہارا نام کیا ہے؟"

احمد اسدی!

"میرا نام طنیشہ ہے"۔

"کیا کام کرتی ہو؟"

"ایک فرم میں ملازم ہوں۔ ڈچ بہت کنجوس ہوتے ہیں۔ بہت کم معاوضہ دیتے ہیں"۔

نہ جانے کیوں وہ مسکرائی۔ "لیکن تم یورپین معلوم نہیں ہوتے"۔

"تمہاری ماں ہے؟" میں نے پوچھا۔

"تھی اب نہیں ہے خود غرض، اپنی خواہشوں کی غلام، میرے لیے اس نے کبھی کچھ نہ کیا"۔

میں نے حیرت سے اسے دیکھا۔ کیا خوب لڑکی ہے۔ کس قدر آسان، میرے مزاج سے ہم آہنگ، چنانچہ وہ مجھے پسند آ گئی اور پھر میں نے اسے اپنی کار میں خوب سیر کرائی وہ مجھے گائڈ کر رہی تھی جب خوب رات ہو گئی تو میں نے اس سے کہا۔

"اتنی رات گئے تم کہیں اور نہ جاؤ میرے فلیٹ پر چلو کوئی حرج تو نہیں ہے؟"

"بالکل نہیں۔ تم میرے بہت ہی اچھے دوست ہو"۔ مجھے معاً یہ احساس ہوا تھا کہ اس شعبے میں کچھ نہ کر کے ذرا سی غلطی کی ہے۔ زندگی میں کچھ لوگ ساتھ ہونے چاہئیں۔ لیکن قصوروار میں بھی نہیں تھا۔ نعمان اسدی نے بچپن سے کچھ اس طرح ذہنی رو بدل دی تھی کہ

اؤں کی قربت سے خود بخود گریز کرنے لگا تھا۔ بس شکایتیں ہی شکایتیں تھیں۔ نہ جانے کس سے...... اور ان کا آغاز اس وقت وقت ہوا تھا۔ جب ہوش کی منزل میں داخل ہوا اور یہ احساس ہوا تھا کہ میرے اردگرد پھیلے ہوئے لوگ میرے اپنے نہیں ہیں۔

اب لڑکی کی قربت حاصل کر کے لگ رہا تھا جیسے زندگی اتنی مشکل چیز نہیں ہے اور ے آپ کو اناڑی محسوس کر کے بھی انوکھی لذت کا احساس ہوا تھا۔ الغرض میں اس کو اپنے ... پر لے آیا۔ رات کا کھانا کھا لیا گیا تھا۔ کوئی اور مشغلہ نہیں تھا۔ وہ میری خوبصورت اب گاہ میں آ کر اس کا جائزہ لیتی رہی اور اس نے کہا۔

"تم خاصے امیر آدمی معلوم ہوتے ہو، یہاں تنہا رہتے ہو؟"

"ہاں"۔

"خوب، بہرحال تم سے مل کر مجھے خوشی ہوئی ہے"۔

"اور میں بھی بہت بہتر محسوس کر رہا ہوں اب ایسا کرو کہ اس کے برابر ایک کمرہ ہے۔ اس میں جا کر سو جاؤ۔ میرے آرام کا وقت ہو گیا ہے"۔ اس نے شکایت آمیز نگاہوں سے ے دیکھا اور پھر کمرے سے باہر نکل گئی۔ میں لباس تبدیل کرنے کے بعد مدھم روشنی میں ز پر دراز ہونے کے بعد سوچنے لگا یہ لمحات کچھ اجنبی اجنبی سے گزرے ہیں۔ گویا زندگی ں کوئی تبدیلی پر لطف ہوتی ہے۔ زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ میرے کمرے کا دروازہ کھلا اور وہ اندر آ گئی لیکن مدھم روشنی میں اسے دیکھ کر چونکا تھا وہ لباس سے عاری تھی اور ایک ارت کا جسم میری نگاہوں کے سامنے تھا۔ میں نے اسے سر سے پاؤں تک دیکھا اور اس کے بعد آہستہ سے کہا۔

"یہ تم بے لباس کیوں ہو گئیں؟" اس نے عجیب انداز میں میرا بازو پکڑا اور مجھے بستر تک لا کر بولی۔

"تم نشے میں ہو یا یہ بھی کوئی انداز ہے"۔ نہ جانے کیوں مجھے ایک عجیب سی وحشت کا احساس ہوا۔ میں اپنے اندرونی جذبوں کو کوئی نام نہیں دے سکا لیکن میری فطرت نے اس بے حیائی قبول نہیں کی تھی۔ میں نے اسے کہا۔

"تم مجھے اس انداز میں اچھی نہیں لگ رہی ہو"۔ غالباً انسانی فطرت کا ایک پہلو یہ

بھی ہے کہ وہ اپنے مطلوب میں حیا پسند کرتا ہے۔

"کیا تم پاگل ہو، مجھے یہاں کس لیے لائے ہو؟"

"وہ سامنے ایک چادر ہے اسے لپیٹ لو، اچانک ہی تم نے مجھے نئی سوچ میں مبتلا کر دیا ہے"۔

"فضول آدمی میرے نزدیک آؤ...... میں تمہیں زندگی سے روشناس کراؤں"۔

"وہ زندگی جسے ذہن کی گہرائیاں قبول نہ کریں میں پسند نہیں کرتا"۔

"تب پھر مجھے یہاں لانے کا مقصد بتا دو"۔

"مقصد...... مقصد ایک ایسے شخص کی ضد ہے جس سے شاید میں نفرت کرنے لگوں"۔

"سنو، میں کال گرل ہوں میرا کام یہی ہے لوگوں کی راتوں کو جگمگاؤں، اپنا معاوضہ وصول کروں اور اس کے بعد چلی جاؤں"۔

"بس؟"

"تو تم اور کیا سمجھتے ہو؟"

میں جو کہتا تھا، اس میں ایک بار پھر دھوکہ کھا گیا تھا اور میرے اندر پھر وہی نفرتوں کا طوفان موجزن ہو گیا تھا میرے ذہن پر گرمی سی چڑھنے لگی۔ میں نے اس سے کہا۔

"تم کال گرل ہو اور اس سے پہلے مختلف لوگوں کی خوابگاہوں میں جا چکی ہو؟"

"ہاں مجھے اس سے انکار نہیں"۔

"لیکن میں...... میں شاید تمہیں ان الفاظ میں اپنا مقصد نہیں سمجھا سکتا جن میں سمجھانا چاہتا ہوں، دوسرے کمرے جاؤ، اپنا لباس پہنو اور مجھے بتاؤ کہ اپنی راتوں کا کتنا معاوضہ وصول کرتی ہو؟"

میرے اندر وہی متلائی متلائی سی کیفیت تھی۔ تو یہ ہوتی ہے عورت اور یہ ہوتی ہے اس کی محبت! حاکف خدام تو بہت گھٹیا انسان ہے۔ اب تک تو میں اسے اپنے استاد کا درجہ دیتا رہا لیکن اس نے جن راستوں کا مجھے راہی بنایا وہ تو بہت مکروہ ہیں۔ میں نے بہت سے نوٹ نکال کر اپنے ہاتھوں میں لے لیے اور جب لڑکی کے قدموں کی چاپ دروازے پر آئی تو وہ نوٹ اسے دیتے ہوئے کہا۔

"اور اس کے بعد کبھی اس فلیٹ کا رخ نہ کرنا ورنہ میں تمہارا چہرہ بگاڑ دوں گا"۔

"سنو، اجازت دو تو اس کے بعد اس کمرے میں پڑی رہوں۔ رات زیادہ ہو گئی ہے"۔ وہ لجاحت سے بولی۔

"میں ایک لمحے تمہارا وجود برداشت نہیں کر سکتا اور اب سے چند منٹ بعد میں باہر نکل کر تمہیں دیکھوں گا تم مجھے نظر آئیں تو تمہارے ساتھ نہ جانے کیا ہو جائے گا"۔ پھر اس کے قدموں کی آواز سنائی دی اور میں ساری رات کھولتا رہا۔ حاکف خدام پر مجھے غصہ آ رہا تھا۔ دل چاہ رہا تھا کہ فون کر کے اسے بتاؤں اور برا بھلا کہوں لیکن برداشت کیا البتہ یہ محسوس ہو گیا کہ لڑکی فلیٹ سے چلی گئی ہے۔

اور دوسری صبح ناشتا کیے بغیر میں اپنی کار لے کر حاکف خدام کی جانب دوڑ گیا۔ وہ صبح خیزی کا عادی تھا اور اپنے گھر میں موجود تھا۔ مجھے دیکھ کر چونک پڑا اور پھر آہستہ سے بولا۔

"آؤ......" میں اس کے ساتھ کمرے میں داخل ہو گیا اور اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

"دنیا کی قدیم زبانوں اور پُراسرار علوم کے بارے میں جس قدر معلومات میں نے تم سے حاصل کی ہیں، حاکف خدام! وہ بیشک میرے لیے بڑی اہمیت کی حامل ہیں اور میں ان کی بے پناہ قدر کرتا ہوں لیکن تمہاری شخصیت کا ایک پہلو میری نگاہوں کے سامنے عریاں ہو گیا ہے۔ اس نے میرے دل میں تمہاری توقیر ختم کر دی ہے۔ اور شاید میں تمہیں اپنے استادِ محترم کا نام نہ دے سکوں"۔ حاکف خدام کے چہرے پر عجیب سے تاثرات پھیل گئے۔ اس نے مجھے دیکھا اور بولا۔

"ہوا کیا ہے؟"

"تمہاری خواہش پر میں نے عورت کو قربت بخشی تھی"۔

"تو پھر؟"

"اور اس کے جواب میں مجھے جو کچھ نظر آیا۔ اس نے عورت کی نہیں، تمہاری شخصیت کی نفی کر دی"۔

"مجھے واقعہ بتاؤ"۔ حاکف خدام بولا اور میں نے اسے تفصیل سنا دی حاکف خدام قہقہے لگانے لگا تھا، پھر وہ ایک دم سنجیدہ ہو گیا اور اس نے کہا۔

""اصل میں تم نے طریقہ کار غلط استعمال کیا تھا اور اگر کر بھی لیا تھا تو بات اس قدر شدت کی نہیں تھی لیکن وہی مسئلہ درپیش آ جاتا ہے۔ میں تمہاری فطرت کو کیسے تبدیل کروں؟ سنو......! تم بہت ہی ناواقف انسان ہو۔ اگر میں تمہیں دنیا سے روشناس کراتا رہوں تو میرا بہت وقت ضائع ہو جائے گا۔ تم جانتے ہو کہ میں سرکاری ملازم ہوں اور اس طرح اپنی زندگی بسر کرتا ہوں جبکہ تم اپنے باپ کی بے پناہ دولت سے فائدہ اٹھا سکتے ہو۔ میں تمہیں وہ وقت نہیں دے سکوں گا۔"

""میں تم سے وقت چاہتا بھی نہیں ہوں مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے تھوڑے سے علم کے لیے میں نے تمہارے ساتھ بہت وقت ضائع کر دیا۔" حاکف خدا کو بھی شاید غصہ آ گیا اس نے کہا۔

""تو پھر جاؤ اگر صاحبِ عزت ہو تو اس وقت تک مجھ سے رجوع نہ کرنا جب تک اپنی تسکین نہ کر لو۔"

""اور اس تسکین کے بعد میرا خیال ہے مجھے تم سے رجوع کرنے کی بھی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔"

""تو پھر جاؤ بہتر ہے کہ ایک ایسی چھت کے نیچے اپنا وقت ضائع نہ کرو، جس سے تم مستقبل میں کوئی رابطہ نہیں رکھنا چاہتے۔"

""او کے......ٹھیک ہے۔" میں نے کہا اور غصے سے تیز تیز قدم رکھتا ہوا باہر نکل آیا۔ لیکن دنیا بہت بدنما لگ رہی تھی۔ ہر طرف پیلے رنگ کا غبار اُڑ رہا تھا میرا دل چاہ رہا تھا کہ سڑکوں پر چلنے والوں کو قتل کرنا شروع کر دوں۔ کیا کرنا چاہیے مجھے اور اب جبکہ میرا یہاں کوئی مقصد بھی نہیں ہے تو مجھے یہاں کرنا کیا ہے۔ نعمان اسدی نے یورپ پہنچا دیا تو اور یہاں بے مقصد رابطے ہو گئے تھے۔ مجھے اس ماحول سے نفرت ہو گئی اور اب میں یہاں نہ رکنے کا فیصلہ کر رہا تھا لیکن اس کے لیے مجھے کچھ انتظامات کرنے تھے۔ حاکف خدام کہتا تھا کہ میں ایک بدنما لکڑی کا کندہ ہوں جس میں کوئی تراش خراش نہیں ہے۔ میں نے آپ کو ایسا نہیں سمجھتا تھا۔ پھر اس کے بعد میں انتظامات کیے اور اس شہر کو چھوڑنے کا فیصلہ کیا۔ رقم بہت تھی مجھے اس شعبے میں کبھی پریشانی نہیں ہوئی تھی چنانچہ میں نے اپنے اثاثے

محفوظ کیے دوسرے کام کرائے اور پھر تمام انتظامات کرنے کے بعد کسی نامعلوم منزل کی جانب چل پڑا۔

ایک خوبصورت شہر کے فائیو سٹار ہوٹل میں قیام کے بعد میں نے اپنے مستقبل کے بارے میں سوچا۔ حقیقت یہ ہے کہ اب تک کی زندگی بے مقصد تھی کسی بھی ٹھوس منصوبے پر عمل نہیں کر سکتا تھا۔ جن علوم کے حصول کے لئے نعمان اسدی نے مجھے یورپ میں چھوڑا تھا ان کی اصلیت معلوم ہو چکی تھی لیکن دل میں جو کچھ تھا وہ ایک خواب معلوم ہوتا تھا۔

اس خواب کی تعبیر کہاں ہے؟ حاکف خدام نے بھی ساتھ چھوڑ دیا تھا ہوٹل کے تنہا کمرے میں بہت سی حقیقتوں کا ادراک ہو رہا تھا ان میں یہ احساس بھی تھا کہ ہم اپنے ارد گرد پھیلے ہوئے لوگوں پر ضرورت سے زیادہ انحصار کر لیتے ہیں اور خود کو انہیں سونپ دیتے ہیں حالانکہ اصولی طور پر ہم تنہا ہیں۔ رشتے صرف ایک قید ہوتے ہیں جن سے رہائی ناممکن ہوتی ہے لیکن یہ ایک طلسم ہوتا ہے جسے توڑنا ممکن نہیں ہوتا۔ زندگی گزارنے کے لئے اپنے اصولوں پر نہیں دنیا کے اصول پر چلنا ہوتا ہے۔ تبھی اس کے ساتھ گزارہ ہوتا ہے لوگ نہ جانے کیا کیا کرتے ہیں۔

چھ دن میں نے اس کمرے میں خود پر غور خوض کرتے ہوئے گزار دیئے تھے۔ ہوٹل کے ویٹر مجھے حیرت سے دیکھتے تھے۔ پھر ساتویں دن مجھے میرے تجربے نے کہا کہ یہ زندگی گزارنے کا صحیح ڈھنگ نہیں ہے تحریک میں زندگی ہوتی ہے ورنہ تنہا انسان ذہنی مریض بن جاتا ہے میں نے اپنے اطوار بدلنے کا فیصلہ کر لیا۔ ایک ٹھوس فیصلہ! ساری کہولت جھٹک کر میں واش روم میں داخل ہو گیا۔ چہرے پر باقاعدہ داڑھی نکل آئی تھی لیکن یہ داڑھی مجھے بہت خوش نما محسوس ہوئی۔ اور میں نے اس کی بے ترتیبی روا کر کے اسے اسی طرح چھوڑ دیا۔ غسل کے بعد میں نے خوشنما لباس پہنا اور باہر نکل آیا اور اس کے بعد ہوٹل کے ایک خوبصورت پورشن میں پہنچ گیا۔ کچھ شناسا ویٹر جو مجھے میرے کمرے میں قیدی سمجھنے لگے تھے، خوشگوار تاثر کے ساتھ میرے پاس آ گئے۔

"آپ کی میز اس طرف ہے"۔ ان میں ایک نے میری رہنمائی کی اور میں اپنی میز کی طرف چل پڑا۔ مجھے احساس تھا کہ بہت سی آنکھیں میری طرف نگران ہیں۔ میں اپنی

میز کے گرد گرد پڑی ہوئی کرسیوں میں سے ایک گھسیٹ کر اس پر بیٹھ گیا۔ ویٹر نے میرے آرڈر کے مطابق مشروب میرے سامنے رکھ دیا، میں اس سے شغل کرنے لگا۔

کچھ دیر گزری تھی کہ کوئی میرے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا میں نے نگاہ اٹھا کر دیکھا تو ایک عورت کو کھڑے پایا جو اپنا جواب آپ تھی۔ اتنی دراز قد اور اس قدر متناسب کہ دور سے منفرد لگتی تھی نہایت سلیقے کا لباس پہنے ہوئے تھی۔ رنگ سانولا تھا اور نقوش ایسے کہ اس کی قومیت کے بارے میں صحیح اندراہ نہ ہو سکے اس نے نہایت خوشگوار مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

"کچھ دیر آپ کے پاس بیٹھنا چاہتی ہوں"۔

میرا ذہن ہوا میں اُڑنے لگا وہ تجربہ یاد آ گیا جس سے دل میں آج تک خود شرمندہ تھا لیکن پھر اپنے عہد کا خیال آیا تجربے کرتے رہنا چاہیے ممکن ہے ان سے کچھ اندازہ ہو جائے۔

"تشریف رکھئے"۔

"شکریہ"۔ وہ بیٹھ گئی پھر مسکرا کر بولی۔ "آپ کی شخصیت اس بات کی متقاضی ہے کہ مجھے بیٹھنے کی اجازت دیتے ہوئے آپ اس قدر پس وپیش کرتے"۔

"آپ کون ہیں؟" میں نے سوال کیا۔

میرے براہِ راست سوال پر اس کے ہونٹوں پر دلنشین مسکراہٹ پھیل گئی۔ تب مجھے احساس ہوا وہ قد و قامت اور جسامت کے لحاظ سے بڑی لگتی ہے ورنہ اس کی عمر زیادہ نہیں ہے۔ اس نے کہا۔

"تحینہ علایہ میرا نام ہے"۔

"مجھ سے کیا کام ہے؟"

"غالباً آپ نے میری آمد کو پسند نہیں کیا؟"

"میں متجسس ہوں"۔

"صرف آپ سے ملاقات کرنے کو دل چاہا۔ اب آپ کو اختیار ہے کہ آپ مجھے یہاں سے اٹھ جانے کا حکم دے دیں"۔

میں نے ایک لمحے کے لئے سوچا اس عرصہ میں انسانوں سے گفتگو کرنے کو ترس گیا تھا۔ جو تبدیلی اپنے اندر کرنے کا فیصلہ کیا تھا اس کی ابتداء ہو جائے تو حرج نہیں۔

"نہیں، آپ تشریف رکھیے"۔ میں نے لہجہ نرم کر لیا، وہ اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے دیکھ رہی تھی اور یوں لگ رہا تھا جیسے وہ میرے اندر اترنا چاہتی ہو۔ یہ لڑکی عام لڑکیوں سے الگ لگ رہی تھی۔

"اب جب آپ نے اتنی اجازت دے دی ہے تو کچھ آگے بات ہو جائے؟"

"جی فرمائیے"۔

"آپ کا کیا نام ہے؟"

"احمد اسدی"۔

"ایرانی ہیں؟"

"نہیں"۔

"آپ کے نقوش میں ایران جھلکتا ہے"۔ اس نے کہا اور میرے دل پر ایک چرکہ سا پہلی بار کسی نے انکشاف کیا تھا کہ میرے نقوش میں زمرد جہاں ہے۔ وہ جس نے اپنے …ر کے لئے مجھے ٹھکرا دیا تھا لیکن اس کے ساتھ ہی ایک اور احساس بھی ہوا تھا۔ ماں کی یاد دل کے دروازے کھٹکھٹائے تھے۔ اس کا مطلب ہے کہ دل خوشی یا دکھ کے احساس سے ہوتا ہے۔ دماغ دیر سے یہ احساس قبول کرتا ہے۔ دوہری کیفیت ہو گئی تھی ایک طرف جہاں کی یاد ابھر رہی تھی وہیں اس انکشاف نے متجسس کیا تھا لیکن یہ تحقیق کا وقت نہیں تھا۔

"آپ بہت خاموش طبع ہیں؟"

"نہیں، آپ سے گفتگو کے لیے موضوع تلاش کر رہا ہوں"۔

"یہاں اس شہر میں کس مقصد کے لیے آئے ہیں؟"

"سیاحت"۔

"اپنے ملک میں کیا کرتے تھے؟"

"کچھ نہیں"۔

"کچھ تو کرتے ہی ہوں گے"۔ وہ مسکرائی۔

"میں یورپ تعلیم حاصل کرنے آیا تھا"۔

"او...... آئی سی...... تعلیم"۔

''ہاں......''

''میں بھی تعلیم حاصل کر رہی تھی نفسیات کی طالبہ رہی ہوں اب وطن واپس جارہی ہوں''۔

''آپ کا وطن کون سا ہے؟''

''متنازعہ ہے''۔

''کیا مطلب؟''

''نسلی طور پر کرد ہوں۔ قازقستان کے ایک قصبے فیض آباد کی رہنے والی ہوں''۔ اس نے جواب دیا اور دماغ کو پھر کئی جھٹکے لگے میرے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔

''وطن واپس جارہی ہیں؟''

''ہاں......''

''کب......؟''

''بس چند دنوں میں۔ میں آپ کو اپنے وطن کی سیاحت کی دعوت دیتی ہوں۔ بہت خوبصورت ملک ہے اور روضہ امام کی زیارت کریں، جامی کے شہر تربت جام سے گزریں ہر خطہ اپنی مثال آپ ہے اور پھر وائلڈ ویسٹ فیض آباد۔ آپ نے ایران دیکھا ہے؟''

''ہاں......'' میں نے گہری سانس لے کر کہا۔

''تفصیل سے؟''

''نہیں......''

''ایران کو گہری نگاہ سے دیکھئے، اس کے ذرے ذرے میں حسن پنہاں نظر آئے گا''۔

''آپ کو اپنا وطن بہت پسند ہے''۔

''ہمارا وطن......'' وہ حیرت بھرے لہجے میں بولی اور خاموش ہوگئی۔

''تہمینہ علایہ ایک بات کا جواب دیجئے''۔

''جی......'' وہ سنبھل گئی۔

''آپ میرے پاس کیوں آئی ہیں؟'' میرے اس سوال پر وہ مسکرائی پھر بولی۔

''اسے میری کمزوری کہہ لیں''۔

''کیسے؟''

''انسان خود کچھ نہیں ہوتا اپنا معیار ضرور بنا لیتا ہے۔ مجھے آج نہیں بچپن سے ہی ایک رہی ہے۔ منفرد خوراک اور منفرد لوگ میری کمزوری ہیں۔ آپ یقین کریں زندگی میں صرف تین دوست بنائے ہیں ایک پروفیسر کریمن سلہری دوسری برطانیہ کی جیونا برک، میری تیسری دوست ایک کوہ پیما کی بیٹی تھی جو اپنے باپ کے ساتھ ایک مہم میں ہلاک ہوگئی۔ یہ تینوں بڑے دوست تھے۔ کریمن سلہری یونیورسٹی پڑھاتے تھے اور ذاتی طور پر سائنس کی ایک پیچیدہ اور انوکھی تھیوری پر کام کر رہے تھے۔ آپ کو ہنسی آئے گی کہ ان کی تھیوری کیا تھی''۔

''مثلاً......'' میں نے دلچسپی سے پوچھا۔

''ان کا کہنا تھا کہ بڑھتی ہوئی آبادی کے مسئلے کو حل کیا جا سکتا ہے وہ اس طرح کہ انسان مختصر کر دیا جائے''۔ اس کے ان الفاظ نے مجھے پھر ایک جھٹکا دیا۔

''مختصر کر دیا جائے''۔ میرے اندر سے سحر زدہ آواز نکلی۔

''ہاں اس کے فوائد پر انہوں نے ایک مقالہ لکھا تھا اور اس کا خوب مذاق اڑایا گیا تھا حالانکہ وہ ایک فکری مقالہ تھا''۔

''کیا تھا؟''

''ان کا کہنا تھا کہ صدیوں پہلے قد و قامت بہت زیادہ تھا لیکن اس وقت آبادی اتنی نہیں تھی اس کے بعد انسانی قامت کم ہونے لگی اور اب اگر مسائل کو قابو میں کرنا ہے تو دنیا بھر میں انسانی قامت اس قدر مختصر کر دی جائے کہ نہ رہائش کا مسئلہ رہے نہ خوراک کا، گیہوں کے چند دانے چاول کی ایک بالی انسانی شکم پُری کرے اس طرح خوارک کی قلت ختم ہو جائے گی۔ مکانات چھوٹے چھوٹے ہوں گے تو زمین کی قلت ختم ہو جائے گی۔ ایک خاندان اپنے گھر کے احاطے میں اتنا اناج اگا سکے گا کہ پورے خاندان کی کفالت ہو جائے گی''۔

''اس عمل کے لیے ان کا کیا نظریہ تھا؟''

''یہ کہ ادویات کے ذریعے انسانی ہارمونز کم کر دیئے جائیں''۔

''انہوں نے فارمولے پر کام کیا تھا؟''

''ہاں کر رہے تھے''۔

"پھر کیا ہوا؟"

"اس مقالے کا مذاق اڑایا گیا۔اخبارات نے کارٹون چھاپے اور وہ ناراض ہوکر یونیورسٹی چھوڑ گئے"۔

"کہاں گئے؟"

"خدا جانے"۔

"تم ان کی دوست تھیں تمہیں نہیں معلوم؟"

"ایسے بددل ہوئے تھے کہ پھر کسی سے نہ ملے"۔

"کوئی پتہ نہیں ہے ان کا؟"

"کبھی پتہ نہ چل سکا"۔

"کہاں کے رہنے والے تھے"۔

"مشرقی بعید کے کسی ملک کے غالباً پتریانا کے کسی علاقے کے، انہوں نے کبھی کسی کو نہیں بتایا"۔

"اوہ......" میں نے آہستہ سے کہا۔

"مگر بات ہو رہی تھی تم تک آنے کی"۔

"ہاں......" میں نے سنبھل کر کہا۔

"ممکن ہے تم نے خود پر غور نہ کیا ہو ممکن ہے زیادہ غور کر کے اپنا معیار بنایا ہو۔میری طرح۔ میں صرف منفرد اور نفیس لوگوں سے مل سکتی ہوں۔ وہی میرے من کو بھاتے ہیں اور کبھی کبھی کچھ دوست اس طرح مل جاتے ہیں کہ حیرت ہوتی ہے"۔

"کیا مطلب؟"

"مطلب بہت گہرا ہے اگر تم نے میری دوستی قبول کی تو بتاؤں گی"۔ اس نے آہستہ سے کہا۔

میں سوچ میں ڈوب گیا، کریمن سلہری کے فارمولے کے بارے میں سن کر میرے ذہن میں لاکھوں تصورات جاگ اٹھے تھے۔ یہ فارمولا میرے مطلب کا تھا لیکن ایک اجنبی لڑکی سے بضد ہو جانا بھی ممکن نہ تھا۔ اس کے لیے اس کی دوستی قبول کرنا ضروری تھی اور

گہری نظروں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔

"تم ماہر نفسیات ہو۔میرے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے؟"

"ماہر نہ کہو ابھی تو میں طالب علمی کے دور سے نکلی ہوں"۔

"کچھ تو حاصل کیا ہوگا"۔

"ہاں، کیوں نہیں لیکن اس کے لئے دوسری ملاقات ضروری ہے"۔اس نے کہا۔

"ٹھیک ہے اس کا تعین تم پر منحصر ہے لیکن ایک بات بتاؤ تخینہ علایہ، دو اجنبی ملاقات کے وقت ایک دوسرے کی اس قدر کھوج کیوں کرتے ہیں؟"

"انسانی فطرت، اور کوئی فطرت سے الگ ہونے کا دعویٰ کبھی نہیں کرسکتا"۔ تخینہ علایہ واقعی منفرد تھی۔ میری سوچوں سے الگ۔ حاکف خدام نے بتایا تھا کہ اناش پُراسرار علوم کی ریسرچ اسکالر ہے لیکن میں نے اس کے اندر کوئی انفرادیت نہیں پائی تھی۔ وہ عورت تھی خود پر نازاں اور مغرور مجھے فتح کرنے کا دعویٰ کرنے والی پھر دوسری عورت نے مجھے عجیب مذاق کا نشانہ بنایا تھا۔لیکن تخینہ......!"

رات کو میں اپنے کمرے کے بستر پر لیٹا دیر تک اس کے بارے میں سوچتا رہا مجھے احساس ہو رہا تھا کہ بات آگے بڑھ رہی ہے اپنے خول میں بند رہ کر کچھ نہیں ہوسکتا۔ دنیا کو سمجھنا ہے تو اس کے اندر داخل ہونا ہوگا۔واقعی میرا مزاج عام انسانوں سے مختلف ہے۔ جب تک اس میں نمایاں تبدیلی نہ پیدا کی جائے گی کچھ نہ ہوسکے گا۔ حلقہ احباب ضروری ہے اب یہ عام حالات میں ملنے والی لڑکی جس سے مجھے کریمن سلہری کے بارے میں علم ہوا گو سلہری کا منصوبہ میرے منصوبے سے بالکل مختلف تھا۔لیکن فکری انداز یکساں تھا اگر سلہری مل جائے تو...... یہ لڑکی اس کی تلاش میں مدد دے سکتی ہے۔ وہ کون سا کام ہے جو مجھ سے لے سکتی ہے۔اگر میں اس کا کام کروں تو......پھر اسے اس کام کے لئے مجبور کرسکتا ہوں۔

چنانچہ دوسرے دن میں نے اس کا پُرجوش استقبال کیا تھا وہ ایک خوشگوار حیرت کے ساتھ اندر آئی تھی۔

"آج تمہارا رویہ پہلے سے بہتر ہے"۔

"کل اس میں کوئی خرابی تھی؟"

''سرد مہری تھی؟''

''اس کے لیے تمہیں میرا نفسیاتی تجزیہ کرنا ہوگا''۔

''آمادہ ہو؟''

''ہاں''۔

''اپنے بارے میں مختصر بتاؤ''۔

''وطن کے بارے میں بتا چکا ہوں، ماں باپ کے درمیان اختلاف ہوا اور باپ نے میرے بچپن میں میری ماں سے علیحدگی اختیار کرلی۔ اس نے مجھے ماں سے دور کرنے کے لئے یورپ میں چھوڑ دیا۔ میرے اور اس کے درمیان بہت معمولی روابط رہے۔ ماں کے بارے میں مجھے بتایا گیا تھا کہ وہ مرچکی ہے۔ پھر باپ مرگیا اور مجھے دوسروں سے علم ہوا کہ ماں زندہ ہے ماں کو تلاش کرتے کرتے اس تک پہنچا تو وہ مجھے بھول چکی تھی۔ اس نے مجھے وہ محبت نہ دی جس کی طلب میں اس تک گیا تھا۔ میں اس سے بھی بددل ہوگیا اور اب اس دنیا میں تنہا ہوں''۔

''او...... مائی گاڈ......'' وہ آہستہ سے بولی۔ پھر کہنے لگی۔ ''مالی وسائل کیا ہیں؟''

''باپ کا ترکہ بہت ہے''۔ میں نے جواب دیا۔

''دوسرے عزیزوں سے ملاقات ہے؟''

''کوئی عزیز نہیں''۔ میں نے کہا اور اس نے خاموشی اختیار کرلی۔ پھر مسکرا کر بولی۔

''میں کہہ چکی ہوں کہ ابھی مبتدی ہوں کہ احمقانہ بات کہہ جاؤں تو برا ماننا نہ مذاق اُڑانا''۔

''ٹھیک ہے''۔ میں نے کہا اور وہ میری آنکھوں میں جھانکتی رہی اس طرح براہِ راست میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے وہ بہت خوبصورت لگ رہی تھی پھر اس نے کہا۔

''اب مجھے تم سے کوئی شکوہ نہیں ہے تمہارے کل کے رویے کی وجہ میری سمجھ میں آگئی کہ تم تند مزاج ہو۔ اپنے گرد خود ساختہ حصار قائم کرلیا ہے اور اسے معیارِ زندگی بنالیا ہے دوسرے سے کبھی متاثر نہیں ہوتے یا اگر کبھی ہوتے ہو تو اسے اپنے مزاج کے مطابق چاہتے ہو۔ اس طرح الگ تھلگ رہنے کا مزاج نہیں تو اور کیا ہے تصدیق یا تردید کروگے''۔

''ٹھیک تجزیہ ہے''۔

''کسی منزل کا تعین کیا؟''

''ہاں؟''

''اس خیال میں بھی شدت ہوگی؟''

''پتا نہیں''۔

''اس کے بارے میں کچھ بتاؤ گے؟''

''ایک نظریہ ہے کہ جس پر کام کرنا چاہتا ہوں''۔

''تھوڑی سی تفصیل''۔

''انسان کیا ہے؟''

''دنیا کا سب سے مشکل سوال ہے اور تمہارے مزاج سے بالکل سوٹ نہیں کرتا''۔

''کیوں......؟''

''انسان سے دور رہ کر انسان کے بارے میں جاننا چاہتے ہو''۔

''کیا کرنا چاہیے؟''

''اپنا مزاج بدل لو۔ اپنے پازیٹو کا نیگیٹو بن جاؤ۔ خود میں اتنی نمایاں تبدیلی پیدا کرو کہ اپنی نفی بن جاؤ''۔

''منزل ملے گی؟''

''شاید!'' اس نے کہا اور میں گہری سانس لے کر خاموش ہوگیا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ خود ہی بولی۔ ''اور میں اس کے لیے تمہاری مدد کرنے کو تیار ہوں''۔

''وقت ہے تمہارے پاس؟''

''ہاں ہے''۔

''مجھے کیچ کروگی؟''

''ہاں''۔

''کیوں؟''

''اس لیے کہ اتفاق سے تمہیں دیکھ کر جو کام میرے ذہن میں آیا تھا وہی تمہاری تربیت کا آغاز ہے''۔

"کیا مطلب؟"

"ابھی نہیں بتاؤں گی اس کے لیے وقت درکار ہے"۔

"وقت نہیں ہے میرے پاس"۔

"یہ اس اعتراف کی نفی ہے جو تم نے ابھی کیا ہے۔ کسی کے حالات کچھ اور ہوں اور تمہاری مرضی پر نہ چل سکے تو تمہیں اس پر غصہ نہیں آنا چاہیے بلکہ اس سے تعاون کرنا چاہیے"۔

میری مٹھیاں بھنچ گئیں اور چہرے پر سرخی آگئی وہ مجھے مسکراتی نظروں سے دیکھ کر بولی۔ "نہیں اپنی مٹھیاں کھول دو یا پھر مجھ سے کہو کہ میں کمرے سے باہر نکل جاؤں"۔

"مجھے پانی پلاؤ"۔ میں نے کہا۔

پھر میں نے تحمینہ علایہ کو قبول کرلیا۔ وہ عام لڑکی نہیں تھی بہت گہری بہت زیرک تھی۔

"دیکھنا......" اس نے مجھے ایک البم دکھائی۔ اس میں بہت سے تصویریں لگی ہوئی تھیں وہ بولی۔ "یہ میرے والد صاحب شمون علایہ ہیں۔ چودہ سال تک کُردوں کے لیے ان کے مخالفین سے گوریلا جنگ کرتے رہے لیکن یہ صدیوں کی جدوجہد ہے اپنے بعد انہوں نے تاج اپنے بیٹوں کے سر پر سجانے چاہے لیکن وہ اس کے اہل نہ تھے اور وطن سے باہر نکل آئے۔ شمون علایہ آج تک اس کے لئے افسردہ ہیں۔ دیکھو یہ میرے دونوں بھائی ہیں"۔

اس نے صفحہ الٹ دیا۔

"اور یہ میری ماں جویریہ علایہ ہیں اور یہ میرے دادا"۔

"لیکن تم لوگ کیا ایران میں رہتے ہو؟"

"ہاں!"

"امن وسکون کے ساتھ!"

"ہاں......کیوں؟"

"کیا حکومت ایران شمون علایہ کے بارے میں کچھ نہیں جانتی؟"

"نہیں...... ہم نے انداز بدل دیا ہے اور فیض آباد میں لوگ اس کی حیثیت سے آگاہ نہیں ہیں"۔

"پھر تم نے مجھے کیوں بتایا؟"

"اس لیے کہ تم نے میری دوستی قبول کی ہے اور جسے قدرت بلند قامت دیتی ہے جس کی پیشانی پر نور ہوتا ہے وہ ظرف کی تصویر ہوتا ہے میں جانتی ہوں کہ تم صاحب ظرف ہو اور رازوں کے امین بن سکتے ہو"۔

"تم نے مجھ پر کچھ زیادہ ہی بھروسہ کرلیا"۔

"ایسا ہی تو ہوا ہے"۔ وہ عجیب سے لہجے میں بولی اور میں مسکرانے لگا۔

"اگر میں نے کبھی دھوکہ دے دیا تو؟"

"حسنِ اتفاق ہوگا۔ جانا بوجھا عمل نہیں۔ خیر چھوڑو ان باتوں کو۔ اب یہ بتاؤ میرے ساتھ میرے وطن چلنے پر تیار ہو"۔

"ہاں......لیکن تم نے ابھی تک مجھے یہ نہیں بتایا کہ وہ کون سے کام ہیں جو میں تمہارے لیے کرسکتا ہوں؟"

"جب ہم عازمِ سفر ہوں گے تو راستے میں جہاز میں تمہیں بتاؤں گی"۔

"ٹھیک ہے مجھے بھی جلدی نہیں ہے۔ ایک بات ذہن میں رکھنا اگر وہ سب کچھ میرے معیار کے مطابق نہ ہوا تو میں اس کی انجام دہی کا وعدہ نہیں کرتا"۔

"مجھے منظور ہے"۔

اس سے گفتگو ختم ہوگئی لیکن ایران میرے دل میں دھڑکنے لگا۔ اس وقت میرے جنون کا دور تھا جب زمرد جہاں کو آگ میں جھونک آیا تھا لیکن وقت نے مجھے بہت کچھ سکھایا تھا اور اب مجھے اندازہ ہوگیا تھا کہ مصلحت زندگی کے سفر کا راستہ ہے اور ہر شخص کو اسی راستے پر چلنا ہوتا ہے۔ ایسے وقت میں مجھے زمرد جہاں یاد آرہی تھیں کاش کوئی ایسی صورت نکل آئے کہ میں اسے ان راستوں سے واپس لے آتا۔ کیا ہوا ہوگا۔

انتظامات تحمینہ علایہ نے ہی کئے تھے اور ان میں کوئی مشکل بھی نہیں ہوئی تھی۔ جہاز فضا میں سیدھا ہوا تو میں نے اس سے کہا۔

"اپنا وعدہ پورا کرو"۔

"خود تمہارے ذہن میں بھی کوئی اہم خیال ہے"۔ وہ مسکرا کر بولی۔

"کیا مطلب؟"

''تمہاری دوست نفسیات دان ہے۔ اس سفر کو کرتے ہوئے تمہارے چہرے کا حزن، بدلتے ہوئے رنگ اس بات کے غماز ہیں کہ اس سفر سے تمہارا کوئی ذہنی تعلق ہے، یا پھر تم صرف اس داستان کے لیے متجسس ہو جو میں تمہیں سنانے والی ہوں''۔

اس وقت میں نے سوچا کہ میں نے اپنے رجحان کے خلاف تعلیم حاصل کی ہے۔ علم نفسیات انسان کی تلاش میں معاون ہوسکتا ہے کم از کم اس سے ابتدائی تعاون حاصل کیا جاسکتا ہے۔

''ہاں ایک جواب ہے لیکن ابھی اس کا وقت نہیں آیا''۔ میں نے کہا اور وہ ہنسنے لگی۔

''بدلہ لے رہے ہو؟''

''شاید......'' میں نے مسکرا کر کہا۔

''یہ کچھ تصویریں دیکھو، اس میں مومن کو دیکھو''۔ اس نے ایک تصویر میرے سامنے کر دی۔ شاندار چہرے، بڑی بڑی آنکھوں میں، چوڑی پیشانی والا ایک شخص تھا۔ جس کے سر پر رکھے ہوئے صافے کا طرہ بہت بلند تھا۔ بڑی پُر اسرار شخصیت کا مالک تھا۔

''یہ کون ہے؟''

''حافظ سنجانی''۔ اس نے جواب دیا۔ ''کلام سنجانی کا اکلوتا، بیٹا۔ کلام سنجانی اس وقت کرد گوریلا فوج کا سپہ سالار تھا۔ جب میرے والد شمون علایہ گوریلا جنگ کر رہے تھے اور ان کے دشمن ممالک کی حکومت نے کلام سنجانی کے سر کی بہت بڑی قیمت رکھی تھی۔ پھر وہ خاموشی سے ایک جنگ میں شہید ہوگیا۔ دونوں حکومتیں آج بھی اس کی تلاش میں سرگرداں ہیں۔ حافظ اس وقت صرف پانچ سال کا تھا۔ اس کی ماں روحانہ سنجانی نے اسے پرورش کے لیے بیرون ملک بھجوایا اور اس کے لیے روتے روتے اندھی ہوگئی لیکن اس کا عزم تھا کہ حافظ سنجانی کو اس وقت بلائے گی جب وہ اپنے باپ کا علم لے کر اپنے وطن کی آزادی کے لیے جنگ کرنے نکل سکے گا''۔

''اور اب یہ اس قابل ہوگیا ہے''۔ میں نے اس داستان میں دلچسپی لیتے ہوئے کہا۔

''نہیں اب حالات بدل گئے ہیں بہت بدل گئے ہیں اب یہ خاندان حکومت کی پناہ میں ہیں۔ ہم سب اس جدوجہد سے دست بردار ہونے کا حلف اٹھا چکے ہیں۔ اب اتنے

گروہ سرگرم عمل ہیں اور ہمارا ان سے کوئی تعلق نہیں ہے''۔

''اور حافظ سنجانی؟''

''یہ اس کی ماں روحانہ سنجانی ہے''۔ تخمینہ نے ایک اور تصویر میرے سامنے کردی۔ عمر رسیدہ پُر وقار عورت کی تصویر تھی میں اسے دیکھنے لگا۔ اس کی آنکھیں بے نور نظر آرہی تھیں۔ دیر تک وہ تصویر میں نے سامنے سے نہ ہٹائی پھر ایک گہری سانس لے کر اسے واپس کرتے ہوئے کہا۔

''ماں کی یہ خواہش پوری نہ ہوسکی''۔

''ہاں......افسوس''۔ وہ غمزدہ لہجے میں بولی۔

''اب یہ اپنی ماں کے پاس پہنچ چکا ہے؟''

''نہیں''۔

''کیوں، اب کیوں نہیں؟''

''اس لیے کہ اب یہ اس دنیا میں نہیں ہے''۔ وہ آہستہ سے بولی اور میرا منہ حیرت سے کھل گیا۔ پھر وہی جھلاہٹ میرے ذہن میں اُمڈ آئی۔ وہ مجھے مسلسل ذہنی جھٹکے دے رہی تھی۔ میں نے جھلائی ہوئی آواز میں کہا۔

''تم ضرورت سے زیادہ حاوی ہونے کی کوشش کر رہی ہو مجھ پر۔ بچوں کی طرح مجھے کہانیاں سنا رہی ہو۔ میں نے تم سے اس کام کے بارے میں پوچھا تھا جو تم مجھ سے لینا چاہتی ہو اس کہانی کا تمہارے کام سے کیا تعلق ہے؟''

''آں......یہی کہانی تو اس کام کی بنیاد ہے''۔ اس نے آہستہ سے کہا۔

''عورت......'' میں نے جھلاہٹ پر قابو پا کر سوچا۔ بیشک وہ علم حاصل کرسکتی ہے ہر وہ علم جو مرد حاصل کرسکتا ہے۔ کسی بھی عمل میں وہ مرد سے کمتر نہیں ہے بلکہ وسیع معنوں میں سوچا جائے تو مرد سے طاقتور، اس سے زیادہ قوت برداشت رکھنے والی، ایک دوسرے وجود کو نو ماہ تک سنبھالے رکھنا اور لمحہ لمحہ اس کی حفاظت کرنا مرد کے تصور سے بھی باہر ہے۔ بڑے بڑے سرکش پہلوان جی چھوڑ بیٹھیں۔

وہ ذہنی طور پر بھی اتنی طاقتور ہوسکتی ہے کہ کسی مرد کو اپنے اشاروں کے دائرے میں

قید کر سکے۔ جس طرح ہر مرد عالم نہیں ہو سکتا۔ بلکہ دنیا کے مختلف شعبوں سے اس کا تعلق ہو سکتا ہے۔ اسی طرح عورت بھی مختلف ذہانتوں کی حامل ہو سکتی ہے۔

گو میں نے اس لڑکی کو اپنے ذہن کی گہرائیوں میں جھانکنے کا موقع نہیں دیا تھا لیکن اس نے مجھ پر کاری وار کئے تھے اور نتیجے میں میں اس کے ساتھ سفر کر رہا تھا۔ شاید اس سفر کی سب سے بڑی وجہ کریمن سلہری کا منصوبہ تھا اور اب وہ مجھ سے کھیل رہی تھی لیکن مجھے سنبھلنا تھا۔ اسے اس کے منصوبے میں کامیاب ہونے دینا ہی میری کامیابی کا دروازہ تھا۔ اگر اس کے اجتناب سے میں اکھڑ گیا تو اس وقت کے ضائع ہونے کا افسوس ہوگا۔

وہ سوچ میں ڈوبی ہوئی تھی۔ میں نے بھی خاموشی اختیار کر لی۔ کچھ دیر گزری تو وہ چونکی مجھے دیکھا اور آہستہ سے بولی۔

”آہ...... میں نے تو تم پر غور ہی نہیں کیا تھا“۔ میں نے سرد نظروں سے اسے دیکھا۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ ان لمحوں کی خود پرستی نے اس سے کیا چھین لیا ہے وہ خلوص وہ سچائی جو میں نے اس کے لئے اپنے دل میں بسائی تھی۔ اب دوسری شکل اختیار کر گئی تھی میرے خیال میں انسان کو اپنے خلوص میں بے اختیار ہونا چاہیے۔ اگر ہم سچائی کو لفظی تراش خراش میں الجھا دیں تو وہ بناوٹ کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ اس وقت یہی ہوا تھا۔ اس کی احتیاط نے اس کا کردار مشکوک کر دیا تھا۔

”تم کچھ زیادہ خاموش نہیں ہو گئے؟“

”مجھے کیا گفتگو کرنی چاہیے تھی“۔ میں نے سپاٹ لہجے میں پوچھا۔ وہ ہنس پڑی۔

”تم ناراض ہو گئے ہو؟“

”پتا نہیں“۔

”کیا تمہیں احساس ہے کہ بچے جب باپ سے کسی بات پر روٹھتے ہیں تو ماں باپ کو ان پر کس قدر پیار آتا ہے؟“

”یہ سوال تم مجھ سے کر رہی ہو؟“ وہ جلدی سے سنبھل گئی۔ پھر بولی۔

”معذرت خواہ ہوں احمد، بے خیالی میں الفاظ منہ سے نکل گئے۔ مجھے ان کا افسوس ہے دراصل میں یہ کہنا چاہتی تھی کہ عورت فطری طور پر ممتا کی ماری ہوتی ہے۔ شاید ممتا ہی

ل کی کوئی حس اس کے دل میں اپنی محبوس شخصیت کے لیے ہوتی ہے۔ تم بات بات پر ہ جاتے ہو مجھے بہت اچھے لگتے ہو“۔

میں اندر سے مسکرا دیا۔ واہ ذہنی طور پر طاقتور عورت...... موقع سے فائدہ اٹھایا ہے۔ ے لیے اپنے جذبوں کا اظہار کر کے ایک اور وار کرنے کی کوشش کی ہے...... وہ بھی ت معصومیت سے لیکن مار کھا گئی......

وہ مسلسل میرا چہرہ دیکھ رہی تھی۔ پھر اس نے کسی قدر گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔ ہارے عضلات کی بدلتی ہوئی لکیریں بتا رہی ہیں کہ تم مجھ سے بد دل ہو رہے ہو“۔ میں نا پڑا پھر میں نے کہا۔

”چار چیزوں کے بارے میں کہا گیا ہے کہ وہ ناپائیدار ہوتی ہیں شاید مال بے ت، علم بے عمل اور دو کچھ اور ہیں اس وقت مجھے ایک تجربہ ہوا ہے“۔

”کیا......؟“ اس نے کہا۔

”تمہارا علم نفسیات عمل کی منزل سے نہیں گزرا۔ تم تھیوری کی آنکھ سے دیکھتی ہو۔ ابھی وقت لکیروں کے جال میں خود کو نہ جکڑو جب تک تھوڑا سا پریکٹیکل نہ کر لو“۔

”تو میری مدد کرو“۔ وہ کسی قدر جھینپ کر بولی۔

”غالباً تم اس خط کی طوالت کو مختصر کر کے میرے ذہن سے کھیلنے کی کوشش کر رہی ہو یا اس کہانی کو مؤثر اور متجسس بنانے کی کوشش کر رہی ہو۔ جس کے بارے میں خود تمہارا ا کہنا ہے کہ اس قدر متاثر کن نہیں ہے“۔

اس نے شرمندگی سے گردن جھکا لی پھر کسی قدر افسردہ لہجے میں بولی۔ ”یہ بات نہیں ہے۔ میں مناسب الفاظ کی تلاش میں سرگرداں تھی۔ میں یہ کہنا چاہتی تھی کہ روحانہ سنجانی نے ا زندگی شوہر کی دربدری میں ساتھ دیا، بیٹے کو زندگی کے تحفظ کے لیے خود سے جدا کیا اس کی جدائی سے اس قدر دل شکستہ ہوئی کہ بینائی کھو بیٹھی۔ شوہر بھی ساتھ نہ دے سکا۔ ایک آس زندہ رہی اور اس آس نے اسے زندگی سے جوڑے رکھا لیکن بدقسمتی سے ے یہ موقع بھی نہ ملا۔ حافظ سنجانی ایک حادثے کا شکار ہو گیا اور زندگی ہار گیا اور ایک ماں کے انتظار میں ہے“۔

"حافظ سنجانی کی موت کی خبر اس کی ماں کو نہ پہنچی؟" میں نے سوال کیا۔

"نہیں......"

"یہ کیسے ممکن ہے؟"

"اس لیے کہ میں نے کسی کو نہیں بتایا" تحینہ علا یہ سسکی لے کر بولی۔

"کیا مطلب؟" میں نے حیرت سے کہا۔

"ہاں...... ایک جرم میرے سینے میں بھی پوشیدہ ہے اس واقع کو ایک سال گزر گیا ہے پورا ایک سال۔ ہم ساتھ ساتھ تعلیم حاصل کر رہے تھے وہ میرا اچھا دوست تھا کیونکہ ہم، ہم وطن تھے چھٹیاں تھیں۔ ہم یہ چھٹیاں گزارنے ایک تفریحی مقام پر گئے، حافظ اسکیٹنگ کا دیوانہ تھا اور اسکیٹنگ کے بہت سے ٹورنامنٹ جیت چکا تھا اس تفریحی مقام کے نواحات برفانی میدانوں سے بھرے ہوئے تھے۔ ہم انہی نواحات کی سیر کو نکلے تھے پھر ایک غیر محفوظ برفانی میدان کو دیکھ کر اس پر دیوانگی طاری ہوگئی یہاں پہ بورڈ لگا ہوا تھا کہ یہاں اسکیٹنگ ممنوع ہے۔ میں نے بہت منع کیا لیکن وہ نہ مانا اور......اور برف پر بہت دور نکل گیا۔ پھر میں نے...... پھر......" تحینہ کی آواز لرز گئی۔ اس کے رخسار آنسوؤں سے بھیگ گئے۔ اس نے سسکیوں کے درمیان کہا۔

"وہ...... میری نظروں کے سامنے...... وہ......" اس کی ہچکیاں ابھرنے لگیں۔ "ایک برفانی گڑھے میں غروب ہوگیا، برف نے اسے نگل لیا"۔

"ہوسٹس......!" میں نے ہوسٹس کو اشارہ کیا۔ وہ قریب آئی تو پانی لانے کے لئے کہا، ہوسٹس نے ایک خوبصورت لڑکی کو ایک نوجوان کے قریب روتے ہوئے دیکھا تو مسکرا کر آگے بڑھ گئی۔

پانی پینے کے بعد وہ دیر تک خود کو سنبھالنے کی کوشش کرتی رہی۔ پھر گلوگیر لہجے میں بولی۔ "میں وہاں سے تنہا ہی آئی تھی۔ نہ جانے کیوں مجھے احساس ہو رہا تھا کہ میں مجرم ہوں۔ نہ جانے کیوں میں خوفزدہ تھی کہ پولیس مجھے پریشان کرے گی۔ وہ مجھے اس کا قاتل گردانے گی...... اور...... اور......" اس نے اپنی گردن پر ہاتھ پھیرا پھر گھٹے گھٹے لہجے میں بولی۔

"میں نے کسی کو کچھ نہیں بتایا میں خاموش رہی اور وقت گزر گیا بمشکل میں نے خود

سنبھالا"۔

"اس کی گمشدگی پر کسی کی حیرت نہیں ہوئی؟"

"ضرور ہوئی ہوگی۔ مجھ سے کسی نے کچھ نہیں پوچھا کیونکہ حافظ کا معاملہ صیغہ راز میں رکھا گیا تھا اس لیے اس کا اپنے گھر سے بھی رابطہ نہیں تھا"۔

"تم نے کہا ہے کہ تمہارے گھرانے سے سنجانی خاندان کے گہرے روابط تھے"۔ میں نے سوال کیا۔ "تم نے روحانہ سنجانی کو بھی اطلاع نہیں دی؟"

"تم بتاؤ کیا ان حالات میں انہیں اطلاع دی جاسکتی تھی؟ ایک سال رہ گیا تھا صرف ایک سال۔ روحانہ اپنی بے نور آنکھوں سے اپنے پھول کو دیکھنا چاہتی تھی۔ اور میں اسے یہ اطلاع دیتی۔ میں یہ نہیں کر سکتی تھی احمد اسدی، یہ میرے بس کی بات نہیں تھی"۔

"اب کیا کرو گی؟" میں نے پوچھا۔

"اب......" اس نے ایک گہری سانس لی اور کچھ دیر تک کچھ نہ بولی پھر اس نے آہستہ سے کہا۔ "یہی وہ کام ہے جو میں تم سے لینا چاہتی تھی"۔

"کیا مطلب......؟" میں نے چونک کر تعجب سے کہا۔

"احمد اسدی! ایک ماں کی آنکھوں کی روشنی بن جاؤ۔ ایک دل کا کنول بن جاؤ۔ نہ......ورنہ وہ عورت جس نے طویل عرصہ اپنے جگر گوشے کا انتظار کیا ہے اس طرح مرجائے گی کہ دیکھنے والوں کے دل بند ہو جائیں گے"۔

"یعنی...... میں خود کو...... میں خود کو حافظ سنجانی کے روپ میں اس کے سامنے پیش کروں......؟"

"ہاں......" اس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا اور میرے چہرے پر تفکر کی لکیریں کھنچ گئیں...... "میں ایسا کیوں کروں؟"

"انسانی رشتوں کے تقدس کے لئے، ایک پیاسی ماں کے دل کی پیاس بجھانے کے لئے، میرے لیے"۔ اس نے کہا اور میرے دل میں شدید آگ بھڑک اٹھی ماں...... میری آنکھوں میں ناز مرد جہاں کی صورت ابھری۔ مختلف تصویریں میرے ذہن کے پردوں پر ناچ گئیں۔ آخری تصویر میں وہ مجھ پر پستول تانے ہوئے تھی۔

"کیا تم اپنا فیصلہ سناؤ گے احمد! تم وہی قد و قامت رکھتے ہو، اسی سج دھج کے مالک ہو۔ تمہارے چہرے میں وہی روپ جھلکتا ہے جو حافظ سنجانی کا روپ تھا کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا کہ تم حافظ سنجانی نہیں ہو۔ کوئی اس کا صورت آشنا نہیں۔ صرف میں اس کی شناسا ہوں اور میں تصدیق کر دوں تو کسی کو بھی شک نہیں گزرے گا۔ بول، احمد اسدی! کیا تم ایک ماں کی تسکین بنو گے؟"

"نہیں......" میں نے بے دلی سے کہا اور وہ اچھل پڑی۔

"کیا......کیا......نہیں"۔

"ہاں......مجھے اس سے نفرت ہے"۔

"ماں سے......؟"

"ہاں"۔

"اوہ!" وہ آہستہ سے بولی اور پھر خاموش ہو گئی۔

"اپنی منزل پر پہنچنے کے بعد تم اگر چاہو تو مجھے بھول سکتی ہو۔ دوبارہ اگر کہیں مل جاؤ تو غیر شناسا نگاہوں سے مجھے دیکھ کر قریب سے گزر جانا۔ میری آنکھوں میں شکایت نہ پاؤ گی"۔

"کیسے ممکن ہے، میں سوچ بھی نہیں سکتی"۔

"اور اب می تم سے وہ بھی نہیں کہنا چاہتا جو میرے دل ہے"۔

"اتنا ظلم کرو گے مجھ پر؟"

"یہ ظلم نہیں سودا تھا جو نہ ہو سکا"۔

"مگر میں منتظر رہوں گی۔ کاش میں تمہارے لیے اس قدر موثر ہو جاتی کہ تم سے اپنی بات منوا سکتی"۔

شہر کی سڑکوں پر روشنیاں جگمگانے لگیں۔ نہ جانے میں دوبارہ یہاں کیوں آ گیا تھا۔ کسٹم سے فراغت کے بعد میں باہر نکل گیا۔ تحینہ کو اپنے سامان کے لیے رکنا پڑا تھا لیکن میں باہر نکل آیا۔ ایک ٹیکسی روکی اور ڈرائیور کو ایک ہوٹل کا بتا دیا۔

خوبصورت ہوٹل کے کمرے کی کھڑکی سے بہتی ہوئی روشنیوں کو دیکھ کر میں نے سوچا

کہ میں یہاں دوبارہ کیوں آیا ہوں۔ میں یہاں سے جا چکا تھا۔

سب کچھ فنا کر چکا تھا۔ اب یہاں کچھ بھی نہیں ہے میرے لیے۔ کریمن سلہری، تحینہ ...ایہ، مجھے اس کے الفاظ یاد آئے، اپنی نفی بن جاؤ۔ یہی تو ممکن نہیں تھا۔ اپنی نفی کر سکتا تو ...لف خدام سے علیحدہ کیوں ہوتا۔ تحینہ کو نظر انداز کر کے غلطی کی ہے۔ اس سفر کا مقصد ہی ...ت ہو گیا اب کیا کروں صرف شہر کی روشنیاں دیکھتا رہوں۔

پھر دل میں حیدر سماوی کا خیال آیا۔ ان سے ملاقات کی جائے۔

دوسرے دن لباس تبدیل کر کے باہر نکل آیا۔ عاطف اکبر کا حافظہ بہت اچھا تھا مجھے ...یکھ کر کہا۔ تمہاری صورت میرے لیے اجنبی نہیں مگر یاد نہیں آ رہا کہ ہماری ملاقات کہاں ...ہوئی تھی۔

"میں نے آپ سے حیدر سماوی کے بارے میں پوچھا تھا"۔

"بالکل یاد آیا ملاقات ہو گئی تھی؟"

"ہاں"۔

"اب میرے لیے کیا خدمت ہے؟"

"حیدر سماوی کے بارے میں معلوم کرنا چاہتا ہوں"۔ میں نے کہا اور مسکرا دیا۔

...اطف اکبر بھی ہنس پڑا تھا۔ پھر اس نے کہا۔

"وہ اسی شہر میں ہیں۔ آج ہی میری ان سے ملاقات ہوئی ہے کیا آپ کو اب بھی ان ...کی رہائش کے بارے میں معلوم نہیں؟"

"نہیں آپ نے صرف قرون والی رہائش گاہ کا پتا بتایا تھا۔ اگر وہ وہاں نہیں ہیں تو میں ...ری رہائش گاہ سے ناواقف ہوں"۔

عاطف اکبر سے پتا لے کر چل پڑا۔ ٹیکسی ڈرائیور اس علاقے کے بارے میں جانتا ...ر مطلوبہ عمارت کے سامنے اتر کر ٹیکسی ڈرائیور کو بل ادا کر رہا تھا کہ کوٹھی سے ایک ...بصورت کار باہر نکلی جس کے شیشے رنگین تھے مجھے خدشہ ہوا کہیں حیدر سماوی نہ نکل گیا ہو ...ن کار فراٹے بھرتی ہوئی دور نکل گئی تھی۔

بہر حال اگر اس وقت نکل گیا ہے تو دوبارہ آنا پڑے گا۔ گیٹ پر موجود چوکیدار سے

پوچھا تو اس نے یہ کہہ کر اطمینان دلایا کہ حیدر ساوی اندر ہیں۔ حیدر ساوی مجھے دیکھ کر ششدر رہ گیا تھا پھر وہ بڑے پُرجوش انداز میں مجھ سے ملا۔

''تمہارے کردار نے مجھے متاثر کیا ہے احمد اسدی! میں اکثر تمہیں یاد کرتا رہتا تھا، تم ایشیا سے چلے گئے تھے؟''

''ہاں''۔

یورپ؟

''جی''۔

''واپسی کب ہوئی؟''

''پچھلے روز''۔

''کہاں قیام ہے؟''

''ہوٹل میں''۔

''حالانکہ یہاں تمہارا سب کچھ ہے''۔

''زمرد جہاں کا کیا ہوا؟'' میں نے سوال کیا اور حیدری ساوی کا چہرہ اتر گیا۔

''سزائے موت ہوگئی؟''

''نہیں''۔

''معافی مل گئی؟''

''نہیں، البتہ اس تنظیم کے ڈیڑھ سو افراد کی گردنیں کٹوا دی گئیں بظاہر وہ ختم ہوگئی ہے''۔

''اور زمرد جہاں؟''

''فرار ہوگئیں''۔

''اوہ...... کیسے؟''

میرے اس سوال پر حیدر ساوی ایک ٹھنڈی سانس لے کر خاموش ہوگیا تھا۔ میں سوالیہ نگاہوں سے اسے دیکھ رہا تھا کہ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد اس نے نگاہیں اٹھا کر مجھے دیکھا اور آہستہ سے بولا۔

''میں نے اس خاندان کا نمک کھایا ہے......'' میں منتظر تھا کہ اس سے آگے بھی وہ کچھ کہے گا لیکن یہ الفاظ ادا کرنے کے بعد وہ خاموش ہوگیا تھا میں نے کچھ دیر انتظار کرنے کے بعد کہا۔

''آپ نے اپنا جملہ پورا نہیں کیا۔ حیدری ساوی''۔

''میں نے اس خاندان کا بہت نمک کھایا ہے اور اس کی بہتری کا خواہاں رہا ہوں۔ اور جب خاتون زمرد جہاں نے اپنی فطری جبلت سے متاثر ہو کر یہ تنظیم بنا لی اور اس کے سلسلے میں مجھ پر اپنے افکار کا اظہار کیا تو میں نے نہایت احترام کے ساتھ اس کی مخالفت کی اور کہا کہ اپنی ذہنی کیفیت کو اس جانب منتقل نہ کریں''۔

''مداخلت کی معافی چاہتا ہوں حیدر ساوی! آپ نے زمرد جہاں کی ذہنی جبلت کے بارے میں کہا؟''

''ہاں ایک حقیقت تھی۔ نعمان اسدی نے آپ کی والدہ محترمہ کے ملک میں کاروبار کا آغاز کیا تو میں بھی ساتھ تھا۔ بات کچھ عجیب سی ہے۔ ایک بیٹے کو ماں باپ کے بارے میں یہ تفصیلات بتانا کچھ عجیب سا لگتا ہے لیکن تم نے چونکہ اس بارے میں سوال کیا ہے۔ اس لیے جواب دینا ضروری سمجھتا ہوں''۔

''میں آپ کا شکرگزار ہوں، حیدر ساوی! میں اپنا اطمینان چاہتا ہوں''۔

''ہاں اگر تم نے محسوس کیا ہو تو معاف کرنا، میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ تم نے انہیں کس قدر محسوس کیا اور کس قدر محسوس نہیں کیا تو زمرد جہاں کے مزاج میں ایک تندی، ایک دہشت اور شاید ایک انتہا پسندی موجود تھی اور آج بھی ہے اور جب انہوں نے نعمان اسدی سے شادی کا، فیصلہ کیا تو ان کی شدید مخالفت کی گئی۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر زمرد جہاں کی مخالفت نہ کی جاتی اور اس کے برعکس یہ کوشش کی جاتی کہ نعمان اسدی کو نچلے درجے کا انسان قرار دیا جاتا اور زمرد جہاں کو یہ احساس ہوجاتا کہ نعمان اسدی ذہنی طور پر اور فطرتاً ان کا ہم پلہ نہیں تو میرا خیال ہے وہ کبھی نعمان اسدی سے شادی کرنے کا فیصلہ نہ کرتیں اور معاملہ صاف ہو جاتا۔

لیکن ان کی مخالفت کی گئی تو سمجھ لو کہ ان لوگوں نے خود اپنے پاؤں پر کلہاڑی ماری جو

دل سے یہ سب کچھ نہیں چاہتے تھے بلکہ ایک مختلف طریق کار تھا ان کے لئے، یعنی زمرد جہاں کو اگر کسی سلسلے میں متاثر کرنا ہوتو پہلے ان کی اس بات سے اتفاق کیا جائے جس کا اظہار وہ کرنا چاہتی ہیں۔اور اس بعد انہیں کچھ اس قسم کے حالات سے روشناس کرایا جائے کہ وہ حقیقت کو سمجھ سکیں۔بس یوں مناسب طریقے سے کام ہوسکتا تھا لیکن ایسا نہیں کیا گیا اور آخر کار نعمان اسدی ان کی زندگی میں شامل ہو گئے۔ بعد میں لوگوں نے سر پیٹا لیکن اب اس سے کیا حاصل۔

تو یہ ان کی فطری جبلت تھی کہ وہ اس تنظیم کی سرگرم کارکن ہونے سے کسی طرح باز نہ رہ سکیں لیکن اس قسم کی تنظیمیں اتنی کمزور بنیادوں پر کامیاب نہیں ہوتیں بلکہ اس کے لئے تو نہ جانے کیا کیا جتن کرنے پڑتے ہیں۔صرف ڈیڑھ سو افراد تھے۔ جو ان کے ہم نوا تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ سب طاقتور حیثیت کے مالک تھے اور آگے چل کر یہ تنظیم درحقیقت حکومتِ وقت کے لئے دردِ سر بن سکتی تھی۔ جہاں تک میرا مسئلہ تھا تو میں انتہائی معذرت کے ساتھ تمہیں بتاؤں کہ میں اپنے وطن کا احترام کرتا ہوں اور اس کی بقاء کے لیے اپنی تمام تر خدمات پیش کرتا رہتا ہوں۔ بہت سے ایسے امور ہیں جن میں سرکاری طور پر مجھ سے مشورہ لیا جاتا ہے اور مجھے غیر سرکاری طور پر ایک مشیر کا درجہ دیا جاتا ہے۔

چنانچہ جب یہ بات میرے علم میں آئی اور اس سے متعلق جتنے عوامل ہیں، ان میں کچھ عوامل میں تم خود اتفاق سے شریک ہو گئے ہو میری مراد اس کتاب سے ہے، تو پھر میں اپنے آپ کو اس سلسلے میں ملوث ہونے سے باز نہیں رکھ سکا۔ میں نے اپنا فرض پورا کرنے کی حتی الامکان کوشش کی۔ میں ہر شخص کو سمجھا نہیں سکتا تھا کہ کیونکہ تم نے خود دیکھا کہ کتاب کے سلسلے میں میرے ساتھ کیا کچھ نہ کیا گیا اور میں اگر اس وقت ان لوگوں کے ہتھے چڑھ جاتا اور ان کی مرضی کے مطابق کتاب انہیں مل جاتی تو مجھے باآسانی قتل کیا جاسکتا تھا۔وہ تمام کوششیں کی گئیں اور خاتون زمرد جہاں نے بھی میرے ساتھ کوئی رعایت نہیں برتی بلکہ مجھے تنظیم کے دشمنوں میں شمار کر کے میرے لیے موت کا پروانہ جاری کر دیا گیا۔ یہ ان کا عمل تھا لیکن مجھے یہ اندازہ تھا کہ شاہوں کے دور میں اس خاندان کی کیا حیثیت تھی۔

بہر طور میں نے بھی اس دور میں بہت وقت گزارا ہے اور میں یہ نہیں کہوں گا کہ میں

کا دشمن تھا یا شاہ کے زاول کا خواہش مند تھا۔بات میری سطح سے اونچی تھی اور میں اس سلسلے میں اپنے کسی فیصلے پر نہ تو غور کرسکتا تھا نہ توجہ دے سکا تھا۔تو بہر حال مطلب یہ ہے کہ پھر جب یہ دور ختم ہو گیا اور حقیقتیں نمایاں ہوئیں تو میرے ضمیر نے ان حقیقتوں سے اتفاق کیا اور میں نے وہ سب کچھ تسلیم کیا جو ہو گیا تھا۔ایسے عالم میں اگر میرے سامنے کوئی ایسی تنظیم ڈسکلوز ہوتی تو ظاہر ہے میرے فرائض مجھے مجبور کرتے کہ میں اس کے خلاف اپنے وطن کی فلاح کے لئے کام کروں، سو میں نے ایسا ہی کیا۔خاتون زمرد جہاں کو البتہ میں نے اپنے طور پر سمجھایا کہ وہ ایسا نہ کریں اور اس چکر میں نہ ہی پڑیں تو بہتر ہے لیکن اس کے نتیجے میں جو کچھ ہوا شاید میں تمہیں بتا بھی نہ سکوں“۔

”کیا آپ نے یہ کہانی طویل نہیں کردی بیرسٹر سماوی“۔

”اکتا رہے ہو؟“

”ہاں“۔

”یہ تمہاری ماں کی کہانی ہے“۔

”حید سماوی صاحب!اس میں کوئی شک نہیں کہ میں آپ سے تعاون لینے پر دوبارہ مجبور ہوا لیکن اس کا یہ مقصد نہیں کہ آپ میری ذاتیات میں دخل انداز ہوں اگر آپ یہ کہتے ہیں کہ یہ میری ماں کی کہانی ہے تو آپ کو یہ بھی کہنا پڑے گا کہ جو کامیابی آپ کو حاصل ہوئی ہے اس میں سو فیصد میرا ہاتھ ہے۔ میں اگر اسے اپنی ماں کی کہانی سمجھتا تو وہ کتاب جسے میں نے بہر حال آپ سے حاصل کرلیا تھا۔آپ تک واپس نہ پہنچتی“۔

”میری بات کا برا مان گئے، لیکن میرے دوست!اس حقیقت سے تو انکار نہیں کرو گے تم کہ بہر حال وہ تمہاری ماں ہے“۔

”اجازت چاہتا ہوں“۔ میں نے کہا اور حیدر سماوی ایک دم سنبھل گیا۔جلدی سے بولا۔

”اوہ......میں معافی چاہتا ہوں احمد اسدی۔میرا خیال ہے غلطی مجھ سے ہی ہوئی ہے“۔

وہ بے اختیار مسکرا پڑا اور بولا۔”خاتون زمرد جہاں کے کچھ نہ کچھ جراثیم تو تم میں بھی منتقل ہوئے ہوں گے۔ بہر حال مختصر سننا چاہتے ہو تو یہ سمجھ لو کہ جب تنظیم کی نشاندہی ہوئی اور انتہائی منظم پیمانے پر ایک ایسی حکمتِ عملی ترتیب دی گئی جس میں تنظم کے تمام افراد کو

گرفتار کرنا تھا ایجنسیاں متحرک ہوگئیں سول انتظامیہ متحرک ہوگئی۔ مجھے مکمل اعتماد میں لیا گیا۔ میرے ذریعے ان افراد کی نشاندہی ہوئی، سب کچھ میں نے کیا لیکن اپنے آپ کو اس سے باز رکھ سکا کہ خاتون زمرد جہاں کو تحفظ دوں۔ چنانچہ میں نے انہیں چالاکی سے مطلع کردیا کہ اگر وہ فوراً فرار کی کوشش نہ کر پائیں تو گرفتار ہو جائیں ممکن ہے زمرد جہاں نے میری بات سے اتفاق نہ کیا ہو، یقین نہ آیا ہو انہیں، لیکن ظاہر ہے تنظیم کی رکن تھیں۔ اطلاع تو انہیں مل ہی گئی ہوگی کہ چھاپے پڑ رہے ہیں اور تنظیم کے معزز ارکان گرفتار ہو رہے ہیں چنانچہ انہوں نے عقل سے کام اور فرار ہوگئیں"۔

"زندہ ہیں......؟"

"یقیناً......"

"ملک ہی میں روپوش ہیں"۔

"میں بالکل نہیں جانتا"۔

"اس کے بعد کوئی رابطہ ہوا؟"

"نہیں"۔

"گویا کہانی ختم ہوگئی؟" میں نے کہا، حیدر سماوی مجھے دیکھنے لگا پھر بولا۔

"تم خود سمجھ دار آدمی ہو کیا کسی کی زندگی میں اس کی کہانی ختم ہو جاتی ہے؟"

"نہیں......میری مراد اس تنظیم سے تھی"۔

"ہاں...... تنظیم کی کہانی ختم ہوگئی اور اس کا سہرا تمہارے سر ہے"۔

"کیا میں افسوس کروں؟"

"نہ کرو تو بہتر ہے کیونکہ تنظیم کا ختم ہو جانا ملک کے مفاد میں ہے کہ ایسا ہوگیا۔ اس کے علاوہ زمرد جہاں کا اس طرح نکل جانا بھی کم ازکم میرے ضمیر کے باعثِ اطمینان ہے ظاہر ہے تنظیم ختم ہوگئی اکیلا چنا کیا بھاڑ پھوڑ سکتا ہے۔ خاتون زمرد جہاں نے جہاں پناہ لی ہوگی۔ بہرحال اب وہ اس قدر مستحکم نہیں ہو سکتیں کہ دوبارہ اس تنظیم کو فعال بنا سکیں"۔

"ٹھیک ہے حیدر سماوی صاحب!"

"احمد اسدی صاحب یورپ سے آئے ہو؟"

"جی......"

"دیکھو ہر انسان کی اپنی فطرت ہوتی ہے۔ تم اس قدر نفیس انسان ہو کہ میں اس وقت ے بعد ایک لمحہ تمہیں نہیں بھلا سکا۔ خاتون زمرد جہاں سے تو اصل میں میری بات نہیں ہو کی۔ وہ میرے شدید مخالفوں میں تھیں اور پھر میں بہت زیادہ وفاداری کا مظاہرہ بھی نہیں کر ا چاہتا تھا کیونکہ اس سے مجھے ذاتی طور پر نقصان پہنچنے کا خدشہ تھا لیکن ایک طرح سے میں نے اپنے وطن سے غداری بھی کی۔ اگر میں کوشش کرتا تو زمرد جہاں گرفتار ہو سکتی تھیں لیکن میں نے ایسا نہیں کیا بلکہ انہیں فرار ہونے میں مدد دی۔ اس سے یہی نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ یرے دل میں تمہارے خاندان سے محبت تھی، تم سے بھی بے لوث اور بے غرض۔ کوئی غرض اگر میری اس ہمدردی میں چھپی نظر آئے تو تم مجھے مسترد کر دینا۔ ان تمام الفاظ کی روشنی میں بنہیں تم فوراً ہی مختصر کرنے کے لیے کہو گے میں تم سے ایک سوال کرنا چاہتا ہوں"۔

"کیجئے"۔

"واپس یورپ جاؤ گے؟"

"نہیں......"

"یہیں اپنی والدہ کے وطن میں رہو گے؟"

"نہیں"۔

"کیا مطلب؟"

"نہ واپس یورپ جاؤں گا اور نہ ہی اپنی والدہ کے وطن میں رہوں گا"۔

"اوہو...... پھر تم نے اپنے ددھیال میں قیام کا فیصلہ کیا ہے"۔

"نہیں......"

"ارے پھر کیا ارادہ ہے؟"

"کوئی فیصلہ نہیں کر سکا"۔

"یعنی یہ فیصلے تم کر چکے ہو کہ نہ تم والدہ کے وطن میں رہو گے اور نہ یورپ واپس جاؤ گے اور نہ ددھیال میں قیام کرو گے اور اس کے بعد کا فیصلہ نہیں کر سکے ہو؟"

"یہی بات ہے"۔

"یہاں کب تک قیام ہے؟"

"بس چند دن"۔

"اس کے بعد کہاں جاؤ گے؟"

"سوچوں گا"۔

"تو پھر ایک پیش کش قبول کرلو میری"۔

"کیا......؟"

"میرے ساتھ رہو۔ یہاں رہو"۔ حیدر سماوی نے کہا اور میں نے محسوس کیا کہ اس کے لہجے میں صرف اور صرف خلوص ہے اور بہر حال میں جنگلی جانور بھی نہیں تھا کہ کسی کے خلوص کا جواب نیاز مندی سے نہ دے سکتا۔ میں نے کہا۔

"حیدر سماوی صاحب! بدقسمتی سے میری پرورش تنہائیوں میں ہوئی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ انسان کو اپنی سرشت بدلنی چاہیے۔ اگر ایک غلطی کسی سے ہوئی ہے اور وہ اس کا شکار ہوگیا ہے تو ہوش مند ہونے کے بعد اسے اپنی غلطی کا ازالہ کرنا چاہیے۔ ان حماقتوں سے بچنا چاہیے لیکن اس میں دیر لگتی ہے حیدر سماوی صاحب! اور پھر میں تنہائی کی جس زندگی کا عادی ہوگیا ہوں ممکن ہے طویل عرصے تک اس سے الگ نہ ہوسکوں۔ آپ ایک بھرے پُرے گھر کے مالک ہیں۔ میرا خیال ہے میں یہاں ایڈجسٹ نہیں ہوسکوں گا۔ ہوٹل میں قیام ہے میرا۔ میرا پتہ چاہیں تو ذہن نشین کر لیجئے گا۔ آپ سے رابطہ رہے گا اور اگر کوئی ضرورت پیش آئی تو آپ سے گفتگو کروں گا...... میری مشکل حل کرسکیں تو کر دیجئے گا نہ کرسکیں تو بالکل محسوس نہ کیجئے گا۔ کیونکہ ویسے بھی میں اپنی مشکلات خود حل کرنے کا عادی ہوں اور اپنی ضرورتیں پوری کر لیتا ہوں۔ کوئی مالی مسئلہ نہیں ہے کیونکہ نعمان اسدی صاحب نے میرے لیے اور کچھ کیا یا نہ کیا ہو لیکن اتنی دولت ضرور چھوڑ دی ہے کہ شاید طویل عرصے تک مجھے اس قسم کی کوشش نہ کرنی پڑے۔ تنہا آدمی ہوں ہر جگہ کام چل جائے گا اور پھر کبھی ایسی ضرورت آئی تو خود ایک مضبوط آدمی ہوں کام کرلوں گا اپنا"۔

"ٹھیک ہے......جیسی تمہاری مرضی"۔ حیدر سماوی نے کہا اور میں نے انہیں اپنے ہوٹل اور کمرے کا نمبر بتادیا۔ پھر میں وہاں سے اجازت لے کر نکل آیا۔ اس خوبصورت سرزمین کا

شہر بہت سی روایتوں کا مظہر تھا۔ نہ جانے کیوں دل چاہا کہ ان روایتوں کو گہری نگاہ سے دیکھوں اس سے پہلے بھی آیا تھا یہاں لیکن نہ وقت مل سکا تھا۔ نہ موقع، بہرحال اس وقت بہت دیر تک سڑکوں پر چکراتا رہا۔ پھر رات ہوئی تو اپنے ہوٹل واپس چلا گیا۔ وہی معمول وہی زندگی، ہوٹل واپس پہنچنے کے بعد ضروریات سے فارغ ہو کر اپنے کمرے میں آرام کرنے کے لئے دراز ہوگیا لیکن ذہن کی آزادی ممکن نہیں تھی۔ حالات دماغ کے پردوں سے ٹکرا رہے تھے۔ تصورات بہت سی سوچوں کے دروازے کھول رہے تھے اور ان دروازوں سے لاتعداد کردار ایک ایک کر کے اندر داخل ہو رہے تھے۔

حافظ خدام بہت اچھے استاد تھے بہت کچھ سکھایا انہوں نے مجھے بڑی محبت اور بڑی مہربانی سے پیش آئے لیکن نظریاتی اختلاف...... میرا خیال ہے کہ یہ اختلاف، اختلاف کی مختلف خصوصیات میں سب سے شدید ہوتا ہے اور اس کی شدت ہر اختلاف پر حاوی ہوتی ہے۔ پھر اس کے بعد بہت سے کردار، خاتون، زمرد جہاں کا تصور دل میں آیا، کس قدر خوبصورت خاتون تھیں۔ یقین نہیں آتا تھا کہ میری ماں ہوسکتی ہیں۔ انہوں نے جس انداز میں مجھے پہلی ملاقات پر خوش آمدید کہا تھا اس میں تمام تر تصنع تھا وہ ماں نہیں تھیں۔ ان کے کسی انداز سے مامتا نہیں جھلکتی تھی۔ ایک ماں وہ نابینا عورت تھی جو اپنے بیٹے کی منتظر تھی۔ میں حافظ سنجانی سے رقابت محسوس کر رہا تھا اگر اس کی ماں اس سے اس قدر محبت کرتی ہے تو وہ کم بخت مجھ پر سبقت لے گیا ناں! وہ الگ بات ہے لیکن موت کے بعد بھی اسے ماں کی محبت حاصل ہے۔ کس قدر فرق تھا زمرد جہاں اور روحانہ سنجانی میں اور کس قدر خوش نصیب تھا حافظ سنجانی اور کس قدر بدنصیب ہوں میں نہ باپ کی توجہ ملی اور نہ ماں کی۔

لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ بہت سی چیزیں جو مل جاتی ہیں۔ انسان نظر انداز کر دیتا ہے اور جو اسے حاصل ہو جاتی ہے ان پر شاکی رہتا ہے۔ اب جو نہ ملا نہ سہی۔ تحینہ علایہ بہت اچھی لڑکی تھی کم از کم اس سے گفتگو کرنے میں مزہ آتا تھا تعلیم یافتہ تھی۔ ہر چیز کی باریکی کو پیشِ نگاہ رکھتی تھی ان عورتوں کی طرح نہیں تھی جنہوں نے عورت کا روپ بگاڑ کر میرے سامنے پیش کیا تھا اور مجھے عورت سے خوفزدہ کر دیا تھا لیکن تحینہ علایہ نے جو تصور میرے ساتھ منسوب کیا تھا اس کی تکمیل میرے لیے ممکن نہیں تھی اس کی بہت سی وجوہات

تھیں وہی رقابت ماں نام کی چیز سے، تو اب میں کبھی رغبت کر ہی نہیں سکتا تھا وہ مجھ سے ایک ایسا کام لینا چاہتی تھی جو میرے دل پر ضرب کی حیثیت رکھتا تھا۔ انکار کر نہایت بہتر ہوا ہوسکتا ہے کچھ زیادہ ہی برا مان گئی ہو۔ میں نے کھل کر کہہ دیا تھا۔

بہر حال نہ جانے کون کون سی سوچیں دامن گیر رہیں اور اس کے بعد نیند آ گئی۔ اپنی مرضی کا مالک تھا کوئی ذمہ داری تو تھی نہیں کسی کی جب دل چاہے جاگا۔ دھوپ چڑھ چکی تھی۔ کھلے ہوئے پردے سے روشنی اندر داخل ہو رہی تھی دیوار گیر گھڑی میں وقت دیکھا، غسل کیا اور اس کے بعد روم سروس کو ٹیلی فون کر کے ناشتا طلب کر لیا۔

تھوڑی دیر بعد ناشتا سرو کر دیا گیا اور میں ناشتے میں مصروف ہو گیا۔ ابھی یہ سوچ ہی رہا تھا کہ کیا کرنا چاہیے اور کوئی خاص تصور بھی دل میں نہیں تھا۔ نعمان اسدی کے جن رشتے داروں سے ملاقات ہوئی تھی ان کا تیاپانچہ کر کے آیا تھا۔ پھوپھی جان بہر حال اس قدر کمزور نہیں تھیں کہ اپنے حقوق کی حفاظت نہ کر پاتیں۔ جو کچھ انہیں سونپ دیا تھا قانونی طور پر کوئی اسے واپس لینے کا حق دار نہیں تھا۔ چنانچہ وہاں جانا بے مقصد تھا البتہ ایک احساس دل میں پیدا ہوا کہ تہمینہ علایہ سے بالکل ہی قطع تعلق کر کے ذرا جلد بازی کر ڈالی ہے۔ اسے ذرا سا اعتماد میں لینا چاہیے تھا مجھے۔

اگر میں اسے اپنی کچھ باتیں بتا دیتا تو اس میں کوئی حرج نہیں چونکہ اس سے کریمن سلہری کے بارے میں تھوڑی بہت تفصیلات معلوم ہو جاتیں۔ اس شخص کا نظریہ میرے اپنے اندازے کے مطابق تھا اور اگر ذہنی طور پر وہ اور میں ہم آہنگ ہو جاتے تو ضرور کوئی ایسا راستہ نکل سکتا تھا جو میرے اس احمقانہ تصور کی تکمیل میں مددگار ثابت ہوتا جو میں نے اپنے ذہن میں بسا لیا تھا۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ خود اپنے اس تصور سے میں غیر مطمئن تھا۔ ایسے کام تصور میں تو لائے جا سکتے تھے لیکن ان کی حقیقتوں کو پانا آسان نہیں ہوتا۔ پھر بھی اگر کریمن سلہری سے ملاقات ہو جاتی تو کم از کم تبادلہ خیال ہی رہتا۔ باقی زندگی کا کوئی اور مقصد تو تھا نہیں۔ انہی سوچوں میں گم تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی اور میں نے ویٹر کو اندر آنے کی اجازت دے دی جو میرے اندازے کے مطابق وہ برتن لینے آیا ہو گا۔

لیکن میری اجازت پر اندر داخل ہونے والا ایک سرخ سفید رنگت کا مالک پینتالیس

سالہ ڈی ایس پی تھا اس کے عہدے کے نشان اس کی وردی پر نظر آ رہے تھے۔ ڈی ایس پی کے پیچھے ہوٹل کا منیجر اور دو انسپکٹر کے رینک کے افراد تھے باہر کچھ اور بھی لوگ تھے جن کا مجھے احساس ہو رہا تھا لیکن پولیس کی اس طرح آمد اور وہ بھی اس طرح جارحانہ انداز میں میرے لیے باعثِ حیرت تھی۔

میں تعجب بھری نگاہوں سے ان لوگوں کو دیکھنے لگا ڈی، ایس پی کی گہری نگاہیں میرا جائزہ لے رہی تھیں میں نے خاموشی اختیار کیے رکھی اور ڈی ایس پی قریب پہنچ کر بولا۔

"تمہارا نام احمد اسدی ہے؟"

"افسوس مجھے قانون سے واقفیت نہیں ورنہ تمہارے اس طرح یہاں آنے پر میں تم سے یہ سوال کرتا کہ کیا پولیس کو اس طرح اندر گھس آنے کی اجازت ہوتی ہے"۔

"اگر تمہیں قانون سے واقفیت نہیں تو کم از کم اتنا تو تمہیں سمجھایا جا سکتا ہے کہ خصوصی حالات میں پولیس کو یہ اختیارات ہوتے ہیں"۔

"ٹھیک ہے ہر ملک کا قانون اپنی جگہ اہمیت رکھتا ہے اتفاق سے میرا واسطہ کبھی قانونی حالات سے نہیں پڑا لیکن اگر تم کہتے ہو ٹھیک ہے اب اپنی آمد کی وجہ بتاؤ؟"

"تمہارا نام احمد اسدی ہے؟"

"یقیناً تم معلومات حاصل کر کے آئے ہو گے"۔

"اور تمہاری ماں کا نام زمرد جہاں تھا؟"

"زمرد جہاں ہے، باپ کے بارے میں تم کہہ سکتے ہو کہ اس کا نام نعمان اسدی تھا"۔ میں نے جواب دیا۔

"مسٹر احمد اسدی ہمارے پاس تمہاری گرفتاری کے وارنٹ ہیں اور وارنٹ تم دیکھ سکتے ہو اور اس کے بعد پولیس ہیڈ آفس چلنا ہے"۔

"وارنٹ تو ہو گا ہی آپ کے پاس"۔ میں نے پریشان ہوئے بغیر کہا۔

پولیس افسر نے وارنٹ میرے سامنے کر دیا میں نے سرسری نظر اس پر ڈالی اور اس کے بعد کھڑا ہو گیا۔

"میرے سامان کا تحفظ آپ کا فرض ہے کیونکہ میرے کاغذات اور کچھ قیمتی اشیاء

یہاں موجود ہیں''۔

''ان کی جانب سے مطمئن رہو لیکن اپنے کاغذات کی نشاندہی کرو کہاں ہیں''۔

''وہ سامنے الماری میں''۔

''انسپکٹر، ان کے تمام کاغذات اپنی تحویل میں لے لو''۔

انسپکٹر نے اپنے افسرِ اعلیٰ کی ہدایت پر عمل کیا اور پھر ان لوگوں کے ساتھ باہر نکل آیا۔ وہ لوگ ہتھکڑی ساتھ لائے تھے لیکن پتہ نہیں ابھی قانون میرے ہاتھوں میں ہتھکڑی لگانے کی اجازت دیتا تھا یا نہیں ویسے ان لوگوں نے ہتھکڑی لگائی نہیں تھی۔ البتہ میرے لباس کی تلاشی بے شک لے لی گئی تھی اور اس کے بعد ایک پولیس کی کار جو بند تھی مجھے لے کر واپس ہیڈ آفس چل پڑی۔ جس جگہ مجھے لایا گیا وہ صاف ستھری تھی ایک چھوٹے سے کمرے میں پہنچایا گیا اور مجھے لانے والے افسر نے کہا۔

''تمہاری گرفتاری کی رپورٹ تیار کی جائے گی اور اس کے بعد تم سے رابطہ دوبارہ قائم کیا جائے گا۔ بہتر طریقہ یہ ہوتا ہے کہ اپنے بارے میں مکمل رپورٹ تیار ہو لینے دو۔ اس سے پہلے نہ تو شور شرابہ کرو، نہ کوئی ایسی حرکت جس میں قانون کا تم سے براہِ راست تصادم ہو۔ یہ ایک بہتر اور دوستانہ مشورہ ہے''۔

میں نے خاموش رہنا ہی مناسب سمجھا حالانکہ میرے دل میں سیکڑوں سوالات مچل رہے تھے کوئی بات سمجھ میں نہیں آ رہی تھی لیکن اس بند کمرے میں کافی وقت ہو گیا تھا اور اس طرح کہ کوئی پُرسان حال نہیں تھا۔ کم از کم کسی کو خبر دینی چاہیے تھی بھوکا پیاسا اپنی جگہ بیٹھا رہا اور پھر آہستہ آہستہ دل میں بغاوت کی کیفیت نمودار ہو گئی۔ یہ تو بہتر بات نہیں کسی انسان کے ساتھ اس قدر بے اعتنائی جائز نہیں ہوتی۔ دروازہ باہر سے بند تھا میں نے کئی گھنٹے گزرنے کے بعد دروازے پر دستک دی تو ایک آدمی نے دروازہ کھولا دوسرا اس کے پیچھے سنگین لگی ہوئی رائفل تانے کھڑا تھا دروازہ کھولنے والے نے کہا۔

''ہاں...... کیا بات ہے''۔

''تم لوگوں کو علم ہے کہ میں یہاں موجود ہوں''۔

''اسکول ماسٹر بننے کی کوشش مت کرو۔ بتاؤ کیا بات ہے''۔

''یہاں نہ پانی کا بندوست ہے نہ مجھے چائے وغیرہ کے لیے پوچھا گیا اور آخر انسان کی دوسری ضروریات بھی ہوتی ہیں تم لوگ میرے ساتھ جانوروں جیسا سلوک کر رہے ہو''۔

''مسٹر! جب تک ہمیں تمہارے بارے میں اوپر سے ہدایات نہیں ملیں گی بھلا ہم کیا کر سکتے ہیں اس لیے آرام سے بیٹھو''۔

''آرام سے......؟'' میں نے طنزیہ انداز میں کہا۔

''اب بغیر کسی ضرورت کے دروازے پر دستک نہ دینا ورنہ......'' اس نے دروازہ بند کر دیا اور میں خاموش کھڑا ان لوگوں کی یہ غیر انسانی حرکات دیکھتا رہا۔

بہرحال یہ لوگ میرے ساتھ بہت بدسلوکی کر رہے تھے اور افسوس کی بات یہ تھی کہ اس بدسلوکی کی وجہ میری سمجھ میں نہیں آ سکی تھی۔ پھر رات کے تقریباً ساڑھے نو بجے تھے جب کچھ لوگوں نے مجھے وہاں سے نکالا۔ میں نے اب سے ان سے کوئی سوال نہیں کیا تھا۔ مجھ پر غصہ طاری ہوتا جا رہا تھا لیکن شکر ہے اس نے جنون کی شکل اختیار نہیں کی تھی پھر ان لوگوں نے مجھے ایک بڑے کمرے میں پہنچا دیا جو غالباً حوالات کا کمرہ تھا موٹی موٹی لوہے کی سلاخیں لگی ہوئی تھیں۔ اس کے سامنے ایک راہداری تھی اور سلاخ دار دروازے پر ایک موٹا سا تالا پڑا ہوا تھا۔ اس موٹے تالے کو کھول کر مجھے اندر دھکیل دیا گیا۔

میں نے یہ لمحات بڑے صبر و سکون سے برداشت کیے تھے اور کمرے کے ماحول کا جائزہ لینے لگا، ایک تیس بتیس سالہ مقامی آدمی جس کا بدن دبلا پتلا اور قد لمبا تھا چہرے پر افسردگی کے آثار اور شیو بڑھا ہوا تھا، اس نے سفید جوتے اور گرے کلر کا سوٹ پہنا ہوا تھا دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ اور بھی چند قیدی اس متعفن کمرے میں موجود تھے ان میں سے چند گندے فرش پر پڑے خراٹے لے رہے تھے۔ ایک قیدی سامنے سلاخوں والے دروازے سے باہر دیکھ رہا تھا۔ بہرحال یہ ماحول اور یہ منظر میرے لیے ناقابلِ یقین تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں پھر مجھے دوسرے قیدیوں کے ساتھ بڑی سی ڈبل روٹی اور تھوڑا سا سالن دیا گیا۔ یہ انتہائی نامناسب انداز تھا۔ میں نے اسے قبول نہ کیا تو وہ بغیر کسی تکلف کے کھانا واپس لے گئے جبکہ دوسرے قیدی بڑے ذوق و شوق سے یہ کھانا کھا رہے تھے میں نے ان میں سے ایک دو کی نگاہوں میں طنزیہ آثار بھی دیکھے۔ لیکن شکر تھا

کہ کسی نے اس وقت میرا مذاق نہیں اُڑایا تھا ورنہ شاید مجھ پر جنون طاری ہو جاتا

بہر حال رات جس طرح گزری میرا دل جانتا تھا۔ بھوکا پیاسا، نیند کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ساری رات دیوار سے کمر لگائے بیٹھا رہا تھا۔ صبح کو ناشتا آیا اور میں نے ناشتا بھی قبول کرنے سے انکار کر دیا جس کے بعد صبح دس بجے مجھے حوالات کی کوٹھری سے باہر نکالا گیا اور ایک دوسرے بڑے کمرے میں پہنچا دیا گیا جہاں ایک بینچ پڑی ہوئی تھی غالباً یہ عقوبت خانہ تھا کیونکہ کچھ اذیت رسانی کے آلات بھی وہاں نظر آ رہے تھے جیسے لوہے کی وہ ٹکٹکی جو غیر انسانی عمل کے لیے استعمال کی جاتی ہے۔

چند افراد یہاں موجود تھے ان میں سے کچھ سمجھ دار لوگ بھی نظر آ رہے تھے۔ وہ ڈی ایس پی بھی تھا، جس نے مجھے گرفتار کیا تھا اس نے ایک اور اعلیٰ افسر کے سامنے میرے بارے میں تفصیلی رپورٹ پیش کی اور افسر اعلیٰ نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

''ہاں ٹھیک ہے، مسٹر احمد اسدی! براہ کرم یہاں بیٹھ جائیے''۔ اس کا لہجہ نرم تھا۔ پیچھے کھڑے ہوئے ایک شخص نے اسے بتایا اور وہ چونک پڑا۔

''کیا، رات کا کھانا کھایا ہے نہ صبح کا ناشتہ کیا ہے لیکن کیوں؟''

''جناب! انہیں دونوں بار کھانے کی پیش کش کی گئی تھی لیکن انہوں نے مسترد کر دی''۔

''اوہو...... نہیں، مسٹر احمد اسدی...... یہ غلط ہے، میرا خیال ہے یہاں آپ نے ہمارے ساتھ زیادتی کی ہے''۔

''نہیں۔ سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ یہاں مجھے میرا جرم نہیں بتایا گیا اور دوسری بات یہ کہ میری حیثیت کو نظر انداز کر کے میرے ساتھ انتہائی بدترین سلوک کیا گیا ہے۔ میں نے اپنی ناپسندیدہ چیزوں کو قبول نہیں کیا۔

''نہیں، یہ غلط ہے چلو ناشتے کا بندوبست کرو''۔ اس افسر نے کہا اور مجھے اس کمرے سے اور ایک اور کمرے میں لے جایا گیا۔ افسر اعلیٰ شاید کوئی بہت ہی ذہین اور سمجھدار آدمی تھا۔ بہت عمدہ ناشتا منگوایا گیا تھا میری عقل کام کر رہی تھی میں نے یہی سوچا کہ جسمانی توانائی سے کام لوں گا۔ چنانچہ میں نے وہ ناشتہ کر لیا۔ چائے کی کئی پیالیوں اور دوسری لذیذ اشیاء نے میرے دل دماغ کو خاصی بہتر کیفیت سے ہمکنار کر دیا تھا۔ افسر اعلیٰ نے اس

دوران مجھ سے کوئی سوال نہیں کیا تھا لیکن ناشتا کرنے کے بعد میں نے اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا۔

''سب سے افسوسناک بات یہ ہے جناب کہ مجھے یہ نہیں بتایا کہ مجھے کس جرم میں گرفتار کیا گیا ہے''۔

''آپ آیئے ظاہر ہے ہر کام اپنی ضرورت کے مطابق ہوتا ہے، آیئے''۔

میں نے محسوس کیا کہ کچھ میرے نگران ہیں اور مسلح ہیں، غالباً اس بات کے لیے تیار کہ میں کوئی حرکت کروں تو کم از کم مجھے زخمی کر دیا جائے لیکن میں کوئی حرکت کیوں کرتا۔ کوئی ایسی غلط فہمی ان لوگوں کو ہوئی تھی جس کی بنا پر انہوں نے مجھے گرفتار کیا تھا لیکن میرا نام بھی پوچھا گیا۔ بہر حال مجھے دوبارہ اس کمرے میں لے آیا گیا اور ایک بار پھر مجھے اس کرسی پر بٹھا دیا گیا پھر افسر اعلیٰ میرے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا اس نے کہا۔

''کیا آپ ہمارے سوالات کے جواب دینے کے لیے تیار ہیں؟''

''ہاں......''

''آپ کا نام احمد اسدی ہے؟''

''جی......''

''آپ کا تعلق کہاں سے ہے؟''

''میرا تعلق اسلامی ملک سے ہے لیکن میری پیدائش اسی ملک کی ہے میں نے پرورش یورپ میں پائی اب آپ جو کچھ بھی کہہ لیں''۔

''ٹھیک ہے آپ کو ماضی یاد ہے؟''

''ماضی کے کون سے حصے کی بات کر رہے ہیں آپ؟'' میں نے سوال کیا اور افسر عجیب سی نگاہوں سے مجھے دیکھنے لگا پھر بولا۔

''آپ کے والد نے شادی ایک مسلمان عورت سے کی؟''

''جی......''

''اور آپ کی والدہ کا نام زمرد جہاں تھا؟''

''جی......''

"کیا آپ اپنی والدہ کے ساتھ اس تنظیم کے رکن نہیں تھے؟"

"نہیں......"

"کیا آپ اپنے ماضی کے حالات دہرا سکتے ہیں؟"

"نہیں"۔

"کیا مطلب؟"

"آپ کے سامنے کسی بھی غیر ضروری بات کو نہیں دہرا سکتا"۔

"مطلب یہ کہ آپ یورپ میں تھے اور آپ کی والدہ یہاں تھیں یورپ میں رہ کر آپ اس تنظیم کے لیے کیا کر رہے تھے؟"

"کچھ نہیں...... میرا اس تنظیم سے کوئی تعلق نہیں ہے"۔

"اپنی والدہ سے آپ کا تعلق ہے؟"

"آپ سے عرض کر چکا ہوں کہ کوئی غیر ضروری سوال نہ کریں جواب نہیں دوں گا"۔

"لیکن جواب ضروری ہے مسٹر"۔

"ہو سکتا ہے آپ کے لیے ضروری ہو لیکن میں اسے ضروری نہیں سمجھتا"۔

"اگر آپ نے یہ نہیں بتایا کہ آپ کی والدہ کہاں ہیں تو آپ کو جسمانی نقصان بھی پہنچایا جا سکتا ہے"۔

"میں اتنا بتا سکتا ہوں آپ کو کہ مجھے اپنی والدہ کے بارے میں کوئی علم نہیں ہے"۔

"بھلا یہ کیسے ممکن ہے؟"

"اور اب میں آپ کے کسی سوال کا جواب نہیں دوں گا"۔ میں نے سرد لہجے میں کہا اور آفیسر ادھر ادھر دیکھنے لگا چند لمحات خاموش رہا پھر ایک گہری سانس لے کر بولا۔

"ٹھیک ہے......آپ کا تفتیشی افسر آپ سے اس بارے میں مناسب سوال کر لے گا۔ میں تو یہ چاہتا ہوں کہ آپ مجھے تفصیلی جواب دے دیں اور ایک شریفانہ طرز عمل اختیار کریں۔ دیکھیے جب انسان بازی ہار جاتا ہے تو اسے سرکشی اور تندی چھوڑنی پڑتی ہے' آپ پولیس لاک اپ میں ہیں۔ پولیس کسٹڈی میں ہیں۔ یہ بات ہمیں پتہ چل چکی ہے کہ آپ خاتون زمرد جہاں کے صاحبزادے ہیں ہم نعمان اسدی کو اس بارے میں ملوث نہیں کرتے

چونکہ وہ ایک اسلامی ملک کے باشندے تھے اور ملک کی سیاست سے ان کا کوئی تعلق نہیں تھا لیکن آپ کی والدہ زمرد جہاں کا معاملہ مختلف تھا اور جبکہ یہ بات ہمارے علم میں آ چکی ہے کہ آپ اپنی والدہ سے ملاقاتیں کرتے رہے ہر چند کہ آپ یورپ میں رہتے تھے"۔

"دیکھیے آپ کو تمام اطلاعات غلط ملی ہیں۔ میرا قیام یورپ میں تھا کچھ دن پہلے میں صرف یہاں چند روز کے لیے آیا تھا اس کے بعد یورپ واپس چلا گیا تھا"۔

"دوبارہ آپ کی آمد کس سلسلے میں ہوئی؟"

"یہ سب بیکار کی باتیں ہیں میں نے عرض کیا کہ میں آپ کو نہیں بتاؤں گا"۔

"ٹھیک ہے۔ اصل میں آپ کا تفتیشی افسر میں نہیں ہوں جو شخص ہے وہ آنے والا ہے میں آپ کو اس کے ہینڈ اوور کر کے چلا جاؤں گا"۔

پھر بہت سے افراد اس کمرے سے باہر نکل گئے میں خاموش کرسی پر بیٹھا رہا تھوڑی دیر بعد ایک انتہائی سمارٹ نوجوان اندر داخل ہوا۔

بھوری آنکھوں والا۔ یہ نوجوان شکل و صورت کا بہت اچھا تھا لیکن اس کے چہرے پر عجیب سفاکی تھی۔ ویسے بھی کھلاڑیوں جیسی مضبوط جسامت کا مالک تھا بدن بھی ورزشی تھا اندر داخل ہوا تو پہلے سے موجود شخص نے کہا۔

"نجم غرقندی! یہ آپ کا ملزم ہے تعلیم یافتہ آدمی ہے۔ ہمیں کچھ بتانے پر آمادہ نہیں ہوا لیکن بہر حال ہم نے اس سے زیادہ معلومات حاصل کرنے کی کوشش بھی نہیں کی اب آپ جانیں اور آپ کا کام"۔

"بہتر یہی تھا کہ مجھے ہی میرا کام دیکھنے دیا جاتا۔ خیر کوئی بات نہیں آپ آرام کیجیے۔ اپنے معزز مہمان سے خود گفتگو کر لوں گا"۔ اس شخص نے مسکراتے ہوئے کہا لیکن انداز اندر طنزیہ تھا جیسے وہ اپنے آپ کو بہت بڑی شخصیت کا مالک سمجھتا ہو اور مجھے معمولی اہمیت دیتا ہو۔

میں نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ پھر کمرے میں صرف دو افراد رہ گئے تھے غالباً نجم ان کے ساتھ تھے باقی تمام لوگ کمرے سے باہر نکل گئے تھے۔

بھوری آنکھوں والے اس نوجوان آفیسر نے ایک کرسی پر بیٹھ کر انتہائی نرم لہجے میں

کہا۔

''آپ نے صبح کا ناشتا کرلیا، مسٹر احمد اسدی؟''

''جی......''

''دیکھئے مدافعت اچھی چیز ہوتی ہے لیکن صرف اس وقت تک جب تک اس کی گنجائش رہے۔ آپ کو علم ہے کہ پاور اسٹیٹ تنظیم کے تمام افراد کو سزائے موت دے دی گئی ہے صرف خاتون زمرد جہاں ہمارے ہاتھ نہیں لگیں اور مسٹر احمد اس فہرست میں ان کا نام بھی موجود ہے۔ جس میں یہ بتایا گیا ہے کہ پاور اسٹیٹ تنظیم کے ڈیڑھ سو افراد کون کون ہیں۔ آپ کے بارے میں ہمیں اطلاع بھی ملی ہے کہ آپ نے تقریباً اپنی تمام زندگی اس ملک سے باہر ہی گزاری ہے اور غالباً یورپ میں رہے ہیں...... یہ بہترین موقع ہے مسٹر احمد اسدی کہ آپ اپنے آپ کو اس تنظیم کا فرد کہلوانے سے گریز کریں اور وہ تمام حقائق بتادیں جو آپ کو خاتون زمرد جہاں کے بارے میں معلوم ہیں ورنہ دوسری شکل میں آپ کو بھی لازمی طور پر خاتون زمرد ہاں کا ہمراہی سمجھا جائے گا۔ اور ظاہر ہے یہ ثابت ہونے کے بعد سزائے موت آپ کا مقدر بن جائے گی آپ صرف اتنا ہمیں بتادیں کہ خاتون زمرد کہاں روپوش ہیں یہ بات ہمارے علم میں آچکی ہے کہ وہ آپ کے والد کے ملک میں نہیں گئیں اور وہاں ان کا کوئی تعلق نہیں بلکہ شاید اب وہاں ان کے لیے کوئی بہتر جگہ نہیں رہی اور انہیں کوئی اہمیت نہیں دی گئی مسٹر احمد اسدی کیا وہ اس ملک میں ہیں یا آپ کے پاس یورپ میں چلی گئی ہیں؟''

میں نے چند لمحات خاموشی اختیار کی پھر آہستہ سے کہا۔

''نہیں، حقیقت یہ ہے کہ مجھے ان کے بارے میں کوئی علم نہیں ہے''۔

''آہ......وہی کر رہے ہیں آپ جو آپ کے حق میں بہتر نہیں ہے۔ میں آخری بار کہتا ہوں کہ حقائق بیان کرو کیوں اپنی زندگی کھونا چاہتے ہو۔ میرا نام غرقندی ہے اور لوگوں کا کہنا ہے کہ جو کیس میرے سپرد کیا جاتا ہے اس میں اگر دور دور تک کوئی ملوث ہوتا ہے تو خدا کر مجھے بتاتا ہے کہ حقیقت حال یہ ہے اور پھر مجھ سے معافی کا طلبگار رہتا ہے۔ میں تمہیں اس ٹکٹکی سے بندھواؤں گا اور پھر اس قسم کی ٹیکنیکل اذیتیں دوں گا کہ تم زبان کھولنے پر مجبور

ہو جاؤ گے کیا تم ایک شریف آدمی کی مانند ان اذیتوں سے بچنے کی کوشش کرو گے؟''

اس کے الفاظ مجھے میری فطرت یاد لانے کے لئے کافی تھے میری آنکھوں میں خون کی سرخی لہرانے لگی تب میں نے نجم غرقندی سے کہا

''یہ تمام اذیتیں......پہلی بات تو یہ ہے کہ بے مقصد تم مجھے دو گے۔ دوسری یہ کہ تم ساری پولیس فورس کے ساتھ یہ عمل کرو گے۔ تمہاری اپنی اوقات کیا ہے بتاؤ گے کیا تم ذاتی طور پر مجھے یہ اذیتیں دینے کی صلاحیت رکھتے ہو؟''

میرے ان الفاظ نے اس سرکش پولیس آفیسر کو بھی دل و دماغ کے قابو سے باہر کر دیا۔ اس نے آہستہ سے کہا۔

''ہاں۔ میں اپنے آپ کو اس اہل سمجھتا ہوں''۔ یہ کہہ کر اس نے اپنے ساتھی کو حکم دیا۔

''تم دونوں باہر جاؤ دروازہ باہر سے بند کردو۔ خبردار کسی کو اندر آنے نہ دینا''۔

وہ دونوں ہچکچاتی نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھتے ہوئے باہر نکل گئے تب سرکش پلس آفیسر نے اپنا پولیس کوٹ اتار دیا۔ پھر قمیض بھی اتار دی اس کے بازوؤں کی مچھلیاں تڑپ رہی تھیں تن و توش کا پھرتیلا آدمی تھا اور اس کا اندازہ میں نے پہلے سے لگالیا تھا۔

میں پُرسکون نگاہوں سے اپنی کرسی پر بیٹھا اسے دیکھتا رہا پولیس آفیسر نے اپنی گھڑی اتار کر ایک جانب رکھی اور پھر ان چیزوں کو ایک طرف سرکاتا ہوا بولا۔

''کھڑے ہو جاؤ کیا اپنے الفاظ پر نادم ہو؟''

میں آہستہ آہستہ اپنی جگہ سے اٹھا اور اس سے کہا۔

''جو کچھ تم مجھ سے پوچھنا چاہتے ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ میرے علم میں نہیں ہے لیکن جو بکواس تم نے کی ہے اگر میں اس کی سزا تمہیں نہیں دوں گا تو اذیتوں کا شکار رہوں گا آؤ......'' میں نے دونوں ہاتھ سیدھے کئے اور اسے اپنی طرف آنے کا اشارہ کیا وہ بڑے اعتماد سے آگے بڑھا پھر اس نے اپنی جگہ گھوم کر اپنے بوٹ کی ٹھوکر میرے پیٹ پر مانے کی کوشش کی لیکن میں نے ہلکی سی جنبش سے اس کا پاؤں پکڑا اور اسے اوپر اچھال دیا۔

وہ غالباً مناسب تربیت یافتہ آدمی تھا اور پولیس میں کام کرنے کے لئے ایسے تربیت یافتہ ہی مناسب رہتے ہیں۔ بے شک میری طاقت سے وہ اچھلا تھا لیکن پیروں کے بل ہی

زمین پر آیا تھا۔

اور پھر اس نے مجھ پر دوبارہ لات چلائی اور اس بار اپنی کوشش میں کامیاب ہوگیا لیکن میں نے اس کا پاؤں اپنی کمر سے لپٹا اور اس کے قریب پہنچ گیا پھر میں نے اس کی گردن اپنے ہاتھوں میں دبوچ لی اور میرے بدن پر گھونسے برسانے لگا لیکن چند ہی لمحوں میں اسے احساس ہوگیا کہ غلط ہوگیا ہے۔ انسان کو اپنے بارے میں خوش فہمیوں کا شکار نہیں ہونا چاہیے اور اس نے یہ نہ کیا جس کے نتیجے میں وہ پھنس گیا تھا۔

میری انگلیاں اس کی گردن میں پیوست تھیں اس کا چہرہ سرخ ہوتا جا رہا تھا اور آنکھیں ابلنے لگی تھیں۔ وہ میرے بدن پر گھونسے برسانا بھول گیا اور اپنے دونوں ہاتھوں سے میری کلائیاں پکڑ کر میری گرفت سے نکلنے کی کوشش کرنے لگا لیکن اس کی قوتِ مدافعت جواب دے گئی تھی اور میرے چہرے پر خونخوار تاثرات ابھرتے جا رہے تھے۔

پھر اچانک اس نے مایوسی کے عالم میں اپنی تمام تر قوت کو جمع کر کے میرے پیٹ میں زوردار کہنی ماری اور میری گرفت سے نکل گیا۔ ساتھ ہی اس نے میرے جبڑے پر گھونسا بھی رسید کر دیا تھا لیکن یہ گھونسا مشعل پر تیل کی مانند ثابت ہوا تھا۔ اس بار میں نے اس کے منہ پر ایک زوردار ضرب لگائی اور اس کے سینے پر سوار ہوگیا۔ اس کے منہ سے بڑی خوفناک غراہٹیں نکل رہی تھیں

میں نے اس کے جبڑوں کو نشانہ بنایا اور پھر زوردار لات رسید کر کے اس پر سے ہٹ گیا۔

بہر حال میں کوئی قتل نہیں کرنا چاہتا تھا وہ کراہتا ہوا پیچھے لڑھکا اور دیوار کی طرف کھسکنے لگا۔ تب میں نے اس پر چھلانگ لگائی۔ وہ پھرتی سے ایک جانب ہٹ گیا اس وقت میں منہ کے بل نیچے آ رہا تھا۔ میں نے خود کو سنبھالا تو وہ کھڑا ہو چکا تھا۔ اس نے ایک خوفناک غراہٹ کے ساتھ مجھ پر چھلانگ لگا دی اور ہم دونوں گتھم گتھا ہو گئے لیکن وہ مجھ سے زیادہ طاقتور نہیں تھا۔ چند ہی لمحات کے بعد اس کے پاؤں سست پڑنے لگے۔

پھر میں نے ایک وحشیانہ قوت کے ساتھ اسے سر سے اوپر اٹھا لیا۔ باہر موجود محافظ اندر کے حالات سے لاعلم نہیں رہے تھے۔ غالباً اندر جھانک رہے تھے۔ دروازہ پوری قوت کے

ساتھ کھلا اور وہ دو افراد ہی نہیں بلکہ مزید دس افراد اندر آ گئے تھے میں نے اسے زور سے ان پر اچھالا تو انہوں نے اسے درمیان سے لپک لیا چند افراد نے ایسا کیا تھا باقی بیک وقت مجھ پر ٹوٹ پڑے تھے۔

انہوں نے مختلف چیزوں سے مجھ پر وار کرنے شروع کر دیئے۔ سب ہی کو مارنا تو مناسب نہیں تھا جس شخص نے مجھے چیلنج کیا تھا میں نے اسے کیفرِ کردار تک پہنچا دیا تھا باقی لوگوں سے میں نے کوئی تعرض نہ کیا اور وہ مجھ پر وحشت آزمائی کرتے رہے جس کے نتیجے میں میرے ہوش و حواس بھی ساتھ چھوڑ گئے اس کے بعد مجھے کوئی احساس نہیں رہا تھا۔

پھر غالباً اسپتال کے کمرے میں ہوش آیا تھا۔ سفید در و دیوار لوہے کے فریم والا بستر جس پر دراز تھا جسم میں بہت سی چوٹوں کا احساس تھا۔ غالباً سر کی ضرب نے بے ہوش کیا تھا۔ سر پر پٹی بندھی ہوئی تھی کمرہ کافی وسیع تھا اور اس میں کئی بستر پڑے ہوئے تھے لیکن صرف ایک بستر پر میرے علاوہ ایک اور مریض بھی موجود تھا۔ پولیس کے جوان وہاں تعینات تھے کیونکہ میں ایک قیدی تھا وہ مجھ سے چند قدم کے فاصلے پر خاموش کھڑے تھے۔

میں سرد نگاہوں سے پورے ماحول کا جائزہ لیتا رہا۔ ذہن میں بہت سے خیالات آ رہے تھے۔ زیادتی ہوئی ہے میرے ساتھ۔ زمرد جہاں تو صرف میری وجہ سے اس مشکل کا شکار ہوئی تھی۔ ورنہ شاید ڈیڑھ سو افراد بہت عرصے تک حکومت کے خلاف جدوجہد کرتے اور ان لوگوں نے صرف اس بنیاد پر مجھے گرفتار کیا تھا کہ میں نعمان اسدی کے ساتھ ساتھ زمرد جہاں کی اولاد بھی ہوں لیکن میری نشاندہی کس نے کی؟

ویسے تو ہر ملک میں پولیس اور انٹیلی جینس ذہین ہوتی ہے اور اپنے مسائل حل کرتی ہیں لیکن پھر بھی ذرا تعجب خیز بات تھی کہ تھوڑے ہی وقت میں میری نشاندہی ہوگئی تھی کیا کسی خاص شخصیت نے میری مخبری کی اور کیا وہ خاص شخصیت حیدر ساوی ہو سکتا ہے لیکن اسے ایسا کرنے کی کیا ضرورت تھی اور اگر اس نے ایسا کیا ہے تو میرے خیال میں اچھا نہیں کیا۔

بہت سی سوچیں دامن گیر تھیں پھر دروازہ کھلا اور میں نے خوشبو کا ایک جھونکا محسوس کیا، ایک خوبصورت سی لڑکی اندر آئی تھی اس کے پیچھے ایک کم سن نوجوان اور ایک ملازم

ٹائپ شخصیت تھی۔لڑکی آہستہ آہستہ چلتی ہوئی اس دوسرے مریض کے پاس پہنچ گئی اور خاموشی سے کھڑی ہو کر اسے دیکھنے لگی۔تب مریض اٹھ کر بیٹھ گیا اور اس نے پُرمحبت لہجے میں کہا۔

''نوشین سوری، تمہیں یہاں آنے کی تکلیف ہوئی''۔

''لیکن یہ کیسے ہوا؟'' لڑکی کی آنسو بھری آواز ابھری۔اب میں نے مریض کا چہرہ دیکھا اور چونک پڑا۔

یہ وہی پولیس آفیسر تھا جن کا نام نجم غرقندی تھا۔اسے بھی اسی کمرے میں رکھا گیا تھا غالباً پولیس کی یہ تعداد اس وجہ بھی زیادہ تھی۔

میرے ذہن میں عجیب سے تصورات پیدا ہو گئے۔یہ شخص پتا نہیں، میرے بارے میں باعلم ہے یا میری ہی طرح بے خبر۔بہر حال وہ کہنیوں کے بل اٹھ کر بیٹھ گیا اور اس نے کہا۔

''اونٹ پہاڑ تلے آگیا ہے اور کوئی بات نہیں ہے نوشین، میں ٹھیک ہوں''۔

''کیا ہوا، کیسے زخمی ہو گئے۔کسی قیدی سے لڑ پڑے تھے؟''

''وہ قیدی بھی سامنے ہی موجود ہے''۔نجم غرقندی نے مسکرا کر میری جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا اور لڑکی میری جانب دیکھنے لگی پھر بولی۔

''میں اسے قتل کر دوں گی، ہلاک کر دوں گی میں اسے''۔

''نہیں نوشین وہ اتنی آسانی سے ہلاک ہونے والا نہیں۔بڑی شاندار شخصیت کا مالک ہے میں نے کہا نا، اونٹ پہاڑ تلے آگیا ہے''۔

''مجھے تو ابھی تھوڑی دیر قبل معلوم ہوا اور میرے پیروں تلے سے زمین نکل گئی، لیکن ہوا کیا تھا؟''

میں ان کی آواز سن رہا تھا اور ان الفاظ پر غور کر رہا تھا جو پولیس والے نے ادا کئے تھے لڑکی سے اس کا کیا تعلق ہو سکتا ہے؟ میں سوچ رہا تھا۔میں نے پھر ان کی گفتگو کی طرف توجہ مبذول کر دی۔

''گہرے زخم لگے ہیں؟''

''نہیں، اس سے پہلے کہیں گہرے گھاؤ لگ چکے ہیں''۔اس کے لہجے میں شرارت تھی۔

''کیا؟''

''تمہیں علم نہیں ہے''۔

''جھوٹ بول رہے ہو''۔

''بخدا جھوٹ نہیں بول رہا، پہلی بار تمہیں دیکھنے سے جو گھاؤ دل پر لگا کیا وہ ٹھیک ہوا؟''

''باتوں میں ٹال رہے ہو۔بتاؤ گے نہیں کیا ہوا؟'' لڑکی بولی۔

''کہا نا اونٹ پہاڑ تلے آگیا۔وہ ایک ملزم......میں اس سے تفتیش کر رہا تھا۔دوران تفتیش پُرجوش ہو گیا میں نے کچھ ایسی باتیں کیں کہ وہ مشتعل ہو گیا اور میں نے اس کا چیلنج قبول کر لیا لیکن......''

''لیکن کیا......؟''

''وہ مجھ سے زیادہ طاقتور ہے''۔

''ناممکن!'' لڑکی بے اختیار بولی۔

''کیا ناممکن؟......''

''تم سے زیادہ طاقتور کون ہو سکتا ہے؟''

''ارے نہیں، میں ایک انٹیلی جنیس کا افسر ضرور ہوں لیکن رستم یا سہراب نہیں ہوں''۔ افسر ہنس کر بولا۔''تمہیں مجھ سے زیادہ طاقتور آدمی کو دیکھنا ہے تو اسے دیکھ لو''۔

اب مجھے یہ باتیں دلچسپ لگ رہی تھیں۔یہ اس آفیسر کی خوبی تھی اس نے لڑکی کے سامنے ڈینگیں مار کر عذرِ لنگ پیش کرنے کی کوشش نہیں کی تھی بلکہ صدق دل سے اپنی شکست کا اعتراف کیا تھا جبکہ خوبصورت چوہیا کے سامنے تو چوہا بھی دُم کے بل کھڑے ہونے کی کوشش کرتا ہے۔

لڑکی بھی روشن خیال معلوم ہوتی تھی آگے بڑھی اور میرے قریب آگئی پہلے مجھے خشمناک نظروں سے دیکھا پھر چونک سی پڑی اور تعجب بھری نظروں سے مجھے دیکھنے لگی میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''وہ بہت شاندار ہے لیکن اس سے کہو کہ دوران تفتیش ملزموں کو گالیاں نہ دیا کرے''۔

لڑکی نے کوئی جواب نہیں دیا تو میں نے پھر کہا۔''اور اس کو بتا دینا کہ اس نے نہیں

بلکہ دوسرے دس افراد نے مل کر زخمی کیا ہے"۔

وہ کچھ لمحے کھوئی کھوئی سی کھڑی رہی پھر وہاں سے چلی گئی لیکن زخمی پولیس آفیسر کے پاس وہ دیر تک رکی تھی اور وہ مدہم لہجے میں باتیں کرتے رہے تھے۔

اس وقت شام کے سات بجے تھے جب کمرے میں چند افراد داخل ہوئے ان میں ایک ایس پی کے علاوہ میں نے حیدر سماوی کو بھی دیکھا۔ حیدر سماوی تیر کی طرح میرے پاس آیا تھا پھر وہ تاسف بھرے لہجے میں بولا۔

"احمد اسدی۔ لیکن یہ سب......"

"میں نہیں جانتا"۔ میں نے کہا۔

"ہوا کیا تھا؟" اس نے کہا۔

"میرے خیال میں کچھ نہیں میں قانونی طور پر ایک ملک میں داخل ہوا تھا۔ میرے کاغذات اس بات کے گواہ ہیں اپنے ہوٹل میں مقیم تھا کہ پولیس نے مجھے گرفتار کرلیا مجھے بھوکا پیاسا گندے لاک اپ میں رکھا گیا۔ پھر کچھ تیس مار خانوں نے مجھ سے زمرد جہاں کے بارے میں پوچھا آپ جانتے ہیں کہ مجھے ان کے بارے میں کچھ معلوم نہیں لیکن اس آفیسر نے مجھ سے بدکلامی کر کے چیلنج دیا جسے میں نے قبول کرلیا"۔

"اوہ......تم نے میرا حوالہ کیوں نہ دیا؟"

"کس سلسلے میں؟"

"تم یہ تو کہتے کہ مجھے بلا لیا جائے"۔

"کیا اس ملک میں آپ سے رابطے کے بغیر قیام ممکن نہیں ہوتا"۔

میں نے طنزیہ سوال کیا اور حیدر سماوی شرمندہ ہو گیا۔ ایک لمحہ خاموش رہنے کے بعد اس نے کہا۔

"تم فکر مند نہ ہو بس چند گھنٹوں کے بعد تمہیں رہا کرالوں گا"۔

"میں خود رہا ہو سکتا ہوں زمرد جہاں کی مدد سے نہیں اپنے طور پر۔ بہت سے بہادروں نے مل کر مجھے قابو کیا تھا اور میں نے ان پر ہاتھ نہیں اٹھایا تھا اگر میں جنگ کرتا تو شاید مجھے قابو میں کرنا ان کے بس میں نہ ہوتا لیکن اب......"

"نہیں خدا کے لیے ایسا نہ کرنا، صرف چند گھنٹے میرا انتظار کرلو بلکہ مجھ سے وعدہ کرو کہ میرے لیے اتنا صبر کرلو۔ دیکھو! اب تک میرے اور تمہارے درمیان عزت و احترام کا رشتہ رہا ہے"۔ میں مسکرا کر خاموش ہو گیا۔

اس کے بعد اسپتال کے عملے کا میرے ساتھ رویہ بہت اچھا رہا تھا۔ رات کو نو بجے نجم رندی کو اس کمرے سے کہیں اور منتقل کر دیا گیا۔ ساڑھے دس بجے ایک نرس نے مجھے موبائل فون لا کر دیا اور بولی۔ "مسٹر حیدر سماوی گفتگو کرنا چاہتے ہیں"۔ میں نے فون اس کے ہاتھ سے لے لیا حیدر سماوی کی آواز سنائی دی۔

"احمد اسدی"۔

"ہاں سن رہا ہوں"۔

"بیٹے یہ رات اسپتال میں گزار لو"۔

"اس کے بعد؟"

"گھڑی کا وقت دیکھ لو۔ صبح نو بجے میں تمہارے پاس پہنچ جاؤں گا۔ ذمہ دار ارکان تم سے معافی مانگیں گے تمہاری پوزیشن صاف ہوگی۔ خود وزیر داخلہ تمہاری گرفتاری سے ناخوش تھا"۔

"ٹھیک ہے"۔ میں نے جواب دیا اور رسمی گفتگو کے بعد سلسلہ منقطع کر کے موبائل فون نرس کے حوالے کر دیا۔

پھر رات گئے تک میں مختلف کیفیات کا شکار رہا۔ میری زندگی کا انداز بدل چکا تھا۔ بہت سی حقیقتیں منکشف ہونے کے بعد میری ذہنی کیفیت میں تبدیلیاں رُونما ہوتی جارہی تھیں یہ بات عیاں ہو گئی تھی کہ دنیا میرے مزاج سے مختلف ہے صرف اپنی سوچ سے سب کچھ نہیں ہوتا۔ دنیا کے ساتھ مصلحتوں کا سہارا لے کر جیا جاسکتا ہے مجھے منزل کی تلاش تھی لیکن راستے اس دنیا سے گزرتے ہیں ان سوچوں نے بڑا سکون دیا تھا اور اطمینان بخش نیند آئی تھی۔

ٹھیک نو بجے حیدر سماوی ایک مجسٹریٹ اور چند آفیسروں کے ساتھ داخل ہوئے۔ مجسٹریٹ نے مجھ سے کہا۔

"آپ بچپن سے یورپ میں مقیم ہیں؟"

"جی......"

"کیا یہ سچ ہے کہ زمرد جہاں سے آپ کے تعلقات بہتر نہیں تھے؟"

"شٹ اپ......" میری غراہٹ ابھری۔

"کیا ان سوالات کی گنجائش ہے رضوی؟" حیدر ساوی نے ناخوشگوار لہجے میں کہا۔ مجسٹریٹ میرے ڈانٹنے پر ہی ششدر رہ گیا تھا وہ کچھ نہ بولا تو حیدر ساوی نے ایک کاغذ میری طرف کرتے ہوئے کہا۔

"براہِ کرم دستخط کردو۔ چاہو تو کاغذ پڑھ سکتے ہو"۔ میں نے خاموشی سے دستخط کردیئے۔

پھر میں حیدر ساوی کے ساتھ ایک کار میں چل پڑا۔ حیدر ساوی نے کہا تمہارا سامان میں نے اپنے گھر میں منگوالیا ہے۔

"کیوں؟"

"کچھ عرصہ میرے مہمان رہو گے"۔

"مہمان یا قیدی؟"

"میرے بارے میں یہ خیال رکھتے ہو؟"

"پھر میرا سامان آپ کے گھر کیسے پہنچ گیا میری مرضی کے بغیر؟" میں نے کہا۔

"وہ میں نے پولیس ہیڈ آفس سے حاصل کیا ہے اور اس وقت تک تمہاری خدمت کروں گا جب تک مکمل صحت یاب نہیں ہو جاؤ گے۔ یہ ایک بزرگانہ عمل ہے اور اسے غلط نہ سمجھو"۔

میں خاموش ہوگیا اور حیدر ساوی کی رہائش گاہ میں داخل ہوگیا۔

صدر گیٹ میں کئی افراد نے استقبال کیا جن میں وہ لڑکی نوشین بھی تھی۔ اس نے مسکراتے ہوئے مجھے دیکھا تھا پھر وہ لوگ مجھے ڈرائنگ روم میں لے گئے۔

میں لڑکی کو دیکھ کر ہی حیران تھا کہ میں نے ڈرائنگ روم میں نجم غرقندی کو بھی دیکھا ایک صوفے پر بیٹھا ہوا تھا مجھے دیکھ کر صوفے کے ہتھے کا سہارا لے کر اٹھتے ہوئے بولا۔

"اگر میرا ایک پاؤں بھی کھڑا ہونے میں مدد دے سکتا تو میں تمہارے استقبال کے لیے دروازے تک ضرور آتا۔ ان میں سے کوئی میرا بوجھ اٹھانے کو تیار نہیں ہے کیا مجھ سے

مصافحہ نہیں کرو گے؟" اس نے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔

"میرا دل تمہاری طرف سے صاف نہیں ہے مسٹر......ایسے عالم میں مصافحہ کرنا صرف منافقت ہو سکتی ہے"۔

"چلو کچھ دیر کے بعد سہی"۔ اس نے فراخ دلی سے مسکراتے ہوئے کہا حیدر ساوی نے کہا۔

"بیٹھو احمد اسدی، یہ بتاؤ اس لباس میں الجھن محسوس کر رہے ہو گے۔ غسل کر کے یہ لباس تبدیل کرنا چاہو گے؟"

"نہیں......" میں نے آہستہ سے کہا۔

"تو پھر میں پہلے تم سے ان لوگوں کا تعارف کرادوں۔ یہ میری اہلیہ بسمہ ہیں، یہ میری بیٹی نوشین اور یہ میرا بیٹا زنیر ہے یہ موصوف آفیسر نجم غرقندی میری بیٹی کا منگیتر ہے۔ اور پاؤں میں شدید تکلیف کے باوجود یہ خاص طور پر یہاں آیا ہے"۔

"شاید یہاں نہ آسکتا اگر میرے کانسٹیبل میرے احکامات کو نظر انداز کر کے اندر نہ گھس آتے کیونکہ مسٹر اسدی نے مجھے سر سے بلند کرلیا تھا اور زمین پر دے مارنے والے تھے"۔ نجم مسکراتے ہوئے کہا اور نوشین کے حلق سے ایک سسکی سی نکل گئی۔

حیدر ساوی نے مسکراتے ہوئے کہا، اس سے قبل کہ ہماری گفتگو شروع ہو۔ تم ان نامناسب الفاظ کے لیے احمد اسدی سے معافی مانگو جو تم نے ادا کئے تھے۔

"میں اپنے الفاظ واپس لیتے ہوئے ان کی ادائیگی کے لیے آپ سے معافی چاہتا ہوں احمد اسدی!"

"ٹھیک ہے میں معاف کرتا ہوں"۔ میں نے کہا۔

"شکریہ احمد اسدی؟" حیدر ساوی نے کہا پھر بولا۔ "تم لوگوں کو علم ہے کہ میں پچھلے دنوں کن حالات کا شکار رہا ہوں۔ جو کچھ میرے علم میں آچکا تھا اس سے حکومت کو آگاہ نہ کرنا وطن سے غداری تھی حالانکہ ساری زندگی خاتون زمرد جہاں کا وفادار رہا ہوں تنظیم کے ارکان میرے پیچھے پڑے ہوئے تھے وہ میرے قتل کے درپے تھے۔ احمد اسدی مجھ سے زمرد جہاں کا پتا دریافت کرنے آیا تھا وہ لوگ اسے اغوا کر کے لے گئے اس خیال سے شاید

یہ میرا ساتھی ہے۔ پھر انہیں اس کے ہاتھوں بدترین زک اٹھانی پڑی۔ نہ صرف زک بلکہ.....‘‘

حیدر سماوی نے پورے واقعات سنائے اور وہ لوگ بہت متاثر نظر آنے لگے۔ تب حیدر سماوی نے کہا۔

’’یہ یورپ سے دوبارہ اپنی والدہ کے ملک آیا۔ یہ فطری امر تھا کہ یہ خاتون زمرد جہاں کے بارے میں معلوم کرتا، لیکن اب ڈیئر نجم وہ کہانی شروع ہوتی ہے جس پر تمہارا غور کرنا لازمی ہے۔ اصل میں احمد اسدی۔ حکومت کو تمہارے بارے میں علم نہیں تھا۔ نجم کا کہنا ہے کہ افسران بالا کو ایک گمنام فون موصول ہوا۔ جس میں بتایا گیا کہ مفرور خاتون زمرد جہاں کا بیٹا احمد اسدی اس ہوٹل میں مقیم ہے اور اسے اپنی ماں کے بارے میں معلوم ہے۔ پولیس نے اس بنیاد پر تمہیں گرفتار کیا‘‘۔

’’گمنام فون؟‘‘ میں نے حیرت سے کہا۔

’’ہاں...... یہ فون مردانہ آواز میں تھا۔‘‘

’’کون ہوسکتا ہے......؟‘‘ میں تعجب سے بولا۔

’’غالباً ایک عمر رسیدہ شخص‘‘۔

’’کیا حاکف خدام؟‘‘ میرے منہ سے نکلا۔

’’یہ کون ہے؟‘‘ حیدر سماوی نے سوال کیا۔

’’یورپ میں میرا استاد!‘‘

’’کیا وہ یورپ سے تمہارے ساتھ آیا تھا؟‘‘

’’نہیں، لیکن یہاں آنا مشکل تو نہیں‘‘۔

’’اس سے کوئی اختلاف ہوگیا تھا؟‘‘

’’ہاں‘‘۔

’’اور اسے یہ حالات معلوم ہیں؟‘‘

’’ہاں......‘‘

’’تب پھر وہی ہوسکتا ہے لیکن اس کی اس کوشش کا مقصد تم ہی سمجھ سکتے ہو‘‘۔

’’حاکف خدام ایک خاص ریسرچ کے لیے مجھے اپنے ساتھ شامل رکھنا چاہتے تھے

لیکن ان کے افکار سے اختلاف کر کے میں نے انہیں چھوڑ دیا تھا‘‘۔

’’سو فیصد وہی ہوسکتا ہے‘‘۔ حیدر سماوی نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

’’مشکل کام نہیں ہے یورپ کے کسی شخص کی اس ملک میں آمد کے بارے میں معلوم کرنا مشکل نہ ہوگا۔ اس شخص نے ان معلومات کا فائدہ اٹھایا‘‘۔ نجم غرقندی نے کہا۔

’’ہوا یوں احمد اسدی کہ مجھے ان واقعات کے بارے میں کچھ نہیں معلوم تھا۔ ان دنوں میری مصروفیات اتفاق سے کچھ زیادہ تھیں نوشین چونکہ نجم سے منسوب ہے اس لیے اس کے زخمی ہونے کی خبر سن کر وہ اسپتال گئی وہاں اس نے تمہیں دیکھا اور تمہیں پہچان گئی‘‘۔

’’مجھے؟ میں‘‘ نے حیرت سے کہا۔

’’ہاں اس کی تفصیل تم اس سے سنو۔ احمد کو بتاؤ نوشین!‘‘ حیدر سماوی نے کہا۔

’’اس دن کے بعد مسٹر احمد! جب شاید آپ میرے ڈیڈی سے ملنے آئے تھے۔ میں اپنی ایک دوست کے ساتھ کار میں بیٹھ کر باہر جا رہی تھی۔ مجھے تو کوئی احساس نہیں ہوا لیکن میری دوست چونکہ پڑی۔ اس نے کہا کہ کیا میں آپ کو جانتی ہوں تو میں نے نفی میں گردن ہلا دی۔ تب اس نے بتایا کہ آپ احمد اسدی ہیں اور یورپ سے آئے ہیں‘‘۔

’’آپ کی دوست؟‘‘ میں نے ٹوکا۔

’’ہاں...... تخمینہ علایہ ہے اس کا نام‘‘۔ نوشین نے کہا اور میرے دماغ میں ایک چھناکا سا ہوا‘‘۔

حیدر سماوی نے کہا۔ ’’نوشین، نجم کے زخمی ہونے سے بہت پریشان تھی گھر آ کر اس نے پوری تفصیل بتاتے ہوئے تمہارا نام لیا تو میں ششدر رہ گیا۔ اس کے بعد میں نے تم سے ملاقات کی پھر براہ راست وزیر داخلہ کے پاس پہنچا۔ خدا کا شکر ہے کہ میری بات مان لی گئی ہے اور ویسے تم اس ملک کے محسن ہو‘‘۔

کسی کو میرے اندرونی احساسات کا اندازہ نہیں تھا میرے ذہن میں حاکف خدام کے خلاف زہر بھر دیا تھا لیکن ایک کردار اور سامنے آیا تھا۔ تخمینہ علایہ، کیا وہ اس عمل کی محرک ہو سکتی ہے؟ لیکن کیوں صرف اس لیے کہ میں نے اس کی بات نہیں مانی بہرحال میں نے لوگوں پر کچھ ظاہر نہ کیا۔

’’تاہم جو کچھ ہوا وہ افسوسناک ہے لیکن اب تمہاری حیثیت کو تسلیم کر لیا گیا ہے اور میں تمہیں عمل کا ہرجانہ دلانے پر غور کر رہا ہوں‘‘۔

’’آپ جانتے ہیں کہ مجھے ہرجانہ درکار نہیں ہے‘‘۔

’’کیا آپ خاتون زمرد جہاں کو تلاش کریں گے مسٹر احمد اسدی‘‘۔ نوشین نے پوچھا۔

’’نہیں‘‘۔

’’کیوں؟‘‘

’’میرا ان سے تعلق ٹوٹ چکا ہے‘‘۔

’’پھر بھی وہ آپ کی ماما ہیں‘‘۔ نوشین نے کہا، میں نے خاموشی اختیار کر لی۔ کچھ دیر کے بعد میں نے نوشین سے کہا۔

’’آپ اپنی دوست کو یہ دلچسپ واقعات ضرور سنائیں نوشین!‘‘

’’آپ دونوں کی ملاقات کیا یورپ میں ہوئی؟ وہ تو بیلجیم میں زیر تعلیم تھی جھکی، سنکی اور ضدی لڑکی۔ فلسفے کی تعلیم حاصل کر کے دیوانی ہو گئی ہے ورنہ پہلے خوش مزاج اور با اخلاق تھی‘‘۔ نوشین نے کہا۔ اس کے بعد میں نے اس موضوع پر کچھ بھی نہیں کہا البتہ مصلحتاً ہی میں نے یہ فیصلہ کر لیا کہ حیدر سماوی کے ہاں قیام میرے لیے موزوں ہے اور مجھے اس سے گریز نہیں کرنا چاہیے۔

حیدر سماوی نے بھی غالباً اس تصور کے ساتھ کہ میں نے بہرحال اس کے ساتھ بہتر سلوک کیا تھا اور اسے میری وجہ سے حکومت نے ایک اعلیٰ حیثیت سے نوازا تھا۔ پھر معاملہ یہ بھی تھا کہ نجم غرقندی نے میرے ساتھ بدسلوکی کی تھی اور وہ اس مسئلے کو ہموار کرنا چاہتا تھا۔ اس لیے میری بہترین آسائش کا بندوبست کیا گیا۔ پولیس نے میرے جسم اور سر پر جو زخم لگائے تھے انہوں نے بے شک مجھے عارضی طور پر مفلوج کر دیا تھا لیکن میرے ہاتھوں نجم غرقندی کو زیادہ نقصان پہنچا تھا۔ پھر مجھے میرے کمرے میں منتقل کر دیا گیا۔ میرا سامان یہاں موجود تھا اور کمرہ بھی بہت خوبصورت، تمام ضرورتوں سے آراستہ۔ غسل وغیرہ کر کے میں نے لباس تبدیل کیا تو حیدر سماوی ایک ڈاکٹر کے ساتھ اندر آ گیا۔ ڈاکٹر میڈیکل باکس اٹھائے ہوئے تھا۔

’’غسل کے بعد یہ ضروری ہے کہ تمہاری مرہم پٹی دوبارہ کی جائے میں نے ڈاکٹر صاحب کو زحمت دی ہے۔‘‘

میں نے اعتراض نہیں کیا۔ اب مجھے تنہائی درکار تھی اور اس تنہائی میں مجھے بہت سے فیصلے کرنے تھے۔ واقعات پر نظر دوڑانے سے بڑے سنسنی خیز انکشافات ہو رہے تھے میں نے چشم تصور سے حاکف خدام کی شخصیت کا جائزہ لیا اور مجھے فوراً ہی اندازہ ہوا کہ اس کی شخصیت کو میں نے غلط انداز میں محسوس کیا ہے وہ سیدھے سچے انسان تھے میرا ان کا ساتھ لمحوں کا نہیں برسوں کا تھا اور میں نے ان کی شخصیت میں کوئی سازشی کیفیت نہیں پائی تھی جو عمل انہیں کرنا ہوتا، وہ کھل کر کرتے تھے اور اگر کسی بات سے اختلاف ہو جاتا تو یا تو سمجھانے کی کوشش کرتے تھے یا ماننے کی ورنہ اس کے بعد خاموش ہو جاتے تھے۔ ذہن ایک لمحے کے لیے بھٹکا ضرور تھا لیکن اب یہ احساس ہو رہا تھا کہ میں نے ان کے بارے میں غلط سوچا ہے ایسی بات ہو نہیں سکتی۔ انہیں جو کچھ کرنا تھا کھل کر کر سکتے تھے اور پھر یہاں آ کر میرے ایسا کرنے کی کیا ضرورت تھی اور یہ کرنے سے انہیں کون سے فائدے حاصل ہو سکتے تھے غالباً ایک بھی نہیں۔ اس لئے حاکف خدام کو ذہن سے نکال دینا ضروری تھا پھر اور کون ہو سکتا ہے؟

کوئی بالکل ہی نامعلوم شخصیت یا پھر وہی لڑکی جس کے لیے تصور یہ ذہن میں آیا تھا میں نے تجینہ علایہ کی شخصیت کو ذہن میں پرکھا۔ نہ جانے کیوں یہ احساس پختگی اختیار کرتا چلا گیا کہ اسی نے یہ حرکت کی ہے حالانکہ اسے بھی زمرد جہاں وغیرہ کے بارے میں معلومات نہیں تھیں لیکن اس دن وہ نوشین کے ساتھ۔ اصولی طور پر اسے گاڑی واپس لا کر مجھ سے ملاقات کرنی چاہیے تھی کیونکہ میں ایئر پورٹ ہی سے اس سے رخصت ہو گیا تھا اور پھر میں نے اس سے ملاقات کرنے کی کوشش نہیں کی تھی ممکن ہے اسے اس نے اپنی توہین سمجھا ہو اور اس توہین کا انتقام لیا ہو۔

بہرحال آخری فیصلہ اس بارے میں بھی نہیں کیا جا سکتا تھا لیکن دل یہ گواہی دے رہا تھا کہ تجینہ علایہ کو ٹٹول لینا زیادہ مناسب ہو سکتا ہے۔ ممکن ہے کہ اس پردہ زنگاری میں وہی نظر آئے۔ اگر ایسا نہ بھی ہو تب بھی اتنے تردد کی بات نہیں جو ہونا تھا وہ ہو گیا اب اس کے

بعد مجھے اپنے راستوں کی تلاش شروع کر دینی چاہیے حالانکہ اس کا ذریعہ بھی وہی کم بخت تہمینہ علایہ تھی۔

غرض یہ کہ میں نے خاموشی سے پورا دن گزارا اور شام کی چائے پر تمام لوگوں کے ہمراہ عمارت کے لان میں آ گیا۔ یہ میری خوش بختی تھی کہ تہمینہ علایہ اور مسٹر علایہ دونوں ہی مسٹر حیدر ساوی سے ملنے آ گئے تھے ان کی خوبصورت کار دیکھ کر نوشین نے فوراً کہا۔

''اوہو...... تہمینہ اور چچا شمون علایہ''۔ وہ دونوں گاڑی سے نیچے اتر آئے۔ پتا نہیں انہوں نے مجھے دیکھا تھا یا نہیں لیکن میرے ذہن میں ایک عجیب سی نفرت ابھر آئی تھی ان لوگوں کا استقبال کیا گیا اور پھر تہمینہ علایہ مجھے دیکھ کر بری طرح چونکی۔

''ارے...... ارے...... آپ...... آپ؟'' اس نے حیرت سے کہا اور میں سرد نگاہوں سے اسے دیکھتا رہا پھر تہمینہ نوشین کی جانب متوجہ ہو کر بولی۔

''نوشین یہ وہ صاحب ہیں نا جنہیں اس دن میں نے تمہاری کوٹھی میں داخل ہوتے ہوئے دیکھا تھا؟''

''ہاں اور ان کے بارے میں پوچھا بھی تھا؟''

''کہو...... حیدر ساوی تمہارا کیا حال ہے؟ خیریت ہے حیدر ساوی شمون علایہ تمہاری ملاقاتیں تو ہوتی ہی نہیں ہیں۔

''تم بھی مصروف انسان اور میں بھی''۔ حیدر ساوی نے شمون علایہ سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا اور پھر شمون میری طرف دیکھ کر بولا۔

''یہ کیا تم نے زخمی اکٹھے کر رکھے ہیں۔ نجم کو تو میں پہچانتا ہوں لیکن یہ صاحب کون ہیں؟''

''ان کا نام احمد اسدی ہے''۔

''میں انہیں پہچانتی ہوں ڈیڈی!'' تہمینہ نے کہا۔

''اچھا اچھا تم لوگوں کے تعلقات ہوں گے''۔

''جی ڈیڈی...... تہمیم میں ان سے ملاقات ہوئی تھی''۔

''گڈ، ہاں بھئی حیدر ساوی! وہ پچھلے دنوں تمہیں ایک کیس دلوایا تھا ہم نے کیا ہوا اسے پھانسی ہو گئی یا بچا لیا گیا''۔

شمون علایہ نے بے پروائی سے موضوع کو ٹالتے ہوئے کہا اور حیدر ساوی اس سے گفتگو کرنے لگا تہمینہ علایہ میرے سامنے بیٹھ گئی اور مسکراتے ہوئے بولی۔

''بڑی اچھی کمپنی بنی ہے بھئی لیکن احمد اسدی نے آپ نے مجھے یہ نہیں بتایا کہ انکل حیدر ساوی سے آپ کے تعلقات ہیں''۔

''میں نے تو آپ کو بہت سی باتیں نہیں بتائیں تہمینہ! اس میں آپ کو کیوں تعجب ہو رہا ہے؟'' تہمینہ کسی قدر خفیف ہو گئی پھر بولی۔

''نہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں نوشین میں تمہیں بتا چکی ہوں کہ چند سرسری ملاقاتیں رہی ہیں اور بعد میں ہم نے یہاں تک کا سفر ساتھ کیا''۔

''مگر میں تو کسی بات کے لیے نہیں کہہ رہی''۔ نوشین نے کہا۔

''بس تمہارے چہرے پر کچھ ایسے تاثرات ابھر رہے تھے جیسے ہماری شناسائی سے تم کچھ کہانیاں تلاش کر رہی ہو''۔

''یہ تو انسان کے دل کا چور ہوتا ہے ورنہ سچی بات یہ ہے کہ میں نے کسی کہانی پر غور نہیں کیا''۔

''چلو چھوڑو۔ تمہیں پتا ہے یوتھ فیسٹیول کے دن آ رہے ہیں اور ہم لوگوں کو پہلے کی مانند اس میں حصہ لینا ہے''۔ نوشین ہنس پڑی اور بولی۔

''یوں لگتا ہے تہمینہ جیسے تم کسی انتشار کا شکار ہو۔ یوتھ فیسٹیول میں حصہ لینے کے دن تھے اور پھر ایک طویل عرصہ ہو گیا ہے۔ تمہیں ملک سے باہر گئے ہوئے یہ یوتھ فیسٹول کیسے یاد آ گیا؟''

''وطن واپس آنے کے بعد بہت سی یادیں تازہ ہو جاتی ہیں اور دل چاہتا ہے کہ ہم دوبارہ انہی یادوں میں کھو جائیں''۔

''تمہاری باتیں اس وقت بالکل مختلف لگ رہی ہیں مجھے۔ کہاں تم ایک پاگل سی فلسفی تھی اور اب اچانک تمہیں ماضی یاد آ رہا ہے نیز فیسٹیول میں حصہ لے لینا کوئی ایسی بات نہیں جسے ہم موضوع بنائیں''۔ نوشین نے کہا۔

میں اس گفتگو میں دلچسپی لے رہا تھا مجھے یہ اندازہ ہو رہا تھا کہ تہمینہ علایہ کسی قدر ذہنی انتشار کا شکار ہو گئی ہے اور نہ جانے کیوں مجھے یوں بھی لگا جیسے مسٹر علایہ بھی ذہنی طور پر کچھ

معطل ہوں اور کسی سوچ میں ڈوبے ہوئے ہوں۔ حالانکہ وہ حیدر سماوی سے گفتگو کر رہے تھے لیکن ان کے انداز سے یہ پتہ چلتا تھا کہ وہ کچھ منتشر ہیں بہرطور میں نے دل میں یہ فیصلہ کرلیا کہ کم ازکم اس سلسلے میں اپنا ذہن صاف کرنے کی کوشش کروں گا اور اگر واقعی تخینہ علایہ میرے خلاف کسی سازش میں شریک ہوئی ہے تو اس سے انتقام لینا میرا حق ہے کیونکہ میں نے اس سازش کا شکار ہو کر حاکف خدام کے خلاف دل میں ایک سقم پیدا کیا تھا۔

پھر وہ لوگ رات تک ڈنر میں شریک رہے۔ تخینہ علایہ نے کئی بار مجھے مخاطب کیا لیکن میں نے اس پر توجہ نہیں دی البتہ رخصت سے کچھ پہلے کچھ لمحات ایسے میسر آگئے جب اس کے ساتھ تنہا رہ گیا تو وہ کہنے لگی۔

''دوستیاں ختم کر دی جاتی ہیں تو دشمنی میں تبدیل نہیں کر دی جاتیں۔ اگر میرا کوئی قصور ہوتا تو کم ازکم یہ سوچ لیتی کہ غلطی کر کے ایک دوست کو کھو بیٹھی ہوں کم از کم کچھ نہیں تو میرا قصور بتانے کے لیے ہی مجھ سے ملاقات کرو''۔

میں نے گہری سانس لے کر کہا۔ ''نہیں تخینہ علایہ، تمہارا کوئی قصور تو نہیں۔ مجھے تو بس یہ افسوس ہے کہ میں تمہارے کسی کام کا نہیں ثابت ہو سکا''۔

''جہنم میں جھونکو اس کام کو۔ وہ میرا کوئی ذاتی مسئلہ نہیں تھا کیا کل کہیں مل سکتے ہو؟''

''ہاں اگر تم چاہو تو''۔

''تو پھر ایک بہت ہی خوبصورت ہوٹل ہے میں تمہیں اس کا پتا بتائے دیتی ہوں۔ میرے ساتھ لنچ کرو گے اور میں انکار نہیں سنوں گی۔ تمہاری شخصیت کے بارے میں اتنا اندازہ تو میں نے ضرور لگا لیا ہے کہ تمہاری ضد، تمہارا غصہ اپنی جگہ لیکن وعدہ کرتے ہو تو اسے نباہتے ہو۔ بولو کیا میں اپنی سوچ میں حق بجانب ہوں؟''

''میں پہنچ جاؤں گا''۔ میں نے جواب دیا۔

''شکریہ......'' تخینہ علایہ نے کہا اور پھر میں نے خود بھی ان لوگوں کو رخصت کیا تھا۔

ڈنر کے بعد نجم غرقندی بھی ہم سے رخصت ہو کر چلا گیا اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''یہ ایک دن کی چھٹی مجھے دوست نے دلوادی تھی بڑا ہی خوبصورت دن گزارا یہاں۔ تور خی کیفیت میں گزرا لیکن بہرحال دلکش تھا آفس جانا ضروری ہوگا''۔

''مگر تم کھڑے تو ہو نہیں سکتے''۔

''اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا''۔

''کیا مطلب؟''

''جانا تو پڑے گا۔ اعلیٰ افسران یہ کیفیت دیکھ کر چھٹی دے دیں تو ان کی مہربانی ہوگی رنہ میز پر بیٹھ کر ڈیوٹی انجام دی جاسکتی ہے''۔

ہم اسے باہر تک چھوڑنے کے لیے آئے تو نجم غرقندی نے اشارے سے مجھے اپنی ہانب بلایا اور بولا۔

''احمد ایک بات کہنا چاہتا ہوں''۔ میں چونک کر اسے دیکھنے گا تو وہ آہستہ سے بولا۔ ''وہ ٹیلی فون جو گمنام آواز میں آیا تھا میرے خیال میں اب گمنام نہیں رہا۔ وہ آواز شمون ملایہ کی تھی لیکن میرے عزیز تمہاری شخصیت سے مجھے اندازہ ہوگیا ہے کہ نہ تو تم جلد بازی کرو گے اور نہ ہی کوئی ایسا قدم اٹھاؤ گے جس سے قانون الجھن میں پڑ جائے۔ میں نے یہ ات تم سے انتہائی خاموشی سے اس لیے کہی ہے کہ یہ فیصلہ تمہیں کرنا ہے کہ باقی لوگوں کو ں بارے میں بتاؤ گے یا نہیں؟''

میں ساکت رہ گیا۔ بہرحال اتنا اندازہ مجھے تھا کہ نجم غرقندی ایک زیرک آفیسر ہے اور ں نے یہ الفاظ پورے غور و خوض کے بعد کہے ہوں گے۔ پھر وہ چلا گیا اور میں ان لوگوں کے ساتھ کمرے میں واپس آگیا۔ حیدر سماوی سے تھوڑی دیر گفتگو رہی۔ میں نے اس سے کہا میں بالکل ٹھیک ہوں اور اب کوئی ا بات نہیں جو باعثِ پریشانی ہو۔ اس لیے میرا یہاں ہنا ضروری نہیں۔ اس بات پر حیدر سماوی کی نے کہا۔

''دیکھو تمہیں جہاں بھی جانا ہوگا ظاہر ہے تم زندگی بھر میرے ساتھ نہیں رہ سکتے لیکن ری گزارش ہے کہ تھوڑا سا وقت میرے ساتھ گزار لو۔ تم گھومو پھرو، گاڑی موجود ہے اور ب فضا تمہارے لیے سازگار ہے ہم تمہارے راستے میں بھی مزاحم نہیں ہوں گے لیکن بس ڑا سا وقت میرے ساتھ گزار لو۔ یہ میری خواہش ہے''۔

میں گہری سانس لے کر خاموش ہو گیا تھا۔

بستر کسی بھی منصوبہ بندی کے لیے مناسب جگہ ہوتی ہے اپنے اس خوبصورت کمرے ں لیٹ کر میں نے حالات پر غور کیا۔ ممکن ہے تخینہ علایہ اور شمون علایہ کا آنا میرے بارے ں معلومات حاصل کرنے کے لیے ہو۔ اب بہت زیادہ کرید تو میں نہیں کر سکتا تھا اور اصولی

طور پر مجھے کرنی بھی نہیں چاہیے تھی چونکہ حیدر ساوی اور شمون علایہ کے تعلقات کی نوعیت بھی کچھ ایسی ہی تھی اور اس کا ایک ثبوت یہ بھی تھا کہ اس دن تجینہ علایہ نوشین کے ساتھ تھی جس دن میں یہاں آیا تھا۔

حالات خود بخود میری سمجھ آتے جا رہے تھے۔ تجینہ علایہ نے مجھے دیکھا نوشین سے تھوڑی بہت معلومات حاصل کیں اور اس کے بعد شمون علایہ سے اس سلسلے میں کہا اور شمون علایہ نے پولیس کو میرے بارے میں فون کر دیا لیکن سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ کیوں؟

دوسرا سوال یہ تھا کہ شمون علایہ کو میرے بارے میں تفصیلات کہاں سے حاصل ہوئیں لیکن ان تمام سوالات کے جوابات اس بستر پر لیٹ کر نہیں مل سکتے تھے اور ان دنوں میں نے جس قدر اپنے آپ کو تبدیل کرنے کا فیصلہ کیا تھا اس کے تحت مجھے یہ فیصلہ بھی کرنا تھا کہ ان لوگوں سے معلومات کس طرح حاصل کی جائیں۔

رات آدھی سے زیادہ گزر گئی اور میں اپنے ذہن میں منصوبے بناتا رہا۔ پھر ایک منصوبے پر جم کر میں نے اس کی نوک پلک سنواری اور غالباً اس عالم میں مجھے نیند آ گئی۔

دوسری صبح بڑی خوشگوار کیفیت میں اٹھا۔ ان لوگوں کے ساتھ ناشتا کیا، حیدر ساوی نے کہا۔

''تمہاری ذمہ داریاں میں نوشین کو سونپ رہا ہوں۔ ویسے گاڑی کے بارے میں، میں نے تم سے کہہ دیا تھا میرے پاس دو گاڑیاں ہیں اور پھر میرا ڈرائیور مجھے کورٹ چھوڑ کر واپس آ جاتا ہے۔ دوسری گاڑی کے لیے بھی ڈرائیور موجود ہے چاہو تو نوشین کو اپنے ساتھ لے سکتے ہو؟''

''میرے لیے آپ بالکل فکر مند نہ ہوں بہرحال میں وعدہ کرتا ہوں کہ کچھ وقت میں آپ کے ساتھ ضرور گزاروں گا''۔ میں نے کہا۔

''ٹھیک ہے''۔

حیدر ساوی کے جانے کے بعد نوشین نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''جناب احمد اسدی صاحب! آپ نے میرے منگیتر کی دونوں ٹانگیں توڑ دی ہیں اس وقت تو واقعی میرے دل میں آپ سے ایک دشمنی پیدا ہو گئی تھی لیکن اب تمام صورتِ حال کا اندازہ لگانے کے بعد مجھے احساس ہوا ہے کہ ہم آپ کے مجرم ہیں چنانچہ اس احساسِ جرم کو کم کرنے کے لیے میں

آپ کو آپ کے ملک کی سیر کروانا چاہتی ہوں''۔

''میرا ملک؟''

''ہاں...... بہرحال آپ کا تعلق یہاں سے ہے''۔

''نہیں نوشین! اگر میں اپنا تعلق یہاں سے قائم رکھتا تو...... خیر جانے دیجئے۔ یہ موضوع مجھے ذہنی طور پر منتشر کرتا ہے۔ میں اپنے ذہنی انتشار کو ختم کرنے کے لیے آپ کو کسی انتشار کا شکار نہیں کرنا چاہتا''۔ میں نے مسکرا کر کہا۔

''مجھے؟''

''جی ہاں......''

''بھلا میں کیسے کسی انتشار کا شکار ہو سکتی ہوں''۔ نوشین نے مسکرا کر کہا۔

''آپ کا منگیتر بے شک فراخدل ہو گا لیکن یہ بھی نہیں چاہے گا کہ اس کے بغیر میں اور آپ پورے ملک کی سیر کرتے پھریں''۔

''ارے باپ رے۔ واقعی میں نے اس بارے میں تو بالکل نہیں سوچا تھا۔ کس مزاج کا انسان ہے نجم غرقندی؟''

''آپ یقین کریں بہت ہی اچھی طبیعت کا انسان ہے بس ذرا سخت گیر پولیس آفیسر ہے اور مجرموں کے ساتھ برا سلوک کر ڈالتا ہے لیکن کسی بے گناہ کے ساتھ برے سلوک کا نتیجہ اسے بھگتنا پڑا ہے۔ ویسے آپ نے اسے ختم کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی مستقبل میرا تباہ ہوتا''۔

''میں سوری نہیں کہوں گا۔ آپ مجھ سے کسی ایسی بات کی توقع نہ رکھیں اور میں ایک مشورہ دوں آپ کو؟''

''جی فرمائیے''۔

''کتنی بری بات ہے کہ وہ تکلیف کا شکار ہے اور آپ اس سے اتنا فاصلہ اختیار کیے ہوئے ہیں''۔

''ہے تو سہی مگر نہ جانے وہ کہاں ہو گا''۔

''کمال ہے...... آپ اسے تلاش نہیں کر سکتیں؟''

''دل تو چاہتا ہے...... مگر ڈیڈی کہہ گئے ہیں کہ آپ کا خیال رکھوں''۔

"تب میرا آپ سے وعدہ ہے کہ آپ جایئے۔ میں حیدر سماوی کو کچھ نہیں بتاؤں گا"۔
وہ ہنسنے لگی تھی پھر اس نے کہا۔

"آپ کا بے حد شکریہ۔ گاڑی آپ لے جایئے"۔

"نہیں کہیں خاص جانا بھی نہیں ویسے کل کا دن میرے علم میں ہے تجینہ علایہ نے میرے بارے میں کوئی گفتگو تو نہیں کی؟"

"نہیں...... بلکہ میرے چبھتے ہوئے جملوں پر وہ محتاط ہو گئی تھی"۔

"ہاں...... میرا خیال ہے آپ نے خاصی گفتگو کی تھی اس سے"۔

"اگر ان لوگوں نے آپ کو نقصان پہنچایا ہے اور ان کی وجہ سے یہ ہوا ہے تو آپ یقین کیجئے کہ میرے دل میں ان کا ذرا بھی احترام نہیں رہا آخر اسے آپ سے کیا دشمنی ہو سکتی تھی"۔

"میں نہیں جانتا"۔

نوشین چلی گئی اور مجھے احساس ہوا کہ میں نے اپنی فطرت کے برعکس اس سے کچھ ضرورت سے زیادہ گفتگو کر لی ہے یہ غالباً اسی سبق کا نتیجہ تھا جو میں نے اپنے آپ کو دیا تھا زمانے سے زمانے کے رنگ میں ملنے کا سبق اور میرا خیال ہے کہ میں اپنی کوششوں میں کامیابی حاصل کرتا جا رہا تھا۔

بہرحال رات کی منصوبہ بندی کو میں نے ذہن میں دہرایا۔ گاڑی کی چابی میرے پاس موجود تھی۔ پتا نہیں نوشین نجم غرقندی کی خیریت لینے گئی تھی یا نہیں۔ اب کسی کے معاملات میں اتنا زیادہ ملوث بھی نہیں ہو سکتا تھا میں البتہ میں مقررہ وقت پر نکل آیا اور گاڑی اسٹارٹ کر کے چل پڑا۔ پیشانی کے زخم پر ٹی لگا دیا گیا تھا اور پٹی کھول دی گئی تھی او اپنے اندازے کے مطابق اس وقت خاصا بہتر نظر آ رہا تھا۔

دو، تین جگہ رک کر میں نے اس ریستوران کے بارے میں معلومات حاصل کی اور مقررہ وقت سے کوئی چار، پانچ منٹ کے بعد میں ریستوران پہنچا تو میں نے تجینہ علایہ کو ریستوران کے دروازے پر اپنا منتظر پایا۔ وہ ایک گوشے میں کھڑی تھی۔ میں کار پارک کر کے نیچے اترا تو وہ میرے قریب آ گئی۔

"اصولی طور پر مجھے تم سے شکایت ہونی چاہیے کیونکہ بہرحال......"

"سوری تجینہ...... ریستوان تلاش کرنے میں مجھے دقت پیش آئی ہے حالانکہ یہ میرا

وطن ہے لیکن شاید ہی کوئی مجھ جیسا ہو جو اپنے وطن سے اس قدر ناواقف ہو"۔

ریستوان بے حد خوبصورت تھا اور تجینہ نے ایک میز یہاں مخصوص کرا لی تھی ویسے بھی ریستوران میں زیادہ رش نہیں تھا بہت پُرسکون مدہم، مدہم، ٹھنڈی ٹھنڈی جگہ تھی اور ہماری نشست بھی ایک گوشے میں تھی جس کے اطراف ساری نشستیں خالی تھیں۔

میں نے پسندیدگی سے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ "یہ ایک حسین جگہ ہے۔ شکریہ......"

تجینہ نے میرے لیے مؤدب انداز میں کرسی گھسیٹی اور میرے بیٹھنے کے بعد خود بھی بیٹھ گئی۔ ویٹر نے مینو لا کر دیا تو تجینہ نے کلائی میں بندھی گھڑی میں وقت دیکھتے ہوئے کہا۔

"آرڈر آدھے گھنٹے کے بعد لینا۔ تمہیں بھوک تو نہیں لگ رہی احمد؟"

"آدھے گھنٹے کے بعد......؟" میں نے مسکرا کر کہا اور وہ بھی مسکرا دی پھر سنجیدہ ہو گئی اور کہنے لگی۔

"تم سے شکایت کروں گی تو تم برا مان جاؤ گے۔ بہت سخت مزاج انسان ہو۔ دیکھو دوستوں کے کچھ حق ہوتے ہیں اور بہرحال تم کم از کم یہ نہیں کہہ سکتے کہ میں تمہاری دشمن ہوں"۔

"نہیں بالکل نہیں...... میں یہ بالکل نہیں کہہ سکتا"۔ میں نے خفیف سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

"اصل میں تجینہ علایہ! بہت سی باتیں ایسی ہوتی ہیں جنہیں انسان زندگی بھر اپنے دل میں رکھنا چاہتا ہے اور کبھی کبھی جذبات ایسی شکل اختیار کر جاتے ہیں کہ انسان ان کا اظہار بھی نہیں کر سکتا۔ لیکن ان کا تاثر بہت شدید ہوتا ہے"۔

"ہمیں بہت کم ایسی محبتیں حاصل ہوتی ہیں جن پر ہم مکمل طور پر بھروسہ کر لیں لیکن کبھی کبھی کانٹوں میں بھی پھول مل جاتے ہیں اور ہمارے بہت سے دکھوں کا مداوا ہو جاتا ہے احمد! انسان کو زندگی میں تلاش اور جستجو ضرور کرنی چاہیے۔ کیا عجب کہ ہمیں کچھ ایسے لوگ مل جائیں جو ہمارے ہر غم کو اپنے سینے میں محفوظ کر لیں دیکھو فطرت انسانی یہی ہے کہ ہر شخص کو محبت کی ضرورت ہے اور ہر شخص محبت کی تلاش میں سرگرداں رہتا ہے...... ہو سکتا ہے میں تمہاری اچھی دوست ثابت ہوتی۔ زندگی میں کسی نہ کسی کے لیے تو کچھ نہ کچھ ہوتا ہی ہے اس میں کوئی گہرا انتخاب تو ضروری نہیں ہے"۔

''میں تمہیں اگر اہمیت نہ دیتا تو تمہارے کہنے پر سفر کر کے دوبارہ اس ملک میں نہ آجاتا۔ میں نے وہ سب کچھ منظور کرلیا کیونکہ بہرحال تمہاری شخصیت مجھے ناپسند نہیں تھی۔ لیکن جو نازک مسئلہ تم نے چھیڑا اس کا میری زندگی سے ایک ایسا گہرا تعلق ہے کہ اگر تم اس کی حقیقتیں جان لو تو میری جانب سے بالکل مطمئن ہو جاؤ''۔

''میں انہی حقیقتوں کی بات کر رہی ہوں کیا اب بھی اس قابل نہیں ہوں کہ تم مجھے اپنے بارے میں کچھ بتا سکو؟''

''تجینہ! میرا تعلق ایک اسلامی ملک سے ہے اس شکل میں کہ میرے والد وہیں رہتے تھے اور میرا پورا خاندان وہیں آباد ہے لیکن میرے والد نے بچپن ہی میں مجھے یورپ بھجوادیا تھا اور وہاں غیروں کے درمیان میری پرورش ہوئی۔ میرے والد بھی میرے لیے غیروں ہی کی مانند تھے ایک بار بھی انہوں نے مجھے محبت کا وہ لمحہ نہیں دیا جو والدین سے منسوب ہوتا ہے، سو رشتے میری نگاہ میں بے اثر ہو گئے اور وہ غیر جو تھوڑے سے مجھ سے قریب تھے سب کچھ محسوس ہوئے لیکن میں نے وہ محبت ان میں بھی تلاش کی جس کا تعلق رشتوں سے ہوتا ہے۔

بچپن میں مجھے بتایا گیا کہ میری ماں مر چکی ہے اور میں نے اس حقیقت کو تسلیم کر لیا تھا حالانکہ مجھے ماں سے شکوہ تھا کہ وہ مجھ سے پوچھے بغیر کیوں مر گئی؟ مجھے وہ مامتا اور شفقت کہاں سے حاصل ہوگی جو میرا حق ہے؟ اس طرح بچپن ہی میں مجھ سے میرا حق چھین لیا گیا اور جس شخص سے اس کا سب کچھ چھین لیا جاتا ہے اس کی ذہنی نشوونما کیسے ہو سکتی ہے تم ایک نفسیات دان ہو اندازہ لگا سکتی ہو۔ پوری دنیا سے مجھے بے زاری کا احساس ہوتا ہے بہت کم لوگ میری قربت حاصل کر سکے...... اس میں میری بھی کوتاہی تھی لیکن میں اسے اپنی کوتاہی نہیں اپنا مزاج سمجھتا ہوں تم سے میرا واسطہ پڑا۔ اچھی لگیں لیکن جو کام تم نے میرے سپرد کیا وہ میں کسی طور پر نہیں کر سکتا اس کی ایک وجہ ہے''۔

''کیا......؟'' تجینہ نے سنجیدگی سے پوچھا۔

''میں یورپ میں تھا وہاں تعلیم حاصل کر رہا تھا والد صاحب کبھی کبھار میرے پاس آتے تھے لیکن اس طرح کہ غیروں سے بھی یہ توقع نہیں رکھتا تھا زندگی میں کبھی انہوں نے مجھ سے شفقت کا اظہار نہیں کیا۔ ہاں...... میری کفالت بڑی خوش اسلوبی سے کی اور کسی بھی مرحلے پر مجھے مالی طور پر تنہا نہیں چھوڑا لیکن تجینہ! پیسہ سب کچھ ہی نہیں ہوتا انسان کو کچھ اور بھی درکار

ہوتا ہے...... وہ محبت بھری نگاہ و شفقت بھرا لمس......

بہرحال وہ مر گئے...... مجھے ان کے وکیل نے ان کے آبائی ملک سے اطلاع دی کہ مجھے وہاں آنا ہے اپنی جائیداد اور کاروبار سنبھالنے کے لئے، مجھے جانا پڑا۔ وہاں کچھ ایسے بوالہوسوں سے ملاقات ہوئی جو اس خوف کا شکار تھے کہ وہ دولت جو وہ اپنے تصرف میں لا رہے ہیں۔ اب میرے ہاتھ میں آجائے گی۔ انہوں نے ریشہ دوانیاں شروع کر دیں اور میں نے اس تمام دولت کا تیاپانچہ کر دیا لیکن ایک ایسی خبر مجھے وہاں سے ملی جس نے میرے دل و دماغ میں طوفان برپا کر دیا۔ مجھے بتایا گیا کہ میری ماں زندہ ہے...... اس کا تعلق ایک ہمسایہ اسلامی ملک سے ہے اور وہ وہاں ایک مقتدر ہستی کی حیثیت سے جانی جاتی ہے۔ یہ یقین کرنے کے بعد کہ کہنے والے سچ کہہ رہے ہیں میں یہاں آیا۔ حیدر سماوی کو میری ماں کے بارے میں معلومات حاصل تھیں میں حیدر سماوی سے ملا تو کچھ ایسے حالات کا شکار ہوا جو میرے لیے ناقابل فہم تھے لیکن میں نے ان پر قابو پا لیا۔ پتہ چلا کہ میری ماں کا تعلق ایک تنظیم سے ہے جو امیر کی وفادار تھی اور موجودہ حکومت کے خلاف کام کر رہی تھی...... حیدر سماوی سے میں نے وعدہ کر لیا کہ میں اپنی ماں کو سمجھانے کی کوشش کروں گا اور اگر وہ نہ مانی تو وہ تمام ثبوت جو اس تنظیم کے اور خود میری ماں کے خلاف ہیں حیدر سماوی کے حوالے کر دوں گا اور پھر جب ماں سے ملاقات ہوئی تو مجھے اندازہ ہوا کہ وہ دوری جو میرے اور اس کے درمیان رہی ہے ایک سنگی دیوار بن چکی ہے اور اب اس دیوار کے پار دیکھنا ممکن نہیں ہے۔

مجھے شدید مایوسی ہوئی کیونکہ میں نے ساری زندگی اسے مُردہ سمجھا تھا اور اس کے لئے ترستا رہا تھا لیکن میری سخت گیر فطرت اس مجبوری کو قبول نہ کر سکی اور میں نے اپنی ماں کے خلاف تمام ثبوت حیدر سماوی کو دے دیئے اور خود یورپ چلا گیا۔ مجھے نہیں معلوم کہ میری غیر موجودگی میں یہاں کیا ہوا۔ تم نے ایک بار مجھے ماں کا وطن یاد دلایا تو میں یہاں آگیا اور یہاں آنے کے بعد مجھے علم ہوا کہ تنظیم کے افراد کو سزائے موت دے دی گئی ہے اور میری ماں فرار ہوگئی ہے...... لیکن میں ماں کے لیے نہیں آیا تھا بس میں تمہارے ساتھ آگیا۔ کیوں؟ میں یہ نہیں بتا سکتا۔ ہاں جو پیشکش تم نے مجھے کی تھی وہ ایک ماں کے لیے تھی اور ماں...... تم میری بتائی ہوئی کہانی سے میری ذہنی کیفیت کا اندازہ لگا سکتی ہو۔ میرے دل میں اب کوئی ماں نہیں چاہے وہ ایک ایسے بیٹے کی ماں ہو جو مر چکا ہے اور وہ اندھی عورت اس کا انتظار کر رہی

ہے۔نہیں...... یہ میرے لیے مشکل تھا اور مجھے شدت سے اس بات کا احساس ہوا کہ تم نے میرا انتخاب غلط کیا ہے بس میں اس جنون کے عالم میں ایئر پورٹ ہی سے تم سے جدا ہو گیا لیکن یہاں کچھ اور ہی دلچسپ حالات میرے منتظر تھے"۔

پھر میں نے مختصر ترین الفاظ میں تحجینہ علایہ کو بعد کی باتیں بتائیں تحجینہ علایہ کا چہرہ عجیب سا ہو گیا تھا وہ بہت دیر تک خاموش رہی۔آدھا گھنٹہ گزر گیا تھا ویٹر پھر آ گیا اور میں نے مینو طلب کر لیا۔پھر میں ۔۔نے ہی کچھ چیزیں منتخب کر کے اسے لانے کو کہا۔اس سلسلے میں نے تحجینہ سے مشورہ نہیں کیا تھا لیکن اس آرڈر پر میں نے اسے چونکتے ہوئے دیکھا تھا۔

بہت دیر خاموشی سے گزر گئی میں پُرسکون تھا اپنی یہ کہانی میں نے سچ سنائی تھی لیکن میرے اندر سچ نہیں تھا اور اس وقت تک سچ پیدا نہیں ہو سکتا تھا جب تک میرے شبے کی تصدیق یا تردید نہ ہو جائے۔

"تمہاری گلوخلاصی ہو گئی؟" آخر کار تحجینہ نے کہا۔

"ہاں ہو گئی۔حیدر سماوی نے احسان کیا ہے"۔

"مجھے یہ علم ہو جاتا تو تم ایک لمحے اندر نہ رہتے۔ڈیڈی کے اپنے تعلقات ہیں"۔

"یقیناً ہوں گے"۔

"اب کیا کرو گے؟"

"پتہ نہیں"۔

"کوئی خیال تو دل میں ہو گا"۔

"بے منزل ہوں تمام داستان سننے کے بعد تمہیں خود اندازہ ہو گیا ہو گا"۔

"کسی کے خلوص کو بھی قبول نہیں کیا تم نے؟"

"لوگ آئے، ساتھ دیا، چھوڑ گئے، یقین اٹھ گیا"۔

"سارے لوگ آ چکے؟"

"کیا مطلب؟"

"یہ طے کر چکے ہو کہ اب کوئی باقی نہیں رہا؟" تحجینہ کی آنکھوں میں آنسوؤں کی نمی آ گئی۔

"بہت تجربے کیے ہیں"۔

"اب کوئی تجربہ نہیں کرو گے؟" تحجینہ بولی اور اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔میں نے کوئی جواب نہیں دیا اس وقت ویٹر کھانے کا سامان لے آیا اور میں اسے دیکھنے لگا۔ویٹر نے کھانا لا کر میز پر سجانا شروع کر دیا۔تحجینہ نے سر جھکا لیا تا کہ ویٹر اس کے چہرے پر آنسوؤں کی لکیریں نہ دیکھ سکے پھر ویٹر اپنا کام ختم کر کے چلا گیا تو تحجینہ اپنی جگہ سے اٹھ گئی اس نے پلیٹیں میرے سامنے کیں اور ایک ڈش اٹھا کر سامنے کرتے ہوئے کہا۔"یہاں سے شروع کرنا پسند کرو گے؟"

"حیرت ہے"۔میں نے کہا۔

"کیوں؟"

"اس لیے کہ میں یہیں سے شروع کرنا چاہتا تھا"۔

"تب میری بدقسمتی ہر شک سے بالاتر ہے"۔

"اس سے تمہاری بدقسمتی کا کیا تعلق ہے؟" میں نے اپنی پسندیدہ چیز پلیٹ میں لیتے ہوئے کہا۔

"جب تم ویٹر کو آرڈر دے رہے تھے تو میں حیران ہو رہی تھی کیونکہ تم ڈشز کا انتخاب مجھ پر چھوڑتے تو میں بھی یہی چیزیں منگواتی"۔

"بدقسمتی کا عقدہ یہاں بھی نہیں کھلتا"۔

"پسند میں اتنی ہم آہنگی اور خیال میں اتنا فاصلہ؟" اس نے افسردگی سے کہا۔

"خیال کا فاصلہ؟"

"ہاں......کاش میں تمہارا آخری تجربہ ہوتی"۔اس نے آہستہ سے کہا اور میں کھانے میں مصروف ہو گیا۔اس نے خود بھی اپنے کھانا لے لیا تھا۔کھانے کے اختتام تک خاموشی رہی جو کافی طویل تھی پھر ہم کھانے سے فارغ ہو گئے۔

"آخری تجربہ......؟" میں نے کہا۔

"ہاں!" وہ آہستہ سے بولی۔

"تم میرے لیے کیا کرتیں"۔

"نفسیات پڑھی ہے محسوسات شدید ہو جاتے ہیں اور شدت تجربہ چاہتی ہے"۔

"بے شک"۔

"عورت کو پڑھا......جانتے ہو، عورت کا دوسرا نام کیا ہے؟"

''نہیں''۔

''ماما......''اس نے کہا اور میری تیوریاں چڑھ گئیں۔

''بکواس''۔

''ہرگز نہیں تم نے ایک فرسودہ مقولے پر تجربہ کیا ہے''۔

''مطلب!......''

''دیگ کا ایک چاول''۔

''تم کیا کہتی ہو؟''

''ایک ماں تجربے کی آخری منزل نہیں ہوتی''۔

''ہرانسان کی ایک ہی ماں ہوتی ہے''۔

''غلط......!''

''خوب......'' میں طنزیہ انداز میں مسکرایا۔

''ہاں تمہارا خیال غلط ہے''۔

''تم کیا کہنا چاہتی ہو؟''

کسی ایک چیز پر انحصار نہیں کیا جانا چاہیے۔وہ ماں ہوتی ہے۔یقین نہ آئے تو روحانہ سنجانی کو دیکھ لو۔وہ بیوی ہوتی ہے۔اپنے شوہر کی ہر امانت کی راز دار،بستر پر وہ اسے حیات کی ساری لذتیں دے دینا چاہتی ہے اس کے بعد وہ اس کو سارے جہاں کی خوشیاں دینے کی خواہش مند ہوتی ہے وہ بہن ہوتی ہے تو بھائی کے لیے ایک دعا ہوتی ہے، بیٹی ہوتی ہے تو باپ کی آبرو۔ ہر رنگ میں اس کی چاہت ماما کا روپ ہوتی ہے''۔

ان الفاظ سے تخینہ نے اپنے لیے موت منتخب کر لی تھی۔عورت کو ماما کا روپ دے کر میرے احساسات پر ایک اور تازیانہ لگایا تھا،ایک اور قتل کیا تھا اس نے،خود اپنا قتل، میں نے عہد کیا، تخینہ اگر تُو غلط عورت نکلی اور میرے شبہے کی تصدیق ہوگئی تو میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا ہلاک کر دوں گا تجھے۔

میرے احساسات سے بے نیاز وہ اپنے دلائل دے رہی تھی۔

''تمہارے دلائل پُر زور ہیں لیکن میرے زخموں کی تعداد اتنی ہے کہ کوئی جگہ خالی نہیں بچی''۔

''مرد ہو...... پوری زندگی پڑی ہے اور زخم کھاؤ ورنہ کیا کرو گے زندگی میں؟''

''بتاؤ کیا کروں؟'' میں نے کہا اور اس کے بدن میں لرزش پیدا ہوگئی عجیب سی کیفیت ہوگئی تھی اس کی ایک بار پھر اس کی آنکھوں میں آنسو چھلک آئے بمشکل تمام اس نے کہا۔

''مجھے......مجھے یہ مقام دو گے؟''

''کسی اور کی تلاش کروں آخری تجربے کے لیے تم کہہ رہی ہو''۔

''میں اس قابل ہوں''۔

''تخینہ نا قابل فہم باتیں کر رہی ہو۔''

''لیکن میں جو کرنا چاہتی ہوں کر رہی ہوں''۔

''اتنا نہ کہو کہ میں اس جوش کے عالم میں نکل جاؤں مجھے بتاؤ کہ اس تجربے کا آغاز کہاں سے کروں؟''

''پہلے ماں کا تجربہ کرو۔اس کے بعد میں تمہیں دوسرے کردار سے روشناس کراؤں گی''۔

''کون ہے وہ ماں؟''

''روحانہ سنجانی''۔

''مجھے اس کے پاس لے چلو''۔ میں نے کہا اور تخینہ کے چہرے سے خون چھلکنے لگا وہ شدت جوش سے سرخ ہوگئی تھی پھر اس نے آہستگی سے کہا۔

''ہم یہاں سے اٹھیں گے''۔ میں نے ویٹر کو بلا کر نوٹ اسے دیئے اور کہا۔

''ان میں بل کی رقم پوری ہو جائے گی؟''

''سر......سر......'' ویٹر نے بل سے چار گنا رقم دیکھ کر بوکھلائی آواز میں کہا......

''باقی رقم تم رکھ لینا''۔

باہر نکل کر تخینہ نے کہا۔''میں تمہیں اپنے گھر نہیں لے جاؤں گی۔تمہارے جتنے چہرہ شناس کم ہوں،اتنا ہی اچھا ہے حیدر سماوی کو ذہن سے نکال دو۔ یہ تمہارا آخری تجربہ ہے۔ ہیں''۔

''مجھ سے کچھ نہ کہو''۔

ہم ہوٹل آگئے وہاں پہنچ کر ایک بار پھر تخینہ نے مجھ سے تصدیق کی کہ کیا وہ سب کچھ کرنے کو تیار ہوں جو اس نے کہا ہے؟ میں نے سرد لہجے میں کہا۔

"میرا ایک بار کہہ دینے کا مطلب وہی ہوتا ہے"۔

"مجھے تھوڑا سا وقت درکار ہوگا"۔

"جیسا تم مناسب سمجھو"۔

تنہائی میں، میں نے اپنے اس فیصلے کے بارے میں سوچا۔ تجربہ...... زندگی کا ایک اور تجربہ اور پھر اس تجربے سے وہ لمحات وابستہ تھے جو میں نے پولیس کی تحویل میں گزارے جہاں میری تحقیر ہوئی۔ میں اس تحقیر کو بھول نہیں سکتا تھا اگر حیدر ساوی اس کا ذمے دار ہوتا تو شاید اب تک میں اسے قتل کر کے اس ملک سے نکل چکا ہوتا اور اب مجھے اس کی تلاش تھی جس نے یہ عمل کیا تھا ممکن ہے وہ سب کچھ نہ ہو جو میں سوچ رہا ہوں لیکن نہ سہی ایک تجربہ ہی سہی۔ مجھے کیا کرنا ہے میں فیصلہ کر چکا تھا۔

تیسرے دن تحینہ نے مسکرا کر کہا۔

"میں نے ٹکٹ حاصل کر لیے ہیں دیگر انتظامات بھی ہو گئے ہیں"۔

"ٹکٹ......؟"

"ہاں ہم ٹرین سے سفر کریں گے"۔

"کہاں......؟"

"غرقند"۔

"کیوں؟"

"روحانہ وہیں رہتی ہیں"۔

"تم نے پہلے نہیں بتایا"۔

"کیا تم نے اس کا موقع دیا تھا"۔ وہ مسکرا کر بولی اور میں خاموش ہو گیا۔

"ہم بہت محتاط رہیں گے میں غرقند تک تمہارے ساتھ چلوں گی لیکن وہاں مجھے تم سے جدا ہونا پڑے گا۔ باقی سب کچھ تم کرو گے۔ میں راستے میں تمہیں مزید بریف کروں گی"۔

"کب چل رہے ہیں؟"

"رات کو......"

رات کو ہم ریلوے اسٹیشن سے غرقند کے لیے روانہ ہو گئے اور اب وہ مخصوص اسلامی ملک کے لباس میں نقاب کئے ہوئے ایک شریف زادی کے طور پر سفر کر رہی تھی رات بھر کا

تھا جگمگاتا ہوا شہر ہمارا استقبال کر رہا تھا۔ پھر کچھ دیر بعد اس کی روشنیوں نے دم توڑ قرون نے ہلکی سی سسکی تھی لیکن وہ کوہ راز نے مدہم سی روشنی کو لمحوں میں نگل لیا تھا۔

"ہم کار میں سفر کر سکتے تھے لیکن کچھ احتیاطی اقدامات ضروری تھے"۔

"ہوں"۔ میں نے سرسری طور پر کہا۔

"میرے پاس ایک البم ہے جسے میں نے ترتیب دیا ہے۔ اس نے کہا اور ایک چھوٹا نکال لیا۔

"کلام سنجانی حاکف سنجانی کا باپ"۔

"جواب دنیا میں نہیں ہے"۔

"ہاں یہ روحانہ سنجانی ہے"۔

"دیکھ چکا ہوں"۔

"اور یہ حافظ سنجانی"۔ اس نے کہا اور میں نے اس تصویر پر نظریں گاڑ دیں پھر کہا۔

"دوسرے اہلِ خاندان؟"

"ہیں لیکن قابل ذکر نہیں"۔

"حافظ سنجانی کا شعبہ کیا تھا؟"

"یورپ میں؟"

"ہاں"۔

"قبل، اصل میں تو اسے کینوس سے دور رکھنا تھا"۔

"کچھ اور یادگاریں جن کے بارے میں سوال کیا جا سکتا ہے"۔

"نہیں کیونکہ وہ عالم ہوش میں وہاں نہیں گیا تھا کوئی اس کی صورت بھی نہیں پہچانتا

تاریخ بہت جلد اپنے آپ کو دہرا رہی ہے۔

"کیسی نفسیات دان ہو؟ انسان ساری کہانیاں بھول سکتا ہے اپنی کہانی نہیں"۔

"شریف صحت......"

"وہ الگ بات ہے"۔

"یہ چیزیں خاص طور سے سنبھال کر رکھو"۔ تحینہ نے ایک بریف کیس مجھے دے کر

کہا۔

’’اس میں کیا ہے؟‘‘

’’کچھ ایسی چیزیں جو تحفے کے طور پر حافظ سنجانی کو بھجوائی گئی تھیں‘‘۔

تخمینہ نے کہا پھر وہ ان کی تاریخ بتانے لگی۔

’’میں وہ زبان نہیں جانتا جو حافظ سنجانی کی زبان ہے‘‘۔

’’تمہیں جاننی بھی نہیں چاہیے‘‘۔

’’کیوں......؟‘‘

’’کیونکہ اس زبان سے بہت پہلے تمہارا رابطہ ٹوٹ چکا ہے‘‘۔ تخمینہ نے کہا اور میں مسکرا دیا......‘‘

تمام پہلو مضبوط ہیں‘‘۔ وہ مسکرا کر ابولی۔

’’روحانہ کی مالی حیثیت کیا ہے؟‘‘

’’بہت شاندار، وہ تانبے کی کاروباری ہے اور یہ کاروبار بہت شاندار ہے۔ تانبہ غیر ممالک بھیجا جاتا ہے‘‘۔

’’یہ کاروبار کون سنبھالتا ہے؟‘‘

’’منتخب کارکن جو طویل عرصے سے روحانہ کے وفادار کارکنوں کی حیثیت رکھتے ہیں ان کے کاروبار بہت اطمینان بخش ہیں اور کئی دوسرے علاقوں میں زبردست زمینیں بھی ہیں اور ان پر شاندار کاشت ہوتی ہے‘‘۔

یہ الفاظ ادا کرتے ہوئے تخمینہ علایہ کے چہرے پر عجیب سی چمک پیدا ہوگئی تھی اور میں اس چمک کو گہری نگاہوں سے دیکھتا رہا۔ اس کے تصور میں بھی نہیں تھا کہ میرے ذہن میں کوئی خاص خیال ہے۔ بہر حال رات بھر کا سفر ختم ہوا اور اس کے بعد صبح کو ہم غرقند پہنچ گئے یہ کافی بڑا شہر تھا۔ کوہ ارمغان سے نکلتی ہوئی ندیاں جنوبی وادیوں کو سیراب کرتی ہیں۔ جہاں زمین بے حد زرخیز ہے مشرق کے اکثر شہروں کی مانند غرقند کا حال اس شہر کے شاندار ماضی سے کوئی مناسبت نہیں رکھتا۔

اکثر تاریخی عمارات قدرتی آفتوں اور زمانے کی تباہ کاریوں کا شکار ہو چکی ہیں نیلی مسجد کی شکستہ اینٹیں اس بات کا پتہ دیتی ہیں کہ صدیوں پہلے یہ عمارت اسلامی فن کا ایک عظیم

شاہکار ہوگی۔ کسی زمانے میں غرقند مغل بادشاہوں کا پایہ تخت تھا۔ کسی خان کی درخواست پر جب خان اعظم نے ایک مغل شہزادی کو مارکوپولو کی حفاظت میں روانہ کی تو وہ اسے یہاں لے آیا تھا لیکن خان اس دوران موت کی وادیوں میں جا چھپا تھا اور یہ شہزادی اس کے بیٹے کے پلے باندھ دی گئی۔

مارکو پو نے اس سلسلے میں تمام تفصیلات لکھی تھی اور یہ سفر نامہ میری نگاہوں سے گزر چکا ہے۔

بہر حال یہ ایک حسین وجمیل شہر تھا جسے کاروباری زندگی میں بھی ایک حیثیت حاصل تھی۔ کمخواب، ریشم اور اطلس کا کاروبار یہاں بے عروج پر تھا۔ شہر کے بازار میں دنیا کے کئی ملکوں کے سامان سے بھرے ہوئے تھے۔ اس کے علاوہ جنوبی وادیوں میں قیمتی پتھروں کا کاروبار بھی ہوتا تھا۔ غرقند کی اپنی ایک حیثیت تھی اور یہاں آنے کے بعد ایک ہوٹل میں قیام کر کے تخمینہ علایہ نے خاصی خوش ذوقی کا ثبوت دیا۔

ہمیں اپنا کام تو سرانجام دینا ہی تھا لیکن اس کے ساتھ تخمینہ کی خواہش تھی کہ میں اس شہر سے واقف ہو جاؤں اور پھر ذرا سا انداز بدل دینے سے صورتِ حال پسند کے مطابق ہو گئی۔ ہم یہاں سے بالکل عام لوگوں کی مانند غرقند کی گلیوں میں گھوم پھر رہے تھے اور اس کے بارے میں مکمل معلومات حاصل کر رہے تھے۔ تخمینہ علایہ نے مجھے اس کے متعلق اور بھی بہت سی تفصیلات بتائیں اور ایک ٹیکسی میں بیٹھ کر ہم سیر و سیاحت کے لیے اس ملک کی سرحد کی طرف چل پڑے۔

غرقند سے باہر نکلتے ہی بلند و بالا پہاڑوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا تھا اس علاقے کے زمینی مناظر بہت خوبصورت اور دلکش ہیں۔ ہر طرف ہرے بھرے کھیت اور سرسبز وادیاں ہیں۔

تخمینہ علایہ مجھے وادی کے پہلو میں ایک چھوٹے سے خوبصورت گاؤں میں لے گئی جس کے بارے میں مشہور ہے کہ یہاں حضرت نوح علیہ السلام کی اہلیہ مدفون ہیں۔ تھوڑے فاصلہ پر ملاکو نامی قصبہ ہے صاف ستھرا اور خوشنما پھولوں سے لدا ہوا۔ صاف شفاف ندی جو پگھلی برف سے بنی ہوئی تھی اور پھر ملاکو کا ناقابلِ تسخیر قلعہ جس نے تیموری افواج کا منہ پھیر دیا۔ انہی پہاڑیوں اور وادیوں میں زرتشت نے تبلیغ کی تھی اور اس کے افکار بھی میرے علم میں تھے۔

جانوروں اور غریبوں سے نیکی کرو۔ مقدس آگ کو لکڑیوں سے جلائے رکھو۔ خدا آہو ڈامزاڈا نے کہا کہ نیک سوچ نیک الفاظ اور نیک عمل نجات کا ذریعہ بنتے ہیں۔ زرتشت نے غزنی تک سفر کیا۔ تب بلخ کے بادشاہ نے اپنے آتش پرست ہونے کا اعلان کیا اور وہ آتش کدوں کا شہر کہلایا۔ ملاکو سے یہ روایات نمایاں ہوتی تھیں اور یہاں مجھے ایک عجیب سی کیفیت کا احساس ہوا تھا۔ اردگرد کے پہاڑوں پر بلند آسمان سے دھنک کے گولے نمودار ہو رہے تھے۔

یہ سیر و سیاحت اس قدر حسین تھی کہ انسان کے دل میں عجیب و غریب تصورات پیدا ہو جائیں۔ کچھ فاصلے پر کہ چمن کے خوبصورت سحر کی داستانیں تھیں۔ غرض یہ کہ تجینہ علایہ کے ساتھ باقی وقت تو جیسے گزرا وہ ایک الگ کہانی تھی لیکن یہاں آنے کے بعد سیر و سیاحت میرے مزاج سے عین مطابقت رکھتی تھی اور مجھے اس سے بڑا لطف آیا تھا۔ ایک معمولی زندگی عیش و عشرت کی زندگی سے کس قدر بہتر ہوتی ہے اس کا تجزیہ ہو رہا تھا۔

غرض یہ کہ یہاں ہم نے چار دن اسی انداز میں گزارے۔ ان چار دنوں کے زیاں سے تجینہ علایہ کا تصور کچھ بھی ہو لیکن میں یہ محسوس کر رہا تھا کہ اس سیاحت نے مجھ پر بہت اچھے اثرات مرتب کئے ہیں، لیکن یہ نہیں کہ میں تجینہ علایہ سے متاثر ہو گیا۔ ویسے میں نے اس دوران درجنوں بار محسوس کیا تھا کہ تجینہ علایہ کبھی کبھی اپنی حد عبور کرنے کی کوشش کرتی ہے اور ان حدود کو مختصر کرنا چاہتی ہے جو میرے اور اس کے درمیان تھیں لیکن بہت ہی سرسری طور پر، غالباً اس کی فطرت میں بھی انتہا پسندی نہیں تھی اور میں تو بہرحال اس کا شکار بالکل نہیں تھا بلکہ ایک شکاری کی طرح اس کی ہر جنبش پر نگاہ جمائے بیٹھا ہوا تھا کہ کب وہ میرے نشانے پر آتی ہے۔

سیر و سیاحت کا یہ سلسلہ آخر کار ختم ہوا اور اسے تجینہ ہی نے ختم کیا۔

کہنے لگی۔ ''اب تم اس شہر سے مکمل طور پر واقف ہو گئے ہو......!''

''ہاں''۔

''حالانکہ تمہیں اس کی چنداں ضرورت ہیں تھی لیکن یہ خوشگوار لمحات میں اپنی زندگی میں ہی سمیٹنا چاہتی تھی''۔

''سمیٹ لیجئے''۔

''شاید ایک اور کوشش بھی اس میں شامل تھی......''

''کیا......؟''

''تمہاری قربت کا احساس...... جس میں یہ تصور پنہاں ہو کہ اس وقت میں اور تم تنہا ہیں، ہر بوجھ سے بے نیاز......''

''ایک سوال ذہن میں ابھرتا ہے''۔

''کیا؟''

''شمون علایہ کو تمہارے اس عمل کے بارے میں علم ہے؟'' وہ ہنس پڑی، پھر اس نے کہا۔

''کیا تم نے یہ سوال مجھ سے دیر سے نہیں کیا؟''

''ضروری نہیں سمجھا''۔

''انہیں علم نہیں ہے''۔

''تو پھر اتنے دن تک تمہاری غیر موجودگی؟''

''بہانہ کیا ہے میں نے ان سے''۔

''کیا؟''

''یہی کہ ایک دوست کے پاس جا رہی ہوں کیونکہ بہت دن سے اس سے ملاقات نہیں ہوئی''۔

''ہوں''۔ میں نے اور خاموش ہو گیا۔

تب اس دن تجینہ علایہ نے مجھے ایک خوبصورت مکان دکھایا جو ایک انتہائی خوبصورت وادی میں الگ تھلگ بنا ہوا تھا ایک چوڑی اور شفاف سڑک سے ایک ذیلی سڑک گہری سڑک گہرائیوں میں اترتی تھی۔ اُس سڑک کا اختتام اس خوبصورت سفید عمارت پر ہوا تھا جسے دور ہی سے دیکھ کر دل خوش ہوتا تھا۔ تجینہ علایہ نے انگلی اٹھاتے ہوئے کہا۔

''وہ تمہاری منزل ہے''۔ میں نے پھر چونک کر اسے دیکھا۔ اپنی فطرت سے جنگ کر رہا تھا میں...... ایک احمق سی لڑکی مجھے میری منزل دکھا رہی تھی لیکن شاید میری منزل کی وسعتیں ابھی خود میری نگاہوں میں نہیں سمٹ پائی تھیں۔

''وہاں رہ جانا رہتی تھی؟ میں نے سوال کیا۔

''ہاں''۔

''ٹھیک ہے، آؤ چلیں''۔

واپس آنے کے بعد میں نے کہا۔ ''تو پھر اب مجھے کب روانہ ہونا ہے؟''

''کل صبح 11 بجے''۔

''کیسے جاؤں گا؟''

''ٹیکسی سے......''

''اور سفری کاغذات؟''

''ان کا انتظام میں نے کرلیا ہے''۔

''کیا مطلب......؟'' میں نے چونک کر کہا۔

''میں کوئی پہلو تشنہ نہیں چھوڑنا چاہتی تھی۔ وہ ابتدائی تین دن میں نے تم سے اسی لیے مانگے تھے''۔

''تو کیا تم نے میرے نئے کاغذات بھی تیار کرا لئے؟''

''ہاں!''

''خوب!...... دکھاؤ......'' میں نے کہا اور تحینہ علایہ نے وہ کاغذات میرے سامنے رکھ دیئے۔

میں ان کاغذات پر نگاہیں جماتے ہوئے تھا۔ جو کچھ اس نے کر ڈالا تھا، وہ ناقابلِ یقین تھا۔ حافظ سنجانی کا ہوائی ٹکٹ جو اسکے نام پر ایشو ہوا تھا، حافظ سنجانی کا پاسپورٹ، تمام لہریں، میری کچھ اسناد جو اصل تھیں۔ یہ تمام چیزیں ایک ناقابلِ یقین محنت کا احساس دلاتی تھیں اور اس کے ساتھ ہی میرے شبہ کو تقویت بھی بخشتی تھیں۔

ایک لڑکی اس قدر فعال نہیں ہوسکتی کہ یہ سارے کام تنہا سرانجام دے دے اور اس سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ شمون علایہ بھی اس کام میں پوری طرح ملوث ہے اور شبہات نجم غرقندی کے اس بیان سے تقویت پاتے تھے۔ جس میں اس نے پورے وثوق سے کہا تھا کہ ٹیلی فون پر میرے بارے میں اطلاع دینے والی آواز شمون علایہ کی تھی۔

بہرحال یہ لوگ اپنا عمل کر رہے تھے اور میری اپنی کہانی اس سے بالکل مختلف تھی۔ تحینہ علایہ اس طرح میرے کام سرانجام دے رہی تھی جیسے مجھے کسی بڑے سفر پر روانہ کرنے والی ہو''۔

''اور تم کیا اس دوران واپس چلی جاؤ گی؟''

''ہاں...... لیکن کچھ وقت کے لئے۔ بعد میں، میں بھی غرقند ہی آجاؤں گی اس دوران تم نظر رکھنا ضروری ہے لیکن ابتدائی کچھ دن تم پوری محنت سے سنبھالو گے۔ کل سے ٹھیک ایک ہفتے کے بعد کل ہی کے دن کسی بھی وقت تم مجھ سے اسی ہوٹل میں اور اسی کمرے میں رابطہ قائم کرو گے کیونکہ میں اسے برقرار رکھوں گی''۔

میں نے گردن ہلا دی۔ تحینہ علایہ نے مجھے ایک مخصوص لباس میں تیار کیا۔ خاص طور پر اس نے مجھے ایک پگڑی دیتے ہوئے کہا۔

''یہ ایک روایتی پگڑی ہے۔ تم لوگوں کی خاندانی شناخت اور تمہیں اس پگڑی میں وہاں داخل ہونا ہے۔ ہاں پگڑی باندھنے کا انداز میں تمہیں بتائے دیتی ہوں اور پھر اس نے مجھے پگڑی باندھ کر دکھائی اور جب میں تیار ہوگیا تو وہ مجھے عجیب سی نگاہوں سے دیکھنے لگی اور دیر تک دیکھتی رہی۔ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد اس نے کہا۔

''تم جارہے ہو گو یہ سب بہت مشکل ہے احمد اسدی! لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ تم اس شکل پر قابو پالو گے۔ جوں جوں وقت قریب آتا جارہا ہے، شاید تم سے زیادہ میں اس سلسلے میں اپنے حوصلے کھوتی جارہی ہوں''۔

پھر میں نے خاموشی اختیار کئے رکھی۔ پھر کلائی میں بندھی گھڑی میں اس نے دیکھ کر کہا۔

''اب تمہیں روانہ ہونا چاہیے۔ بعد میں اس نے نیچے آکر مجھے ٹیکسی میں بٹھایا تھا اور میرا مختصر سامان ٹیکسی میں رکھ دیا تھا، ٹیکسی ڈرائیور کو پتہ بتانے کے بعد میں اطمینان سے پچھلی نشست پر پشت ٹکا کر بیٹھ گیا۔ میرے اندر مکمل اعتماد تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ جعلسازی اور فریب کے اس سفر پر روانگی میرے لئے اجنبی چیز تھی۔ اس سے پہلے کبھی میں نے ایسا نہیں کیا تھا لیکن خوف نام کی کوئی چیز اس میں شامل نہیں تھی کیونکہ میں خود ذہنی طور پر اس فریب کے لئے تیار نہیں تھا اور میں نے فیصلہ کرلیا تھا کہ اس فریب کا پردہ کسی اور ذریعے سے چاک ہونے سے پہلے اس شریف عورت کو اپنی اصلیت بتا دوں گا۔ اول تو یہ بھی نہیں کیا جاسکتا تھا کہ مجھے حافظ سنجانی کی حیثیت سے اتنی آسانی سے قبول کرلیا جائے گا۔ جتنی آسانی سے تحینہ علایہ نے کیا تھا اور اس کے علاوہ میرا مشن دوہرایا تھا۔ تحینہ علایہ کو منظر عام پر لانا میرے لئے بڑی اہمیت کا حامل تھا۔ غرض یہ کہ یہ سفر مختلف خیالات میں جاری رہا۔ پھر ٹیکسی ذیلی سڑک پر چل پڑی، اور میں سب کچھ بھول کر اپنے مشن کی سرانجام دہی کے لئے تیار ہوگیا۔

وہ خوبصورت عمارت میں نے دور سے دیکھی تھی، آہستہ آہستہ قریب آتی جارہی تھی۔

لکڑی کا ایک بڑا سا گیٹ اس عمارت کا داخلی دروازہ تھا۔ یہاں دو افراد مستعد کھڑے تھے۔ جنہوں نے دور سے ٹیکسی کو دیکھ لیا تھا اور صورتِ حال معلوم کرنے کے لئے سامنے آئے تھے۔

میں نے ٹیکسی رکوائی اور اشارے سے ان میں سے ایک شخص کو قریب بلایا۔ دونوں ہی میرے پاس آگئے تھے۔ میں نے کہا۔

"دروازہ کھولو میں اندر جانا چاہتا ہوں"۔

"کیا آپ بیگم جاں کے مہمان ہیں"۔ ان دونوں نے میری وجاہت اور پگڑی کو بغور دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہاں......"

"لیکن ہمیں آپ کے اندر داخل ہونے سے پہلے "وجاہت علی" سے اجازت لینا ہوگی"۔

"جو کچھ تمہیں کرنا ہے اُسے فوراً انجام دو۔ کیا میں تمہیں اس کی اجازت دوں کہ تم وجاہت علی سے رابطہ کرو؟"

"تم جاؤ اور وجاہت علی سے کہو کہ ایک مہمان آیا ہے"۔ ایک شخص ان میں سے اندر گیا اور میں ٹیکسی روکے ہوئے انتظار کرتا رہا۔ تب میں نے ایک درمیانی عمر کے ایک شخص کو جو اچھی شخصیت کا مالک تھا، دروازے پر آتے ہوئے دیکھا۔ وہ باہر نکل آیا۔ میں ٹیکسی کی پچھلی نشست پر بیٹھا ہوا تھا، وہ میرے قریب آیا۔ اور پھر بولا۔

"آپ کون ہیں؟ اور آپ کو کس سے ملنا ہے؟"

"تم وجاہت علی ہو؟" میں نے سوال کیا۔

"جی......"

"میں بیگم جان کا مہمان ہوں اور انہی سے ملنے آیا ہوں"۔

"کیا تمہیں معلوم ہے کہ ڈاکٹر نے بیگم جان کو کسی ملاقاتی سے ملاقات کرنے کی ممانعت کردی ہے؟"

"کیا مجھے تمہارے بہت سے سوالات کے جواب دینے ہوں گے؟ کسی نے کچھ بھی کہا ہے، مجھے روحانہ کے پاس لے چلو۔ یہ اشد ضروری ہے"۔

"معاف کیجئے گا جناب! میں اس عمارت کا منتظم ہوں اور تمام تر ذمہ داریاں مجھ پر عائد کی گئی ہیں۔ بات یہ نہیں کہ یہ عمارت کوئی ایسا قانون رکھتی ہے جس میں کسی ملاقات کو آنے کی

دقت ہو۔ اصل مسئلہ یہ ہے کہ بیگم جان بیمار ہیں۔ اگر آپ کسی اور سے ملاقات کرنے آتے تو آپ کو کسی الجھن کا سامنا نہ کرنا پڑتا"۔

"میں سمجھتا ہوں کہ تم بھی بے قصور ہو ورنہ شاید میں تم سے برگشتہ ہو جاتا۔ جاؤ ان کو بتاؤ کہ ان کا بیٹا آیا ہے"۔ میں نے کرخت لہجے میں کہا اور سامنے کھڑے ہوئے شخص کی کیفیت خراب ہوگئی۔ اس نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔

"حافظ سنجائی!"

"کیا میں تمہیں شناخت نامہ پیش کروں"۔ میں نے کہا لیکن وہ شخص پرجوش لہجے میں ان دونوں سے بولا۔

"دروازہ کھولو...... دروازہ کھولو، ہمارے مالک، ہمارے مالک"۔ اور پھر دونوں آدمیوں نے دروازہ کھول دیا۔ ٹیکسی کو اندر لے گیا۔ عظیم الشان جگہ تھی۔ دور دور تک احاطے کی دیوار بکھری ہوئی تھی۔ اس کے درمیان ایسے حسین سبزہ زار تھے کہ دیکھ کر آنکھیں کھل جائیں۔ دونوں طرف تالاب بنے ہوئے تھے جن میں سفید بطخوں کی قطاریں جوق در جوق تیر رہی تھی۔ تالاب کا پانی گزرگاہ کے نیچے سے گزارا گیا تھا اس کے دونوں حصے نیچے سے آپس میں ملے ہوئے تھے۔ انتہائی خوشنما عمارت تھی۔ سامنے ہی پورچ تھا جس میں چار گاڑیاں کھڑی ہوئی تھیں۔ دو لینڈ کروزر اور دو اعلیٰ درجے کی دوسری خوبصورت گاڑیاں۔

میں ٹیکسی سے نیچے اُتر گیا۔ جس شخص کا نام وجاہت علی تھا، وہ دوڑا چلا آ رہا تھا اور پھر ٹیکسی کے پاس رک گیا۔

"آپ نیچے اُتر آیئے محترم! سامان کا بندوبست ہو جاتا ہے۔ آپ براہِ کرم میرے ساتھ آیئے"۔ پھر اس نے ایک ملازم کو جو تھوڑے فاصلے پر کھڑا ہوا تھا، اشارہ کرکے کہا۔

"ٹیکسی کو بل ادا کرو، سامان اتار کر اندر پہنچاؤ۔ آیئے محترم!" اور میں اس کے ساتھ پروقار انداز میں چلتا ہوا اندر داخل ہوگیا۔ اس کے انداز سے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ مجھ سے کچھ کہنا چاہتا ہوں لیکن زبان ساتھ نہ دے رہی ہو۔ ایک بڑے سے ہال نما ڈرائنگ روم میں آ کر اس نے مودبانہ انداز میں کہا۔

"آپ کی آمد کی توقع تو تھی آپ کے پچھلے کچھ خطوط سے اس بات کا اظہار ہوتا تھا کہ آپ کسی بھی وقت تشریف لے آئیں گے لیکن ہمیں وقت کا علم نہیں تھا اس لئے یہ کوتاہی ہوئی

اور نہ ہی آپ نے اس کا تعین کیا“۔

”ہوں، میں نے اچانک ہی آنا مناسب سمجھا۔ والدہ محترمہ کیسی ہیں؟ ابھی تم نے کہا کہ وہ بیمار ہیں“۔

”ہاں...... وہ سخت بیمار ہیں۔ بہت دنوں سے صاحب فراش ہیں“۔

”مجھے اطلاع کیوں نہیں دی گئی؟“

”منع فرمایا تھا انہوں نے......“

”اور تم نے مان لیا......؟“

”حکم کی تعمیل ضروری تھی“۔

”کہاں ہیں وہ......؟“

”میں ایک اجازت چاہتا ہوں آپ سے......“

”ہاں کہو“۔

”کیا ڈاکٹر تحمیر فرندی کو طلب کرنا مناسب ہوگا۔ آپ کے خیال میں؟“

”کیوں؟“

”آپ خود بھی سمجھتے ہو کہ ”بیگم جان“ آپ کے لئے کس قدر مضطرب تھیں۔ آپ خود بھی سمجھ سکتے ہیں کہ ایک ماں اچانک ہی اپنے بیٹے کو قریب سے دیکھ کر کس کیفیت کا شکار ہو سکتی ہے، میری رائے ہے ”محترم“ کہ ڈاکٹر تحمیر فرندی اُسے سنبھال سکیں“۔

”گویا مجھے انتظار کرنا ہوگا؟“

”مصلحتاً“۔

”کتنی دیر میں آ سکتا ہے ڈاکٹر فرندی؟“

”کچھ وقت لگ جائے گا۔ آپ اجازت دیجئے گا“۔

”بلالو......“

”میں ابھی انتظام کرتا ہوں، آپ یہاں تشریف رکھئے“۔ میں صوفے پر بیٹھ گیا تو وہ سامنے رکھے ہوئے ٹیلی فون کی جانب بڑھ گیا۔ پھر اس نے نمبر ڈائل کئے اور تھوڑی دیر کے بعد رابطہ قائم ہو گیا تو وہ بولا۔

”ڈاکٹر فرندی! آپ جس حال میں بھی ہیں لمحوں کے اندر یہاں پہنچیں...... اوہو......

میں آپ کو فون پر کچھ نہیں بتا سکتا...... ہاں...... آپ بیگم جان کے لئے ایسے انتظامات کر کے آیئے کہ اگر انہیں کوئی ذہنی جھٹکا لگے تو آپ انہیں سنبھال سکیں“۔

”آپ براہِ کرم ٹیلی فون پر اتنے سوالات مت کیجئے میں آپ کا بے چینی سے انتظار کر رہا ہوں“۔

”آپ کتنے ہی مصروف ہوں اپنی ہر مصروفیت چھوڑ کر آ جائیں“۔

”جی بہت شکریہ! اس نے ٹیلی فون بند کر دیا اور میرے قریب آ گیا“۔

”دل چاہتا ہے کہ کتے کی طرح آپ کے قدموں میں لیٹ جاؤں۔ آپ نہیں سمجھ سکتے کہ میں اس وقت کتنی بڑی خوشخبری سے دو چار ہوا ہوں، آپ کا آنا اشد ضروری تھا لیکن روحانہ کا حکم تھا کہ جب تک آپ خود اپنے طور پر آنا بہتر خیال نہ فرمائیں گے، آپ کو بلایا نہ جائے۔ میرا بس چلتا تو بہت پہلے آپ سے درخواست کرتا کہ آپ سے تشریف لے آیئے۔ ”بیگم جان“ چراغ سحری ہیں اس چراغ کے بجھنے سے پہلے آپ اس کی روشنی سنبھال لیجئے“۔

”کیا وہ بہت بیمار ہیں؟“

”ہاں......“ ڈاکٹر فرندی کا کہنا ہے کہ وہ سینے پر ایسا کوئی بوجھ سنبھالے ہوئے ہیں جو ان کی زندگی کو تیزی سے گھلا رہا ہے۔ اگر وہ اپنا بوجھ کسی پر ظاہر کر دیں تو صحت کی کچھ علامتیں نمودار ہو جائیں......“

”آہ میری ماں کے دل پر میری جدائی کے علاوہ اور کون سا بوجھ ہو سکتا ہے!“ میں نے کہا۔ اور مجھے خود اپنے آپ پر حیرت ہوئی۔ میں تو اچھا خاصا اداکار تھا اور خوب اداکاری کر رہا تھا حالانکہ یہ سب کچھ میری فطرت سے بالکل مختلف تھا۔ وجاہت علی کہنے لگا۔

”آج اس گھر میں ایک نئی تاریخ کا آغاز ہو رہا ہے۔ یہ آغاز بہت سوں کے لئے موضوع بنا رہا ہے اور اس کے بارے میں نجانے کیا کیا تصورات قائم کئے گئے تھے لیکن یہ اس طرح لمحوں میں ہو جائے گا، کسی نے اس بارے میں سوچا بھی نہیں تھا۔

”لیکن وجاہت علی! کم از کم تمہیں مجھے یہ خبر دینی چاہیے تھی“۔

”میرا قصور نہیں ہے، محترم! مجھے یہ سختی سے حکم دیا گیا تھا کہ آپ کو بیگم جان کی بیماری کے بارے میں خبر نہ دوں اور اس میں سب ہی شامل تھے حالانکہ میں نے بحث بھی کی تھی۔ میں نے کہا تھا اب حالات اس قدر مشکل نہیں ہیں اور ”محترم“ کی آمد کسی ایسے مسئلے کا باعث

نہیں بنے گی جو مشکل ہو لیکن بھلا حکم حاکم سے منحرف کون ہو سکتا ہے۔ ویسے محترم آپ نے بڑا انوکھا قدم اٹھایا اور کیا اب مستقل وطن واپس آ گئے ہیں؟''

''ہاں......'' میں نے جواب دیا۔

''کتنی بڑی خوش قسمتی ہے اور کتنا بڑا مقام ہے ان حالات اور ان لمحات کے لئے واقعی کوئی سوچ بھی نہیں سکتا کہ خوش بختی اس طرح گھر میں داخل ہو جائے گی، آہ، اگر آپ اپنی آمد کی خبر دے دیتے تو نہ جانے کیا کیا ہوتا۔ حالانکہ بیگم جان بجھ چکی ہیں اور اس بیماری نے تو انہیں بالکل ہی نڈھال کر دیا ہے''۔

بیگم جان پر کیا بیتی یہ الگ کہانی ہے۔ میں اپنی بات کر رہا ہوں۔ ہر آغاز کا انجام ہوتا ہے۔ میرا آغاز کہاں سے ہوا تھا اور میری زندگی اب کون سے دور میں سفر کر رہی تھی۔ حادثات نے میری زندگی کے دھارے بدل دیئے۔ آنکھیں گئیں، وقت نے سب سے بڑا دیدہ ور بنا دیا۔ وہ کچھ دیکھا جو کم ہی دیکھنے میں آتا ہے اور اگر میں دنیا سے کنارہ کشی کر کے گوشہ نشین بھی ہو جاؤں تو کون جانے کب کوئی نئی کہانی سفر کرتی ہوئی مجھ تک پہنچ جائے...... زندگی نے کوئی نئی کروٹ بدلی تو وعدہ کرتا ہوں کہ آپ کو اپنا راز دار ضرور رکھوں گا۔

❀❀❀❀